

# تفسیر المیزان معارف القرآن

تصنیف لطیف

حضرت مولانا خواجہ محمد عبدالحی فاروقیؒ

تلمیذ رشید

امام انقلاب حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ

حکمت قرآن انسٹیٹیوٹ

# تفسیر الفرقان فی تفسیر معارف القرآن

تصنیف لطیف

حضرت مولانا خواجہ محمد عبدالحی فاروقیؒ

تلمیذ رشید

امام انقلاب حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ

اشاعت اول: 2010ء

کمپیوٹر لے آؤٹ: محمد امتیاز احمد

طابع: ذکی سنز پرنٹرس کراچی

ناشر: حکمت قرآن انسٹیٹیوٹ کراچی

ایڈریس:

حکمت قرآن انسٹیٹیوٹ

6 سندھی جماعت کو آپریٹو سوسائٹی، جوگی موڈ بس اسٹاپ

نیشنل ہائی وے کراچی۔ 75030

رابطے کیلئے 021-35000278

0300-2707097

web: [www.hikmatequran.org](http://www.hikmatequran.org)

## فہرست مضامین

46.....	اس کا نتیجہ	19.....	<b>پیش لفظ</b>
47.....	عقل و تمیز	19.....	یورپ سے تعلق
48.....	محصولات	19.....	احساس حقیقت
48.....	خارجی تعلقات	20.....	قرآن کا ذوق
50.....	الزام فساد	20.....	ریشمی خطوط
52.....	رفتائے کار کی تعذیب	21.....	جامعہ ملیہ اسلامیہ
53.....	سنت اللہ	22.....	طبع جدید
55.....	طاقت کی نمائش	23.....	<b>باب نمبر ۱: قصص القرآن</b>
56.....	کلمہ حق کا خوف	23.....	فلسفہ تاریخ
57.....	<b>باب نمبر ۲: انجام</b>	23.....	سبب اختصار
57.....	جھوٹے وعدے	24.....	دوا اور مقصد
58.....	احسانات کی یاد	25.....	اقسام ثلاثہ
61.....	فرعون کی ناقابلیت	26.....	احسن القصص
63.....	اقتدار کا بھوت	27.....	حضرت عیسیٰ علیہ السلام
64.....	ذہاب الی اللہ	27.....	اور قسمیں
65.....	نتیجہ کی بشارت	28.....	رجوع الی المقصود
66.....	حسن خاتمہ	30.....	<b>باب ۲: فر اعنه مصر</b>
67.....	بصائر للناس	30.....	چھوت چھات
69.....	تفاسیر پر ایک نظر	30.....	قومیت متحدہ کی ضرورت
69.....	وسعت بیان	31.....	ترندی میں ہے
70.....	اوائل عہد	35.....	اسباب حیات
71.....	زاویہ نگاہ	38.....	بیگار
75.....	جدید راہ	39.....	زاویہ نگاہ کا فرق
76.....	مابعد کی تفسیریں	41.....	سرمایہ داری
81.....	الفاظ کی غلط تعبیر	42.....	نعت عظمیٰ
87.....	غلط فہمی کے اسباب	44.....	حرمت سود
91.....	دعوت و تبلیغ	45.....	غلامی کے اثرات

134	فرشتوں کا سجدہ	95	سورة البقرة
136	آدم کی جنت	95	سورة کانام
139	نزول الہام	95	ترتیب نزول
141	باب نمبر ۲: قرآن حکیم کی ضرورت	95	ما قبل سے تعلق
142	علمی خرابی	96	موضوع سورة
145	عملی کمزوری	98	روئے سخن
146	انتظامی نقص	98	مضامین کی فہرست
148	اجمال کی تفصیل	104	باب ا: وحی الہی کی ضرورت
148	تذکیر بمابعد الموت	104	حروف مقطعات
149	شفاعت	105	محکم، تشابہ
150	تذکیر بآلاء اللہ	107	موجودہ کتاب
151	غلامی کے آثار باقیہ	109	ارباب تقویٰ
153	تورات کا نزول	109	ایمان بالغیب
154	افراط کا ارتکاب	110	اقامت صلوة
155	سپاہیانہ زندگی	110	انفاق فی سبیل اللہ
156	شہر کا داخلہ	111	انصار
158	پانی کی تلاش	112	کفار
162	رفع اشتباہ	112	فطرت انسانی کے متعلق مذاہب مختلفہ
164	قانون سے نفرت	113	قرآن کا فیصلہ
165	حیلہ سازی	114	منافقین
167	باریک بینی	116	اصلاح و افساد
170	حیات قومی کی لئے تین قسم کے لوگوں کی ضرورت	121	جرم کا اقرار
171	دست و بازو نہیں بن سکتے	122	امثال قرآنی
172	سکمان حق	123	دو قسم کے لوگ
172	جہلائے یہود کی حالت	124	دعوة الی التوحید
174	نجات کا قانون	128	نکتہ چینی
176	عہود و مواثیق	130	(الف) ایمانی کمزوری
178	ہمیشہ سے عادت ہے	130	(ب) ضعف طبیعت
180	ماتحت نہیں رہ سکتے	131	(ج) کوتاہ عقلی
180	تقلید اعمیٰ	133	آدم علیہ السلام



244	غیر اللہ کی غلامی	182	انکار کا سبب
246	صرف کرنے کا قانون	183	پابندی تو راہ کا دعویٰ غلط ہے
250	حکومت کی قابلیت	184	آخرت کے متعلق خیالات
253	فوجداری قانون	186	قابل نفرت ہیں
255	ضابطہ دیوانی	191	علحدگی کا حکم
257	مذہبی تعلیم کی نشر و اشاعت	193	اعتراف کی پوچھاڑ
259	روزہ کی فرضیت	195	ناخ و منسوخ؟
260	صدقۃ الفطر	196	اعتراف کی اصلی غرض
263	روح مذہب کی پابندی	198	ارکان اسلامی کی انتہائی غرض
264	اتباع قانون	202	تنفیخ ملل
267	باب نمبر ۵: معاملات	203	حقیقت قبلہ
268	قمری حساب ہو	206	بعثت کی ضرورت
270	باب نمبر ۶: سیاست مدن	210	انصاف سے کام لیں
271	فصل اول: جہاں گیری	215	دعائے رزق
271	کوئی مقام مستثنیٰ نہیں	216	دعائے خلیل
273	کوئی شخص بھی مستثنیٰ نہیں	219	ایک اور حجت
275	کوئی وقت مستثنیٰ نہیں	220	صنۃ اللہ
276	جہاد ہی میں زندگی ہے	222	شہداء علی الناس
277	فریضہ حج	223	بیت المقدس عارضی قبلہ کیوں بنا؟
280	حج کے احکام	225	تحویل قبلہ
283	تجارت بھی جائز ہے	227	مرکز قائم کرنا ہے
284	اتحاد عمل شرط ہے	229	قبلہ ایک ہی ہو گا
284	شریف النسب کو دعوت اسلام دو	229	چند لطیف نکلتے
285	دو قسم کے آدمی	233	باب ۳: تہذیب اخلاق
286	مقطع سخن	233	اخلاق کی تفصیل
289	پورے پورے مسلم بن جاؤ	235	مواقع صبر
290	جہاد فی سبیل اللہ کی غرض	238	تعلیم گاہ حریت
293	مکالیف کا آنا ضروری ہے	239	تبلیغ و دعوت
294	کہاں روپیہ صرف کریں	242	باب ۴: تدبیر منزل
294	جہاد کب تک رہے گا	242	دولت کمانے کے ذرائع

337	اثبات قیامت	296	ناجائز ذرائع کا استعمال حرام ہے
338	ایک اور مثال	297	کتنا خرچ کریں؟
340	انفاق فی سبیل اللہ کی شرطیں	297	یتامی کی تربیت
340	من واذیٰ نہ ہو	299	فصل ثانی: جہاں داری
341	رضائے الہی پیش نظر رہے	299	توطیہ و تمہید
342	بہترین مال خرچ کرو	300	نکاح کی غرض
345	انفاق فی سبیل اللہ کے مصارف	301	مسلمان کی عظمت
346	سود کی حرمت	303	افزائش نسل
349	اعلان جنگ	304	بروتقویٰ کی حفاظت
351	قرض کا قانون	307	طلاق کے متعلق چند الفاظ
354	رہن کی اجازت ہے	308	تین حیض کا انتظار
354	ارکان خلافت اور تعلق باللہ	310	طلاق رجعی
356	یوں دعا کرو	311	حلالہ
357	حسن خاتمہ	313	ضرر دینا جائز نہیں
359	بسم اللہ الرحمن الرحیم	314	رکاوٹ پیدا نہ کرو
359	الحمد للہ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ	315	مسئلہ رضاعت
359	<b>سورہ آل عمران</b>	317	عورت انتظار کرے
359	سورہ کانام	318	طلاق قبل الوطی
359	ترتیب نزول	321	فصل ثالث: ضروریات جہاد
360	ما قبل سے تعلق	321	میدان جنگ اور موت
360	روئے سخن	322	روپیہ بھی دو
362	موضوع سورہ	323	انتخاب امیر
362	تلخیص مضامین	324	شرائط انتخاب
365	باب نمبر ۱: الوہیت مسیح	325	نزول برکات
365	نصاریٰ کی غلط کاری	326	فوج کا امتحان
366	نزول قرآن	330	باب ۷: خلافت کبریٰ
368	قطعی فیصلہ	330	ایک لطیف نکتہ
369	تقسیم کتاب	332	خلیفہ اسلام کے فرائض
370	فطری طریق	334	جبر و اکراہ کی ضرورت نہیں
371	فیصلہ کن راہ	335	وجود باری تعالیٰ

398	نبی اُمّی کے لئے پیشین گوئی	372	ایک مثال
399	مریم سے وعدہ ہائے خداوندی	373	نتیجہ
403	مریم کا تعجب	374	رجوع الی المقصود
404	عیسوی معجزات	374	خلاصۃ المرام
405	صراط مستقیم	375	دعائے ہدایت
406	من انصاری الی اللہ	376	تباہی کی وعید
407	مکر کی تشریح	377	غلبہ اسلام
409	وعدہ ہائے خداوندی	377	جنگ بدر
409	رجوع الی المقصود	378	اختلاف مقاصد
410	توفی کی تحقیق	379	فرزندان اسلام
411	رافع الی	381	باب نمبر ۲: دعوت اسلام
412	تیسرا وعدہ	381	فصل اوّل: نصاب تعلیم
412	فضیلت و برتری	381	اساس عالم
412	دو قسمیں	382	صرف اسلام مطلوب ہے
413	کامیابی کا عہد	383	ترقی ناممکن ہے
414	ابن اللہ کا ابطال	383	دوزخ کی بشارت
415	مباہلہ کی دعوت	385	قانون سے اعراض
416	توحید خالص	385	یہ کیوں
418	سینہ بسینہ تعلیم	386	فصل ثانی: شرائط خلافت
419	کائنات غلت	386	حکومت کی دعا
420	باب نمبر ۳	388	انقطاع تعلقات
420	فصل اوّل: اہل کتاب کی خرابیاں	390	انتباہ
420	انتہائی سفاہت	391	بہترین طریق عمل
421	خدع و فریب	392	فصل ثالث: تاریخی نظائر
422	فضل عظیم	392	برگزیدہ خاندان
423	خان و بد عہد	393	عمران کی بیوی کی دعا
425	اصلی قانون	394	قبولیت دعا
425	عاقبت کار	395	بشارت یحییٰ
426	تحریف کتاب	396	طلب آیت
426	انسان خدا نہیں بن سکتا	397	مریم کی برگزیدگی

468	امیر کی تخصیص	428	اغذیثاق
469	موت کا وقت	430	انتہاء
470	استقلال شرط ہے	432	طغرائے امتیاز
470	نصرت الہی کا وعدہ	433	کوئی عذر نہیں رہا
472	ایفاء وعدہ	435	ایک اعتراض
474	فساد عظیم کی روک تھام	436	حج بیت اللہ
476	نزول اطمینان	437	آیات پینات
477	معنی خیر حقیقت	440	اپنی تکذیب آپ
478	بھاگنے والوں کی تعداد	441	فصل ثانی: انقطاع تعلقات
479	کون لوگ بھاگے ہیں	443	فرقہ بندی ممنوع ہے
481	صرف حسرت باقی ہے	445	دعوت و ارشاد
482	تنظیم جماعت کے اصول	447	اختلاف سے بچو
484	توکل علی اللہ	449	اتحاد و اختلاف کے نتائج
484	خیانت ناممکن ہے	451	خیر الامم
486	شان بینہما	452	اللہ نگہبان ہے
487	ہذا الصائر للناس	453	مزید تفصیل
488	کالیف کا لطیف جواب	455	منافقین سے پرہیز
490	انظار مسرت	456	مزید تشریح
490	جنگ میں مرنا یقینی نہیں	457	باب نمبر ۴: غزوہ احد
492	آپ غمگین نہ ہوں	457	فصل اول
493	فرق و امتیاز	457	ما قبل سے ربط
493	فصل ثانی	457	واقعات احد
493	ان سے پرہیز کرو	459	رجوع الی المقصود
494	ناشائستہ حرکات	460	غزوہ بدر
495	دجل و فریب	460	اعداد ملائکہ
497	فصل ثالث: اوصاف ضروریہ	461	بیجا انتقام
497	اولو الالباب	462	جنت کی طلب
498	وہ فرض یہ ہے	464	تذکیر بایام اللہ
499	وعدہ الہی	465	بیان للناس
500	فضائل مخصوصہ	465	غم کا علاج
501	حی علی الفلاح	466	مقصد کیا تھا

539	مقصد کیا تھا
539	نزول برکات
541	ملائکہ کی آمد
543	نصرت الہی کا ظہور
544	طریق جنگ
546	باب (۲): جنگ سے بھاگنا جرم ہے
547	دست عمل
549	آفتاب آمد دلیل آفتاب
550	اوّلی الامر کی اطاعت
551	جہاد ہی میں زندگی ہے
551	قلت تعداد کا عذر
552	فرض منصبی کی حفاظت
553	تقویٰ اللہ
553	دارالندوہ میں مشورہ
555	قانون تحذیب
556	بیت اللہ کے وارث
557	ہمیشہ جنگ کرتے رہو
559	تقسیم غنائم
560	گدایان عشق
562	جھگڑا مت کرو
563	اسباب ہزیمت
564	ارباب نفاق
565	تذکیر بایام اللہ
566	نقض عہد
567	سلمان حرب کی فراہمی
568	خون ریزی مقصد نہیں
570	تحریض علی القتال
571	کتاب من اللہ
572	وعدہ الہی
573	سیاسی مواخات

<b>تفسیر الفرقان فی معارف القرآن (جلد دوم)</b>	
505	تمہید
506	انتخاب طبعی
507	قوموں کی جنگ
507	القرآن الحکیم
507	جزئیات تنازع للبقاء
509	فلسفہ جنگ
510	متمدن اقوام
511	کتاب مبین
512	فرصت جہاد
515	مقصد کا تعین
516	مسلمان کے خون کی قیمت
517	عالمگیر اور ادوری
518	فضیلت و برتری
520	آلات حرب کی فراہمی
521	جنگ اور جہاد
524	اسوہ حسنہ
525	حکومت اور جہاد
526	اصیو ادا علی اللہ
527	<b>سورة الانفال</b>
527	سورہ کانام
527	ترتیب نزول
528	ما قبل سے ربط
529	موضوع سورہ
531	تلخیص مضامین
533	باب (۱): قانون جنگ
533	انتیازات مسلم
535	غزوہ بدر پر اجمالی نظر
535	جنگ کے لئے نہیں نکلے
537	اخراج عن البيت

601	قلت تعداد	575	رزق کریم
602	غربت کا خوف	577	بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
603	جزیرہ نمائے عرب	577	اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِهِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی
604	فصل سوئم: جاہدوا فی اللہ حق جہادہ	577	سورة التوبہ
604	اصلاح عام	577	سورة کانام
606	غلط عقائد	578	ترتیب نزول
606	شرک فی الاعمال	578	ما قبل سے تعلق
607	عالم اور دولتمند	579	ترک بسم اللہ
608	جہاد ہمیشہ رہے گا	579	موضوع سورة
609	دھوکا دہی	581	خلاصہ مضامین
610	کوئی استثنا نہیں	581	باب اوّل: اعلان جنگ
611	غار ثور کا واقعہ	582	باب دوم: ارباب نفاق
612	ہر وقت تیار رہو	583	باب سوم: السائقون الاولون
613	باب ۲	585	باب نمبر ۱
613	فصل اوّل: ارباب نفاق	585	فصل اوّل: اعلان جنگ
613	مصالح خصوصی	585	انذار حرب
614	عفو و درگزر	586	غور کی مہلت
614	شکی لوگ	587	الحج الاکبر
615	جاسوس ہیں	588	پابندی عہد
616	فتنہ سے بچتے ہیں	590	قتل عام
617	غازی یا شہید	591	درس قرآن
617	روپیہ بیکار ہے	592	وجہ مخالفت
618	کذب آفرینی	592	مزید تشریح
619	بندگان زر	593	بہترین علاج
619	مصارف صدقات	595	فصل دوم: آمادہ گی جہاد
620	رسول پر کتہ چینی	595	مقصد انتخاب ہے
622	تمسخر و استہزا	596	رفع اعذار و مواعج
623	تذکیر بایام اللہ	596	مذہبی تقدس
624	الجہاد فی سبیل اللہ	597	احب الاعمال الی اللہ
625	بخیل لوگ	600	دنیاوی ضروریات

باب نمبر ۳.....	628	رجوع الی المقصود.....	652
فصل اوّل: السابقون الاولون.....	628	تنبیہ.....	654
پیچھے رہنے کا نتیجہ.....	628	باب نمبر ۱: صبر و تقویٰ.....	655
دولت اور نفاق.....	630	فصل اوّل: تاویل احادیث کی تعلیم.....	655
گاؤں کے لوگ.....	631	سردلبرہاں.....	655
قابل الزام.....	632	سچا خواب.....	656
دیہاتی زندگی.....	632	تعبیر.....	656
السابقون الاولون.....	633	آیات للسائلین.....	658
مختلف اقسام.....	634	مشورۃ قتل.....	658
مسجد ضرار.....	635	تدبیر الہی.....	659
انتباہ.....	637	باپ سے درخواست.....	660
فصل ثانی: اشاعت جہاد.....	638	صبر جمیل.....	660
بہترین سودا.....	638	ایک سوال.....	662
خارجی علامات.....	639	یابشری.....	662
دعائے مغفرت نہ کرو.....	639	لطف خداوندی.....	663
اصحاب ثلاثہ.....	640	استدلال واستشہاد.....	665
اعلیٰ ترین طبقہ کے فرائض.....	642	فصل ثانی: دوسرا دور.....	666
جہاد کی ابتدا.....	644	معاذ اللہ.....	666
مسرت وشادمانی.....	644	پاک دامنی.....	667
حسب اللہ.....	645	معنی خیز تفسیر.....	668
الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی.....	647	برہان رب.....	669
<b>سورۃ یوسف</b> .....	647	عبادنا الخالصین.....	669
سورۃ کا نام.....	647	فریب کاری.....	670
مقام نزول.....	647	عزیز کا فیصلہ.....	670
ترتیب مضامین.....	647	ایک اور حیلہ.....	671
بائبل اور قرآن.....	648	اعتراف شکست.....	672
موضوع سورۃ.....	650	السمن احب الی.....	672
اجمال کی تفصیل.....	651	ساتی و باورچی.....	673
جذبہ امانت.....	652	اعلان توحید.....	674
باقی خواب.....	652	حقیقی تعبیر.....	676

699	فصل دوم	676	صاف مطلب
699	رسول اللہ ﷺ	677	بادشاہ کا خواب
699	الہام	677	ذریعہ نجات
701	انبیاء کرام کا طریق عمل	678	الزامات کی تحقیق
702	انجام	679	امر آة العزیز کی شہادت
703	ہدایت و رحمت	680	محقق کی رائے
705	الحمد للہ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ	680	حمکین فی الارض
705	ذکرئی: پارہ عسم کی تفسیر	681	حقیقہ علیم
705	سکی اور مدنی تقسیم	682	بصار و حکم
705	سکی سورتیں	685	باب نمبر ۲
705	مدنی سورتیں	685	خواب کا سچا ہونا
706	اس کی حکمت	685	فصل اوّل
706	رسول کی ضرورت	685	بھائیوں کی آمد
707	قلب القرآن	686	رواگی کی اجازت
708	الغبا	687	اللہ پر بھروسہ
708	موضوع سورۃ	688	پیالہ کی چوری
708	جزائے اعمال پر زور	689	کد نالیوسف
710	یوم الفصل	689	انتم شرمکانا
710	عظیم الشان خبر	690	مشورہ کے مطابق بیان
711	ایک نکتہ	691	صبر جمیل
713	تشریح الفاظ	691	اعتماد علی اللہ
713	مناظر قدرت سے استدلال	692	انتہائے صبر
713	قیامت کا دن	693	استجاب و حیرت
714	آثار و قرائن	694	حجتہ اللہ البالغہ
715	پہاڑوں کے مختلف حالات	694	کرشمہ ہائے قدرت
716	نتائج اعمال	695	عجابات قدرت
716	عذاب کا سبب	696	اقسام قیص
717	ارباب تقویٰ	696	قد جعلہ ربی حقا
718	جنت کی حقیقت	697	یوسف کی دعا
718	کس روز	698	چند موعظت



740	وحی والہام	719	رجوع الی المقصود
740	واقعات قیامت	721	<b>النازعات</b>
741	خمسہ مستحیرہ	721	موضوع سورۃ
742	تطابق اقسام	723	رفع استبعاد قیامت
743	بعض خصوصیات	723	اقیام القرآن
743	عالم گیر تعلیم	724	رجوع الی المقصود
745	<b>الانفطار</b>	724	فرشتوں کی خصوصیت
745	تفخیص مضامین	725	اظہار تعجب
745	مالک یوم الدین	726	فرعون کی ہلاکت
745	حادثہ قیامت	727	عبرۃ لمن ینحش
746	آخر یہ کیوں	728	نتائج اعمال
746	محافظ موجود ہیں	729	قیامت کی تاریخ
747	ظہور نتائج	730	دنیا کی زندگی
748	مالک یوم الدین	731	<b>عبس</b>
749	<b>المطففين</b>	731	تفخیص مضامین
749	تفخیص مضامین	732	مساوات عمومی
750	القسطاس المستقیم	732	عبداللہ بن ام مکتوم
750	تاجروں کی مثال	732	یہ عتاب نہیں
750	امثال القرآن	733	عصمت انبیائے کرام
751	تذکیر بما بعد الموت	734	غلط فہمی کا ازالہ
751	جد اگانہ نتائج	734	خصوصیات قرآن
752	انکار کا سبب	735	اعتبار
753	ارباب تقویٰ	735	انسان کی ناشکر گزاری
754	مقرئین اور ابرار	736	ابتداء انتہا
754	تقسیم کی اصلی غرض	736	درمیانی زندگی
754	باہمی تقابل	737	اسلام کی خصوصیت کبریٰ
755	الجوزاء من جنس العمل	738	غور و نسل بے کار ہے
756	<b>الانشقاق</b>	738	عمل کی قاہرانہ قوت
756	تفخیص مضامین	739	<b>التکویر</b>
756	یا ایھا الانسان انک کادح	739	تفخیص مضامین
756	ہلاکت و بربادی		

772	ضرورت الہام	757	احب الیمین
772	الحمد للہ رب العالمین	758	مجرمین کے نتائج
773	اعتبار	758	مناظر قدرت
774	حیوانات کی نگہداشت	759	اعتبار
774	وحی والہام	760	<b>البروج</b>
774	الامشاء اللہ	760	تلخیص مضامین
775	جہر و خفی	760	مخالفین اسلام یقیناً برباد ہوں گے
775	باہمی تطبیق	760	اقسام ثانیہ
776	تبلیغ قرآن	760	والسماوات البروج
776	راہ نجات	761	الیوم الموعد
777	دین قیم	761	شاہد و مشہود
778	<b>الغاشیہ</b>	761	شہادت کی تفصیل
778	تلخیص مضامین	762	جرم کی نوعیت
778	اصول کامرانی	763	الہامات انبیائے کرام
778	ناکام لوگ	764	اگر عذاب میں تاخیر ہو
779	ارباب ایمان	765	تاریخی شہادت
779	طبع انسانی کا خاصہ	766	کفار کا انکار
780	سادگی طبع	766	یہ فیصلہ اٹل ہے
781	بلندی مقصد	767	لوح محفوظ
782	استقلال	768	<b>الطارق</b>
783	فروتنی	768	تلخیص مضامین
783	ایک مثال	768	یوم الدین
784	فرض تبلیغ	768	الطارق
785	<b>الفجر</b>	769	طریق استشہاد
785	تلخیص مضامین	769	نفسی شہادت
785	جزائے اعمال	770	بعث بعد الموت
785	اقسام کی تفصیل	770	نشاۃ ثانیہ
786	ہماری رائے	771	مزید مہلت
786	جفت اور طاق	772	<b>الاعلیٰ</b>
787	واللیل اذا یسر	772	تلخیص مضامین

801	اختلاف اعمال	787	عبرت و موعظت
802	کامیاب لوگ	788	تذکیر بایام اللہ
802	بحط مستقیم مخالف	789	انفرادی احتساب
804	ارباب تقویٰ	789	اس کا اصلی سبب
805	<b>الضحیٰ</b>	790	آخری احتساب
805	تفخیص مضامین	791	ظہور نتائج
805	والمنعمۃ ربک فحدث	792	<b>البلد</b>
805	شان نزول	792	تفخیص مضامین
806	دن اور رات کی شہادت	792	لقد خلقنا الانسان فی کبد
806	دائمی وعدہ	792	طریق استشہاد
807	ماضی کی تذکار	793	رسول اللہ ﷺ
808	ارحوا من فی الارض	793	فرزند آدم
809	تبلیغ قرآن	793	غلط مصرف
810	<b>الانفصاح</b>	794	اصلی راہ
810	تفخیص مضامین	795	فک رقبتہ
810	رفع موانع	795	مساکین ویتائے
810	شرح صدر	795	احب المینمۃ
811	بوجہ کا ہلکا ہونا	796	بد بخت
811	رفع ذکر	797	<b>الشمس</b>
812	رنج و راحت	797	تفخیص مضامین
812	اثابت الی اللہ	797	کامرانی و خسران
814	<b>التین</b>	797	مناظر قدرت
814	خلاصہ مضمون	798	طریق استدلال
814	فما یکذبک بعد بالدین	798	نفس انسانی
814	تین اور زیتون	799	جواب قسم
815	بقیہ اقسام	799	تاریخی شہادت
815	استشہاد کا مقصد	800	قرآن کا منصب اصلی
816	احسن تقویم	801	<b>اللیل</b>
816	بدترین خلائق	801	تفخیص مضامین
816	ایک استثناء	801	ان سحیم لشی

831	واقعات قیامت	817	جزائے اعمال
831	زلزلہ	818	<b>العلق</b>
832	حکم خداوندی	818	تلخیص مضامین
832	مختلف گروہ	818	دشمنان اسلام کی بربادی
833	<b>العادیات</b>	818	شوق عبادت
833	تلخیص مضامین	819	آپ کا خوف زدہ ہونا
833	ان الانسان لرہہ لکنود	819	مانا بقاری
833	گھوڑوں کی شہادت	820	ابتدائی الہام
834	انسان کی ناشکری	820	رجوع الی المقصود
835	مرض کا سبب	820	احسانات خداوندی
835	غلط فہمی کا ازالہ	821	انسان کی سرکشی
836	تذکیر بمابعد الموت	821	مخالفت کی انتہا
837	<b>القارعة</b>	822	تباہی کا اعلان
837	تلخیص مضامین	823	تاخیر کا سبب
837	یوم التغابن	824	<b>القدر</b>
837	تباہی عالم	824	تلخیص مضامین
838	نتائج اعمال	824	العروۃ الوثقی
839	<b>التکاشر</b>	824	شب قدر کی بزرگی
839	تلخیص مضامین	825	نزول قرآن
839	حقیقت اعمال	825	خصوصیات شب
839	کثرت طلبی	825	تنبیہ واعتبار
840	حقیقت اعمال	827	تلخیص مضامین
841	رجوع الی المقصود	827	نبی الانبیاء کی ضرورت
841	اگر حقیقت پیش نظر رہتی	827	تقسیم مذاہب
843	<b>العصر</b>	828	رسول من اللہ
843	تلخیص مضامین	829	اختلاف کیوں ہوا
843	کلید کامرانی	829	کیا تعلیم تھی
843	زمانہ کی شہادت	830	مخالفین کا انجام
843	طرق تذکیر	831	<b>الزلزال</b>
844	کامیاب لوگ	831	تلخیص مضامین

859	شکر نعمت	846	<b>الہمزہ</b>
860	اس کا نتیجہ	846	تلخیص مضامین
861	<b>الکافرون</b>	846	اخلاق اور دولت
861	تمہید	846	باہمی تصادم
861	انقطاع تعلقات	846	گمان باطل
861	ناممکن	847	نتیجہ
862	دامنی فیصلہ	848	<b>الفیل</b>
863	آخری اعلان	848	تلخیص مضامین
863	ادوار ثلاثہ	848	شعار الہیہ
864	یہ اعلان جنگ ہیں	848	واقعہ کی تفصیل
864	لکم دینکم ولی دین	849	قانون تغذیب ام
866	<b>النصر</b>	850	تشریح الفاظ
866	تمہید	850	ضروری تشریح
866	فوز و ظفر کا اعلان	851	نتائج و عبر
866	نصرت الہیہ کا اظہار	852	عیسائی اور مسلمان
867	اعلان وفات	853	<b>القریش</b>
867	دوسری توجیہ	853	تمہید
869	<b>اللہب</b>	853	صوفیائے کرام و علمائے عظام
869	تمہید	853	شوق تجارت
869	کفار کی ہزیمت	854	بصار و حکم
869	ابولہب	856	<b>الماعون</b>
870	درس عبرت	856	تمہید
871	<b>الاخلاص</b>	856	مالی قربانی
871	تمہید	856	زبانی دعویٰ
871	توحید خالص	857	حقیقت نماز سے غفلت
871	اللہ کی وحدانیت	857	ماعون
872	احد اور واحد	858	<b>الکوثر</b>
872	اللہ الصمد	858	تمہید
872	برابری کا دعویٰ	858	حیات ملی
873	نتیجہ	858	کوثر کا مطلب

880	قرآن حکیم کی تفسیر و تعبیر کا جامع اسلوب ...	874	الفلق .....
883	”مکاتب قرآنیہ“ کا قیام .....	874	تمہید .....
884	قرآنی تعلیم کے پھیلاؤ کی حکمت کا دوسرا پہلو: .....	874	جسمانی مضرات سے تعویذ .....
885	جمعیت الانصار کا قیام .....	874	توطیہ و تمہید .....
889	دفعہ دوم (۲) .....	875	رجوع الی المقصود .....
889	دفعہ سوم (۳) .....	875	خلاف فطرت سے پناہ .....
890	دفعہ چہارم (۴) .....	875	ضروریات زندگی فراہم ہوں .....
892	عام فہم ترجمہ قرآن کی ضرورت اور ترجمہ شیخ الہند .....	876	ناگہانی آفات .....
897	”نظارة المعارف القرآنیہ“ کا قیام پس منظر اور مقاصد .....	876	حاسد سے بچا .....
900	نمبر ۱۷: .....	877	الناس .....
901	نمبر ۱۸: .....	877	تمہید .....
901	نمبر ۱۹: .....	877	روحانی مضرات سے تعویذ .....
901	نمبر ۲۰: .....	877	شدید ترین دشمن .....
905	حضرت مولانا خواجہ عبدالحی فاروقی .....	878	صفات الہیہ .....
908	”تفسیر الفرقان فی معارف القرآن“ .....	878	پناہ کی طلب .....
912	حوالہ جات .....	879	ابتدا اور انتہا .....

## پیش لفظ

### یورپ سے تعلق

عرب کے رہنے والے عموماً تجارت کرتے تھے، اسی غرض کے لئے وہ دور دراز کے سفر اختیار کرتے تھے اور مال دولت لے کر اپنے گھروں کو واپس جاتے۔ ہندوستان میں بھی وہ برابر آتے رہتے اور مدت ہائے دراز سے ایک ملک کی چیزیں دوسرے میں منتقل کرتے، مگر اب آہستہ آہستہ ان کو یورپین قوموں نے میدان تجارت سے دھکیلنا شروع کیا، مغلوں کے زمانہ میں انہوں نے مختلف اطراف میں اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کر لیں اور آخر کار عرب شکست کھا کر بالکل پیچھے ہٹ گئے اور ہندوستان کا پورا بازار ان کے قبضہ میں آ گیا۔

ان کی تجارت کیا تھی؟ عام لوگ تو اس حقیقت کو کیا سمجھ سکتے تھے، مگر حساس دل، بیدار مغز اور دور بین ارباب سیاست اسی وقت تاڑ گئے تھے کہ اس تجارت کی تہ میں کیا چیز کام آ رہی ہے۔ اورنگ زیب عالم گیر، سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان خوب سمجھتے تھے کہ یہ تجارتی کوٹھیاں تجارت کے پس پردہ کیا کیریئرہ دوانیاں کر رہی ہیں۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان لوگوں کے قدم اس سر زمین پر جم سکیں، مگر کسی نہ کسی طرح انجام کار ہندوستان کی سیاست کلیہً یورپ کے قبضہ میں آ گئی۔

یورپ میں اگرچہ مختلف قومیں آباد ہیں، مگر جہاں تک ان کی سیاست کا تعلق مشرق کے ساتھ ہے، اس میں وہ سب متحد ہیں اور ایک ہی انداز پر وہ مشرقی قوموں کے ساتھ سلوک کرتی ہیں، البتہ یہ ماننا پڑے گا کہ اس میدان میں سب سے آگے انگلستان ہے۔ اس نے ہندوستان کے اندر باقی تمام یورپین کو شکست دے کر تنہا اپنا اجارہ قائم کیا اور ڈیڑھ سو سال تک بلا شرکت غیرے اس سر زمین پر اپنا جھنڈا لہراتا رہا۔

### احساس حقیقت

انگریزوں نے جب اس ملک پر قبضہ کر لیا تو اپنی حکومت مضبوط و مستحکم کرنے کے لئے انہوں نے وہ سب کچھ کیا جو ایک اجنبی ظالم حکومت کا خاصہ ہے۔ ابھی ان کو اقتدار قائم کئے زیادہ زمانہ نہیں گذرا تھا کہ دہلی کے مردم خیز شہر میں شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے اس حقیقت کا احساس کر لیا کہ ان کی سیاست کا رخ کس طرف ہے، اس لیے انہوں نے اپنی سرکردگی میں ایک جماعت بنائی، جس کا مقصد وحید یہ تھا کہ انگریز کی سیاست کو قدم قدم پر آگے بڑھنے سے روکے۔ چنانچہ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ نے حضرت سید احمد بریلوی کو امیر المجاہدین بنا کر سرحد کی طرف بھیجا، مگر افسوس کہ اپنے ہی

ہاتھوں اس کوشش کو ناکام ہونا پڑا۔

۱۸۵۷ء میں ہندو مسلمانوں نے متح دھوکرا انگریز کے خلاف بڑا زبردست محاذ قائم کیا اور یہ ہندوستان کو اجنبی اقتدار سے آزاد کرنے کی پہلی متفقہ کوشش تھی، مگر انجام کار انگریز ہی غالب رہا اور رہی سہی ہندوستانی قوت کو کچل کر رکھ دیا گیا۔ اس مسلسل ناکامیوں کے باوجود یہاں کے رہنے والے ہمت نہ ہارے اور مل جل کر انڈین نیشنل کانگریس کے نام سے استخلاص وطن کیلئے کام کرنے لگے۔ اس سعی و جہد کی پوری تاریخ آپ کے سامنے ہے جسکے دہرانے کی ضرورت نہیں۔

## قرآن کا ذوق

غالباً ۱۹۱۲ء کا واقعہ ہے کہ مولانا عبید اللہ سندھی قدس سرہ اپنے استاد شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ سے ملنے دیوبند آئے ہیں۔ ان دنوں وہاں تعلیم پارہا تھا۔ مولانا کے علم و فضل و ذکا، بیدار مغزی اور سیاست دانی سے دارالعلوم کا بچہ بچہ واقف تھا، جیسے ہی ان کے آنے کی خبر ملی، مولانا محمد میاں المعروف بہ مولانا منصور مجھے ان کی خدمت میں لے گئے۔ کہہ نہیں سکتا کہ ان سے مل کر کس قدر مسرت و شادمانی اور اطمینان قلب نصیب ہوا۔ اس کیفیت کی یاد اب تک میرے دل میں تازہ ہے۔ مولانا کو دیکھ کر خدا یاد آتا تھا۔ وہ جب تک رہے قرآن کریم اور حجة اللہ البالغہ کا درس برابر ہوتا رہا۔ سردی کی راتوں میں بارہا ایسا ہوا کہ عشاء کی نماز کے بعد جو درس شروع ہوا، تورات کے تین چار بج گئے اور استاد و شاگرد میں سے کسی نے بھی تھکن محسوس نہ کی۔

مولانا کافی دن تک رہے۔ دن رات یہی مشغلہ رہتا تھا۔ ان صحبتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن میں درس و فکر کا ذوق پیدا ہو گیا۔ دیوبند سے فارغ ہو کر میں میرٹھ کالج میں عربی کا پروفیسر ہو گیا اور مولانا نے مسجد فتحپوری دہلی کے شمالی کمروں میں “نظارة المعارف القرآنیہ” کو قائم کیا۔ میں ہر شنبہ کی شام آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا اور پیر کے روز میرٹھ واپس جاتا۔ آخر مولانا افغانستان کو روانہ ہو گئے اور میں تین سال کے بعد کالج کی پروفیسری چھوڑ کر کلکتہ چلا گیا، جہاں حضرت مولانا ابوالکلام آزاد “دارالارشاد” میں شب کے وقت قرآن کریم کا درس دیا کرتے تھے اور ایک عجیب و دلنریب ایمانی کیفیت قلوب و اذہان میں پیدا کرتے تھے۔

## ریشمی خطوط

۱۹۱۶ء کے اوائل ہی میں ریشمی خطوط اور غالب نامہ کے سلسلہ میں طول و عرض ملک میں تلاشیاں اور گرفتاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ حضرت مولانا ابوالکلام رحمۃ اللہ علیہ کو تو حکومت نے “رائچی” میں نظر بند کر دیا اور مجھے یہ حکم ملا کہ لاہور شہر کی میونسپل حدود سے باہر نہ جاؤں اور پنجاب سی، آئی، ڈی کے دفتر میں ہفتہ وار اپنی حاضری کی اطلاع دیا کروں۔ آخر مارشل لا کا مشہور حادثہ فاجعہ ہوا، بادشاہی مسجد کا سب سے پہلا مقدمہ تھاجو سپیشل ٹریبونل میں پیش ہوا،



اخباروں کے اندر اسکا فیصلہ سنا دیا گیا۔ مجھے ”عمور در یائے شور“ اور ”ضبطی جائد اد“ کی سزا ملی اور فیصلہ کے آخر میں یہ بھی لکھا گیا کہ اگر یہ رحم کی درخواست کرے گا تو اسکی سماعت نہ ہوگی۔ ۱۵ دن لاہور سینٹرل جیل میں رہنے کے بعد ملتان سینٹرل جیل بھیج دیا گیا۔

گرمقاری سے دو ایک روز پہلے میں نے خواب دیکھا کہ ملک نصر اللہ خاں عزیز ایڈیٹر اخبار ”کوثر“ اور میاں ریاض بی اے کو اکھاڑا بوٹا مل لاہور میں قرآن پڑھا رہا ہوں۔ پہلے سورہ یوسف کی تفسیر کا درس دیا پھر سورۃ العصر کا، اگلے دن یہ دونوں جو اس وقت اسلامیہ کالج کے طالب علم تھے میرے پاس آئے، تو میں نے اپنا خواب ان سے بیان کیا، انہوں نے بتایا کہ ہم تو اپنا اپنا خواب بیان کرنے آئے تھے۔ ہم تینوں کے خواب میں ذرہ برابر فرق نہ تھا۔ میں نے کہا کہ گرمقاری کا زمانہ بالکل قریب تھا، آپ تو اوصی بالحق اور توصی بالصبر پر پوری قوت کے ساتھ عامل رہیں۔ انشاء اللہ فتح و کامرانی ہمارے ہم رکاب ہوگی۔

ملتان سینٹرل جیل میں فرصت کا تمام وقت قرآن کریم کے لئے وقف تھا۔ بنی اسرائیل کے واقعات و حوادث بار بار سامنے آتے تھے۔ ان کی پوری تاریخ ازبر تھی اور فرعون نے جو کچھ ان کے ساتھ کیا تھا، وہ بھی مخفی نہ تھا۔ میں دیکھتا تھا کہ ایک ایک آیت ہندوستانیوں اور انگریز پر صادق آرہی ہے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قرآن کریم نے بنی اسرائیل اور فرعون کے حالات بیان کر کے پیشین گوئی کے طور پر ہم ہندوستانی مسلمانوں کی پوری زندگی معجزانہ انداز میں بیان کر دی ہے۔ انگریز ہمارے ساتھ وہی کر رہا ہے جو فرعون بنی اسرائیل کے ساتھ کر رہا تھا۔ اگر ہم گذشتہ ڈیڑھ سو سال کی تاریخ اپنے سامنے رکھ لیں، تو ہم یقیناً اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ انگریز اور فرعون میں کوئی فرق نہ تھا۔ دونوں کی سیاست ایک ہی طرح کی تھی۔ اس لیے لازمی تھا کہ نتیجہ بھی ایک ہی قسم کا نکلے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ

یہ تاثرات تھے جو میرے دل میں پیدا ہوتے رہے۔ ملتان سینٹرل جیل سے نکلنے کے بعد جب میں لاہور آیا تو ترک موالات کی تحریک اپنے پورے شباب پر تھی۔ جامعہ کے قیام کے لیے حضرت شیخ الہند قدس سرہ دیوبند سے علی گڑھ گئے اور میں لاہور سے۔ مولانا محمد علی مرحوم، حضرت شیخ الہند قدس سرہ اور حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے مجھے حکم دیا کہ میں جامعہ میں قرآن کریم کا درس دوں، جس خدمت کو میں اس وقت تک انجام دے رہا ہوں۔

علی گڑھ میں مجھے ان تاثرات کے قلم بند کرنے کا موقع ملا جن کو میں نے ”بصائر“ کے نام سے شائع کر دیا۔ یہ میری پہلی کوشش تھی جو کتاب کی صورت میں ظاہر ہوئی، مگر ارباب ذوق نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور دیکھا کہ ان کے حالات اس میں پورے پورے بیان کر دیئے گئے ہیں۔ اس کے بعد یہ کتاب کئی مرتبہ چھپی۔ ادھر ۱۹۴۷ء کے فسادات میں مکتبہ

جامع کو قروں باغ میں آگ لگادی گئی، تو اس میں نہ صرف میری تمام مطبوعات نذر آتش ہو گئیں بلکہ کئی نئی کتابوں کے مسودات کو بھی راکھ کا ڈھیر ہونا پڑا۔

طبع جدید

اب جب ملک میں سکون پیدا ہوا اور حالات رو بہ اصلاح ہونے لگے، تو احباب نے پیہم اصرار کیا کہ اس کو پھر سے شائع کروں، مگر ادھر تو ہمت ٹوٹ چکی تھی اور اس کا کوئی نسخہ نہ ملتا تھا۔ اس لیے میں خاموش ہو گیا اور سمجھا کہ بلا ٹل گئی، مگر یہ بات نہ تھی۔ تقاضے ہو رہے تھے اور ان کی قوت بڑھ رہی تھی کہ اتفاق سے حامد علی خاں صاحب ناظم مکتبہ کی سعی و کوشش سے اس کا ایک نسخہ مل گیا جو حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب کے لطف و کرم کے طفیل ہدیہ قارئین کرام ہو رہا ہے۔

عبداللہ الحی کان اللہ لہ

۷ ار رمضان ۱۳۶۸ھ

۱۴ جولائی ۱۹۴۹ء

جامعہ نگر دہلی

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
الْحَمْدُ لِلَّهِ وَسَلَامٌ عَلَى عِبَادِهِ الَّذِينَ اصْطَفَى

## باب نمبر ۱ قصص القرآن

### فلسفہ تاریخ

قرآن کریم میں گزشتہ امتوں کے واقعات و حوادث بیان کئے گئے ہیں۔ ان قصوں کے بیان کرنے میں اس کتاب عزیز کا ایک اندازِ تبلیغ یہ ہے کہ وہ عموماً واقعہ کے انہیں اجزاء کو بیان کرتا ہے جو نتائج و عبرت اور موعظت و موضوعِ حکایت کے لحاظ سے قصہ کے ضروری و ناگزیر اجزاء ہیں۔ اور ان چیزوں کو بالکل چھوڑ جاتا ہے جن کے بیان سے موضوعِ استدلال و مقصدِ موعظت کو کوئی تعلق نہیں۔ اس کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ توریت سامنے رکھ لی جائے اور کسی مشترک قصہ کو دونوں میں دیکھا جائے۔ تورات کا مقصد بیانِ قصص سے عبرت و موعظت اور استخراج و عرضِ نتائج نہ تھا، اس لیے وہ ایک مؤرخ و راوی کی طرح اول سے آخر تک تمام واقعات بیان کرتی ہے اور اس باب میں صرف جمع و استقصاء و احاطہ کو پیش نظر رکھتی ہے۔ نفع و عدم نفع، و احتیاج و عدم احتیاج کو نہیں، برخلاف اس کے قرآن کریم کا مقصد ”کتاب پیداؤں و خروج“ کی طرح جمع واقعات و تاریخ نہیں ہے، بلکہ ہدایت و موعظت۔ وہ کسی قصہ کو لیتا ہے تو اس لیے نہیں کہ مؤرخ کی طرح مرتب کر دے، بلکہ اس لئے کہ ان سے کسی خاص تعلیم کے لیے استشہاد کا کام لے، حفظ واقعات و تاریخ دنیا کے لیے بیکار ہے بجز اس کے کہ اس کے نتائج مستقبل میں کام آئیں۔ فلسفہ تاریخ کا یہی مقصد بیان کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید نے اسی کو پیش نظر رکھا ہے۔ وہ اقوام و امم کے مشہور ایام و سنین و انقلابات سے استخراجِ نتائج و استنباطِ شواہد و تعلیل و توجہ امور کرتا ہے، اسی کا نام بصائر و موعظت ہے اور اس معنی میں دنیا کے پاس قصصِ اولین کے لیے بجز قرآن کے اور کوئی کتاب نہیں۔ قَدْ جَاءَكُمْ بَصَائِرُ مِنْ رَبِّكُمْ فَمَنْ أَبْصَرَ فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا (۱۰۴:۶) تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس روشن دلیلیں پہنچ چکی ہیں، تو جس نے دیکھا، اس نے بھلا کیا اور جو اندھا بنا رہا، اس نے اپنے حق میں برا کیا۔

### سبب اختصار

اختصار بیانِ قصص و عدم اعتناء بہ بعض جزئیات واقعہ کی ایک علت تو یہ ہے۔ کہ دوسری ایجازِ بلاغت و عدم اعادہ

و تکرار جزئیات ہے، یعنی جن جزئیات کو سامع قرینہ سے خود سمجھ لے گا، کیونکہ انکی طرف پہلے اشارہ ہو چکا ہے، ان کا اعادہ بالکل ترک کر دیا جاتا ہے۔ جو جزئیات قصص ضمناً واضح ہو جاتے ہیں ان کی طرف مستقلاً اشارہ نہیں کیا جاتا، یا جن الفاظ اتصال و ربط کو بیان و قرینہ بتلا رہا ہے اس کو ترک کر دیتا ہے۔

ایک اور قسم ہے یعنی تیسری۔ قرآن مجید میں بڑا حصہ قصص کا بنی اسرائیل و اہل کتاب کے متعلق ہے۔ یہ قصص نہایت شرح و بسط سے روایات یہود میں موجود تھے اور یہود و نصاریٰ عموماً ان سے واقف تھے۔ پس قرآن مجید ان کے بعض اجزا کو اس بنا پر چھوڑ جاتا ہے کہ سامع ان کے بیان کا محتاج نہیں اور پورا قصہ اس کے علم میں موجود ہے، صرف اشارہ کافی ہو گا۔ اشارہ کر کے اس کے ذہن کو اس نتیجہ کی طرف پھیر دیا جائے جو اس قصہ میں موجود ہے۔ مگر غفلت و ضلالت کی وجہ سے وہ معرض ہے۔ مخاطب کے لیے اس میں کاوش اور دلچسپی بھی ہے، ورنہ وہ ایسی باتوں کے سننے سے گھبر جائے جو اس کو پہلے سے بصرح تمام معلوم ہیں۔

### دو اور مقصد

پس قصص معلومہ و مشہورہ اہل کتاب کے بیان میں قرآن ارشادات پر اکتفا کرتا ہے، البتہ اس سلسلہ میں اس کے دو مقصد اور بھی ہیں، اکثر واقعات ایسے تھے جن کی روایت و کتابت میں سخت غلطیاں پڑ گئی تھیں۔ یا راویوں اور کاتبوں کے ادہام و رسوم و عوائد سے مختلط ہو گئے تھے یا عدم اسباب نامہ حفظ کی وجہ سے بعض کڑیاں معدوم ہو گئی تھیں یا تقلید و پرستش قدامت کی وجہ سے مکتوب تورات پر روایات احبار و علماء تفسیر و تاویل شرح کو مقدم کر دیا تھا۔ سوان امور کی اصلاح و تصحیح بھی قرآن کریم نے اپنے اعمال مہمہ میں داخل کی، کیونکہ اختلاف کے لیے حکم، اور ظنون و ادہام کے لیے وہ کتاب مبین تھا۔ پس جن قصص میں اور قصہ کے جن حصص میں ایسے اغلاط پیدا ہو گئے تھے، ان کو خاص طور پر بیان کر کے، اصلیت مستورہ کو واضح کر دیا ہے۔

یا بعض عقائد کی غلطیاں تھیں جو بعض واقعات کی بنا پر پیدا ہو گئی تھیں اور ان کی وجہ سے لاکھوں انسان ضلالت میں مبتلا ہو گئے تھے، تو بیان واقعات کے ضمن میں ان کی حقیقت بھی کھول دی اور اہل کتاب پر واضح کر دیا کہ ان کی معلومات تاریخی اس بارے میں لائق احتجاج نہیں۔

اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ قرآن مجید قصص اہل کتاب کو جب بیان کرتا ہے، تو اس کا انداز اور مقصد بیان کیا ہوتا ہے، مختصر جملوں میں یہ کہ:

(الف) استدلال و موعظت وغیرہ، اور یہ عام ہے۔

(ب) تصحیح بعض واقعات مہمہ۔

(ج) رد بعض عقائد مبنی علی القصص۔

ان تینوں صورتوں میں وہ صرف ان ہی کلموں سے تعرض کرتا اور بیان کرتا ہے، جن سے استدلال و موعظت یا تصحیح و اقعات یا تصحیح عقائد مقصود ہے۔ باقی کے لیے مخاطبین کے علم اور قصص کی شہرت پر اعتماد کرتا ہے۔

### اقسامِ ثلثہ

پس قرآن مجید کے اختصار بیان کی تین قسمیں ہوئیں۔

(۱).... مقصود تاریخ نہیں، بلکہ بعض ایام و سنین مشہورہ عالم سے استدلال و استشہاد اور بعض نتائج عبرت و ہدایت

کے لیے نظائر و امثال و استقراء تاریخی، اس لیے صرف مطلوبہ اجزاء کو لے لیا۔

(۲).... ایجاز بلاغت، و عدم تکرار غیر ضروری، و قناعت بہ قرآن و دلالت معنوی۔

(۳).... مخاطبین میں وہ واقعات شہرت رکھتے ہیں اور ان کی تفصیل ان کے پاس موجود ہے، پس اشارات پر اکتفا اور

باقی کے لئے سامع کے علم پر اعتماد، الا یہ کہ تصحیح و اقعات یا تصحیح عقائد مقصود ہو اور اس لیے باوجود علم مخاطبین ان

کو اغلاط سے الگ کر کے صورت صحیحہ میں جلوہ گر کیا جائے۔

پہلی قسم کی مثال میں تقریباً تمام حصہ قصص پر نظر ڈالیے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام و بنی اسرائیل کے واقعات تورات کی

چار کتابوں میں بیان کئے گئے ہیں۔ کیونکہ مقصود تاریخ محض تھا۔ لیکن قرآن کریم نے جس قدر بیان کیا ہے وہ زیادہ سے

زیادہ چار صفحات میں آسکتا ہے، کیونکہ مقصود عبرت و موعظت و استدلال و استشہاد و جمع نتائج تھا، قرآن صرف حضرت

موسیٰ کی پیدائش، خروج، محاربہ فلسطین و عمالقہ اور پھر بعد از موسیٰ میں سے صرف قصہ طالوت و عہد دادو سلیمان کو بالا

اختصار بیان کرتا ہے اور ان کے نتائج پر توجہ دلا کر دوسری طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔

حضرت لوط علیہ السلام کے واقعات کتاب پیدائش کے تین صفحات میں آئے ہیں۔ لیکن قرآن حکیم تمام سوانح لوط علیہ السلام

میں سے صرف اسی قدر حاصل سخن لے لیتا ہے کہ:

وَلَمَّا جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا سِيقَهُمْ وَصَاقَ بِهِمْ ذُرْعًا وَقَالَ هَذَا يَوْمٌ عَصِيبٌ ۖ (۱) وَجَاءَهُ قَوْمُهُ يُهْرَعُونَ إِلَيْهِ ۖ

وَمِنْ قَبْلُ كَانُوا يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ ۖ قَالَ لَیْقَوْمٌ هَؤُلَاءِ بَنَاتٍ هُنَّ أَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَلَا تُخْزَوْنَ فِي صَیْغِهِ ۖ

أَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَشِيدٌ ۚ (۲) قَالُوا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِي بَنَاتِكَ مِنْ حَقٍّ ۖ وَإِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نَدِيدُ ۚ (۳) قَالَ لَوْ أَنَّ

لِي بِيَكُم قُوَّةٌ أَوْ آوِیُّ إِلَىٰ رُكْنٍ شَدِيدٍ ۚ (۴) قَالُوا لَیْلُوطُ إِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَصْلُوَا إِلَيْكَ فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ اللَّیْلِ

وَلَا يَلْتَفِتْ مِنكُمْ أَحَدٌ إِلَّا أَمْرَاتَكَ ۖ إِنَّهُ مُصِیْبُهَا مَا أَصَابَهُمْ ۖ إِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ۖ أَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِیبٍ

ۚ (۵) فَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَابًا مِّن سِجِّیلٍ ۖ مَّنْضُودٌ ۚ (۶) مُّسَوَّمَةٌ عِنْدَ

رَبِّكَ ۖ وَمَا هِيَ مِنَ الظَّالِمِينَ بِبَعِيدٍ ۚ (۷)

اور جب ہمارے فرشتے لوط کے پاس آئے، تو وہ ان سے غمناک اور تنگ دل ہوئے اور کہنے لگے کہ آج کا دن بڑی مشکل

کادن ہے اور لوط کی قوم کے لوگ ان کے پاس بے تحاشہ دوڑتے ہوئے آئے اور یہ لوگ پہلے ہی سے برے کام کیا کرتے تھے۔ لوط نے کہا کہ بھائیو! میری لڑکیاں ہیں یہ تمہارے لیے پاک ہیں، تو خدا سے ڈرو اور میرے مہمانوں کے بارہ میں میری آبرو نہ کھو، کیا تم میں کوئی بھی شائستہ آدمی نہیں۔ وہ بولے کہ تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری بیٹیوں کی ہمیں کوئی حاجت نہیں اور جو ہماری غرض ہے اسے تم جانتے ہو۔ لوط نے کہا اے کاش! مجھ میں تمہارے مقابلہ کی طاقت ہوتی یا میں کسی مضبوط قلعہ میں پناہ پکڑ سکتا، فرشتوں نے کہا کہ لوط ہم تمہارے پروردگار کے فرشتے ہیں، یہ لوگ ہر گز تم تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ تو کچھ رات رہے سب اپنے گھر والوں کو لے کر چل دو اور تم میں سے کوئی شخص مجھے پھر نہ دیکھے، مگر تمہاری بیوی کہ جو آفت ان پر پڑنے والی ہے وہی اس پر پڑے گی ان کے وعدے کا وقت صبح ہے، اور کیا صبح کچھ دور ہے۔ تو جب ہمارا حکم آیا، ہم نے اس بستی کو الٹ کر نیچے اوپر کر دیا اور ان پر پتھر کی تہ بتہ کنکریاں برسائیں جن پر تمہارے پروردگار کے ہاں سے نشان کئے ہوئے تھے اور وہ بستی ان ظالموں سے کچھ دور نہیں۔

اب غور کرو، سارے قصہ لوط علیہ السلام کا حاصل ہے اور جتنا واقعہ بیان کیا ہے اس کے انداز بیان خواتیم آیات اور جابجا کے ارشادات میں کس طرح ہدایت و تنبیہ و موعظہ و بصیرت کو ملحوظ رکھا ہے۔ برخلاف اس کے صفحات تورات ان حکم و ابصار سے یکسر خالی ہیں، البتہ نہایت تفصیل سے ایک بے اثر قصہ جمع کر دیا ہے۔ لایسن ولا یغنی من جوع۔ اسی طرح قصہ نوح و قصہ طالوت کو دیکھئے اور مقابلہ کیجئے۔

حضرت لوط وغیرہم کا نسب نامہ، وطن کی حالت، قوم کی بدکاریوں کے مشرع و واقعات، آپس کا سوال و جواب، بعد از عذاب کی حالت، ان تمام امور کو قرآن نے بالکل نظر انداز کر دیا ہے اور ہمیشہ بہ تتبع قرآن ہر حکیم اجتماعی نظر انداز کر دے گا۔

### احسن القصص

دوسری قسم کی مثال بھی تمام حصہ قصص میں دیکھی جاسکتی ہے۔ سورۃ یوسف کو دیکھے، غیر ضروری ٹکڑوں کو کس طرح نظر انداز کر دیا ہے، بھائی مشورہ کرتے ہیں کہ باپ سے یہ جا کر کہیں گے، اب چاہئے کہ ان کا باپ کے پاس جانا اور طے شدہ مشورہ کے مطابق باتیں کرنا بھی بیان کیا جائے۔ داستان سراسر اس قسم کے ٹکڑوں کو ہمیشہ دو جگہ دکھلائے گا، ایک مشورہ کے وقت اور ایک ملاقات پدر کے وقت۔ تورات میں ایسا ہی ہے، لیکن قرآن صرف ایک موقعہ کو لے لیتا ہے اور چونکہ دوسرے موقع پر اسی کے مطابق حکام ہوئے، اس لئے اس کو بیان نہیں کرتا:

إِذْ جَعَلْنَا إِلَىٰ آبَائِهِمُ الْقَوْلَ فَقُولُوا يَا أَبَانَا إِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ وَمَا شَهِدْنَا إِلَّا بِمَا عَلَّمْنَاهُ وَمَا كُنَّا لِنُغَيِّبَ حَفِظِينَ ۝ وَنَقْلُ الْقُرْآنِ الَّتِي كُنَّا فِيهَا وَالْعَذِيرُ الَّتِي أَقْبَلْنَا فِيهَا ۝ وَإِنَّا لَصَدُوقُونَ ۝ اب اس کے بعد ہی باپ کا جواب ہے۔  
قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْرًا ۝

اس دوسری قسم میں اس کو بھی دیکھئے کہ جس مقام پر اشخاص کے ناموں سے کوئی خاص نتیجہ یا اثر نہیں مرتب ہوتا،

وہاں ان کے نام بھی نہیں لیے جاتے، یوسف کے بھائیوں کے نام نہیں بتلائے، کیونکہ ان سے کوئی فائدہ نہ تھا، اور اہل کتاب کو معلوم، اسی طرح وہ مقامات جہاں قال، قالوا اجاب کو مخذوف کر دیا ہے، مثلاً سورۃ مومنون میں فارسلنا فیہم رسولاً منہم، ان اعبدا للہ الخ “ان اعبدا للہ” رسول کا قول ہے، مگر بیان نسبت قولی کو ترک کر دیا، کیونکہ قرآن سے معلوم ہے۔ بصورت عام چاہئے تھا، قال اعبدا للہ، الخ۔

### حضرت عیسیٰ علیہ السلام

تیسری قسم کی بنا پر بھی تمام قصص اہل کتاب پر نظر ڈالیے، ایک بڑا نمونہ سورہ یوسف ہے۔ قرآن مجید بقیہ حصص کے لیے معلومات مخاطبین یعنی اہل کتاب پر اعتماد کرتا ہے، الا یہ کہ تصحیح واقعات و رفع اختلافات، و رد عقائد باطلہ کی ضرورت پیش آجائے، اس کی عمدہ مثال حضرت مسیح کا قصہ ہے۔ سورۃ مریم اور بعض حصص آل عمران سے مقصد حضرت مسیح کی سوانح عمری نہیں ہے، بلکہ بنی اسرائیل کی ضلالت، انکار و قتل انبیائی، دعوت موسوی کے ظہور آخری و تبشیر ظہور رسالہ کبری و دعوت عظمیٰ وغیرہ مقاصد پیش نظر ہیں۔ اسی سلسلہ میں ان غلطیوں کا ازالہ بھی ضروری ٹھہرا جو حضرت مسیح کے متعلق یہود و نصاریٰ میں پھیل گئی تھیں۔ یہود نے نبوت کا انکار کیا اور مریم صدیقہ پر زنا کا الزام لگایا، نصاریٰ نے ظہور مسیحی کی حقیقت گم کر دی اور “عبد اللہ” کو “ابن اللہ” ٹھہرایا، پس ضمناً جزئیات کو بھی بیان کر دیا جن سے ان گمراہیوں کا رد ہو جاتا تھا، مثلاً جزئیات پیدائش حضرت مسیح وغیرہ۔

واقعہ صلیب کی اصلیت گم ہو گئی تھی۔ پس ضرور تھا کہ تصحیح واقعہ کر دیا جائے، لہذا ماقتلوه و ما صلیبوه و لکن شبہ لہم فرمایا۔ اسی طرح حضرت سلیمان کے واقعات، قصص یہود و روایات طالمود میں بے حد مسخ ہو گئے تھے۔ یہودیوں کے یہاں حضرت سلیمان کی وہی حیثیت ہو گئی تھی، جیسے عوام مسلمانان ہند میں “امیر حمزہ” امی ایک فرضی ہیر و کی صد ہار مز خرافات و مافوق الفطرۃ عجائب و غرائب ان کی طرف منسوب ہو گئے تھے اور گھر گھر پھیل گئے تھے، کتاب اللہ تو دراء ظہود ہم تھی۔ زیادہ تر دار و مدار روایات احبار و مکتوبات طالمود تھا، جیسے آجکل قرآن سے زیادہ قصص الانبیاء مساجد کے جماع میں مقبول ہے۔ قرآن حکیم نے ان طغوتیوں کا انسداد کیا اور عہد سلیمان کے اصلی اور سچے واقعات بیان کر دیئے۔ قصہ ہاروت و ماروت اور انکار کفر سلیمان، جس کی تفسیر میں لوگ سرگرداں ہیں، اسی قسم کے ماتحت لا کر حاصل کیجئے۔

### اور قسمیں

ایک مرتبہ پھر ان قصص پر نظر ڈالیے، آپ دیکھیں گے کہ وہ اپنے موضوع و مقصد اور طرز استدلال و استنباط نتائج کی بنا پر کئی قسموں میں منقسم ہیں۔

(الف).... بعض سورتیں ہیں، جن میں ان قصص کے بیان کرنے سے ایک طرح کا استقرار تاریخی مقصود ہے، یعنی

یہ ثابت کرنا کہ آغاز نزول ہدایت سے لے کر اس وقت تک شریعت الہیہ کی یکساں تعلیمات نے ہمیشہ یکساں نتائج پیدا کئے ہیں، اور اس لئے ماضی کا استقراء ثابت کرتا ہے کہ حال و مستقبل میں بھی ان مؤثرات و اسباب سے وہی نتائج پیدا ہوں گے۔ سورہ ہود ملاحظہ کیجئے۔

جن سورتوں میں یہ طرز استدلال مقصود ہے، ان میں گزشتہ واقعات تاریخی ترتیب کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں، اور وہ بالکل ایک مرتب و منظم زنجیر کی طرح ہیں، جس میں یکے بعد دیگرے ایک ہی شکل و صورت کی کڑیاں رکھ دی گئی ہیں۔ (ب).... بعض سورتیں ہیں، جن میں یہ استقراء تاریخی مقصود نہیں ہے، بلکہ صرف کسی ایک عمل اور اس کے نتیجہ کی طرف دنیا کو متوجہ کرنا ہے جو بارہادنیامیں ظاہر ہو چکا ہے اور ہمیشہ وہی نتیجہ پیدا ہوا ہے۔ اس کے لیے ترتیب تاریخی کی ضرورت نہ تھی، بلکہ صرف گزشتہ واقعات میں سے زیادہ واضح، زیادہ مؤثر، زیادہ جامع اور مخاطبین کے معلومات و فہم سے زیادہ اقرب حوادث کا چن لینا کافی تھا۔ چنانچہ ان سورتوں کا انداز یہی ہے، اور تم پاؤ گے کہ ان میں تاریخی ترتیب بالکل مفقود ہے۔ سورہ شعراء کو دیکھئے۔

(ج).... کہیں وحدت ادیان و توحید شرائع مقصود ہے، اور یہ ثابت کرنا ہے کہ وہ ایک ہی شریعت الہیہ ہے، جس کی طرف برابر ہر ظہور نے دعوت دی اور سب کی دعوت کا مقصد قیام دین الہی و عدم تفرقہ و اختلاف تھا، چنانچہ سورہ شوریٰ کا یہی موضوع اصلی ہے۔

### رجوع الی المقصود

گزشتہ اوراق میں ہم نے بڑی حد تک قصص القرآن پر پوری تفصیل سے بحث کر دی ہے، اب اصل مقصد کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ قصوں میں پہلی قسم حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے واقعات و حوادث تھے، اس رسالہ میں ہم اپنے مباحث کو صرف بنی اسرائیل ہی تک محدود رکھتے ہیں۔ ان حالات و واردات کے بیان کرنے سے ہمارا صرف یہ مقصد ہے کہ کتاب عزیز کے بعض پہلوؤں کو ممتاز و نمایاں کیا جائے اور ارباب نظر و بصیرت پر یہ کیفیت واضح ہو جائے کہ تاریخ ہمیشہ اپنے آپ کو دہراتی ہے، اگر چشم بصیرت واہو، تو ہم اس وقت بھی قصہ فرعون و موسیٰ کا تماشا ان آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔

ہم نے بنی اسرائیل کو قصص القرآن کی اولین صف میں لا کر کھڑا کیا، اور سب سے پہلے ان ہی کے سوانح و حالات سے بحث کی، اس انتخاب کا سبب بالکل واضح ہے۔ قرآن حکیم نے سورہ بنی اسرائیل میں بتایا ہے کہ بنی اسرائیل پر غفلت و ضلالت کے دو سب سے بڑے درآئے، اس لیے دو ہی مرتبہ عام بربادی چھائی، اور ان کو عذاب دینے کے لئے دو جابر و قاہر قومیں مسلط ہوئیں۔ پہلی بربادی بخت نصر والی بابل کے ہاتھوں ہوئی اور دوسری نیش قیصر روم کے ہاتھوں۔

وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَءِيلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا ۝ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ



أُولَٰئِكَ بِمَا عَصَوْا عَنْكُمْ عِبادَ اللَّهِ أَتَوَّلُوا الْأُولَىٰ بَأْسِ شَدِيدٍ فَجَاسُوا خِلَلِ الدِّيَارِ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُولًا ۝

اور ہم نے بنی اسرائیل سے اسی کتاب میں صاف کہہ دیا تھا کہ تم ضرور ملک میں دودفعہ فساد کرو گے اور دونوں دفعہ ملک پر بڑی زیادتیاں بھی کرو گے، تو جب ان فسادوں میں پہلے فساد کا وقت آیا، تو ہم نے تمہارے مقابلہ میں اپنے ایسے بندے اٹھا کھڑے کیے جو بڑے سخت گیر تھے اور وہ تمہارے شہروں کے اندر پھیل گئے اور خدا کا وعدہ پورا ہونا ہی تھا۔ بنی اسرائیل کی پہلی بربادی خود ایشیا ہی کی ایک قوم کے ہاتھوں ہوئی، یعنی اہل بابل کے ہاتھوں اور دوسری کا ظہور یورپ سے ہوا، یعنی روم۔

رسول اللہ ﷺ نے جہاں ماور صد ہا امور پر پیشین گوئی کے طور پر روشنی ڈالی اور وہ سب کے سب حرف بہ حرف ثابت ہوئے، اسی طرح آپ نے ارشاد فرمایا۔

لیاتین علی امتی ما ائی علی بنی اسرائیل حذو النعل بالنعل۔

میری امت پر بھی وہ سب کچھ گزرنے والا ہے جو بنی اسرائیل پر گذر چکا ہے۔

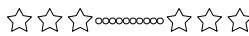
ٹھیک اسی طرح فتنہ تاتار کے ظہور میں مسلمانوں کے لیے وہی معاملہ تھا جو بنی اسرائیل کی واسطے بخت نصر کے ظہور میں تھا۔ یہ فتنہ ایشیا کا تھا اور وہ ہو چکا ہے، دوسرا یورپ کا ہے جو ہو رہا ہے۔

قرآن کریم نے مختلف مقامات پر بنی اسرائیل کے متعلق نہایت ہی مفصل و مبسوط درس دیئے ہیں اور اس میں قوم کی اجتماعی و انفرادی خرابیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ مندرجہ بالا حدیث نے یہ بتا دیا کہ مسلمانوں میں وہ تمام باتیں پیدا ہو کر رہیں گی جن کا شکار بنی اسرائیل ہوئے۔ سورۃ بقرہ کی تفسیر میں ہم نے مسلمانوں اور یہودیوں کے حالات کا مقابلہ کر کے دکھایا ہے کہ فرزند ان اسلام ٹھیک ٹھیک یہودیوں کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔

فراعنہ مصر نے صدیوں تک بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنائے رکھا۔ ان کی فطری آزادی کو سلب کر لیا اور ان کو جانوروں کی سی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا تا آنکہ قدوس حق نواز نے اپنا دست اعانت دراز کیا، اور موسیٰ عمران کو فرعون کی تباہی و بربادی کے لئے بھیجا۔ آج اس زمانہ کے فراعنہ وہ سب کچھ مسلمانوں کے ساتھ کر رہے ہیں جو کئی ہزار برس قبل بنی اسرائیل کے ساتھ سرزمین مصر میں ہوا۔ وما یعقلها الا العلیون، وقلیل ماہم۔ ہم نے اسی حقیقت کو آئندہ اوراق میں بیان کیا ہے۔

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں

گفتہ آید در حدیث دیگران



## باب ۲

## فراعنہ مصر

## چھوت چھات

کنعان کا ایک اسرائیلی نوجوان سرزمین فراعنہ میں قدم رکھتا ہے، غلامی کی حالت میں وہاں فروخت کیا جاتا ہے۔ پھر وہی نوجوان عمل صالح کی قاہرہ قوت سے مصر کے تاج و تخت کا مالک بن جاتا ہے۔ فراعنہ مصر کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ مصریوں کو اس زمانہ میں غیر قوموں سے بڑی نفرت تھی، حتیٰ کہ ہندوؤں کی طرح چھوت کرتے تھے۔ توراۃ میں ہے کہ جب یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کے لیے دسترخوان چنوا یا اور انہوں نے اس کے لئے الگ اور ان کے لیے جدا، اور مصریوں کے لئے جو ان کے ساتھ کھاتے تھے علیحدہ چنا۔ اس لیے کہ مصری کی لوگ عبرانیوں کے ساتھ کھانا کھا نہیں سکتے، مصری اسے مکروہ جانتے ہیں۔“ (پیدائش ۳۴-۳۳)

ایسی قوم کی نگرانی میں بنی اسرائیل کو قریباً چار سو سال تک مصر میں مقیم رہنا پڑا۔ قبطیوں نے ان پر طرح طرح کے مظالم کیے۔ اس اجنبی رعایا کے تباہ و برباد کرنے میں انہوں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور اس طرح اللہ کی زمین، فراخی و وسعت کے باوجود اس قوم پر تنگ ہو گئی، تا آنکہ مالک السموات والارض کے ہاتھ نے حرکت کی اور ایک ہی آن میں فراعنہ مصر کی ظالمانہ حکومت کا خاتمہ کر دیا، اور آئندہ کے لئے یہ قانون بنادیا کہ جب کبھی کوئی فرعون اس کرہ ارض کی پشت پر نمودار ہو گا، اس کو سمندروں میں غرق کرنے کے لیے فوراً ایک موسیٰ پیدا کر دیا جائے گا، جو اس کو آنا فائتا ہی کے سمندر میں غرق کر دے گا۔ دنیا اس وعدہ الہی کے ماضی کو دیکھ چکی ہے، اب مستقبل کو دیکھنا باقی ہے۔ وکان وعداً مفعولاً۔

فرعون نے اس قوم پر جو جو مظالم کیے، ان کی الم انگیز داستان تو بہت طویل ہے اور ایک مبسوط تصنیف کی محتاج ہے۔ ہم نے فی الحال قرآن حکیم کے چند مقامات کو درس و فکر کے لیے چن لیا ہے، کہ ان سے استنباط و استخراج کیا جائے اور ارباب فہم و بصیرت ان نتائج و عبر کو آویزہ کو شش بنائیں۔

## قومیت متحدہ کی ضرورت

اقوام عالم کی موت و حیات، ترقی و تنزل، تسلط و تنزع اور سعادت و شقاوت کے جو اصولی اسباب و مراتب ہیں، ان میں سب سے اہم و اعظم ترین اتحاد و اشتراک عمل ہے، قوم کے تمام افراد اپنے آپ کو ایک ہی جسم کے اجزائے مختلفہ یقین

کریں۔ سب کا مقصد ایک ہی ہو، اسی کا عشق دامن گیر ہو اور اسی کی محبت کی زنجیریں سب کے پاؤں میں ہوں، مریں تو اسی کے لیے اور زندگی ہو تو اسی کی خاطر۔

پیکرش از قوم وہم جانشی ز قوم  
ظاہرش از قوم وپہنائش ز قوم

قرآن حکیم نے جابجا اتحاد و اجتماع کو زندگی کی سب سے بڑی بنیاد اور اصل قرار دیا ہے۔ اس نے سب سے پہلے عرب کو اور پھر تمام دنیا کو ان الفاظ میں مخاطب کر کے فرمایا:

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا ۚ (۳: ۱۰۳)

سب مل جل کر اور پوری طرح اکٹھے ہو کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو سب کے ہاتھ ہی ایک حبل اللہ سے وابستہ ہوں، اللہ کا یہ احسان یاد کرو کہ کیسی عظیم الشان نعمت ہے جس سے سرفراز کئے گئے، تمہارا حال یہ تھا کہ بالکل بکھرے ہوئے اور ایک دوسرے کے دشمن تھے، اللہ نے تم سب کو باہم ملا دیا اور اکٹھا کر دیا، پہلے ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اب بھائی بھائی ہو گئے۔

شارع علیہ السلام نے اسی بنا پر اسلامی زندگی کا دوسرا نام جماعت رکھا اور علیحدگی کو جاہلیت سے تعبیر کیا۔

من خراج من الطاعة وفارق الجباعة فبات، مات، ميتة جاهلية۔

جو اطاعت سے باہر ہو گیا اور اس نے جماعت کا ساتھ چھوڑ دیا پھر اسی حالت میں بغیر توبہ کے مر گیا، تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوئی۔

ترمذی میں ہے

من فارق الجباعة شذافا فکانا خلع ربة الاسلام عن عنقه۔

جو شخص بالشت بھر بھی جماعت سے باہر ہو، اس کا حکم یہ ہے کہ گویا اس نے اسلام کی اطاعت کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے خطبوں میں یہ حدیث بیان کرتے تھے۔

علیکم بالجباعة فان الشيطان مع الواحد، وهو من الاثنين ابعد۔

جماعت سے الگ نہ ہو، ہمیشہ جماعت بن کر رہو، کیونکہ جب کوئی تنہا اور الگ ہو تو شیطان اس کا ساتھی ہو گیا و انسان بھی مل کر رہیں تو شیطان ان سے دور ہے۔ ان میں اتحادی اور جماعتی قوت پیدا ہو گئی، اب وہ راہ حق سے نہیں بھٹک سکتے۔

اسی طرح: علیکم بالسواد الاعظم اور فانه من شذ، شذ فی النار۔ اور: ید الله علی الجباعة: اور: لایجمع الله امق علی الضلالة۔

تمہیں جماعت کے ساتھ رہنا چاہئے۔ اس لیے جو جماعت سے الگ ہو اودہ دوزخ میں ڈال دیا گیا۔ اللہ کی تائید و نصرت فقط جماعت کے ساتھ ہے۔ میری امت کو اللہ گمراہی پر جمع نہیں کر دے گا۔

اس بارے میں مشہور و معروف اور زبان زد خاص و عام ہیں۔

نماز میں جماعت پر زور دیا، ”اھدن ی“ کی جگہ ”اھدنا الصراط المستقیم“ فرما کر بتا دیا کہ قرآن کے نزدیک فرد اور فرد کی ہستی کوئی شے نہیں، ہستی صرف اجتماع اور جماعت کی ہے۔ جمعہ و عیدین کو اگر حقیقت بین نظر سے دیکھے تو اتحاد کی غرض نمایاں اور ممتاز نظر آئے گی۔ زکوٰۃ کی غرض و غایت ہی یہی تھی کہ جماعتی زندگی کی بقا و استحکام کی جانب فرزند ان تو حید کو متوجہ کیا جائے۔ شارع نے ”توخذ من اغنیائہم و تر دالی فقرا تہم“ میں اسی فلسفہ اجتماع کو بیان کیا تھا۔ حج میں مجملہ اور اسرار و مصالح کے ایک سب سے بڑی غرض و مصلحت یہی ہے۔ جب ایک شخص نے حضرت رسالت سے دریافت کیا کہ حج کسے کہتے ہیں، تو آپ نے فرمایا، ”الحج عرافۃ“، میدان عرفات میں اجتماع کا نام حج ہے۔ چنانچہ تمام ائمہ اعلام کا یہی مذہب ہے کہ جو شخص عرفات میں حاضر نہ ہو اس کا حج نہیں ہوتا۔

ہر ظالم و جابر اور اجنبی حکومت کی اولین سعی و کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح جائز و ناجائز طریقوں سے کام لے کر اپنی رعایا میں پھوٹ اور اختلاف ڈال دے، ان کے مختلف گروہ بن جائیں، ان میں اس قدر اختلافات پیدا ہوں کہ شب و روز ان میں مبتلا رہ کر ایک دوسرے کو فنا کرنے کی فکر میں رہیں۔ اگر ایک بھائی ترقی کرنے لگے تو دوسرا اسکے گرانے اور ذلیل کرنے کے درپے ہو۔ ہر وقت اپنی ہی قوم کے ذبح کرنے کی تجاویز پر غور و فکر ہوتی رہے۔ اس اختلاف و تفریق کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اجنبی حکومت کی بنیادیں مضبوط و مستحکم ہو جاتی ہیں، جو ہر وقت ان مختلف گروہوں کو آپس میں لڑاتی رہتی ہے اور ہر ضعیف جماعت کو قوی کے مقابلہ میں بھڑکا کر دونوں کی قوت کو پاش پاش کر دیتی ہے۔

اس خانہ جنگی کے باعث رعایا کے دل میں نہ تو کبھی شریفانہ جذبات پیدا ہوئے ہیں اور نہ ہی کبھی حریت و استقلال قومی کا انہیں خیال آتا ہے، بلکہ ہر فریق کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ یہی اجنبی حکومت ہمارے ملک پر قابض رہے اور بباگ دہل ہر جماعت اپنی کوتاہ فہمی اور کم عقلی کی وجہ سے اس کا اعلان کرتی ہے کہ ہماری زندگی صرف اس حکومت کے بقا و استحکام کے ساتھ وابستہ ہے، اس لیے تمام جماعتیں اپنے اپنے طور پر اس کے قیام کی خاطر ہر قسم کی غداری اور ملت فردشی کی مرتکب ہوتی ہیں اور نہیں دیکھتیں کہ وہ دراصل اپنے آپ کو تباہ و برباد کر رہی ہیں۔ قدرت کی جانب سے ہر قوم کو جارہانہ اور مدافعتی قوت و طاقت نوازش کی جاتی ہے، کہ حسب ضرورت اس کو غیروں کے مقابلہ میں صرف کیا جائے، لیکن آہ ثم آہ! اختلاف کے وقت یہی چیز اپنے بھائیوں کو غلامی و محکومی کی زنجیروں میں جکڑنے کے لیے صرف کی جاتی ہے۔ فیاللاسف و یاللعاد!

اپنے حقوق کی نگہداشت، حریت حقہ کی حفاظت اور ارتقاء ملت کا خیال دل سے حرف غلط کی طرح مٹ جاتا ہے۔ اجنبی حکومت خواہ کیسی ہی ظلم و جور کرنے والی اور ناانصاف و مفسدہ پرداز ہو، جسکے مظالم روز روشن کی طرح ”الم نشرح“ ہو چکے ہوں اور جس نے کبھی اپنے عہد کی پابندی نہ کی ہو، اختلاف و تفریق کے وقت اسی کو رحمت الہی قرار دیا جاتا ہے۔ خوشامد، چالپوسی اور تملق کے جذبات خبیثہ ان بد بختوں کی تمام انفرادی و اجتماعی زندگی کو فنا کر دیتے ہیں۔ سورہ قصص ان تحقیقوں کی طرف ہماری یوں راہنمائی کرتی ہے۔

إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضِعُّ طَائِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ ۚ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ﴿٥٠﴾

فرعون ملک مصر میں بہت بڑھ چڑھ رہا تھا اور اس نے وہاں کے لوگوں کے الگ الگ گروہ قرار دیئے تھے، ان میں سے ایک گروہ یعنی بنی اسرائیل کو اس قدر کمزور سمجھ رکھا تھا کہ انکے بیٹوں کو ذبح کر دیتا اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھتا، اس میں شک نہیں کہ وہ فساد یوں میں سے ایک فساد تھا۔ اس آیت میں فرعون کے چند مظالم بیان کئے گئے ہیں۔

(الف).... بنی اسرائیل کے سپاہیانہ جذبات کو فنا کرنے کے لیے فرعون نے سیاسی فریب اور مکاری کے ذریعہ اس میں بغض و عداوت، پھوٹ و نفاق اور باہمی انتقام کے امراض پیدا کر دیئے، ان کی جمعیت کو توڑ دیا، ان کی قومیت کو فنا کر دیا اور انکی اجتماعی قوت کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا، یہی مسئلہ توازن ہے۔

جب ایک قوم اختلافات و منازعات باہمی کا شکار ہو جائے تو اسکا مستقبل تاریک ہو جاتا ہے، اقبال کی جگہ اوبار، عروج کی جگہ تسفل، ترقی کی جگہ تنزل، عظمت کی جگہ ذلت، حکومت کی جگہ غلامی اور بالآخر زندگی کی جگہ موت اس پر چھا جاتی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جب کسی قوم پر خدا کی لعنت طاری ہوتی ہے تو وہ غلامی اور محکومی کی صورت میں ظاہر ہوا کرتی ہے۔ مفسرین کرام نے ضَرْبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةَ آيْنَ مَا تُنْقِضُوا إِلَّا يَحْبِلُ مِنَ اللَّهِ وَحَبْلُ مِنَ النَّاسِ (۳:۱۱۲) جہاں دیکھو ذلت ان کے سر پر سوار ہے، مگر اللہ کے عہد و پیمان کے ذریعہ سے اور نیز لوگوں کے عہد و پیمان کے ذریعہ سے کہیں ان کو پناہ مل گئی تو دوسری بات کی ہے، کی یہی تفسیر کی ہے۔ اور هُوَ النِّقَادُ عَلَى أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ (۶:۶۵) وہی خدا اس پر قادر ہے کہ تمہارے اوپر کی طرف سے کوئی عذاب تمہارے لیے نکال کھڑا کرے، کا مطلب یہی ہے۔

سورۃ انفال میں مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا:

وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَعْتَثْ سَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ

اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو، کہ آپس میں جھگڑا کرنے سے تم ہمت ہار دو گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

(ب).... فوجی طاقت: جب بنی اسرائیل میں مختلف جماعتیں پیدا ہو گئیں، تو اب فرعون کو یہ خیال دامن گیر ہوا کہ چوں کہ اس قوم میں ابھی تک کچھ لوگ بیدار دماغ، متحرک اعصاب اور مضطرب دل رکھتے ہیں اور سیاست کی چھپی ہوئی چالوں کے زہر آلود اثر کو محسوس کرتے رہتے ہیں، اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لڑکوں کو ذبح کر دیا جائے۔ نہ لڑکے زندہ رہیں گے نہ ان میں حریت و استقلال قومی کے خیالات پیدا ہوں گے۔ صبر و استقامت، ہمت و جوانمردی اور جوش فداکاری و سرفروشی یک قلم نابود ہو جائے گا۔ نوجوان ہی سے فوج بنتی ہے جو ہتھیار سنبھالتی ہے اور دشمنوں کے ساتھ میدان جہاد و قتال گرم کر کے اپنے حقوق کی حفظ و نگہداشت کرتی ہے۔ قتل کرنے سے لڑکوں کا نام و نشان باقی نہ رہے گا، فوجی طاقت فنا ہو جائے گی۔ حکومت کو رعایا کی جانب سے کسی قسم کا خوف و خطر باقی نہ رہے گا اور اس طرح یہ لوگ بے دست و پا ہو کر اس ظالمانہ حکومت کے ہاتھ میں آلہ بے جان بن جائیں گے اور اپنی فطری حرکت کو چھوڑ کر اس کے اشاروں پر چلیں گے۔

اس ظلم و جور اور قہر و استبداد کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنی اسرائیل کی فوجی طاقت پر عالم ممت طاری ہو گیا اور آن واحد میں نشو و ارتقا سے رک گئی۔

(ج) قلت افراد: لڑکوں کے ذبح کرنے سے فرعون کے پیش نظر ایک چیز یہ بھی تھی کہ بنی اسرائیل کی آبادی روز بروز کم ہوتی جائے، تاکہ بتدریج ان کی ترقی کی تمام راہیں بند ہو جائیں اور کچھ مدت کے بعد ان کا نام و نشان بہ حیثیت قوم کے حرف غلط کی طرح دنیا سے باطل ہو جائے۔

(د).... اخلاقی قوت: قوم، عبارت ہے اخلاق فاضلہ اور اعمال صالحہ سے، رسول کریم نے اپنی بعثت کی غرض و غایت ان الفاظ میں بیان فرمائی۔

”بعثت الائم مکارم الاخلاق“ میں عمدہ ترین اخلاق کی تکمیل و اتمام کے لئے بھیجا گیا ہوں۔ قوموں کی بنیاد مضبوط و مستحکم کرنے کے لیے چند چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً اس کے افراد آپس میں مل جل کر اور جماعت بن کر رہیں۔ سپاہیانہ جذبات اور جنگ جوینانہ احساسات رکھتے ہوں۔

فضائل اخلاق اور محاسن اعمال سے آراستہ ہوں۔

فرعون نے لڑکوں کو ذبح کیا، کہ بنی اسرائیل کی لڑکیاں آزادانہ عصمت فروشی کریں، ان کی اخلاقی قوت برباد ہو، ہر گلی اور کوچہ میں فاحشہ عورتوں کے چکلے ہوں جن کی نگرانی خود ارکان حکومت کے ذمہ ہو۔ انہیں کی سرپرستی اور ولایت میں بد عملی و بد کرداری کا بازار گرم ہو اور اس بد بخت قوم کی ہر لڑکی حاکم سے سند اجازت لے کر بازار میں اپنے حسن و جمال کی نمائش کر سکے، فوجی لوگ بغیر کسی ظاہری رکاوٹ کے اپنی خواہشات نفسانی کو پورا کر سکیں اور اگر ارکان حکومت کو دو شیزہ اور نوجوان لڑکیوں کی تلاش و جستجو ہو تو آسانی سے مل سکیں۔

(ہ).... نوجوان: اسے معلوم تھا کہ آزادی و حریت کی راہ میں بوڑھے ہمیشہ پیچھے رہتے ہیں۔ سن رسیدہ ہونے کی وجہ سے ان میں مصلحت، دوراندیشی اور عاقبت بینی آجاتی ہے۔ بات بات میں بحث و جدل کے عادی ہو جاتے ہیں۔ ان کی کمزور ہڈیاں ٹکلیفوں اور مصیبتوں کو برداشت نہیں کر سکتیں، اس لیے بچنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ قربانی اور ایثار کی اگر کوئی توقع ہو سکتی ہے تو صرف نوجوانوں سے جو دالہانہ و مضطربانہ نتائج و عواقب سے بے نیاز ہو کر اپنی ہر چیز حریت و استقلال قومی کے لیے قربان کر دیتے ہیں۔ بنی اسرائیل کے نوجوانوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم سے یہ جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ فرعون نے اس فتنہ کو روکنے کی یہ تدبیر کی کہ نوجوانوں کو ذبح کرنا شروع کر دیا۔

یہ مظالم آپ کے سامنے ہیں ان کو دیکھئے اور پھر گہری نظر سے دیکھئے۔ فرعون کیا چاہتا ہے؟ یہ کہ: قوم حریت و اجتہاد فکر سے محروم رہے۔ مذہب و اخلاق سے اجنبی اور فسق و فجور میں مبتلا ہو۔ اپنے آباؤ اجداد کے روشن کارناموں کو فراموش کر دے اور قومی روایات سے دور جا پڑے۔ غلامی اور محکومی کی بوجھل بیڑیاں اس کے پاؤں میں ہمیشہ کے لیے رہیں۔ اپنی قوم کی آزادی کے خیال سے محروم ہو کر غلامی پر قناعت کر لے۔

اپنے تمام اوقات بیکاری میں صرف کرے، اس میں سستی اور کاہلی پیدا ہو، جسم و جان کمزور و ناتوان ہوں۔ منافقت، بد عہدی اور ندامت نفس کا شکار ہو۔

اکبر مرحوم نے اپنے انداز خاص میں فرمایا ہے۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سو جھی۔

ارباب بصیرت خوب سمجھتے ہیں کہ اکبر نے کس طرح آیت کے نتائج و ثمرات کو اس شعر میں بیان کر دیا ہے جو یورپین تہذیب و شائستگی کا مغز اور نچوڑ ہیں۔

### اسباب حیات

جس قوم کے قبضہ میں سامان حرب ہو، وہ آلات جنگ کے استعمال سے واقف ہو، اور ہمیشہ رزم گاہوں میں شریک ہوتی ہو۔ وہی قوم زندہ رہتی ہے، اس کے قبضہ اقتدار میں ہر قسم کی طاقت ہوتی ہے، حاکمانہ طور پر زندگی بسر کرتی ہے اور کسی کو ہمت نہیں ہوتی کہ اس کے مقابلہ کا خیال بھی دل میں لاسکے۔ تمام دوسری قومیں مجبور ہوتی ہیں کہ اس کے ہر فرمان کے آگے اپنی گردنیں خم کر دیں۔

وتنکر ان شئنا علی الناس قولہم، ولاینکر القوم حین نقول۔

اور ہم اگر چاہیں تو لوگوں کی بات کا انکار کر دیں لیکن جب ہم کہیں تو کوئی ہماری بات رد نہیں کر سکتا۔ زمین و آسمان کی ہر چیز زندہ رہنے کی سعی و کوشش میں مصروف رہتی ہے، یہی تنازع للبقاء ہے اور اس کشمکش میں صرف اسی کو دائمی زندگی نصیب ہوتی ہے جس میں قوت و طاقت ہو اور اس لیے اصلح و امثل ہو، یہی بقائے اصلح ہے اور اس کا دوسرا نام ”انتخاب طبعی“ ہے۔

ٹھیک اسی اصول کے مطابق قرآن حکیم نے اس کش مکش حیات کو ان الفاظ میں بیان فرمایا۔

وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّى يَرُدُّوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا ۝

یہ کفار سدا تم سے لڑتے رہیں گے، یہاں تک کہ ان کا بس چلے تو تم کو تمہارے دین سے برگشتہ کر دیں۔

اس تصادم اور باہمی جنگ و جدل کا علاج قرآن حکیم نے اس طرح بیان کیا۔

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِنْ دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ (انفال ۶۰)

اور مسلمانو! سپاہیانہ قوت سے اور گھوڑوں کے باندھے رکھنے سے، جہاں تک تم سے ہو سکے کافروں کے مقابلہ کے لئے ساز و سامان مہیا کئے رکھو، کہ ایسا کرنے سے اللہ کے دشمنوں پر اور اپنے دشمنوں پر اپنی ڈھاک بٹھائے رکھو گے اور نیز ان کے سوا دوسروں پر بھی، جن کو تم نہیں جانتے اور ان کے جال سے اللہ خوب واقف ہے۔

اور یہ دائمی حکم نافذ کر دیا کہ وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَلِلَّهِ (انفال ۳۹) اور ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ ملک میں فساد باقی نہ رہے اور ایک خدا کا حکم چلے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان آیت کی تفسیریوں کی:

(الجهاد ماضی الی یوم القیامة)

مسلمانوں کے بقاء قیام کے لئے ضروری ہے کہ وہ فریضہ جہاد سے ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہ ہوں اور یہ فرض دائمی ہے کسی کے روکے نہیں رک سکتا۔

جب صحابہ کرام کی ایک جماعت میں یہ گفتگو ہوئی کہ: ای الامال احب الی اللہ ساری نیکیوں اور عبارتوں میں سب سے زیادہ کون سا عمل اللہ کے نزدیک محبوب مقبول ہے۔ تو اس کے جواب میں سورۃ صف نازل ہوئی جس میں فرمایا۔

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَانَهُمْ بَنِيَّاءُ مَرَضُوعُونَ ۝ (صف ۴)

اللہ ان لوگوں کو محبوب رکھتا ہے جو اس کی راہ میں صف باندھ کر اس استقامت اور جماد سے لڑتے ہیں، گویا ایک دیوار ہے جو تلواروں کے سامنے کھڑی کر دی گئی ہے۔ اور یہ دیوار بھی کیسی؟ ایسی جس کی ہر اینٹ دوسری اینٹ سے سیسہ ڈال کر جوڑ دی گئی ہو۔

جہاد فی سبیل اللہ کی فضیلت و برتری کے لیے صرف یہی ایک حدیث بس کرتی ہے جس کو امام بخاری نے اپنی صحیح حدیث میں روایت کیا ہے، جس سے معلوم ہو گا کہ ختم نبوت کے اعلیٰ ترین مرتبہ کے باوجود رسول اکرم ﷺ کس طرح



شہادت فی سبیل اللہ کی آرزو کرتے ہیں:

والذی نفسی بیدۃ لوددت ان اقتل فی سبیل اللہ ثم احمی ثم اقتل ثم احمی ثم اقتل۔  
خدا کی قسم اگر ممکن ہو تاؤں میں یہ چاہتا کہ اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں، پھر زندہ ہوں، پھر قتل کیا جاؤں، پھر زندہ ہوں پھر قتل کیا جاؤں، پھر زندہ ہوں پھر قتل کیا جاؤں۔ تاکہ اسکی راہ میں جان دینے کی لذت و سعادت ایک ہی مرتبہ ختم نہ ہو جائے۔

تبنت سلیبی ان نبوت بحبھا  
واھون شیء عندنا ما تبنت

ترجمہ: سلیبی نے چاہا کہ ہم اس کی محبت میں جان دیدیں اور جو اس نے خواہش کی وہ ہمارے نزدیک نہایت ہی آسان بات تھی۔

اگر کسی قوم کو فنانا منظور ہو تو اس کی آسان ترین صورت یہی ہے کہ اس سے آلات حرب چھین لیے جائیں۔ ہر قسم کے سامان جنگ کا استعمال ممنوع قرار دیا جائے اور قانونی طور پر اس کی خرید و فروخت بند کر دی جائے۔ اس طریق عمل کا یہ لازمی نتیجہ ہو گا کہ تمام قوم خود بخود بے دست و پا ہو جائے گی۔ اس کی بہادری کے تمام جذبات حقہ پر عالم ممت طاری ہو جائے گا۔ پھر اس قوم کے کروڑوں افراد ہوں گے جو بکریوں اور بھیڑوں کے ریوڑ سے زیادہ حقیقت نہ رکھتے ہوں گے۔ ایک اجنبی انسان ہو گا جو ان لاکھوں انسانوں پر حکومت کرتا ہو گا۔ رعب و ہیبت کا یہ عالم ہو گا کہ حاکم نام سنتے ہی کانپ جائیں گے۔

ہر وہ حکومت جس کی بنیاد ظلم و جور، جبر و استبداد اور قہر و غلبہ پر ہو، جو دلوں کے بجائے جسموں پر فرماں روائی کرتی ہو، جس کے تعلقات اپنی رعایا کے ساتھ محض تاجرانہ اصول پر مبنی ہوں، وہ ہمیشہ اسی قانون کی پناہ لیتی ہے اور اپنی ماتحت اجنبی رعایا سے ہر قسم کا سامان جنگ چھین لیتی ہے، قرآن حکیم ان حقائق عالیہ پر یوں روشنی ڈالتا ہے:

وَإِذْ نَبَّيْنَاهُ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكَ سُوءَ الْعَذَابِ (البقرة ۴۹)

اور اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے تم کو فرعون کے لوگوں سے نجات دی جو تم کو بڑی بڑی تکلیفیں پہنچاتے تھے۔  
اس بدترین عذاب کی تفسیر میں حسب ذیل امور داخل ہو سکتے ہیں جو بطور ”اعتبار“ کے اس آیت سے مستنبط ہو سکتے ہیں۔

(الف) فرعون نے بنی اسرائیل سے آلات حرب چھین لیے، اب وہ اپنی فطری حکومت کو چھوڑ کر حکام کے اشاروں پر چلتے، انہیں کی کہتے، ان کے احسانات کی یاد سے ان کی زبانیں نغمہ سنج رہتیں۔ چونکہ غلامی و محکومی کی وجہ سے تمام قوتیں بیکار ہو جاتی ہیں، اس لیے وہ دیکھتے تو ان کی آنکھوں سے، سنتے تو ان کے کانوں سے اور غور فکر کرتے تو انہیں کے القائے شیطانی کے مطابق۔ سچ ہے: فَإِنَّهَا لَا تَعْلَى الْاِكْبَارُ وَلَكِنْ تَعْلَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ (الحج ۲۲) بات یہ ہے کہ کچھ آنکھیں اندھی نہیں ہوا کرتیں، بلکہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہو جایا کرتے

ہیں، جو لوگ غلام و محکوم ہوتے ہیں ان پر ہر اعتبار سے یہ آیت صادق آتی ہے۔

لہم قلوب لا یفقہون بہا ولہم اعین لا یصرون بہا ولہم اذان لا یسمعون بہا اولئک کالانعام بل ہم اضل اولئک ہم العغفلون۔

ان کے دل تو ہیں مگر ان سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے اور ان کی آنکھیں بھی ہیں مگر ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے اور ان کے کان بھی ہیں مگر ان سے سننے کا کام نہیں لینے، غرض یہ لوگ چار پایوں کی طرح کے ہیں، بلکہ ان سے بھی گئے گزرے ہوئے، یہی لوگ ہیں جو بالکل بے خبر ہیں۔

(ب) فرعون تمام جلیل القدر عہدوں کو اپنی قوم کے لیے مخصوص کر لیتا اور بنی اسرائیل کو نہایت ہی ذلیل اور ادنیٰ کاموں کے لئے مجبور کرتا۔

”مصریوں نے خدمت کروانے میں بنی اسرائیل پر سختی کی اور انھوں نے سخت محنت سے گارا اور اینٹ کا کام اور سب قسم کی خدمت کھیت کی کروا کے ان کی زندگی تلخ کی اور ان کی ساری خدمتیں جو وہ ان سے کراتے تھے، مشقت کی تھیں۔“ (خروج، ۴۱، ۳۱:۱)

(ج).... اگر قدرتی اسباب و ذرائع کی فیاضی سے ملک کی زرعی حالت قابل اطمینان ہوتی، تو مصنوعی قحط ڈال کر گرائی پیدا کر دی جاتی۔

(د).... کام کی اس قدر کثرت ہوتی کہ صبح سے شام تک لگاتار مصروف رہنے کے باوجود پھر بھی کم ہونے میں نہ آتا، کثرت کار اور ہجوم مشاغل کی وجہ سے ان کی دماغی قوتیں بیکار ہو جاتیں۔ جسمانی قوتوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے، آنکھوں کی قوت جاتی رہتی، کان، بہرے ہوتے جاتے اور مسائل ملکی میں کبھی درس و فکر کا موقع نہ ملتا۔ ”تم اس میں سے کچھ کم نہ کرو کہ وہ کاہل ہیں اور ان کا کام بڑھا دیا جاوے تاکہ اس میں مشغول رہیں اور بیہودہ باتوں کی طرف متوجہ نہ ہوں۔“ (کتاب خروج، ۵: ۸، ۹)

بیگار

چونکہ بنی اسرائیل غلام و محکوم ہونے کی وجہ سے بالکل بے دست و پا ہو گئے تھے، ان کو بیگار کے لیے پکڑا جاتا، ان سے کام لینے میں جبر و ظلم روار کھا جاتا، کوشش کی جاتی کہ انہیں کسی کام کا آرام نہ ملے، اول تو انہیں مزدوری نہ ملتی اور اگر ملتی بھی تو برائے نام۔

وَدَخَلَ الْمَدِينَةَ عَلَى حِينٍ غَفْلَةٍ مِّنْ أَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلَانِ ۚ هَٰذَا مِنْ شِيعَتِهِ ۖ وَهَٰذَا مِنْ عَدُوِّهِ ۚ فَاسْتَعَاثَ الَّذِي مِّنْ شِيعَتِهِ عَلَى الَّذِي مِّنْ عَدُوِّهِ ۚ

اور ایک ایسی حالت میں جب کہ تمام شہر غافل تھا موسیٰ شہر میں آئے اور دو آدمیوں کو دیکھا لڑ رہے ہیں، ان میں ایک موسیٰ کی قوم کا تھا اور دوسرا اس کے دشمن کے گروہ کا۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حکام کو جب کبھی کوئی کام کرانا ہوتا، تو بنی اسرائیل کے افراد کو زبردستی بیگار میں پکڑ لیتے، جانوروں کی طرح ان کے ساتھ سلوک کرتے۔ چنانچہ وہ بنی اسرائیل اس لیے موسیٰ کو دیکھ کر چیخ اٹھا تھا۔“ اور ان دنوں میں یوں ہوا کہ جب موسیٰ بڑا ہوا تو اپنے بھائیوں کے پاس گیا اور ان کی مشقتوں کو دیکھا اور دیکھا کہ ایک مصری ایک عبرانی کو جو اس کے بھائیوں میں سے ایک تھا، مار رہا ہے۔ (خروج، ۲۱، ۱۱:۶)

حاکم وقت کے تمام افراد تو اپنا وقت آرام سے گزارتے، مگر ان بنی اسرائیلیوں کے لئے آرام کی صورت نہ تھی۔ ان کا تمام وقت پیٹ پالنے کی خاطر روٹی کمانے میں صرف ہوتا اور ہر قسم کی ذلت و رسوائی اور تکلیف و مصیبت برداشت کرتے۔ اپنی قومی حکومت کے گھمنڈ میں حاکم قوم بنی اسرائیل کے ہر فرد کو اپنا زر خرید غلام خیال کرتی۔ اسے یقین تھا کہ سرزمین کنعان کا یہ مہجور گلہ صرف اسی لیے دیا گیا ہے، کہ چار پایوں کی طرح اس کے آگے جھکے۔ اس کے لیے وہ جس کو چاہتی جان سے مار ڈالتی۔ نہ تو ان مظالم کی باز پرس کرنی والا کوئی تھا، اور نہ کوئی ایسی عدالت تھی جہاں بنی اسرائیل مرافعہ کر سکتے اور اگر مرافعہ کرتے بھی تو فیصلہ ان کے خلاف ہوتا۔

### زاویہ نگاہ کا فرق

حقیقت یہ ہے کہ جب ایک انسان اپنے شرف و مجد کو اپنی ہی غلط کاریوں کی بنا پر کھو بیٹھتا ہے، اپنی فطرت صالحہ کو فراموش کر دیتا ہے اور اپنی فضیلت و برتری کو ضائع کر دیتا ہے جو اسے تمام کائنات ارضی و سماوی پر نوازش کی گئی تھی، تو اس کا یہی نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ بدترین خلائق بن جاتا ہے، تمام عزتیں اور بزرگیاں اس سے چھین لی جاتی ہیں اور وہ ذلت اور رسوائی کے لیے وقف ہو جاتا ہے۔

قرآن حکیم نے انسانی بزرگی و فضیلت پر مختلف مقامات میں نہایت تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ انسان اشرف ترین مخلوقات ہے۔ سورہ بنی اسرائیل میں آتا ہے:-

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْوَدَّ وَالْبَحْرِ وَزَكَّيْنَاهُمْ مِّنَ الطَّلَبِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا ۝۵

اور ضرور ہم نے انسان کو عزت دی ہے اور خشکی اور تری میں ان کو سوار کر کے پھرایا، ان کو سفر کرنے کے وسائل سمجھائے اور الوان نعمت سے انکار زق مقرر کیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر ان کو شرف بخشا۔

شرک و بت پرستی کی ممانعت صرف اسی لیے کی گئی ہے، کہ انسان جب سب سے اشرف و اعلیٰ ہے تو وہ کیوں خدائے برتر کے سوا کسی اور چیز کے آگے جھکے جو رتبہ میں اس سے کمتر ہے۔ جس وقت بنی اسرائیل نے ایک قوم کو بت پرستی کرتے

ہوئے دیکھ کر حضرت موسیٰ سے درخواست کی کہ ہمیں بھی ایک بت بنا دیجئے تاکہ اس کے آگے جھکیں، تو موسیٰ نے اسی فضیلت و شرافت انسانی سے استدلال کر کے جواب دیا تھا کہ تم زمین و آسمان کی ہر چیز سے افضل و اعلیٰ ہو، اس لیے تمہیں اللہ کے سوا کسی دوسری چیز کے آگے سجدہ کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

قَالَ اَخْبِرَ اللَّهُ اَبْغِيَكُمْ اِلٰهًا وَهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ ۝

موسیٰ نے کہا کہ میں تمہارے لیے اور معبود ہونڈ لاؤں؟ حالانکہ اس نے تمہیں تمام عالم پر فضیلت و بزرگی عنایت کی ہے۔ سورۃ "التین" کا تو موضوع ہی یہی ہے کہ وہ انسان کی بزرگی کا اعلان عام کر دے۔ اور بتا دے کہ جب کہ دنیا کے تمام فلاسفہ اور حکماء انسانی شرف و مجد کو معلوم کرنے سے عاجز رہے، تو لسان الہی نے اس حقیقت مستورہ کو بے نقاب کرتے ہوئے فرمایا لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝ (۹۵:۴) ہم نے انسان کو بہترین حالت عدل پر پیدا کیا ہے۔ عدل ہی خیر کی حقیقت ہے۔ اور وہ صرف شرف و عظمت ہی کے لیے ہے۔ وہی خیر البدیۃ ہے۔ یہی وہ خصوصیت کبریٰ تھی جس کی بنا پر آدم کو ارض الہی کی خلافت نوازش کی گئی اور یہی سبب تھا کہ وہ معبود ملائک قرار پایا۔

نائب حق در جہاں بودن خوش است

بر عناصر حکمراں بودن خوش است

مگر جس وقت وہ اس حقیقت کو گم کر دیتا ہے، اخلاق و اعمال کی گندگی اور ناپاکی اس کے عقائد و یقینات کے چشمہ صافی کو متعفن و بدبودار بنا دیتی ہے، اس کی فطرت صالحہ کا آئینہ طوفانوں اور آندھیوں سے گرد آلود ہو جاتا ہے اور اپنی بزرگی برتری کو کھو بیٹھتا ہے، تو پھر جانوروں سے بھی زیادہ ذلیل و حقیر ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کی نسبت قرآن نے اعلان کیا۔

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۚ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۚ وَلَهُمْ اُذُنٌ لَا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۚ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝ (۷۹:۷۹) یہی الاعیٰ شرا البدیہ، اصلب النار اور الذلّٰتِ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسَاهُمْ اَنْفُسَهُمْ ہیں، اور ختم اللہ علی قلوبہم و علی سمعہم و علی ابصارہم غشاوۃ بھی ایسے ہی لوگوں کی نسبت کہا گیا ہے۔

اس غلامی و محکومی کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان محکوموں کی عقل جانوروں سے بھی کم ہو جاتی ہے اور اس وقت ہر ایک شخص بغض و حسد کا پتلا بن جاتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ میں تو اس ذلت و رسوائی میں رہوں اور دوسرا بھائی ترقی کر جائے۔ اس لیے وہ اس کو فنا کرنے کی فکر میں لگ جاتا ہے۔ سورہ مائدہ میں ہائیل و قاتیل کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ قاتیل اپنے بھائی ہائیل کو صرف اس لیے قتل کرتا ہے کہ جب میری قربانی کو شرف قبول نہیں بخشا گیا تو اس کو یہ عزت کیوں نوازش کی گئی۔ مگر قتل کے بعد حیران و پریشان ہو کر پھر جاتا ہے۔ اسے کچھ نہیں سوچتا کہ اب لاش کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ ایک کو آکر اس کو دفن کرنے کی ترکیب بتاتا ہے۔ اس پر قاتیل کی آنکھیں کھلتی ہیں اور وہ بصد حسرت و ندامت پکاراٹھتا ہے:-

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْٓ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَأُوَارِىْ سَوۡۤءَۃَ اَخِيْ ۚ فَاَصۡبَحَ مِنَ الْاٰثِمِيْنَ ۝

کیا میں ایسا گیا گذرا ہوں کہ بلا سے اس کو بے جیسا ہوتا، تو اپنے بھائی کی فضیحت یعنی لاش کو چھپا دیتا، الغرض وہ اپنے لئے پر بہت ہی پشیمان ہوا۔

وہ غلامی و محکومی کو دنیا کی انتہائی عزت و سربلندی خیال کرتا ہے، اسی پر قانع رہتا ہے۔ اگر حریت و آزادی کے لیے سعی و کوشش کی جائے تو کفر و ارباب کفر کی حکومت کے قیام و ثبات کی خاطر اس تحریک استقلال کی مخالفت کرتا ہے۔ اس کا مطمح نظر دولت و ثروت کی تلاش اور اس کا مقصد عزت و جاہ اور خطابات کی جستجو ہوتی ہے۔ اگر ارباب دجل و شیطنت کی طرف سے کبھی مروت و احسان اور احترام و اکرام دیکھتا ہے تو اس کو اپنی کائنات حیات اور سرمایہ افتخار و ناز خیال کرتا ہے۔ وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کو متروک و مہجور کر کے غیروں کی دوستی پر اتر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی نسبت فرمایا۔

بَشِيرِ الْمُتَّقِينَ بِأَنَّهُمْ عَدَاوَا كَيْدِهِ ۖ  
عِنْدَهُمُ الْعِزَّةُ فَإِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا ۝

منافقوں کو خوشخبری سنا دو کہ ان کو دردناک عذاب ہوتا ہے، کہ یہ لوگ مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بناتے پھرتے ہیں، کیا کافروں کے ہاں اپنی عزت بڑھانا چاہتے ہیں؟ تو عزت تو ساری اللہ کی ہے۔

### سرمایہ داری

ظالم حکومتوں کی ایک عادت یہ بھی ہے کہ وہ اپنی محکوم قوم میں سے بعض افراد کو اپنی اغراض مشومہ کے لیے چن لیتی ہے۔ ان کے اعزاز و اکرام میں مبالغہ کرتی ہے۔ دولت و ثروت سے ان کو مالامال کر دیتی ہے اور پھر خود ان ہی لوگوں کے ذریعہ ان کی قوم پر ظلم و جور کرتی ہے، ان کے حقوق پر غاصبانہ تصرف کرتی ہے اور ان کی راہ ترقی کو مسدود کر دیتی ہے۔

إِنَّ قَادِرُونَ كَانَ مِنْ قَوْمٍ مُّؤَسَّسِي فَبَنَىٰ عَلَيْهِمْ ۖ وَآتَيْنَاهُ مِنَ الْكُتُبِ مَا إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنَتَّو بِأَلْعَصْبَةِ أُولَى الْقُوَّةِ

قارون موسیٰ کی قوم میں سے تھا اور ان پر تعدی کرتا تھا، اور ہم نے اس کو اتنے خزانے دیئے تھے کہ ان کی کنجیاں ایک طاقتور جماعت کو اٹھانی مشکل ہوتیں۔ (۲۸:۷۶)

قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کی قوم کا ایک فرد تھا، مگر فرعون نے اس کو اپنے ساتھ ملا لیا، اس کو قوت و طاقت دی اور دولت سے سرفراز کیا۔ اب اس کی ہر سعی و کوشش اور غور و فکر کامرکز یہی تھا کہ فرعون کی حکومت مضبوط و محکم ہو اور اس کی اپنی قوم اس کے خلاف سر نہ اٹھا سکے۔ اسے اپنی طاقت پر گھمنڈ تھا۔ سونے چاندی کے خزانوں نے اس کو مغرور و سرکش بنا دیا تھا، اس لئے وہ اپنی قوم پر ظلم کرتا اور اسے ابھرنے نہ دیتا۔

لوگوں نے اسے سمجھایا کہ غیروں کے ساتھ مل کر اپنی قوم سے غداری کرنا ٹھیک نہیں۔ سرمایہ داری کے غرور میں تم غریب و مفلس کو نہ بھولو اور ہر ایک کا حق ادا کرو۔ اس نے ان باتوں کی پروا نہ کی، اور ہر ظلم و عدوان میں بڑھتا ہی چلا گیا۔ آخر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حریت و آزادی کا پیغام بربنا کر بھیجا۔

وَلَقَدْ آرَسْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ قَارُوْنَ فَقَالُوْا سِحْرٌ كَذٰبٌ ۝

اور ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں اور دلیل روشن دے کر بھیجا۔ فرعون، ہامان اور قارون کی طرف، تو انہوں نے کہا کہ یہ تو جادو گر ہے جھوٹا۔

آخر جب یہ کسی طرح اپنی ناشائستہ حرکات سے باز نہ آئے تو سنت کے مطابق انکے ساتھ وہی ہوا جس کے وہ حقدار تھے۔

فَخَسَفْنَا بِهٖ وِ بَدَارِهٖ الْاَرْضَ ۚ فَمَا كَانَ لَهُ مِنْ فِئَةٍ يَنْصُرُوْكَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ ۝

پس ہم نے قارون کو اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا، تو خدا کے سوا کوئی جماعت اس کی مددگار نہ ہو سکی اور نہ وہ بدلہ لے سکا۔

نعمت عظمیٰ

ملوکیت اور سرمایہ داری یہ دو سب سے بڑی لعنتیں ہیں جو ابن آدم پر اس وقت مسلط کر دی جاتی ہیں، جب وہ حق کو ٹھکراتا ہے اور باطل کی سرپرستی میں منہمک ہو جاتا ہے۔ اللہ نے اسلام کو بھیجا کہ وہ ان کی بیخ کنی کرے۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ ”اقامۃ الارادۃ تفافات واصلاح الرسوم“ کے باب میں بعثت نبوی کا راز اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

اعلم ان العجم والروم لها توار ثوا الخلافة قروناً كثيرة و خاضوا في لذة الدنيا، ونسوا الدار الآخرة واستحوذ عليهم الشيطان تعبقوا في مرافق المعيشة وتباهاوا بها وورد عليهم حكماً وعوغيهم وفقيرهم الا قد استولت عليه واخذت بتلابيبه وأعجزته في نفسه واهاجت عليه غبوماً وهبوماً لا ار جاعلها وذلك ان تلك الاشياء لم يكن لتحصيل الا ببذل اموال خطيرة ولا تحصل تلك الا موال الا بتضعيف الضرائب على الفلاحين والتجار واشباههم والتضييق عليهم فان امتنعوا قاتلوهم وعذبوهم، وان اطاعوا جعلوهم بمنزلة الحبيروالبقر ويستعمل في النضج والدياس والحصاد ولا تقتنى الا ليستعان بها في الحاجات ثم لا تترك من العناعت حتى صاروا لا يرفعون رءوسهم الى السعادة الا خروية اصلاً ولا يستطيعون ذلك وربما كان اقليم واسع ليس فيهم احد يهيمه دينه ولم يكن ليحصل ايضاً الا يوم يتكسبون بتهية تلك البطاعم والملابس والا بنية وغيرها ويتركون اصول المكاسب التي عليها بناء نظام العالم وصار عامة من يطوف عليهم يتكفون محاكاة الصناديد في هذه الاشياء والا لم يجد واعندهم خطوط ولا كانوا عندهم على بال وصار جمهور الناس عيالاً على الخليفة يتكفون منه تارة على انهم من الغزاة على انهم من الغزاة والبديرين للبدينة يترسون برسومهم ولا يكون المقصود دفع الحاجة ولكن القيام بسيرة سلفهم وتارة على انهم شعراء جرت عادة البلوك بصلتهم وتارة على انهم زهاد و فقر أعيقب من الخليفة ان لا يتفقد حالهم فيضيق بعضهم بعضاً ويتوقف مكاسبهم على صحة البلوك والرفق بهم وحسن المحاورة معهم والتبليق منهم وكان ذلك هو الفن الذي يتعمق افكارهم فيه ويضيع اوقاتهم معه فلما كثرت هذه الاشغال هيات

خسیسہ و اعراضوا عن الاخلاق الصالحة وان شئت ان تعرف حقيقة هذا البرض فانظر الى قوم ليست فيهم الخلافة ولا هم متعبدون في لذائذ الاطعمة والا لبسة تجد كل واحد منهم بيده امره وليست عليه من الضرائب الثقيلة ما يثقل ظهورهم فهم يستطيعون التفرغ لامر الدين والملة ثم تصور حالهم لو كان فيهم الخلافة وملائكتها وسخروا الرعية وتسلطوا عليهم فلما عظمت هذه البصيبة واشد هذا البرض سخط عليهم الله والملائكة المقربون، وكان رضا تعالى في معالجة هذا المريض بقطع مادته فبعث نبياً آمياً ﷺ لم يخالط العجم والروم ولم يترسم برسومهم وجعله ميزاناً يعرف به الهدى الصالح المرضي عند الله من غير المرضى وانطقه بذعادات الاعاجم وقبح الاستغراق في الحيوۃ الدنيا والا طينان بها ونفث في قلبه ان يحرم عليهم رعوس ما اعتاده الاعاجم وبتاهاوبها كلبس الحرير والقس والار رجوان واستعمال اواني الذهب والفضة وحلى الذهب غير المقطع والثياب المصنوعة فيها الصور وتزويق البيوت وغير ذلك وقضى بزوال دولتهم بدولته ورياستهم برياسته وبانه هلك كسرى فلا كسرى بعده وهلك قيصر فلا قيصر بعده۔

معلوم کرنا چاہئے کہ جب عجم اور روم کے لوگ مدت ہائے دراز سے سلطنت کے مالک ہوتے چلے آئے اور دار آخرت کو بھول کر دنیوی لذت میں بھرپور ہو گئے، اور شیطان ان پر غالب آگیا، تو انہوں نے معیشت کے منافع میں بہت خوش کیا اور انہیں امور کو مایہ ناز اعتدالیوں سے اعضائے شہر میں ایک نہایت سخت بیماری سرایت کر گئی تھی اور بڑی آفت برپا ہو گئی تھی۔ رعایا، دہقان اور امیر و غریب میں سے کوئی ایسا شخص باقی نہ رہا تھا جس پر عیش و آرام مسلط نہ ہو گیا ہو۔ اس کو تھکا تھکا کر بے انتہا مصائب اور درخشاں میں نہ پھنسا دیا ہو، یہ عیش و آرام زیادہ تکلیف کا باعث اس لئے ہو گیا تھا کہ جب تک بہت سامان نہ صرف کیا جائے یہ لطف حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور مال کی اتنی مقدار پیدا کرنے کے لیے ضرور ہے کہ کاشتکاروں، تاجروں اور پیشہوروں پر ٹیکس زیادہ کئے جائیں وہ خوب تنگ کئے جائیں۔

اگر یہ لوگ ٹیکسوں کے ادا کرنے سے دست کشی کریں تو حکام کو ان سے لڑنا پڑے گا۔ طرح طرح کی ان کو تکلیف دینا ہوگی اور اگر وہ لوگ ان کے احکام کی تعمیل کرتے رہیں گے تو حکام گدھے اور نیل کا سان کا درجہ کر دیں گے، جو آپاشی جو تھے اور اناج کی کٹائی میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ صرف اپنی مطلب براری کی لیے یہ چار پائے ذخیرہ کیے جاتے ہیں، ایک گھنٹہ محنت سے ان کو فرصت نہیں ملا کرتی۔ امراء ایسے ہی گرفتار بلا ہو کر سعادت اخروی کی طرف سرٹھا کر نہیں دیکھتے اور ان کے اندر یہ صلاحیت ہی نہیں رہتی۔ اور بسا اوقات ایک بہت بڑے ملک میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ہوتا جس کو دین کا اہتمام اور خیال ہو اور نیز یہ سب عیش کے سامان ایسے ہی لوگوں کے ذریعہ سے حاصل ہوا کرتے ہیں، جن کا پیشہ یہی ہوتا ہے کہ کھانے کی چیزیں، لباس، عمارت وغیرہ کو درست کرتے رہیں، ایسے لوگ پیشوں کے ان اصول سے پہلو تہی کرتے ہیں جن پر نظام عالم کا مدار ہے۔

ان کے علاوہ اور عام لوگ جو بڑے لوگوں کی حضوری میں رہتے ہیں، ان سب امور میں ان ہی کی نقل کرتے ہیں، ورنہ ان کو ان امراء کی خدمت میں بازیابی نہ ہو۔ ان کے دلوں میں ان کی کچھ وقعت نہ رہے اور اکثر لوگ پادشاہ پر بار

ہو جاتے ہیں۔ اس پر وہ مختلف طریقوں سے متقاضی رہا کرتے ہیں۔ بعض دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم غازی اور شہر کے منتظم ہیں، ایسے لوگوں کی وہ روش تو اختیار کر لیتے ہیں، لیکن اپنے فرائض ادا کرنے کا کچھ بھی قصد نہیں کرتے، صرف اپنے بزرگوں کے حالات ہی کے پیرو رہا کرتے ہیں۔ اور بعض دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم شاعر ہیں جن پر انعام و اکرام کرنے کی سلاطین عادی ہو کر تے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ہم درویش و پارسایں بادشاہوں کو زیبا نہیں ہے کہ ان کی طرف سے غفلت برتے، اس واسطے کہ یہ فرقے ایک دوسرے کی تنگدلی کے باعث ہوتے ہیں۔ اور ان کے ذرائع معاش اسی پر موقوف ہوتے ہیں کہ وہ بادشاہوں کی خدمت میں رہیں، ان سے نیاز مندانه پیش آئیں، تہذیب سے ان کے ساتھ گفتگو کریں، ان کی چاپلوسی کرتے رہیں۔ اس فن میں ان کی عقل منہک رہتی ہے، اس کی وجہ سے ان کے اوقات غارت ہوتے ہیں۔ جب اس قسم کے مشغلے زیادہ بڑھ جاتے ہیں تو ان کے دلوں میں پوج اور فضول باتیں جاگزیں ہو جاتی ہیں اور عمدہ اخلاق سے وہ اعراض کرتے رہتے ہیں۔ اگر تم کو اس مرض کی اصلی حقیقت معلوم کرنی ہو تو ان لوگوں کی حالت میں غور کرو جن کو امور سلطنت سے آزادی ہوتی ہے۔ لذیذ کھانوں اور عمدہ لباسوں میں ان کو انہماک نہیں ہوتا، ہر شخص ان میں سے آزادانہ زندگی بسر کرتا ہے، اگر ان ٹیکسوں کا بار ان پر نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں کو اپنے دین اور ملت کی خدمت کر نیکی توفیق ملتی ہے۔ پھر ان ہی لوگوں کی اس حالت کو خیال کرو کہ ان کے ہاتھ میں زمام خلافت آجائے، رعایا کو وہ اپنا مطیع بنا کر ان پر اپنا قبضہ کر لیں۔

جب ایسی مصیبت زیادہ بڑھ گئی اور اس قسم کی بیماری بہت سخت ہو گئی تو اس وقت خدائے تعالیٰ اور ملائکہ مقررین نے ان پر غصہ ظاہر فرمایا۔ خدا کی مرضی ہوئی کہ اس مادہ فساد کو بالکل قطع کر دے۔ اسی غرض کو پورا کرنے کے لیے اس نے ایک بنی امی صَلَّى اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کو بھیجا جس کا عجم اور روم سے کسی قسم کا میل جول نہ ہوا تھا۔ ان کے رسوم کو اس نے بالکل اختیار نہ کیا تھا۔ اس پیغمبر کو خدائے تعالیٰ نے میزان قرار دیا، جس کو ان طریقوں کی پوری شناخت تھی جو خدا کے نزدیک پسندیدہ اور ناپسندیدہ تھے۔ اس نے عجیبوں کی رسوں کی مذمت بیان کی اور دنیاوی زندگی میں مستغرق ہو جانے کی قباحتیں ظاہر کیں۔ اس پیغمبر کے دل میں خدا تعالیٰ نے القا فرمایا کہ لوگوں پر وہ امور حرام کر دے جن کے عجی لوگ خو کر ہو گئے تھے، جن کی وجہ سے وہ ایک دوسرے پر فخر کرتے، مثلاً ریشم کا استعمال، ارغوانی لباس، سنہری اور زرد پیلے برتن، سنہری زیور، ایسے کپڑے جن میں تصویریں بنی ہوئی ہوں، مکانوں پر نقش و نگار کرنا وغیرہ۔

خدا تعالیٰ نے فیصلہ کیا کہ اس کی دولت سے ان کی دولتوں کا استیصال کر دے اور اس کی ریاست سے ان کی ریاستوں کو نیست و نابود کر دے، اس کے وجود سے کسریٰ ہلاک ہو جائے اور اب اس کے بعد کوئی کسری نہ ہونے پائے اور نیز اس کے ذریعہ سے قیصر بھی ہلاک ہو جائے پھر کوئی قیصر نہ ہو۔ (حجۃ اللہ البالغہ ۱۱۱ و ۱۱۲)

حرمت سود

دوسری جگہ حرمت سود کی نسبت تحریر فرمایا:

”وسمّا لتبریم ان اللہ تعالیٰ یکرہ الرفاہیۃ البالغۃ کالحریر والار تفاقات المحوۃ الی لا معان فی طلب



الدنيا كانية الذهب والفضة وحلى غير مقطوع من الذهب كالسوار والخلال والطوق والتدقيق في المعيشة والتعبق فيها لان ذلك مردى لهم في اسفل السافلين صارف لا فكارهم الى الوان مظلمة“ (حجۃ اللہ البالغہ ۶۹۲)

اور سود کے حرام ہونے میں حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو نہایت عیش پسندی، مثلاً ریشم کا لباس پہننا پسند ہے اور علیٰ ہذا القیاس وہ ارتقاات جن میں طلب دنیا کے اندر غرق ہو نیکی حاجت پڑتی ہے، جیسے سونا چاندی کے برتنوں کا استعمال کرنا، ان زیورات کا پہننا جو بڑے بڑے زیور ہیں اور گھڑ کر بنائے جاتے ہیں، جیسے نگین، گوجری اور ہنسی وغیرہ اور کھانے پینے میں زیادہ تکلف کرنا، کیونکہ یہ امور لوگوں کو اسفل السافلین میں گرا دیتے ہیں اور ان کی فکر کو تاریک رنگوں کی طرف پھیرنے والے ہیں۔

### غلامی کے اثرات

اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا عذاب جو کسی قوم پر نازل ہوتا ہے یہ ہے کہ اس پر غیروں کو حاکم بنا دیا جائے۔ ضریت علیہم الذلۃ کی یہی تفسیر کی گئی ہے۔ اس سے قوم کے تمام شریفانہ جذبات فنا ہو جاتے ہیں، فاسد خیالات، ذلیل عواطف اور ناپاک رجحانات کا غلبہ اور استیلاء ہو جاتا ہے اور آخر قوم پر عالم ممت طاری ہو جاتا ہے۔  
حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسا جلیل القدر پیغمبر اپنی قوم کو لے کر نکلتا ہے، کہ انہیں آبائی وطن دشمن سے واپس دلادے، مگر دیکھئے وہ کیا جواب دیتے ہیں۔ پہلے انہیں یوں جوش دلایا جاتا ہے کہ تم انبیاء کی اولاد ہو۔ بادشاہت تمہارے گھر کی لونڈی ہے اور تمہیں ایسے ایسے فضائل و کمالات دیئے گئے ہیں کہ دنیا میں ان کی نظیر نہیں ملتی۔

وَ اِذْ قَالَ مُوسٰى لِقَوْمِهٖ يَقُوْمُواْ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ جَعَلْ فِیْكُمْ اَنْبِیَآءَ وَ جَعَلْكُمْ مَّلٰٓئِكًا ۚ وَ اَتٰكُمْ مَّا لَمْ یُوْتِ اَحَدًا مِّنْ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۲۰﴾ (المائدہ ۲۰)

جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ بھائیو! اللہ نے جو تم پر احسانات کیے ہیں ان کو یاد کرو، کہ اس نے تم میں پیغمبر بنائے اور تم کو بادشاہ بنایا اور تم کو وہ نعمتیں دیں جو دنیا جہان کے لوگوں میں سے کسی کو نہیں دیں۔ اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ اس ملک پر تمہارا قبضہ ہو کر رہے گا جس میں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ استقلال و ثبات قدم سے کام لو اور پیچھے ہٹنے کا خیال بھی نہ آنے پائے۔

یَقُوْمُواْ اَدْخُلُواْ الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِیْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰی اَدْبَارِکُمْ فَتَقْلَبُوْا خَسِرٰتِیْنَ ﴿۲۱﴾ (المائدہ ۲۱)

بھائیو! شام کا مقدس ملک جو خدا نے تمہاری تقدیر میں لکھ دیا ہے اس میں داخل ہو اور پیچھے نہ پھیرنا ورنہ اٹلے گھاٹے میں آ جاؤ گے۔

غور کیجئے کہ تاجوش انگیز و ولولہ نیز خطبہ ہے کہ مردے بھی زندہ ہو جائیں، مگر ان کی قوم جو چار سو سال سے فرعون کی

غلام چلی آ رہی تھی، کیا یاں انگیز جواب دیتی ہے۔

قَالُوا يَبْسُوسُ إِنَّ فِيهَا قَوْمًا جَبَّارِينَ ۖ وَإِنَّا لَنَذْخُلُهَا حَتَّىٰ يَخْرُجُوا مِنْهَا ۖ فَإِن يَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِنَّا دَاخِلُونَ ﴿٣٥﴾  
 قَالَ رَجُلٌ مِّنَ الَّذِينَ يَخَافُونَ أَنعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۖ فَإِذَا دَخَلْتُمُوهُ فَاثْبِتُوا عَلَىٰ مَوَاقِعُكُمْ ۚ وَعَلَىٰ  
 اللَّهِ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَإِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ ﴿٣٦﴾ قَالُوا يَبْسُوسُ إِنَّ لَنَا نَذْرًا مَّا دَامُوا فِيهَا فَادْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا  
 هَاهُنَا قَاعِدُونَ ﴿٣٧﴾ قَالَ رَبِّ إِنِّي لَا أَمْلِكُ إِلَّا نَفْسِي وَأَخِي فَافْرِقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ﴿٣٨﴾ قَالَ فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ  
 عَلَيْهِمْ ذَرْبَعَيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيهُونَ فِي الْأَرْضِ ۚ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ﴿٣٩﴾ (المائدہ ۲۲-۲۶)

وہ لگے کہنے کہ اے موسیٰ، اسی ملک میں تو بڑے زبردست لوگ ہیں اور جب تک وہ وہاں سے نہ نکل جائیں، ہم تو اس میں  
 قدم رکھتے ہی نہیں۔ ہاں وہ لوگ اسمیں سے نکل جائیں، تو ہم ضرور داخل ہوں گے۔ خدا کا ڈر ماننے والوں میں سے  
 دو آدمی تھے کہ ان پر خدا نے مہربانی کی اور وہ بول اٹھے ان پر دروازے میں تو کھس پڑو، اور جب تم دروازے میں گھس  
 پڑے تو بلاشبہ تمہاری فتح ہے۔ اگر تم ایمان رکھتے ہو تو اللہ ہی پر بھروسہ رکھو۔ وہ بولے اے موسیٰ، جب تک اس میں  
 دشمن ہیں ہم تو کبھی بھی اس میں قدم نہیں رکھیں گے، ہاں تم اور تمہارا خدا جاؤ اور لڑو اور ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔ اس پر  
 موسیٰ نے دعا کی کہ اے میرے پروردگار، اپنی ذات خاص اور میرے بھائی کے سوا اور کوئی میرے بس کا نہیں۔ تو ہم  
 میں اور ان نافرمان لوگوں میں امتیاز کی جیو۔ خدا نے فرمایا اچھا تو وہ ملک چالیس برس تک ان کو نصیب نہ ہوگا، جنگل میں  
 بھٹکے بھٹکے پھریں گے، تو تم نافرمان لوگوں پر افسوس نہ کرنا۔

غلامی اور محکومی کیسی بری بلا ہے کہ:

(الف).... یہ لوگ جب مصر سے نکلے تھے تو حضرت موسیٰ کے ہاتھ پر یہ عہد کر کے نکلے تھے کہ ہم اپنے آبائی وطن  
 کو لینے کے لیے ہر ممکن قربانی کریں گے، مگر غلامی انہیں اپنے عہد پر قائم نہیں رہنے دیتی اور آگے بڑھنے سے  
 صاف انکار کر دیتے ہیں۔

(ب).... اس قدر بزدل اور بے حس ہو گئے ہیں کہ اپنے باپ دادا کی میراث لینے کے لیے بھی ان میں کوئی جوش  
 نہیں پیدا ہوتا۔

(ج).... ہمت پست ہو جاتی ہے، غلامی پر قانع ہو کر اشیاء و قربانی سے گریز کرتے ہیں اور موت سے گھبراتے ہیں۔

اس کا نتیجہ

ان ناشائستہ حرکات کی سہرا ان بد بختوں کو یہ دی گئی کہ چالیس سال تک اس پاک زمین میں ان کا داخلہ بند کر دیا گیا،  
 تاکہ اس زمانے میں وہ تمام لوگ فنا ہو جائیں جن کے دل و دماغ پر غلامی کے جراثیم مسلط ہیں، دوسری نسل پیدا ہو جو آزاد  
 سر زمین میں نشوونما پائے، جہاں اللہ کے سوا اور کسی کی حکومت نہ ہو اور اس کے ذریعہ اس ارض مقدس پر قبضہ کیا جائے۔

## عقل و تمیز

غلامی کے نتائج فاسدہ اسی جگہ پر ختم نہیں ہو جاتے، یہ ایسی متعدی بیماری ہے کہ اس کا سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آتا، قوم کی عقل و خرد پر عالم ممت طاری ہو جاتا ہے۔ حق و باطل اچھے اور برے کی تمیز اٹھ جاتی ہے۔ ہر شعبہ باز اور سامری صفت اٹھتا ہے اور جس طرف چاہتا ہے قوم کو لیجاتا ہے۔ قوم میں اتنی بھی سمجھ باقی نہیں رہتی کہ وہ اپنے رہنماؤں میں تمیز کر سکے۔ سامری کا قصہ پڑھیے اور دیکھیے اس کا ایک ایک لفظ ہم پر منطبق ہو رہا ہے۔

لِكِنَّا حَبَلْنَا أَوْدَارًا مِّنْ زِينَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنَاهَا فَكَذَلِكَ أَلْقَى السَّامِرِيُّ ۖ فَأَخَرَهُ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَهُ خُورٌ  
فَقَالُوا هَذَا إِلَهُكُمْ وَإِلَهُ مُوسَى ۖ فَتَنَسَوْا ۝ (طہ ۸۷ تا ۸۸)

بلکہ قوم کے زیوروں کا بوجھ ہم پر لاد دیا گیا تھا، اب ہم نے اس کو ڈالا اور اسی طرح سامری نے بھی ڈالا، پھر اس نے لوگوں کے لئے پچھڑا نکال کھڑا کیا، یعنی بت جس کی آواز پچھڑے کی تھی، اس پر لوگ کہنے لگے کہ یہی تو تمہارا معبود ہے اور موسیٰ کا معبود اور وہ بھول گیا ہے۔

دیکھیے غلامی نے ان کی عقل پر کیسے پردے ڈال دیئے اور ذرا غور و فکر نہ کیا کہ۔

أَفَلَا يَرَوْنَ أَلَّا يَرْجِعُ إِلَيْهِمْ قَوْلًا ۚ وَلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا ۝ (طہ ۸۹)

کیا ان لوگوں کو اتنی بات بھی نہ سوجھ پڑتی تھی کہ پچھڑا ان کی بات کا نہ تو الٹ کر جواب دے سکتا ہے اور نہ ان کے کسی نقصان کا مالک ہے اور نہ کسی نفع کا۔

حضرت ہارون علیہ السلام نے یہ دیکھ کر انہیں فرمایا:

يَقُومُوا إِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهِ ۚ وَإِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمَنُ فَاتَّبِعُونِي وَأَطِيعُوا أَمْرِي ۝ (طہ ۹۰)

بھائیو! یہ تو اس کے ذریعہ سے تمہاری آزمائش کی جا رہی ہے، ورنہ تمہارا پروردگار رحمن ہے، تم میرے کہنے پر چلو اور میری بات مانو۔

مگر وہ لوگ کب ان کی سننے والے تھے اس لئے انہوں نے دو ٹوک جواب دیا:

لَنْ نَّبْرِيحَ عَلَيْهِ عَكَفَيْنَ حَتَّىٰ يَرْجِعَ إِلَيْنَا مُوسَى ۝ (طہ ۹۱)

ہم برابر اس پچھڑے کی پرستش پر جبرے رہیں گے جب تک موسیٰ لوٹ کر ہمارے پاس نہ آئیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ:

غلامی میں انسان کی عقل ماری جاتی ہے۔

حق و باطل میں تمیز نہیں کر سکتا۔

ہر شخص آسانی کے ساتھ دھوکا دے سکتا ہے اور دھوکا کھا سکتا ہے، امتحان کی آزمائش میں کوئی پورا نہیں اترتا۔

## محصولات

رعایا کی انتہائی غربت و ناداری اور ذلت و عکبت، حاکم قوم کے دل میں نفرت و حقارت کے جذبات خبیثہ پیدا کر دیتی ہے، پہلے وہ اگر صرف ان لوگوں کی دشمن تھی جو اپنی عاجز و درماندہ اور محکوم قوم میں حق و حریت کا احساس پیدا کرنے کے آرزو مند ہوتے ہیں اور اس سعی و کوشش میں اپنی تمام زندگی صرف کر دیتے ہیں۔ تو اب جبکہ تمام قوم میں حس و بیداری نمایاں طور پر ظاہر ہونے لگتی ہے تو وہ ان سب کو فنا کرنے کی فکر میں لگ جاتی ہے اور اس کا منشا یہ ہوتا ہے کہ بن پڑے تو تمام قوم کو اس سر زمین سے نکال باہر کرے، گھر سے بے گھر ہو کر فقیروں کی زندگی بسر کرے اور بتدریج اس کا نام و نشان دنیا سے مٹ جائے۔

فَأَرَادَ أَنْ يَنْتَفِظَهُمْ مِنَ الْأَرْضِ (بنی اسرائیل ۱۰۳)

پھر فرعون نے چاہا کہ بنی اسرائیل کو کسی طرح ملک سے اکھیڑ دے کہ رہنے نہ پائیں۔

مگر اس کے ارکان سلطنت نے ایسا کرنے سے روکا اور کہا کہ اگر یہ لوگ چلے گئے تو جس قدر ادنیٰ اور معمولی درجہ کے کام ہیں، وہ بھی ہم ہی لوگوں کو کرنے پڑیں گے، اس لیے ان کی جلا وطنی قرین عقل و انصاف نہیں، بلکہ انہیں سر زمین مصر ہی میں رہنے کے لئے مجبور کیا جائے، غیر ملک کے پروانہ ہائے راہ داری سے انہیں محروم کر دیا جائے۔ ہماری کوشش یہی ہو کہ وہ ہمیشہ غریب و نادار ہی رہیں اور ان پر مختلف قسم کے ٹیکس لگا دیئے جائیں، کہ ان کے بوجھ سے دیں اور ابھرنے نہ پائیں۔ اس پر فرعون نے اپنے لوگوں سے کہا: دیکھو بنی اسرائیل کے لوگ ہم سے زیادہ اور قوی تر ہیں، آؤ ہم ان سے دانشمندانہ معاملہ کریں تاکہ ایسا نہ ہو کہ جب وہ اور زیادہ ہوں اور جنگ پڑے تو وہ ہمارے دشمنوں سے مل جاویں اور ہم سے لڑیں اور ملک سے نکل جائیں، اس لیے انہوں نے ان پر خراج کے لئے محصل بٹھادیئے تاکہ انہیں سخت کاموں کے بوجھوں سے ستاویں۔“ (خروج، ۹: ۱۱ تا ۱۱)

## خارجی تعلقات

بنی اسرائیل مدت ہائے دراز سے فرعون کے مظالم کا تختہ مشق بنے ہوئے ہیں۔ اس کی کوشش یہ ہے کہ یہ لوگ ہمیشہ اسی کے غلام و محکوم رہیں، جبر و استبداد سے اپنے آپ کو بادشاہ اور خدا تسلیم کرانا چاہتا ہے، اس کا مقصد حیات یہی ہے کہ یہ عاجز و درماندہ جماعت اس کی چوٹ پر سردھرے۔ اسی کے آگے دست سوال دراز کرے، کسی بیرونی طاقت اور خارجی حکومت سے اپنے تعلقات و روابط نہ رکھے۔ اسے یہ اندیشہ تھا کہ بلاد اجنبیہ سے رشتہ مودت جوڑ کر یہ کہیں میرے خلاف فتنہ نہ کھڑا کر دے۔ ممالک خارجہ کے حالات و واقعات سنکر اس میں جوش و ہيجان پیدا ہو گا۔ آزادی کے خیالات اور

استقلال قومی کے جذبات سے معمور ہو کر اس ظالم و جابر حکومت کی بنیادوں کو متزلزل کر دے گی۔ چنانچہ جس وقت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے کہا کہ میں زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے کی طرف سے بھیجا گیا ہوں، کہ اپنی قوم کو تمہارے پنجہ قہر و ظلم سے نجات دلاؤں تو اس نے چھوٹے ہی کہا:

لَئِنْ أَتَخَذْتَ إِلَهًا غَيْرِي لَأَجْعَلَ لَكَ مِنَ الْمُسْجُوتِينَ ﴿٢٩﴾ (الشعر آء ۲۹)

اگر تو نے میرے سوا کسی اور کو خدا مانا تو میں تجھ کو قیدیوں میں لے جا دوں گا۔

اس سے فرعون کا یہی مقصد تھا کہ میرے سوا کسی اور خارجی طاقت سے تعلق نہ رکھیں اور نہ اس کو اپنا مذہبی امام و پیشوا تسلیم کریں۔ پھر اس نے اسی پر قناعت نہ کی، بلکہ اس قوت کو فنا کرنے کے لئے ہر قسم کی تیاری شروع کر دی اور دوسرے لوگوں کو بھی تیاری کا حکم دیا۔ اسے یقین تھا کہ جس طاقت سے موسیٰ نے اپنا رشتہ قائم کیا ہے وہ کمزور و ناتوان ہے اور اس لیے اس کو آسانی کے ساتھ تباہ کیا جاسکتا ہے۔ چونکہ اس طاقت کی جلالت قدر اور کبریائی سے واقف نہ تھا، اس لیے اس نے نہایت ہی تمسخرانہ انداز میں اپنے وزیر سے کہا:

فَأَوْقِدْ لِي يَهُامُنْ عَلَى الطِّينِ فَاجْعَلْ لِي صَرْحًا لَعَلِّي أَطَّلِعُ إِلَى إِلَهِ مُوسَى ۖ وَإِنِّي لَأَكْذِبُ مِنَ الْكَذَّابِينَ ﴿٣٠﴾  
وَاسْتَكْبَرُوا وَجُنُودُهُ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَلَمُوا أَنَّهُمُ الْبَيْنَاءُ لَئِيْزَجْعَلُوهُنَّ ﴿٣١﴾ (القصص ۳۸-۳۹)

اے ہامان! اچھا تو ہمارے لئے مٹی کی اینٹوں کو آگ لگا پڑا دے پکو۔ ان سے ہمارے لئے ایک پکا محل بنواتا کہ ہم اس پر چڑھ کر موسیٰ کے خدا کو جھانکیں اور ہم تو اس دعویٰ میں موسیٰ کو جھوٹا ہی سمجھتے ہیں اور فرعون اور اس کے لشکروں نے ناحق ملک میں بہت سراٹھایا اور انہوں نے ایسا سمجھا کہ وہ ہماری طرف لوٹا کر نہیں لائے جائیں گے۔

دنیا داروں اور مادہ پرستوں اور ظالم و جابر حکومتوں نے روحانی طاقتوں کے اثر و نفوذ اور ثمرات و نتائج کے اندازہ کرنے میں ہمیشہ غلطی کی ہے، جس وقت نوح کو کشتی بناتے وقت ان کی قوم نے لکارا ہے اور ان پر استہزاء کیا ہے، تو وہ بھی اس غلطی میں مبتلا تھے۔ ابراہیم کو آگ میں ڈالنے وقت نمرود بھی اسی کا شکار ہوا تھا، فرعون بھی اسی وادی کا ایک رہ نور تھا، عیسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کرنے کے لئے جانا یہ بھی اسی غلط فہمی کا ایک نتیجہ تھا جس میں یہودی مبتلا تھے اور کفار مکہ بھی اسی کوتاہ فہمی کے مرتکب ہوئے جب وہ رسول اللہ ﷺ سے جنگ کرنے کے لئے بدر کے میدان میں خیمہ زن ہوئے۔

یہ واقعات جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، ایسے نہیں جن سے ارباب دجل و شیطنت ناواقف ہوں۔ اس کرہ ارضی کے تمام ذرات، دریاؤں اور سمندروں کی مچھلیاں اور آسمان کے چمکتے ہوئے نجوم و کواکب ان باتوں کو جانتے ہیں۔ ہر قوم و ملت کے پاس ان حوادث کی پوری تفصیل موجود ہے اور ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جب کبھی دنیا کی جابرانہ طاقتوں نے روحانی قوتوں کا مقابلہ کیا ہے تو سچائی نے باطل کو ہمیشہ شکست دی ہے اور دائمی طور پر حق ہی کو غلبہ حاصل ہوا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ لِيَصُدَّوْا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۖ فَسَيُنْفِقُونَهَا ثُمَّ تَكُونُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُونَ ۖ وَالَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ يُحْطَمُونَ ﴿٣٢﴾

اس میں شک نہیں کہ یہ کافر اپنے مال اس لیے خرچ کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو راہ خدا سے روکیں۔ سو یہ لوگ تو مال کو اسی طرح پر خرچ کرتے ہی رہیں گے، مگر پھر آخر کار وہی مال ان کے حق میں موجب حسرت ہو گا۔ خرچ بھی کریں اور پھر مغلوب بھی ہوں اور قیامت کے دن کافر سب جہنم کی طرف ہلکے جائیں گے۔ جس آیت سے ہم نے اس عنوان کے لیے استدلال کیا تھا اس پر دوبارہ نظر ڈالئے، تو آپ کو معلوم ہو گا کہ فرعون کیا کر رہا ہے۔

- (الف).... جو لوگ ملک اور قوم کی خدمت کرتے تھے، وہ ان کو غلط کافر بھی، مکار اور جھوٹا قرار دیتا ہے۔  
 (ب).... ان لوگوں کی خدمات کی اس کے دل میں کوئی عزت و توقیر نہیں۔  
 (ج).... فرعون غرور و تکبر کا پتلا تھا اور اس کا تمام تر اعتماد اپنی مادی قوتوں پر تھا۔  
 (د).... اسے خیال تھا کہ اس کے جابرانہ طرز عمل اور ظالمانہ طریق کار سے حق و حریت کی تحریک رک جائے گی، جس کی وجہ سے ملک میں شورش پیدا ہو رہی ہے اور اس کی سلطنت نقصان سے محفوظ رہے گی۔

## الزام فساد

فرعون نے دیکھا کہ باوجود ان تمام باتوں کے بنی اسرائیل حریت و آزادی کی تحریک میں برابر حصہ لیتے ہیں، اور موسیٰ کی جماعت میں بھی روز بروز اضافہ ہوتا جاتا ہے تو اس نے تنگ آ کر دوسری راہ اختیار کی، جن لوگوں کے دماغ نشہ حریت سے سرشار اور جذبات قومیت و وطنیت سے لبریز تھے جو اپنی قوم کو غلامی اور محکومی سے نکال کر آزادی دلانے کے آرزو مند تھے، انہیں پاگل اور مجنون کا خطاب دیا، کہ اس طرح عوام الناس ان فداکاران ملت اور سرفروشان حریت کے پھندے میں مبتلا نہ ہوں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دربار میں آتے ہی سب سے پہلے یہی مطالبہ کیا تھا۔

أَنْ أَرْسِلَ مَعَنَا بَنِي إِسْرَءِيلَ ۖ (الشعر آء ۱۷)

تم بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ روانہ کرو۔

مگر اس نے آزاد کرنے کی بجائے لوگوں کو مخاطب بنا کر کہا:

قَالَ إِنَّ رَسُولَكُمْ الَّذِي أُرْسِلَ إِلَيْكُمْ لَمَجْنُونٌ ۖ (الشعر آء ۲۷)

وہ رسول جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہے مجنون ہے۔

لوگوں کی یہ کیفیت ہے کہ پروانہ دارا انہیں پاگلوں پر نثار ہوتے ہیں، اپنے اندر حریت و استقلال کی تشنگی محسوس کرتے ہیں اور ظلم و سفاکی کے دور کرنے کے لیے صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ دراصل دنیا کا ہمیشہ سے دستور رہا ہے کہ اس نے ارباب اصلاح و تجدید کو ابتداء میں پاگل کہا ہے، مجنون کا خطاب دیا ہے، جادو گر بتایا ہے اور مفسد کے نام سے یاد کیا ہے۔ ناصرہ کے اسرائیلی نوجوان کو جب حکومت کے سامنے پیش کیا گیا، کہ وہ اس بزرگ و جلیل ہستی کو پھانسی دے تو اس پر جو الزامات لگائے گئے تھے، ان میں اولین الزام یہی فساد تھا۔ مدین کا پیغمبر جلیل لوگوں کو کم تو لے سکتا ہے، مگر وہ اسی

کو مفسد قرار دیتے ہیں۔ لوط صرف اسی لیے فسادی تھے کہ وہ اپنی بد بخت قوم کو ایک غیر فطری طریق عمل سے روکتے تھے۔ رؤسا قریش کی نظر میں رسول اللہ ﷺ بھی اسی جرم کے مرتکب تھے، مگر قدوس حق نواز کی کار فرمائی ملاحظہ ہو کہ تھوڑی سی مدت کے بعد تمام لوگ اسی مفسد کو اپنا امام اور پیشوا تسلیم کرتے ہیں اور اسی ملک کا ایک ایک گوشہ اور ایک ایک چپہ اس کی فضیلت اور برتری کے آگے جھک جاتا ہے۔

جب فرعون نے دیکھا کہ لوگ، حکومت کی ان باتوں کی پروا نہیں کرتے بلکہ ان اعلانات کے ساتھ تمسخر و استہزاء کرتے ہیں اور برابر اس جدید تحریک میں حصہ لے رہے ہیں، تو اس نے یہ مشہور کرنا شروع کر دیا کہ یہ لوگ جو تمہاری آزادی اور استقلال کے طالب ہیں، حقیقت میں انہیں تم سے کوئی ہمدردی نہیں اور تمہاری خیر خواہی ان کے پیش نظر نہیں، بلکہ وہ فساد پھیلانے، بد امنی پیدا کرنے، نظام صالح کو درہم برہم کرنے، قانون کو توڑنے اور اپنی حکومت قائم کرنے کی غرض سے ان حرکات کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ ان کی نیتوں میں خلوص نہیں، دلوں میں جوش و ولولہ نہیں اور ان کے دماغوں میں افساد فی الارض کے سوا اور کوئی خیال نہیں، اس لئے رعایا کے لیے مناسب یہی ہے کہ وہ ان لوگوں سے الگ رہے اور ان کی مجلسوں میں شریک نہ ہو، فرعون کہتا ہے:

إِنَّ هَٰذَا السَّحَرَةُ عَلِيمُونَ ﴿۱۱﴾ يُرِيدُونَ أَن يُضْحِكُوا مِنَّا هُزْنًا وَأَنَّا مُرْسِلُونَ ﴿۱۲﴾ (الاعراف ۱۱-۱۲)

یہ تو بڑا جادو گر ہے، چاہتا ہے کہ تم سب کو تمہارے ملک سے نکال باہر کرے، تو اب تم لوگ کیا صلاح دیتے ہو۔  
کبھی غصہ و جذبہ انتقام کے خیال سے یوں خطاب کرتا ہے:

ذُرُوْثٍ اَقْتُلْ مُوسٰی وَلْيَدْعُ رِبِّهٖ ؕ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ يُبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُظْهِرَ فِی الْاَرْضِ الْفُسَادَ ﴿۲۶﴾ (المومن ۲۶)

مجھے موسیٰ کو قتل کرنے دو اور وہ اپنے پروردگار کو اپنی مدد کے لیے بلائے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تمہارے دین کو الٹ پلٹ کر ڈالے یا ملک میں فساد نکال کھڑا کر دے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کی غرض و غایت ہی یہی تھی، کہ وہ امن کے پیغمبر، ظلم و جور کو دنیا سے مٹانے والے اور بنی اسرائیل کو ایک ظالمانہ حکومت سے نجات دلانے والے ہیں۔ انہوں نے فرعون کے دربار میں آتے ہی، اولین مطالبہ یہ کیا کہ ادو آئی عبادہ اللہ۔ چاہتے تھے کہ وہ حکومت جس نے تہذیب و شائستگی کے پھیلانے اور علم و فضل کی نشر و اشاعت کے نہایت بلند آہنگی سے اعلان کیے تھے، جس کا دعویٰ تھا کہ وہ صرف اس قوم کی فلاح و بہبود اور نفع و سود کی خاطر جہان بانی و فرماں روائی کر رہی ہے، جس کا ادعا یہ تھا کہ اس پڑ مردہ قوم کو پھر زندہ کرنا چاہتی ہے جس کی حکومت مدتوں رہی ہے، اس کی دراز دستی ملاحظہ ہو کہ:

(الف) .... جو لوگ قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھاتے ہیں ان پر فساد کا الزام لگایا جاتا ہے، ان کو مذہب کا بگاڑنے والا اور رسم و رواج قومی کا تبدیل کرنے والا کہا جاتا ہے۔

(ب) .... چونکہ حکومت کی بنیاد تمام تر ظلم و جور پر ہے، اس لیے اس کو اپنی تباہی و بربادی کا ہر وقت خوف دامن گیر رہتا ہے۔ مصلحین کی ہر کوشش کو اپنی تخریب کا باعث خیال کرتی ہے، شب و روز اسی فکر میں غلطاں و پچپاں

رہتی ہے، اپنے خیالات و افکار اسے خطرات و مہالک بن کر نظر آتے ہیں۔ جب کبھی ارباب اصلاح کی طرف سے کوئی صدائے حق بلند ہوتی ہے، تو اسے یقین ہو جاتا ہے کہ اب میری بربادی کا وقت آگیا۔ اور یہ اعلان حریت مجھے فنا کرنے کے لیے کیا گیا ہے، اس لیے وہ سختی کی راہ اختیار کرتی ہے اور سرفروشان ملت کو قید و بند کی تکلیفیں پہنچاتی ہے، حالانکہ وہ ذرا غور و فکر سے کام لیتی تو اسے معلوم ہو جاتا کہ یہ لوگ فساد پھیلانے کے لئے نہیں بلکہ امن عامہ کی خاطر اپنی ہر چیز قربان کر رہے ہیں۔

### رفقائے کار کی تعذیب

اگر بعض اسباب و مصالح خفیہ کی بنا پر حکومت رہبر ان ملت اور مصلحین قوم پر ہاتھ نہیں ڈالتی، تو اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان کو بے دست و پا بنادیا جائے، جو لوگ ان کے اعوان و انصار ہیں ان کو کسی طریق سے الگ کر دیا جائے، ان میں باہمی کوئی تعلق قائم نہ رہے اور اس طرح ان فداکاران حریت کی تمام کوششیں اکارت جائیں، اس لیے ان کو طرح طرح کی تکالیف دی جاتی ہیں۔ ان کو گھر سے بے گھر کیا جاتا ہے، ان کی جائیدادیں ضبط کی جاتی ہیں، جس وزن دان کی تاریک کوٹھڑیوں میں بند کیا جاتا ہے، گلے میں آہنی طوق ہیں اور پاؤں میں لوہے کی بو جھل بیڑیاں اور اگر اس پر بھی یہ لوگ راہ حق سے منحرف نہ ہوں تو قانون کی سخت گیریاں ہیں اور پھانسی کے تختے۔

جب فرعون پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ موسیٰ و ہارون کو گرفتار کرنے سے ملک میں عام فتنہ و فساد کا اندیشہ ہے، تو اس کو ارکان سلطنت نے حسب ذیل مشورہ دیا:

أَرْجِهْ وَأَخَاكَ وَأَزْسِلْ فِي الْمَكَائِنِ حُسْرَيْنَ ﴿١١﴾ (الاعراف ۱۱)

موسیٰ اور اس کے بھائی ہارون کے معاملہ کو اس وقت ملتوی رکھئے اور اطراف و جوار کے قصبات میں کچھ ہر کارے روانہ کیجئے۔ اگرچہ موسیٰ و ہارون کے آزاد رہنے کا ارکان سلطنت نے مشورہ دیا، مگر وہ اس لئے نہ تھا کہ ان کی خیر خواہی مطلوب تھی، نہ اس لیے کہ وہ ان کو تکلیف و مصیبت سے بچانا چاہتے تھے، بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ اس کے ملک میں فساد نہ ہونے پائے۔ مگر اسی کے ساتھ ان لوگوں کا دوسرا حکم ان الفاظ میں نافذ ہوا:

اقْتُلُوا أَبْنَاءَ الَّذِينَ آمَنُوا مَعَكُمْ وَاسْتَحْيُوا نِسَاءَهُمْ (المومن ۲۵)

ان لوگوں نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا کہ جو لوگ موسیٰ کے ساتھ خدا پر ایمان لے آئے، ان کے بیٹوں کو قتل کر ڈالو اور عورتوں کو زندہ رہنے دو۔

اس حکم سے فرعون اور اس کے ارباب مشاورت کا یہی مقصد تھا کہ جب یہ لوگ ہمارے اعلانات کی جانب سے آنکھیں بند کئے ہوئے ہیں اور ان کی طرف توجہ نہیں کرتے تو بہتر ہے انہیں قتل کی دھمکی دی جائے۔ شاید یہ اشد شدید عذاب ان کی ہمتوں کو پست، ان کے ارادوں کو کمزور اور ان کے جوش و ولولہ کو سرد کر دے، مگر جب یہ حکم بھی بیکار ثابت ہوا تو اس نے نہایت ہی غصہ میں کہا:



فَلَا تَقْطَعْنَ أَيْدِيَكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ مِنْ خِلَافٍ وَلَا صَلِّبَتْكُمْ فِي جُذُوعِ النَّخْلِ ۚ وَلِتَعْلَمِنَّ أَنَّ أَشَدَّ عَذَابًا وَأَبْغَىٰ (طہ ۷۱)

تو تمہارے ہاتھ اور تمہارے پیر لے سیدھے کاٹ ڈالوں اور تم کو کھجور کے تنوں پر سولی چڑھا دوں، تو سہی اور اب تم کو اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ ہم دو فریقوں میں کس کی مار زیادہ سخت اور دیر پا ہے۔

مگر ان خوفناک اور دہشت انگیز احکام نے انکے ثبات قدم میں تزلزل پیدا نہیں کیا، وہ اپنے ارادوں پر قائم رہے۔ وہ نہایت ہی جوش و ولولہ اور عشق و محبت کے ساتھ آگے بڑھے اور بے خودانہ و مجنونانہ لہجہ میں فرعون کو عین دربار میں للکار کر کہا:

قَالُوا لَنْ نُؤْمِرَكَ عَلَىٰ مَا جَاءَنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالَّذِي فَطَرَنَا فَاقْضِ مَا أَنْتَ قَاضٍ ۚ إِنَّمَا تَقْضِي هَذِهِ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا (طہ ۷۲)

بولے کہ کھلے کھلے معجزے جو ہمارے سامنے آئے ان پر، جس نے ہم کو پیدا کیا ہے اس پر تو ہم تجھ کو کسی طرح ترجیح دینے والے ہیں نہیں، تو جو کر نیوالا ہے کر گذر، تو دنیا کی اسی زندگی پر حکم چلا سکتا ہے کہ ہم کو عذاب دے یا بہت کرے تو جان سے مراد ہے۔

سچائی کی پرستش اور حق کی حمایت نے کمزور و ناتوان لوگوں کو ہمیشہ قوی و طاقتور بنا دیا ہے، پھر وہ حق کی حفظ و صیانت کے لئے باطل کا مقابلہ کرنے کو کھڑے ہو جاتے ہیں۔ باطل کی طاقت خواہ کیسی ہی زبردست ہو، مگر وہ ان میں ضعف و اضمحلال نہیں پیدا کر سکتی: فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا (ال عمران ۱۳۶) پھر وہ لوگ خدا کی راہ میں تکلیف پہنچنے سے ہارے نہیں، وہ نہ سست ہی ہوئے اور نہ دب گئے: لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا (التوبہ ۴۱) غم نہ کرو، بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے، میں یہی حقیقت مضمر تھی: الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا (فصلت ۳۰) یہ صرف اس لیے اللہ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں کہ وہ باطل پرستارانہ قوتوں اور فراعنہ و وجاہلہ وقت سے خوف زدہ نہیں ہوتے، ان کو نہ تو اپنی جان عزیز ہوتی ہے اور نہ مال۔ پھر نصرت الہی بھی ان کا ساتھ دیتی ہے، اور کم من فئۃ قلیۃ غلبت فئۃ کثیرۃ کی حقیقت خفیہ مستبدانہ حکومتوں کے سامنے آشکارا ہو جاتی ہے۔ اس وقت وہ حق کی قوتوں کے آگے اپنی گردنیں خم کر دیتی ہیں، مگر دراصل ان کی تباہی کا وقت آگیا ہوتا ہے، اس لئے ان سے کہا جاتا ہے کہ:

آلَنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ (۱۰:۹۱)

کیا اب ایسے وقت میں ایمان اور تیرا حال تو یہ تھا کہ اس سے پہلے برا برا فرمائی کرتا رہا اور تو مفسدوں میں سے ایک ہی تھا۔

سنت اللہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب فرعون کے دربار میں آتے ہیں اور اس سے اپنی نجات کا مطالبہ کرتے ہیں، تو دیکھو وہ اکیلے ہوتے ہیں، کوئی ان کا یار و مددگار نہیں، فرعون کی حکومت ہے، جس کے قہر و استبداد، ظلم و جور نے عرش الہی تک کو ہلا دیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو خدا کہتا ہے اور جو اس کو نہ مانے اس کو موت کے گھاٹ اتارتا ہے، وہ موسیٰ کے مطالبہ پر استہزاء و تمسخر کرتا ہے۔ ان کو ذلیل اور اپنے آپ کو عزیز و محترم خیال کرتا ہے: أَمَّا خَيْرٌ مِنْ هَذَا الَّذِي هُوَ مَهِينٌ ۖ وَلَا يَكَادُ يُبِينُ (۱۰:۹۲)

(الزخرف ۵۲) بیشک، میں اس شخص سے جو کچھ عزت نہیں رکھتا اور صاف گفتگو بھی نہیں کر سکتا کہیں بہتر ہوں، ان کو جادو گر اور پاگل کہتا ہے، تمام درباری اس پر ہنستے ہیں۔

اس غربت اولیٰ کا منظر تمہارے سامنے ہے۔ تمام ملک کو ان کی مخالفت پر ابھارا جاتا ہے، عوام الناس میں اس کے خلاف جوش پھیلا جاتا ہے۔ آہ! تم نہیں دیکھتے کہ فرعون کی تمام باطل پرستارہ سعی و کوشش کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ ملک کس

کا ساتھ دیتا ہے اور روز بروز کس کے اعوان و انصار میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ فرعون ابتداء میں نرمی سے کام لیتا ہے، جب یہ طریق عمل کامیاب ثابت نہیں ہوتا تو سختی کرتا ہے، کہ شاید لوگ ڈر کر موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ چھوڑ دیں۔ وہ جادو گروں کو دعوت دیتا ہے کہ جلسہ عام میں اس کو ذلیل کریں، مگر وہ جو بے کسوں کا چارہ ساز اور آہ نیم شبی کا سننے والا ہے، اس کی کار فرمائی ملاحظہ ہو کہ جو لوگ حق کی مخالفت پر کمر باندھ کر آئے تھے، وہی موسیٰ کے دست و بازو بن جاتے ہیں۔ اور لاکھوں انسانوں کے سامنے اس ظالم و جابر بادشاہ کو ذلیل و رسوا کرتے ہیں۔

یہ سنت اللہ ہے کہ حق کی حمایت کرنیوالے ابتداء میں ہمیشہ کم ہوا کرتے ہیں۔ ان کا ارتقاء تدریجی ہوا کرتا ہے۔ ارباب دولت و ثروت ان کو ذلیل خیال کرتے ہیں، مگر انجام کار وہی کامیاب و بامراد ہوتے ہیں۔ بدعہ الا سلام غریبا و سيعود غریبا فطوبی للفرعاء۔ اس حق پرست جماعت کی سچائی اور صداقت کی سب سے بڑی نشانی یہ ہوتی ہے کہ ابتداء میں بہت کم لوگ اس کے ساتھ ہوتے ہیں، مگر جو اس حزب اللہ میں داخل ہوتے ہیں، وہ پھر پیچھے ہٹنے کا نام نہیں لیتے۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کا ہر قل نے ابوسفیان سے گفتگو کرتے وقت اظہار کیا۔

کیا آپ نہیں دیکھتے کہ جن لوگوں نے رسول عربی کی سب سے زیادہ مخالفت کی، انجام کار وہی سب سے زیادہ فداکار اسلام ثابت ہوئے۔ عمرو بن عاص، نجاشی والی حبش کے پاس قریش کا سفیر بن کر جاتا ہے کہ ان مسلمانوں کو حاصل کر لے جو کفار مکہ کی تکالیف و شدائد سے تنگ آکر حبش کی جانب ہجرت کر گئے تھے۔ چند سال کے بعد یہ حالت ہوتی ہے کہ وہی والی عمان کے پاس سفیر اسلام بن کر جاتے ہیں اور ہزاروں اشخاص کے مسلمان ہو جانے کی خوشخبری دربار رسالت میں لاتے ہیں۔

خالد بن ولید جنگ احد میں کفار کے کمان دار ہیں اور مسلمانوں کو فنا کرنے کی فکر میں ہیں۔ ان کو دیکھتے تو لات و عزی کے مندروں کو اپنے ہاتھ سے گراتے ہیں اور اکثر فتوحات کی بدولت ان کو دربار رسالت سے سیف من سیف اللہ کا معزز و محترم خطاب نوازش کیا جاتا ہے۔ جس وقت رسول اللہ ﷺ مکہ جانے کا قصد کرتے ہیں تو حدیبیہ کے میدان میں عروہ بن مسعود قریش کے سفیر بن کر آتے ہیں کہ آپ کو اس ارادہ سے باز رکھیں، وہ خود بخود مدینہ میں آتا ہے اور اسلام قبول کر کے اپنی قوم میں اسی کی تبلیغ و اشاعت کرتا ہے۔ عمر بن الخطاب گھر سے تلوار لے کر نکلتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا سر قلم کریں، مگر جاتے ہی حلقہ بگوش اسلام بن جاتے ہیں۔ طفیل دوسی جبکہ مکہ میں آتے ہیں تو اپنے کانوں میں روئی کی ڈاٹ رکھ لیتے ہیں کہ محمد ﷺ کی آواز کان میں نہ پہنچے۔ بالآخر اپنے وطن میں گھر گھر پھرتے اور محمد ﷺ کی آواز کو پہنچاتے

ہیں۔ وہی عبدیایل ثقفی، جس نے طائف میں غلاموں اور بچوں کو پتھر پھینکنے کے لئے نبی ﷺ کے پیچھے لگا دیا تھا، انجام کار مدینہ میں حاضر ہوتا ہے، اور وہاں سے اپنی قوم کے لئے ایمان و یقین لے کر جاتا ہے۔ تم جانتے ہو کہ جنگ حنین میں جبکہ سب لوگ بھاگ کھڑے ہوئے تھے، کون تھا جو رکاب نبوی ﷺ کو تھامے ہوا تھا، یہ وہی ابوسفیان بن حارث بن عبد المطلب تھا جو اگرچہ رسول اللہ ﷺ کے حقیقی چچا کا بیٹا تھا، مگر آپ کی ہجو میں اشعار کہا کرتا تھا۔

یہی سنت اللہ ہے کہ انجام کار اپنے اور بیگانے سب تسلیم کر لیتے ہیں۔ سب کی گردنیں جھک جاتی ہیں اور سب مان جاتے ہیں کہ جس راہ پر ہم کو یہ مصلح اعظم لیجانا چاہتا ہے، وہ یقیناً نجات کی راہ ہے اور اس پر چل کر ضرور کامیاب ہوں گے۔ ہماری تمام دقتیں اور تکلیفیں دور ہو جائیں گی۔ وہ ہمیں حکومت و آزادی دلوانے کا وعدہ کرتا ہے۔ ضرور ہے کہ یہ پورا ہو کر رہے، یہی وجہ ہے کہ ملک اس کے ساتھ ہو جاتا ہے اور ظالمانہ حکومت کے اعوان و انصار میں روز بروز کمی ہوتی جاتی ہے۔

### طاقت کی نمائش

قوم میں زندگی کے آثار نمودار ہو گئے ہیں، اسے اپنی غلامانہ ذلت اور محکومانہ رسوائی کا احساس ہو رہا ہے، وہ اپنے دل میں تڑپ پاتی ہے، اس کا جی چاہتا ہے کہ آزاد سر زمین ہو، کوئی غیر حاکم نہ ہو اور نہ کسی کے ماتحت زندگی بسر کرنی پڑے، اس لئے سعی و کوشش ہوتی ہے۔ عام لوگوں میں جوش و ہيجان پیدا ہوتا ہے، شوق و ولولہ طلب سے ہر ایک سر فروشانہ اقدام کرنا چاہتا ہے، مگر حکومت سدر راہ بن جاتی ہے۔ اس حیات قومی اور سرگرمی عمل کو دبانیے کے لئے طرح طرح کے حیلے تراشتی ہے۔ ہر قسم کے ظالمانہ قوانین کی تدوین و ترتیب ہوتی ہے اور اگر یہ شویدہ سر لوگ ان مجنونانہ اجتماعات کو قائم کریں تو ان کو ڈرانے اور دھمکانے کے لئے فوجی طاقت کی نمائش ہوتی ہے۔

جب فرعون نے دیکھا کہ موسیٰ و ہارون کا اثر برابر بڑھتا جاتا ہے، تو اسے یہ خوف دامن گیر ہوا کہ اگر اس وقت ان کی راہ میں زبردست رکاوٹ نہ پیدا کی گئی، تو آگے چل کر یہ دونوں میری حکومت کو برباد کر دیں گے۔ اس لئے اپنا رعب و اقتدار قائم رکھنے اور ان کو ہیبت زدہ کرنے کے خیال سے اس نے اپنی تمام تر فوجی طاقت کا مظاہرہ کیا، کہ رعایا کے لوگ اس شاہانہ شان و شوکت، فراوانی مال و دولت، کثرت اعدا و دشمن، سامان حرب کی نمائش اور تلواروں کی چمک سے خوفزدہ ہو جائیں اور حریت و استقلال قومی کے خیالات و افکار کو دلوں سے نکال دیں۔

فَجَبَّ السُّعَىٰ فَلَيْسَتْ يَوْمَ مَعْلُومٌ ﴿٥٠﴾ وَقِيلَ لِلنَّاسِ هَلْ أَنتُمْ مُجْتَمِعُونَ ﴿٥١﴾ (الشعر آء ۳۷ تا ۳۸)

اس روز مقرر کے وعدے پر جادو گر جمع کئے گئے اور لوگوں میں منادی کرادی کہ اب تک تو خیر تم لوگ الگ تھک رہے، اب ایسے موقع پر بھی تم لوگ جمع ہو گے یا نہیں۔  
اس نمائش سے فرعون کا مقصد یہ تھا کہ،

(الف) جو لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے ہیں، وہ اپنے انجام اور عاقبت کار سے خوفزدہ ہو کر آزادی کے جنون کو سر سے نکال دیں۔

(ب) عام لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اس حکومت کے قبضہ و اقتدار میں کس قدر قوت و طاقت ہے۔ وہ جب چاہے کتنی فوج فراہم کر سکتی ہے۔ پھر جس سلطنت کے ذرائع و وسائل اس کثرت کے ساتھ ہوں، وہ ایک بے سرو سامانی موسیٰ سے کیا خوفرزدہ ہوگی۔

(ج) چونکہ موسیٰ کے بار بار مطالبہ آزادی و حریت نے عوام الناس پر اپنا اثر ڈال لیا ہے اور لوگوں کے دلوں سے حکومت کا رعب اٹھ گیا ہے، یہ نمائش کی گئی کہ اس کا رعب قائم ہو جائے اور اس کی ہیبت میں کسی قسم کا فرق نہ آنے پائے۔

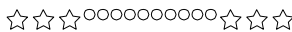
## کلمہ حق کا خوف

بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قوت و طاقت فرعون کے ساتھ ہے۔ سلطنت کے خزانے اس کے قبضہ و اقتدار میں ہیں اور فوج اس کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن کلمہ حق اور خدا کا ارادہ حریت کی پادشاہت اور خسروی ملاحظہ ہو کہ ان کی تعداد قلیل ہے، ان کے پاس ذرائع و وسائل عیش و کامرانی نہیں۔ وہ لوگوں کو پھولوں کی بیج پر لیٹنے کی دعوت نہیں دیتے، بلکہ کانٹوں کے بستر ہیں جن کی طرف ان کو بلاتے ہیں، مگر یہی چھوٹی سی جماعت ہے جو باوجود قلت تعداد، فقدان اسباب اور ضعف ظاہری کے جنود کفر و ضلالت میں ہیبت پیدا کر رہی ہے۔ ایوان حکومت میں زلزلہ آرہا ہے اور اعضاء و ارکان حکومت اپنے آپ کو خطرات و مہالک میں گھرا ہوا پاتے ہیں۔

إِنَّ هَؤُلَاءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيلُونَ ﴿٥٠﴾ وَإِنَّهُمْ لَنَا لَغَائِظُونَ ﴿٥١﴾ وَإِنَّا لَجَبِينُمْ خِذْرُونَ ﴿٥٢﴾ (الشعر ۵۲-۵۱-۵۰)

بنی اسرائیل تھوڑی سی جماعت ہیں، اور انہوں نے ہمیں سخت ناراض کیا ہے اور اگرچہ ہماری جماعت کثیر ہے مگر ہمارا شیوہ احتیاط ہے، اس لئے تم کو مدد کے لئے بلاتے ہیں۔

فرعون کا دل اس جماعت کی روز افزوں ترقی اور کامیابی کو دیکھ کر کانپ رہا ہے۔ اسے اپنی کمزوری و ناتوانی کا احساس ہو رہا ہے۔ وہ یہ بھی دیکھ رہا ہے کہ کل جن لوگوں کی امداد و اعانت پر مجھے پورا اعتماد اور بھروسہ تھا آج وہ میری جماعت سے کٹ کر موسیٰ علیہ السلام سے مل گئے ہیں، اس لئے دوراندیشی کے خیال سے وہ اپنے باقی ماندہ اعوان و انصار کو مدد کے لیے بلاتا ہے، مگر اس مدد کے طلب کرنے میں بھی وہ دجل و فریب اور وسائل سیاست سے کام لیتا ہے۔ وہ اپنی بے بسی اور بے کسی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے اور ظاہر بین نظروں کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہانہ رعب و داب، قوت و طاقت اور تائید الہی اسی کے ساتھ ہے۔ مگر اہل نظر اور ارباب بصیرت خوب جانتے ہیں کہ اس قسم کے اعلانوں کی تہ میں کون سی چیز کام کر رہی ہے اور حقیقت اصل یہ کیا ہے۔



## باب نمبر ۳

## انجام

جھوٹے وعدے

ظالم حکومتوں کی ایک عادت یہ بھی ہے کہ جب وہ دیکھتی ہے کہ اب رعایا میں اپنی آزادی کا قوی احساس پیدا ہو گیا ہے، قوت و طاقت اور فوجی نمائش نے کوئی کام نہیں دیا، بلکہ اس کا جوش و عشق حریت و استقلال اور ترقی کرتا جاتا ہے، اب اگر سختی سے کام لیا تو بنابنائیا کھیل بگڑ جائے گا، تو پھر وہ جھوٹے وعدوں پر آتی ہیں۔ رعایا کو غلط امیدیں دلاتی ہیں اور دور از کار تو قعات سے ان کا دل بہلاتی ہیں اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کی حرارت قومی سرد پڑ جائے اور جوش میں کمی پیدا ہو۔

فرعون پر جب کبھی مصیبتیں نازل ہوئیں اور تکالیف نے اس کو چاروں طرف سے گھیر لیا، تو وہ ہمیشہ موسیٰ سے طالب اعانت ہوا۔ اور وعدہ کیا کہ اگر ان مصیبتوں اور تکلیفوں کے بادل چھٹ گئے تو میں اسی وقت نبی اسرائیل کو آزاد کروں گا، مگر ایسا بارہا ہوا کہ موسیٰ کی دعاؤں نے فرعون کی عین وقت پر یادری کی اور اس کو ہر تکلیف و مصیبت سے نجات مل گئی، لیکن وہ ہمیشہ بد عہد ثابت ہوا اور کبھی اپنی بات پورا کرنے کی تکلیف گوارہ نہ کی، کہ فراعنہ و دجالہ کی یہی سنت ہے۔ اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

وَقَعَمَ عَلَيْهِمُ الرَّجْزُ قَالُوا يٰنُوسَىٰ اذْعُمْ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عٰهَدَ عِنْدَكَ ۚ لَٰنَ كَسَفَتْ عَنَّا الرَّجْزُ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ  
مَعَكَ بَنِي إِسْرَءٰٓءِلَ ﴿٣٧﴾ فَلَمَّا كَسَفْنَا عَنْهُمْ الرَّجْزَ اِلٰٓى اٰجَلٍ هُمْ يَلٰغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُشُوْنَ ﴿٣٨﴾ (الاعراف ۱۳۳ تا ۱۳۵)

جب ان پر عذاب نازل ہوا تو کہتے: اے موسیٰ، تم سے جو خدا نے قبول دعا کا وعدہ کر رکھا ہے اس کے آسرے پر اپنے پروردگار سے ہمارے حق میں دعا کرو اور اگر تم نے ہم پر سے اس عذاب کو ٹال دیا تو ہم ضرور تم پر ایمان لے آئیں گے اور بنی اسرائیل کو بھی ضرور تمہارے ساتھ بھیج دیں گے، پھر جب ہم ایک وقت خاص کے لئے جن تک ان کو پہنچنا تھا عذاب کو ان سے ٹال دیتے، تو وہ فوراً ہی بد عہدی کرنے لگتے۔

اس آیت میں حسب ذیل امور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

(الف).... جب حکومت پر کوئی مصیبت آتی تو اسی ذلیل و کمزور رعایا کی طرف توجہ ہوتی، اس کی مدح و ستائش کے گیت گائے جاتے، اس کے سپاہیانہ جذبات، مالی فداکاری اور جوش مذہبی سے اپیل کیا جاتا۔

(ب).... اپنی مصیبتوں اور تکلیفوں کو دور کرنے کے لئے ان لوگوں سے صلح و آشتی کی جاتی اور ان سے درخواست کی جاتی کہ عارضی طور پر وہ اپنی مخالفانہ کوششوں کو ترک کر دیں۔

(ج).... ان سے وعدے کئے جاتے کہ اس مصیبت عظمیٰ اور واہیہ کبریٰ سے نجات حاصل کرتے ہی تمام مطالبات قومی پورے کر دیے جائیں گے۔ تمہاری ہر تکلیف و مصیبت کا علاج ہو جائے گا اور کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے گی۔

(د).... لیکن جب تکلیفوں سے نجات ملتی اور رنج و غم کے بادل چھٹ جاتے تو ان تمام وعدوں پر پانی پھر جاتا، کاغذ کے ایک پرزے سے زیادہ ان کی حقیقت نہ ہوتی، بلکہ جس قوم نے دھوکے میں آکر اس قدر جوش فداکاری و سرفروشی کا اظہار کیا تھا، اس کی عملی قوتوں کو معطل و بیکار کرنے کے لئے اور زیادہ سخت قوانین کی ترغیب عمل میں آتی۔

چاہئے یہ تھا کہ جس بد بخت قوم نے اپنی زندگی اور موت، حکومت کے حوالہ کر دی ہو، جس نے اپنی دولت و ثروت اس پر قربان کر دی ہو اور جس نے ہر ممکن طریقہ سے اس کی امداد و اعانت کی ہو، اس کی ہر طرح دل جوئی کی جاتی، اس کی ترقی کے لئے مختلف تدابیر سوچی جاتیں اور اس کو موقع دیا جاتا کہ وہ آزاد ہو کر اپنے اوپر خود حکومت کر سکے، مگر فرعون کی شوریدہ سری ملاحظہ ہو کہ وہ صرف بد عہدی ہی پر قناعت نہیں کرتا اور اپنی بیہودہ حرکت پر نادم نہیں ہوتا، بلکہ بنی اسرائیل کو تکلیف و مصیبت میں ڈالنے اور ان کا دل دکھانے کا پورا سامان کرتا ہے۔ ان کی تفحیک و تحمیق اور ان کی سادہ لوحی پر تمسخر و استہزا کرتا ہے۔ وہ لوگ تو اپنی قومی آزادی کے لئے کوشش کرتے ہیں، مگر یہ ان کی سعی کو ہنسی میں اڑا دیتا ہے۔

فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ إِذْ أَهَمُّ مِنْهَا يَضْحَكُونَ ﴿٢٥﴾ (الزخرف ۷۷)

تو جب موسیٰ ہمارے مجرے لے کر ان کے پاس آئے تو وہ لگے ان کی ہنسی اڑانے۔  
مگر انجام کار اس کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمسخر و استہزا دراصل خود اپنے ساتھ کر رہا تھا۔

احسانات کی یاد

حکومت کرنے کے دو طریقے ہیں۔

(الف) اگر حاکم جماعت کو رعایا کے ساتھ الفت و ہمدردی ہے، تو اس کی سب سے پہلی کوشش یہ ہوگی کہ ان میں اخلاق صالحہ اور صحیح کریکٹر پیدا کر دے اور ان کی ایسی تربیت کرے کہ خود ان میں حکومت و جہانبانی کی قابلیت پیدا ہو جائے۔

(ب) لیکن اگر تلوار کے زور سے اور طاقت کے بل پر لوگوں کو اپنا غلام و محکوم بنالیا ہے، اس کے تعلقات و روابط اپنی ماتحت قوموں کے ساتھ محض تاجرانہ اصول پر مبنی ہیں اور اس کو رعایا کے سود و زیاں سے کوئی سروکار نہیں، تو اس کی کوشش ہوگی کہ ان لوگوں میں سیرت نہ پیدا ہو، روز بروز یہ بد اخلاقی کے گڑھے میں گرتے جائیں، ان کو اپنی گذشتہ شاندار تاریخ سے واقفیت نہ ہو اور ہمیشہ میرے ہی غلام رہیں۔

تورات ہمیں بتاتی ہے کہ فرعون کا طرز حکومت دوسری قسم کا تھا، یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنی حکومت کے ثبات و قیام کے لئے مسئلہ توازن پر عمل کرتے ہوئے بنی اسرائیل کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا اور ان کو ہمیشہ ذلیل سے ذلیل خد متوں کے لئے مجبور کرتا تھا، کہ ابھرنے نہ پائیں۔ ملک میں جس قدر اصلاحات نافذ ہوتی تھیں، ان کا مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ حکام کی مختصر جماعت کو فائدہ پہنچے، اس کی جیبیں سونے اور چاندی کے سکوں سے بھر پور ہوں، اگرچہ ایسا کرنے سے بنی اسرائیل کے لاکھوں افراد بھوک اور فاقہ کشی کی وجہ سے مرجائیں اور ہزاروں فرزندان آدم مختلف امراض اور بیماریوں کا شکار ہوں۔

جس حکومت کا یہ طرز عمل ہو جو اصلاح کے پردے میں انسانوں کو ذبح کرتی ہو، جو انسانی ہمدردی کا نقاب پہن کر ہمارے سامنے آئے اور اپنے عشوۂ و ناز سے عوام الناس کو اپنا فریفتہ کر لے، مگر جب نقاب کو الٹے تو بھیڑیوں اور درندوں کی طرح اپنے گرد و پیش کے تمام انسانوں کو چیرے اور پھاڑے۔ ظاہر ہے کہ کسی شریف انسان کو ایک لمحہ کے لئے بھی ایسی حکومت کے ساتھ ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ اور اگر افراد رعایا اس کی سحر طرازیوں سے مسحور ہو گئے تھے، تو جس وقت ان میں جس و بیداری پیدا ہوگی، اس کے اشد شدید دشمن بن جائیں گے اور ایسی ظالمانہ حکومت کے تباہ و برباد کرنے کے لئے اپنی تمام کوششیں وقف کر دیں گے۔

پانی سر سے گزرنے کے بعد حکومت کی آنکھیں کھلتی ہیں۔ وہ دیکھتی ہے کہ بنی اسرائیل کے لئے تنبیہ و اعتبار کی راہیں کھل گئی ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم و تربیت نے ان کو آزادی کے لئے تیار کر دیا ہے۔ اب فرعون اپنی حکومت کے بقا و استحکام کی خاطر اپنے گزشتہ احسانات یاد دلاتا ہے، اپنے سابقہ کارناموں کا تذکرہ کرتا ہے، اس نے جو جو اصلاحات نافذ کی ہیں ان کی منظر عام پر جلوہ نمائی کی جاتی ہے۔ اور اس تمام تر خدع و فریب اور دجل و شیطنت کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ ان فریب کاریوں اور ملمع سازیوں میں پھنس کر رعایا کے عام لوگ اس حکومت کو اللہ کا احسان عظیم خیال کریں، بادشاہ وقت کو ”ظل اللہ“ اور ”اوتار“ سمجھیں اور اس سے انحراف و بغاوت کو گناہ عظیم تصور کریں۔

فرعون پر یہ حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ بنی اسرائیل حریت و استقلال کے لئے تیار ہو چکے ہیں۔ موسیٰ نے آتے ہی دربار فرعون میں اپنا مطالبہ پیش کر دیا تھا کہ: ارسل معنا بنی اسرائیل، مگر اس صدائے حریت نے اس قوم کو آزادی بخشے اس لیے قابل غور اپنی حکومت و فرمان روائی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے وہ ان الفاظ میں موسیٰ کو خطاب کرتا ہے۔

اَلَمْ نُرَبِّكَ فَيُنَاوِلِنَا اَوْ كُنْتَ تَسْمِنُ ۖ (الشعراء: ۱۸)

کیا ہم نے تجھ کو اپنے ہاں رکھ کر بچے سانہیں پالا اور تیری اتنی عمر ہونے آئی تو اپنی اس عمر میں سے برسوں ہمارے ہاں رہا۔ تم تہذیب و شائستگی سے عاری، تمدن و حضارت سے بے بہرہ، محاسن اخلاق و فضائل اعمال سے ناواقف اور علوم و معارف سے محروم تھیں، جنگلیوں کی سی زندگی بسر کرتے، حیوانوں کی طرح رہتے اور درندوں کی مانند ایک دوسرے



کو چیرتے پھاڑتے تھے، کپڑا پہننے، کھانا کھانے، بات کرنے کی تمیز نہ تھی۔ تمہاری بے کسی اور بے بسی کی یہ حالت تھی کہ سمندر کی موجوں کے رحم پر چھوڑ دیئے گئے تھے۔ تمہارا کوئی نگران کار و محافظ نہ تھا۔ ہم نے تمہاری نگہداشت اپنے ذمہ لی، تعلیم و تربیت کا انتظام کیا، تمہیں مہذب و شائستہ بنایا، رہنے کا ڈھنگ سکھایا، قصور و محلات شاہی میں رہ کر تم میں عقل و شعور اور تمیز پیدا ہوئی، تمہارے آرام کی خاطر ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچا دیں، کیا یہ قرین عقل و انصاف ہے کہ ایسی شفیق و مہربان حکومت سے انحراف و بغاوت کرو اور اپنی قوم میں اس کی طرف سے نفرت و حقارت کے جذبات خبیثہ پیدا کرو۔

لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام اس حقیقت سے خوب آشنا تھے کہ ان احسانوں کا شکر گزار ہونا کسی طرح بھی جائز نہیں۔ فرعون کا یہ مقصد ہر گز نہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام اور اس کی قوم کو فائدہ پہنچے اور اس کی تعلیم و تربیت سے وہ اپنی قوم میں زندگی پیدا کرنے کے قابل ہوں، بلکہ اپنے ذاتی اغراض و مقاصد پیش نظر تھے اور اپنے ہی زاویہ نگاہ سے ان امور کو انجام دیا تھا، اتفاق سے دوسرے لوگوں کو بھی فائدہ پہنچ گیا۔ اب ظاہر ہے کہ ان باتوں پر کون عقل مند شکر گزاری کا مطالبہ کرے گا۔ یہ تو ایسی ہی بات ہے کہ زید اپنے ایک دوست خالد سے ملنے کے لئے جاتا ہے، رستہ میں اسکو اتفاقاً ایک ہزار روپیہ کی تھیلی مل جاتی ہے۔ کیا خالد کو یہ حق حاصل ہے کہ زید کو اپنی شکر گزاری کے لئے مجبور کرے۔

موسیٰ علیہ السلام جانتے تھے کہ مجھے اس لئے نہیں پرورش کیا گیا کہ ان لوگوں کو میرے ساتھ کسی قسم کی ہمدردی تھی، بلکہ ان کی خود غرضی اور مطلب پرستی نے ان کو اس کے لئے مجبور کیا تھا۔ فرعون کی بیوی نے جب موسیٰ علیہ السلام کو اپنے خاوند کے بچہ ظلم سے بچانے کی کوشش کی تو یہ کہا:

فَرَأَيْتَ عَيْنِي وَلَكَ لَا تَقْتُلُوهُ عَسَىٰ أَنْ يَنْفَعَنَا أَوْ يَتَّخِذَ وَلَدًا (القصاص ۸)

یہ میری اور تمہاری دونوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے تو تم لوگ اسکو مارو نہیں، عجب نہیں کہ ہم کو فائدہ پہنچائے اس کو اپنا بیٹا ہی بنالیں۔

یہ تو فرعون کے گھر والوں کی غرض و غایت تھی مگر اللہ تعالیٰ کا مقصد کچھ اور ہی تھا وہ چاہتا تھا، لیکن لہم عدوا و حوذا، ان کے دشمن اور ان کی پریشانی کا باعث ہوں۔

جس حکومت نے اس بچے پر روپیہ صرف کیا ہو کہ اس کے عوض میں تمام قوم کو اپنا غلام بنائے۔

جس نے تہذیب و شائستگی اس لئے سکھائی ہو کہ غلامی میں اور زیادہ قوت و استحکام ہو۔

جس نے ہمدردی و مروت کا اظہار اس لیے کیا ہو کہ محکومیت کی بیڑیاں اور طوق مضبوط ہوں۔

جس نے ہر قسم کی سہولتیں اس لئے بہم پہنچائی ہوں کہ ان کو اپنی خود غرضیوں کا شکار کرے۔

جس نے سفر میں آسانیاں پیدا کر دی ہوں کہ تمام کی تمام قوم آرام طلب بن جائے۔

جس نے علوم و فنون کی ترویج اس لیے کی ہو کہ ان کو اپنی گزشتہ تاریخ بالکل تاریک نظر آئے، اپنے آباؤ اجداد کو ہر

قسم کی خوبی اور نیکی سے خالی پائیں اور یہ لوگ سستے داموں غلامی کے لئے تیار ہوں۔



جس نے طہارت و پاکیزگی، عفت و پاکدامنی اور نیکی و فرشتگی سے متنفر کرنے کی پوری کوشش کی ہو۔  
جس نے ہر بد اخلاقی اور فسق و فجور کو اپنی سرپرستی میں لے لیا ہو، اور ملک میں اس کی عام نشر و اشاعت کر دی ہو۔  
اور جس نے قوم کی قوم کو ادنیٰ ترین ضروریات زندگی کے لیے غیروں کا محتاج و دست نگر بنا دیا ہو۔  
وہ حکومت ہر گز اس قابل نہیں کہ اس کا شکریہ ادا کیا جائے اور کبھی کوئی صاحب نظر و بصیرت اس فرعون کے آگے  
سر تسلیم خم نہ کرے گا۔ چنانچہ موسیٰ نے اس فرعون کو مطالبہ کا جواب ان الفاظ میں دیا:

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَبْتَغَاهَا عَلَىٰ أَنْ عَبَّدْتَ بَنِي إِسْرَءِيلَ ﴿٢٢﴾ (الشعر ۲۲)

یہ احسان پرورش جو تم مجھ پر رکھتے ہو کیا اسی کے بدلے تم نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے۔  
فرعون اپنے گزشتہ احسانوں کو یاد دلاتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ان کے شکریے میں وہ بنی اسرائیل کو ابھی اور ایک  
مدت تک اپنا غلام بنائے رکھے، لیکن موسیٰ علیہ السلام اس کو صاف طور پر کہہ رہے ہیں کہ ان کا شکر ادا کرنا بالکل غلط ہے۔ تمہیں  
ہر گز جائز نہیں کہ اس احسان پرورش کی خاطر تمام قوم کو برباد کر دو۔

یہ فرعون حکومتوں کا خاصہ ہے کہ جب تحریکات قومی کسی طرح نہیں دیکھتے، رعایا میں آزادی کا جوش بڑھتا جاتا ہے، نہ  
تو تمسخر و استہزاء کام دیتا ہے اور نہ جابرانہ طریق حکومت کا میاب ثابت ہوتا ہے، تو اپنی رعایا کے جذبہ شکر گزاری کو تحریک  
دینے کے لئے اپنے احسان جتاتی ہیں اور اس طرح کوشش کرتی ہیں کہ عوام الناس اس دھوکے میں آکر ان کا ساتھ دیں اور  
آزادی کی راہ حق ترک کر دیں۔ اگرچہ یہ حقیقت بالکل واضح ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنی رعایا پر کوئی احسان نہیں کیا اور  
واقعات اس کی پوری شہادت دے سکتے ہیں، مگر پھر بھی احمق اور کوتاہ اندیش لوگ اپنی لاعلمی اور جہالت کی وجہ سے اس  
چال بازی کو نہیں سمجھتے اور حکومت کا ساتھ دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔

### فرعون کی ناقابلیت

اس بد بخت کا کبھی بھی یہ مقصد نہ ہوا کہ بنی اسرائیل آزاد ہوں، اس نے ان کی ترقی کی تمام راہیں بند کر دیں تھیں۔  
ذلیل ترین خدمتیں ان کے سپرد کی جاتیں اور کبھی ان کو دولت مند ہونے کا موقع نہ دیا جاتا۔ یہ لوگ مصر میں قریباً  
چار سو سال تک غلامانہ زندگی بسر کرتے رہے اور کبھی اس قابل نہ ہو سکے کہ حکومت کر سکتے۔ اب اس سے زیادہ محکومانہ  
زندگی بسر کرنا کسی طرح بھی قرین عقل و انصاف نہ ہو سکتا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت صرف اس لئے ہوئی تھی کہ بنی  
اسرائیل آزاد ہوں، اور فرعون کے قہر و استبداد سے نجات حاصل کریں۔ ان کو ایسا قانون نوازش کیا گیا تھا، جو ہدیٰ و نور تھا،  
جو حریت و استقلال کا ذمہ دار و کفیل تھا۔ موسیٰ ہر قسم کے سامان و وسائل اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ وہ اپنی عاجز و دردماندہ  
قوم کو غلامی و محکومی کی ذلت و رسوائی سے نکال کر حکومت و خلافت تک لے جانے کے قابل تھے۔ اس لئے انہوں نے جس  
وقت قومی آزادی کا مطالبہ کیا تو اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ میں اس قوم کو راہ ترقی دکھلا سکتا ہوں، ملاحظہ ہو:

فَالْقُلُوبُ غَصَاةٌ فَإِذَا هِيَ تُغْبِطُ ۝ وَذُرْعَاكَ فَإِذَا هِيَ بِيْضَاءُ لِلْظُّلُمِ ۝ (۲۶:۳۳، ۳۴)

اس پر موسیٰ نے اپنی لائٹھی ڈال دی تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ صریح اثر دہا ہے اور اپنا ہاتھ باہر نکالا تو وہ نکالنے کے ساتھ سب دیکھنے والوں کی نظر میں بڑا چمک رہا تھا۔

ان معجزات سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے حریف فرعون اور اس کے ارکان سلطنت کو یہ بتانا چاہتے تھے۔

(الف).... یہ لائٹھی بالکل بے جان تھی، میرا ہاتھ لگتے ہی اس میں زندگی پیدا ہو گئی اور وہ حرکت کرنے لگی۔ ایسے ہی بنی اسرائیل چار سو سال تک تمہارے غلام رہے، مگر تمہارا قانون زندگی بخش ثابت ہونے کے بجائے ان کی موت کا باعث بن گیا اور وہ حقیقت میں مر گئے۔ کیونکہ محکومیت اور موت دونوں مترادف الفاظ ہیں۔ حقیقت ایک ہی ہے، اگرچہ نام مختلف ہیں۔ زندگی صرف حکومت اور جہاں بانی کو کہتے ہیں۔ جس وقت بنی اسرائیل تمہاری غلامی سے نجات حاصل کر کے میرے قانون پر عمل کرنا شروع کر دیں گے تو وہ فوراً زندہ ہو جائیں گے اور ارض مقدس کی حکومت انہیں نوازش کی جائے گی۔

(ب).... حرکت کرنے کے بعد لائٹھی نے ان تمام سانپوں کو نگل لیا جو فاسامانی کی خاطر جادو کے زور سے بنائے گئے تھے۔ بنی اسرائیل میرے قانون کا اتباع کر کے زندہ ہو جائیں گے اور ان تمام دشمنوں کو تباہ و برباد کر دیں گے جنہوں نے اب تک ان مظلوموں اور بے کسوں کو سانپ کی طرح کاٹ کھایا ہے، جن کی تہذیب و شائستگی، تعلیم و تربیت اور اصناف علوم و فنون کی نمائش بظاہر نہایت ہی دل فریب اور دل خوش کن تھی، لیکن حقیقت میں اس کا زہر نہ صرف جسم کو ہلاک کر دیتا تھا بلکہ روح پر بھی عالم ممت طاری کر دیتا تھا۔

(ج).... میرے ہاتھ نے میرے حکم کی تعمیل کی تو روشن ہو گیا اور اب کسی آنکھ کو طاقت نہیں کہ اس کی طرف دیکھ سکے، سب کے سب محو حیرت و استعجاب ہیں۔ ایسے ہی جب بنی اسرائیل میرے دست و بازو بن کر حریت قومی کے لیے سرفروشانہ اقدام کریں گے، ہر قسم کے ایثار و قربانی کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لیں گے تو ان کی ترقی نہایت سرعت کے ساتھ ہوگی۔ تمام قومیں ان کو حیرت سے دیکھیں گی۔ کسی میں ان کے مقابلہ کی طاقت نہ ہو گی اور دنیا میں ان کا نام روشن ہو جائے گا۔

ان دونوں معجزات کو قرآن حکیم نے مختلف ناموں سے یاد کیا ہے۔ ایک جگہ انکو فتح و کامرانی اور غلبہ فرمایا: وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِينٍ ۝ (ہود ۹۶) ایک موقع پر ان کو آزادی کے زبردست دلائل سے تعبیر کیا: فَذٰلِكَ بُرْهٰنُنَا مِنْ رَبِّكَ (قصص ۳۲) ایک مقام پر ان کو اللہ نے اپنی آیات کبریٰ سی یاد کیا۔ مقصد ان تمام آیات کا یہی ہے کہ اب بنی اسرائیل کی آزادی کا وقت آگیا اور موسیٰ علیہ السلام کے پاس وہ قانون موجود ہے جو ان کے استقلال قومی کا ضامن ہو سکتا ہے۔

ان معجزات کو دیکھ کر فرعون کو اس امر کا موقع مل گیا کہ عوام الناس کو دھوکا دے۔ چنانچہ اس نے لوگوں کو مخاطب

کر کے کہا:

إِنَّ هَذَا لَسِحْرٌ عَلَيْنِمْ ﴿٣٥﴾ يُرِيدُ أَنْ يُخْرِجَكُمْ مِنْ أَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِ ﴿٣٦﴾ (الشعر آء ۳۴ تا ۳۵)

بیشک یہ شخص ماہر جادوگر ہے۔ چاہتا ہے کہ تم کو تمہارے ملک سے اپنے جادو کے زور سے نکال باہر کرے۔

### اقتدار کا بھوت

ظالم و جابر اور اجنبی حکومتوں کی ایک عادت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنی آنکھوں سے حق و صداقت کو روز روشن کی طرح دیکھ لیتی ہیں۔ وہ جانتی ہیں کہ رعایا جو مطالبات پیش کرتی ہے وہ جائز اور درست ہیں اور ہر طرح سے ان کے پورا کرنے کی اہلیت بھی ان میں ہے، بلکہ بسا اوقات حکومت کے بعض ذمہ دار افراد بھی اس حقیقت کو کھلے الفاظ میں تسلیم کر لیتے ہیں اور خود لوگوں کو بھی ان کی تقریروں سے یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ اب ہمارے حقوق ادا ہوں گے اور ہمیں کامل آزادی نصیب ہوگی۔

مگر ہمیشہ مواقع میں اقتدار اور رعب کا بھوت افراد حکومت کے سر پر سوار ہو جاتا ہے۔ انہیں یہ ڈر لگتا رہتا ہے کہ اگر ہم نے رعایا کے مطالبات تسلیم کر لیے تو ہمارے اقتدار میں فرق آجائے گا۔ ہمارا ڈر لوگوں کے دلوں سے جاتا رہے گا، قانون بالکل لغو و مہمل ہو کر رہ جائے گا اور ہماری حکومت کی بنیادیں متزلزل ہو جائیں گی، اس لئے وہ ان کے مطالبات کو ٹھکرادیتی ہے اور ان کے پورا کرنے سے بلطائف الجلیل انکار کر دیتی ہے۔

چنانچہ فرعون اور اس کی حکومت کے افراد یہی کیا کرتے تھے۔ سورۃ مومنون میں آتا ہے:

ثُمَّ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ وَأَخَاهُ هَارُونَ بِآيَاتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِينٍ ﴿٣٥﴾ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ فَاسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا عَالِينَ ﴿٣٦﴾ فَقَالُوا أَنْتُمْ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عِدُوْنَ ﴿٣٧﴾ فَكَذَّبُوهُمَا فَكَانُوا مِنَ الْمُهْلَكِينَ ﴿٣٨﴾ (المومنون ۳۵ تا ۳۸)

پھر ہم نے موسیٰ اور ان کے بھائی ہارون علیہ السلام کو اپنی نشانوں اور دلیل ظاہر کے ساتھ فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا، تو وہ سب شیخی میں آگئے اور وہ تھے بھی سرکش لوگ۔ تو آپس میں لگے کہنے، کیا ہم ان دو شخصوں پر کہ وہ بھی ہمارے ہی جیسے ہیں ایمان لے آئیں، حالانکہ ان کی قوم کی قوم ہماری خدمت گار ہے۔ غرض ان لوگوں نے دونوں کو جھٹلایا تو انجام یہ ہوا کہ ہلاک کر دیئے گئے۔

فرعون اور اس کے ارباب شوریٰ نے حضرت موسیٰ کے مطالبات تسلیم نہ کئے اور بنی اسرائیل کو آزادی کامل دینے سے انکار کر دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سب کے سب حق کے ٹھکرادینے کی وجہ سے برباد ہو گئے۔ پس آج بھی جو حکومت فرعون کے نقش قدم پر چلے گی، وہ اس حقیقت کو پیش نظر رکھ لے کہ اس کا بھی وہی انجام ہو گا: وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

## ذہاب الی اللہ

جب نوبت یہاں تک آگئی تو بنی اسرائیل ترک وطن اور ہجرت الی اللہ کیلئے مجبور ہو گئے، کہ بلاد بعیدہ میں جا کر اپنے وطن کی آزادی کے لیے سعی و کوشش کریں اور اپنی تمام قوتوں کو ایک مرکز پر جمع کر کے آنے والے وقت کیلئے تیار ہو جائیں، مگر بد بخت فرعون نے انکے اس رستہ میں بھی رکاوٹیں پیدا کیں اور ہر طرح سے مسلح ہو کر ان کا دور تک تعاقب کیا۔

فَاتَّبَعُوهُمْ مُشِرِّقِينَ ﴿٦٠﴾ فَلَمَّا تَرَاءَ الْجَنْعُ قَالَ أَصْحَبُ مُوسَى إِنَّا لَمُدْرِكُونَ ﴿٦١﴾ قَالَ كَلَّا ۚ إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ ﴿٦٢﴾ (الشعر آء ۶۰ تا ۶۲)

تو فرعون کے لوگوں نے دن نکلنے نکلنے بنی اسرائیل کا تعاقب کیا۔ پھر جب دونوں جماعتیں ایسی قریب ہو گئیں کہ ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں تو موسیٰ کے لوگ لگے کہنے کہ اب تو دشمن نے ہم کو آلیا۔ موسیٰ نے کہا ہرگز نہیں، میرے ساتھ میرا پروردگار ہے اور کوئی دم میں وہ مجھ کو مخلصی کا رستہ دکھائے گا۔

فرعون کا لشکر اور اس کا ساز و سامان دیکھ کر بنی اسرائیل کے اوسان خطا ہو گئے اور یہ کوئی عجیب بات نہیں، جو قوم ہمیشہ سے دوسروں کی غلام و محکوم رہی ہو وہ اس قسم کے خیالات کا اظہار کرتی ہے، اگرچہ منزل مقصود اس کے سامنے ہو اور سپیدہ صبح نمودار ہو گیا ہو، مگر پھر بھی وہ شک میں مبتلا رہے گی۔ آزادی کی راہ آسان نہیں۔ اس میں تکلیف و مصیبت کا آنا ضروری ہے۔ قصر آزادی کی طرف صرف ایک ہی راستہ جاتا ہے جس کا فرش اینٹ اور چوٹے کا نہیں، بلکہ انسانی خون اور اس کے مغرور سروں کا ہے، قرآن نے اس اصول کی طرف ان الفاظ میں توجہ دلائی۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُدْخِلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۖ مَسَّتْهُمْ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَاءُ وَزُلُّوا حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَى نَصُرُ اللَّهُ ۖ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ ﴿٢١٣﴾ (البقرة ۲۱۳)

کیا تم ایسا خیال کرتے ہو کہ مزے سے بہشت میں داخل ہو گے اور ابھی تک تم کو ان لوگوں کی حالت پیش نہیں آئی جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں کہ ان کو سختیاں بھی پہنچیں اور تکلیفیں بھی اور جھڑ جھرائے بھی گئے یہاں تک کہ پیغمبر اور ایمان والے جو ان کے ساتھ تھے چلا اٹھے، آخر خدا کی مدد کے آنے کا کوئی وقت بھی ہے؟ سنبھلو سنبھلو! اللہ کی مدد کا وقت آگیا ہے۔

جس وقت فرعون نے تنگ آ کر بنی اسرائیل کے لڑکوں کو ذبح کرنے کا حکم دیا تھا، اس وقت بھی ان لوگوں نے موسیٰ ہی پر تمام الزام رکھا تھا کہ جس قدر تکالیف و شدائد حکومت کی جانب سے ہم پر نازل ہو رہی ہیں، وہ آپ ہی کی وجہ سے ہیں۔ اگر آپ یہ مطالبہ نہ کرتے تو آرام سے زندگی بسر ہوتی: قَالُوا أَوْفَيْنَا مِنْ قَبْلُ أَنْ تَأْتِيَنَا وَمِنْ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا (الاعراف ۱۲۹) مگر موسیٰ نے ان کے اس اعتراض کی کوئی پروا نہ کی، اپنی کوشش میں مصروف رہے اور ان کو بتا دیا کہ میری کوششوں کا یہ نتیجہ ہو گا۔

عَلَىٰ رَبِّكُمْ أَن يُمِدَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ (الاعراف ۱۲۹)

اب وہ وقت آگیا ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو ہلاک کرے اور تم کو ملک میں اس کا جانشین بنائے۔ یہ غلامی ہی کے نتائج تھے جن کی بنا پر بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بت بنانے کی درخواست کی اور یہی وہ چیز تھی جس نے ان کی ہمتوں کو پست اور ارادوں کو کمزور کر دیا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کا وعدہ قطعی اور یقینی ہے، مگر بیت المقدس پر حملہ کرنے کے لئے آگے نہیں بڑھتے اور انجام کار اپنی بزدلی اور کمزوری کا اظہار یوں کرتے ہیں فَادْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ، تم اور تمہارا خدا دونوں جاؤ اور ان لوگوں سے لڑو، ہم تو اسی جگہ بیٹھے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ غلاموں اور محکوموں کے جذبات صادقہ پر عالم ممت طاری ہو جاتا ہے، پھر نہ تو ان میں ہمت کی بلندی ہوتی ہے اور نہ ارادہ کی قوت۔ وہ درخت کی ٹہنی کو، جنگلوں اور پہاڑوں کے ہر پتھر کو اور قدرت کی ہر جلوہ نمائی کو اپنے سے زیادہ عزیز و محترم خیال کرتے ہیں۔ اور اس لیے ہر ذلیل سے ذلیل چیز کے آگے سر بسجود ہو جاتے ہیں۔ اس غلامی نے ان کو بزدل بنا دیا اور باوجود آزادی حاصل کرنے کے وہ فرعون کے لشکر کو دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے، مگر موسیٰ نے انہیں اطمینان دلایا کہ جب میں حق پر ہوں تو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی میری اس تحریک آزادی کو فنا نہیں کر سکتی۔ خدائے کریم جو بے کسوں کا چارہ ساز اور مظلوموں کا دادرس ہے، مجھے اس وادی میں اکیلا نہیں چھوڑے گا کہ گم کردہ اور راہ بھٹکتا پھروں، بلکہ وہ میرے ساتھ ہے اور رہ نمائی کرتا ہے، وہی نجات و کامرانی کی صورت بھی پیدا کر دے گا۔

### نتیجہ کی بشارت

جس وقت بنی اسرائیل سر زمین مصر میں انتہائی مظالم کا شکار ہو رہے تھے آسمانوں پر ان کی قسمت کا فیصلہ یوں کیا جا رہا تھا۔  
وَنُيِّدُ أَنْ تَبْنَئَ عَلَى الْبَنِينَ اسْتَضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلُهُمْ أَبْنَاءَ وَنَجْعَلُهُمُ الْوَرْدِثِينَ ۖ وَتَبْكُنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ  
وَنُورِي فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا مِنْهُمْ مَا كَانُوا يَحْذَرُونَ ① (القصص ۶۳۵)

اور ہمارا ارادہ یہ تھا کہ جو لوگ اس کے ملک میں کمزور سمجھے گئے تھے ان پر احسان کریں اور انہیں کو سردار بنائیں اور انہیں کو سلطنت کا وارث ٹھہرائیں اور انہیں کو ملک میں جمائیں اور فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر کو بنی اسرائیل کی طرف سے جس بات کا خطرہ تھا وہ انہیں کے ہاتھ سے ان کے آگے لائیں۔

قرآن حکیم نے ان الفاظ میں ایک دائمی قانون عدل کی طرف ہماری رہ نمائی کی ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ دنیا قوت کے جاہ و جلال کی نمائش گاہ ہے اور کمزوروں کی ہلاکت کا مقتل۔ طاقتور قومیں اور زبردست حکومتیں کمزوروں کو اپنا غلام و محکوم بنا لیتی ہیں، ان میں پھوٹ اور نفاق، بغض اور کینہ اور باہمی انتقام کے جذبات خبیثہ پیدا کر کے ان کی جمعیت کو توڑتی ہیں۔ ان کے مختلف گروہوں اور فرقوں کو آپس میں ملنے نہیں دیتیں، کیونکہ وہ اگر مل کر ایک ہو جائیں گے تو کمزور نہ رہیں گے اور اتفاق و یکجہتی کی طاقت اعلیٰ ترین ظالموں کے تاج و تخت کو الٹ دے گی۔ یہ حال مصر میں بنی

اسرائیل کا تھا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی دنیا کا ایک دوسرا قانون بھی ہے، خدا کا زبردست ہاتھ کبھی کبھی چپکنے والی حرکت کا بھی اظہار کرتا ہے، جب ظلم اور طاقت کی انتہا ہو جاتی ہے، جبر و تشدد اور غرور و تکبر کا شیطان حد سے تجاوز کرتا ہے تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ دنیا طاقت والوں کی جگہ کمزوروں کا گھر بنا دیتی ہے اور وہی زمین جو کمزوروں کے لئے قتل گاہ تھی، طاقت والوں کی تباہی و ہلاکت کا تماشا گاہ بن جاتی ہے۔ پس اس دن چھوٹے بڑے کیے جاتے ہیں اور بڑوں کو چھوٹا کیا جاتا ہے۔ وہ کمزور کر دیئے گئے تھے، وہ کہ بے کس اور بے نوا تھے، وہ کہ صرف رونے ماتم کرنے، بے بسی کی چیخیں مارنے اور لٹنے لٹانے کے لئے تھے، قابل غور وقت آتا ہے کہ احسان الہی کا کے سزاوار ٹھہرتے ہیں اور کمزوری کی جگہ طاقت کے لئے، بے کسی کی جگہ فرماں روائی کے لئے، رونے کی جگہ خوشیوں کے لئے، ماتم کی جگہ عیش و کامرانی کے لئے اور لٹنے کی جگہ لوٹنے کے لئے تمام عالم میں نمایاں ہو جاتے ہیں۔ قوت فرعون کی جگہ قوت موسوی کی تلوار آن کی آن میں دنیا کو پلٹ دیتی ہے اور صدیوں کی گری ہوئی قومیں پھر جاہ و جلال ربانی کے ظہور و قیام کے لئے دنیا کی وارث اور خلیفہ بنا دی جاتی ہیں۔

حسن خاتمہ

اس قدوس حق نوار کی کار فرمائی دیکھئے کہ اس ضعیف و کمزور قوم کو کس طرح وارث تاج و تخت بنا دیتا ہے۔

وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ کَانُوْا یُسْتَضَعُوْنَ مَسَارِقِ الْاَرْضِ وَمَعَارِبِهَا الَّذِیْنَ یُرِکْنَا فِیْهَا ۚ وَ تَبَّتْ کَلِیْتُ رَبِّکَ الْحُسْنٰی عَلٰی بَنِیْۤ اِسْرَآئِیْلَ ۚ بِمَا صَبَرُوْۤا ۚ وَ دَمَرْنَا مَا کَانَ یَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَ مَا کَانُوْا یَعْرِشُوْنَ ﴿۱۳﴾ (الاعراف ۱۳)

اور ملک شام کی زمین جس میں ہم نے برکت دی تھی، آخر کار ہم نے ان لوگوں کو اس کے پورب اور پیچھم کا مالک کر دیا جو فرعون کے ہاں کمزور سمجھے جاتے تھے اور اے پیغمبر، چونکہ بنی اسرائیل نے فرعون کے ظلموں پر صبر کیا، اس لئے تمہارے پروردگار کا وعدہ نیک جو اس نے بنی اسرائیل سے کیا تھا، ان کے حق میں پورا ہوا اور جو سختیاں فرعون اور اس کی قوم کے لوگ بنی اسرائیل کے ساتھ کرتے تھے اور بڑی بڑی اونچی عمارتیں ان سے بے گار میں بنواتے تھے، اس سارے انتظام کو ہم نے درہم برہم کر دیا۔

ادھر تو بنی اسرائیل کو ارض مقدس کا وارث بنا دیا اور ادھر فرعون اور اس کی قوم کو سرزمین مصر سے محروم کر دیا۔

فَاٰخِرُ حَسْبُهُمْ مِّنْ جَنَّتٍ وَّ عِیُّوْنَ ﴿۱۴﴾ وَ کُنُوْۤا مَقَامِرَ کَرِیْمٍ ﴿۱۵﴾ کَذٰلِکَ ۚ وَ اَوْرَثْنَاهَا بَنِیْۤ اِسْرَآئِیْلَ ﴿۱۶﴾

(الشعر آء ۵۷ تا ۵۹)

غرض ہم نے فرعون کے لوگوں کو باغوں اور چشموں اور خزانوں اور عزت کی جگہ سے نکال باہر کیا، ایسا ہی ہوا اور بنی اسرائیل کو ان چیزوں کا وارث بنایا۔

## بصائر للناس

تم نے دیکھ لیا کہ یوسف غلامانہ حیثیت سے مصر میں داخل ہو کر اس سرزمین کے وارث بن جاتے اور تمام اطراف مملکت میں اسرائیل عزت و کرامت کی زندگی بسر کرتے ہیں، مگر جب وہ اپنے شرف و مجد انسانی کو کھو بیٹھتے ہیں اور دائرہ انسانیت سے نکل کر جانوروں اور درندوں کی زندگی اختیار کرتے ہیں، تو ان پر عذاب الہی اس صورت میں نازل ہوتا ہے کہ ان پر ظالم و جابر بادشاہ مسلط کیئے جاتے ہیں جو ان میں پھوٹ اور نفاق کے جذبات پیدا کر کے ان کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیتے ہیں، ہر ایک جماعت دوسری کو فنا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ قریباً چار سو سال تک غلام رہتے ہیں۔ پھر جب فرعون کے مظالم کی انتہا ہو جاتی ہے اور جبر و استبداد اپنے کمال پر پہنچ جاتا ہے، تو رحمت الہی جوش میں آتی ہے اور موسیٰ کو ان کی نجات کے لئے مبعوث کرتی ہے۔ وہ ایک مدت تک فرعون کے گھر میں پرورش پاتے ہیں کہ سیاست کی چال بازیوں اور مکاریوں سے خوب واقف ہوں۔ حکومت کے نظروں فریب، رعب و داب اور ظاہری شان و شوکت کی حقیقت سے آگاہ ہوں اور جہاں بانی و جہاں داری کے اصول و ضوابط کو معلوم کر لیں، پھر ان کو خود جلاوطنی کی مقدس منزل پیش آتی ہے اور دس سال تک شعیب علیہ السلام کی بکریاں چراتے ہیں کہ اس طریق سے غلامانہ زندگی بسر کر کے ان کو معلوم ہو کہ میری قوم کی حالت کیا ہوگی جو چار سو سال سے غلامانہ طور سے رہ رہی ہے، پس وہ آئے اور بے باکانہ فرعون کے دربار میں للکار کر اپنی قوم کی آزادی کا مطالبہ کیا۔

فرعون کو دیکھو، وہ پہلے اس تحریک آزادی کو ہنسی میں اڑانا چاہتا ہے، اور موسیٰ کو مجنون کا لقب دیتا ہے، مگر تھوڑی سی مدت کے بعد اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک نے ملک میں جڑ پکڑ لی ہے، تو وہ سختی پر اتر آتا ہے اور فداکاران حریت کو قید اور پھانسی کی دھمکی دیتا ہے۔ اسے خیال ہوتا ہے کہ یہ سختیاں میری سلطنت کو اور زیادہ محکم و استوار کر دیں گی، مگر دراصل یہی جابرانہ طریق عمل اس کی حکومت کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔ چند روز کے بعد وہ سمندر میں غرق ہوتا ہے اور وہی مظلوم و بے کس وارث تخت و تاج بن جاتے ہیں۔ سچ ہے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ مِنْ بَعْدِ مَا أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ الْأُولَىٰ بِصَافِرٍ لِلنَّاسِ وَهَدَىٰ وَرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿٣٠﴾

(القصص ۳۳)

اور اگلی امتوں کے ہلاک کیے پیچھے ہم نے موسیٰ کو کتاب عنایت کی جس سے لوگوں کی آنکھیں کھلتی تھیں، اور انکے لئے ہدایت اور رحمت تھی اور اس غرض سے دی گئی تھی کہ لوگ نصیحت پکڑ لیں۔

اس خدائے قدوس کے وعدہ کی سچائی کو دیکھو، اس نے کس طرح ایک فرعونی حکومت کو تباہ و برباد کیا۔ پس جس کی آنکھیں ہیں، وہ دیکھے، جس کے کان ہیں، وہ سنے اور جس کا دل ہے وہ غور کرے۔ کہ یہ وعدہ صرف ماضی کے لئے نہ تھا بلکہ مستقبل کے لئے بھی ہے، جو حکومت فرعون کے نقش قدم پر چلے گی وہ اسی طرح سمندروں میں غرق ہوگی۔ اس وعدہ الہی

کے ماضی کو تمام دنیا دیکھ چکی ہے، اب مستقبل کو دیکھنا باقی ہے: وکان وعد امفعولا منزل مقصود سامنے ہے اور سورج اگرچہ دکھائی نہیں دیا، مگر اس کی روشنی خبر دے رہی ہے کہ ظلمت و تاریکی گئی اور نور کا زمانہ آگیا۔ یاس و قنوط کی کوئی وجہ نہیں۔

وَهُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قُنُطُوا وَيُنْشِئُ رَحْمَتَهُ ۖ وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيدُ ﴿٢٨﴾ (الشعوریٰ ۲۸)

اور وہی تو ہے جو لوگوں کے ناامید ہو جانے کے بعد مینہ برساتا ہے اور اپنی رحمت کی برکت کو پھیلا دیتا ہے اور وہ کار ساز اور سزاوار حقیقت ہے۔

فیضی گماں میر کہ غم دل نہفتہ ماند  
اسرار عشق انچہ تواں گفت گفتہ ایم

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العلمین۔

☆☆☆○○○○○○○○☆☆☆☆



بسم الله الرحمن الرحيم

الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلَامٌ عَلَىٰ عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰی

## تفاسیر پر ایک نظر

وسعت بیان

تفاسیر کا جس قدر ذخیرہ اس وقت ہمارے پیش نظر ہے، اس کے دیکھنے سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ فرزندان اسلام نے اپنے تہذیب و شائستگی اور تمدن و حضارۃ کے مبارک عہد میں قرآن حکیم کے حقائق و معارف اور بصائر و حکم پر زور دینے اور دنیا کو اس کا حلقہ بگوش بنانے کے لئے کس قدر انتہائی سعی و کوشش سے کام لیا ہو گا اور اس کی تعلیمات صالحہ کی نشر و اشاعت میں کس درجہ ایشاد و فدویت کا اظہار کیا ہو گا، ان جلیل القدر بزرگوں نے اس کتاب عزیز کے حقیقی مفہوم و معانی کی تبلیغ و دعوت میں سرفروشانہ اقدام کیا اور دنیا کی مختلف زبانوں میں بے شمار تالیفات لکھیں، اگر اس وقت ہم تمام زبانوں کی تفسیروں کو نظر انداز کر کے صرف عربی ہی کو لے لیں تو یقین کیجئے کئی ہزار تک ان کی تعداد پہنچے گی۔ ہم ارباب بصیرت کی ضیافت طبع کے لئے صرف چند تفاسیر کا تذکرہ کرتے ہیں کہ ان کی وسعت بیان کا اندازہ ہو، ملاحظہ کیجئے۔

تفسیر ابن الجوزی: ۲۷ جلدوں میں ہے۔

تفسیر الاصبہانی: ۳۰ جلدوں میں ہے، اس کے مؤلف ابو مسلم اصبہانی ہیں، جن کی تفسیر کے اقتباسات جا بجا تفسیر کبیر میں درج ہیں۔ امام فخر الدین رازی اکثر مقامات پر ان کی شناخت کرتے ہیں۔

کتاب الجامع فی التفسیر: ۳۰ جلدوں میں ہے۔

تفسیر ابن النقیب: کچھ اوپر پچاس جلدوں میں ہے۔

کتاب التحریر والتبجیر: اس کی پچاس سے زائد جلدیں ہیں۔

تفسیر الادنفی: علامہ ادنفی، روم کے شہرہ آفاق عالم تھے۔ اس تفسیر کے وہی مؤلف ہیں، اس کی ۱۲۰ جلدیں ہیں۔

تفسیر القزونی: تین سو جلدوں میں ہے۔

تفسیر حدائق ذات البہ: پانچ سو جلدوں میں ہے۔

اس وسعت بیان کو دیکھئے، کیا کوئی شخص اس حقیقت سے انکار کرے گا کہ یہ تفسیریں کسی زمانہ میں قرآن حکیم کی

انسائیکلو پیڈیا (موسوعات) نہ رہی ہوں گی۔ اقوام و امم عالم کی تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ دنیا کی کسی قوم نے اس کثرت کے ساتھ اپنی کسی کتاب کی خدمت کی ہو۔ یہ شرف و مزیت اور خصوصیت کبریٰ صرف قرآن ہی کو حاصل ہے کہ اس کثرت سے اس کی شرح و تفسیر کی گئی، اس کے احکام و ضوابط کی تدوین و ترتیب میں عمریں صرف کی گئیں، کشف سرائر و معجوبات کے لئے تالیفات لکھی گئیں لیکن پھر بھی ارباب فہم و بصیرۃ اور حقیقت شناس حلقوں سے یہی صدائے عشق و وارفتگی بلند ہو رہی ہو کہ: القرآن لاتقفی عجائبہ ولا تنقصی غرائبہ۔

### اول نکل عہد

عبد الملک بن مروان ۲۵ ہجری میں تخت خلافت پر متمکن ہوا، اس نے اولین کام یہ کیا کہ اپنی تمام تر توجہ علوم و فنون کی تدوین کی جانب پھیر دی۔ اطراف و اکناف خلافت میں اعلان کر دیا کہ ہر ایک فن پر کتابیں تالیف ہوں۔ علماء عظام کو دعوت دی اور ان کو تصنیف کی طرف متوجہ کیا۔ سعید بن جبیر سے درخواست کی کہ قرآن کی شرح و تفسیر میں کچھ تحریر کریں۔ وہ اپنے زمانہ کے امام اور تفسیر میں یمکٹائے روزگار تھے، انہوں نے تفسیر لکھ کر بھیجی جس کو شاہی کتب خانہ میں جگہ دی گئی۔ حضرت عمر بن عبد العزیز کا زمانہ آیا تو انہوں نے اور زیادہ اس دائرہ کو وسعت دی اور تمام بلاد و امصار اسلامی میں احکام نافذ کر دیئے کہ سنن و احادیث پر تالیفات تیار ہوں۔

دوراؤں میں تفسیر کا طریق نہایت ہی دلاویز اور معنی خیز تھا۔ ان لوگوں کو معلوم تھا کہ قرآن میں اخلاق بھی ہے اور فلسفہ اخلاق بھی، تمدن و حضارۃ کے احکام بھی ہیں اور تہذیب و شائستگی کے اصول و ضوابط بھی، تدبیر منزل و سیاست مدن کے آئین و قوانین بھی ہیں اور جہانگیری و جہانداری کے قواعد تنظیم و تشکیل بھی، لیکن انداز بیان، طریق تعبیر اور اسلوب تحریر کچھ اس درجہ جاذب قلوب و انظار واقع ہوا ہے کہ ان علوم سے کوئی واقف ہو یا نہ ہو جس وقت یہ اعجازی کلمات اس کے کانوں تک پہنچیں گے اس کی فطرت صالحہ اور قلب سلیم کا یہی اقتضار ہے گا کہ ہر وقت ان سے حلاوت اندوز رہے اور اس کے دل و دماغ پر حاوی ہوں۔

ابتدائی زمانہ کی تفسیروں کے نمونے ہمارے سامنے ہیں۔ ان میں نہ منطقی دلائل ہیں نہ فلسفیانہ موشگافیاں، نہ ان کو ریاضیات و طبعیات سے کوئی سروکار ہے، اور نہ ہیئت و نجوم کے زور سے استدلال و حجت کو قوی بنانے کی کوشش کی جاتی ہے، صاف صاف اور کھلی کھلی باتیں ہیں، کسی قسم کا خفا اور حجاب نہیں۔ البتہ اگر ان میں کوئی حقیقت نمایاں اور ممتاز پہلو لئے ہوئے ہے تو وہ عمل کی دعوت ہے اور بس۔ شتیق بن سلمہ اور ابو وائل بیان کرتے ہیں کہ امیر المومنین علی بن ابی طالب نے اپنے عہد حکومت میں ایک مرتبہ حضرت عبد اللہ بن عباس کو امیر الحج مقرر کر کے بھیجا تھا۔ انہوں نے خطبہ حج اس انداز سے بیان کیا اور سورہ نور کی تفسیر اس دل فریب طریق پر کی کہ کفار ترک و روم بھی اگر اسے سن لیتے تو یقیناً دائرۃ اسلام میں داخل ہو جاتے اور ان کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار باقی نہ رہتا۔ ایسے ہی ایک مرتبہ سورہ بقرہ کی ایسی معنی خیز

و موثر اور دلاویز تفسیر بیان کی کہ ایک شخص تو بے اختیار پکار اٹھا لو سبھ هذا الدیلم لاسلمت اگر کفار دیلم اس کو سن پاتے تو ضرور حلقہ بگوش اسلام ہو جاتے۔

یہ جو کچھ اوپر لکھا گیا محض افسانہ ہی افسانہ نہیں بلکہ ایک حقیقت ثابتہ ہے اور تاریخ کے صفحات اس قسم کے بے شمار امثلہ و نظائر سے پر ہیں۔ غیر مسلم قوموں کو جب کبھی قرآن کی تعلیمات کے سننے اور ان میں درس و فکر کرنے کا موقع ملا تو پھر ان کے مسلمان ہو جانے میں کوئی تاثر نہ رہا۔

عہد نبوت سے جب تک قرب و اتصال رہا تفسیر کا یہی انداز تھا، خلفائے اربعہ، عبد اللہ بن مسعود، ابن عباس، ابی بن کعب، زید بن ثابت، ابو موسیٰ اشعری اور عبد اللہ بن زبیر کے اسمائے گرامی دور اوّل میں نہایت ہی جلی قلم سے لکھے ہوئے نظر آتے ہیں اور باوجود امتداد عہد اور استیلائے جہل ان کی تابناکی اور درخشندگی میں کسی قسم کا فرق نہیں پیدا ہوا۔

مکہ مبارکہ میں ابن عباس کے شاگردوں کی فہرست تو بہت ہی طویل ہے، لیکن مجاہد، عطاء ابن ابی رباح، عکرمہ مولیٰ بن عباس، سعید بن جبیر اور طاؤس اس کے ارشد تلامذہ میں شامل اور اس لئے خصوصیت سے مشہور ہیں۔ تفسیروں میں ابن عباس کے جس قدر اقوال ملتے ہیں وہ سب انہی کی وساطت سے ہم تک پہنچتے ہیں۔ مجاہد کہتے ہیں کہ میں نے ابن عباس کو تیس بار قرآن سنایا ہے۔ کوفہ کی سرزمین عبد اللہ بن مسعود کے شاگردوں کی وجہ سے علوم و معارف قرآن کا نشیمن بنی ہوئی تھی۔ اسی طبقہ میں حسن بصری، عطاء بن ابی سلمہ خراسانی، محمد بن کعب قرطبی، ابو العالیہ ضحاک بن مزاحم، عطیہ، قتادہ، زید بن اسلم، مرہ ہمدانی ابومالک اور ربیع بن انس ہیں۔

تیسرے دور میں سفیان بن عیینہ، وکیع بن الجراح، شعبہ بن حجاج، یزید بن ہارون، عبد الرزاق، آدم بن ابی ایاس، اسحق بن راہویہ، روح بن عبادہ، عبد بن حمید اور ابو بکر بن شیبہ ہیں۔

### زاویہ نگاہ

قرآن حکیم کے نزول کی غرض و غایت یہ تھی کہ جو لوگ اس کی تعلیم پر عمل کریں ان میں اعلیٰ ترین اخلاق پیدا ہوں، انہیں حکمین فی الارض حاصل ہو اور کوئی بڑی سے بڑی طاقت ان کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اور یہ ایک ایسی حقیقت تھی کہ اپنے تو اپنے بیگانے بھی اس سے نا آشنا نہ تھے۔ ۶ ہجری میں رسول اللہ ﷺ نے شاہ ہرقل کو اسلام کی دعوت دی۔ ابو سفیان ان دنوں روم ہی میں تھے، اس نے ابو سفیان سے اسلامی تعلیمات، رسول اللہ ﷺ اور فرزند ان اسلام کے متعلق مختلف سوال کئے اور آخر میں کہا

ان يك ماتقول حقا فانه نبی

ولیبغن ملكه ماتحت قدمی

”اگر یہ سچ ہے جو تم کہتے ہو، تو وہ بنی ہے اور اس کی سلطنت ضرور میرے قدموں کے نیچے کی سر زمین تک پہنچے گی۔“  
اسی تعلیم کا اثر تھا کہ حضرت خبیبؓ کو حارث بن عامر بن نوفل کی اولاد شہید کرتی ہے تو وہ حسب ذیل اشعار پڑھتے ہیں۔

لقد جمع الا حزاب حولي واليؤ

قبائلهم واستجمعوا كل مجبع

”انہوہ در انہوہ لوگ میرے گرد آگروں آٹھیرے ہیں اور انہوں نے بڑی بڑی جماعتوں کو بلا لیا ہے۔“

وكلهم مبدى العداوة جاهد

على لا نى فى وثاق بضيعة

”یہ سب کے سب میرے دشمن اور عداوت کا اظہار کرنے والے ہیں اور میں اس ہلاکت گاہ میں بندھا ہوا ہوں۔“

وقد جمعوا ابناهم ونساءهم

وقربات من جزم طويل ممتع

”قبیلوں نے اپنی عورتوں اور بچوں کو بھی بلار کھا ہے اور مجھے ایک مضبوط بلند لکڑی کے پاس لے آئے ہیں۔“

وقد خيدوني الكفر والبوت دونه

وقد هبلت عيني من غير مجزع

”انہوں نے کہہ دیا ہے کہ کفر اختیار کرنے سے مجھے آزادی مل سکتی ہے، مگر اس سے تو موت میرے لئے بہت سہل ہے، میری آنکھوں سے آنسو لگا تار جاری ہیں مگر مجھے کچھ ناشکیبائی نہیں۔“

فلمست بببد للعد وتنشعاً

ولا جزعاً انى الى الله مرجع

”میں دشمن کے سامنے نہ عاجزی کروں گا اور نہ روؤں اور چلاؤں گا، میں جانتا ہوں کہ میں خدا کی طرف جا رہا ہوں۔“

ومالى حذار الموت انى لميت

ولكن حذارى حجم نار ملفع

”موت سے مجھے اس لئے ڈر نہیں کہ میں مر جاؤں گا، لیکن میں تو لپٹ جانے والی آگ کے خون چوسنے سے ڈرتا ہوں۔“

فذلوالعرش صيدنى على ما يراحب

فقد بصغوالحصى وقد ياس مطبيع

”اس عرش عظیم کے مالک نے مجھ سے کوئی خدمت لینی چاہی اور مجھے شکیبائی کے لئے فرمایا ہے، اب انہوں نے زدو کو ب سے میرا تمام گوشت کوٹ دیا ہے اور میری امید جاتی رہی ہے۔“

فوالله ما ارجو اذامت مسلماً

على اى جنب كان فى الله مصرعى

”بخدا جب میں اسلام پر جان دے رہا ہوں تو میں یہ پرواہ نہیں کرتا کہ راہ خدا میں کس پہلو پر گرتا اور کیونکر جان دیتا ہوں۔“

وذلك فى ذات الا له وان يشاء

بىارك على اوصال شلو مبزعى

”خدا کی ذات سے اگر وہ چاہے تو پوری امید ہے کہ وہ پارہ ہائے گوشت کے ہر ایک ٹکڑے کو برکت عطا فرمائے۔“  
سب سے آخر میں انہوں نے فرمایا:

اللهم بلغنا رسالتہ

رسلک فبلغه ما یصنع بنا

”اے خدا، ہم نے تیرے رسول کے احکام ان لوگوں کو پہنچا دیئے اب تو اپنے رسول کو ہمارے حال اور ان کی کرتوتوں کی خبر دیدے۔“

یہ نتائج و ثمرات تھے قرآن حکیم کی تعلیم و تربیت کے، صحابہ کرام کی مقدس جماعت خوب جانتی تھی کہ قرآن کا نزول صرف اس لئے ہوا ہے کہ:

(الف).... اس کو نہایت ہی غور و خوض سے پڑھیں اور اس کی آیات میں درس و فکر کریں۔

(ب).... جس قدر پڑھیں اس پر عمل پیرا ہوں۔

(ج).... قرآن حکیم پر عمل کرنے میں رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو پیش نظر رکھیں۔ خود رسالت مآب کی یہ کیفیت تھی کہ:

وكان رسول الله ﷺ يترتل السورة حتى تكون اطول من اطول منها وقامه باية يردوها حتى الصباح۔

”رسول ﷺ سورۃ کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرتے تھے یہاں تک کہ ایک معمولی سورۃ بڑے سے بڑی سورۃ ہو جاتی تھی اور بعض دفعہ ایک ہی آیت پر ٹھہر جاتے تھے اور اسی کو بار بار صبح تک پڑھتے تھے۔“

حضرت عبد اللہ بن مسعود اور عبد اللہ بن عباس کی رائے ہے کہ:

ان الترتیل والتدبر مع قلته القراءة افضل من سرعة القراءة مع كثرتها بان المقصود من القراءة فہمہ وتدبرہ والفقہ فیہ والعمل بہ وتلاوته وحفظہ وسیلۃ الی معانیہ کما قال بعض السلف نزل القرآن لیعمل بہ فاتخذوا تلاوته عبلاً ولہذا کان اهل القرآن هم العالمون والعاملون بہا فیہ وان لم یحفظوا عن ظهر قلب واما من حفظہ ولم یفہمہ ولم یعمل بہ فلیس من اہلہ وان اقام حروفہ اقامتہ السہم واما مجردة التلاوة من غیر فہم ولا تدبر فی فعلہا البر والفاجر والمومن والمنافق کما قال البہی ؓ مثل

البنافق الذی یقر القرآن کبش الريحانة ريحها طيب وطعها مروقال مشعبة حدثنا ابو حمزة قال قلت لابن عباس انی رجل سريع القرآءة وربما قرعت القرآن فی ليلة مرة او مرتين فقال ابن عباس لان اقرأ سورة واحدة اعجب الى من ان افعل ذلك الذی تفعل فان كنت فاعلاً لا بد فاقراً قرآءة تسبغ اذنيك ويعيه قلبك قال ابن مسعود فقوا عند عجائبه وحركوا به القلوب ولا يكن هم احدكم اخر السورة وقال عبد الرحمن بن ابی ليلى دخلت على امرأة وانا اقرأ سورة هود فقالت يا عبد الرحمن هكذا تقرأ سورة هود والله اني فيها منذ ستة اشهر وما فرغت من قراتها۔

”آہستہ پڑھنا اور غور کرنا جس میں قرآن اگرچہ تھوڑا پڑھا جاوے یہ اس سے بہتر ہے کہ جلد اور زیادہ پڑھا جائے کیونکہ پڑھنے سے مقصود سمجھنا اور غور کرنا ہے تاکہ اس پر عمل ہو سکے، اس کا پڑھنا اور یاد رکھنا معانی تک پہنچنے کا وسیلہ ہے۔ چنانچہ بعض سلف نے کہا ہے کہ قرآن اس لئے نازل ہوا ہے کہ اس پر عمل کیا جائے مگر لوگوں نے اس کی تلاوت کو ایک مستقل عمل بنالیا، اسی لئے گزشتہ طبقات میں اہل قرآن وہی سمجھے جاتے تھے جو قرآن کے عالم اور عامل تھے اگرچہ ان کو زبانی حفظ نہ بھی ہوتا تھا لیکن جس شخص نے قرآن کو یاد کیا اور اس کے مطالب نہ سمجھے نہ ان پر عمل کیا تو وہ اہل قرآن سے نہیں ہے۔ اگرچہ اس کے حروف کو تیر کی طرح اس نے درست کر لیا اور وہ تلاوت تو ہر نیک و بد، مومن اور منافق کر سکتا ہے جو فہم و تدبر سے خالی ہو، رسول ﷺ نے فرمایا کہ قرآن پڑھنے والے منافق کی مثال ریحان کی ہے جس کی بو عمدہ اور مزاکرٹو ہے۔ شعبہ نے کہا ابو حمزہ نے ابن عباس سے عرض کیا میں تیز پڑھنے والا ہوں بعض اوقات ایک ہی شب میں ایک دو مرتبہ قرآن ختم کر دیتا ہوں۔ ابن عباس نے جواب دیا کہ مجھے ایسے قرآن پڑھنے سے ایک سورت پڑھنا بہتر معلوم ہوتی ہے، بہر حال اگر تم تیزی ہی سے پڑھنا چاہو تو بھی ایسا پڑھو کہ تمہارے کان سنیں اور تمہارا دل اسے یاد کر لے۔ ابن مسعود نے فرمایا ہے کہ قرآن کے عجائب پر ٹھہرو اور ان سے دلوں کو حرکت دو اور تمہاری یہ کوشش نہ ہو کہ خواہ مخواہ آخر سورہ تک پہنچو، عبد الرحمن بن ابی لیلى فرماتے ہیں کہ میں ایک عورت کے پاس گیا اور میں سورہ ہود پڑھ رہا تھا اس نے کہا اے عبد الرحمن تم اس طرح سورہ ہود پڑھتے ہو خدا کی قسم میں چھ مہینے سے اس سورہ کو پڑھ رہی ہوں اور اب تک اس سے فارغ نہیں ہوئی۔“

عبد اللہ بن مسعود فرماتے ہیں۔

كان الرجل منا اذا تعلم عشر ايات لم يجاوزهن حتى يعرف معانيهن والعمل بهن وقال ابو عبد الرحمن السلمي حدثنا الذين كانوا يقرؤنا انهم كانوا ليستقروا من النبي ﷺ وكانوا اذا تعلموا عشر ايات لم يخلفوها حتى يعلموا بها فيها من العمل فتعلمنا القرآن والعمل جميعاً۔

”جب کوئی شخص ہم میں سے دس آیتیں سیکھ لیتا تھا، تو اس سے آگے نہ بڑھتا جب تک ان کے معانی اور ان پر عمل کرنا نہ سیکھ لیتا۔ ابو عبد الرحمن سلمی نے فرمایا ہے کہ ہم سے ان لوگوں نے بیان کیا جو ہم کو پڑھاتے تھے اور وہ رسول ﷺ سے پڑھا کرتے تھے، جس وقت دس آیتیں پڑھ لیتے تو ان سے تجاوز نہ کرتے جب تک ان پر عمل نہ کر لیتے لہذا ہم

نے قرآن اور اس پر عمل دونوں اکٹھے سیکھے۔“

اس پاک گروہ کی نظر صرف اسی پر نہ تھی بلکہ وہ اس امر پر بھی غور و فکر کرتے کہ تعلیم قرآن سے قبل ہماری کیا حالت تھی اور اب اس سے کس قسم کے انقلابات و تغیرات رونما ہوئے ہیں، اس لئے ان لوگوں نے اس حقیقت کبریٰ پر مہر لگادی کہ:

لا یصلح اخر هذه الامة الا باصلاح اولها

“اس امت کے آخری حصہ کی اصلاح فقط اسی چیز سے ہوگی جس سے اس کے اوّل کی اصلاح ہوئی۔“

جدید راہ

اب ایک نیا دور شروع ہوا، ایک ایک آیت کے لئے متعدد مطالب اور مختلف روایات ذکر کی جانے لگیں، جن میں بعض تو یقیناً قابل قبول اور لائق استناد تھیں، مگر بیشتر غلط اور موضوع، رد و قبول کے محک پر ان کے پرکھنے کی ضرورت تھی تاکہ کھوٹے اور کھرے میں، غث اور سمین میں فرق و امتیاز ہو جائے اور حق و باطل میں التباس و اشتباہ باقی نہ رہے۔ ان بزرگوں نے مختلف اقوال کو صرف اس لئے جمع کر دیا تھا کہ آیات کے مفہوم میں جس قدر ممکن سے ممکن اقوال منقول ہوں یا ہو سکتے ہوں اور جس قدر زیادہ سے زیادہ مواد فراہم ہو سکتا ہو ناظرین کے روبرو بغیر حک و اضافہ کے تمام و کمال پیش کر دیا جائے اور ہر ایک سخن شناس طبیعت کے لئے اس امر کا موقع حاصل رہے کہ وجدان سلیم، ذوق صحیح اور اصول تفسیر کی اعانت سے ان اقوال کو جرح و تعدیل کے میزان میں تولے اور نقد و اختیار کے بعد جس کو چاہے ترجیح دے اور جسے چاہے مرجوح قرار دے۔

چنانچہ تیسری صدی ہجری میں علامہ ابو جعفر بن جریر طبری نے اپنی مشہور تفسیر لکھی جس کی نسبت علامہ ابو حامد اسفرائینی کی رائے یہ ہے کہ لو سافر رجل الی الصین حتی یحصل له کتاب تفسیر محمد بن حریلم یکن ذلک کثیر (تفسیر ابن جریر کی تلاش میں اگر ایک شخص چین تک کا سفر کرے تو یہ کوئی بڑی بات نہ ہوگی) ابن جریر کی وفات کو ایک ہزار برس سے زیادہ زمانہ گزر چکا ہے۔ وہ ہر ایک بات میں روایت کے پابند ہیں۔ ان کا خاص مذاق یہی ہے کہ حدیث کے نام سے خواہ کیسی ہی لغو اور مہمل بات کہی جائے، سب پر ایمان لانے کو تیار ہو جاتے ہیں اور نہیں دیکھتے کہ حقیقت اصل یہ کیا تھی اور عقل سلیم کہاں تک اس کو قبول کرنے کو تیار ہوگی۔ ایک ایک آیت کے متعلق مختلف اقوال و روایات پیش کرتے ہیں اور بعض اوقات ترجیح بھی دے جاتے ہیں۔

پانچویں صدی ہجری میں ابو عبد الرحمن محمد بن حسین نیشاپوری ہیں۔ ان کی وفات ۲۱۴ ہجری میں ہوئی۔ انہوں نے تفسیر حقائق لکھی اور ربط و یاس روایات و مطالب کا ایک انبار جمع کر دیا۔ یہی حال ابو اسحق احمد ثعلبی کا ہے۔ ابو محمد عبد اللہ جوینی، ابو القاسم عبد الکریم قشیری، اور ابو الحسن بن احمد اسی طبقہ میں شامل ہیں۔ اس صدی کی تفسیروں میں صرف اتنا فرق

ہے کہ ان میں روایات تو بیان کی جاتی ہیں مگر ان کے اسناد کو حذف کر دیا جاتا ہے چنانچہ کشف الظنون میں ہے:

ثم الف في التفسير طائفة من المتأخرين فاختصروا الا سائيد ونقلوا عن الاقوال تبداً فدخل من هنا الدخيل والتبس والصحيح بالعليل ثم صار كل من سئله قول يورده ومن خطئ به لاله شي يعتمده ثم ينقل ذلك خلف عن السلف ظاناً ان له اصلاً غير ملتفت الى تحرير ماورد عن السلف الصالح-

“اس کے بعد متاخرین میں سے ایک جماعت نے تفسیر تالیف کیں اور اسنادوں کو مختصر کر دیا، بہت سے اقوال نقل کئے یہاں سے زائد باتیں داخل ہونے لگ گئیں اور صحیح و ضعیف آپس میں ملتبس ہو گئے۔ اس کے بعد جس کو جو بات معلوم ہوئی وہی درج کر دی اور جو کچھ اس کے خیال میں آیا اسی پر اعتماد کر لیا، اس کے بعد ہر پچھلا طبقہ اپنے متقدمین سے نقل کرنے لگا۔ اس خیال سے کہ ضرور کوئی نہ کوئی اس کی اصلیت ہوگی، انہوں نے اس کی تحقیق نہ کی کہ سلف صالح سے اس میں کیا منقول ہے؟”

ان غلط اور بے بنیاد روایات کا اندازہ علامہ سیوطی کے صرف اس ایک قول سے ہو سکتا ہے کہ:-

رأيت في تفسير قوله تعالى غير المغضوب عليهم ولا الضالين نحو عشرة اقوال مع ان الوارد عن النبي ﷺ وجميع الصحابة والتابعين ليس غير اليهود والنصارى-

“میں نے غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کی تفسیر میں دس مختلف اقوال دیکھے ہیں حالانکہ رسول ﷺ، جمہور صحابہ اور جملہ تابعین سے یہود و نصاریٰ کے سوا کوئی دوسرا قول بھی روایت نہیں کیا گیا۔”

## ما بعد کی تفسیریں

جس قدر زمانہ بڑھتا گیا اور عہد نبوت سے بعد و ہجر ہوتا گیا، تفسیر کی صورت بھی نمایاں تبدیلیاں اختیار کرتی گئی اور انجام کار ایسا انقلاب عظیم پیدا ہوا کہ جن مطالب اور روایات کے حق میں محکمہ تحقیق کا یہ فیصلہ تھا کہ وہ قابل قبول نہیں ہیں، وہی زیادہ مشہور ہو گئیں۔ اور عام طبائع نے ان کو شرف اجابت بخشا۔ ہر بات میں پیچیدگی، مشکل پسندی اور عجائب پرستی کا طومار بھر گیا۔ حکمت و فلسفہ کی نکتہ آفرینیاں دکھائی دینے لگیں، معانی و بیان کے حقائق بیان کئے جانے لگے اور ہیئت و نجوم کے مطابق قرآن حکیم کی تفسیر ہونے لگی، مگر جس قدر ان چیزوں میں زیادتی ہوتی گئی اتنی ہی قرآن سے دوری ہوتی گئی اور منشاء قرآن کی خصوصیت میں فرق آتا گیا۔

اس میں شک نہیں کہ مفسرین کرام کی زندگی کا مقصد وحید اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ اس کتاب عزیز کے اسرار و معارف کی نشر و اشاعت ہو اور اس کے مفہوم و معانی کی تبلیغ و دعوت ہو، لیکن جب ان تفسیروں میں بحث و نظر کی جاتی ہے تو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ: لایسمن ولا یغنی من جوع، تفسیر کبیر ہی کو اٹھا کر دیکھ لیجئے، اس میں بطلموسی ہیئت و نجوم اور فلسفہ یونان کے سوا کیا دھڑا ہے۔ مخالفین کے شبہات بیان کریں گے اور اپنا تمام زور استدلال ان کی تقویت



میں صرف کر دیں گے، لیکن جواب کے وقت اس درجہ ضعف و کمزوری کا اظہار کریں گے کہ پڑھنے والے کے دل میں وہ شبہ اور زیادہ قوی ہو جائے گا۔ بعض ارباب نظر و بصیرت کو خود امام فخر الدین رازی کے اسلام ہی میں تردد ہے، مگر یہ خیال تو درست نہیں البتہ اتنا ضرور ماننا پڑیگا کہ اس میں دنیا جہان کی باتیں ہیں مگر تفسیر نہیں، جو اس کا اصلی موضوع و مقصد تھا۔ چنانچہ آگے چل کر آپ کو بعض اکابر کی رائے ان کی تفسیر کے متعلق معلوم ہوگی۔ پس اگر بعض نکتہ سنج طبائع کا یہ مطالبہ ہو کہ اس زمانہ میں تفسیر کبیر کا پڑھنا بے سود ہے تو شاید کچھ لوگ ان کی تائید کے لئے کھڑے ہو جائیں گے۔ قرآن کا نزول تو اس لئے ہوا تھا کہ اس کے درس و فکر سے حیات انفرادی و اجتماعی میں انضمام و توحید پیدا ہو۔ ہر مسلم قانت کی تشنہ لبی دور ہو اور ہر ایک فرزند اسلام اس کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنائے مگر ان تفاسیر سے یہ مقصد حاصل نہ ہو سکا۔ لوگوں نے ان تفاسیر کا درس و مطالعہ شروع کیا حالانکہ ضرورت تھی قرآن حکیم کی تلاوت کی۔ پس وہ چشمہ حیات سے بہت دور جا پڑے اور اب تو بعض کے نزدیک خود قرآن کا درس ممنوع و ناجائز ہے یا لیتنی مت قبل هذا کنت نسیا منسیا۔ پنجاب کے ایک جلیل القدر سجادہ نشین کی رائے ہے کہ الحمد کے صرف الف کے معانی و مطالب معلوم کرنے کے لئے ۳۶۰ علوم کی ضرورت ہے۔ ذلک مبلغهم من العلم۔

مدار روزگار سفلہ پرور را تماشا کن!

دنیا میں ہمیشہ تغیرات و انقلابات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ تمام اقوام و امم عالم بھی ادوار مختلفہ میں سے گزرتی رہتی ہیں۔ فن تفسیر بھی اس قاعدہ کلیہ سے مستثنیٰ نہ ہو سکا، ہر زمانہ میں اس کا رنگ بدلتا گیا اور اب تو اس میں ایسی ایسی تبدیلیاں واقع ہو گئیں کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ابتدا میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ محدثین نے قرآن حکیم کی آیات کے مناسب تمام ان احادیث، مرویات صحابہ اور اقوال تابعین کو ایک جگہ جمع کر دیا جن سے اخذ مطالب اور فہم معانی میں سہولت و آسانی ہو اور وہ تمام بصائر و حکم سامنے آجائیں جو براہ راست مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہوں۔ ان کے بعد معتزلہ کا گروہ سامنے آتا ہے، جنہوں نے فلسفہ یونان سے مرعوب و ہیبت زدہ ہو کر تمام آیات صفات کی تاویل شروع کر دی اور متبادر معانی و مطالب کو ترک کر کے بعید از فہم حقائق کی جانب متوجہ ہو گیا۔ نکتہ آفرینیوں اور فلسفیانہ مویشگافیوں کا دروازہ کھول دیا اور اس طرح ہمیشہ کے لئے الحاد و زندقہ، فتنہ و فساد اور توجیہ و تاویل کا باب مفتوح کر دیا۔ فلسفہ کی نشر و اشاعت نے عقائد و اخلاق میں اور زیادہ تزلزل پیدا کر دیا۔ متکلمین آگے بڑھے اور ہر شبہ کا جواب دینے لگے۔ اس لئے قرآن کی شرح و تفسیر، علم کلام کے مطابق ہونے لگی۔ فقہاء کے گروہ نے صرف استنباط احکام و اخذ مسائل ہی کو اپنا مطمح نظر بنالیا اور ان کی سعی و کوشش یہیں تک محدود رہی، ارباب لغت نے دوسری حیثیت سے نظر ڈالی۔ علمائے نحو کے سامنے یہی فن تھا اسی کی خاطر انہوں نے کلام عرب سے شواہد کی تلاش و جستجو کی اور صرف بسم اللہ الرحمن الرحیم کی تین ہزار ترکیبیں بیان کر دیں۔ اہل سلوک و احسان نے صرف تصوف کو اپنی غایت الغایات یقین کر کے قرآن حکیم کو تصوف کے قالب میں ڈھال دیا، ظواہر کو چھوڑ کر بطون کے پیچھے پڑ گئے اور مغز کو پھینک کر محض چھلکے پر قناعت کر بیٹھے۔ سب سے زیادہ نقصان اسلام کو اس ہندوانہ تصوف سے

پہنچا۔ اور لوگ تو اب تک اس کے دام میں پھنسے ہوئے ہیں فہل من مذکر۔

فاران کی چوٹی پر نزول الہام اس لئے ہوا تھا کہ مسلمانوں کے لئے قانون اساسی کے طور پر کام دے۔ مگر زمانہ کی نیرنگ سازی ملاحظہ ہو کہ وہ اب ہر کس و ناکس کی رائے و خیال کا دست خوش بن گیا اور ہر شخص اپنے مذاق خاص کے مطابق اس کی تفسیر کرنے لگا، اس بے اصول خطرناک آزادی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب کا بہت بڑا حصہ زید و عمر کے اقوال اور شیخ و سید کے باطل و اکاذیب کا ذخیرہ بن گیا۔ آیات احکام کے مفہوم متعین کرنے میں اعجاب کل ذی رای ہدایہ کی آمیزش ہونے لگی۔ وسعت معلومات، اسلوب تحریر اور لہجہ بیان ظاہر کرنے کے لئے تفسیر قرآن میں مفروضات و تخیلات کی جس قدر جولانی دکھاتے بنی، اچھی طرح دکھائی گئی اور یہ خیال نہ آیا کہ ہم تلاعب بالقرآن کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ نظامی شاعر تھے، مگر وہ بھی اس درد انگیز و حسرت خیز منظر کو نہ دیکھ سکے، بیتاب ہو گئے اور ان الفاظ میں رسول اللہ ﷺ سے فریاد کی۔

دین ترا در پے آرائش اند

در پے آرائش و پیرائش اند

بسکہ بر و بستہ شدہ برگ و ساز

گر تو بہ بنی نہ شناسیش باز

یہ کیفیت ہمیں چھٹی صدی ہجری تک تو نظر آتی ہے کہ احساس تو ہے، اگرچہ اس وقت بھی اس عالم آشوب طوفان کے روکنے کی کوئی صورت نہ تھی لیکن بعد کو تو اس قدر استیلائے کفر و ضلالت ہوا کہ اتنی حس و بیداری بھی باقی نہ رہی۔ غوغائے عجبت میں یہ فریاد بھی کسی کی زبان سے نہ نکل سکی۔ وہ دین فطرت جو حجاز کی وادیوں میں اپنے اصلی حسن و جمال کے ساتھ دلفریبی اور کشش کا باعث تھا، اس پر مجوسیوں کی عجائب پرستیاں، یہودیوں کے دوراز کار افسانے اور بت پرستوں کے رسم و رواج چھا گئے اور اب ہمارا زمانہ آیا تو دودھ سے پانی کا جدا کرنا سخت ترین کام ہو گیا۔ دقت آفرینی اور عجائب پسندی کی بنیاد پر جو جو شاخیں نکلیں، جیسے جیسے شگوفے پھولے اور تفسیروں میں جس نہج پر اس قسم کی روایتیں پھیلی پھولیں، ان کو دیکھ کر بدن پر رو نگئے کھڑے ہو جاتے ہیں اور قلم میں طاقت نہیں کہ ان کو تحریر میں لاسکے۔

ابو الفیض فیضی اکبری دربار کے نور تن تھے۔ قدرت سے طبیعت نکتہ سنج پائی تھی۔ سواطع الالہام قرآن کی تفسیر لکھی، جس میں یہ التزام کیا گیا کہ تمام تفسیر میں اوّل سے آخر تک ایک لفظ بھی منقوٹ نہ ہو۔ اس نفسانی ہیجان کو پورا کرنے کے لئے انہیں جس قدر اپنی طبیعت پر زور ڈالنا پڑا ان کے انداز تحریر سے ظاہر ہے۔ عبارتوں کی عبارتیں، فقروں کے فقرے اور ترکیبوں کی ترکیبیں یکے بعد دیگرے چلی آرہی ہیں جن میں باہم کوئی ربط و تعلق نہیں۔ ایک بے معنی کلام ہے جس کے لئے دلاویز و دلفریب ترکیبوں اور جملوں کی تلاش ہو رہی ہے، صورت ہے لیکن معنی نہیں، جسم ہے مگر روح سے خالی، ایک حی و قائم انسانی وجود ہے جس کے تمام اعضاء و جوارح کاٹ دیئے گئے ہیں۔

شیخ علی بن احمد مہائم ضلع گجرات کے رہنے والے تھے۔ ان کی وفات ۸۳۵ ہجری میں ہوئی۔ شیخ محی الدین بن عربی کے بے انتہا شاخوواں اور مسئلہ وحدت وجود میں ان کے نقش قدم پر چلنے والے تھے انہوں نے تفسیر رحمانی لکھی۔ چونکہ تصوف میں ذوق رکھتے تھے اس لئے قرآن حکیم کی تفسیر اسی صوفیانہ رنگ میں کی۔ آیات کا مطلب احسان و سلوک کے رنگ میں بیان کیا۔ قرآن کی نظم و ترتیب پر بھی روشنی ڈالی تو یہی چیز غالب رہی۔ انہیں اس امر کا خیال نہ رہا کہ رسول اللہ ﷺ محض تصوف ہی سکھانے نہ آئے تھے بلکہ وہ شیل موسیٰ بھی تھے اور آپ کی بعثت کی غرض و غایت یہ تھی کہ فرزند ان اسلام شہداء علی الناس بن جائیں اور اخلاف ارضی کے جائز وارث قرار پائیں۔ ساتویں صدی ہجری کے اواخر میں قاضی ناصر الدین ابو سعید عبد اللہ بن عمر بیضاوی شافعی آئے، انہوں نے ایک تفسیر لکھی جس کا نام انوار التزیل و اسرار التاویل ہے۔ عربی مدارس میں اس کا ابتدائی حصہ درس میں شامل ہے۔ اکثر علما نے اس پر حواشی بھی تحریر کئے ہیں۔ تفسیر کی کیفیت یہ ہے کہ فن معانی، بدیع اور بلاغت میں جو کچھ لکھتے ہیں جارا اللہ ز مخشری کی تفسیر کشاف سے لیتے ہیں اور بغیر حریت رائے و اجتہاد کے اس کی تقلید کرتے ہیں۔ فلسفہ و کلام کے مسائل کی نوبت آتی ہے تو فخر الدین رازی سے طالب اعانت ہوتے ہیں۔ جب مفردات الفاظ اور اشتقاق کے مباحث سامنے آتے ہیں تو امام راغب اصفہانی کی جانب رجوع کرتے ہیں۔

ہم نے اوپر جو کچھ لکھا اس سے ان جلیل القدر بزرگوں کی تفہیم و تنقیص مقصود نہیں بلکہ ایک حقیقت ثابتہ ہے جس کا اظہار ضروری تھا۔ الساکت عن الحق شیطان اخرا اس اور پھر اس وادی میں ہم ہی اکیلے نہیں بلکہ دوسرے ارباب بصیرت بھی ہمارے رفیق طریق ہیں۔ چنانچہ صاحب کشف الظنون کی رائے ملاحظہ ہو۔

ثم صنف بعد ذلك قوم برعوائی شی من العلوم وملا کتابہ ببا غلب علی طبعہ من الفن واقتصروا فیہ علی ماتہرہو فیہ کان القرآن ائزل لاجل هذا العلم لا غیر مع ان فیہ بیان کل شی فالنحوی ترا لیس له ہم الا الاعراب وتکثیر الالوجہ المحتملة فیہ وان کانت بعيدة وينقل قواعد النحو ومسائله وفروعه وخلاقیاته کالزجاج والواحدي فی البسيط وابو حیان فی البحر والنهر، والاخباری لیس له شغل الا القصص واستیفاءها والاخبار عن سلف سواء کان صبیحة او باطلة ومنهم الثعلبی والفقیه یکاد لیعرف فیہ الفقه جیباً و ربما استطردالی اقامة ادلتہ الفروع الفقہیة التي لا تعلق لها بالایة اصلا والجواب عن ادلة المخالفین کا القرطبی وصاحب العلوم العقلیة خصوصاً الامام فخر الدین قد ملاء تفسیرہ باقوال الحكماء والفلاسفة وخرج من شیء الی شیء حتی یقضى الناظر العجب قال ابو حیان فی البحر جمع الامام الرازی فی تفسیرہ اشياء كثيرة طویلة لاحاجة لها فی علم التفسیر ولذلك قال بعض العلماء فیہ کل شیء الا التفسیر والمبتدع لیس له قصد الا تحریف الایات وتسویتها علی مذهبه الفاسد بحیث انه لولاه له شاردة من بعيد اقتضها او وجد موضعاً له فیہ احدی مجال سارع الیه والمحدد فلا تسئل عن کفره والحادة فی آیات الله وافتراءه علی الله مالم یقله ومن ذلك القبیل الذین یتکلمون فی القرآن بلا

سند ولا نقل عن السلف ولا رعايته الاصول الشرعية والقواعد العربية كتفسير محمد بن حنيفة الكرماني في مجلدين سباه العجائب والغرائب ضمنه اقوالا هي عجائب عند العوام وغرائب عما عهد عن السلف بل هي اقوال منكرة لا يحل الاعتقاد عليها ولا ذكرها الا للتحذير من ذلك وسئل البلقيني عن فسر بهذا افاقتي بانه ملحد واما كلام الصوفية في القرآن فليس بتفسير قال ابن الصلاح في فتاواه وجدت عن الامام الواحدى انه قال صنف السلفى حقائق التفسير ان كان قد اعتقد ان ذلك تفسير فقد كفر قال النسفى في عقائده النصوص تحبل على ظواهرها والعدول عنها الى معاني يدعيها اهل الباطن الحاد<sup>①</sup>۔

“اس کے بعد ایسے لوگوں نے تصنیف کی جنہوں نے کسی ایک علم میں فوقیت حاصل کی ہے اور اپنی کتاب کو اسی فن سے بھر دیا ہے جو اس کی طبیعت میں غالب تھا اور محض اسی پر اکتفا کیا جس میں اس نے مہارت حاصل کی تھی، گویا قرآن صرف اسی علم کے لئے نازل ہوا تھا، حالانکہ اس میں ہر چیز کا بیان ہے۔ نحوی کو فقط اعراب اور وجوہ ترکیب ہی پیش نظر ہیں۔ اگرچہ وہ بعید ہی کیوں نہ ہوں۔ وہ نحو کے قواعد، مسائل فردع اور خلافیات ہی کو داخل کرے گا۔ جس طرح زجاج و واحدی نے بسیط میں اور ابو حیان نے بحر اور نہر میں کیا ہے۔ اخباری کو صرف قصے اور ان کی تکمیل ہی پیش نظر رہتی ہے۔ گزشتہ قسموں کا خیال رہتا ہے خواہ وہ صحیح ہوں یا غلط۔ تعلیلی ان لوگوں میں سے ہیں۔ فقیہ کا یہی مطلب ہوتا ہے کہ ساری فقہ داخل کر دے، بسا اوقات فقیہ فرعیات فقہ کی دلیلیں لاتا ہے حالانکہ نفس آیت سے ان کو کوئی تعلق نہیں ہوتا اور پھر مخالفین کے جواب بھی نقل کر دیتا ہے۔ اس قسم کے لوگوں میں سے قرطبی ہیں۔ ارباب علوم عقلیہ میں امام رازی ہیں جنہوں نے اپنی تفسیر کو حکماء اور فلاسفوں کے اقوال سے بھر دیا ہے اور کہیں سے کہیں چلے جاتے ہیں، جس سے دیکھنے والا تعجب میں رہ جاتا ہے۔ ابو حیان نے بحر میں کہا ہے کہ امام رازی نے اپنی تفسیر میں بہت سی چیزیں درج کر دیں جن کی علم تفسیر میں کچھ ضرورت نہ تھی، اسی لئے بعض علما نے کہا ہے کہ امام رازی کی تفسیر میں سب کچھ ہے مگر تفسیر نہیں۔ ایک بدعتی کی غرض آیتوں کی تحریف ہوتی ہے تاکہ ان کو اپنے فاسد مذہب پر منطبق کرے یہاں تک کہ اگر اسے کوئی دور کی بات بھی سوچتی ہے تو اسے لے لیتا ہے یا اگر کوئی ایسا موقع پاتا ہے جس میں اس کی کچھ بھی بات بن سکے تو فوراً بنالیتا ہے۔ اور ملحد کا تو ذکر ہی کیا ہے، وہ خدا کی نسبت جھوٹ بناتا ہے جو اس نے بالکل نہیں کہا۔ اور جو لوگ قرآن میں بلا سند سلف صالحین کے اقوال کے ماسوا قواعد عربیہ اور اصول شرعیہ کے بغیر کچھ کہتے ہیں وہ سب اسی قسم میں شامل ہیں۔ محمود بن حمزہ کرمانی کی تفسیر دو جلدوں میں اسی قسم کی ہے جس کا نام العجائب والغرائب رکھا ہے۔ اس میں ایسے اقوال نقل کئے ہیں جو عوام کے نزدیک عجیب اور طریق سلف سے دور ہیں بلکہ ایسے ہیں کہ ان پر اعتقاد ہی جائز نہیں اور ان کا ذکر تحذیر کے سوانا جائز ہے۔ ایسے لوگوں کے متعلق بلقینی سے فتویٰ طلب کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ ایسے مفسر ملد ہیں اور قرآن کے بارہ میں صوفیہ کا کلام تفسیر نہیں۔ ابن الصلاح نے اپنے فتاویٰ میں ذکر کیا ہے کہ میں نے امام

① کشف الظنون، ج ۲ ص، مطبوعہ

واحدی سے دریافت کیا، انہوں نے کہا کہ سلسلی نے حقائق التفسیر لکھی ہے جو شخص اس کو تفسیر کہے وہ کافر ہے۔ نسفی نے اپنے عقائد میں کہا کہ نصوص کو اپنے ظواہر پر محمول کیا جائے گا اور ان سے اہل باطن کے معانی کی جانب پھرنا الحاد ہے۔ اس قسم کی تفاسیر کے درس و مطالعہ اور بحث و نظر نے ہماری تمام قوتوں پر عالم ممات طاری کر دیا، چونکہ انسان منفعل اور اثر پذیر واقع ہوا ہے اس لئے عام لوگوں نے قتل کی زندگی بسر کرنا شروع کر دی اور آخر یہ کہنا پڑا: لم یبق من الاسلام الا رسمہ۔

### الفاظ کی غلط تعبیر

دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن حکیم کے اکثر الفاظ کے حقیقی مفہوم و معانی بدل دیئے گئے۔ لسان الہی نے ان کو جن مواقع میں استعمال کیا تھا اور جو مطالب صاحب شریعت علی صاحب الصلوٰۃ والتحیۃ کے پیش نظر تھے، وہ بالکل فراموش کر دیئے گئے ہم مثال کے طور پر چند الفاظ پیش کرتے ہیں۔

(۱) توکل: عام لوگوں کے نزدیک اس کا یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ ایک انسان بیکاروں اور اپاہجوں کی زندگی بسر کرے۔ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھا رہے، کوئی کام نہ کرے۔ لوگوں کے صدقات و خیرات اور نذر و ہدا یا پر نظر رکھے لیکن قرآن اس کا مفہوم بالکل جدا گانہ بتاتا ہے، اس کے نزدیک توکل کے یہ معنی ہوں گے کہ مشکلات و مصائب کے وقت ہمت و استقلال، عزم و ثبات قدم اور جوش صادق و دلولہ عمل کے ساتھ مصروف کار ہو، نتائج و ثمرات کی طرف سے خوف زدہ ہو کر اپنے فرائض حیات کو ترک نہ کر دے، بلکہ خدائے حق نواز سے پوری توقع رکھے کہ وہ ضرور کامیابی نوازش کرے گا۔ چنانچہ فرمایا:

قَالُوا يَبْنَؤُ سِإِنَّ فِيهَا قَوْمًا جَبَّارِينَ ۖ وَإِنَّا لَنَنذُرُكُمْ لَخُلُوعِهَا حَتَّىٰ يَخْرُجُوا مِنْهَا ۚ فَإِن يَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِنَّا دَاخِلُونَ ﴿٢٣﴾  
قَالَ رَجُلَانِ مِنَ الَّذِينَ يَخَافُونَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَإِذَا دَخَلْتُمُوهُ فَإِنَّكُمْ عَلَيْهِمْ ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَتَوَكَّلُوا ۚ إِنَّ كُنْتُمْ مَوْءِنِينَ ﴿٢٤﴾ (المائدہ ۲۲-۲۳)

”وہ لوگ لگے کہنے اے موسیٰ! اس ملک میں تو بڑے زبردست لوگ رہتے ہیں اور جب تک وہ وہاں سے نہ نکل جائیں ہم تو اس ملک میں قدم رکھتے نہیں، ہاں وہ لوگ اس میں سے نکل جائیں تو ہم ضرور جاداخل ہوں گے، خدا سے ڈرنے والوں میں سے دو آدمی تھے جن پر خدا نے اپنی خاص مہربانی کی وہ بول اٹھے کہ ان پر چڑھائی کر کے دروازے میں گھس پڑو اور جب تم دروازوں میں گھس پڑو بلاشبہ تمہاری فتح ہے اور تم ایمان رکھتے ہو تو اللہ پر توکل کرو۔“

(۲) صبر: مشہور یہ ہے کہ اگر کسی وجہ سے کوئی تکلیف و مصیبت آپڑے تو غم کا اظہار نہ کریں۔ ذلتوں اور رسوائیوں کے برداشت کرنے کی عادت ڈال لیں، پیش اور اف نہ کریں، سب طرف سے لعنت و نفرین ہو اور ہم خاموش بیٹھ کر سنا کریں، لیکن قرآن کہتا ہے کہ صحیح اصول اور مقاصد صالحہ کو پیش نظر رکھ کر کام کرتے وقت جس قدر

بھی تکالیف و شدائد آئیں ان کو برداشت کریں۔ باوجود ان آلام و مصائب کے اپنے مقصد کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ کام برابر جاری رکھیں اور رکاوٹوں سے گھبرا کر اپنے آپ کو بے دست و پانہ نہ بنالیں۔ حسب ذیل آیتیں اس مفہوم کی تائید کرتی ہیں۔

وَكَانَ مِنْ بَنِي قُتَيْبٍ مَعَهُ رَيْثُونٌ كَثِيرٌ ۖ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا ۗ  
وَاللَّهُ يَحِبُّ الصَّابِرِينَ ﴿٢٦﴾ (ال عمران ۱۳۶)

”اور بہت سے پیغمبر ہو گزرے ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والے لوگ دشمنوں سے لڑے تو جو مصیبت انکو اللہ کی راہ میں پہنچی اس کی وجہ سے نہ تو انہوں نے ہمت ہاری نہ یو داپن کا اظہار کیا اور نہ دشمنوں کے آگے عاجزی کا اظہار کیا اور اللہ صابروں کو دوست رکھتا ہے۔“

اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٢٧﴾ (ال عمران ۲۰۰)

”اپنے مقصد پر مرمٹو، دوسروں کو مرنے کے لئے تیار کرو، دشمنوں کی نقل و حرکت کی نگرانی کرو، اللہ سے ڈرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔“

قرآن حکیم! ارباب صبر و استقامت سے کم از کم اتنی توقع ضرور رکھتا ہے کہ اپنے سے دگنی طاقت کا مقابلہ کر سکیں:

فَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ ۚ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُوا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿٢٨﴾ (ال انفال ۶۶)

”اگر تم میں سے سو صابر ہوں گے تو دو سو پر غالب رہیں گے اور اگر تم میں سے ایسے ایک ہزار ہوں گے تو خدا کے حکم سے وہ دو ہزار کافروں پر غالب رہیں گے اور اللہ تعالیٰ صابروں کے ساتھ ہے۔“

(۳).... تقدیر: اس عقیدہ کے غلط مفہوم نے بھی مسلمانوں کی تباہی و بربادی میں کچھ کم حصہ نہ لیا۔ لوگ سمجھ گئے کہ جب سب کچھ خدا کے حکم سے ہوتا ہے تو ہمیں کام کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ انفرادی و اجتماعی زندگی کے بقاء و قیام کے لئے کوشش کرنا ترک کر دی۔ بیکاروں اور اپاہجوں کا ایک گروہ بن گیا اور بے دست و پابن کر دوسروں کے لئے بار دوش ثابت ہوئے۔ لیکن یقین کیجئے کہ اسلام کبھی اس سے آلودہ دامن نہیں ہوا۔ اس کی تعلیم کا ہر گز یہ مقصد نہیں کہ مسلمان قنط و بیکاری کی زندگی بسر کریں بلکہ وہ تو یکسر پیغام عمل ہے۔ اس نے اپنے نزول کے اولین روز بباگ دہل اس امر کا اعلان کر دیا کہ:

لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ ۚ وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرَىٰ ﴿٢٩﴾ (النجم ۳۹ تا ۴۰)

”انسان کو اتنا ہی ملے گا جتنی اس نے کوشش کی اور یہ کہ اس کی کوشش آگے چل کر دیکھی جائے گی۔“

پھر فرمایا۔

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۖ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۖ (الزلزال ۷ تا ۸)

”جس نے ذرہ بھرنیکی کی ہوگی وہ اس نیکی کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ بھربرائی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔“  
دوسری جگہ کہا:

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ ۚ (البقرہ ۱۳۴)  
”ان کا کیا ان کو اور تمہارا کیا تم کو۔“

گویا اس نے ہر ایک کے سامنے دعوت عمل پیش کی اور بتا دیا کہ یہ صرف انسان کی اپنی سعی و کوشش ہے جو اچھے اور برے نتائج پیدا کرتی ہے انہی اعمال کم تردد علیکم فمن وجد خيرا فليحمد الله ومن وجد غير ذلك فلا يلومن الانفسه میں اسی حقیقت کو واضح کیا۔

قرون اولیٰ کے مومنین قانتین تقدیر کا مفہوم صرف اتنا جانتے تھے کہ دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی حکومت ہمارے نفع و نقصان، سود و زیان داد و ستد، سلب و عطاء، اور حیات و ممات کی مالک نہیں، صرف خدائے یگانہ و قہار ہی کی ذات ہر قسم کے احکام نافذ کرتی ہے اور اسی کے قبضہ قدرت میں سب کچھ ہے۔ اس عقیدہ نے عرب کے بادیہ نشینوں میں اتنا جوش و ولولہ عمل اور استقلال و ثبات قدم پیدا کر دیا تھا کہ انہوں نے قیصر و کسریٰ کی تخت گاہوں کو الٹ دیا، اس وقت تو ایک ایک قطرہ طوفان در بغل تھا اور اب سب کے سب یاس و حسرت کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔ فشتان بینہما۔

(۴).... جہاد فی سبیل اللہ: بہت سی زبانیں تو اس کے ذکر ہی سے گنگ ہیں، شیاطین الانس کا خوف ان کے رگ و پے میں اس درجہ اثر کئے ہوئے ہے کہ وہاں اللہ کے خوف کے لئے جگہ نہیں یخشون الناس کخشية الله أو أشد خشية (النساء ۷۷) اور جنہیں ابھی بولنے کی طاقت حاصل ہے وہ اسے جہاد با نفس پر محمول کرتے ہیں اور: رجعا من الجهاد الا صغری الجہاد الا کبر کی غلط اور موضوع حدیث سے ان کا نفس خادع تمسک و اعتقام کرتا ہے۔ گویا ابلیس نے ان علمائے سو کو اپنے اعمال شیطانی کے لئے ایک آلہ بنالیا ہے اور جس طرح چاہتا ہے ان سے کام لیتا ہے۔ لیکن قرآن حکیم نے صاف صاف اعلان کر دیا کہ:

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًا كَانَتْهُمْ بُنْيَانًا مَرْصُوعًا ۖ (الص ۴)

”بیشک خدا ان لوگوں کو محبوب رکھتا ہے جو اس کی راہ میں صف باندھ کر لڑتے ہیں گویا وہ ایک دیوار ہیں جس میں سیسہ پلایا گیا ہے۔“

تاریخ اسلام میں سب سے پہلے جن لوگوں سے تمام تعلقات و روابط منقطع کئے گئے وہ وہی تین جلیل القدر صحابہ تھے جو کابلی کی بنا پر جنگ تبوک میں شریک نہ ہوئے۔

وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ خُلِفُوا ۖ حَتَّىٰ إِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوا أَنَّهُ لَا



مَلْجَأٍ مِنَ اللَّهِ إِلَّا إِلَيْهِ ۖ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا ۗ إِنَّ اللَّهَ هُوَ الشَّوَابُ الرَّحِيمُ ﴿۱۱۸﴾ (التوبہ ۱۱۸)

”اور ان تین پر بھی جو بانظار امر خدا ملتی رکھے گئے تھے یہاں تک کہ جب زمین باجود فرخی ان پر تنگی کرنے لگی اور وہ اپنی جان سے بھی تنگ آگئے اور سمجھ گئے کہ خدا کی گرفت سے اس کے سوا اور کہیں پناہ نہیں پھر خدا نے ان کی توبہ قبول کر لی تاکہ وہ آئندہ کے لئے توبہ کئے رہیں بیشک اللہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔“

جو لوگ جہاد میں شریک نہ ہوں، ان کی نسبت فرمایا کہ نہ صرف یہی مصیبتوں اور تکلیفوں کا نشانہ بنیں گے بلکہ ان کی وجہ سے تمام قوم مبتلائے آلام ہوگی۔

وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُصِيبُ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿۲۶﴾ (الانفال ۲۶)

”اور اس بلا سے ڈرتے رہو جو خاص کر ان ہی لوگوں پر نازل نہیں ہوگی جنہوں نے تم میں سے سرتابی کی ہے بلکہ سب اس کی زد میں آجاؤ گے اور جانتے رہو کہ اللہ کی مار بڑی سخت ہے۔“

جس طرح ہر شخص اپنی انفرادی زندگی کے بقا و قیام کے لئے ہر قسم کی جدوجہد کرتا ہے، ٹھیک اسی طرح قرآن حکیم نے تمام مسلمانوں پر حیات اجتماعی کے قائم و دائم رکھنے کے لئے جہاد کو الزم اللوازم قرار دیا۔

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُنْهَوْنَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ (الانفال ۶۰)

”اور سپاہیانہ قوت اور گھوڑوں کے باندھے رکھنے سے جہاں تک تم سے ہو سکے کافروں کے لئے ساز و سامان مہیا کئے رہو کہ ایسا کرنے سے اللہ کے دشمنوں پر اور اپنے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو گے۔“

پھر نبوت کے اعمال مہمہ میں سب سے اشرف و اعلیٰ مقام اسے نوازش کیا گیا۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ (الانفال ۶۵)

”اے نبی! مسلمانوں کو جنگ و قتال کرنے کے لئے ابھارو۔“

عالم الغیب والسماء کو اس امر کی اطلاع تھی کہ آخری زمانہ میں مسلمانوں کی تمام تر زندگی بطالت و بد عملی اور جبن و نامردی کی تصویر ہوگی۔ جہاد فی سبیل اللہ سے بچنے کے لئے طرح طرح کے حیلے تراش کر نفس خادع کے فریب میں مبتلا ہو جائیں گے اور قتال فی سبیل الحق والحریۃ ترک کر دیں گے۔ اس لئے سورہ توبہ میں ان کے ایک ایک عذر لنگ کو بیان کیا، ہر ایک کی حقیقت آشکارا کر دی اور بتا دیا کہ تمہیں کسی طرح بھی اس فرض اہم و قدم سے نجات نہیں مل سکتی۔ یہ فوجی خدمت ہر مسلم مرد و عورت۔ امیر و غریب، پادشاہ و فقیر اور آقا و غلام پر لازمی ہے اور اس سے کسی کو حق استثناء حاصل نہیں۔ ہم اس وقت صرف اشارات پر اکتفا کرتے ہیں، تفصیل کا مقام دوسرا ہے۔

(الف).... مخالفین و معاندین اسلام نے اپنی مجتمہ قوت سے اسلامی حکومتوں کو تاخت و تاراج کرنا شروع کر دیا

ہے، مسلمانوں کے تمام بلاد و امصار تباہ و برباد ہو رہے ہیں۔ اندیشہ ہے کہ حمیت مذہبی کی وجہ سے مسلمان مقابلہ



کے لئے نہ اٹھ کھڑے ہوں، دشمنانِ دین فوراً اپنے مواعید کا ذبح کا اعلان کر دیتے ہیں کہ فرزندِ انِ اسلام کے تمام حقوق کی حفظ و نگہداشت کی جائے گی، ان کے مقدس مقامات کا احترام کیا جائے گا اور ان کے مذہبی و سیاسی معاملات میں کسی قسم کی مداخلت روانہ رکھی جائے گی۔ اس قسم کی دل فریب باتیں سن کر اکثر حیلہ جو طبیعتیں پکاراٹھتی ہیں کہ ایسے لوگوں سے جنگ کرنا حد درجہ کی سفاہت و بد اخلاقی ہے، یہ تو پیکرِ فرشتگی و ملکوتیت ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ان پر اعتماد کرنا جہل و نادانی ہے، وہ کبھی اپنا وعدہ پورا نہ کریں گے۔

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِينَ أَنْ يَعْبُرُوا مَسْجِدَ اللَّهِ شُهُودِينَ عَلَى أَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ (التوبہ ۷۱)

”مشرکوں کو کوئی حق نہیں کہ اللہ کی مسجدیں آباد رکھیں اور اپنے اوپر کفر کی گواہی بھی دیے جائیں۔“

(ب) مسلمان اپنے گھروں میں نیک کام کرتے ہیں۔ علمائے کرام قرآن و حدیث کے درس میں مصروف ہیں۔ گروہ صوفیہ اپنی خانقاہوں میں اللہ اللہ کے نعرے لگاتا ہے کہ تزکیہ نفس حاصل ہو۔ ہزاروں لاکھوں انسان ہیں جو ان سے اپنی تشنگی کو دور کرتے اور سیراب ہو کر گھروں کو لوٹتے ہیں۔ یہ لوگ ان اعمالِ صالحہ کو پیش کر کے اپنے آپ کو قتال فی سبیل اللہ سے مستثنیٰ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن لسانِ الہی ان بد بختانِ ملت کو ظالم قرار دیتی ہے۔

أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ أَمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَجَاهِدَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَوُونَ عِنْدَ اللَّهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿۱۱﴾ (التوبہ ۱۱)

”کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے اور خانہ کعبہ کے آباد رکھنے کو اس شخص کی خدمتوں جیسا سمجھ لیا جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لاتا اور اللہ کے راستہ میں جہاد کرتا ہے۔ اللہ کے نزدیک تو یہ برابر نہیں اور اللہ ظالم لوگوں کو راہِ راست نہیں دکھایا کرتے۔“

حضرت عبد اللہ بن المبارک نے اپنے سال کو چار حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ تین ماہ تجارت کرتے، تین ماہ درس حدیث میں مصروف رہتے، تین مہینوں میں حج ادا کرتے اور باقی ایام جہاد فی سبیل اللہ میں صرف کرتے۔ انہوں نے حضرت فضیل بن عیاض کو خط بھیجا جو اس وقت بیت اللہ میں معتکف تھے اور حضرت عبد اللہ مصروف جہاد۔ اس خط کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

يا عابد الحرمين لو ابصرتنا  
لعلبت انك بالعبادة تلعب!

فضیل رو پڑے اور کہا ابو عبد الرحمن سچ کہتا ہے۔

(ج) دنیاوی ضرورتیں ماں باپ کی محبت، رشتہ داروں کی خبر گیری، مساکین و غربا کی اعانت اور زمین و جائیداد کی حفاظت، ان میں سے ایک چیز بھی جنگ سے مستثنیٰ نہیں کر سکتی۔

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ ۖ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا

وَمَسْكِنٌ تَرْضَوْنَهَا أَحَبُّ إِلَيْكُمْ مِّنْ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرٍ ۖ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ﴿٢٣﴾ (التوبہ ۲۳)

”کہہ دو، اگر تمہارے باپ، بیٹے، بھائی، بیویاں، کنبے والے، مال جو تم نے کمائے ہیں، سوداگری جس کے مند اپڑ جانے کا تم کو اندیشہ ہو اور مکانات جن کو تمہارا جی چاہتا ہے، اللہ، اس کے رسول اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے تم کو زیاد عزیز ہوں، تو صبر کرو یہاں تک کہ جو کچھ خدا کو کرنا ہے وہ تمہارے سامنے لا موجود کرے اور اللہ ان لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا جو سرتابی کریں۔“

(د).... قلت تعداد، فقد ان اسباب اور ضعف ظاہری کی بنا پر جہاد کو ترک نہیں کیا جاسکتا۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرٍ ۖ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُم مُّدْبِرِينَ ﴿٥٢﴾ (التوبہ ۵۲)

”اللہ بہت سے مواقع پر تمہاری مدد کر چکا ہے اور حنین کے دن جبکہ تمہاری کثرت نے تم کو مغرور کر دیا تھا تو وہ تمہارے کچھ بھی کام نہ آئی اور زمین باوجود وسعت لگی تم پر تنگی کرنے، پھر تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔“

(ہ) تاجرانہ تعلقات اور ملازمت کے روابط کی بنا پر کسی قوم سے جنگ کو ملتوی نہیں کیا جاسکتا اور یہ خیال نہ ہو کہ اس سے علیحدگی اختیار کرنے پر آمدنی کے تمام ذرائع مسدود ہو جائیں گے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَذَا ۚ وَإِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيكُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ إِن شَاءَ ۚ (التوبہ ۲۸)

”مسلمانو! مشرک تو گندے ہیں، تو اس برس کے بعد حرمت والی مسجد کے پاس بھی نہ پھٹکنے پائیں اور اگر ان کے ساتھ لین دین بند ہو جانے سے تم کو مفلسی کو اندیشہ ہو تو خدا چاہے گا تو تم کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا۔“

پس ان تمام آیات نے واضح کر دیا کہ جب تک آنکھوں میں بصارت ہے، کان سن سکتے ہیں، ناک سونگھ سکتی ہے، زبان میں قوت گویائی، ہاتھوں میں پکڑنے کی طاقت اور پاؤں میں چلنے کی قابلیت ہے، ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ جہاد کی تیاری کرے۔ تمام محبتوں اور چاہتوں پر اس کی شیعہ فتنگی دوار فتنگی غالب رہے۔ اس کا سودا سر میں ہو اور اسی کی زنجیر پاؤں میں ہوں کہ یہی احب الاعمال الی اللہ ہے، یہی سنام الاسلام ہے، یہی عصارہ ایمان اور مغز عبادت ہے۔

وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ ۚ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ۚ وَلِلَّهِ آيَاتُكُمْ (البرہین) ۖ هُوَ سَيُكَلِّمُ الْمُسْلِمِينَ ۚ مَنْ قَبْلَ رَفِي ۚ هَذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ ۚ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللَّهِ هُوَ مَوْلَاكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلَىٰ وَنِعْمَ النَّصِيرُ ﴿٢٢﴾ (۷۷، ۷۸:۲۲)

اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو جو حق جہاد کرنے کا ہے۔ اس نے تم کو تمام دنیا کی قوموں میں سے برگزیدگی اور امتیاز کے لئے چن لیا، پھر جو دین تم کو دیا گیا ہے وہ ایک ایسی شریعت فطری ہے جس میں تمہارے لئے کوئی رکاوٹ نہیں، یہی ملت تمہارے مورث اعلیٰ ابراہیم خلیل کی ہے اور اس نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے گزشتہ زمانوں میں بھی اور اب بھی تاکہ رسول تمہارے لئے اور تم تمام عالم کی ہدایت اور نجات کے لئے شاہد ہو۔ پس اللہ کے رشتہ کو مضبوط پکڑو، جان اور مال دونوں کو اس کی عبادت میں لٹادو۔ وہی تمہارا ایک آقا اور مالک ہے اور پھر جس کا خدا مالک و حاکم ہو اس کا کیا اچھا مالک ہے اور کیسا قوی مددگار۔

احادیث نے اس کی اہمیت کو اور زیادہ کھول کر بیان کیا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

والذی نفسی پیدا لوددت ان اقتل فی سبیل اللہ ثم احمی ثم اقتل ثم احمی ثم اقتل ثم احمی ثم قتل۔

”خدا کی قسم میں چاہتا ہوں کہ اللہ کی راہ میں شہید ہو کر دوبارہ زندہ ہو جاؤں پھر شہادت کا درجہ حاصل کر کے زندہ کیا جاؤں پھر شہید ہو کر زندہ ہوؤں پھر قتل کیا جاؤں۔“

دوسری حدیث میں کہا:

رباطیوم فی سبیل اللہ خیر من الدنیا وما فیہا۔

”ایک دن اللہ کی راہ میں جو کیداری کرنی بہتر ہے دنیا اور اس کی تمام چیزوں سے۔“

جس شخص نے جہاد کا ایک لمحہ کے لئے بھی ارادہ نہ کیا ہو، اسی حالت میں مر گیا ہو اس کی نسبت فرمایا کہ وہ منافق کی موت مر ہے۔

من مات ولم یغز ولم یحدث بابہ بنفسہ مات علی شعبۃ من نفاق۔

”جو شخص مر گیا نہ تو اس نے اپنی زندگی میں کبھی جہاد کیا اور نہ اسے کرنے کا ارادہ ہی دل میں پیدا ہوا وہ نفاق کی موت مرا۔“

ایک موقعہ پر یوں ارشاد ہوا:

ان ابواب الجنة تحت ظلال السیوف۔

”جنت کے دروازے تلواروں کے سایہ کے نیچے ہیں۔“

**غلط فہمی کے اسباب**

آیات کا مفہوم سمجھنے میں اکثر غلطیاں اس لئے سنگ راہ ہو گئیں کہ باریک بین نگاہوں نے الفاظ کو موشگافی کی نظر سے دیکھا اور جب اس سے بھی سیری نہ ہوئی تو داماں نگاہ کو تنگ کرنے کے لئے ہر قسم کی تاویلات سے مدد لی اور بات کہیں سے کہیں جا پڑی۔ بے شبہ قرآن حکیم کا مفہوم اور مطلب سمجھنے کے لئے سخن فہم اور نکتہ سنج طبیعت کی ضرورت ہے، لیکن اسی کے ساتھ ہر سخن جائے و ہر نکتہ مکانے دار کے اصول سے بھی علیحدگی ممکن نہیں۔ قرآن کے پڑھنے والے کو جس علم

وفن پر عبور لازم ہے وہ اسوہ حسنہ رسول اللہ ہے۔ جس کی ناواقفیت سے تفسیر میں صدہا مشکلات پیدا ہو گئی ہیں۔ دوسری غلط فہمی شان نزول کے متعلق پیدا ہو گئی۔ ہر آیت کے لئے کوئی نہ کوئی واقعہ فرض کر لیا گیا، پھر اس کے مطالب کو اسی مخصوص حادثہ میں محدود کر دیا۔ ان میں بیشتر وہ واقعات تھے جو اہل کتاب سے منقول اور اس لئے ناقابل اعتماد تھے، مگر ان ارباب تفسیر نے انہیں اسرائیلیات کو اصل و اساس قرار دیکر قرآن کی تفسیر لکھی اور اس طرح اس کتاب کی اجتماعی اور محیط الکل حیثیت کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ قرآن کو افسانہ گوئی کی کتاب بنا دیا۔ قصہ یوسف واقعہ حسن و عشق بن گیا اور اب تو عام زبانوں پر یہ جاری ہے۔

کہ من اسیر بمعشوق اور بفرزند است!

سلیمان کے عجائب و غرائب تو زبان زد خاص و عام ہیں۔ ہاروت و ماروت کا ذکر بھی اسی قبیل سے ہے۔ قرآن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ امتوں کے واقعات اس لئے بیان کئے جاتے ہیں کہ لوگ ان سے بصیرت اندوز ہوں، ان سے استخراج و استنباط نتائج و شواہد کریں، جہاں گیری و جہانداری کے اصول و ضوابط کی تعلیم ہو۔ پھر مصیبت یہ ہوئی کہ قرآن کے مخاطب کو صرف عرب کے لئے مخصوص کر دیا، کہا کہ یا ایہا الناس سے مراد کفار مکہ ہیں اور یا ایہا الذین امنوا کاروئے سخن اہل مدینہ کی جانب ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نزول قرآن کے وقت اولین مخاطب یہی لوگ ہیں، مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ دنیا کی باقی قومیں اور آنے والی نسلیں ان آیات کی مخاطب نہیں بن سکتیں۔ علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

”اختلف اهل الاصول هل العبرة بعموم اللفظ او بخصوص السبب والارحج عندنا الاول“

”اہل اصول کا اس امر میں اختلاف ہے کہ عموم لفظ کا اعتبار ہو گا یا خصوص سبب کا، ہمارے نزدیک قول اول ہی ارجح و اقویٰ ہے۔“

باوجود اس قسم کی تصریحات کے متاخرین نے پھر بھی کچھ خیال نہ کیا۔ اسی کا آج اثر ہے کہ صرف برکت اور بزرگی کی خاطر قرآن کی تلاوت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ لوگوں کے نزدیک اس کے مخاطب عرب تھے نہ کہ ہم۔ انہیں یہ خیال نہیں ہوتا کہ قرآن بار بار درس و مطالعہ کی دعوت دیتا ہے، محض الفاظ پر زور دینا اور حقیقت سے غافل رہنا شریعت کے نزدیک بیکار ہے۔ اس کا روئے سخن عالمگیر ہے۔ وہ ایک بین المللی جامعہ کے قیام کے لئے آیا ہے۔ وہ ہماری انفرادی و اجتماعی خرابیوں کا تذکرہ کرتا ہے۔ ان کی اصلاح و تہذیب کے لئے مرتب قانون پیش کرتا ہے، مگر چونکہ یہ حقیقت پیش نظر نہیں اس لئے ہماری قوتیں بیکار ہو گئیں، اباہوں کی امت بن گئے۔ احیاء اور تجدید کی ضرورت محسوس ہوئی تو یورپ کی جانب دیکھا، اسی کی تقلید اعلیٰ کی، زنجیروں نے ہمارے پاؤں کو بو جھل کر دیا۔

اقسام القرآن کا علم نہایت ہی معنی خیز اور لطیف و دلآویز تھا، جس سے صدہا سرائے و مجربات فطرت کا کشف و بروز ہوتا

تھا مگر اول تو ان کی نظر ہی وہاں تک نہ پہنچی اور اگر امام فخر الدین رازی کو کچھ تبنہ ہوا بھی تو اتنا سا کہہ کر رہ گئے کہ: ”قسمیں صرف ان چیزوں کی بیان کی جاتی ہیں جو جلیل القدر ہوں۔“

قرآن حکیم میں بار بار کہا گیا کہ جو لوگ ایمان باللہ اور عمل صالح رکھتے ہیں وہ ضرور کامیاب ہوں گے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں شاد کام و باہر اور رہیں گے اور کبھی انہیں حزن و ملال نصیب نہ ہو گا۔ ارباب تفسیر نے اس امر پر مہر لگادی کہ اعمال صالحہ کے جن نتائج و ثمرات کا ذکر کیا گیا ہے، وہ قیامت کے لئے مخصوص ہیں، دنیا میں مسلمان ذلیل و رسوا رہیں گے، اس خیال نے چنگی پیدا کی اور اب تو یہی عقیدہ ہر مسلمان کے قلب و دماغ پر حاوی ہے۔ پس مسلمان دنیا کی جانب سے غافل ہو گئے اور محکومانہ زندگی پر قناعت کر بیٹھے، مگر قرآن کہتا ہے کہ:

كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَآتَاهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ ﴿٥﴾ فَأَذَاقَهُمُ اللَّهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ﴿٢٥﴾ (۲۵:۲۶:۳۹)

”جو لوگ ان سے پہلے ہو گزرے ہیں انہوں نے بھی پیغمبروں کو جھٹلایا تو ان کو عذاب نے ایسی طرف سے آلیا کہ انہیں اس کی خبر بھی نہ تھی، ان کو اس دنیا کی زندگی میں اللہ نے ذلت کا مزہ اچکھایا۔“

دوسری جگہ فرمایا:

أَفْتَوْهُمُ مَنْوَنَ بَعْضُ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ تُنْفِخُ الْفُيُوءُ إِلَى أَشَدِّ الْعَذَابِ (البقرة ۸۵)

”تو کیا کتاب الہی کی بعض باتوں کو ماننے ہو اور بعض کو نہیں۔ پس جو لوگ تم میں سے ایسا کریں گے اس کے سوا ان کا اور کیا بدلہ ہو سکتا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ان کو ذلت ہو اور آخر کار قیامت کے دن بڑے ہی سخت عذاب کی طرف لوٹائے جائیں۔“

ایک مقام پر یوں ارشاد ہوا۔

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا تَقِفُوا إِلَّا بِحَبْلٍ مِنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِنَ النَّاسِ وَبَاءُؤُ بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ﴿١١٢﴾ (ال عمران ۱۱۲)

”جہاں دیکھو، ذلت ان پر سوار ہے مگر اللہ اور نیز لوگوں کے عہد پیمان کے ذریعہ سے کہیں ان کو پناہ مل گئی تو دوسری بات ہے خدا کے غضب میں گرفتار ہیں اور محتاجی ہے کہ الگ ان کے پیچھے پڑ گئی ہے۔“

یہ تمام آیات اس حقیقت کو واضح کر رہی ہیں کہ ذلت و مسکنت، خسران و خذلان اور غلامی و محکومی اللہ تعالیٰ کے غضب اور اس کے عذاب شدید کی نشانیاں ہیں، البتہ جن ارباب قدس و طہارت کو وہ اپنے فضل مخصوص کی لئے چن لیتا ہے، ان کو جنت ارضی، خلافت الہی اور سرفرازی و سر بلندی نوازش کرتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿۱۲۳﴾ (ال عمران ۱۲۳)  
 ”نہ ہمت ہارو اور نہ غم کرو تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔“  
 پھر کہا:

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزُّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ﴿۱۰۵:۲۱﴾  
 ”اور ہم زبور میں پسند و نصیحت کے بعد یہ بات لکھ چکے ہیں کہ ہمارے نیک بندے زمین کی سلطنت کے وارث ہوں گے۔“  
 اس سے زیادہ اور کیا صداقت ہو سکتی ہے:

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ ﴿۵۴:۲۴﴾  
 ”تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل بھی کرتے ہیں ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ انکو سلطنت ضرور عطا کرے گا۔“  
 سیاست تو ان کے نزدیک شجرہ منوعہ سے کم نہ تھی۔ اس کا قرب و اتصال بھی ان کے لئے ارتکاب کبیرہ کے برابر تھا اور بعض نکتہ آفریں طبائع نے تو اپنی بدنماتی کا یہاں تک ثبوت دیا کہ لاتفر باھذہ الشجرۃ کی تفسیر میں لکھا کہ اس میں جس درخت کے قریب جانے کی ممانعت کی گئی ہے وہ یہی سیاست ہے۔ اس خیرہ نظری کی انتہائی ہوئی کہ مذہب اور سیاست کو دو جداگانہ چیزیں سمجھا جانے لگا۔ اب تو ہر شخص اس کو مسلمانوں کے مسلمہ عقائد میں سے تسلیم کرتا ہے اور ارباب عمام اپنے مواعظ و خطب میں بانگ دہل کہہ اٹھتے ہیں کہ مذہب کا حلقہ دوسرا ہے اور سیاست کا دوسرا۔ ساء ملیحکون۔  
 آہ! ان بد بختان ملت کو یہ تمیز نہ رہی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ معجزات قاہرہ اور بشارات عظیمہ دیکر فرعون کے پاس بھیجتا ہے۔ فرعون مشرک بھی ہے، مے نوش بھی ہے، بدکار بھی ہے۔ فاسق بھی ہے، فاجر بھی ہے غرض وہ سب کچھ ہے جو دنیا کا ایک سیہ کار اور شریر و ظالم انسان ہو سکتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک پیغمبر برحق تھے۔ توحید الہی، رد شرک و اصنام پرستی، تزکیہ نفس و اخلاق، درس کتاب و حکمت ان کے فرائض نبوت کے حقیقی ارکان ہیں، ان کا مخاطب ایک مشرک و فاجر پادشاہ اور ایک مشرک و فاجر حکمران قوم تھی۔ اگر سیاست اور دین دو الگ الگ چیزیں ہیں، جیسا کہ نادانی اور جہل کے ابلیس نے تمہیں سمجھایا ہے، اور اگر ایک قوم کو غلامی سے نجات دلانا ایک غیر دینی عمل ہے، جیسا کہ بد بختانہ تم سمجھتے آئے ہو، تو اب ضروری تھا کہ حضرت موسیٰ کی دعوت و تبلیغ بھی اس چیز سے بالکل علیحدہ رہتی، جس کا نام تم نے سیاست رکھا ہے۔ وہ آتے اور فرعون سے سب کچھ چاہتے، مگر وہ نہ چاہتے جو نہ تو دین ہے اور نہ پیغمبرانہ دعوت کا کوئی جزو حقیقی، مگر قرآن حکیم تمہارے سامنے موجود ہے، خدا نے فرعون کو نہ تو توحید کی دعوت دی نہ اس کی شراب کی بوتلیں توڑ ڈالیں، نہ اس کی سیاہ کاریوں کا جائزہ لیا بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس دعوت کا صرف ایک ہی مقصد بتا کر رخصت کیا۔

إِذْهَبْ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ ﴿۲۴:۲۰﴾

”فرعون کے پاس جاؤ کیونکہ وہ بڑا سرکش اور ظالم ہو گیا ہے۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے پاس آئے اور انہوں نے بجز اس کے اور کچھ نہ کہا کہ۔

أَنْ أَدَّاءِ إِلَيَّ عِبَادَ اللَّهِ إِنَّ لَكُمْ رَسُولًا أَمِينًا ﴿۱۷﴾ (۱۷:۴۴)

”خدا کے بندوں یعنی (بنی اسرائیل) کو مجھے واپس دیدو جسے تم نے اپنا محکوم بنارکھا ہے، میں تمہارے پاس ایک امانت دار رسول بن کر آیا ہوں۔“

تم نے غور کیا، یعنی حضرت موسیٰ نے فرعون کے آگے اپنی تبلیغ کا مقصد یہ نہیں کہا کہ فسق و فجور چھوڑ دو، گناہ اور شرارت سے باز آ جاؤ، نیک زندگی اختیار کرو، پاک طریقوں پر عمل کرو، بلکہ اولین مطالبہ یہ کیا کہ خدا کے جن بندوں کے پاؤں میں تو نے اپنی محکومی اور غلامی کی زنجیریں ڈال دی ہیں انہیں چھوڑ دے اور مجھے واپس دے دے۔ خدا نے مجھے اس قوم کا امین بنایا ہے۔ اس کے بندوں کو میں آزادی دلاؤں گا، محکومی کی جگہ ایک حکمران قوم بناؤں گا، خدا کے بندے خدا کی امانت ہیں، تو ظالم و مستبد ہے اس لئے تو اس امانت کا مستحق نہیں، یہ شرف اللہ نے مجھے عطا فرمایا ہے کہ میں اس امانت کو ٹھیک ٹھیک اپنے پاس رکھوں گا۔

یہ مطالبہ اگرچہ نہایت مختصر الفاظ میں کیا گیا، لیکن درحقیقت وہ سیاست کی روح، سیاست کا مغز اور سیاست کی حقیقی تفسیر تھا۔

## دعوت و تبلیغ

اب ہم اتنی منازل مختلفہ طے کرنے کے بعد مذہب کے اس اہم و اقدم باب کی طرف توجہ کرتے ہیں، جس میں داخل ہونے کے بعد ہر قوم نے کامرانی و سربلندی کی راہیں اپنے سامنے کشادہ پائی ہیں اور جہاں ذرا سی ذلتہ قدم نے ان کو ہمیشہ کے لئے حرف غلط کی طرح مٹا دیا ہے۔

اسلام سے قبل جس قدر اقوام و امم اس زمین کی پشت پر پیدا ہوئیں، اگر ان کے تنزل و انحطاط کے اصولی اسباب و مراتب کا درس و مطالعہ کیا جائے تو سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز علت یہی نظر آئے گی جو تمام امراض و مفسد ملی کے لئے بمنزلہ اصل و اساس کے کام دے گی کہ امت کے تمام افراد نے تبلیغ و دعوت کے اہم و اقدم فرض سے بعد و ہجر اختیار کیا۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ برائی کا ارتکاب کیا جا رہا ہے مگر ٹس سے مس نہ ہوئے۔ گویا آنکھیں اس لئے نہ دی گئی تھیں کہ ان سے دیکھنے کا کام لیتے: فانھا لاتعین الابصار ولكن تعین القلوب التقی الصدور۔

پھر اس کے ساتھ دوسری مصیبت یہ ہوئی کہ ایک مخصوص گروہ نے دعوت و اصلاح کو اپنے اندر محدود کر دیا کہ کسی دوسرے کو دخل دینے کا حق حاصل نہیں۔ ہندوؤں میں صرف برہمن ہی ویدوں کے عالم بن سکتے ہیں، دوسروں کو صرف

ان معبودان باطل کی رسوم کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ رومن کی تھو لک کے فادروں نے کتاب مقدس کے اسرار و خزانہ پر قبضہ کر کے اپنے آپ کو ارباباً من دون اللہ کا درجہ دیا۔

قرآن حکیم کا نزول ہوا کہ وہ ان بیڑیوں کو کاٹ دے جو لوگوں کے پاؤں میں ڈال دی گئی ہیں۔ اس نے ہر مسلم کا فرض قرار دیا کہ وہ مبلغ ہے اور اسلام و قرآن کی آواز دنیا کے گوشہ گوشہ اور کونہ کونہ میں پہنچانا اس کا مقصد حیات۔ اس نے صاف صاف اعلان کر دیا کہ:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ (۱۱۰:۳)

”لوگوں کی راہ نمائی کے لئے جتنی امتیں پیدا ہوئی ہیں ان میں تم سب سے بہتر ہو کہ اچھے کام کرنے کو کہتے ہو اور برے کام سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔“

دوسری جگہ فرمایا:

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ (۱۲۳:۲)

”اور اسی طرح ہم نے تم کو درمیانی امت بنایا تاکہ لوگوں کے راہ نمائے ہو۔“

سورۃ حج میں فرمایا:

الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَآمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَاللَّهُ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ۝ (۲۱:۲۲)

”اگر حاکم بنا کر ہم زمین میں ان کے پاؤں جمادیں تو نماز پڑھیں گے، زکوٰۃ دیں گے، لوگوں کو اچھے کاموں کے لئے کہیں گے اور برے کاموں سے منع کریں گے اور سب چیزوں کا انجام کار اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔“

یہ تمام آیات بغیر کسی اختلاف و تفریق کے بباگ و بیل اس حقیقت کا اعلان کر رہی ہیں کہ مسلمان صرف اس غرض کے لئے دنیا میں بھیجے گئے ہیں کہ وہ ہر نیکی کے آمر اور ہر برائی کے ناهی ہیں۔ تبلیغ و دعوت ان کا طغرائے امتیاز ہے جو ان کو باقی تمام اقوام عالم سے نمایاں کرتا ہے۔ اس کا ہر ہر فرد پیکر دعوت و اصلاح ہے اور اس میں کسی ایک گروہ کی تخصیص نہیں، بلکہ یہ فرض عام اور سب پر فرداً فرداً حاوی ہے۔

سورہ عصر نے تو کامیابی اسی تبلیغ و اشاعت ہی کو قرار دیا کہ اگر فرزند ان اسلام تو اوصی بالحق و تواصی بالصبر نہ کریں گے تو خسران و غدلاں اور ذلت و ادبار میں مبتلا ہوں گے اور پھر صرف وہی لوگ مستوجب عقوبت نہ ہوں گے جنہوں نے تبلیغ و ارشاد کو اپنی زندگی کا مقصد اصلی تو قرار دیا مگر اس کے ادا کرنے میں تساہل سے کام لینے لگے، بلکہ پوری امت کی امت مبتلائے آلام ہوگی: و اتقوا فتنة الذين ظلموا منكم خاصة۔

جبکہ ہر مسلم داعی الی الحق پیدا کیا گیا تھا تو کیسے ممکن تھا کہ لسان نبوت خاموش رہتی اور صحابہ کرام اس موضوع پر کسی



قسم کی روشنی نہ ڈالتے۔ رسول اللہ ﷺ نے صاف صاف اعلان کر دیا کہ:

بلغوا عنی ولو ابیة۔

”اگر ایک آیت بھی جانتے ہو تو اس کی نشر و اشاعت کرو۔“

فلیبذلغ الشاهد الغائب فان الشاهد عسو ان یبدلغ من هو ادعی له منه۔

”ہر وہ شخص جو اس وقت موجود ہے غائب کو اس کی اطلاع کر دے ممکن ہے جس کو اس کی خبر پہنچے وہ مبلغ سے زیادہ صاحب فہم و فراست ہو۔“

پھر ایک جگہ فرمایا:

من رای منکم منکر افلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فیلسانہ وان لم یستطع فبقلبہ وذلك اضعف الایمان۔

”تم میں سے جو شخص کسی برائی کو دیکھے وہ طاقت سے کام لے کر اس کو روکے اگر قوت نہیں تو زبان سے ورنہ دل سے ضرور ہی برا جانے اور یہ ضعیف ترین درجہ ایمان ہے۔“

مزید تاکید کے بعد پھر ارشاد کیا۔

الا کلکم راع و کلکم مسؤول عن رعیتہ۔

”تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے اور ہر ایک سے اس کی ذمہ داری کی بابت سوال کیا جائے گا۔“

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے ان الفاظ میں اس کی اہمیت کو واضح کیا:

لو وضعتم الصمصامة علی هذه و اشار الی قفاه ثم ظننت انی انفذ كلمة سبعتها من البني ﷺ قبل ان تخیروا علی لا انفذتها۔

”اگر تم تلوار کو میری گردن پر رکھ دو اور مجھے یہ توقع ہو کہ گردن کٹنے سے قبل میں ان کلمات کی تبلیغ کر سکوں گا جو نبی ﷺ سے سن چکا ہوں تو ضرور کہہ کر رہوں گا۔“

صحابہ کرام کی حیات مقدس اس امر کی شاہد ہے کہ ان میں ایک ایک فرد مجسم دعوت اسلام تھا، وہ کہیں جاتے تبلیغ کا دردان ان کے دل میں تھا۔ ان کا ہر اقدام وادب اسی غرض کے لئے ہوتا۔ تجارت تھی تو اسی کے لئے، زراعت تھی تو اسی کی خاطر۔ بلاد بعیدہ اور ممالک اجنبیہ کے دور دراز سفر تھے۔ جنگلوں اور بیابانوں کی بادیہ پیمائی تھی، پہاڑوں کی سربلک چوٹیاں، سمندروں اور دریاؤں کی طوفان خیز موجیں، آندھیوں اور طوفانوں کی ہلاکت خیز بربادیاں ان کی راہ میں حائل تھیں، مگر ان میں سے کوئی چیز بھی ان کے لئے سنگ راہ ثابت نہ ہوئی۔ قید خانوں کی کوٹھری میں بھی وہ اسوہ کوسنی کو ہاتھ سے جانے نہ دیتے اور برابر تبلیغ میں مصروف رہتے۔ وہ جانتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی تمام تر زندگی اسی فرض جلیل کے ادا کرنے

میں گزر گئی، لوگوں نے آپ پر پتھر برسائے، گالیاں دیں، مجنون و ساحر کہا، کس لئے؟ صرف اس لئے کہ داعی حق، ناشر صداقت اور مبلغ قرآن تھے۔

لیکن آہ ثم آہ! مسلمانوں نے اس اسوۂ حسنہ کو ترک کر دیا۔ اس سے بعد وہ ہجر اختیار کیا اور اس کو درءِ ظہود ہم پھینک کر یقین کر لیا کہ ضرور کامیاب ہوں گے، لیکن صدیوں کے تجربہ نے آج اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ جب تک ہر فرزند اسلام قرآن حکیم کی دعوت کے لئے سربکف کو شش نہ کرے گا اور اس کتاب عزیز کو لے کر سرفروشانہ اقدام نہ کرے گا امت مسلمہ کا تنزل و انحطاط سے نجات حاصل کرنا محال قطعی ہے۔

چند ابتدائی صدیوں تک مسلمانوں کا یہ خیال تھا کہ تبلیغ و دعوت ہر مسلمان کا فرض حیات ہے، مگر آخر جمود و استبداد نے ان کی قوتوں کو پامال کر دیا اور گروہ علمائے اس پر قبضہ کر لیا، گویا یہ اقلیم فرمانروائی تھی جو صرف انہی کے لئے مخصوص تھی، لیکن آج وہ بھی اپنے فرض سے غافل خانقاہوں میں تسبیح و سجادہ پر قائل ہیں۔

پس وقت آگیا ہے کہ ہر وہ مسلم جس کے دل میں اسلام کا درد اور دین کی ٹیس ہے میدانِ عمل میں آگے بڑھے اور قرآن کی نشر و اشاعت میں لگ جائے۔

أَنْ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ فَاتَّبِعُوهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ ۚ (۱۵۳:۶)

واخرا دعونا ان الحمد لله رب لعلمین۔

ربنا تقبل منا انک انت السميع العليم۔

☆☆☆○○○○○○○○☆☆☆☆

## سورة البقرة

(رکوع ۴۰ آیات ۲۸۶)

## سورة کا نام

قرآن حکیم میں جس قدر سورتیں ہیں ان کی بعض نمایاں اور ممتاز خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر رسول اللہ ﷺ نے ان کے نام معین کر دیئے ہیں۔ سورہ بقرہ میں گائے ذبح کرنے کا قصہ بیان کیا گیا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیتے ہیں، وہ اس کی حکمت سے آگاہ نہیں، اس لئے جدل و مناظرہ کا بازار گرم کرتے ہیں تا آنکہ بہت سے سوال و جواب اور بحث و تحقیق کے بعد تعمیل ارشاد کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ چونکہ اس میں قرآن کے اہم واعظم ترین اصول کی تعلیم تھی جو اقوام و امم کے عروج و ارتقاء کی اساس و بنیاد ہے، اس لئے اس سورہ مبارکہ کا نام ”بقرہ“ تجویز ہوا۔

## ترتیب نزول

یہ سورہ تمام و کمال دارالہجرت ہی میں نازل ہوئی ہے۔ ”صاحب اتقان“ نے صرف دو آیتوں کو مستثنیٰ کیا ہے۔

## ما قبل سے تعلق

قرآن حکیم کی موجودہ ترتیب میں سورہ فاتحہ کے بعد سورہ بقرہ آتی ہے۔ ایک عاجز و درماندہ انسان خدائے قدوس کے حضور میں کھڑا ہو کر الصراط المستقیم کی درخواست کرتا ہے کہ وہ راہ حق کو پائے اور ضلالت و گمراہی سے محفوظ رہے۔ اس سورہ مبارکہ میں دعاء کو اجابت بخشی گئی اور ایسی تعلیم نوازش ہوئی جو ہدیٰ للمتقین ہے اور جس کا طغرائے امتیاز یہ ہے کہ وہ ان کو اولئک علی ہدیٰ من ربہم و اولئک ہم المفلحون کے پاک و مزی کی گروہ میں شامل کر دیتی ہے۔

ام الكتاب میں مغضوب علیہم اور الضالین کے نقش قدم پر چلنے سے پناہ مانگی گئی تھی، اس سورہ نے شرح و تفصیل کے ساتھ ان مغضوبین کے جذبات و احساسات، الف و عادات رسم و رواج، اور امراض و مفسدات سے بحث کی، ضالین کے حقائق مستورہ کو آل عمران نے بے نقاب کیا۔

فاتحہ الكتاب متن ہے اور تمام قرآن اس کی شرح و تفسیر، یہ اجمال ہے اور وہ تفصیل۔

## موضوع سورة

آپ پہلے چند مقدمات کو پیش نظر رکھ لیجئے کہ ان پر ہمارے تمام مباحث تفسیر مبنی ہیں۔

(الف).... قرآن حکیم کی ہر سورۃ کا ایک موضوع (Subject) ہے اور اوّل سے لے کر آخر تک وہ سورۃ اسی پر مبنی ہے، جس قدر مطالب درمیان میں آگئے ہیں وہ سب کے سب اسی ایک موضوع اصلی کے ناگزیر و ضروری اطراف بحث و تعلیم ہیں۔

(ب).... ہر سورۃ کی ابتدا و انتہا، اس موضوع کے معلوم کرنے کی کنجی ہے۔

(ج).... جب ہر سورۃ کا ایک موضوع ہے تو یہ چیز بھی ضمناً آپ کو معلوم ہو گئی کہ قرآن کی تمام آیات باہم مربوط و مسلسل ہیں اور ایک نظم و اسلوب حقیقی کے ساتھ سلسلہ بیان بتدریج اجمال سے تفصیل، دعویٰ سے دلیل اور تعلیم سے امثال و نظائر کی طرف بڑھتا اور کھلتا جاتا ہے۔ اسی کو قرآن حکیم نے تصریف آیات سے جا بجا تعبیر کیا ہے۔ ”صرف“ کے معنی لغت میں رد الشئ من حالة الى حالة کے ہیں۔

یہ اصول اساسی آپ کے سامنے ہیں، سورہ بقرۃ کی ابتداء میں فرمایا: اولئک علی ہدی من ربہم و اولئک ہم المفلحون، فلاح کے حسب ذیل معانی بیان کئے گئے ہیں۔

(۱).... الذی انفتحت لہ وجوہ الطفر ولم تستغلق علیہ، جس کے لئے ظفر و کامرانی کے ابواب مفتوح ہوں اور اس کی تمام رکاوٹیں ایک قلم مفقود ہو جائیں۔

(۲).... الفلاح بمعنی البقاء، فیکون المعنی اولئک ہم الباقون فی النعمیم المقیم، فلاح کے معنی بقا بھی بیان کئے جاتے ہیں، اس اعتبار سے آیت کا مفہوم یہ ہو گا کہ دائمی نعمتوں میں ہمیشہ رہیں گے۔

(۳) اصل الفلاح الشق، فعلى هذا يكون المعنى اولئک هم المقطوع اولئک هم بالخیر فی الدنیا والاخرۃ، فلاح کے معنی انشقاق اور قطع و برید کے بھی آتے ہیں، اس لئے معنی یہ ہوں گے کہ دنیا و آخرت کی ہر قسم کی خیر و برکت اور عزت و کرامت صرف فرزند ان اسلام کے لئے مخصوص کر دی گئی ہے۔

ان تینوں معانی میں دراصل کوئی اختلاف نہیں، بلکہ سب کے سب ایک ہی حقیقت کو بیان کرتے ہیں۔ مقصد سب کا یہی ہے کہ دنیا کی ہر انتہائی کامیابی و کامرانی، اجلال و تجلیل، جہانگیری و جہانداری، جنت ارضی و سماوی مخصوص ہے ان ارباب فضل و کمال کے لئے جن کے یہ خصائص و امتیازات اور کمالات و فضائل ہیں اور وہ کبھی ناکام و خاسر نہیں رہ سکتے۔ اسی سورۃ کے آخر میں دعا کی گئی:

فانصرنا علی القوم الکفرین، جس کے معنی اس کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں کہ ہمارے مخالفین و معاندین تباہ و برباد ہوں، اور ہمیں ان پر ظفر و کامرانی نصیب ہو۔

پس اس سورۃ کے اوّل و آخر نے ہمیں بتا دیا کہ اس کا موضوع اصلی یہی ہے کہ اس میں ایسی تعلیم دی جائے جو مسلمانوں کے اندر صحیح کریکٹر پیدا کر دے، وہ اپنے مذہب اور اخلاق کے پابند رہ کر دنیا و آخرت کی انتہائی کامیابیوں اور کامرانیوں سے بہرہ اندوز ہوں۔ گویا دوسرے الفاظ میں اس کا موضوع و مقصد مسلمانوں کو خلافت کبریٰ کی تعلیم دینا اور اس سے سرفراز کرنا ہے۔

اگر ہم ان تمام احادیث و آثار کو پیش نظر رکھیں جن میں اس سورہ کے فضائل بیان کئے گئے ہیں تو ہمارے دعوے کی صداقت روز روشن کی طرح واضح ہو جائے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لا تجعلوا بيوتكم مقابر، وان البيت الذي تقرأ البقرة فيه لا يدخله الشيطان۔ (ترمذی)

اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ، جس گھر میں سورہ بقرہ کی تلاوت ہو وہاں شیطان کا داخلہ بند ہوتا ہے۔

ایک جگہ آپ نے ان الفاظ میں اس کی اہمیت ظاہر کی:

لكل شي سنام وان سنام القرآن سورة البقرة۔ (ترمذی)

ہر ایک چیز کا ممتاز و نمایاں حصہ ضرور ہوتا ہے۔ قرآن کی یہ خصوصیت کبریٰ اور علو و رفعت سورہ بقرہ کو حاصل ہے۔ ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ، رسول اللہ ﷺ کو جنگ کے لئے ایک جماعت بھیجنا تھی جس کے لئے سردار کی تلاش میں تھے، جن لوگوں نے اپنی خدمات پیش کیں ان میں سے ہر ایک سے آپ یہ پوچھتے کہ قرآن کے کونسے اجزاء حفظ ہیں، اتنے میں ایک نوجوان نے کہا کہ مجھے سورہ بقرہ یاد ہے، آپ نے فرمایا کہ، تم اس جماعت کے امیر ہو۔ حالانکہ عمر کے اعتبار سے وہ سب سے چھوٹا تھا<sup>۱</sup>۔

مسلم میں انس بن مالک سے روایت ہے:

كان الرجل اذا قرأ البقرة ذل عمران جديبينا۔

جو شخص بقرہ اور آل عمران پڑھ لیتا اس کی ہم بے انتہا قدر و منزلت کرتے تھے۔

نبیہی نے کتاب الدلیل میں عثمان بن ابی العاص سے روایت نقل کی ہے کہ، میں باوجود اس امر کے کہ صغیر السن تھا اور میری عمر کچھ زیادہ نہ تھی، لیکن رسول اللہ ﷺ نے مجھے طائف کی گورنری نوازش فرمادی، صرف اس لئے کہ میں نے سورہ بقرہ پڑھی تھی۔

شعب الایمان میں ہے کہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سورہ مبارک کو آٹھ سال میں ختم کیا اور اس کے درس و فکر سے فارغ ہونے پر اونٹ ذبح کیا اور تمام دوستوں کو دعوت دی۔

ان احادیث و آثار کو بار بار پڑھئے، آپ اس کے سوا اور کسی نتیجہ پر نہ پہنچیں گے کہ اس سورہ کا موضوع، خلافت کبریٰ

① ترمذی ج ۲، ص ۱۱۱

اور مسلمانوں کو ایسی تعلیم دینا ہے جو انہیں تمام مہذب ممالک پر حکمران بنادے، چنانچہ دنیا ایک مرتبہ اس کا تجربہ کر چکی ہے، اب مستقبل کو دیکھنا باقی ہے۔ وما ذلک علی اللہ العزیز ۔

روئے سخن

قرآن حکیم کا درس و فکر ایک اور عجیب و غریب اصل و اساس کی جانب ہماری راہ نمائی کرتا ہے۔ دنیا کے اندر صدہا اقوام و امم ہیں۔ ان کے مذاہب و ادیان ہیں، سوم و عوائد ہیں، عقائد و اخلاق ہیں۔ قرآن حکیم اس لئے آیا کہ تمام اختلافات کے لئے حکم اور ظنون و ادہام کے لئے کتاب مبین ہو، اس لئے ضروری تھا کہ اس کا روئے سخن سب کی جانب ہو، ہر ایک کی غلط کاریاں بیان کر کے اس کو صحیح راہ عمل دکھا دے۔

چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا، سورہ اعراف تک اس نے مختلف ادیان و مذاہب کو مخاطب کیا، قرآن حکیم کے نزول کے وقت یہودیوں کی سب سے بڑی جماعت تھی جس کو مذہبی ہونے کا دعویٰ تھا، یہ لوگ شریعت موسوی کے حامل اور اسی کے مبلغ و داعی تھے، لیکن مدت ہائے دراز سے اپنے فرض جلیل سے بعد و ہجر اختیار کر چکے تھے۔ اس لئے سب سے پہلے بنی اسرائیل کو اس سورہ میں مخاطب کیا گیا، ان کی انفرادی و اجتماعی خرابیاں ظاہر کیں، ان کی حاکمانہ زندگی کے امراض و مفسد بیان کئے۔ تبلیغ و دعوت کے دوران میں انہوں نے جن بد کاریوں کا ارتکاب کیا تھا ان پر تفصیلی روشنی ڈالی اور آخر میں بتا دیا کہ اس وقت یہ لوگ مسند تبلیغ سے علیحدہ کر دیے جاتے ہیں، ان کی جگہ پر مسلمان کام کریں گے۔

دنیا کی قوموں اور ملتوں میں جب کبھی انقلابات ہوئے ہیں وہ ہمیشہ نتیجہ ہوتے ہیں ارباب علم و فضل کی سعی و کوشش اور دعوت و تبلیغ کا، ان کے وعظ و تذکیر سے زندگی پیدا ہوتی ہے۔ اور حریت و استقلال کے جذبات میں جوش و ولولہ پیدا ہوتا ہے، اگر یہ لوگ قتل و بیکاری اختیار کر لیں تو تمام قوم پر عالم ممت طاری ہو جاتا ہے، یہ لوگ قوم کے لئے بمنزلہ قلب کے ہوتے ہیں، ان کی صحت و تندرستی پر حیات ملی کا دار و مدار ہے اور ان کے بیمار ہونے سے تمام قوم امراض کا شکار ہو جاتی ہے۔

سورہ بقرہ میں یہودی علماء کی خرابیاں ذکر کیں تاکہ امت مسلمہ کے اہل علم ان سے بصیرت اندوز ہوں اور اپنے دامن کو ان آلودگیوں سے بچانے کی کوشش کریں۔

مضامین کی فہرست

دنیا میں دو ہی قسم کے آدمی نظر آتے ہیں۔

(الف) .... عوام الناس، جن کی نظر نتائج و ثمرات، اور ظواہر اعمال پر ہوتی ہے، وہ درخت کو اس کے پھل کی وجہ سے شناخت کرتے ہیں، ان لوگوں میں تنبیہ و اعتبار پیدا کرنے کے لئے سورہ بقرہ کے ابتدا سے لے کر دوسرے

پارہ کے دوسرے رکوع تک مخصوص کر دیا۔

(ب).... ارباب علم و فضل جو حقائق و معارف کے شیفہ، اسرار و حکم کے دلدادہ اور بصادغوا مض کے جویاں ہیں، ان کے لئے سورہ کے تمام بقیہ اجزا ہیں وہ ان کی تحلیل و تفرید کریں، ارباب سیاست، اس کے درس و فکر میں مصروف ہوں، جو جماعتیں، قوانین و ضوابط کی تنظیم و تشکیل کی ذمہ دار ہیں، اس کو آدیزہ گوش بنائیں اور جن کی سعی و کوشش صرف علم کے کسب و حصول کے لئے وقف ہے، اس کی طرف اپنی توجہ مبذول کریں۔

سورہ بقرۃ کو حسب ذیل ابواب و فصول میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

پہلا باب وحی والہام کی ضرورت از ابتداء سورہ تا آیت۔ ۷

پہلے دور کو ع میں بتایا کہ ہر جدید تعلیم و تحریک کے وقت تین قسم کے لوگوں کا پیدا ہونا ضروری ہے۔

(۱).... ارباب ایمان و صلاح جو اس تعلیم حق کے آگے اپنی گردنیں خم کر دیتے ہیں۔

(۲).... دجالہ کفر و شیطنیت، جن کا مقصد وحید یہی ہوتا ہے کہ ہر اصلاح کی مخالفت ہو، اور دنیا کا نظام ہمیشہ درہم برہم رہے۔

(۳).... منافقین، دونوں جماعتوں سے تعلق رکھتے ہیں، کفار و مشرکین سے یہ لوگ زیادہ خطرناک اور نقصان دہ ہوتے ہیں۔

پھر تذکیر بآلاء اللہ کے بعد ان کو قانون الہی کی جانب توجہ دلائی اور بتایا کہ وحی والہام پر صرف وہی لوگ نکتہ چینی کرتے ہیں، جن میں حسب ذیل امراض ہوں۔

(الف).... ایمان کمزور ہو۔

(ب).... طبیعت ضعیف ہو۔

(ج).... عقل کوتاہ ہو۔

ان کو بتایا کہ مذہب انسان کی فطرت میں داخل ہے اور اس لئے وہ الہام ربانی کے آگے سر جھکانے کو مجبور ہے، چنانچہ آدم علیہ السلام پر لاشان مضطرب پھرتے رہے تا آنکہ وحی الہی نے ان پر چند کلمات الہام کئے جو ان کے اطمینان قلب اور تلج صدر کا باعث بنے۔

پس قصہ آدم سے ثابت ہو گیا کہ دنیا میں انسان کو سکون و اطمینان صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو وحی الہی کا پابند بنائے، اس کے بغیر نہ تو اس کی زندگی کسی کام آئے گی اور نہ وہ حیوانات کے درجہ سے ترقی کر سکے گا۔

دوسرا باب قرآن حکیم کی ضرورت آیت ۸۳ سے ۱۴۶ تک،  
پانچویں رکوع میں یہودیوں کی اجمالی خبریاں ذکر کی گئیں اور وہ حسب ذیل ہیں۔

(الف) .... علمی۔

(ب) .... عملی۔

(ج) .... انتظامی۔

ربح اول سے ان امراض و مفاسد پر نہایت ہی شرح و تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی اور دو باتوں کا فیصلہ کیا گیا۔  
(۱) .... آیت ۶۹ تک یہ بتا دیا گیا کہ جس وقت تم خلافت ارضی اور فضلیت علیٰ العلمین سے سرفراز تھے، تم نے ایسی بد کرداریوں اور بد عملیوں کا ارتکاب کیا جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ تم سے حکومت چھین لی گئی اور تم پر ذلت و مسکنت طاری کی گئی۔ حیات ملی کے لئے تین قسم کے ارباب فضل و کمال کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن تمہاری قوم ان سے یکسر خالی تھی، پس آئندہ ہمیشہ کے لئے تم جہانگیری و جہاں داری سے محروم کر دیے گئے۔

(۲) .... آیت ۸۷ تک اس حقیقت کو بے حجاب کیا کہ تم مسلمانوں کے ساتھ مل کر بھی دعوت و ارشاد کا فرض اہم و اقدم انجام نہیں دے سکتے، اسی ذیل میں ان کے عالموں، دو لتمدنوں اور عام لوگوں کی باطل پرستیوں اور غلط عقیدوں کو بیان کیا۔

ان دو صورتوں کے علاوہ بنی اسرائیل محکومانہ زندگی ہی بسر کر سکتے تھے، مگر یہ بھی صاف کر دیا گیا کہ وہ شریف رعایا بننے کی بھی قابلیت نہیں رکھتی۔ چنانچہ آیت ۹۸ تک اس پر بحث کی اور ساتھ ہی فرزند ان اسلام کو یہ تعلیم دی گئی کہ اپنے تمام تعلقات و روابط سابقہ ان سے منقطع کر لیں۔ جب یہودیوں نے دیکھا کہ بحث کا دائرہ بالکل تنگ ہو گیا تو نسخ ادیان و ملل کی طرف توجہ کی اور اس کو اپنے شبہات کا نشانہ بنایا۔ لیکن فوراً ہی مسلمانوں کو بتا دیا گیا کہ ان شبہات کے پیش کرنے سے ان کی اصلی غرض کیا ہے۔ آیت ۱۱۳ تک یہی بحث تھی، اب انہوں نے نسخ قبلہ کو لیا اور اس پر اعتراضات کی بوچھا شروع کر دی۔ قرآن نے اس کے دو جواب دیئے۔

(الف) الزامی۔

(ب) اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام، بنائے کعبہ اور دعائے خلیل کا تذکرہ کیا اور انہیں بتا دیا کہ اب دنیا کی ہدایت و راہ نمائی صرف قرآن کے لئے مخصوص ہے اور فرزند ان اسلام ہی مسند تبلیغ و ارشاد کے مالک ہونگے۔ یہ بحث آیت ۱۱۵ تک ختم ہو جاتی ہے۔

تیسرا باب تہذیب اخلاق، یہاں سے قرآن کی اصلی تعلیم شروع ہوتی ہے اور سب سے پہلے ان اخلاق کو پیش کیا جاتا ہے جو انفرادی حیثیت سے ہر انسان میں پیدا ہونا ضروری ہیں، جو اصل و اساس حیات ملی ہیں، اور جن کی غرض و غایت یہ



ہے کہ قوم میں صحیح کری کٹر پیدا ہو، ساتھ ہی اس تعلیم گاہ کی جانب اشارہ کیا جس میں داخل ہونے کے بعد ان اخلاق کی تہمتہ و تولید ہو سکتی ہے۔ آیت ۶۲ تک۔

چوتھا باب، تدبیر منزل، رزق کمانے کے ذرائع و وسائل پر بحث کی۔ صرف کرنے کا قانون دیا، دیوانی اور فوجداری ضوابط کی تدوین کی۔ اندیشہ تھا کہ ان امور میں مصروف رہنے کی وجہ سے لوگوں کی روحانیت اور تعلق باللہ میں ضعف و کمزوری نہ پیدا ہو جائے، اسلئے روزے فرض کر دیئے اور مذہبی تعلیم کی نشر و اشاعت کی جانب توجہ دلائی۔ آیت ۸۷ تک۔

پانچواں باب، معاملات، اس میں دو باتوں کا فیصلہ کیا:۔  
(الف) ناجائز طریق سے کسی کا مال کھانا قانونی جرم ہے اس سے پرہیز کرو اور ان امور کا فیصلہ خود ان کا کریکٹر کر دے گا، کیونکہ پہلے اس کی تعلیم دی جا چکی ہے، عدالت کو شاذ و نادر ہی مداخلت کی نوبت آئے گی۔  
(ب) مسلمان اپنے تمام حسابات قمری مہینوں کے مطابق رکھیں، کیونکہ کائنات خلعت حضرت ابراہیم نے قمری مہینوں میں ایام حج معین کئے ہیں۔ (آیت ۱۸۸ تا ۱۸۹)

چھٹا باب، سیاست مدن، اس میں تین فضلیں ہیں۔  
فصل اوّل جہانگیری، اس میں حسب ذیل مسائل بیان کئے گئے ہیں۔  
(۱).... کوئی وقت، کوئی شخص اور کوئی جگہ جہاد فی سبیل اللہ سے مستثنیٰ نہیں قرار دی جاسکتی۔  
(۲).... ہر مسلمان کا فرض ہے کہ جس قدر روپیہ اس کی جائز اور ضروری حاجات زندگی سے بچ جائے وہ تمام و کمال جہاد فی سبیل اللہ کی خاطر خلافت اسلامی کی نذر کر دے۔

(۳).... حج ضروری قرار دیا گیا تاکہ ان تمام اعمال مہمہ کی مشق ہو، جو جہاد کے لئے لازم اللوازم ہیں۔  
(۴).... وحدت مقصد ضروری ہے۔

(۵).... ہر شریف اور خاندانی انسان کے پاس اسلام کی آواز حق و حریت پہنچانا فرائض دین میں سے ہے۔  
(۶).... جہاد فی سبیل اللہ کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔

(۷).... اس راہ ایثار و فدویت میں تکالیف و شدائد سے کوئی چارہ کار نہیں۔  
(۸).... جہاد کب تک رہے گا اور اسے کس قدر روپیہ کی ضرورت ہے۔

(۹).... ناجائز ذرائع سے کمایا ہوا روپیہ کبھی اس احب الاعمال الی اللہ کے لئے قبول نہیں کیا جاسکتا۔  
(ق).... جب لڑائیوں کی کثرت ہوگی، تو یتیمیٰ بھی ضرور بہت زیادہ تعداد میں نظر آئیں گے، ان کی تعلیم و تربیت اور

حفظ و صیانت کے لئے قانون بنایا گیا۔ آیت ۲۲۰ تک۔

فصل ثانی، جہانداری، اس میں ان مسائل کا تذکرہ ہے۔

(۱).... کسی غیر مسلم کو حاکم نہ بنایا جائے۔

(۲).... جس قدر قومیں مسلمانوں کے ماتحت رہیں گی ان کو کامل اندرونی آزادی دی جائے گی۔

(۳).... جدید قانون کی وضع و ترتیب کے وقت اس امر کا خیال رہے کہ وہ نظام صالح کا حامی، برو تقویٰ کا محافظ و نگران کار اور نوع انسانی کے لئے زندگی بخش ہو۔

(۴).... صدر جمہوریہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے فرائض ادا کرے، اگر اس کے لئے تیار نہ ہو تو اس کو چار ماہ کی مہلت دی جائے، اگر اس نے اپنی اصلاح کر لی تو بہتر، ورنہ معزول کر دیا جائے۔

(۵).... عزل کے وقت اس کی تمام سابقہ واجب الادا قوم ادا کر دی جائیں۔

(۶).... معزول ہونے پر وہ ان اصلاحات کو خراب و برباد کرنے کی کوشش میں نہ لگ جائے جن کو اس نے اپنے زمانہ حکومت میں نافذ کیا تھا۔

(۷).... اگر معزول شدہ حاکم دوسری مرتبہ رعایا کے حقوق کی نگرانی کا عہد و میثاق کرے تو اسے انتخاب میں آنے کا موقعہ دیا جائے۔

(۸).... اگر وہ تین مرتبہ معزول ہو تو پھر اسے امیدوار کے طور پر کھڑے ہوتے ہی روک دیا جائے۔

(۹).... حاکم کی رائے کو کچھ ترجیح ضرور حاصل ہوگی۔

(۱۰).... معزول شدہ حاکم دوسروں کے انتخاب میں رکاوٹیں نہ پیدا کرے۔

(۱۱).... حکومت کے لئے خود اپنے آپ کو پیش نہ کرے، بلکہ قوم خود ان لوگوں کی تلاش کرے۔ اور جن میں قابلیت و استعداد ہو ان کے ہاتھ میں عنان سلطنت دینے کی کوشش کرنی چاہئے۔

(۱۲).... حکومت کرنے میں ذاتی اور خاندانی مصلحتوں کی پروا نہ کرے، بلکہ عامہ ناس کا نفع و سود پیش نظر ہو۔

آیت ۲۴۲ تک۔

فصل ثالث، عملی سیاست کا نمونہ، اس میں ان مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۱).... یہ ضروری نہیں کہ جو شخص میدان جنگ میں جائے گا وہ مر ہی کرے گا۔

(۲).... جنگ کے لئے امیر کا انتخاب ضروری ہے۔

(۳).... شرائط انتخاب بیان کئے۔

(۴).... رائے عامہ کا احترام ضروری ہے۔

(۵).... کام شروع کرنے سے پہلے فوج کا امتحان ہو۔

(۶).... صرف ان لوگوں کو میدان جنگ میں بھیجا جائے جن کے اندر سب سے زیادہ اعتماد علی اللہ اور قربانی کا جذبہ

صادقہ ہو۔ آیت ۲۵۲ تک۔

ساتواں باب، خلافت کبریٰ، اس میں حسب ذیل امور کا تذکرہ ہے۔

(۱).... تمام مہذب اور شائستہ ممالک پر مسلمانوں کی حکومت کس طرح قائم ہو سکتی ہے؟

(۲).... خلیفۃ المسلمین کے فرائض۔

(۳).... مال دار اپنی تمام دولت و ثروت، خلافت اسلامی کی نذر کر دے۔

(۴).... مال قبول کرنے کے لئے چند شرائط کو بیان کیا، جب تک ان قیود کے ماتحت روپیہ نہ دیا جائے گا خلافت کبھی

اس کو لینے کے لئے تیار نہ ہوگی

(۵).... مالداروں کی طرح ارباب علم و فضل بھی ان شرائط کو پیش نظر رکھ کر ملک و ملت کے لئے اپنے تمام علوم

و معارف وقف کر دیں۔

(۶).... جب مال کو دور کرنے کے لئے سود کی حرمت بیان کی۔

(۷).... قرض کا قانون مدون کیا۔

(۸).... ارکان خلافت کو بتادیا کہ ان کے تعلقات و روابط اپنے خالق کے ساتھ کس قسم کے ہوں اور انہیں تدوین

قانون کے وقت کس امر کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے، آیت ۲۸۶ تک۔

مضامین کی فہرست آپ کے سامنے ہے، اس اجمال نے جہاں اور صدہا امور پر روشنی ڈالی ہے، وہاں ان دو حقیقتوں کو بھی واضح کر دیا ہے کہ۔

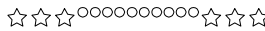
(الف).... اس سورت کی تمام آیات باہم مربوط اور مسلسل ہیں اور ایک نظم و اسلوب حقیقی کے ساتھ تمام کڑیاں

باہم دگر پوست کر دی گئی ہیں۔

(ب).... اس میں خلافت کبریٰ کے نظم و ادارہ کی تعلیم دی ہے اور اس سورۃ کا مقصد یہ ہے کہ فرزند ان اسلام

کمزوری کی جگہ طاقت کے لئے، بے کسی کی جگہ فرماں روائی کے لئے اور رونے کی جگہ خوشیوں کے لئے تمام عالم

میں نمایاں اور ممتاز ہوں۔



## باب ۱ وحی الہی کی ضرورت

اَلَمْ ۝

### حروف مقطعات

قرآن حکیم میں ۲۹ سورتیں ہیں، جن کی ابتدا حروف مقطعات سے کی گئی ہے، مفسرین کرام ان حروف کے متعلق مختلف خیالات رکھتے ہیں۔ کچھ لوگوں کی یہ رائے ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بہت سے اسرار و رموز ہیں جن کی اطلاع کسی انسان کو نہیں دی گئی، یہ حروف بھی ان میں شامل ہیں، بعض یہ کہتے ہیں کہ ان کے معانی رسول اللہ ﷺ کو معلوم ہیں، کیونکہ یہ اللہ اور اس کے رسول کے اسرار و خفایا ہیں، بعض اس طرف گئے ہیں کہ یہ متشابہات ہیں اور ان میں گفتگو کرنا قرآن کی رو سے جرم ہے، لیکن ایسے بھی ہیں جو ان کے مطالب بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ ابن مسعود اور ابن عباس کا یہی مذہب ہے۔

سب سے پہلے ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دنیا میں قرآن حکیم کا نزول اس لئے ہوا کہ اس کی ضلالت و گمراہی دور ہو اور عمل حق و صالح کی قاہرہ قوت نافذ ہو۔ اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے اس امر کو تسلیم کر لیں کہ قرآن کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جس کے مطالب کوئی فرد بشر نہیں جانتا، تو دوسرے الفاظ میں اس اعتقاد کے یہ معنی ہوں گے کہ قرآن کا ایک جزو ایسا ہے جس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا اور اس لئے بیکار ہے۔ حالانکہ قرآن اپنی نسبت اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ وہ ہدی للناس ہے، برہان ہے، بصائر ہے، نور ہے، بصیرت ہے اور سب سے آخریہ کہ وہ العلم ہے اور دنیا کے پاس اس کے سوا جو کچھ ہے ظن ہے، تخمین ہے، انکل کی باتیں اور قیاسات ہیں۔ اس زمین کی پشت پر جس قدر ادعاء علم کے اعلانات ہیں ظن اور شک سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ پس یہ ایک لمحہ کے لئے بھی تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ حروف مقطعات کا علم کسی کو نہیں دیا گیا۔

البتہ جن لوگوں نے ان کو متشابہات میں داخل کیا اور اس لئے ان کے درس و فکر سے الگ ہو گئے، ان سے ہمیں کچھ عرض کرنا ہے۔ انہوں نے جس آیت سے استدلال کیا وہ حسب ذیل ہے۔

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ ۖ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ ۗ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ ۚ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ ⑤ (ال عمران ۵)

”وہی ہے جس نے تم پر یہ کتاب اتاری، جس میں سے بعض آیتیں محکم ہیں کہ وہی اصل کتاب ہیں اور دوسری متشابہ، تو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ تو قرآن کی متشابہ آیتوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں تاکہ فساد پیدا کریں اور ان کے اصل مطلب کی ٹوہ لگائیں۔ حالانکہ اللہ کے سوا ان کا اصلی مطلب کسی کو معلوم نہیں اور جو لوگ علم میں بڑی پانگاہ رکھتے ہیں وہ تو اتنا ہی کہہ کر رہ جاتے ہیں کہ ان پر ہمارا ایمان ہے۔ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے اور وہی سمجھتے ہیں جن کو عقل ہے۔“

اس آیت میں دو لفظ بیان کئے گئے ہیں۔

محکم، متشابہ

یہی دونوں لفظ محل بحث و نظر ہیں، اس لئے ہم فی الحال ان کو ترک کر کے ایک اور چیز پیش کرنا چاہتے ہیں۔ دنیا میں جس قدر علوم و معارف موجود ہیں، اگر ان تمام کی تحلیل و تفرید کی جائے تو دو چیزیں ممتاز نظر آئیں گی جن پر تمام مباحث علمیہ کا دار و مدار ہو گا اور جو حقیقی اور فطری تقسیم ہو گی ہر علم اور کتاب کی، دو جلیل القدر اصل و اساس حسب ذیل ہیں۔

(الف) بدیہی جس کا فہم و ادراک ہر شخص کے لئے آسان و سہل تر ہو، جس کے لئے دلیل و حجت کی ضرورت نہ ہو۔  
(ب) نظری، پہلے بدیہی مقدمات کو ترتیب دینے کی ضرورت پڑتی ہے، تب کہیں جا کر اس کی حقیقت مستورہ بے نقاب ہوتی ہے۔

تعلیم دینے کا فطری طریق یہی ہے کہ ابتداء میں بدیہیات کو پیش کیا جائے، پھر جوں جوں استعداد و قابلیت بڑھتی جائے، نظریات کی جانب توجہ ہو۔ اس قاعدہ کی پابندی سے صحیح نشو و نما اور تربیت ہو سکتی ہے، لیکن جو لوگ کوتاہ بین اور کج فہم ہوتے ہیں وہ ہمیشہ نظریات کو پہلے لیتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی تعلیم بیکار رہ جاتی ہے اور کوئی ثمرہ مرتب نہیں ہوتا۔

یہ دو اصول آپ کو ہر جگہ جاری و ساری نظر آئیں گے، فلسفہ، منطق، ہندسہ، نجوم، مابعد الطبیعیات، علم النفس وغیرہ، کوئی علم اور کتاب نہیں جس نے ان اصولوں کی پابندی نہ کی ہو۔

یہی وہ اصول ہیں جن کی جانب، آل عمران کی اس آیت نے ہماری راہ نمائی کی ہے، وہ بتاتی ہے کہ قرآن کی تمام آیات دو حصوں میں تقسیم ہو سکتی ہیں:

(الف) .... محکمات، جن کو آپ بدیہیات سے تعبیر کرتے ہیں اور یہی اصل و اساس ہیں، انہیں پر تمام تعلیمات الہیہ کا دار و مدار ہے۔

(ب) .... متشابہات، جن کے لئے دوسرا لفظ نظریات کا ہے۔

قرآن میں بحث و نظر کا صحیح طریق تو یہی تھا کہ ابتدا میں محکمات کو لیتے، جب ان سے فارغ ہو جاتے پھر متشابہات کی جانب توجہ کرتے، لیکن جن لوگوں کے دلوں میں کچی ہو وہ اس قاعدہ سے گریز کرتے ہیں، اور سب سے پہلے متشابہات میں گفتگو شروع کر دیتے ہیں اور ایسا کرنے میں چند مقاصد ان کے پیش نظر ہوتے ہیں۔

(۱).... لوگوں کو پریشان کر کے تشویش و اضطراب میں ڈال دیں، جن عقائد و اخلاق کو وہ اب تک درست تسلیم کرتے تھے انہیں غلط معلوم ہونے لگیں۔ ایک آیت کا مفہوم دوسری کے خلاف کر دیں۔ اصول سے الگ ہو کر اپنی رائے سے قرآن کی آیات کا مطلب جداگانہ قرار دیں۔ شک پیدا کر کے قوائے علیہ کو فنا کریں۔

(۲).... چونکہ ان کی عملی قوت بالکل بیکار ہوتی ہے، اس لئے چاہتے ہیں کہ احکام و اوامر پر عمل کرنے سے قبل ہی ان کے نتائج و ثمرات سے آگاہی حاصل کریں۔ اپنی خواہش اور باطل عقیدہ کے مطابق معنی کریں اور محکمات کو چھوڑ کر محض متشابہات ہی پر حصر کر دیں۔

ان اوامر و نواہی کے نتائج و عواقب نہ صرف اللہ ہی جانتا ہے بلکہ راسخین فی العلم بھی ان سے محروم نہیں رہتے۔ یہ درجہ علیا ان کو صرف اس لئے نصیب ہوا کہ پہلے انہوں نے محکمات و بدیہیات کو لیا، جب ان میں رسوخ و کمال پیدا کر لیا تو متشابہات و نظریات کی جانب جھک گئے اور یہ راہ حق صرف وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جو ارباب بصیرت ہوں اور عقل و خرد سے بہرہ وافر رکھتے ہوں۔

اس قدر گفتگو سے یہ واضح ہو گیا کہ جن لوگوں کو رسوخ فی العلم حاصل ہو وہ متشابہات اور حروف مقطعات کے مطالب سے آگاہ ہوتے ہیں، اب صرف اتنا سوال باقی رہ جاتا ہے کہ وہ ارباب فہم و بصیرت کون ہیں جو اس گروہ میں شامل ہونگے۔ اس کا جواب بھی خود قرآن ہی سے دریافت کرنا چاہئے۔

قرآن حکیم نے دین الہی کا دوسرا نام العلم رکھا ہے:

وَلَقَدْ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ \* (البقرة ۱۱۳)

اور اگر تو نے ان کی خواہشوں کی پیروی کی، بعد اس کے کہ تیرے پاس علم یعنی دین الہی آچکا ہے۔

ہر جگہ گمراہ قوموں کے بغی و ضلالت اور عدوان و سرکشی پر ملامت کرتے ہوئے کہا: فَمَا اخْتَلَفُوا إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ \* بَغْيًا بَيْنَهُمْ \* (۱۷: ۳۵) حالمین قرآن کی نسبت کہا: فی صدور الذین اتوا العلم (۲۹: ۳۸) وہ ان کے سینوں میں ہے جن کو علم دیا گیا، نیز کہا کہ یہ برہان ہے اور نور و ہدیٰ ہے اور ہر جگہ کفر کو کہا کہ وہ ظن ہے، شک ہے، تخمین ہے اور انکل کی باتیں اور قیاسات ہیں: وَمَا لَهُمْ بِذَلِكَ مِنْ عِلْمٍ ؕ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ﴿۲۳﴾ پھر دین الہی کے ماننے اور اطاعت کرنے کو ایمان کہا اور ایمان والوں کو مومن۔ ایمان، امن سے ہے اور امن کے معنی طمانینۃ النفس اور زوال خوف و شک کے ہیں۔ ان تمام تصریحات سے واضح ہو گیا کہ دنیا میں علم و یقین صرف ایک ہے اور وہ وحی الہی ہے اور اس کے

سوا اور جس قدر ادعائی علم کے اعلانات ہیں، ظن اور شک سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ نیز یہ کہ ایمان کے معنی یقین حاصل کرنے کے ہیں اور مومن وہ ہے جس کے پاس شک کی جگہ یقین ہو، یہی وجہ ہے کہ مومن اور غیر مومن کو الذین یعلمون اور الذین لایعلمون اور الاعی اور البصیر سے تشبیہ دی، یعنی صاحبان علم اور پینا اور ارباب جہل اور اندھے۔ اس بنا پر علم اضافی و محدود تو دنیا کے پاس ہے مگر علی الاطلاق العلم قرآن کے سوا اور کوئی نہیں، اور قرآن جس کے پاس ہے وہی دنیا میں سب سے زیادہ عالم اور سب سے بڑا جاننے والا ہے۔ پس وہ راسخ فی العلم ہے اور اسی کو حق حاصل ہے کہ حروف مقطعات اور مشابہات میں گفتگو کرے۔

ہمیں یہ یقیناً معلوم ہے کہ عرب میں مقطعات حروف کا استعمال عام طور پر ہوتا تھا۔ عرب کے لوگ اس سے اجنبی نہ تھے، اگر یہ کوئی جدت طرازی ہوتی تو ضرور تھا کہ سب سے پہلے وہی اس کی مخالفت کرتے، کیونکہ ان سے بڑھ کر قرآن کا دشمن اور کون ہو سکتا تھا؟ تاریخ میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں پیش کیا جاسکتا جس سے اس امر کی تائید ہو سکے کہ کسی عرب نے اعتراض کیا ہو۔

عرب میں حروف ہجا کو اصول کلمات تسلیم کیا جاتا تھا اور ان میں سے ہر ایک کے معنی معلوم تھے۔ بلکہ بعض اوقات اذکیاء ملک کا انہیں میں امتحان ہوتا تھا، اہل عرب کا دعویٰ ہے کہ جس لفظ میں نون و فاجع ہوں، اس کے معنی ہمیشہ خروج کے ہوں گے۔ مثلاً نفر، نفث، نفخ، نفق، نفذ، وفقد وغیرہ، اگر فاولام جمع ہوں تو اسکے معنی شکافتن کے آئیں گے۔ مثلاً فلق، فلج، فلذ، فلو وغیرہ۔

اسی طرح اگر ہم ترقی کرتے چلے جائیں تو صرف ایک حرف کے معانی و مطالب بھی معلوم کئے جاسکتے ہیں۔ اگر ان قواعد کو ملحوظ رکھا جائے جن سے حروف مقطعات کے مطالب معلوم ہو سکتے ہیں، تو کہا جاسکتا ہے کہ ”الم“ اس صورت کا نام ہے۔ اور اس صورت میں جس قدر مضامین شرح و بسط کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں ”الم“ میں ان کی جانب اجمالی اشارہ ہے۔

شیخ صدر الدین قونوی نے حروف مقطعات کے متعلق دورائے تحریر کئے ہیں جن میں ان کے اجمالی معانی و مطالب پر روشنی ڈالی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے الفوز الکبیر میں ایسے اصول و ضوابط بیان کئے ہیں جن پر کاربند ہو کر ارباب فضل و کمال مقطعات کے معانی معلوم کر سکتے ہیں: ومن شاء التفصیل فلیدرجہ ثمہ۔

موجودہ کتاب

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۤ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۱

اس کتاب میں کچھ شک نہیں، ڈروالوں کو راہ بتاتی ہے۔

اس سورۃ میں بنی اسرائیل سے خطاب ہے۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ یہ وہی کتاب ہے جس کے نازل کرنے کا وعدہ موسیٰ

سے کیا گیا تھا اور اس میں ذرا شک و اشتباہ کی گنجائش نہیں، اس کی صداقت حسب ذیل آیت سے ہوتی ہے۔  
 ”میں ان کے لئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا۔ (الاستثنائی، ۸۱: ۸۱)

یہ دعویٰ تھا اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ ہدیٰ للمتقین ہے۔ قرآن حکیم نے اپنی نسبت دوسری جگہ کہا وہ: ہدیٰ للناس ہے، لیکن دراصل دونوں میں کوئی اختلاف نہیں جہاں اس نے کہا وہ: ہدیٰ للناس ہے، تو اس سے یہ مراد ہے کہ اس میں متقی اور غیر متقی دونوں شامل ہیں۔ اس جگہ صرف: ہدیٰ للمتقین کہا، اس نے غیر متقی کو اس درجہ حقیر و ذلیل خیال کیا کہ اس کا ذکر ہی مناسب نہ سمجھا۔

تقویٰ کے معنی حسب ذیل بیان کئے گئے ہیں۔

جعل النفس فی وقایة مایخاف، ہر اس چیز سے بچنے کی کوشش کرنا جو اس کے لئے ضرور نقصان کا باعث ہو۔  
 حفظ النفس مایوشم، گناہ کی جانب دعوت دینے والی چیزوں سے پرہیز کرنا۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے ایک شخص نے پوچھا تقویٰ کی کیا تعریف ہے؟ انہوں نے کہا، جب تم ایسے راستے سے گزرو جس میں چاروں طرف خاردار جھاڑیاں ہوں تو کیا کرو گے؟ سائل نے جواب دیا کہ اس وقت میری کوشش یہ ہوگی کہ میں ہر ممکن طریق سے اپنے دامن کو کانٹوں میں الجھنے سے بچاؤں اور صحت و سلامتی کے ساتھ منزل مقصود تک پہنچ جاؤں۔ فرمایا یہی تقویٰ ہے۔

ان کا مطلب یہ تھا کہ متقی وہ شخص ہے جو ہر اس چیز سے پرہیز کرے جو اس کے مقصد حیات میں رکاوٹ پیدا کرے، ہر تکلیف و مصیبت پر غالب آئے اور راہ آزادی کی تمام الجھنوں اور دلربائیوں سے دامن کو پاک رکھتا ہو منزل مقصود تک پہنچ جائے۔ دوسرے الفاظ میں وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ صرف اسی کو متقی کہا جاسکتا ہے جو اپنے مقصد حیات پر مر مٹے۔

بہر حال ان تمام تصریحات نے بتادیا کہ اس کتاب میں ایسی ہدایتیں اور بصیرتیں موجود ہیں جن پر عمل کرنے سے متقی تیار ہوتے ہیں اور کوئی شخص متقی نہیں بن سکتا، جب تک وہ قرآن حکیم کو اپنے ہاتھ میں نہ لے۔

فارسی میں کہتے ہیں ”ایں دایہ شیردہ ایں جوان است“ ظاہر ہے کہ جوانی کے عالم میں دودھ پلانے کی ضرورت نہ تھی، بلکہ عہد طفولیت میں دودھ دیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قوی و طاقتور بن گیا۔ چونکہ اس کی جوانی اور توانائی شمرہ ہے اس دودھ کا اس لئے کہا گیا کہ: شیدہ جوان است۔ ٹھیک اسی طرح قرآن نے کہا کہ: ذلک الكتاب ہدیٰ للمتقین اس کتاب کی ہدایت سے متقین تیار ہوتے ہیں، قرآن کا ایک حصہ مکہ میں نازل ہو چکا ہے، اس پر عمل کر کے بہت سے لوگ ارباب صلاح و تقویٰ کے پاک و مز کی گروہ میں داخل ہو چکے ہیں، اس لئے یہ کہنا بالکل درست ہے کہ: ذلک الكتاب ہدیٰ للمتقین۔

درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اگر یہ معلوم کرنا چاہو کہ فلاں شخص طبیب اور معالج ہے تو دیکھو اس کے مریضوں کی کیا کیفیت ہے اور اس کے بیمار کس قدر شفا یاب ہوتے ہیں۔ اسی اصول پر مذہب اور صحائف و اسفار آسمانی کی



حقیقت معلوم کی جاسکتی ہے۔ اگر ایک کتاب کی تعلیم بہترین انسان بنا دیتی ہے تو یقین کیجئے کہ وہ منزل من اللہ ہے ورنہ تحریف و تبدل نے اس کے اثر کو زائل کر دیا ہے۔

یہودیوں کے پاس موسیٰ کی کتاب ہے جس کی نسبت قرآن بھی ہدی و نور کے الفاظ استعمال کرتا ہے، وہ لوگ تورات کو کتاب الہی مانتے ہیں، وحی والہام کے سلسلہ کو تسلیم کرتے ہیں، جن اصولوں پر وہ اپنی کتاب کو وحی الہی ثابت کرتے ہیں وہی قرآن کے متعلق استعمال کر کے دیکھ لیں اور پھر بتائیں کہ اس وقت کس کتاب کو زیادہ حق حاصل ہے کتاب الہی ہونے کا، تورات کو یا قرآن کو۔

تمہارا دعویٰ ہے کہ تورات نے متقین کی ایک جماعت تیار کی، قرآن بھی اپنے ارباب تقویٰ و طہارت کو پیش کرتا ہے، دونوں کا باہمی مقابلہ کرو اور انصاف و حق پرستی کو پیش نظر رکھ کر بتاؤ کہ کونسی تعلیم زیادہ موثر، نتیجہ خیز اور مشرب رکت ہے۔ چنانچہ اگلی دو آیتوں میں ان متقین کو پیش کیا جاتا ہے جو قرآن کی تعلیم سے تیار ہوئے، پھر ان کا مقابلہ ہو گا ان لوگوں سے جو تورات کی تعلیم کا بہترین نمونہ تھے۔

### ارباب تقویٰ

الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ﴿۱۰۹﴾

”جو یقین کرتے ہیں بن دیکھا اور درست کرتے ہیں نماز اور ہمارا دیا کچھ خرچ کرتے ہیں۔“

### ایمان بالغیب

جس چیز کا ہمارے ظاہری اور باطنی حواس اور اک نہیں کر سکتے، وہ غیب ہے۔ ارباب تقویٰ کی اولین خصوصیت یہ بتائی کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات پر وہ ہر اس چیز کو ماننے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں، جس کو انہوں نے کسی طریق پر بھی محسوس نہ کیا ہو، حضرت ابو بکر اور علی رضی اللہ عنہما سے یہ جملہ بار بار نقل کیا جاتا ہے کہ: لو كشف الغطاء ما زدنا يقيناً، اگر درمیانی حجاب اٹھا دیئے جائیں تو ہمارے یقین و اذعان میں کسی قسم کا اضافہ نہ ہو گا۔ رسول کا کہنا اور اپنی آنکھوں سے دیکھنا دونوں برابر ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی صحبت و ہم نشینی اور قرآن حکیم کی تعلیم و تربیت نے ایسے ارباب طہارت پیدا کر دیئے جن کا طغرائے امتیاز یہی تھا کہ وہ بغیر کسی دلیل و حجت کے رسول کے آگے جھک گئے اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام طور سیناء سے توراۃ لے کر آتے ہیں، بنی اسرائیل کو اس پر ایمان لانے کو کہتے ہیں۔ لیکن وہ جواب دیتے ہیں کہ لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّى نَرَى اللَّهَ جَهْرَةً ﴿۵۵:۲﴾ جب تک ہم خدا کو ظاہر میں نہ دیکھ لیں ہم تو کسی طرح تمہارا یقین کرنے والے نہیں۔

## اقامت صلوٰۃ

لغوی طور پر صلوٰۃ کا لفظ دعا اور رحمت کے لئے استعمال ہوتا ہے، لیکن قرآن حکیم میں نے اس کو ایک اصطلاحی معنی کے لئے مخصوص کر لیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے طرز عمل سے اس کی تفسیر بیان کر دی ہے اور اب اس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ نماز کو ادا کریں، فرائض و واجبات، سنن و مستحب کا خیال ہو۔ اوقات کی پابندی ہو اور تعدیل ارکان پیش نظر رہے۔

جس وقت سورۃ ہمز مل نازل ہوئی اور قم الدلیل الاقلیلاً کا حکم ہوا۔ ظاہر ہے کہ اس میں صرف رسول اللہ ہی مخاطب تھے، لیکن صحابہ بھی آپ کے شریک ہوئے۔ تمام شب اللہ کے حضور میں کھڑے رہتے اور ہر وقت یہ خوف دامن گیر رہتا کہ کہیں تھوڑا وقت صرف کرنے پر عتاب نازل نہ ہو۔ یہ اس وقت کی حالت ہے جبکہ پانچ نمازیں فرض نہ ہوئی تھیں۔ جس وقت ان نمازوں کا حکم ہوا تو صحابہ کی یہ کیفیت تھی کہ اپنے اپنے کاروبار میں مصروف ہیں۔ حی علی الصلوٰۃ کے الفاظ کان میں پڑے اور سب کچھ چھوڑ کر فوراً مسجد میں آگئے۔ انہیں کے بارے میں کہا گیا: رَجُلًا ۚ لَا تَلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَإِقَامِ الصَّلَاةِ (۳۷: ۲۳) یہ وہ لوگ ہیں کہ جب اللہ کا نام سنتے ہیں تو اس پر قربان ہونے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ کوئی بڑے سے بڑی چیز بھی ان کو اپنی دلفریبیوں اور محبوبیتوں کا شیفہ نہیں بنا سکتی۔

پس ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ جب وہ نماز پڑھے تو یہ سمجھ لے کہ جس طرح میں اس وقت حی علی الصلوٰۃ کے الفاظ سنتے ہی مسجد میں آگیا ہوں، ایسے ہی جب کبھی اسلام کو میری زندگی کی ضرورت ہو، تو میں فوراً اپنے آپ کو پیش کر دوں اور کوئی چیز بھی میرے لئے رکاوٹ کا باعث نہ بن جائے۔ سوتے وقت ہر مسلمان اپنے ایمان و اسلام کو دیکھے کہ اللہ کے ساتھ میں نے جو عہد باندھا ہے، اس میں کسی قسم کی کمی تو نہیں پیدا ہو گئی اور کیا میں اس کے نام پر اپنے آپ کو قربان کرنے کے لئے تیار ہوں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”ہر شخص خود اپنا محتسب بن جائے اور قبل اسکے دوسرے لوگ اس پر حرف گیری کریں وہ خود ہی عیوب کو دیکھے اور اصلاح کرے“، بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا: ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا (۵۵: ۲) سجدہ کر کے دروازہ میں داخل ہو، وہ اس پر عمل تو کیا کرتے، الناس کے ساتھ تمسخر و استہزاء کیا اور سریں کے بل رینگتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے۔ فشتان بینہما۔

## انفاق فی سبیل اللہ

متقین کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر چیز اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ خواہ روپیہ ہو، ان کے قوائے عملیہ ہوں اور خواہ ان کی جان ہو، وہ سب کچھ حق و حریت کے لئے قربان کر دیتے ہیں، صحابہ کی جانی اور مالی قربانیوں سے تاریخ کے

اور اوراق بھرے ہوئے ہیں اور کسی مزید ثبوت کے محتاج نہیں، لیکن مثال کے طور پر صرف ایک واقعہ کافی ہو گا۔ جانی قربانی کے بارے میں بخاری کی حسب ذیل روایت ملاحظہ ہو۔

قال المقداد يوم رى رسول الله انالا نقول لك كما قالت بنو اسرائيل لموسى فاذهب انت وربك فقاتلا انا ههنا قاعدون، ولكن امض و نحن معك (بخاری کتاب التفسیر)

معرکہ بدر میں مقداد نے کہا یا رسول اللہ ﷺ ہم بنی اسرائیل کی طرح نہیں کہ انہوں نے موسیٰ سے یہ کہہ دیا۔ اذہب انت وربک فقاتلا انا ههنا قاعدون بلکہ آپ تشریف لے چلیں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ مالی قربانی کی کیفیت یہ ہے کہ جنگ کے لئے روپیہ کی ضرورت ہے، ابو بکر جاتے ہیں اور سب کچھ لا کر نذر رسالت کر دیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ دریافت فرماتے ہیں کہ گھر میں بچوں کے لئے کیا رکھا، جواب دیتے ہیں کہ اللہ اور اس کا رسول۔ ان کے مقابلہ میں یہودیوں کی یہ حالت ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام ان سے بیت المقدس پر حملہ کرنے کے لئے کہتے ہیں تو ان کی طرف سے یہ جواب ہوتا ہے: فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ ﴿۲۴﴾ (۵: ۲۴) تم جاؤ اور تمہارا خدا دونوں جا کر لڑو ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ جب کبھی ان سے روپیہ مانگا جاتا ہے تو کہتے: يَدُ اللَّهِ مَغْلُولَةٌ ﴿۵۱﴾ (۵: ۶۳) خدا کا ہاتھ تنگ ہے۔

النصار

یہاں تک مہاجرین کا تذکرہ تھا، جو سر زمین مکہ میں تعلیم قرآن سے تیار ہوئے، اب ان لوگوں کا ذکر آتا ہے جو مدین میں اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے۔

وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۖ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ﴿۵۱﴾

اور جو یقین کرتے ہیں جو کچھ اتر اتر چکے ہیں اور جو کچھ اتر اتر چکے ہیں پہلے اور وہ آخرت کو یقین جانتے ہیں۔

مدینہ منورہ میں یہودیوں کے تین قبائل آباد تھے، بنو نضیر، بنو قریظ بنو قینقاع۔ انصار کے دو قبیلے تھے اوس اور خزرج۔ یہودیوں اور انصاریوں کی باہمی جنگ رہتی، جب کبھی یہودیوں کو ناکامی ہوتی تو وہ کہا کرتے کہ نبی آخر الزماں کے ساتھ مل کر ہم تم کو فنا کر دیں گے، علاوہ ازیں انہوں نے مدینہ اور اس کے اطراف میں اپنی تعلیم گاہیں جاری کر رکھی تھیں، جن کو بیت المدارس کہتے تھے۔ انصار کے لڑکے ان کے مدارس میں تعلیم حاصل کرتے اور ان کے عقائد وغیرہ سے واقف ہوتے، اس لئے جس وقت حضور اقدس ﷺ کا ظہور ہوا یہ لوگ جو درجہ اسلام میں داخل ہونے لگے، ان میں عبد اللہ بن سلام وغیرہ بھی شامل ہیں۔ ان لوگوں کی حسب ذیل خصوصیات اس آیت میں بیان کی گئیں۔

(الف) قرآن حکیم پر ان کا ایمان ہے۔

(ب) اس سے ما قبل کے تمام صحائف و اسفار آسمانی کے قائل ہیں۔

(ج) جزائے اعمال کا بھی انہیں یقین ہے۔

أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٥٠﴾

انہوں نے پائی ہے راہ اپنے رب کی اور وہی مراد کو پہنچے۔

مہاجرین و انصار کے یہی دو گروہ ہیں جو راہ حق پر قائم ہیں اور دنیا میں خلافت کبریٰ سے سرفراز ہوں گے، چنانچہ دنیا اس کا تجربہ کر چکی ہے۔

کفار

ہر جدید تحریک کے وقت تین قسم کے لوگوں کا پیدا ہونا ضروری ہے۔

(الف) اس تحریک کے حامیان کار ہوں۔

(ب) سخت مخالف ہوں۔

(ج) جن کے تعلقات دونوں کے ساتھ ہوں۔

پہلی تین آیتوں میں ارباب صلاح و تقویٰ کا ذکر کیا، اب کفار و مخالفین کا تذکرہ آتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٥١﴾

وہ جو منکر ہوئے برابر ہے ان کو تو ڈراوے یا نہ ڈراوے وہ نہ مانیں گے۔

حَتَّمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ ۖ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوًا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ ﴿٥٢﴾

مہر کر دی اللہ نے ان کے دل پر اور ان کے کان اور ان کی آنکھوں پر ہے پردہ اور ان کو بڑی مار ہے۔

فطرت انسانی کے متعلق مذاہب مختلفہ

اب تک فطرت انسانی کے بارے میں دنیا کے خیالات حسب ذیل رہے ہیں:

(الف) انسان کی فطرت میں بدی ہی بدی ہے۔ ماہر کی تربیت اسکو عارضی طور پر خوش نما کر دیتی ہے۔ وہ خصائص

فطرت کے اعتبار سے بالکل حیوان ہے، لیکن تربیت پذیری کے لحاظ سے اس پر فوقیت رکھتا ہے، درخت کی شاخیں متناسب نہیں ہوتیں، لیکن ان کو کاٹ کر اور چھیل کر درست کر لیتے ہیں۔ (Diogenes) دیوجانس کلبی اس فلسفہ اخلاق کا مشہور پیشوا گذرا ہے۔

(ب) اس کی فطرت بالکل سادہ ہے، اس میں نہ نیکی ہے نہ بدی۔ وہ محض ایک منفعل، اثر پذیر اور نقش انگیز وجود

ہے، وہ ایک دامن ہے جس کے اندر گنجائش کے سوا اور کچھ نہیں۔ اگر اس کو پتھر ملا ہے تو اس کو بھر لیگا، پھول ملے ہیں تو ان کو اٹھا لیگا۔ حکماء یونان میں اس مذہب کا ایک دور رہ چکا ہے، معتزلہ نے بھی زیادہ تر اسی کی پیروی کی، آج یورپ میں بھی حکماء اخلاق کا ایک بڑا گروہ یہی کہتا ہے۔

(ج) نیکی اور بدی دونوں اس کی فطرت میں موجود ہیں، بالقوہ وہ شیطان اور فرشتہ دونوں ہے، دنیا میں آکر جس قسم کے خارجی اثرات ملتے ہیں انہی کے مطابق اس کی کوئی ایک قوت نشوونما پاتی اور بروز کرتی ہے۔ اگر نیکی کے اثرات ملے تو قوت ملکوتی ابھرے گی اور چمکے گی، لیکن اگر برخلاف اس کے بدی کا گرد و غبار چھا جائے گا تو نیکی کی چمک ماند پڑ جائے گی اور بدی کی تاریکی پھیل جائے گی۔ دنیا کے قدیم و جدید دوروں میں اس مذہب نے سب سے زیادہ مقبولیت حاصل کی۔ ارسطو کا یہی مذہب تھا۔ تقریباً تمام حکمائے اسلام اسکے قائل ہیں۔ ابن مسکویہ اسی کا داعی ہے۔ دور جدید کے حکمائے اخلاق نے اسی کے آگے اپنی گردنیں خم کر دیں۔ فخر الدین رازی نے وہدیناۃ النجدین اور فالہمہا فجورہا و تقوہا کی اس مذہب کی بنا پر تفسیر کی ہے۔

### قرآن کا فیصلہ

لیکن قرآن نے ان سب سے الگ اپنی راہ نکالی۔ وہ کہتا ہے کہ انسان خالص و کامل نیکی ہے، اس میں خیر کے سوا اور کچھ نہیں۔ جس قدر بھی برائی ہے، وہ اس کا کسب خارجی ہے۔ نیکی اس کا فطری عمل اور بدی غیر فطری، خارجی اور غیر صناعی ہے۔ اگر وہ نیک ہے تو یہ فطرت ہے اگر بد ہے تو یہ تصنع ہے۔ قرآن اسی کو فطرت صالحہ، دین الہی، دین قیم، دین حنفی، صراط مستقیم، فطرت اللہ، صلبۃ اللہ اور اسلام کہا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ انسان کی اصلی فطرت، اسلام ہے اور کفر ایک صناعی اور غیر فطری عمل۔ اگر ایک انسان مسلم ہے تو اس کو یوں کہو کہ وہ اپنی اصلی فطرت صالحہ پر قائم ہے۔ اسکی فطری روشنی نور دے رہی ہے، لیکن اگر ایک انسان مسلم نہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ فطرت حقیقی کا چراغ بجھ گیا۔ اس کے اندر کا آئینہ زنگ آلود ہو گیا، گرد و غبار کی تعافت نے اس کو سیاہ کر دیا اور وہ فطرت کی صورت حقیقی کی جگہ ایک مسخ شدہ، غیر فطری و مصنوعی جانور بن گیا۔ معصیت سے یہ فطری آئینہ زنگ آلود ہوتا ہے اور کفر زنگ آلودگی کی وہ آخری حالت ہے جبکہ آئینہ بالکل سیاہ ہو گیا اور ایک دھندلی سی چمک بھی اس میں باقی نہ رہی۔ ختم اللہ علی قلوبہم و علی سماعہم و علی ابصارہم غشاوة اور سو اعلیہم ائذرتہم امر لم تنذرہم لایؤمنون وغیرہ تصریحات قرآنیہ میں اسی آخری درجہ ضلالت کی طرف اشارہ ہے اور لہم قلوب لا یفقہون بہا، (الایتۃ) اولئک کالانعام بل ہم اضل اور جعلنا علی قلوبہم اکنۃ ان یفقہوۃ میں اسی فطرت صالحہ کی پامالی اور ایک غیر فطری حالت مسخ و انقلاب کو واضح کر دیا گیا ہے۔

یہی معنی ہیں مسلم کی اس مشہور حدیث کے: کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواۃ یھوداۃ او ینصرانہ او یمجسانہ بچہ جب پیدا ہوتا ہے اپنی اصل اور بے میل فطرت ہی پر پیدا ہوتا ہے اب باہر کی ہوائیں اس کے اندر کی روشنی کو تہہ بالا کرنے لگتی ہیں۔ اگر یہودیت کے اثرات اس پر غالب آگئے تو یہودیت کا جھوٹا اس کے چراغ فطرت کو گل کر دے گا، اگر نصرانیت یا مجوسیت کا طوفان اٹھا تو اسی میں اس کی کشتی فطرت ڈگر گانے لگے گی۔

جب خدا نے ذریت انسان سے پوچھا: الست بربکم، کیا میں ہی تمہارا پروردگار نہیں ہوں، تو اس نے تصدیق کی اور بلیٰ کہا، اب اگر تصدیق ربوبیت کی جگہ وہ انکار کرتا ہے تو یہ اس کی فطرت کی صدا نہیں ہے، ایک غیر فطری صنایع ہے۔ اسی فطرۃ صالحہ کا نام قلب سلیم ہے اذ جاءه رب بقلب سلیم جبکہ ابراہیم اللہ کے حضور میں فطرۃ صالحہ غیر آلودہ کے ساتھ حاضر ہوئے۔ اس کی فطرت کو باہر کا کوئی بڑے سے بڑا جلوہ بھی مرعوب و ہیبت زدہ نہ کر سکا۔

شرایع الہیہ کا نزول اس لئے ہوتا ہے کہ انسان نے صنایع اور خارجی ضلالت کا جو زنگ فطرۃ صالحہ پر چڑھا لیا ہے اسے دور کر دے اور اس کی اصلی روشنی پھر چمک اٹھے۔ اسی لئے ہدایت الہی کو قرآن نے ذکر اور کفر و ضلالت کو نسیان کہا ہے۔ نسیان کی انتہا غفلت ہے۔ اس کو قرآن نے منہائے ضلالت قرار دیا۔ لہم قلوب لا یفقہون بہا (الایتہ) کی یہی تفسیر ہے الذین نسوا اللہ فانساہم انفسہم یعنی اپنی فطرت صالحہ کو بھول گئے کیونکہ فطرۃ صالحہ تو وہ تھی جس نے بلیٰ کہا تھا یعنی خدا کی ربوبیت اور اس کے رشتہ کا اقرار کیا تھا اب اگر وہ اس ہستی کے رشتہ کو بھلا رہے ہیں جس کے آگے اصلی فطرت بلیٰ کہہ چکی ہے تو اس رشتہ کو نہیں بھلا رہے بلکہ اپنی فطرت اصلی کو بھلا رہے ہیں۔

پس جن لوگوں نے اپنی فطرت صالحہ کو مسخ کر دیا اور اس کی روشنی کو آندھی اور طوفان سے محفوظ نہ رکھا اس پر ظلمت اور تاریکی چھا گئی۔ وہ انسانیت سے نکل کر حیوانوں کے دائرہ میں داخل ہو گیا، اب اس کے لئے نبی کا انداز و عدم انداز برابر ہے، علم و معرفت حاصل کرنے کے تین ہی ذرائع تھے، دل، آنکھ اور کان مگر کفر کی زنگ آلودگی نے اس کے آئینہ کو بالکل سیاہ کر دیا اور ایک دھندلی سی چمک بھی اس میں باقی نہیں رہی۔ اب اس کو جس قدر بھی عذاب دیا جائے کم ہے کہ اس نے اپنی تصدیق کو بھلا دیا، جو اس کے اندر ودیعت کی گئی تھی۔

منافقین

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ ①

اور ایک لوگ وہ ہیں جو کہتے ہیں، ہم یقین لائے اللہ پر اور پچھلے دن پر اور ان کو یقین نہیں۔

بنی اسرائیل، جن کو اس سورۃ میں مخاطب کیا گیا ہے، کہہ سکتے ہیں کہ مدینہ میں ایسے لوگ ہیں جو تمام اعمال مذہبی کے پابند ہیں، مگر ان کی اخلاقی حالت میں کسی قسم کی اصلاح نہیں پیدا ہوئی، اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ خود قرآن کی تعلیم ہی محل بحث و نظر ہے۔ یہاں سے اس اعتراض کا جواب دیا جاتا ہے اور اس جماعت کے سرار و محجوبات کو بے نقاب کیا جاتا ہے۔

منافقت کے اقسام حسب ذیل ہیں۔

(الف) ہر ایمان کا اظہار ہو، لیکن حقیقت میں وہ تمام ضروریات ملی کا منکر اور تعلیم الہیہ کا اشد شدید دشمن ہو۔

(ب) ظاہر و باطن، دونوں اعتبار سے تذبذب اور اضطراب ہو۔

(ج) فسق و فجور کی کثرت اور عدوان و ضلالت کا اثر اس درجہ غالب آگیا ہو کہ دنیا کو دین پر انفراد کو اجتماع پر اور کفر کو اسلام پر ترجیح دے۔

اگر ان مراتب سے گانہ کو پیش نظر رکھا جائے تو کتاب و سنت کے تمام مقامات حل ہو جائیں گے اور کسی آیت اور حدیث میں اختلاف معلوم نہ ہو گا۔ حدیث میں منافق کی علامتیں مندرجہ ذیل بیان کی گئی ہیں۔

(۱) ہر بات جھوٹ کہے۔

(۲) ہمیشہ بد عہدی کرے۔

(۳) خائن اور بے ایمان ہو۔

(۴) جھگڑے کے وقت گالیوں پر اتر آئے۔

رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری سے قبل مدینہ میں عبد اللہ ابی بن سلول ایک بااثر شخص تھا وہاں کے لوگوں نے اس کو بادشاہ بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ چنانچہ تاج بھی تیار ہو چکا تھا۔ اتنے میں رسول اللہ تشریف لے آئے، شہر کی تمام جماعتوں نے مل کر یہ طے کر لیا کہ آپ ہی ان کے تمام مناقشات و منازعات کا فیصلہ کریں۔ عبد اللہ کے لئے اب اس وقت اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ اپنی کمزوری کو محسوس کر کے خاموشی اختیار کرے۔ مخالفت کرنے کی طاقت نہ تھی، اس نے بھی اسلام کا اظہار کر دیا اور مسلمانوں کے ساتھ مل گیا، لیکن دراصل اس کی یہی کوشش رہی کہ بن پڑے تو مسلمانوں کا نام و نشان دنیا سے مٹا دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے لوگوں کی وجہ سے تعلیم قرآن پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّا اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝۶

”و غابازی کرتے ہیں اللہ سے اور ایمان والوں سے، اور کسی کو دغا نہیں دیتے مگر اپنے آپ کو اور نہیں بوجھتے۔“

اسلام کے دو درجے ہیں۔

(الف) اعمال کے ساتھ اخلاق کی تہذیب و شائستگی کا بھی خیال ہو تو دنیا اور آخرت دونوں جگہ عزت ملے گی۔

(ب) ظاہری اعمال کی پابندی پر زور دیا جائے اور اصلاح اخلاق سے آنکھیں بالکل بند کر لی جائیں، ممکن ہے بعض اسباب کی بنا پر دنیا میں ان لوگوں کو عزت و کرامت نصیب ہو، لیکن مرنے کے بعد تو قطعاً محروم رہیں گے۔

ان منافقین کی حالت یہ ہے کہ محاسن اعمال و فضائل اخلاق کی طرف تو توجہ نہیں کرتے اور اس پر امید رکھتے ہیں کہ مرنے کے بعد نجات کے مستحق ہوں گے، گویا اللہ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں کیونکہ نتائج اعمال تو وہی دے گا۔ دنیا میں اس امر کی انہیں آرزو ہے کہ مسلمان ان کا اکرام و احترام کریں اور اس طرح مسلمانوں کو بھی خدع و فریب میں رکھنا چاہتے ہیں، مگر حقیقت میں وہ خود ہی دھوکا کھائے ہوئے ہیں۔ اپنی فطرت صالحہ کو فراموش کر چکے ہیں اور یہی فتہائے ضلالت ہے کہ تنزل کو ترقی سمجھنے لگ جاتے ہیں۔

فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ ۖ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۰﴾ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ ﴿۹﴾

”ان کے دل میں آزار ہے پھر زیادہ دیا اللہ نے ان کو آزار اور ان کو دکھ کی مار ہے اس پر کہ جھوٹ کہتے تھے۔“  
آپ کو معلوم ہے کہ عبد اللہ بن ابی کی رسم تاجپوشی ادا ہونے والی تھی کہ رسول اللہ کی تشریف آوری سے رک گئی، اس نے مسلمانوں کا ساتھ دیا مگر اس خیال سے کہ یہ لوگ گھربار چھوڑ کر فقر و فاقہ کی حالت میں یہاں آئے ہیں، خود ہی فنا ہو جائیں گے، خاموش رہا۔ لیکن ظاہر ہے کہ جہانداری کے لئے چند اخلاق فاضلہ ضروری ہیں، منافقین کی حالت یہ ہے کہ خصائص حکومت تو اپنے اندر پیدا نہیں کرتے اور خواہش جہانداری کو ترقی دے رہے ہیں۔

مسلمان اگرچہ مفلس و نادار ہیں لیکن انہیں اپنی اصلاح کا خیال ہے اور برابر اس فکر میں ہیں، جب یہ لوگ حکومت کے قابل ہو جائیں گے تو فوراً خلافت ارضی ان کے سپرد کر دی جائے گی۔ اس وقت منافقین کو بے انتہا تکلیف ہوگی اور دیکھیں گے کہ جس حقیقت کا ہم انکار کرتے تھے وہ صادق ہو کر رہی اور ہم اس نعمت عظمیٰ سے محروم رہے۔

وَإِذْ أَقْبَلْنَا لَهُمُ لَاقِئَتْنِي فِي الْأَرْضِ ۖ قَالُوا إِنَّا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ﴿۱۱﴾ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَكِنْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿۱۲﴾

”اور جب کہنے ان کو فساد نہ ڈالو ملک میں کہیں ہمارا کام تو سنو ارنہ۔ سن رکھو وہی ہیں بگاڑنے والے پر نہیں سمجھتے۔“

### اصلاح و افساد

دنیا میں اصلاح و افساد، باہم مخلوط ہیں۔ نور و ظلمت دست و گریباں ہیں۔ خیر و شر ہم آغوش ہیں اور ایک دوسرے کو مستلزم۔ جس چیز کو ایک اصلاح کہتا ہے دوسرا اسی کو افساد کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام اس لئے آتے ہیں کہ بنی اسرائیل کو فرعون کے پنجہ مظلم سے نجات دلوائیں، لیکن فرعون اسی کو افساد کہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ باوجود اس اختلاط و التباس کے ان دونوں میں ایک حد فاصل بھی ہے۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ قرآن حکیم کی رو سے اس کی حقیقت کو متیقن کر دیں۔ قرآن نے اس کے لئے حسب ذیل عنوانات قائم کئے ہیں۔

(الف) جزئیات اصلاح و افساد اور ان کے آثار و علامات کی تعین و تشخیص۔ قرآن حکیم نے نہایت تفصیل سے ان جزئیات کو بیان کیا ہے، ہم اختصار کی خاطر صرف چند اقتباسات پر اکتفا کرتے ہیں۔

(۱) چور چوری کرتا ہے، ایک کا گھر برباد ہوتا ہے لیکن خود چور کا گھر آباد ہو جاتا ہے۔ اس لئے یہ افساد بھی ایک دوسری صورت میں اصلاح ہے۔ بالین ہمہ اس کو ہر شخص افساد کہتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں پر جب مصر میں پیمانہ کی چوری کا الزام لگایا گیا تو انہوں نے کہا۔

تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْأَرْضِ وَمَا كُنَّا سَارِقِينَ ﴿۱۲﴾ (۴۳)

خدا کی قسم تم لوگ جانتے ہو کہ ہم اس لئے یہاں نہیں آئے کہ زمین میں فساد کریں اور ہم چور نہیں ہیں۔

(۲) ایک شخص اس سے بھی زیادہ ترقی کرتا ہے اور محدود چوری کی جگہ ڈاکے ڈالتا ہے، اس سے اگرچہ لٹنے والوں کی



بستی بالکل لٹ جاتی ہے مگر لوٹنے والوں کا گھر، مال و دولت کی کان بھی بن جاتا ہے، ایک شخص غیر فطری طریقوں سے لذت نفسانی حاصل کرتا ہے اور اس کو اپنے نفس کی بھلائی اسی میں نظر آتی ہے، وہ اس کو فلسفہ عیش و امید کے لقب سے یاد کرتا ہے، لیکن تمہیں معلوم ہے کہ یہ کیسا مفسدانہ فلسفہ ہے جو حفظ صحت کو، نسل کو، مال و دولت کو اور انسان کے قواعد طبعی کو یکسر برباد کر دے۔

اَنْتُمْ لَتَتَّاتُونَ الرِّجَالَ وَ تَقْطَعُونَ السَّبِيلَ وَ تَأْتُونَ فِي نَادِيَكُمُ الْمُنْكَرَ (۲۹: ۲۹)

تم فعل خلاف و ضح فطری کرتے ہو، ڈاکہ ڈالتے ہو اور اپنی مجلسوں میں بد اخلاقیوں کے کام کرتے ہو۔ انہی نتائج مہلک کے لحاظ سے ایک پیغمبر خدا نے بے اختیار ہو کر کہہ دیا۔

رَبِّ انْصُرْنِي عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِينَ ﴿۳۰﴾ (۲۹: ۳۰)

خدا یا مجھ کو مفسد لوگوں پر نصرت عطا کر۔

(۳) ایک حکومت ایک قوم کی حریت و آزادی سلب کر لیتی ہے، اس سے غلاموں کی طرح کام لیتی ہے، اس کی قوت کو فنا کر دیتی ہے، اس کی اخلاقی طاقت کو برباد کر دیتی ہے۔ اس کا یہ عمل باطل یک قلم سرچشمہ قساد ہے، لیکن وہ کہتی ہے کہ میں اپنی قوم کی اصلاح کرتی ہوں، اور اس کی اصلاح و عروج کے لئے دوسری قوم کو اپنا غلام بناتی ہوں۔ پس جو شخص اس حکومت کے برخلاف جہاد کرتا ہے، وہ اس کو مفسد قرار دیتی ہے، لیکن تم کو معلوم ہے کہ خدا اس کو کیا کہتا ہے۔

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَ جَعَلَ اَهْلَهَا شِيْعًا يَسْتَفْعِفُ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ يُدَبِّحُ اٰبْنَاءَهُمْ وَ يَسْتَعْمِي نِسَاءَهُمْ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ﴿۳۸﴾ (۲۸: ۳)

”فرعون نے مصر میں سرکشی کا بڑا ہی سراٹھایا تھا، اس نے رعایا کو کمزور کرنے کے لئے گروہ در گروہ کر دیا، ان میں سے ایک گروہ کو کمزور کرنا چاہتا تھا۔ وہ ان کے بچوں کو ذبح کرتا ان کی عورتوں کو بے عصمتی کے لئے چھوڑ دیتا، بلاشبہ وہ فساد کرنے والوں میں سے تھا۔“

ان کے علاوہ اور بے شمار جزئیات ہیں۔ قرآن حکیم نے مفسدین کی کوئی خاص دنیوی علامت نہیں بتائی جو ان کے اعمال کی عکس تصویر ہو، بلکہ وہ صرف اپنے اعمال ہی سے شناخت کئے جاسکتے ہیں۔ فساد، دراصل عدم محض و تیرگی خالص کا نام ہے اور تاریکی میں صرف تاریکی ہی نظر آتی ہے۔ اب اصلاح کی بعض امثلہ و نظائر ملاحظہ ہوں:-

(۱) ارباب اصلاح جو کام کرتے ہیں صرف اپنے نور ایمان کی ہدایت سے کرتے ہیں، ان کو ترغیبات کی ضرورت نہیں ہوتی۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ يَهْدِيهِمْ رَبُّهُمْ بِإِيمَانِهِمْ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ ﴿١٠﴾ (۹:۱۰)

”جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور صالح اعمال اختیار کئے، تو اللہ ان کے ایمان کی روشنی کو ان کے لئے شمع ہدایت بنادیتا ہے ان کے لئے نعمتوں کی جنت ہے اور اس کی نہروں کی روانی کا نظارہ۔“

(۲) مصلحین میں ہمیشہ باہم محبت دیگائی ہوتی ہے، باہمی پھوٹ اور نفاق صاحب اصلاح گروہ میں نہیں ہو سکتا۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَنُ وُدًّا ﴿١٩﴾ (۹۶:۱۹)

”جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کیا، سو قریب ہے کہ خدائے رحمن ان کے لئے محبت کا دروازہ کھول دیگا۔“

(۳) عمل صالح انسان کے دل کو سنوراتا ہے اس لئے پچھلے گناہوں کا جو داغ دل میں ہوتا ہے، اس کو بھی مٹا دیتا ہے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَآمَنُوا بِمَا نُزِّلَ عَلَى مُحَمَّدٍ وَهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَأَصْلَحَ بَالَهُمْ ﴿٢٤﴾ (۲:۴۷)

”اور جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کیا اور قرآن حکیم پر یقین کیا جو ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے لئے پیام حق ہے، سو وہ یقین کریں کہ ان کے تمام گناہ جھڑ گئے اور ان کے دل کو سنوار دیا گیا۔“

ان مثالوں سے واضح ہو گیا کہ اعمال صالحہ کی حالت اعمال مفسدہ سے بالکل مختلف ہے۔ وہ زندگی اور طاقت و صحت ہیں، اس لئے زندگی ہی کے نتائج کا ان سے ظہور ہوتا ہے۔ وہ روشنی ہیں، اس لئے روشنی ہی کے تمام آثار و علامت اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔

(ب) اصلاح و افساد یا خیر و شر دنیا میں مخلوط اور بالکل ملے جلے ہیں لیکن اصلاح، افساد پر اور خیر، شر پر کماؤ کیفا غالب ہے۔ یعنی بلحاظ حقیقت کے بھی، بلحاظ وجود کے بھی اور بلحاظ نتائج کے بھی۔

مفسدین و مصلحین کی صفیں تمہارے سامنے ہیں، تم نے اصلاح کو افساد سے، نور کو ظلمت سے، پھول کو کانٹوں سے الگ کر کے دیکھ لیا۔ لیکن یہ بالکل ظاہر ہے کہ کاغذ کے صفحات پر تو ان کو الگ کیا جاسکتا ہے۔ سطح زمین پر ان کی بزم آرائی نہیں ہو سکتی، فرشتوں نے خلقت آدم پر اعتراض کیا اور بظاہر آدم نے جنت ہی میں ان کے اعتراض کی تصدیق بھی کر دی، لیکن تم کو صرف آدم کے عمل ہی کو نہیں دیکھنا چاہئے، بلکہ اس کے دقیق نتائج پر بھی نظر ڈالنا ضروری ہے، آدم نے غلطی کی اور خود اپنا بنا بنا یا گھر اجاڑا، لیکن تم نے دیکھا کہ اس افساد نے کیا اصلاح کی۔ اس تخریب نے کیا تعمیر کی۔ بغور دیکھو! اس تخریب نے ایک عالم کھڑا کر دیا، جس میں آدم کی اولاد چلتی پھرتی نظر آتی ہے، اس لئے آدم کا یہ گناہ فرشتوں کے اعتراض کی تصدیق نہیں کرتا بلکہ یہ اس کا عملی جواب ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ فساد سے دنیا برباد ہو جائے گی۔ خدا نے ان کو دکھادیا کہ اصلاح و افساد لازم ملزوم ہیں۔ اس لئے اگر ایک گھر برباد ہو گا تو دوسرا آباد بھی ہو جائے گا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ مادہ عالم کی ترکیب میں دونوں اجزاء برابر کی نسبت رکھتے ہیں یا ان میں کوئی جز غالب بھی ہے، خدا

کا فیض عام جواب دیتا ہے کہ:

”سبقت رحمتی علی غضبی“

”میری رحمت میرے غصہ پر سبقت لے گئی ہے۔“

اس لئے خیر شر پر، اصلاح افساد پر غالب ہے۔ خدا نے فرشتوں کو یہی جواب دیا ہے۔ فرشتوں کو حضرت آدم کے دامن پر صرف ایک فساد کا دھبہ نظر آیا تھا، جس کو خون کے چھینٹوں نے اور رنگین و نمایاں کر دیا تھا، لیکن خدا نے کہا کہ ایک دھبہ ہزاروں نقش و نگار کے پردوں میں چھپ جاسکتا ہے۔

پس جس طرح مقدار و کمیت کے لحاظ سے خیر شر پر غالب ہے، اسی طرح کیفیت کے اعتبار سے بھی وہ شر و فساد سے زیادہ لطیف، نرم، رقیق اور تربیت پذیر ہے۔ شر و فساد ایک کوئلہ ہے جو پھونکنے کے بعد بھڑکتا ہے لیکن خیر و اصلاح کی برق جو دفعتاً روشن ہو جاتی ہے۔

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهُ ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهُ ۝ (۹۱: ۹۰)

”وہ شخص کامیاب ہوا جس نے اس کا تزکیہ کیا اور وہ ناکامیاب رہا جس نے اس کو دفن کر دیا۔“

اصلاح اصل فطرت صالحہ ہے اور افساد خارجی ضلالت کا نتیجہ۔ پس ضرورت صرف تزکیہ و تربیت کی ہے تاکہ زنگ دور ہو جائے اور آئینہ چمک اٹھے، اس تربیت و تزکیہ کے بعد اس کا قوام اس قدر لطیف ہو جاتا ہے کہ۔

يَكَادُ زَيِّنُهَا يَبْصُرُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ تُوَدُّ عَلَى نُوْرٍ يُفِيْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهِ مَنْ يَّشَآءُ (۲۴: ۳۵)

”قرب ہے کہ اس کا تیل روشن ہو جائے اگرچہ اس میں آگ نہ لگائی جائے۔ روشنی پر روشنی ہے، خدا اپنی روشنی کی طرف جس کو چاہتا ہے راہ دکھاتا ہے۔“

(ج) ان دونوں کے درمیان ایک حد فاصل ہے، جو ایک کو دوسرے سے ممتاز کر دیتی ہے۔

”جس وقت اللہ تعالیٰ نے خیر و شر کو پیدا کیا اسی وقت سے حد بھی قائم کر دی۔ آدم کو یہ حد بتائی گئی تھی۔“

وَلَا تَقْرَبُوا هَٰذِهِ السَّبْجَةَ فَتَكُونُوا مِنَ الظَّالِمِينَ ۝ (۲: ۳۳)

اور اس درخت کے قریب نہ پھٹکنا تاکہ زیادتی و انحراف کرنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ۔ لیکن چونکہ یہ حد محسوس نہ تھی اس لئے شریعت نے اس کے امتیاز کا ذریعہ صرف ذوق صحیح کو قرار دیا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”الاثم ملحاك في نفسك“

”گناہ وہ ہے جو دل میں کھٹکے۔“

اور یہ ذوقی شہادت فطرتی چیز ہے۔ آدمی جب گناہ کرتا ہے تو اس کا دل دھڑکنے لگتا ہے، چہرہ متغیر ہو جاتا ہے، اسی کا نام

نور ایمان اور یہی خیر و شر کی حد فاصل قائم کر سکتا ہے۔

(د) اصلاح و فساد کا توازن طبعی، صرف دین الہی کے ذریعہ سے قائم رہ سکتا ہے، دنیا میں ہزاروں سیارات گردش کر رہے ہیں، ہر ایک چاہتا ہے کہ دوسرے کی حد میں قدم رکھے، لیکن فطرت ان کو مضبوطی میں جکڑ دیتی ہے۔ قدرت الہی ان کو کشش باہمی سے ایک دوسرے کی طرف بڑھنے نہیں دیتی۔ اس لئے سب اپنے اپنے طور پر ایک نہایت منظم، نہایت باقاعدہ اور نہایت مرتب گردش کر رہے ہیں۔

انسان کا، اس کے اعمال کا اور اس کے اخلاق و عادات کا بھی یہی حال ہے۔ وہ ایک دوسرے سے ٹکرانا چاہتے ہیں، اس لئے وحی الہی مذہب کی سنہری زنجیر سے ان کی مطلق العنانیوں کو جکڑ دیتی ہے۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا (۳: ۹۸)

”سب کے سب خدا کی رسی کو مضبوط پکڑ لو، کہ ایک دوسرے پر تعدی نہ کرنے پائے اور دنیا کی میزان عدل کا پلہ برابر رہے۔“

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (۵۷: ۲۵)

”ہم نے اپنے رسولوں کو دلائل حقہ و براہین واضحہ کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان کو اتارنا کہ عدل و توازن قائم رہے۔“

(ه) لیکن اس توازن کے قائم رکھنے کے لئے جزئیات عمل میں مصالح عامہ کا لحاظ ضروری ہے۔

انسان کے جذبات، فطرت کے دوسرے قوائے طبعیہ سے زیادہ ذکی الحس، زود اثر اور سرلیج الاشتغال ہیں، اس لئے وہ باوجود اس جذب و کشش کے باہم ٹکرانا چاہتے ہیں، پس۔

وَلَوْ أَنَّبَغَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ ۖ (۲۳: ۷۱)

”اگر حق بھی ان کا اتباع کرتا تو زمین و آسمان اور ان کے رہنے والے برباد ہو جاتے۔“

دنیا کو اس تباہی سے بچانے کے لئے اس کو بجز واکراہ ایک مرکز پر لانے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہی فطری ضرورت جہاد، قصاص اور تغیر و عقوبت کی سنگ بنیاد ہے۔

وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (۵۷: ۲۵)

”اور ہم نے لوہا اتارا کہ اس میں سلطان و نفوذ کی بڑی خوفناکی ہے اور لوگوں کے لئے فوائد بھی ہیں۔“

قرآن حکیم نے جابجا اسی توازن طبعی کے ذریعہ قیام امن و سلام عام کی طرف اشارہ کیا ہے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۖ لَفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿۲﴾ (۲: ۲۵۱)

”اور اگر خدا بعض آدمیوں کے ظلم و زیادتی کو بعض کے ذریعہ دفع نہ کرتا، تو زمین تباہ ہو جاتی۔ لیکن خدا تو دنیا پر احسان

کرنے والا ہے۔”

اس منطقیانہ ترتیب سے جو اوپر گزر چکی ہے، دو باتیں خود بخود بطور نتیجہ کے ثابت ہوتی ہیں اور ان پر کسی مزید دلیل و برہان کی ضرورت نہیں رہتی۔

- (۱) اعمال صالحہ کی ایک محدود زندگی ہے اور وہ جسمانیات کی طرح صحت و مرض، یعنی اصلاح و فساد سے گھری ہے۔
  - (۲) جمہوریت صالحہ اور اجتماعی قوت عادلہ اس کو امراض سے محفوظ رکھتی ہے اور اصلاح کو ترقی دیتی ہے۔
- چونکہ قرآن حکیم کی تفسیر میں اصلاح و فساد ایک اہم و اقدم باب تھا، اس لئے ہم نے تفصیل سے کام لیا کہ تمام مراتب کا کشف و ظہور ہو جائے۔ اب آپ اس آیت کو پھر ایک مرتبہ دیکھ لیجئے جو اس بحث کے آغاز میں تحریر ہوئی ہے۔ ان منافقین کی کوشش یہ ہے کہ حق دہ کر رہے اور کفر کو غلبہ و اقتدار نصیب ہو، اس لئے وہ مفسد ہیں۔
- جرم کا اقرار**

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ امْنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ ۗ أَلَا أَنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَكِنْ لَا يَعْلَمُونَ ۝

”اور جب کہئے ان کو ایمان میں آؤ، جس طرح ایمان میں آئے سب لوگ، کہیں کیا ہم اس طرح مسلمان ہوں جیسے مسلمان ہوئے یہو قوف، سنتا ہے وہی ہیں یہو قوف پر نہیں جانتے۔“

سفہت کہتے ہیں کو تاہ عقلی اور ناعاقبت اندیشی کو، منافقین اپنے آپ کو ارباب فہم و فراست خیال کرتے ہیں اور مسلمانوں کو یہو قوف کہتے ہیں کیونکہ انہوں نے اسلام کی خاطر اپنے وطن و دیار کو، عزیز و اقارب کو اور مال و جائداد کو قربان کر دیا۔ یا حقیقت میں یہو قوف وہ شخص ہے جو علم کی پرواہ نہیں کرتا، اخلاق کی جانب سے اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے اور فضائل و محاسن کے کسب و حصول کی ضرورت محسوس نہیں کرتا اور یقیناً ہر سلیم الفطرۃ انسان اس کی تصدیق کرے گا۔

وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شُيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ ۖ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُونَ ۗ اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ۝

”اور جب ملتے ہیں ان لوگوں سے جو ایمان لائے کہتے ہیں ایمان لائے ہم اور جب اکیلے ہوتے ہیں طرف اپنے سرداروں کے، کہتے ہیں تحقیق ہم تمہارے ساتھ ہیں، سوائے اس کے نہیں کہ ہم ٹھٹھا کرتے ہیں۔ اللہ ٹھٹھا کرتا ہے ان سے اور کھینچتا ہے ان کو بیچ سرکشی ان کی کے، بیکتے ہیں۔“

یہ لوگ خود اپنی زبان سے اس امر کا اقرار کر رہے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی مجالس میں صرف استہزاء و تمسخر کی غرض سے جاتے ہیں ورنہ دراصل ان کو تلاش و جستجوئے حق نہیں ہوتی۔ لیکن حقیقت میں وہ اپنے ہی ساتھ ہنسی کرتے ہیں اور اپنے نفسوں کی صلاحیت کو فراموش کر دیتے ہیں۔ وہ دونوں جگہ عزت کے آرزو مند ہیں مگر جلد ہی ان کی حقیقت مستورہ بے نقاب ہو جاتی ہے اور پھر چاروں طرف سے ذلت و رسوائی نصیب ہوتی ہے۔

شیاطین سے مراد ان کے سردار اور روسائے کفر و ضلالت ہیں۔

یہاں تک منافقین کی چند اصولی غلط کاریاں صاف کر دی گئیں۔

(۱) ان کے ظاہر و باطن میں اختلاف شدید ہوتا ہے۔

(۲) خدع و فریب ان کی عادت ہے۔

(۳) جاہ طلبی ان کی غایت الغایات ہے۔

(۴) مسلمانوں کی نسبت انہیں پورا یقین ہے کہ قرآن کے پابند رہ کر کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔

(۵) فرزند ان اسلام کو غیروں کا غلام بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

(۶) فساد پھیلانے کی فکر میں رہتے ہیں۔

(۷) مسلمانوں کو ناعاقبت اندیش اور کوتاہ بین خیال کرتے ہیں۔

(۸) جانی و مالی قربانی سے گریز کرتے ہیں۔

(۹) تعلیم الہی کے ساتھ تمسخر و استہزاء کرتے ہیں۔

## امثال قرآنی

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلٰةَ بِالْهٰذِیْ ۖ فَمَا رِبْحُ تِجَارَتِهِمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِیْنَ ۝

یہی لوگ ہیں جنہوں نے مولیٰ گرہی بدلے ہدایت کے، پس نہ فائدہ پایا سوداگری ان کی نے اور نہ ہوئے راہ پانے والے۔  
قرآن حکیم کا درس و فکر ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بسا اوقات اپنے اعلیٰ ترین مطالب و مقاصد کے اظہار کے لئے امثلہ و نظائر پیش کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کا بہت بڑا حصہ انہی تمثیلات پر مشتمل ہے۔ کہیں ہواؤں کی تصریف ہے، بادلوں کا انبساط ہے، زمین کی نشوونما ہے، لیل و نہار کا اختلاف ہے۔ موجودات و مخلوقات کے مختلف اشکال و الوان ہیں، کو اکب و سیارات اور نجوم و ثوابت کے طلوع و غروب ہیں۔ انقلابات طبعیہ کے مناظر جمیلہ ہیں۔ رعد و برق کے دہشت انگیز اور خوف دلانے والے نظارے ہیں۔ بیع و شراء اور خرید و فروخت کی منازعات و منافشات ہیں اور ان میں وہ تمام اسرار و معارف بیان کئے گئے ہیں جو فہم انسانی کا منتہائے اور اک ہیں۔ وَ لَقَدْ فَتَرْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْآنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝ (۳۹: ۲۷)

ان امثال و نظائر کے بیان کرنے سے قرآن حکیم کا مقصد یہ ہے کہ انسانوں کی قلبی و روحی حیات و ممت، اقوام و ملل کے انقلابات، ملکوں اور حکومتوں کے تسلط و تنزع اور ہدایت الہی اور شقاوت انسانی کے مختلف مدارج و مراتب سامنے آجائیں۔ وما یعقلها الا العالمون۔

مجملہ ان امثال قرآنیہ کے بیع شر کی ایک لطیف و بدیع اور جامع و مانع تمثیل ہے، جس پر سب سے زیادہ زور دیا گیا

ہے۔ ایک شخص بازار جاتا ہے کہ کچھ خرید کرے، اس کی انتہائی سعی و کوشش یہی ہوگی کہ بہتر سے بہتر چیز خریدے، کبھی اس کو اپنا نقصان گوارہ نہ ہوگا، مگر ان لوگوں کی حماقت و نادانی ملاحظہ ہو کہ ہدایت دے کر گمراہی اور ضلالت خرید رہے ہیں۔ پس یہ تجارت کہاں نفع بخش ثابت ہو سکتی ہے اور یہ لوگ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

## دو قسم کے لوگ

منافقین کے مختلف اقسام ہیں، کچھ تو اس درجہ اسلام کے دشمن ہیں کہ ان سے کبھی نیکی کی توقع ہی نہیں ہو سکتی، بلکہ وہ ہمیشہ اسلام کی تباہی و بربادی کی تجاویز سوچتے رہتے ہیں، لیکن بہت سے لوگ اپنی طبعی کمزوری سے مجبور ہیں، ہر اثر کو قبول کر لیتے ہیں، ہر صحبت و ہم نشینی ان پر غالب آ جاتی ہے اور ہر زبردست شخصیت ان کو اپنے قابو میں لا سکتی ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ قرآن جس طرح پہلی جماعت کی پروا نہیں کرتا تو دوسری طرف سے بھی آنکھیں بند کر لے، اور ان کی ہدایت و راہ نمائی کی کوئی سبیل تجویز نہ کرے۔

اگلی آیتوں میں دو قسم کی مثالیں بیان کی گئی ہیں، عام مفسرین کا خیال ہے کہ ان مثالوں سے ایک ہی طرح کے لوگ مراد ہیں۔ حالانکہ حقیقت بالکل اس کے برخلاف ہے، دو الگ الگ گروہ ہیں اور دونوں کے خصائص و امتیازات کو واضح کیا جا رہا ہے۔ ایک کی شقاوت قلبی اور جو دو کفر و روشن کیا ہے تو دوسرے کی کمزوری و ناتوانی کو بھی ذکر کر دیا ہے تاکہ اگر پہلی جماعت سے اعتنا نہ کیا جائے تو دوسرے گروہ کو وقف فراموشی نہ کر دیا جائے۔ ممکن ہے دوسرا طائفہ ترہیب و ترغیب کے ذریعہ دائرہ اسلام میں داخل ہو کر اپنی اصلاح کر لے۔

اس قدر تمہید کے بعد آپ آیات مندرجہ ذیل میں غور و فکر کیجئے۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَاتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمٍ اٍلَّا يَبْصُرُونَ ﴿٥٨﴾  
صُمُّ بَكْمٌ عَنْهُمْ لَا يَنْزِعُ عَنْهُمْ ۝ ﴿٥٩﴾

”مثال ان کی جیسے مثال اس شخص کی ہے جو جلانے آگ، پس جب روشن کیا جو کچھ گردا سکے تھالے گیا اللہ روشنی انکی اور چھوڑ دیا انکو بیچ اندھیروں کے، نہیں دیکھتے بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں پس وہ نہیں پھر آتے۔“

ان دونوں آیتوں میں منافقین کی اس جماعت کو بیان کیا گیا ہے جو ایمان لے آئے۔ اسے اسلام کی حقیقت و حقانیت کا یقین ہو گیا، لیکن جس وقت آگے چل کر اس کے مصالح خصوصی و ذاتی اغراض کا مفاد اسلام و منافع اجتماعیت کے ساتھ تصادم ہوا تو فوراً ایمان و اسلام سے ہاتھ دھو بیٹھی اور یوں اپنی تمام قوتوں کو برباد کر دیا۔ پس ان کی آنکھوں، انکے کانوں اور ان کی زبانوں کا بیکار ہو جانا نتیجہ ہے ان کی بد اعمالی کا اور ان کے راہ حق کو ترک کر دینے کا، جس کو وہ صحیح یقین کر چکے تھے۔

أَوْ كَصَيْبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمٌ وَّ رَعْدٌ وَ يَرَقَىٰ ۚ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِيٓ اِذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۚ

وَاللّٰهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ ﴿٥﴾ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ ۖ كُلَّمَا أَصْبَأَ لَهُمْ مَشْئَوْا فِيهِ ۖ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا ۖ وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَبْعِهِمْ وَأَبْصَارَهُمْ ۖ إِنَّ اللّٰهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٦﴾

”یا جیسے مینہ برستا ہے آسمان سے، اس میں ہیں اندھیرے اور گرج اور بجلی، ڈالتے ہیں انگلیاں اپنے کانوں میں مارے کڑک کے ڈر سے موت کے اور اللہ گھیر رہا ہے منکروں کو، قریب ہے بجلی کہ اچک لے انکی آنکھیں جس بار چمکتی ہے ان پر چلتے ہیں اسمیں اور جب اندھیرا پڑا کھڑے رہے اور اگر چاہے اللہ بجائے لنگے کان اور آنکھیں اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

یہ دوسری قسم کے لوگ ہیں جو اپنی کمزوری، طبیعت کی وجہ سے ان مصیبتوں کا نشانہ بن رہے ہیں، ان لوگوں کی مثال ٹھیک اس شخص کی سی ہے جو شب کے وقت کہیں جا رہا ہو، رعد و برق کے خوف سے اپنی جان بچانے کی فکر میں ہو، اسلام تو قبول کر لیا، مگر اب یہاں مشکلات کا سامنا ہے۔ عزیز و قریب، وطن و یار، مال و جائیداد سے علیحدگی ہے۔ جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے لئے سربکف پھرنا ہے، منہیات شرعیہ سے اجتناب ہے۔ یہ قربانیاں ان کو تکلیفوں میں مبتلا کئے ہوئے ہیں، یہ چونکہ طبیعت کے کمزور ہیں، اس لئے ان کو دھمکی دی گئی کہ اگر اب بھی اپنے کانوں اور آنکھوں سے کام نہ لینگے تو ان پر عالم ممات طاری کر دیا جائے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس مثال سے منافقین کی حقیقت اصل یہ ہے کہ ان کی عام طور پر یہی کیفیت ہوتی ہے۔ مذہب بین بین ذلک لالی ہولاعولالی ہولاع کی پوری تصویر بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کی طبیعت کا رجحان یہ ہوتا ہے کہ دونوں جماعتوں سے تعلقات قائم رہیں۔ اگر اسلام کے ساتھ دوستی ہے تو کفر سے بھی رشتہ انخوت نہ ٹوٹنے پائے، حق کی تائید ہے تو باطل بھی قائم و دائم رہے، نور سے استفادہ ہو رہا ہے تو ظلمت و تاریکی بھی کوئی بری چیز نہیں پھر کیوں اس سے مفت میں بیر مول لیا جائے۔

منافقین کا پہلا گروہ توازن فرق تابع قدم اسلام کا اشد شدید دشمن ہے، اس سے کسی خیر و صلاحیت کی توقع ہی رکھنی فضول ہے، البتہ دوسری قسم کے لوگ ایسے ہیں کہ انکی رکاوٹوں کو دور کیا جائے، رشد و ہدایت ان کے سامنے ہو، ممکن ہے ترغیب و ترہیب سے وہ اپنے اندر عبرت و موعظہ پیدا کریں اور دائرہ اسلام میں داخل ہو جائیں، اس لئے اگلی آیات میں ان کی جانب توجہ کی جاتی ہے اور تذکیر بالاء اللہ کے ذریعہ ان کے لئے تنبیہ و اعتبار کی راہیں کھولی جاتی ہیں۔

### دعوة الی التوحید

گزشتہ آیات میں تین قسم کے لوگوں کا تذکرہ کیا گیا تھا، آخر میں منافقین کے متعلق بحث تھی کہ یہ دو قسم کے ہیں۔ کچھ تو اس درجہ اشد شدید دشمن اسلام ہیں کہ ان سے کسی قسم کی توقع رکھنا ہی بے سود اور لا حاصل ہے۔ البتہ دوسری جماعت بھی ہے جو اپنی طبعی کمزوری کی بنا پر منفعل اور اثر پذیر واقع ہوئی ہے۔ ہر صحبت اور سوسائٹی اسے اپنے اندر جذب کر لے گی۔ اسی آخری گروہ کی نسبت کہا گیا تھا کہ اگر اس نے اپنے ظاہری و باطنی حواس سے کام نہ لیا تو آخر کار کچھ مدت کے



بعد ان پر قحط و بیکاری چھا جائے گی اور پھر ان سے کام نہ لیا جاسکے گا۔ اگلی آیتوں میں اسی جماعت کو توحید کی جانب دعوت دی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی نعمتیں یاد دلاتا ہے کہ شاید ان سے تذکیر و موعظت پیدا ہو اور وہ اپنی اصلاح و تہذیب کی طرف توجہ کرے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا إِلَهَ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿١﴾ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً ۖ وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ ۖ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٢﴾

”اے لوگو! بندگی کرو اپنے رب کی جس نے بنایا تم کو اور تم سے اگلوں کو شاید تم پر ہیز گاری پکڑو، جس نے بنادیا تمہارے لئے زمین کو بچھو نا اور آسمان کو عمارت اور اتار آسمان سے پانی پھر نکالا اس سے میوہ کھانا تمہارا سونہ ٹھہراؤ اللہ کے برابر کوئی اور تم جانتے ہو۔“

قرآن حکیم کا درس و فکر ہمیں بتاتا ہے کہ مخالفین و معاندین کو راہ حق پر لانے کے لئے تین قسم کی تذکیر و موعظت سے کام لیا جاتا ہے۔

(الف) تذکیر بالآلہ، اپنی نعمتیں یاد دلا کر عبرت و بصیرت پیدا کرنا مثلاً ﴿فَاذْكُرُوا آلَاءَ اللَّهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ (۶۷:۷۷)

(ب) تذکیر بایام اللہ، گذشتہ اقوام و امم کے عروج و تسفل کی تاریخ اور اس سے استنباط نتائج و غیرہ مثلاً۔ ﴿وَذَكِّرْهُمْ بِأَيَّامِ اللَّهِ ۚ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ﴾ (۱۳:۵)

(ج) تذکیر بمابعد الموت، مرنے کے بعد اعمال انسانی کے نتائج بیان کر کے نیکی کا شوق دلانا مثلاً ﴿يَعْلَمُ إِذَا بُعِثَ رَافٍ الْقُبُورِ ۚ وَحِصْلَ مَا فِي الصُّدُورِ﴾ (۱۰۰:۹۱) ان آیات میں تذکیر بالآلہ سے کام لیا گیا ہے، تمام انبیاء و رسل کی تعلیمات صالحہ کی اصل و اساس توحید باری تعالیٰ ہے۔ ﴿وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ حُنَفَاءَ﴾ (۹۸:۵) زندگی کے جس قدر مراتب مختلفہ ہیں، سب خدائے واحد کے قبضہ میں ہیں۔ موت حیات کا وہی مالک ہے، وہی بادلوں سے پانی برساتا ہے اور وہی حیات انسانی کے بقا و قیام کے تمام ضروری سامان پیدا کرتا ہے۔ پھر یہ کس قدر کوتاہ بینی اور جہل و ضلالت ہے کہ غلامی کرتے وقت ہم کسی اور کو بھی اس کا شریک بنالیں خواہ وہ اصنام و طواغیت ہوں، رسوم و عوائد ہوں، نسلی روایات و عقائد مالوفہ ہوں اور خواہ وہ سلاطین جابرہ ہوں غرض کہ ہر وہ چیز جس کو ارباباً من دون اللہ کا درجہ عملاً یا اعتقاداً دیا جائے سب اس میں داخل ہیں۔

سورہ یوسف میں اسی طرف اشارہ کیا۔ عَزَّ وَجَلَّ ﴿مُتَفَرِّقُونَ خِيَرًا أَمَرَ اللَّهُ الْوَاحِدَ الْقَهَّارُ﴾ ﴿مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءُ سَتَيَبِيضُ مِنْهَا أُنْثَىٰ وَابْنٌ كُفَرَاءُ ۚ أَنَّ اللَّهَ بَعَثَ فِي هَٰذَا الْأُمَّةِ نَبِيًّا ۖ سَمِعْتُمْ نَادِيَهُ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ ۚ﴾ (۱۲:۳۹) حضرت لقمان نے اپنے صاحبزادہ کو ان الفاظ میں نصیحت کی۔ يٰٓأَيُّهَا الْبَالُغُ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ﴿۳۱﴾ (۱۲:۳۱)

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّثْلِهِ ۚ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٢٥﴾ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَأْزَنُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ﴿٢٦﴾ وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۖ كُلًّا زُرِعُوا مِنْهَا مِنْ شَعِيرَةٍ رُزِقُوا ۖ قَالُوا هَذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۖ وَأُتُوا بِهِ مُتَشَابِهًا ۖ وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُطَهَّرَةٌ ۖ وَهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢٧﴾

”اور اگر تم ہو شک میں اس کلام کے جو اتارا ہم نے اپنے بندے پر تو لے آؤ ایک سورۃ اس قسم کی اور بلاؤ اپنے مددگاروں کو اللہ کے سوا، اگر تم سچے ہو، پھر اگر نہ کرو، اور البتہ نہ کرو گے، پس جو آگ سے، جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں تیار ہے منکروں کے واسطے اور خوش خبری دے ان کو جو ایمان لائے اور نیک کام کئے ان کے لئے ہیں باغ بہشتی، ان کے نیچے ندیاں ہیں جس بار طے ان کو وہاں کوئی میوہ کھانے کو کہیں یہ وہی ہے جو ملتا تھا ہم کو آگے، اور ان کے پاس وہ آئے گا ایک طرح کا اور ان کے لئے ہیں وہاں عورتیں پاکیزہ اور انہیں وہاں ہمیشہ رہنا ہے۔“

قرآن حکیم نے مخالفین اسلام سے بار بار اس امر کا مطالبہ کیا ہے کہ ان میں اگر اس کتاب عزیز کے مقابلہ کی طاقت ہے تو اپنے تمام اعوان و انصار اور اولیاء الشیطان کی مدد سے اس کے مثل لکھنے کی کوشش کریں۔ ایک جگہ فرمایا ہے:

قُلْ لِّیْنَ اجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَىٰ أَنْ يَأْتُوا بِمِثْلِ هَذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا ﴿٩٠﴾ (۱۷: ۹۰)

”کہو کہ اگر آدمی اور جنات جمع ہو کر اس بات پر آمادہ ہوں کہ اس قرآن کی طرح کا اور کلام بنالائیں تاہم اس جیسا نہیں بنا لائے، اگرچہ ان میں سے ایک کی پشتی پر ایک کیوں نہ ہو۔“

ایک موقع پر یوں ارشاد ہوا:

قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُورٍ مِثْلِهِ مُفْتَرِيَاتٍ ۚ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿١١﴾ (۱۶: ۱۱)

”کہہ دو کہ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو تم بھی اسی طرح کی بنائی ہوئی زیادہ نہیں تو دس ہی سورتیں لے آؤ اور خدا کے سوا جس کو مدد کے لئے تم سے بلاتے بن پڑے بلاؤ۔“

پھر ان الفاظ میں مطالبہ کیا:

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِثْلِهِ ۚ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۱۰﴾ (۳۹: ۱۰)

”کیا یہ لوگ قرآن کی نسبت کہتے ہیں کہ اس کو خود پیغمبر نے بنالیا ہے تو ان سے کہہ دو کہ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو تم بھی ایسی ہی ایک سورۃ بنالادو اور خدا کے سوا جس کو تم سے بلاتے بن پڑے بلاؤ۔“

چنانچہ آیت زیر بحث میں بھی یہی مطالبہ کیا گیا کہ ایک سورۃ بنا کر لے آؤ۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ جواب کس اعتبار سے مانگا جا رہا ہے؟ عام مفسرین کی رائے ہے کہ فصاحت و بلاغت میں مقابلہ کی دعوت دی گئی ہے، اس میں شک نہیں کہ

مسلمان تو ایک طرف خود معاندین اسلام بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ ایسی فصیح و بلیغ عبارت پیش کرنا غیر ممکن اور انسانی طاقت سے باہر ہے، جب خود اہل زبان اس کی مثل لانے سے عاجز ہوں تو دوسروں کی حقیقت ہی کیا ہے۔

قرآن حکیم نے اپنی نسبت کہا کہ وہ ہدیٰ للناس ہے، نور ہے، بصائر ہے، اس کا روئے سخن عالمگیر ہے، وہ تمام اقوام و امم عالم میں وحدت و جمعیت پیدا کرنے آیا ہے، اس کا مقصد اصلی ایک امة صالحہ اور مدینہ فاضلہ کا بقا و قیام ہے، وہ تہذیب اخلاق، تدبیر منزل، سیاست مدنیہ اور خلافت کبریٰ کی تعلیم دینے آیا ہے۔ یہ اسی کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا کہ اس نے عرب کو ایک زندہ قوم بنادیا جس نے زنا کاری، شراب خوری، قمار بازی اور صدا جراثیم کو آن واحد میں سر زمین عرب سے حرف غلط کی طرح محو باطل کر دیا۔ جس نے عرب کے جنگلوں اور وحشیوں کو خدا کا مقدس دست عمل بنادیا، جو قیصر و کسریٰ کے خزائن کے مالک بنا دیے گئے اور یہ سب سے زیادہ حیرت انگیز اور محیر العقول انقلاب عظیم صرف تیس سال کے قلیل ترین زمانہ میں ہوا۔ کیا دنیا کی تاریخ ہمیں کوئی ایسی نظیر بتا سکتی ہے کہ کسی بڑے سے بڑے ریفارمر اور مصلح کو ایسی عظیم الشان کامیابی نصیب ہوئی ہو۔

یہ حقائق ثابتہ ہیں جو تاریخ کے اوراق میں اب تک اپنی تابناکی و درخشندگی سے دیکھنے والوں کی آنکھوں کو خیرہ کر رہے ہیں، یہ واقعات ہیں جن کو انسان اگر بھول جائیں تو ممکن ہے مگر نہ تو آسمان پر چمکنے والے ستارے فراموش کر سکتے ہیں اور نہ زمین کے رہینگے والے جانور اور سمندروں اور دریاؤں کی تیرنے والی مچھلیاں ان کو بھلا سکتی ہیں۔

جو کچھ اوپر مذکور ہوا یہ قرآن حکیم کا اثر تھا، پس اگر مخالفین اسلام میں ہمت ہے تو وہ کوشش کر کے دیکھیں، اپنے تمام اعوان و انصار اور اولیاء الشیطان کی مدد سے ایسا قانون مرتب کر کے لائیں اور اگر تمام دنیا اس کی نظیر لانے سے عاجز ہے تو پھر قرین عقل و انصاف یہی ہے کہ اسی کتاب عزیز کے آگے سر نیاز جھکا دیں اور اپنی گردنیں خم کر کے بغیر کسی قسم کے بحث و مذاکرہ کے اس کو اپنا امام و پیشوا تسلیم کر لیں ورنہ انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ بد اخلاقی و بد کرداری کے عواقب المیہ سے انہیں کوئی نجات نہ دلا سکے گا۔

البتہ جو لوگ اس قانون کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنالیں گے وہ جنت میں داخل ہوں گے، سب سے پہلے ان کے اعمال صالحہ کی جزا اسی دنیا میں انہیں ملے گی۔ بہشت زرار رضی کے مالک بنا دیئے جائیں گے اور خلافت و نیابت الہی کے مستحق قرار پائیں گے، یہ خیال بالکل غلط اور بے بنیاد ہے کہ نیک کاموں کا بدلہ دنیا میں نہیں ملتا، بلکہ اس کی اولین قسط اسی جگہ سے شروع ہوتی ہے۔ وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ ۚ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿۱۳۹﴾ میں اسی طرف اشارہ ہے پھر حقیقی ثمرات و نتائج مرنے کے بعد ظہور پذیر ہوں گے جن کی نسبت قرآن نے کہا۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۴۰﴾

کوئی شخص بھی نہیں جانتا کہ لوگوں کے نیک عملوں کے بدلے میں کیسی کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک ان کے لئے پردہ غیب

میں موجود ہے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے یوں ارشاد فرمایا:

مَا لَعَيْنَ رَأَتْ وَلَا اَذْنَ سَمِعَتْ وَلَا خَطَّ عَلَى قَلْبٍ بَشَرًا۔

نہ تو آنکھوں نے دیکھا نہ کانوں نے سنا اور نہ کسی انسانی دل و دماغ میں ان کا خیال گذرا۔

اس آیت میں بھی جنت کی چند خصوصیات بیان کی گئی ہیں، ان میں نہریں بہتی ہوں گی جن کی وجہ سے ان میں شادابی اور تروتازگی ہمیشہ رہے گی۔ کھانے کو مختلف قسم کے پھل ملیں گے جو اگرچہ ظاہری شکل و صورت میں ایک دوسرے کے مشابہ ہوں، مگر کھاتے وقت معلوم ہو گا کہ ہر ایک کا مزہ اور ذائقہ جداگانہ ہے پھر پاکیزہ اور طاہر بیباں ہوں گی اور سب سے آخر میں یہ کہ اس زندگی میں دوام اور خلود ہو گا؛ وَفِي ذَلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ۔

نکتہ چینی

انسانی تہ و سہرکشی نے بہت کم مجز و انکساری کا اظہار کیا ہے، بلکہ اپنے ظہور و شہود کے لئے دوسری راہیں نکال لیتی ہے، جب قرآن حکیم کے مقابلہ میں کامیاب نہ ہو سکے تو اس کی تعلیم پر نکتہ چینی شروع کر دی، مکہ مبارکہ میں قرآن کا ایک حصہ نازل ہو چکا تھا، عوام الناس نے خدائے قدوس کو چھوڑ کر احبار اور رہبان کو اربابا من دون اللہ کا درجہ دیدیا تھا، بت پرستی میں سب کے سب مبتلا تھے، ان لوگوں کی جہالت و نادانی واضح کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مَثَلُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ أَوْلِيَاءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوتِ إِتَّخَذَتْ بِعَيْنَهَا وَأَنْتَ أَوْهَنَ الْبُيُوتِ لَبِيتُ الْعَنْكَبُوتِ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿۲۹﴾ (۴۱)

جن لوگوں نے خدا کے سوا دوسرے کا ساز بنا رکھے ہیں، ان کی مثال مکزی کی سی ہے کہ اس نے گھر بنایا اور کچھ شک نہیں کہ گھروں میں بودے سے بودا مکزی کا گھر ہے، اے کاش یہ لوگ اتنی بات سمجھتے۔  
پھر سورہ حج میں کہا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ هَبْ مَثَلًا فَاسْتَبْعُوا لَهُ إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَنْ يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَلَوْ اجْتَمَعُوا لَهُ وَإِنْ يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَا يَسْتَفْتِدُوهُ مِنْهُ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ ﴿۲۲﴾ (۷۳)

”لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے تو اس کو کان لگا کر سنو خدا کے سوا جن معبودوں کو تم پکارتے ہو ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے اگرچہ اس کے لئے سب کے سب اکٹھے ہی کیوں نہ ہو جائیں اور اگر مکھی ان سے کچھ چھین لے جائے تو اس کو اس سے چمڑا نہیں سکتے۔ کیسے بودے یہ بت جو مکھی کے نیچے پڑیں اور اس کو نہ پکڑ سکیں اور کیسی بودی وہ بیچاری مکھی جس کا پیچھا کیا جائے اور پھر بھی ہاتھ نہ آئے۔“

اس قسم کی آیات سن کر منافقین کے دلوں میں مختلف قسم کے شبہات پیدا ہوئے اور آخر وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ جس

کتاب میں ایسی حقیر و ذلیل اور مکروہ چیزوں کا ذکر ہو وہ اللہ کی کتاب نہیں ہو سکتی، اس لئے کہ ان چیزوں کا نام لینا اخلاق و مروت کے قانون میں جرم و معصیت ہے۔ کوئی تہذیب یافتہ انسان ان کا ذکر اپنی زبان پر نہ لائیگا، پھر وحی والہام تو اس سے کہیں زیادہ ارفع و اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔ اگلی آیت میں اسی اعتراض کا جواب دیا گیا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَعِجُ أَنْ يُضْرَبَ مِثْلًا مَّا بَعُوضَةٌ فَمَا فَوْقَهَا ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ ۚ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَذَا مِثْلًا ۚ

اور اللہ کچھ شرماتا نہیں کہ بیان کرے کوئی مثال ایک مچھر یا اس سے اوپر، پھر جو یقین رکھتے ہیں سومانے ہیں کہ وہ ٹھیک ہے ان کے رب کا کیا اور جو منکر ہیں سو کہتے ہیں کیا غرض تھی اللہ کو اس مثال سے۔

ہر چیز کا حسن و قبح اس کے نتائج و ثمرات سے تعلق رکھتا ہے۔ درخت اپنے پھل ہی سے پہچانا جاتا ہے، عاقبت کار ہی نیکی و بدی کا پتہ دیتی ہے، انما الاعمال بالخواص میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، ہر صاحب بصیرت کی نظر انجام پر ہوتی ہے، مگر احمق اپنی جہالت و نادانی کی بنا پر ابتدائے کار ہی میں کٹ جتی شروع کر دیتے ہیں۔ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ بہتر سے بہتر زبان میں آسان سے آسان ترکیبوں اور جملوں کے ذریعہ لوگوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کیا جائے۔ اگر فصاحت و بلاغت کا خیال ہو، مشکل الفاظ، غیر معروف ترکیبیں اور نامانوس طرز بیان اختیار کیا جائے، فلسفہ و منطق کی مدد سے استدلال میں زور پیدا کیا جائے، ہندسہ و نجوم کے لاینحل مسائل سے اور اق کتاب کو زینت دی جائے تو اس کا یہ نتیجہ ہو گا کہ ایک مخصوص طبقہ تو ضرور ان علمی تحقیقات سے فائدہ اٹھا سکے گا جس کی تعداد بہت ہی کم ہوگی، مگر بیشتر افراد علم کی برکات سے محروم محض رہیں گے۔ آج یورپ کے ماہرین فن تعلیم باوجود اس قدر علم و فضل کے اس اصول کو تسلیم کر چکے ہیں کہ سہل ترین زبان کے ذریعہ تعلیم دینا بے انتہا مفید و نفع بخش ہے۔ چنانچہ اس قاعدہ کے ماتحت جدید مصنفات کا ذخیرہ فراہم کیا جا رہا ہے۔

قرآن حکیم نے تیرہ صدی پیشتر اس نظریہ کو وضع کیا، اس نے شرک و بت پرستی، اصنام و طواغیت کی غلامی اور دجالہ و شیطانیت کی کج نظری کو ایسی عام فہم مثالوں میں واضح کیا کہ سب کے سامنے ان کی حقیقت اصل یہ آگئی اور لاکھوں کروڑوں انسان راہ راست پر آگئے۔ اس نے تہذیب و دانشگاہی، جہانگیری و جہاں داری اور عمران و اجتماع کے مسائل کو قصص و اخبار ماضیہ کی شکل میں پیش کیا کہ خود استنباط نتائج و استخراج عبرت کر لیں۔ پس ایسے امثلہ و نظائر، جو ہزاروں انسانوں کی ہدایت و راہنمائی کا باعث بن جائیں، اس قابل ہیں کہ ان کا بار بار ذکر کیا جائے اور ان کے ذکر سے زبان کبھی نہ تھکے۔ اللہ تعالیٰ کے پیش نظر انسانوں کی فلاح و کامرانی ہے پھر وہ کیوں نہ ان چیزوں کا ذکر کرے۔ اس قسم کی مثالوں کے جہاں اور صد ہا فائدہ و منافع ہیں، اس کا یہ ایک بین اور لازمی نتیجہ ضرور ہوتا ہے کہ جن لوگوں کے قلوب غبار شک و اشتباہ سے گرد آلود نہ ہوں، جو اب تک اپنی فطرۃ صالحہ پر قائم ہوں اور جو خارجی اثرات ضلالت سے منفعل اور اثر پذیر نہ ہوئے ہوں۔ وہ ان مثالوں کے سنتے ہی فوراً پکار اٹھتے ہیں کہ یہ تعلیم بیشک اللہ کی جانب سے نازل ہوئی ہے اور ایسا ہی ہونا بھی چاہئے تھا۔ ان کے دل تو پہلے ہی سے مومن تھے مگر اب تک انہیں اظہار کا موقع نہ ملا تھا، اب خود بخود ان کی زبان پر ایسے الفاظ

جاری ہو گئے جن سے ان کا اسلام عالم آشکار ہو گیا۔

مگر جن کے دلوں میں کبھی ہوتی ہے، قلب سلیم کی جگہ زنگ آلود اور سیاہ دل رکھتے ہیں، اعمال فاسقہ کی کثرت اور کفر وجہل کے غلبہ واستیلاء کی بنا پر ان کی ہدایت کی تمام راہیں بند ہوتی ہیں، روشنی کی جگہ تاریکی، حق کی جگہ باطل اور اسلام کی جگہ کفر کی فرمانروائی ہوتی ہے۔ جو بد بخت اپنے مصالح خصوصی کی بنا پر اپنے کفر و نفاق کو چھپائے پھرتے تھے اور مسلمانوں کے مجامع میں اسلام پرستی کا اظہار کرتے تھے، ایسی مثالوں کے سنتے ہی کہتے ہیں کہ بھلا ان مثالوں کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ان سے تو اور زیادہ لوگوں کے دلوں میں نفرت پیدا ہو گئی، وہ بظاہر اپنی دینی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں، لیکن حقیقت میں ان کی منافقت اپنا ظہور کرتی ہے کہ فرزند ان اسلام ان کی چالبازیوں میں نہ آئیں، اور آئندہ کے لئے ان سے احتراز و اجتناب کریں۔

يُفْضِلُ بِهِ كَثِيرًا ۖ وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا ۚ وَمَا يُفْضِلُ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ ﴿١٥﴾ الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ  
وِيثَاقِهِ ۚ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ ﴿١٦﴾

”گمراہ کرتا ہے اس سے بہترے اور راہ پر لاتا ہے اس سے بہترے اور گمراہ کرتا ہے انہیں کو جو بے علم ہیں، جو توڑتے ہیں۔  
اقرار اللہ کا مضبوط کئے پیچھے اور توڑتے ہیں جو چیز اللہ نے فرمائی جوڑنا اور فساد کرتے ہیں ملک میں انہیں کو آیا نقصان۔“  
اس کا یہ منشا نہیں کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو گمراہ کرتا ہے، بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اس قسم کی مثالوں سے بہت سے لوگوں کی گمراہی کا اظہار ہوتا ہے اور بہتوں کی ہدایت ظاہر ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب خدائے قدوس نیکی اور طہارت کا سرچشمہ ہے تو وہ کیسے دوسروں کو گمراہ کرے گا۔ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے بندوں کے واسطے کفر و ضلالت کو پسند نہیں کر سکتا۔ وَلَا يَهْدِي لِعبَادِهِ الْكُفْرَ ۚ (۳۹:۷) پس اس کا یہی مطلب ہے کہ ان کی ضلالت اور گمراہی کا اظہار ہوتا ہے اور گمراہ بھی وہی لوگ ہوتے ہیں جن میں حسب ذیل امراض ہوں۔

### (الف) ایمانی کمزوری

ایک شخص جب دوسروں کے لئے قانون بنائیگا تو ان کی سہولت و آسانی کی پرواہ نہ کرے گا، مگر جب اپنی نوبت آئے گی تو ہر قسم کی سہولتیں تلاش کرے گا۔ لیکن اس کا ایمان اس درجہ کمزور ہوتا ہے کہ باوجود اس قدر سہل و آسان تر قانون ہونے کے وہ پھر بھی اس کا پابند نہیں رہ سکتا اور نقض عہد کا مرتکب ہوتا ہے۔

### (ب) ضعف طبیعت

فطرت انسانی اس بات کی مقتضی کہ خاندانی تعلقات قائم رہیں صلہ رحمی کی جائے اور قرابت داری کے جو روابط ہیں ٹوٹنے نہ پائیں۔ منافق کی فطرت اس درجہ کمزور ہوتی ہے کہ وہ اس کو بھی پورا نہیں کر سکتا، گھر والوں میں جھگڑا اور فساد ڈالتا ہے اور خاندانوں میں جنگ و جدل برپا کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔

## (ج) کوتاہ عقلی

فتنہ و فساد کو ہر شخص ناپسند کرتا ہے کہ اس میں ضیاع مال و دولت کے علاوہ زندگی ہمیشہ خطرہ میں رہتی ہے، مگر اس کی سعی و کوشش ہی یہی رہتی ہے کہ حق و صداقت کو فنا کرے اور کفر و بطالت اس کی جگہ لے۔ یہی وہ بد طینت اور بد اخلاق ہیں جو اس تعلیم صحیح سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے اور یہی وہ لوگ ہیں جو ہمیشہ ناکام اور خاسر رہیں گے۔

كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاحْيَاكُمْ ؕ ثُمَّ يُمَيِّتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٨٥﴾ هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَنِيْعًا ۖ ثُمَّ اَسْتَوٰى اِلَى السَّبْعِ اَفْسُوْلِهِنَّ سَبْعَ سَبُوٰتٍ ۖ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٨٦﴾

تم کس طرح منکر ہو اللہ سے، اور تھے تم مردے، پھر اس نے تم کو جلادی، پھر تم کو مارتا ہے پھر جلادے گا پھر اسی کے پاس لٹے جاؤ گے۔ وہی ہے جس نے بنایا تمہارے واسطے جو کچھ زمین میں ہے سب، پھر چڑھ گیا آسمان کو تو ٹھیک کیا ان کو سات آسمان اور وہ ہر چیز سے واقف ہے۔

جس کار ساز قدرت کے قبضہ میں زندگی اور موت اور اس کے تمام اسباب و مراتب ہوں اس سے انحراف و بغاوت کی کوئی صورت نہیں، بلکہ طوعاً و کرہاً اسی چوکھٹ پر اپنا سر نیاز جھکانا پڑے گا۔ دوسری جگہ فرمایا:

اَفَغَيَّرِ دِيْنَ اللّٰهِ يَتَّبِعُوْنَ وَلَٰكِنَّ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿٨٣﴾

”کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے سوا کسی اور دین کی تلاش میں ہیں، حالانکہ جو آسمانوں اور زمین میں ہیں چاروں طرف اسی کے حکم بردار ہیں اور اسی کی طرف سب کو لوٹ کر جانا ہے۔“

پھر ایک جگہ یوں ارشاد کیا:

يَتَّبِعُ الْجِنَّ وَّ الْاِنْسَ اِنْ اَسْتَعْطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَّ الْاَرْضِ فَاَنْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ﴿٥٥﴾ (۵۵: ۳۳)

”اے گروہ جن و انسان! اگر تم سے ہو سکے کہ آسمانوں اور زمین کے کناروں سے ہو کر کہیں کو نکل بھاگو تو نکل دیکھو، مگر کچھ ایسا ہی زور ہو تو نکلو۔“

پس ہر فرزند آدم کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ رب الارباب کے آگے اپنی گردن خم کر دے اور اسکے تشریفی و تکوینی قانون کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنائے۔

اگر ہم انسان کی تحلیل و تفرید کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ دو چیزوں سے ترکیب دیا گیا ہے۔ (۱) جسم (۲) روح اور ان دونوں کا اثر اک کا نام انسان ہے۔ جسم کی کثافت اس امر کی متقاضی ہے کہ اسکے مالوفات و مطلوبات اور ہوں اور روح کے دواعی اور، اس لئے کہ یہ یکسر نورانیت اور لطافت ہے پس اسکی طلب و جستجو بھی اس سے جدا گانہ ہونی چاہئے، جب اللہ تعالیٰ نے جسم اور روح کو پیدا کیا تو ان کی تربیت اور تکمیل بھی وہی کرے گا۔ اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ﴿۹۲﴾ (۱۲: ۹۲) میں اسی طرف



اشارہ ہے۔ چنانچہ جسمانی ضرورتوں کیلئے اس نے کرہ ارضی کی تخلیق کی اور روحانیت کے لئے آسمان بنایا، زمین و آسمان دونوں مل کر ہماری تمام روحانی و جسمانی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ سورہ تغابن میں اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا:

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوْرَكُمْ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿۶۴﴾ (۳:۶۴)

“عین ضرورت کے مطابق اس نے روحانیت و مادیات کے دو مخزن بنائے پھر ان سے فائدہ اٹھانے کے بہتر سے بہتر اسباب و وسائل بہم پہنچائے اور ہر چیز کا محل استعمال، قوی و اسباب کے لحاظ سے نتائج کا آخری فیصلہ خدا ہی پر ہو سکتا ہے دوسری تمام قوتیں وہاں بیکار ہیں۔”

جب ہماری موت و حیات اور ان کے تمام درمیانی مراحل وابستہ ہیں اسی یگانہ و تہوار کے ساتھ، پھر یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ ہم اس کے قانون سے اپنے آپ کو آزاد کرالیں، بلکہ کسی نہ کسی شکل میں اس کی پابندی کرنی پڑے گی۔ گزشتہ تین رکوع میں اس مسئلہ کو واضح کر دیا گیا کہ ہر انسان کو قانون الہی تسلیم کرنا ضروری ہے اور اس سے مفرکی کوئی صورت نہیں۔ آئندہ حضرت آدم کا قصہ بیان کیا جائے گا تاکہ اس مثال سے اور زیادہ وضاحت ہو اور کسی قسم کا شک و اشتباہ باقی نہ رہے۔ اس قصہ کے پڑھنے سے معلوم ہو گا کہ اللہ تعالیٰ سے تعلقات قائم کرنا وحی الہی کی پابندی اور مذہب کا اتباع انسان کا فطری جذبہ ہے، مذہب کی پیروی صرف اس لئے کرائی جاتی ہے کہ اس کے جذبات فطرت کی تکمیل و تربیت ہو، وہ حقائق و معارف جو ذاتی تجربہ کی بناء پر انسان کو صدیوں کے بعد معلوم ہوتے، وحی الہی کی معرفت چند لمحوں کے اندر جان لے۔

جنگل میں ایک شخص زخمی ہوتا ہے، کوئی نہیں جو اس کا علاج و مداوا کرے، طبی امداد و اعانت کی کوئی صورت نہیں، خود اس کی طبیعت علاج کرتی ہے اور ایک مدت کے بعد اس کا زخم مندمل ہونے لگتا ہے تا آنکہ وہ بالکل تندرست ہو جاتا ہے۔ اگر زخم لگتے ہی اسے ڈاکٹر کی دوا میسر آجاتی تو اسے اتنی تکلیف نہ برداشت کرنی پڑتی اور قلیل ترین زمانہ میں اس کا زخم اچھا ہو جاتا اور یقیناً اس کا ہر رگ و پے ڈاکٹر کا شکر گزار ہوتا کہ اتنی مصیبت سے نجات بخش دی۔

یہی حال مذہب اور انبیاء و رسل کا ہے، انسان کی فطرت خود اس بات کی متقاضی ہے کہ اپنے خالق کے ساتھ وابستہ رہے، اگر اسے اپنی طبیعت پر چھوڑ دیا جاتا تو مدت ہائے دراز کے بعد تکمیل ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کمال رافت و رحمت سے کام لے کر اس دشوار گزار راستہ کو نہایت ہی مختصر کر دیا اور انبیائے کرام کے ذریعہ اس کی تمام مشکلات آسان کر دیں۔ چنانچہ قصہ آدم سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔

گزشتہ رکوع کی آخری آیت میں فرمایا تھا کہ۔ هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ جَبِيْنًا ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۹﴾ زمین و آسمان کی تخلیق کیوں عمل میں آئی اور ان کو کس غرض کے لئے پیدا کیا گیا؟ قصہ آدم ان تمام باتوں پر روشنی ڈالے گا اور ان تمام کا حاصل یہ ہو گا کہ سب سے باغی ہو کر صرف ایک کے وفادار بن جائیں۔ اسی کا عشق دامن گیر ہو اور اسی کی محبت و شیفنگی میں مجنوں و اربابہ پیمائی ہو۔



آدم علیہ السلام

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ۚ قَالُوْۤا اَنْتَ جَعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۗ قَالَ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۵﴾

”اور جب کہا تیرے رب نے فرشتوں کو مجھ کو بنانا ہے زمین میں ایک نائب بولے کیا تو رکھے گا اس میں وہ شخص جو فساد کرے وہاں، اور کرے خون، اور ہم پڑھتے ہیں تیری خوبیاں اور یاد کرتے ہیں تیری پاک ذات کو، کہا مجھ کو معلوم ہے جو تم نہیں جانتے۔“

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو اپنے ارادہ سے اطلاع دی کہ میں اس زمین میں اپنا ایک نائب بھیجنا چاہتا ہوں، جو نوع انسانی کی سعادت و ہدایت کے لئے خاص ذمہ دار حکومت قائم کرے، میری عدالت کو دنیا میں نافذ کرے، ظلم و جور، طغیان و سرکشی اور ضلالت و گمراہی سے میری زمین پاک ہو، میرا وہ ہمہ گیر قانون عدل جو تمام کائنات ہستی میں سورج سے لے کر زمین کے ذرات تک قائم ہے، زمین کے گوشے گوشے اور چپے چپے میں جاری و ساری ہو اور کرۂ ارضی سعادت و امنیت کی ایک بہشت زار بن جائے۔

آدم مختلف عناصر و اجزائے ارضی سے ترکیب دیئے گئے تھے، ضرور یہ تھا کہ آگے چل کر ان کی اولاد میں ان گونا گوں اجزائے ترکیبی کے اثرات و نتائج کا ظہور و برذر ہو، قبائے آدم خون کے چھینٹوں سے رنگین نظر آئی، اس لئے فرشتوں نے محض اظہار حقیقت کی غرض سے کہا کہ اس کی اولاد سے فتنہ و فساد کا اندیشہ ہے، انہیں آدم کے کمالات اور محاسن و فضائل کی اطلاع نہ تھی، اس لئے حق بجانب تھے، لیکن واقفیت ہونے پر انہیں اپنی لاعلمی کا اعتراف کرنا پڑا۔

فرشتے ہر وقت اللہ کی تسبیح و تقدیس میں مصروف رہتے ہیں، وہ اقرار کرتے ہیں کہ خدا کی ذات ناقص و دو نام سے پاک و صاف ہے، مگر ساتھ ہی اس کے جب یہ دیکھتے ہیں کہ اولاد آدم خون کی ندیاں بہا دیگی اور قتل و غارت گری کی مرتکب ہو گی تو جہاں وہ آدم کے متعلق اپنے شبہات پیش کرتے ہیں، اسی کے ساتھ اس سے بھی غافل نہیں کہ اس کی پیدائش میں کوئی حکمت مضمون ہے جو ان کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ چنانچہ ان کو یہی جواب دیا گیا کہ تخلیق آدم کی غرض و غایت سے ہم واقف ہیں اور تھوڑے سے انتظار کے بعد تم بھی جان لو گے۔

وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْتُمْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۶﴾ قَالُوْۤا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ﴿۷﴾ قَالَ یٰۤاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ؕ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ؕ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَ اَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۸﴾

اور سکھائے آدم کو نام سارے پھر وہ دکھائے فرشتوں کو، کہا بتاؤ مجھ کو نام ان کے اگر تم سچے ہو، بولے تو سب سے نرالا ہے ہم کو نہیں معلوم مگر جتنا تو ہی اصل دانا پنختہ کار، کہا اے آدم بتا دے ان کو نام ان کے، پھر جب اس نے

بتا دیے نام ان کے، کہا میں نے نہ کہا تھا تم کو مجھ کو معلوم ہیں پردے آسمان اور زمین کے اور معلوم ہے جو تم ظاہر کرو اور جو چھپاتے ہو۔

چونکہ آدم کو خلافت ارضی اور نیابت الہی کے لئے پیدا کیا گیا تھا اس لئے اسکو وہ تمام علوم و معارف سکھائے گئے، جو قانون عدل کے قیام و نفاذ، ضلالت و طغیان کے رفع و انسداد اور سعادت و امنیت عالم کے لئے ضروری و ناگزیر تھے۔ ہر چیز کی حقیقت و ماہیت، اس سے جلب منافع اور دفع مضرات کے تمام طرق کی تعلیم دی اور اس قدر قابلیت و استعداد پیدا کر دی کہ تمام اشیاء کے استعمال کے اسباب و ذرائع اور ان کے انتہائی ثمرات و نتائج معلوم کرنے کی ضرورت و احتیاج خود بخود اس کے مشکلات و موانع کو دور کر دیگی، اگر ایک شخص بھوک کی شدت سے تڑپ رہا ہے اور اتفاق سے اس نے انگو کا باغ دیکھ لیا تو خود بخود اس کے لئے راستہ تلاش کر لے گا۔

ملائکہ الرحمن کی نسبت یہ بات مشہور ہے کہ وہ تمام حوائج نفسانی سے پاک ہیں۔ کھانے پینے کی انہیں ضرورت نہیں، وہ فرمان الہی کے تابع ہیں اور ان کا طغرائے امتیاز یہ ہے کہ۔ لَا يَصْنَعُونَ اللَّهَ مَا آفَكُهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ﴿۶۵﴾ پھر ان سے یہ توقع کیسے ہو سکتی تھی کہ وہ زمین کی چیزوں کے خواص و امتیازات سے واقف ہوں گے، مگر چونکہ انہوں نے خلق آدم پر اپنا شبہ ظاہر کیا تھا اس لئے ان کے اطمینان کی خاطر اور رفع اشتباہ کے واسطے ان سے کہا گیا کہ ان اشیاء کی حقیقت و ماہیت پر روشنی ڈالو، وہ فوراً سمجھ گئے اور اپنی لاعلمی کے معترف ہوئے اور مان گئے کہ فعل الحکیم لا یخلو عن الحکمة، تو ہی ان اسرار و مصالح سے واقف ہے جو وجود آدم میں پنہاں ہیں، ہم میں یہ استعداد ہی نہیں کہ ان چیزوں کے متعلق کچھ لب کشائی کر سکیں۔

آدم کو ان میں سے ہر ایک چیز سے کام لینا تھا، اس لئے انہوں نے سب کچھ بتا دیا، اور واضح کر دیا کہ اللہ کی زمین میں نظم و نسق قائم کرنے اور اس کو الصراط المستقیم پر لانے کے لئے جس قدر عقل و دانائی، فہم و فراست اور علم و دانشمندی کی ضرورت ہے، ملائ سافل کے فرشتے اس سے یکسر محروم ہیں۔ اس فضیلت علمی کے ظاہر ہونے پر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ میں خوب جانتا تھا کہ زمین و آسمان کی تمام چیزیں کس غرض کے لئے پیدا کی گئیں ہیں، کون ان سے کام لے سکتا ہے، اور یہ بھی مجھے معلوم تھا کہ تمہاری موجودہ استعداد کتنی ہے اور آئندہ چل کر تم میں کہاں تک ترقی ہو سکتی ہے، پس ان تمام امور کو پیش نظر رکھ کر آدم کی تخلیق عمل میں آئی۔

فرشتوں کا سجدہ

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبٰلٰیۤسَ ؕ اَبٰی وَاسْتَكْبَرَ ۝۱۶ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۶﴾

اور جب ہم نے کہا فرشتوں کو سجدہ کرو آدم کو تو سجدہ میں گر پڑے مگر ابلیس نے قبول نہ کیا اور تکبر کیا اور وہ تھا منکروں میں سے۔ آپ پہلے معلوم کر چکے ہیں کہ آدم کی پیدائش اس لئے عمل میں آئی کہ وہ دنیا میں نیکی اور پاکیزگی کے قیام کا باعث بنے، اس کی وجہ سے عادل و منصف حکومت قائم ہو، زمین امن و سلامتی کا گہوارہ بن جائے، انسانوں کی گمراہیاں اور

ضلالتیں دور ہوں، لوگ تہذیب اخلاق اور اصلاح اعمال کی جانب متوجہ ہوں اور کرہ ارضی کی ہر چیز سے بہرہ اندوز ہوں۔ پس جب آدم کی تخلیق اس لئے ہوئی تو ضروری تھا کہ تمام فرشتوں کو اس کا مطیع و فرماں بردار بنادیا جاتا، اس کے احکام و اودا مر کے آگے ان کی گردنیں جھک جاتیں تاکہ وہ قلوب بنی آدم میں نیکی اور طہارت کی تحریک کریں، وحی الہی کو لبیک کہنے اور انبیاء و رسل کی تعلیم کے آگے سر نیاز خم کرنے کے لئے ان کو تیار کریں، اس طرح آدم کی راہ میں جو مشکلات و موانع ہوں ان کے دور کرنے میں اس کے معین و مددگار بنیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو اطاعت آدم کا حکم دیا، انہیں اب کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہ تھی۔

آفتاب آمد دلیل آفتاب

گر دلیلے باید ازوے رخ متاب

اس کی فضیلت علمی کا اقرار وہ پہلے کر چکے ہیں، اس حکم کے سنتے ہی ان کی گردنیں آدم کے آگے جھک گئیں اور گویا زبان حال سے اس امر کا عہد و میثاق کیا کہ وہ کبھی اس سے منحرف نہ ہوں گے اور ہمیشہ اس کے تابع فرمان رہیں گے۔ ابلیس نے آدم کی اطاعت و انقیاد سے صاف انکار کر دیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ فرشتہ تھا، لیکن قرآن حکیم صاف اعلان کرتا ہے کہ اس کو فرشتوں سے کوئی تعلق نہیں بلکہ۔ **كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ** (۵۰: ۱۸) وہ جنات کے گردہ سے تھا۔ دوسری جگہ آیا۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَبِينًا ثُمَّ يَقُولُ لِلْمَلَكَةِ أَهْلُ لَاءِ إِيَّاكُمْ كَانُوا يَعْبُدُونَ ﴿٥٠﴾ قَالُوا سُبْحَنَكَ أَنْتَ وَلَيْتُنَا مِنْ دُونِهِمْ  
بَلْ كَانُوا يَعْبُدُونَ الْجِنَّ أَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُؤْمِنُونَ ﴿٥١﴾ (۴۰، ۴۱: ۳۴)

“اور جب کہ خدا سب لوگوں کو جمع کئے پیچھے فرشتوں سے پوچھے گا کہ کیا یہ آدم زاد تمہاری ہی پرستش کیا کرتے تھے، وہ عرض کریں گے کہ خدا یا تو پاک ہے، ہم کو تجھ سے سروکار ہے نہ ان سے، ہماری نہیں بلکہ یہ لوگ شیاطین کی پرستش کیا کرتے تھے اکثر ان میں انہیں کی معتقدہ تھے۔ پھر ایک جگہ کہا:

أَفَتَتَّخِذُونَ ذُرِّيَّتَهُ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِي ﴿٥٠﴾ (۵۰: ۱۸)

“تو لوگو! کیا ہم کو چھوڑ کر ابلیس کو اور اس کی نسل کو اپنا دوست بناتے ہو۔”

حالانکہ فرشتگان خداوندی کے لئے کسی نے بھی آج تک اولاد ثابت نہیں کی، اولاد ہمیشہ مرد و عورت کے اختلاط و امتزاج سے پیدا ہوتی ہے اور فرشتے اس سے پاک ہیں، لوگ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے اس کا صاف صاف انکار کیا اور فرمایا: **وَجَعَلُوا الْمَلَكَةَ الَّذِينَ هُمْ عَبْدُ الرَّحْمَنِ إِنَّكَ** (۱۸: ۳۴) پھر فرشتوں کی خصوصیت کبریٰ یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ طہارت و پاکیزگی اور نیکی و معصومیت کے پیکر ہیں: **لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ** ﴿٦٥﴾ (۶۵: ۶۵) لیکن ابلیس کا جہاں ذکر آیا تہر دو سر کشی اور طغیان و ضلالت کے ساتھ آیا۔ پس یہ بات صاف ہو گئی کہ ابلیس ایک جداگانہ مخلوق ہے جو فرشتوں کی بجز مستقیم مخالف ہے۔ جس کی رگ و پے میں عصیان و عدوان سرایت کئے ہوئے ہے۔ اس سے

اطاعت و فرماں برداری کی توقع رکھنا بھی فضول ہے، اس لئے جس وقت اس کو سجدہ کے لئے کہا گیا، وہ فوراً بول اٹھا: عَاشَجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِينًا ﴿۱۷﴾ (۱۷: ۶۱) دوسری جگہ اور زیادہ تفصیل آئی ہے، جب اس نے سجدہ سے انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

أَمْنَعَكَ إِلَّا تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ ۚ قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِنْهُ ۖ خَلَقْتَنِي مِنْ نَارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ ﴿۱۸﴾ (۱۸: ۷۶)

”جب ہم نے تجھ کو حکم دیا تو آدم کے آگے جھکنے سے، تجھ کو کون سی چیز مانع ہوئی؟ وہ بولا میں اس سے بہتر ہوں، کیونکہ مجھ کو تو نے آگ سے پیدا کیا اور اس کو خاک سے پیدا کیا۔“

گویا انکار کی اصلی وجہ اس کا غرور باطل تھا کہ وہ اپنے آپ کو آدم سے بہتر خیال کرتا تھا، مگر اللہ تعالیٰ کو یہ استکبار کبھی پسند نہیں آسکتا، چنانچہ اس کبر و نخوت کا نتیجہ یہ ہوا کہ لعنت کا طوق ہمیشہ کے لئے اس کی گردن میں ڈالا گیا۔

## آدم کی جنت

وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۚ وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ ﴿۲۰﴾

”اور کہا ہم نے اے آدم! بس تو اور تیری عورت جنت میں رہ اور کھاؤ اس میں محفوظ ہو کر جس جگہ چاہو اور نزدیک نہ جاؤ اس درخت کے، پھر تم بے انصاف ہو گے۔“

کتاب و سنت میں بحث و نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایسا علم بھی موجود ہے جس کی ترکیب جسمانیات سے نہیں ہے، اس کو نہ تواجزائے ارضی سے کوئی تعلق ہے اور نہ وہاں عناصر کا سلسلہ چل سکتا ہے، وہ یکسر روحانیت ہی ہے، تمام وہ حقائق جو ہمارے روزمرہ کے محاورے میں صرف معانی تک محدود ہیں، اس عالم میں ان کا وجود بھی ہے جو صفات و محضات کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ مثلاً رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

بینا انا نائم رایت الناس یعرضون علی، وعلیہم قبص، منها ما یبدخ الشدی، منها ما دون ذلك وعرض علی عربین الخطاب، وعلیہ قبص بجرۃ، قالوا فبا اولت ذلك یا رسول الله، قال الدین،۔

”خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ لوگوں کو میرے سامنے پیش کیا جا رہا ہے، وہ قمیص پہنے ہوئے ہیں مگر کسی کا قمیص تو سینہ تک ہے اور کسی کا اس سے نیچے اتنے میں عمر کی باری آئی تو ان کا قمیص اتنا لمبا تھا کہ پھینچے جا رہے تھے۔ صحابہ نے یہ عرض کیا، یا رسول اللہ ﷺ! اس کی تعبیر کیا ہے آپ نے فرمایا: ”دین۔“ دوسرے موقع پر یوں کہا:

سبعت رسول اللہ ﷺ یقول بینا انا نائم اتیت بقدر لبن، فشربت حتی انی لاری الی یخرجنی اظفاری ثم اعطیت فضلی عربین الخطاب، قالوا فبا اولته یا رسول الله! قال العلم۔

”میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ فرماتے تھے کہ میں سو رہا تھا کہ میرے پاس دودھ کا پیالہ لایا گیا، میں نے اتنا سیر ہو کر پیا کہ اس کی ترو تازگی میرے ناخنوں سے ظاہر ہونے لگی پھر بقیہ دودھ عمر کے حوالہ کر دیا۔ صحابہ نے عرض کیا

یا رسول اللہ اس کی تاویل کیا ہے؟ فرمایا: علم۔“

عوام الناس کے نزدیک دینداری اور علم و فضل کی حقیقت معانی کی سوا اور کچھ نہیں، مگر اس عالم میں ان کے وجود ہیں، اسی قسم کے اور صدہا احادیث ملیں گی، جن میں اس موضوع پر اور زیادہ روشنی ڈالی گئی ہے، حکمائے اسلام کی اصطلاح میں اسے عالم مثال کہتے ہیں۔ عالم مثال آثار و علائم اور نتائج و ثمرات کے اعتبار سے عالم اجسام سے کہیں زیادہ قوی ہوتا ہے اور اس کا دائرہ عمل بھی اثر و نفوذ کے لحاظ سے نہایت ہی وسیع ہوتا ہے۔

آدم کو جس جنت میں رہنے کا حکم دیا گیا ظاہر ہے کہ وہ حقیقی جنت نہیں ہو سکتی، اس لئے کہ قرآن حکیم کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں داخل ہونے کے بعد پھر نکلنا نہ ہو گا، بلکہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

لَا يَسْأَلُهُمْ فِيهَا نَصَبٌ وَمَا هُمْ مِنْهَا بِمُخْرِجِينَ ﴿١٥﴾ (۲۸:۱۵)

”ان کو بہشت میں کسی طرح کی تکلیف چھوئے گی بھی تو نہیں اور نہ یہ کبھی بہشت سے نکالے جائیں گے۔“

وہم فیہا خالدون بھی اسی کی ایک خصوصیت بیان کی گئی ہے، تو ضرور ہے کہ زمین ہی کا ایک ٹکڑا اس غرض کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہو، جس میں قوائے مثالیہ کے ذریعہ جنت کے آثار و محضات پیدا کر دیئے گئے ہوں۔ یہ ظاہر ہے کہ آدم خلافت ارضی کے لئے خلق ہوئے تھے، پھر اس حقیقی جنت میں کیسے رہ سکتے تھے، اس جنت ارضی میں بھی انہیں صرف اس لئے عارضی طور پر رکھا گیا تھا کہ ان کی قوتیں نشو و نما حاصل کر لیں اور زمین میں کام کرنے کے قابل ہو جائیں۔ ان کی مثال اس بچہ کی سی ہے جو ابھی ماں کی گود میں ہے، کچھ مدت تک اس کا صرف دودھ پر گزارہ ہے کہ کھانے کی قابلیت اس میں پیدا ہو۔ جس طرح بچہ ہمیشہ کے لئے ماں کا دودھ نہیں پی سکتا، اسی طرح آدم دائمی طور پر اس جنت میں نہیں رہ سکتے، بلکہ جس وقت ان میں محنت و مشقت کی استعداد پیدا ہو جائے گی فوراً وہاں سے نکال دے جائیں گے۔

مگر انہیں ایک درخت کے قریب جانے سے روک دیا گیا، مفسرین کرام نے اس درخت کی حقیقت و ماہیت پر بہت کچھ لکھا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ تمام و کمال و جولانی طبع کے سوا اور کچھ نہیں۔ کتاب و سنت سے اس بات کا پتہ نہیں لگا کہ وہ درخت کونسا تھا، پھر جب ناموس الہی اور لسان نبوت نے خاموشی اختیار کی تو ہمیں فلسفیانہ موٹکافیاں کرنے کا کیا حق حاصل ہے، البتہ اس درخت کی مثال اس کڑوی دوا سے دی جاسکتی ہے جو ماں اپنے پستان پر اس لئے لگا لیتی ہے کہ بچہ دودھ پینا چھوڑ دے اور ساتھ ہی اس کی محبت بھی والدین کے ساتھ بدستور قائم رہے۔ والدہ بچہ کو اس کے قریب جانے سے روک دیتی ہے، مگر جب وہ نہیں مانتا اور اسے منہ لگائی دیتا ہے تو آخر اس کا کڑوا پن اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے دودھ ترک کر دے۔ یہی کیفیت آدم کے متعلق نظر آتی ہے، انہیں روک دیا جاتا ہے کہ اس کے قریب بھی نہ جانا، ورنہ اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

فَاَزَلَهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ ۚ وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ

مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِينٍ ﴿٢٠﴾

”پھر پھسلا دیا ان کو شیطان نے اس سے، پھر نکالا ان کو وہاں سے جس آرام میں تھے اور کہا ہم نے تم سب اترو ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تم کو زمین میں ٹھہرنا ہے اور کام چلانا ایک وقت تک۔ آدم ایک مدت تک وہاں رہے تا آنکہ ان کے نکلنے کا زمانہ آگیا، دوسری جگہ آتا ہے کہ:

وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ مِنْ قَبْلِ فَنَسَىٰ وَلَمْ نُجِدْ لَهُ عَزْمًا ﴿۲۰﴾ (۱۱۴:۲۰)

”اور ہم نے اگلے زمانے میں آدم سے درخت کی نہ کھانے کا ایک عہد دیا تھا تو آدم اس کو بھول گئے اور ہم نے ان کے ارادے میں استقلال نہ پایا۔“

درخت کا کھانا تھا کہ جنت ارضی کی تمام نعمتیں یک قلم مفقود ہو گئیں۔ اس کے تمام اثرات و علائم جاتے رہے اور وہ زمین کا ایک معمولی ٹکڑا رہ گیا۔ جنت کی سر زمین حوائج انسانی سے بالکل پاک ہے۔ سورہ ط میں ہے۔

إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ ﴿۲۱﴾ وَأَنَّكَ لَا تَظْمَأُ فِيهَا وَلَا تَصْحَىٰ ﴿۲۲﴾ (۱۸:۱۹، ۲۰)

”یہاں بہشت میں تو تم کو ایسے مزے ہیں کہ نہ تم بھوکے رہتے ہو اور نہ ننگے رہتے ہو اور نیز یہ کہ یہاں نہ تم پیاسے رہتے ہو اور نہ دھوپ میں رہتے ہو۔“

جس وقت انہوں نے پھل کھایا اور پیشاب پاخانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس کے لئے کوئی مناسب مقام تلاش کرنے لگے، مگر وہ تو تمام سامان عارضی تھا، اب جبکہ وہ کام کرنے کے قابل ہو گئے تو ان سے سب کچھ چھین لیا گیا۔

فَبَدَّلَ لَهُمَا سَوَآتِهِمَا وَطَفَقَا يَخْصِفْنَ عَلَيْهِمَا مِنْ ذَرِّ الْجَنَّةِ (۲۰:۱۲۱)

”تو اپنی اپنی پردے کی چیزیں ان پر ظاہر ہو گئیں اور لگے باغ بہشت کے پتے اپنے اوپر چپکانے۔“

چونکہ یہ پہلے سے طے شدہ بات تھی کہ آدم ہمیشہ کے لئے اس جنت ارضی میں نہیں رہ سکتے۔ شجرہ ممنوعہ کو ان کے اخراج کا ایک سبب قرار دیا گیا، اس لئے اس کے پھل کا کھانا تھا کہ انہیں وہاں سے نکلنے کا حکم صادر کر دیا گیا۔ ”ہبط“ کے لفظ سے بعض ارباب علم کو یہ شبہ ہوا ہے کہ آدم کی جنت ضرور آسمانوں پر ہوگی، کیونکہ ہبوط کے معنی اوپر سے نیچے آنے کے ہیں۔ قرآن نے بنی اسرائیل کے لئے یہی لفظ استعمال کیا، اِهْبِطُوا مِصْرًا (۶۱:۲) وہاں سب کا اتفاق ہے کہ اس جگہ نقل مکان کے معنی میں یہ لفظ آیا ہے۔ تکلیف و مصیبت میں مبتلا ہونے کو بھی کہتے ہیں۔ پس یہاں بھی ہبوط آدم کے یہی معنی ہیں کہ ان کو جنت ارضی سے نکال کر دوسری زمین میں رہنے کا حکم دیا گیا۔

جنت سے نکلنے کا باعث ابلیس ہوا، اس سے پہلے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ ابلیس کی لعنت کا سبب آدم تھے، اس لئے اب قدرتی طور پر دونوں میں بغض و عداوت کا بیج بویا گیا اور وہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔ دوسری جگہ آتا ہے:

فَقُلْنَا يَا آدَمُ إِنَّ هَذَا عَدُوٌّ لَكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا تَخْرُجْ جَنَّتَيْهِمَا مِنْهُمَا فَنَفْسُكُمَا فِيهَا ﴿۲۲﴾ (۱۱۷:۲۰)

”تو ہم نے آدم سے کہا کہ آدم! یہ ابلیس تمہارا اور تمہاری بی بی کا دشمن ہے۔ تو ایسا نہ ہو کہ تم دونوں کو بہشت سے نکلوا

باہر کرے اور تمہاری شامت آجائے۔

پھر دائمی طور پر فرزند ان آدم کو ان الفاظ میں تنبیہ کر دی۔

يٰۤاٰدَمُ لَا يَفْتِنَنَّكَ الشَّيْطٰنُ كَمَا اَخْرَجَكَ اَبُوۡنُكُم مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا ۚ اِنَّهٗ يَرٰكُمۡ  
هُوَ وَقَبِيْلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ؕ (۷:۲۷)

”اے بنی آدم، کہیں شیطان تم کو راہ خدا سے بہکانہ دے، جس طرح کہ اس نے تمہارے والدین کو بہشت سے نکلوا یا کہ

لگا ان کا لباس اب ان سے اتروانے، تاکہ ان کے پردہ کرنے کی چیزیں ان پر ظاہر کر دے، غرض اغوائے شیطان سے

بچتے رہو، کیونکہ وہ اور اس کی ذریات تم کو ادھر سے دیکھتے رہتے ہیں، جدھر سے تم ان کو نہیں دیکھتے۔“

جس وقت حضرت آدم علیہ السلام وہاں سے نکال دیئے گئے انہیں ایک دائمی قانون کی طرف متوجہ کر دیا اور وہ دستور العمل یہ تھا کہ دنیا دار العمل ہے، کوئی شخص یہاں قتل و بیکاری کی زندگی بسر کرنے کے لئے نہیں پیدا کیا گیا، بلکہ ہر ایک کو محنت و مشقت کرنی پڑے گی۔ اسی سے وہ کمالات و فضائل حاصل کرے گا، اسی پر اس کی فلاح و کامرانی کا دار و مدار ہوگا، جہاں اس نے عیش و آرام کا خیال کیا، تباہ و برباد ہو جائے گا اور کبھی اسے کامیابی نصیب نہ ہوگی، سورہ بلد میں فرمایا: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ ﴿۹۰﴾ (۳:۹۰)

## نزول الہام

فَتَلَكَّمِۦۭ اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ فَكَلِمَتٍ فَاَتٰهُ الْوَحْيُ ۚ اِنَّهٗ هُوَ السَّوَابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۵﴾

”پھر سیکھ لیں آدم نے اپنے رب سے کئی باتیں، پھر متوجہ ہوا اس پر، بیشک وہی معاف کرنیوالا مہربان ہے۔“

جنت سے نکلنے کے بعد آدم مدت ہائے دراز تک پریشان خاطر رہے، انہیں رہ رہ کے وہاں کی نعمتیں یاد آتی تھیں، ہر وقت مضطرب رہتے، اپنے عزم و استقلال کی حقیقت ان پر واضح ہو گئی تھی۔ حیران تھے کہ وہی اطمینان قلب پھر نصیب ہو۔ ویسے ہی عیش و طرب کی زندگی ہو اور اسی آرام کے ساتھ دن کشیں، مگر کوئی صورت سمجھ میں نہ آتی تھی تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی لطف و نوازش سے کام لیا اور انہیں چند کلمات الہام کئے جو ان کے اطمینان و سرور کا باعث ہوئے، وہ کلمات دوسری جگہ ذکر کئے گئے ہیں۔ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا ۖ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۷۷﴾ (۲۳:۷۷)

فَلَمَّا يَآئِيْتِيْكُمْ مِّمَّنْ هٰۤؤُلَآءِ فَبَنِّ تَبِعْ هٰۤؤُلَآءِ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۸۰﴾

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا وَكَذَّبُوْا بِآٰتِنَا ۖ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾

”ہم نے کہا تم اترو یہاں سے سب، پھر کبھی پہنچے تمہارے پاس میری جانب سے ہدایت، تو جو کوئی چلا میری ہدایت پر

نہ ڈر ہو گا ان کو اور نہ غم اور جو منکر ہوئے اور انہوں نے ہماری نشانیوں کی تکذیب کی، وہ ہیں دوزخ کے لوگ، اسی

میں رہیں گے۔“



چونکہ آدم علیہ السلام کے اطمینان قلب کا باعث وہی کلمات تھے جو اللہ کی جانب سے الہام کئے گئے تھے، اس لئے آئندہ کے لئے یہی قاعدہ کلیہ بنادیا گیا کہ انسانوں کے عزم و ارادہ ہمیں قوت و طاقت پیدا کرنے، فطرت اصلیہ کو خارجی اثرات ضلالت سے بچانے، اللہ کے حضور میں قلب سلیم کے ساتھ حاضر ہونے کے لئے، اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء و رسل کو مبعوث کیا کرے گا، ان صحائف و اسفار آسمانی پر ایمان لانا ہر انسان کا فرض ہو گا جو ان پیغمبروں پر نازل ہوں گے اور جن الہامات کا مقصد ہی یہی ہو گا کہ اس کے اندر جذبات صادقہ کی تولید ہو، دعا کو بہترین وسیلہ فلاح و کامرانی خیال کرے اور خالق و مخلوق کے تعلقات و روابط میں کسی قسم کی کدورت نہ پیدا ہو۔ اسی موضوع پر دوسری جگہ ان الفاظ میں روشنی ڈالی:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا بَالِغُنَاكُمْ فَاِذَا بَلَغْنَا لَكُمْ اُكْلًا لِّمَا كُنْتُمْ عَلَىٰ فِتْنَةٍ مِّنْكُمْ فَاَصْلَحْ وَلَا تَخْوَفْ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ  
 (۳۵:۳۶) ۴ ۵ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۶

”اے بنی آدم! جب تکھی تم ہی میں سے ہمارے پیغمبر تمہارے پاس پہنچیں ماورے ہمارے احکام تم کو پڑھ کر سنائیں تو ان کا کہا مان لینا، کیونکہ جو شخص ان کے کہنے کے مطابق پرہیز گاری اختیار کرے گا اور اپنی حالت کی اصلاح کرے گا تو ان پر نہ تو خوف طاری ہو گا اور نہ وہ آزرہ خاطر ہوں گے اور جو لوگ ہماری آیتوں کو جھٹلائیں گے اور ان سے انکار بیٹھیں گے، وہی دوزخی ہوں گے کہ وہ دوزخ میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔“

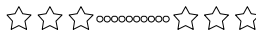
پھر دوسرے موقع پر یوں ارشاد ہوا:

فَاِذَا بَلَغْنَا لَكُمْ مَعِي ۙ هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هٰذَا يَفْلَاحْ وَلَا يَضِلْ ۚ وَلَا يَشْقٰ ۙ ۶ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذٰلِكَ فَاِنَّ لَهُۥ مَعِيشَةً  
 ضَنْكًا ۚ وَنَحْشُرُ لَآيَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰی ۷ (۱۲۳:۱۲۴)

”پھر اگر تمہارے پاس ہماری طرف سے ہدایت آئے تو جو ہماری ہدایت پر چلے گا، نہ راہ راست سے ہٹے گا اور نہ ہلاکت میں پڑے گا اور جس نے ہماری یاد سے روگردانی کی، تو اس کی زندگی ضیق میں گزرے گی اور قیامت کے دن بھی ہم اس کو اندھا کر کے اٹھائیں گے۔“

یہاں تک باب اوّل کی بحث ختم ہو جاتی ہے۔ اس میں یہ مسئلہ صاف کر دیا گیا کہ مذہب انسان کی فطرت میں داخل ہے اور اس لئے وہ مجبور ہے کہ ناموس الہی کے آگے اپنی گردن جھکا دے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اس کو اور زیادہ وضاحت سے صاف کر دیا کہ وہ برابر پریشان و مضطرب پھرتے رہے، تاکہ ان کے وحی الہی نے چند کلمات الہام کئے جو ان کے اطمینان قلب اور دلچسپی کا باعث بنے۔

پس قصہ آدم نے اس دعویٰ پر مہر لگادی کہ دنیا میں انسان کو سکینہ و اطمینان صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو وحی الہی کا پابند بنائے، ورنہ اس کے بغیر اس کی زندگی بالکل بیکار ہو جائے گی۔





## باب نمبر ۲

## قرآن حکیم کی ضرورت

گذشتہ آیات میں مطلق وحی کی ضرورت پر بحث کی گئی ہے اور یہ بتا گیا ہے کہ انسانی زندگی کے بقاء و قیام کے لئے الہام الہی کا نزول اتنا ہی ضروری ہے، جیسا کھیتی کے لئے سورج کی روشنی، جسم کی حفظ و صیانت کے لئے طب و ڈاکٹری اور حیات انفرادی کے لئے ہوا۔ پس جس طرح ان میں سے ہر ایک چیز اس درجہ ضروری اور لازمی ہے کہ ایک لمحہ کے لئے بھی انسان ان سے بے نیاز نہیں ہو سکتا، ایسے ہی روح کی تکمیل و تربیت جذبات صادقہ کی نشست و تولید اور اخلاق فاضلہ کی تہذیب و شائستگی کے لئے الہام کی ضرورت ہے، مذہب، اس کا داعیہ فطرت ہے، پس اس کے لوازمات کی فراہمی بھی الزم اللوازم۔ الہام الہی نے ہر زمانہ میں اس کی ضروریات و مقتضیات کے اعتبار سے مختلف اشکال و صورت اختیار کئے۔ جزئیات میں گو اختلاف رہا ہو، لیکن اصول و کلیات میں ہمیشہ اتحاد رہا۔ تمام صحائف و اسفار آسمانی کے اور اق کو دیکھ جائیے، اساس و بنیاد سب کی ایک ہی ہوگی اور ایک ہی حقیقت کی طرف سب کی دعوت ہوگی۔ اس لئے کہ سچائی ہمیشہ سے ایک ہی ہے اور ایک ہی رہے گی۔ آپ اپنی سہولت و آسانی کے لئے اس کے مختلف نام رکھ لیجئے، مگر مسمی تو وہی ہے۔

عبار اتنا شقی وحسند واحد  
وکل ان ذالک الجبال لیشیر

کبھی وحی الہی نے نوح کو اس وادی کا رہ نور دیا اور کبھی اس نے حجاز کی وادیوں میں ابراہیم و اسمعیل کو نوازا۔ اسرائیل کے گھرانے پر نظر ڈالی تو ایک آگ کی تلاش میں نکلنے والے کو اپنا والہ و شیفہ بنا لیا اور کبھی ناصرہ کے ایک نوجوان کو اپنی آواز کے لئے چن لیا، تا آنکہ وادی بطحا کی قسمت جاگ اٹھی۔ غار حرا میں ایک یتیم سربہ زانو معتکف تھا۔ رحمت کے محافظ فرشتے اس کے ارد گرد صف بستہ تھے، تمام دنیا خواب غفلت میں تھی، مگر وہ بیدار اور سر بسجود تھا کہ خداوند گویا ہو۔ ایک انسان کے منہ میں اپنا کلام ڈالا اور دنیا کے لئے امن و سلامتی کا پیغام نازل کیا: ”خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا۔ فاران کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا، دس ہزار قد و سیویں کے ساتھ آیا اور اس کی داہنے ہاتھ ایک آتشیں شریعت ان کے لئے تھی، وہاں وہ اس قوم سے بڑی محبت رکھتا ہے۔ اس کے سارے مقدس تیرے ہاتھ میں ہیں اور وہ تیرے قدموں کے نزدیک بیٹھے ہیں۔“ (کتاب الاستثناء ۲: ۲۰۳۳)

اگرچہ الہام کی مختلف صورتیں رہیں، مگر سب سے آخری اور مکمل ترین شکل میں جو وحی نازل ہوئی، وہ قرآن ہی ہے اور اب جبکہ یہ مسئلہ صاف کر دیا گیا کہ ہر انسان کو الہام الہی کا اتباع کرنا ضروری ہے، تو یہ بات خود بخود معلوم ہو گئی کہ اس زمانہ میں چونکہ وہ الہام قرآن حکیم کے اوراق میں مسطور ہے، اس لئے اس کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنانا لازمی ہے۔ مگر اس کی وہ لوگ مخالفت کرتے ہیں جن کے پاس پہلی کتابیں موجود ہیں اور اسلام کی راہ ترقی میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں، اس لئے قرآن مجبور ہے کہ ان اقوام و امم کی خرابیاں ذکر کرے، تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ ان میں سے ایک قوم بھی اس مقدس فرض کے قابل نہیں رہی۔ مذاہب تو بہت کثرت سے ہیں، مگر ان سب میں زیادہ قابل اعتناء یہودیت ہے جو اپنے آپ کو ابراہیم و اسمعیل کی طرف منسوب کرتی ہے اور جس کے اتباع خیال کرتے ہیں کہ جنت کے اجارہ دار یہی لوگ ہیں۔ اس لئے سورہ بقرہ میں سب سے پہلے اسی قوم کو مخاطب کیا گیا، کہ عیسائی دراصل انہیں کی ایک مہذب شاخ سے وابستہ ہیں جن کا ذکر آل عمران میں آئے گا۔

قرآن کی ضرورت ثابت کرنے سے قبل یہودیوں کی انفرادی و اجتماعی خرابیوں پر بحث کی جائے گی، پھر ان کے مختلف طبقات امت کے سوانح و حالات کی تنقیح ہوگی۔ ان کی مذہبی کمزوریوں اور اخلاقی فروگزاشتوں کو واضح کیا جائے گا اور اس تمام بحث و مذاکرہ کا اصل مقصد یہ ہوگا کہ ان لوگوں نے اس درجہ اپنے قلب کو زنگ آلود کر لیا ہے اور اس قدر بد اخلاقیوں کا ارتکاب کیا ہے کہ اب ان کی ہدایت کی تمام راہیں بند ہو گئی ہیں۔ اللہ کی رحمت سے بہت دور چاڑھے ہیں اور غضب الہی نے ان کی حیات قومی کے شیرازہ کو منتشر کر دیا ہے۔ تبلیغ و دعوت کے فرض سے ان کا کوئی سروکار نہیں اور نبوت اسرائیل کے خاندان سے منتقل ہو کر اسمعیل کے گھرانہ میں آ گئی ہے۔

اگلے رکوع میں یہودیوں کی خرابیوں پر ایک اجمالی نظر ڈالی جائے گی، بعد ازاں اسی اجمال کی تفصیل ہوگی۔

## علمی خرابی

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنْعَمُوْا عَلٰىكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِكُمْ وَاٰيٰتِيْ فَآذِهْبُوْنَ ۝

“اے نبی اسرائیل! یاد کرو احسان میرا جو میں نے کیا تم پر اور پورا کرو اقرار میرا، میں پورا کروں گا اقرار تمہارا اور میرا ہی ڈر رکھو۔

نبی اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کو کہتے ہیں، کیونکہ ان کا دوسرا نام اسرائیل (عبد اللہ) بھی ہے۔ قرآن حکیم ان کی خرابیاں ذکر کرنے سے قبل تذکیر بالاء اللہ کے ذریعہ سے ان کے اندر حس و بیداری پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ایک شریف انسان کی تنبیہ کے لئے صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہوتا ہے کہ تم شریف زادے ہو۔ چنانچہ اس آیت میں بھی انہیں بتایا گیا کہ تمہارے آباء کرام وہ لوگ تھے جن پر ہر قسم کی نعمتیں نازل ہوئیں، ان کو نبوت سے سرفراز کیا گیا، حکومت نوازش کی گئی اور یہی سب سے بڑے نعمت ہے کہ کسی امت کو ایسے اعلیٰ ترین عقائد و اخلاق کی تعلیم دی جائے کہ

ان کا لازمی اور قطعی نتیجہ حکومت و جہانداری ہو۔ چنانچہ دوسرے موقع پر اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا:

وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ يُقَوْمُوا لَكُمْ إِلَهُكُمْ إِذْ جَعَلَ آيَاتِكُمْ آيَاتِهِ وَجَعَلَكُمْ مِلَّةً وَآيَاتِكُمْ مِثْلَ بُيُوتٍ  
أَحَدًا مِنَ الْعَالَمِينَ ﴿٢٠:٥﴾

”جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ بھائیو! اللہ نے جو تم پر احسانات کئے ہیں، ان کو یاد کرو کہ اس نے تم میں پیغمبر بنائے اور تم کو بادشاہ بھی بنایا اور تم کو وہ نعمتیں دیں جو دنیا جہان کے لوگوں میں کسی کو نہیں دیں۔“

گویا اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو روحانی اور جسمانی دونوں بادشاہتیں نوازش کیں، پھر ایسے لوگوں کے لئے تو یہ کبھی بھی جائز نہیں ہو سکتا کہ وہ اللہ کی غلامی کو چھوڑ کر انسان کو اپنا رب بنالیں۔

اس قدر تذکیر و موعظت کے بعد ان سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اس عہد کی پابندی کریں جو انہوں نے خدا کے ساتھ کیا تھا، اس ایفاء عہد کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اللہ بھی اپنے وعدے کو پورا کرے گا جو ان سے کیا تھا، گویا اس آیت میں دو عہدوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک عہد بنی اسرائیل کا اللہ تعالیٰ سے اور دوسرا اللہ تعالیٰ کا ان سے۔ یہ دونوں کے دونوں عہد حسب ذیل ہیں:

”تو نے آج کے دن اقرار کیا ہے کہ خداوند میرا خدا ہے اور میں اس کی راہوں پر چلوں گا اور اس کے شرعوں اور اس کے حقوق اور اس کے حکموں کی محافظت کروں گا اور اس کی آواز کا شنوا ہوں گا اور خداوند نے بھی آج کے دن تجھ سے اقرار فرمایا، جیسا اس نے تجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تو اس کے خاص گروہ ہوئے اور تو اس کے سب احکام کی محافظت کرے اور تجھے سارے گروہوں سے جنہیں اس نے پیدا کیا صفت اور نام اور عزت میں زیادہ بالا کرے اور خداوند اپنے خدا کی مقدس گروہ ہوئے جیسا اس نے کہا۔“ (کتاب استثناء ۹۱، ۸۱، ۷۱: ۶۲)

خداوند کی آواز کو نہی ہے، یہی کتاب ان الفاظ میں اس پر روشنی ڈالتی ہے ”میں ان کے لئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا، وہ سب ان سے کہے گا اور ایسا ہو گا کہ جو کوئی میری باتوں کو، جنہیں وہ میرا نام لے کے کہے گا، نہ سنے گا تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا“ (کتاب استثناء ۹۱، ۸۱، ۷۱)

بنی اسرائیل سے اب بھی یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ اگر وہ اپنے عہد کی پابندی کریں۔ خداوند کی آواز کے شنوا ہوں اور قرآن حکیم پر ایمان لے آئیں، تو پھر وہ ایسی قوم بنادیئے جائیں گے جو صفت، نام اور عزت میں زیادہ بالا ہوگی۔

جب مذہبی جماعت کی عزت و حرمت کا اصلی سبب اللہ تعالیٰ کا نام ہے اور اسی لئے لوگ اس کو اکرام و احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں، تو اس کے لئے کبھی یہ جائز نہیں ہو سکتا کہ وہ غیر اللہ سے بھی ڈرے، بلکہ اسے فقط ایک ہی ذات کا خوف اپنے دل میں رکھنا چاہئے۔ ایک دل میں دو ڈر کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔ قَالَ اللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَوْهُ إِنَّ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿٩: ١٣﴾ اس سے بڑھ کر اس جماعت کی اور کیا ذلت ہو سکتی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی دوسری قوت بھی اس کو اپنے فرائض ادا کرنے سے روک سکتی ہے۔

وَامِنُوا بِمَا آتَيْنَاكُمْ مَصَدَّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُونُوا اَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ ۚ وَلَا تَشْتَكُوا بِالْحَقِّ شَيْئًا قَلِيلًا ۝ وَاَيُّهَا فَاتَّقُونِ ۝

”اور مانو جو کچھ میں نے اتارا، سچ بتاتا ہے اس کو جو تمہارے پاس ہے اور تم اس کے پہلے منکر مت بنو اور میری آیتوں پر تھوڑا مول مت لو اور مجھ ہی سے بچتے رہو۔“

تصدیق کی ضرورت صرف پیشگوئیوں کے لئے محسوس ہوا کرتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ باوجود تحریفات لفظی و معنوی کے پھر بھی کتب سابقہ میں رسول اللہ ﷺ کی آمد کے متعلق پیشگوئیاں اب تک موجود ہیں۔ چنانچہ گذشتہ آیت میں ہم نے ایک پیشین گوئی کتاب استثناء سے نقل کی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے موسیٰ جیسا ایک پیغمبر بھیجا جائے گا۔ ”موسیٰ علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جتنے انبیاء و رسل مبعوث ہوئے۔ کسی نے بھی مثل موسیٰ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا، اس لئے کہ وہ سب کے سب ملت اسرائیلی کی تجدید و احیاء کے لئے بھیجے گئے تھے، بلکہ خود مسیح علیہ السلام بھی اسی انتظار میں چلے گئے، جب یوحنا بتسمہ دینے والے کے پاس یروشلم سے کاہن اور لیوی آئے اور انہوں نے آکر پوچھا کہ پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیاہ ہے؟ اس نے کہا، میں نہیں ہوں، کیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں۔“ (یوحنا ۱:۱۲)

جس وقت رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی، آپ نے اول ہی روز شیل موسیٰ ہونے کا اعلان کر دیا۔

إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْنَكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا ۝ (سورہ الزمل ۱۵)

جس طرح ہم نے فرعون کی طرف موسیٰ کو پیغمبر بنا کر بھیجا تھا، تمہاری طرف بھی محمد کو رسول بنا کر بھیجا ہے جو تمہارے مقابلے میں گواہی دیں گے۔

اس لئے بنی اسرائیل سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اس قرآن پر ایمان لے آئیں، کیونکہ اس کو مان لینے سے ان کی کتابوں کی صداقت پر مہر لگ جائے گی اور تمام دنیا کو یقین ہو جائے گا کہ صحائف آسمانی کی پیشین گوئیاں درست ثابت ہوں گی۔ مخالفت کا بیج بونے والے تم نہ بن جاؤ، کیونکہ تم مکہ، مدینہ، بنی، علیہ الہی کے قاتل، انبیاء و رسل کے سلسلہ سے واقف اور کتب سابقہ کا علم رکھنے والے ہو، تعلیم یافتہ ہو کر تمہیں انکار کی گنجائش نہیں۔ ورنہ دوسرے لوگ بھی تمہارا ہی اتباع کریں گے اور تمہارے ہی نامہ اعمال میں ان کی غلط کاری بھی لکھی جائے گی۔

یہودی عالموں نے کبھی حق کی آواز کو لبیک نہ کہا، بلکہ اپنے دنیاوی فائدوں کی خاطر برابر سچائی کو قربان کرتے رہے، حالانکہ انہیں خوب یقین تھا کہ آپ ہی وہ نبی ہیں۔ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ آبْنَاءَهُمْ ۖ (سورہ البقرہ: ۱۷۶) قرآن حکیم نے بار بار ان کی اس غلط کاری کو بیان کیا ہے کہ ایک عالم کے لئے اس سے زیادہ بد اخلاقی اور شیطنت کا تصور نہیں ہو سکتا۔ اعاذنا اللہ منہ۔

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكُنُوا الْحَقَّ وَانْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝

اور صحیح میں غلط نہ ملاؤ اور یہ کہ جان کر سچ کو چھپاؤ۔

ہر وہ چیز جو عین ضرورت کے وقت ملے، حق ہے اور ہر غیر ضروری چیز باطل، پس یہ ارباب علم و فضل کی شان سے کس درجہ گری ہوئی بات ہے کہ قوم و ملت کو جن احکام کی ضرورت ہے، ان کی طرف تو کوئی بھی توجہ نہ کرے، حالانکہ ان پر حیات قومی کا دار و مدار ہو اور ان امور پر زور دیا جائے جو فروغیات کا حکم رکھتے ہوں اور پھر اسی پر قناعت نہ ہو بلکہ حق بات جاننے کے باوجود اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی جائے، سچائی کو چھپانے کی کوشش ہمیشہ اس وقت کی جاتی ہے جب خود اس پر عمل نہ ہو۔ اس لئے لوگوں کو بھی اس سے بے خبر رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے، کیونکہ اگر انہیں صداقت کا علم ہو گیا اور انہوں نے اس پر عمل کرنا شروع کر دیا، تو یہ علما مورد طعن و تشنیع بنیں گے کہ باوجود جاننے کے اس پر عمل نہیں کرتے۔

## عملی کمزوری

گذشتہ آیات میں ان کی عملی کمزوریوں کو واضح کیا گیا ہے۔ اب ان کی عملی حالت کو بیان کیا جاتا ہے۔

وَأَقِمْوَا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ ⑤

اور قائم کرو نماز اور زکوٰۃ دیا کرو اور نماز پڑھنے والوں کے ساتھ نماز پڑھو۔

بعض لوگوں کو جان عزیز ہوتی ہے اور بعض کو مال، اس لئے ان سب کے جوش ایمان و ولولہ دینی کے امتحان کی خاطر نماز اور زکوٰۃ دونوں کو لازم کر دیا گیا اور یہ کہ سب کے ساتھ مل کر کام کرو۔

قوموں کے عروج و زوال کے جو اصلی اسباب و مراتب ہیں، ان میں بنیادی چیز یہی ہے کہ سب ایک ہو کر رہیں۔ ان کی قوتوں میں اجتماع و انضمام ہو۔ جہاں انتشار و اختلاف ہو، قوم برباد ہو جائے گی، اس لئے کہ علیحدہ ہونے کی صورت میں عوام الناس اور تعلیم یافتہ اشخاص میں بعد و ہجر کی خلیج حائل ہو جائے گی۔ تمام لوگ بغیر کسی سردار اور امیر کے رہ جائیں گے اور اہل فضل و کمال کے پاس دماغ تو ہو گا مگر دست و بازو نہ ہوں گے، کیونکہ کام کرنے والے عوام الناس ہی ہوا کرتے ہیں۔

جب کسی قوم میں تنزل و ادبار کی ابتداء ہوتی ہے تو بہترین دل و دماغ عوام سے علیحدگی اختیار کر لیتے ہیں۔ عام لوگوں کے ساتھ مل کر فرائض مذہبی ادا نہیں کرتے۔ عذر یہ پیش کرتے ہیں کہ ہم خلوت میں زیادہ اطمینان کے ساتھ کاموں کو انجام دے سکتے ہیں۔ عام لوگوں میں تہذیب نہیں ہوتی، تعلیم سے بے بہرہ ہوتے ہیں، آداب مجلس سے واقف نہیں ہوتے، اس لئے طبیعت کو سکون نصیب نہیں ہوتا۔ آخر اس عزت گزینی کی انتہا یہ ہوتی ہے کہ ان امور کو بالکل ترک کر دیتے ہیں اور ان کو غیر ضروری سمجھنے لگ جاتے ہیں۔

کفار قریش میں دستور تھا کہ ایام حج میں عوام الناس تو عرفات کے میدان سے واپس لوٹتے، مگر یہ لوگ مزدلفہ ہی سے واپس آجاتے اور اس طرح حدود حرم سے باہر جانے کی انہیں ضرورت محسوس نہ ہوتی، یہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی منتخب جماعت خیال کرتے تھے، اس لئے عرفات میں جانا پسند خاطر نہ تھا، قرآن نے انہیں حکم دیا۔

ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١٩٩﴾ (سورة البقرة: ۱۹۹)

”پھر جس جگہ سے اور لوگ چلیں تم بھی وہیں سے چلو اور اللہ سے مغفرت چاہو، اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔“

استغفار اسی لئے کرنے کا حکم دیا کہ اس علیحدگی سے تمام قوم برباد ہوتی تھی، آئندہ اس غلطی کا ارتکاب نہ ہونے پائے۔ رسول اللہ ﷺ نے اجتماعی زندگی پر سب سے زیادہ زور دیا، کہیں فرمایا من فارق الجماعة فمات ميتة جاهلية، ”جو شخص جماعت سے الگ ہوا، اور وہ اُسی حالت میں مر گیا، تو اُس کی یہ موت جاہلیت کی موت ہوئی“، ایک جگہ فرمایا علیکم بالجماعة فان الشيطان مع الفزة وهو من الاثنين ابعده، ”شیطان جماعت سے الگ نہ ہو کیونکہ جب کوئی تنہا ہوا تو شیطان اس کا ساتھی ہو گیا، دو انسان بھی مل کر رہیں تو شیطان ان سے دور ہے۔“ علیکم بالسوا دالاعظم اور فانه من شذ شذی النار اور ید الله علی الجماعة اور لاتجتمع امتی علی الضلالة، مشہور احادیث اور زباں زد خاص و عام ہیں، اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وایاکم والفرقة فان الشاذ من الناس الشيطان کما ان الشاذ من الغنم للذئب، ”علیحدگی سے بچو اس لئے کہ جو الگ ہو وہ شیطان کے قبضہ میں آگیا، جس طرح ایک بکری اگر ریوڑ سے الگ ہو جائے تو وہ بھیڑیے کا مال ہوتی ہے۔“

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مثل المومنین فی توادهم ووتعاطفهم کمثل الجسد الواحد اذا اشتكى منه عضو تداعى له سائر الجسد بالسهر بالحمى، مسلمانوں کی قومیت ایسی ہے جیسے ایک جسم اور اس کے مختلف اعضاء، ایک عضو میں درد ہو تو سارا جسم محسوس کرتا ہے اور اس کی بے چینی اور تکلیف میں اسی طرح حصہ لیتا ہے، جیسے خود اس کے اندر درد اٹھ رہا ہو۔ ”دوسری جگہ یوں ارشاد ہوا: المسلم للمسلم کالبنيان يشد بعضه بعضا“ ان کی مثال دیوار کی سی ہے ہر اینٹ دوسری اینٹ سے سہارا پاتی اور سہارا دیتی ہے۔ ”ظاہر ہے کہ اینٹ کا کوئی مستقل وجود نہیں، اگر ہے تو اجتماعی۔ وہ دیوار کا ایک جز اور ان اجزاء کے ملنے سے مضبوط دیوار بنی ہے۔“

نماز میں بھی صف بندی پر زور دیا کہ سر اہنہ اور پاؤں ایک سیدھ میں رہیں اور اس پر ان الفاظ میں تنبیہ کی لتسون صفوفکم اولیخالفن الله بین وجوهکم، ایک روایت میں فرمایا: سووا صفوفکم فان تسوية الصفوف من اقامة الصلوة۔ یہ تمام تصریحات صاف صاف بتا رہی ہیں کہ باہم مل جل کر رہنا اور اکٹھے ہو کر کام کرنا کس درجہ ضروری ہے، مگر افسوس مسلمان ان سب ارشادات کو فراموش کر چکے اور اب تصویر تنزل بنے ہوئے ہیں۔

## انتظامی نقص

أَتَا مُؤُونَ النَّاسِ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٢٠٠﴾

”کیا لوگوں کو نیک کام کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھولتے ہو اور تم کتاب پڑھتے ہو، پھر نہیں سمجھتے۔“

مذہب جب دعوت دے گا تو عمل کی، اس کے اوامر و احکام ایک ایسی امت پیدا کرنا چاہتے ہیں جو یکسر عمل ہو، اس لئے ہر وہ شخص جو اپنی قوت عملیہ کو فنا کر دے، مذہب کے نزدیک مردود ہے۔ پھر ان لوگوں کی کیا حالت ہو گی جو

دوسروں کو تو کام کرنے کی دعوت دیتے ہیں، مگر خود اس سے محروم محض رہتے ہیں۔ قرآن حکیم نے شاعروں کی ایک اصولی غلط کاری بیان کی ہے اور وہی دراصل ان کے تمام امراض و مفسدات کی علت العلل اور بمنزلہ بنیادی پتھر کے ہے۔ وَ أَتَاهُمْ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ ﴿۲۲۲﴾ (سورہ اشعر آء ۲۲۲) اور یہی باتیں کہا کرتے ہیں جو خود نہیں کیا کرتے۔ پھر سورہ صف میں مسلمانوں کو تادیب فرمایا: لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ ﴿۲﴾ (سورہ الصف ۲) آل عمران میں یہودیوں کی ایک خرابی یہ بتائی کہ۔ وَ يُحِبُّونَ أَنْ يُخْبَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا (سورہ آل عمران ۱۸۸) اور کیا کرایا تو کچھ نہیں اور اس پر چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف ہو، ایک عرب شاعر سے کسی رئیس نے کہا میری تعریف کرو۔ شاعر نے جواب دیا افضل حتی اقول کچھ کر کے دکھاؤ کہ میں تمہاری تعریف بھی کروں۔

اگر ایک مذہبی جماعت اس امر کی آرزو مند ہو کہ لوگ اس کی امامت و پیشوائی کو تسلیم کر لیں تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو عمل صالح کا بہترین نمونہ بن کر دکھائے۔ اس لئے کہ قدر و قیمت عمل کی ہے نہ کہ باتوں کی۔ ان اکرام مکم عند اللہ اتفاقاً، مگر ان یہودیوں کی عجیب حالت ہے کہ باوجود کتاب پڑھنے کے وہ اس حقیقت کو فراموش کئے ہوئے ہیں۔ عمل سے اس درجہ بعد اور اس پر مذہبی ریاست و حکومت کی طلب، این چپ بوالعجبی است!

وَ اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ ۚ وَ اِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِينَ ﴿۲۷﴾ الَّذِيْنَ يَطُوعُوْنَ اَمْرًا مِّنْ لَّدُنْهُمْ وَ اَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُونَ ﴿۲۸﴾

“صبر اور نماز سے مدد طلب کرو اور البتہ نماز بھاری ہے مگر ان لوگوں کے لئے (آسان) ہے جو عاجزی کرنے والے ہیں جنہیں یقین ہے کہ انہیں اپنے رب سے ملنا ہے اور اسی کی طرف لوٹ جانا ہے۔”

تمہیں صبر و استقامت اور دعا سے کام لینا چاہئے کہ یہی چیزیں کامیابی کی ذمہ دار و کفیل ہیں، مگر اس سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں، جنہیں احتساب اعمال کا یقین ہو، ورنہ دوسروں کو ان تکالیف و مصائب کے برداشت کرنے کی کیا ضرورت؟

قرآن حکیم کے بعض الفاظ کا مفہوم اس طرح غلط بیان کیا جا رہا ہے کہ ان کا اصلی مطلب اب کسی ذہن میں نہیں آتا اور غلط مطالب ہی ضرب الامثال اور محاورات کے طور پر استعمال ہونے لگے ہیں، ان میں صبر بھی ہے۔ ہم نے تفسیر کے مقدمہ میں اس پر کافی روشنی ڈال دی ہے۔ ومن شاء التفصیل فلیدرجہم نشہیہ۔

یہاں تک بنی اسرائیل کی خرابیوں سے اجمالی بحث کی، تفصیل آگے آئے گی۔ ہم ارباب ذوق سلیم کی سہولت و آسانی کی غرض سے ان امراض و مفسدات کی تشخیص کئے دیتے ہیں کہ عبرت و بصیرت ہو:

(۱) علمی خرابیاں ❶۔

❶ اہل بصیرت ان خرابیوں کا وقت نظر اور عمیق غور و فکر سے مطالعہ کریں پھر دیکھیں کہ اس وقت علماء کی کیا حالت ہے اور کیا فرؤا فرڈایہ تمام امراض ان میں موجود نہیں ہیں۔ علماء سو کے حالات عام لوگوں پر مخفی نہیں اس لئے ہمیں زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ فہل من مدد کر۔



(الف) عہد کی پابندی نہیں کرتے۔

(ب) قرآن حکیم پر ایمان نہیں لاتے، حالانکہ اس سے ان کی کتاب کی تصدیق ہوتی ہے۔

(ج) کتاب الہی کی تبلیغ و دعوت کے مقابلہ میں دنیوی جاہ و عزت کو ترجیح دیتے ہیں۔

(د) ضروریات دین سے لاپرواہو کر فروعیات پر اپنی تمام تر قوت صرف کرتے ہیں۔

(ه) حق و صداقت کو مخفی رکھتے ہیں کہ عوام الناس کے نزدیک مورد طعن و تشنیع نہ بنیں۔

(۲) عملی کمزوریاں

(الف) اللہ کے پاک نام پر معمولی سے معمولی بدنی تکلیف بھی گوارا نہیں کر سکتے۔

(ب) قومی نشو و ارتقا کے لئے خرچ کرنے سے گریز کرتے ہیں۔

(ج) اجتماعی قوت اور اتحاد قومیت میں اختلاف و تفریق پیدا کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔

(۳) انتظامی نقائص۔

(الف) مذہبی احکام و اوامر اور اخلاق و تہذیب کے باب میں بے انتہا کمزوری کا اظہار کرتے ہیں۔

(ب) دوسروں سے جب مطالبہ کریں گے تو نہایت سختی سے۔

(ج) احتساب اعمال کا یقین نہیں، اس لئے نظم و ترتیب امور کی پرواہ نہیں کرتے۔

اجمال کی تفصیل

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِذْ كُرْهُوا اٰيٰتِيْ الْاٰخِرَةَ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ فَعَلْتُمْ عَلٰى الْاَعْلٰىيْنَ ﴿٢٥﴾

اے بنی اسرائیل! میرا احسان یاد کرو جو میں نے تم پر کیا اور میں نے تم کو بڑا کیا جہاں کے لوگوں سے۔

جب بنی اسرائیل میں انبیاء و رسل کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ مخاطبہ و مکالمہ الہی کے لئے یہی لوگ مخصوص تھے، حکومت بھی ان کے پاس تھی، اس لئے اپنے زمانہ میں یہی سب سے زیادہ بزرگ و برتر تھے۔ آباء کرام کی اولاد میں ہونا خود ایک شرف و مجد ہے اور یہ بہت کم خوش نصیبوں کو حاصل ہوتا ہے، مگر جس وقت انہوں نے اپنے فرائض تبلیغ و دعوت سے انحراف و تجاوز کیا، ان پر ذلت و مسکنت طاری ہو گئی۔ اللہ کی رحمت بیکر اس سے دور ہو گئے اور ان کی تمام فضیلت و بزرگی چھن گئی۔ ولئن کفرتم ان عذابا لشدید۔

تذکیر بما بعد الموت

وَالَّذِيْنَ يَمُوتُ يُرْسِلُ فِيْهِ رُسُلُنَا اَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿٢٦﴾

اور اس دن سے بچو کہ کوئی شخص دوسروں کے ایک ذرہ برابر بھی کام نہ آئے گا۔ اس کی طرف سے سفارش قبول نہ ہوگی

اور اس کے بدلہ میں کچھ نہ لیں گے اور نہ ان کو مدد پہنچے گی۔



چونکہ آگے چل کر بنی اسرائیل کی خرابیوں پر مفصل و مبسوط بحث ہوگی اور ان سے دریافت کیا جائے گا کہ جس قوم کی تمام تر تاریخ ان سیاہ کاریوں اور بد عملیوں سے بھری ہوئی ہو، اس کے لئے اس کے سوا اور کیا فیصلہ ہو سکتا ہے کہ اسے ہمیشہ کے لئے تخت سلطنت سے محروم کر دیا جائے اور وہ غلاموں کی زندگی بسر کرے۔ اس آیت میں انہیں بتا دیا کہ حادثہ قیامت کو پیش نظر رکھیں اور انصاف و دیانت سے جواب دیں۔

اگر ایک شخص کسی جرم کا مرتکب ہو اور اسے عدالت میں پیش کر دیا گیا ہو تو سزا سے بچنے کی صرف یہی صورتیں ہو سکتی ہیں کہ:

(الف) دوسرا شخص اپنے آپ کو پیش کرتا ہے کہ مجرم کو چھوڑ کر مجھ سے مواخذہ کرو۔

(ب) سفارش ہو جائے اور یوں اس کی جان خلاصی پائے۔

(ج) جرمانہ اور معاوضہ ادا کر دے کہ یہ بھی نجات کی ایک شکل ہے۔

(د) یار و مددگار آکر اپنی طاقت و قوت سے کام لے کر ملزم کو چھڑالیں۔

مگر جن لوگوں نے حق پرستوں کی مخالفت کی، سچائی کے فنا کرنے کی فکر میں رہے اور انکار و جھوٹ میں زندگی بسر کی، ان کے لئے نجات کی کوئی صورت نہ ہوگی۔ انہیں اپنے اعمال کا آپ جواب دینا ہوگا۔ جس دن کی یہ کیفیت بیان کی گئی ہو کہ:

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ۖ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ ۖ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ ۖ (سورة عيسٰ ۳۶، ۳۷)

”اس دن ایسی نفسی نفسی پڑیگی کہ آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں، اور اپنے باپ اور اپنی بیوی، اور اپنے بیٹوں سے بھاگے گا۔ ان میں سے ہر شخص کو اپنی اپنی نجات کا غم ہو گا کہ وہ اس کو بس کرتا ہے۔“

لَنْ تَنْفَعَكُمْ أَرْحَامُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَفْصَلُ بَيْنَكُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (سورة الممتحنة ۳)

”قیامت کے دن نہ تمہارے رشتہ دار وہاں تمہارے کچھ کام آئیں گے اور نہ تمہاری اولاد، اس دن تم سب کو الگ الگ کر دیا جائے گا اور جو کچھ بھی تم کر رہے ہو خدا باریک بین نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔“ پس جب حقیقت یہ ہو تو کسی کی خاطر جھوٹ کیوں بولا جائے۔

## شفاعت

اس آیت میں شفاعت کا تذکرہ آیا ہے۔ اگر اس کے حسب ذیل مراتب پیش نظر ہوں تو اس کی حقیقت خود بخود واضح ہو جائے گی۔

(الف) وجاہت: مجرم پادشاہ کے حضور میں پیش ہوتا ہے۔ قانوناً اسے سزا ملنی چاہئے مگر ایک بہت بڑا رکن سلطنت اس کی سفارش کرتا ہے، پادشاہ کو اندیشہ ہے کہ اگر میں نے اس کی بات نہ مانی تو سلطنت میں بہت سی خرابیوں کا موجب ہو گا، اس لئے رعب میں آکر مجرم کو چھوڑ دیتا ہے، اس کو شفاعت و جاہت کہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اللہ

کی جناب میں اس قسم کا عقیدہ رکھے تو اس کے کفر و شرک میں کس کو کلام ہو سکتا ہے تعالیٰ اللہ عباد یقولون،  
 گر بہ محشر خطاب قہر کند  
 انبیاء راجہ جائے مغفرت است؟

قیامت کو سب کی یہ کیفیت ہوگی،

وَحَشَعَتِ الْأَصْوَاتُ لِلرَّحْمَنِ فَلَا تَسْمَعُ إِلَّا هَنَسًا ﴿۱۰۸﴾ (سورة طہ ۱۰۸)

”اور مارے خوف کے خدائے رحمن کے آگے سب کی آوازیں بیٹھ جائیں گی، پس تو سوائے آہستہ آہستہ بات کرنے کے اور کچھ نہ سنے گا۔“

لَيْسَ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۱۰۹﴾ (سورة المؤمن ۱۰۹) بھی اسی روز کے لئے آیا ہے، پھر کس کی وجاہت وہاں کام آسکتی ہے۔

(ب) محبت: بادشاہ کا محبوب و عزیز، سفارش کرتا ہے اور وہ اس کے عشق و محبت کی بنا پر مجرم کو رہائی بخشتا ہے کیونکہ تعمیل ارشاد نہ کرنے کی صورت میں اسے اس کے رنجیدہ خاطر ہونے کا اندیشہ ہے۔ ایسا خیال بھی جناب باری کی شان میں کفر باللہ سے کم نہیں، وَهُمْ مِنْ خَشْيَتِهِ مُشْفِقُونَ ﴿۱۱۰﴾ (سورة الانبیاء ۲۸) اور وہ اس کے جلال سے ہر وقت ڈرتے رہتے ہیں۔

(ج) اجازت: شامت اعمال سے ایک شخص نے جرم کیا، مگر اس پر نادم ہے۔ بادشاہ ہی سے طالب مغفرت ہے۔ کسی امیر کی پناہ میں نہیں آتا، ہر وقت اسی کی رحمت پر نظر ہے، بادشاہ اس کو معاف کرنا چاہتا ہے مگر آئین سلطنت کے خلاف ہے۔ ایک امیر اس کی مرضی پا کر سفارش کر کے اس کا قصور معاف کر دیتا ہے، اس کو شفاعت بالاذن کہتے ہیں۔ کتاب و سنت کی تصریحات اس کی تائید میں ہیں اور کسی کو انکار کی گنجائش نہیں۔

من ذا الذي يشفع عنده الا باذنه میں اسی طرح اشارہ ہے: الا من اذن له الرحمن وقال صوابا کا یہی مطلب ہے اور اُسی مضمون کی کثرت سے احادیث ملیں گی۔ اس آیت میں جس شفاعت کا انکار کیا گیا ہے وہ اس کے لئے ہے جس کی تمام عمر حق و صداقت کے استیصال میں گزری ہو اور جسکی آواز ایک مرتبہ بھی سچائی کی حمایت میں بلند نہ ہوئی ہو۔

تذکیر بالاء اللہ

وَإِذْ نَحْيَيْنَاكَ مِنَ الْفِرْعَوْنَ يَسُومُونَكَ سُوءَ الْعَذَابِ يُدَبِّحُونَ أَبْنَاءَكَ ثُمَّ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكَ كُفَّ وَفِي ذَلِكَ لَكُمْ بَلَاءٌ مِّنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ ﴿۱۱۱﴾ وَإِذْ قَرَّبْنَا بَبَأَكُمْ الْبَحْرَ فَأَنْجَيْنَاكُمْ وَأَغْرَقْنَا الْفِرْعَوْنَ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ﴿۱۱۲﴾

”اور ہم نے تم کو فرعون کے لوگوں سے نجات دی، تم کو بڑی تکلیف دیتے، تمہارے بیٹے ذبح کرتے اور زندہ رکھتے تھے تمہاری عورتیں، اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بڑی آزمائش تھی۔ اور جب ہم نے تمہارے لئے دریا کو

چیر دیا پھر تم کو بچا دیا، فرعون کے لوگوں کو غرق کر دیا اور تم دیکھتے تھے۔” شاہان مصر کو فرعون کہا کرتے تھے۔ آل فرعون سے مراد اس کے اعموان و انصار، اتباع و مقلدین، اور اس کی قوم کے تمام افراد ہیں۔

ان آیات میں فرعون کے مختلف مظالم بیان کئے گئے ہیں، ہم نے اپنی کتاب بصائر میں موسیٰ و فرعون کے واقعات پر نہایت ہی شرح و بسط سے بحث کی ہے اور ان کے تمام اطراف و جوانب کو صاف کر دیا ہے، اس لئے یہاں ان کے لکھنے کی ضرورت نہیں۔ اگر تفصیل کی ضرورت ہو تو اس کو ملاحظہ کیجئے۔

بحیرہ قلزم کے شمالی کنارہ پر بنی اسرائیل کھڑے تھے۔ آگے سمندر تھا اور پیچھے فرعون کا لشکر، اس یاس و قنوط کے عالم میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو الہام کیا کہ وہ اپنی لاٹھی سمندر پر ماریں۔ عالم مثال کی قوتوں نے انہیں وقت پر مدد دی، پانی خشک ہو گیا اور وہ لوگ اطمینان کے ساتھ پار ہو گئے۔ فرعون بھی اپنے لشکر سمیت سمندر میں گھس گیا، جب عین وسط میں پہنچا تو قوائے مثالیہ کے ذریعہ پھر سب طرف پانی ہی پانی دکھائی دینے لگا اور چند لمحوں کے اندر وہ بدترین گروہ انسانی اپنے اعموان و انصار کے ساتھ غرق ہو گیا۔ بنی اسرائیل دوسرے کنارہ پر کھڑے اس مسرت انگیز نظارہ کو دیکھ رہے تھے کہ وہ قوم، جس نے آج تک ہم کو غلاموں کی طرح رکھا، آج بے بسی اور بے کسی کی چیخیں مار رہی ہے، مگر کوئی نہیں جو اس کی مدد کرے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی تمام ان رکاوٹوں کو دور کر دیا جو ان کی راہ میں مختلف اسباب کی بنا پر اس وقت پیدا ہو گئی تھیں جبکہ فرعون کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لئے خود آگے بڑھنا چاہتے تھے۔

### غلامی کے آثار باقیہ

وَإِذْ وَعَدْنَا مُوسَىٰ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهَا وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ ﴿۵۰﴾ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۵۱﴾

”اور جب ہم نے موسیٰ سے چالیس رات کا وعدہ کیا، پھر تم نے اسی کے پیچھے بچھڑا بنالیا اور تم بے انصاف تھے اس پر بھی ہم نے تم کو معاف کیا شاید تم احسان مانو۔“

جب بنی اسرائیل نجات پا کر آگے بڑھے تو اب وہ ایک آزاد قوم تھے جن کے لئے قانون اور دستور العمل کی ضرورت تھی، ورنہ ضابطہ نہ ہونے کی وجہ سے اندیشہ تھا کہ ان کے خیالات میں انتشار نہ پھیل جائے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ کوہ طور پر آکر چالیس روز تک اعتکاف کریں۔ سورۃ اعراف میں فرمایا:

وَإِذْ وَعَدْنَا مُوسَىٰ ثَلَاثِينَ لَيْلَةً وَأَتَمَّمْنَا فِيْهَا بَعْثًا فَرَقْنَاهُ بِمِثْقَالِ رَيْبَةٍ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ﴿۱۴۲﴾ (سورۃ الاعراف ۱۴۲)

”اور ہم نے موسیٰ سے تیس رات کا وعدہ کیا اور ہم نے دس راتیں اور بڑھا کر ان سے چالیس کو پورا کر دیا اور یوں پروردگار موسیٰ کا وعدہ چالیس رات کا پورا ہو گیا۔“

اللہ تعالیٰ کا قانون بھی یہی ہے کہ چالیس روز کے ذکر و فکر اور استغراق کے بعد روحانی کمالات کا فتح باب ہوتا ہے۔

صوفیائے کرام بھی اسی لئے چلہ کشی کرتے ہیں کہ انسانی نجاستوں اور گندگیوں سے پاکیزگی اور طہارت حاصل کر کے عالم ملکوت کے فیوض و برکات حاصل کرنے کی قابلیت پیدا ہو جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس نصاب کو تیس روز میں پورا کر لیا، مگر آخری روز ان سے کچھ ایسی غلطی ہو گئی کہ اس کے کفارہ کے لئے دس روز اور اعتکاف کرنا پڑا، اس طرح اللہ تعالیٰ کا قانون چہل ایام برابر قائم رہا۔ اس میدان کے ہر راہ رو کے لئے اعتزال عن الناس اور علیحدگی ضروری ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکالمہ الہی سے قبل کئی کئی روز تک غار حرا میں معتكف رہا کرتے کہ جبرئیل سے پوری مناسبت پیدا ہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام تو وہاں مصروف ذکر اللہ تھے۔ ان کی غیر حاضری میں بنی اسرائیل کی قوم نے سونے چاندی کا پچھڑا پوجنا شروع کر دیا اور اس کے مختلف اسباب تھے۔

(۱) یہ لوگ مصر میں قریباً چار سو سال سے مقیم تھے، مصری گائے کی پرستش کیا کرتے تھے، بنی اسرائیل نے انہیں دیکھا تو انہوں نے بھی اس کی پوجا شروع کر دی جو ان کی صحبت و ہم نشینی کا اثر تھا۔

(۲) بنی اسرائیل مدت ہائے دراز سے مصریوں کے ماتحت زندگی بسر کر رہے تھے، فرعون نے تمام جلیل القدر عہدے اپنی قوم کے لئے مخصوص کر لئے تھے اور ادنیٰ ترین کام ان کے سپرد تھے۔ ان کی آمدنی کے اسباب و ذرائع بند تھے، جس قدر ملتا تھا ان کی ضروریات کے لئے کافی نہ ہوتا تھا، اس لئے انہیں دولت کے ساتھ الفت و دلبستگی ہو گئی اور یہ ہر غلام و محکوم قوم کے امتیازات میں سے ہے کہ اسے دولت سے محبت پیدا ہو، پھر رہ پیہ ان کا امام و پیشوا ہوتا ہے اور یہی ان کا قبلہ، معبود و کعبہ مسجود ان کی حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے۔

گر جاں طلبی مضائقہ نیست  
گر زر طلبی سخن دریں است

بنی اسرائیل آزاد ہو چکے ہیں، اب ان پر کسی انسان کی حکومت نہیں، ایک اللہ کے غلام ہیں۔ آزاد سر زمین ہے اور وہ ہیں، مگر غلامی کے اثرات اب تک ان کے دل و دماغ پر جاری ہیں اور ان کے رگ و پے میں جاری و ساری، جس وقت انہوں نے سونے چاندی کا پچھڑا دیکھا فوراً سجدہ میں گر پڑے کہ اسی کی بندگی ان کا مایہ حیات ہے۔ چنانچہ ان کی آئندہ قومی زندگی میں اس قسم کے بکثرت واقعات پیش آئے جن سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو گئی کہ ان کا مقصد حیات صرف جمع مال و دولت تھا، ان اللہ فقیر و نحن اغنیاء اور اشتوا بایت اللہ ثمننا قلیلاً، اسی کی موید ہیں، صدیاں گزر گئیں، مگر یہ خصوصیت کبریٰ اب تک یہودیوں میں علی وجہ الکمال دکھائی دیتی ہے، ان سے بڑھ کر اور کوئی قوم صاحب دولت و ثروت نظر نہیں آتی۔

(۳) جب ایک قوم ترقی کرنے لگتی ہے تو قانون نہ ہونے کی شکل میں اس سے دو قسم کی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔

(الف) افراط، روحانیت میں جائز حدود سے تجاوز کر جانا، جیسے نصاریٰ نے عبد اللہ کو ابن اللہ بنا دیا۔

(ب) تفریط، مادیت میں بہت دور نکل جانا، یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جو تاریخ مرتب کی ہے اس کی

بہترین مثال ہے، یہی دونوں اصولی غلطیاں ہیں جن سے سورۃ فاتحہ میں پناہ مانگی گئی۔ غیر المغضوب علیہم ولا الضالین یہودی تفریط کی وجہ سے ہلاک ہوتے ہیں کیونکہ وہ سرے سے مسیح علیہ السلام کا انکار کرتے ہیں اور عیسائی افراط میں مبتلا ہیں کہ ایک بشر کو خدا بناتے ہیں۔

یہ لوگ اس وقت دونوں غلطیوں کے مرتکب ہوئے ہیں۔ سونے کا چھڑا پوجنا شروع کر دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ وہ خداوند جو دارالوری ثم والوری ثم وراء الوری ہے اس میں حلول کر گیا ہے، بت پرست یہی خیال کرتے ہیں پیر پرست اور قبروں کے پوجنے والے اس سے عبرت اندوز ہوں۔ افراط کی مثال آگے آئے گی جبکہ انہوں نے ارنا للہ جہرۃ کہا۔ چونکہ ان کے پاس کوئی قانون نہ تھا۔ خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خاطر جبل طور پر سرسبز انوکھے تھے اس لئے ہم نے درگزر کیا کہ آئندہ اس کے مرتکب نہ ہوں اور قانون ملنے پر اپنی قوتوں کو صحیح مواقع میں صرف کریں۔

### تورات کا نزول

وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۵﴾ وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ لِقَوْمِهِ إِنَّكُمْ كُنْتُمْ أَنْفُسَكُمْ بَاتِلًا خَذَلْتُمْ الْعَجَلَ فَنُتَبِّهُوا إِلَى بَارِئِكُمْ فَأَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ ۖ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ۖ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۖ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿۶﴾

”اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب اور حجت دی کہ شاید تم راہ پاؤ۔ اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اے قوم! تم نے چھڑا بنا کر اپنا نقصان کیا۔ اب اپنے پیدا کرنے والے کے حضور میں توبہ کرو اور اپنی جان مار ڈالو تمہارے خالق کے نزدیک تمہارے حق میں یہی بہتر ہے۔ چنانچہ اس نے تمہاری توبہ قبول کر لی۔ بیشک وہی معاف کرنے والا مہربان ہے۔“

فرقان اس قوت کو کہتے ہیں جس سے حق و باطل، نیک و بد اور اسلام و کفر میں تمیز ہو، ہر کتاب الہی کے نزول سے قبل لوگوں میں ایک قوی احساس پیدا کر دیا جاتا ہے، وہ اپنے روزمرہ کے اعمال کو دیکھتے ہیں تو معلوم کرتے ہیں کہ ان میں بہت زیادہ اصلاح و تہذیب کی ضرورت ہے، اپنے آپ کو کسی مصلح اور ریفارمر کا محتاج سمجھتے ہیں، حق کے لئے ان کے اندر تشنگی پیدا ہوتی ہے اور اب وہ اس چشمہ آب کی تلاش میں نکلتے ہیں جو ان کی پیاس کو دور کر دے۔ اگر فرقان پہلے سے نہ پیدا کر دیا جائے تو کتاب بیکار ثابت ہوتی ہے، کیونکہ جب لوگ ضرورت اصلاح ہی محسوس نہیں کرتے تو انہیں اس کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے، اگر پیاس نہ ہو تو کتنی ہی برف سے ٹھنڈے کئے ہوئے گلاس بھر بھر کر پیش کیجئے کسی کی نگاہ بھی نہ اٹھے گی۔ جب بھوک نہیں تو کھانے کی ہر چیز بیکار ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ان الامانة نزلت في جذر قلوب الرجال فعلموا من الكتاب وعلموا من السنة۔

”لوگوں کے سويدائے قلب میں امانت کا نزول ہوا، اس لئے انہوں نے کتاب و سنت کی تعلیم حاصل کی اور ان سے بہرہ اندوز ہوئے۔“

اس میں امانت سے مراد یہی فرقان ہے، جو ہر نبی کی بعثت سے قبل نازل ہوتا ہے اور جس کی وجہ سے لوگ نبی کے لئے یکسر انتظار بن جاتے ہیں۔ رسول اللہ کی بعثت سے قبل عرب میں اس قسم کے لوگ موجود تھے جو دین جاہلیت کو چھوڑ کر یہ خبریں دیا کرتے تھے کہ عنقریب ایک رسول ظاہر ہونے والا ہے جو ابلیس اور اس کے لشکر پر غالب ہوگا، ان اشخاص میں عثمان بن حریث، عبید، زید بن عمرو اور ورقہ بن نوفل کے نام خصوصیت سے مشہور ہیں۔ زید بن عمرو تو وہ بزرگ ہیں جنہوں نے رسول موعود کی تلاش میں دور دور کے سفر کئے اور آخر یہ معلوم کر کے کہ وہ مکہ میں پیدا ہوں گے، اسی مبارک انتظار میں رہ کر انتقال کر گئے، یہ حضرت عمرؓ کے چچا تھے۔

یہاں فرقان سے مراد وہی تشنگی ہے جو بنی اسرائیل میں قانون الہی کے لئے پیدا کر دی گئی تھی۔ بعض لوگوں نے اس سے نجات موسیٰ اور تباہی فرعون بھی مراد لی ہے، مگر بعد کی آیت پہلے معنی کی زیادہ مؤید ہے۔ ہر نبی کے ساتھ دونوں چیزیں نازل کی جاتی ہیں۔ چنانچہ موسیٰ کو بھی نوازش کی گئیں، تاکہ بنی اسرائیل راہ حق اپنے سامنے دیکھ لیں اور آئندہ کسی غلط کاری کے مرتکب نہ ہوں۔

گذشتہ آیت میں بیان کیا گیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ غیبت میں ان لوگوں نے مچھڑا پوجنا شروع کر دیا، مگر اللہ تعالیٰ نے ان سے عفو و درگزر کیا۔ مگر اس جگہ یہ نہیں بتایا تھا کہ معاف کرنے کی صورت کیا ہوئی۔ اس آیت نے اس اجمال سے پردہ اٹھادیا اور بتایا کہ موسیٰ نے آکر انہیں ان لوگوں کے قتل کرنے کا حکم دیا جو سب سے زیادہ اس بدکرداری میں حصہ لینے والے تھے۔ چونکہ ان میں حق و باطل کی تمیز پیدا ہو چکی تھی اور انہوں نے اس حقیقت کو معلوم کر لیا تھا کہ ہم نے بدترین غلطی کا ارتکاب کیا ہے، اس لئے وہ قتل کرنے پر آمادہ ہو گئے، حالانکہ وہ ان کے عزیز و قریب ہی تھے۔ یہ آمادگی فرقان کا نتیجہ تھی، ورنہ یاد رکھئے مشرک قومیں جن کے رگ و پے میں بت پرستی اثر کر چکی ہو اور ان کی فطرۃ ثانیہ بن گئی، ہو کبھی اپنے آپ کو فنا کرنے کے لئے تیار نہ ہوں گی، کیونکہ وہ اسی کو حق خیال کرتی ہیں اور انہیں اصلاح کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔

جب اللہ تعالیٰ نے ان کی آمادگی کو دیکھ لیا تو ان کو لطف و نوازش سے معاف کر دیا، کہ شروع میں اس قسم کی غلطیاں ہو جانا بعید نہیں۔

افراط کا ارتکاب

وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَرٰى اِلٰهَ جَهَنَّمَ فَاَخَذْتُكُمْ الصِّعْقَةَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ﴿۵۰﴾ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۵۱﴾

“اور جب تم نے کہا اے موسیٰ! ہم تیرا یقین نہ کریں گے جب تک اللہ کو سامنے نہ دیکھیں، پھر بجلی نے تم کو آلیا اور تم دیکھتے تھے، پھر تمہارے مرنے کے بعد ہم نے تم کو دوبارہ زندہ کر دیا، شاید تم شکر گزاری کرو۔”

حضرت موسیٰ علیہ السلام توراۃ لینے کے لئے کوہ طور پر گئے تو اپنے ساتھ بنی اسرائیل میں سے بہترین دل و دماغ کا انتخاب کیا اور ان میں سے ستر اشخاص کو اپنے ساتھ لے گئے۔ مگر انہوں نے صاف کہہ دیا کہ جب تک ہم ان آنکھوں سے کھلم کھلا خدا کو نہ دیکھ لیں گے، تمہاری کبھی تصدیق نہ کریں گے۔ چونکہ انہوں نے بے انتہا گستاخی سے کام لیا اور موسیٰ کی رسالت پر ایمان لانے سے انکار کر دیا، حالانکہ وہ بکثرت نشانات دیکھ چکے تھے، اس لئے صاعقہ حق نے ان کو آلیا اور ان پر بیہوشی طاری ہو گئی۔

تمام محققین کا اتفاق ہے کہ صاعقہ سے موت نہیں ہوتی، اس سے انسان بیہوش ہو جاتا ہے۔ البتہ اگر وقت پر خبر نہ لی جائے تو اس کی موت کا باعث ہو جائے گی۔ جب سب پر غشی طاری ہو گئی تو موسیٰ علیہ السلام سخت پریشان ہوئے، انہیں اس امر کا اندیشہ ہوا کہ اگر یہ لوگ مر گئے تو قوم بغیر کسی نگران کار و محافظ کے رہ جائے گی۔ جب کام کرنے والے دماغ نہ رہیں گے تو قوم خود بخود فنا ہو جائے گی، اس لئے انہوں نے والہانہ و مصطریانہ دعائی:

وَ اخْتَارَ مُوسَىٰ قَوْمَهُ سَبْعِينَ رَجُلًا لِّيَتَوَاتَرُوا ۖ فَلَمَّا آخَذَتْهُمْ الرُّجُفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ أَهْلَكْتَهُم مِّن قَبْلِ وَ اِيَّاي ۖ اَهْلِكْتُنَا بِمَا فَعَلَ الشُّفَهَاءُ مِنَّا ۚ (سورة الاعراف ۱۵۵)

”اور موسیٰ نے ہمارے وعدے پر حاضر لانے کے لئے اپنی قوم میں سے ستر آدمی منتخب کئے، پھر جب ان کو زلزلہ نے آلیا تو موسیٰ نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! اگر تو چاہتا تو مجھ سمیت ان لوگوں کو پہلے ہی سے ہلاک کر دیتا۔ ہم میں سے جو لوگ احمق ہیں وہ ایک حرکت کر بیٹھ، کیا اس کی پاداش میں تو ہم کو ہلاک کئے دیتا ہے؟“

قرآن کریم نے غشی اور بیہوشی کی حالت کو موت سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن میں موت کا لفظ حسب ذیل معانی پر استعمال کیا گیا ہے۔

(۱) حقیقی موت۔

(۲) کفر و جود اور فناء حس و بیداری۔ اِنَّكَ لَا تُسَبِّحُ الْمُبْتَلٰی وَلَا تُسَبِّحُ الشَّمَّ الدُّعَاۤءِ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِیْنَ ۝ (النمل ۸۰)

(۳) زمین کی قوت نباتی کے مردہ ہونے پر۔ وَاللّٰهُ الَّذِیْ اَرْسَلَ الرِّیْلَ فَتَبٰیۡرُ سَحَابًا فَنُفِثْنٰهُ اِلٰی بَلَدٍ مَّیِّتٍ فَلَخِیۡنَا بِہِ الْاَرْضَۃَۤ بَعْدَ مَوْتِہَا ۚ کَذٰلِکَ النُّشُوْرُ ۝ (اطر ۹)

اس بیہوشی سے اللہ تعالیٰ نے ان کو نجات دی اور دوبارہ ان کے اندر احساس پیدا ہو گیا تاکہ پھر اس غلط کاری میں مبتلا نہ ہوں اور کام کریں۔

سپاہیانہ زندگی

وَعَلَّلْنَا عَلَیْکُمُ الْغَمَامَ وَ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمُ الْمَنِّ وَالسَّلْوٰی ۚ کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ ۚ وَمَا ظَلَمْنٰوْا لَکِنۡ کَاۡنُوْا اَنْفُسَہُمْ یَظْلِمُوْنَ ۝

”اور ہم نے تم پر ابر کا سایہ کیا اور تم پر من و سلویٰ اتارا (ہم نے کہا) جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تم کو دی ہیں ان کو کھاؤ اور ہمارا کچھ نقصان نہ کیا، پر اپنا ہی نقصان کرتے رہے۔“

افراط و تفریط کے بعد اب توراۃ نے بنی اسرائیل کے لئے راہ توسط و اعتدال قائم کر دی اور ان کو ارض مقدس کی حکومت کے لئے تیار کرنا شروع کیا۔ ترقی کا اولین زینہ ہے سادہ اور سپاہیانہ زندگی۔ تمام قوم میں سپاہیانہ جذبات ہوں، روزمرہ کی ضروریات بالکل مختصر اور محدودے چند ہوں، جنگ میں اسی پر کامیابی کا دار و مدار ہے، اس لئے سب سے پہلے ان کو اسی زندگی کے لئے تیار کیا گیا، ان کی مثال ایک فوج کی تھی جو جنگ کے لئے تیار ہو رہی ہو، اس لئے ان کی تمام ضروریات قدرت خود بخود پورا کر دیتی۔ انہیں کسی قسم کی تکلیف برداشت نہ کرنی پڑتی تھی اور وہ ضرورتیں نہایت ہی مختصر تھیں۔ جنگل میں دھوپ سے بچنے کے لئے سایہ اور کھانے کے واسطے گوشت، چنانچہ ان کو سب کچھ میسر تھا، مگر ضرورت تھی ان کو قانون کا پابند بنانے کی، اس لئے یہ دستور العمل بنادیا گیا کہ جب ہر قسم کی ضرورت خود بخود پوری ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کا ذمہ لیا ہے تو کل کے لئے ذخیرہ نہ رکھیں۔

غلامی سے ابھی ابھی نجات حاصل کی تھی، اس کے جراثیم دور نہیں ہوئے تھے، اس لئے قانون کی پروانہ کی اور دوسرے روز کے لئے جمع کرنا شروع کر دیا، مگر اس حرکت سے خدا کا تو کیا نقصان ہو تا خود اپنا ہی بگاڑا۔

### شہر کا داخلہ

وَ اِذْ قُلْنَا اَدْخُلُوا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَلَکُمْ مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَاَدْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّفُؤَلُوا حِطَّةً نَّغْفِرْ لَکُمْ ۚ وَ سَنَبِّئُکُمُ الَّذِیْنَ ظَلَمْتُمْ اَقْوَالَ غَیْرِ الَّذِیْ قِیلَ لَهُمْ فَاَلْتَوَلَّوْا عَلَی الَّذِیْنَ ظَلَمْتُمْ اِرْجُوا مِنَ السَّمَآءِ مَائًا کَاثِرًا یُّغْشَوْنَ ۝

”اور جب ہم نے کہا اس شہر میں داخل ہو اور جہاں چاہو اس میں کھاتے پھر وافر اغت اور دروازہ میں سجدہ کر کے داخل ہو اور کہو گناہ بخش، تاکہ ہم تمہاری تقصیریں بخش دیں اور نیکی کرنیوالوں کو اور زیادہ دیں گے پھر ان لوگوں نے جن کی راہ ظلم و شرارت کی راہ تھی، خدا کی بتلائی ہوئی بات ایک دوسری بات سے بدل ڈالی، پھر ہم نے ظلم و شرارت کرنے والوں پر آسمان سے عذاب نازل کیا اور یہ ان کی نافرمانیوں کی سزا تھی۔“

اب تک یہ لوگ جنگلوں کی زندگی بسر کرتے تھے جہاں ایک طرف تو ضروریات حیات نہایت ہی قلیل اور مختصر تھیں، دوسری طرف فواحش و منہیات اور حرام کاری کے سامان بھی نایاب تھے، ایک مدت تک جنگل میں رہنے کے بعد ان کے دل میں خود بخود شہری زندگی کی آرزو پیدا ہوئی۔ انہیں اجازت تو دی گئی، مگر ساتھ ہی ان سے کہہ دیا گیا کہ وہاں شہوت پرستی اور بدکاری کے دواغی بہت کثرت سے ملیں گے، اس لئے بچتے رہنا۔ قانون کی خلاف ورزی نہ کرنا اور گناہوں سے بچنے کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا، کہ وہی ہر قسم کی آلائشوں اور ناپاکیوں سے پناہ میں رکھنے والا ہے، اس



کی رسی ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ جب شہر میں داخل ہو تو کمال اطاعت و فرماں برداری کا خیال دل میں ہو۔ مگر داخل ہوتے ہی ان سے ضبط نہ ہو سکا اوبد کاری شروع کر دی، زنا کے مرتکب ہوئے۔ چنانچہ اس کی پاداش میں ان پر عذاب نازل ہوا اور ہزاروں تباہ<sup>۱</sup> ہوئے۔

شہر میں داخل ہوتے وقت انہیں دو باتوں کا حکم دیا گیا تھا۔

① ادخلوا الباب سجدا، بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اس کا مطلب یہ تھا کہ سجدہ کرتے ہوئے شہر میں جاؤ، مگر ظاہر ہے کہ یہ معنی کسی طرح بھی درست نہیں معلوم ہوتے، ایک شخص کے لئے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ سجدہ بھی کرے اور آگے بھی بڑھتا جائے، اس سے بہتر صاحب مدارک کی رائے ہے، وہ فرماتے ہیں:

“امروا بالسجود عند الاقتراب الى الباب شكر الله تعالى وتواضعاً له”

“اللہ کا شکر ادا کرنے اور تواضع و انکساری کے اظہار کے لئے انہیں حکم دیا گیا کہ دروازہ پر پہنچ کر سجدہ کریں۔”

رسول اللہ ﷺ کا دستور تھا کہ جب آپ سفر سے واپس تشریف لاتے تو شہر میں داخل ہونے سے قبل دو رکعت نماز پڑھ لیا کرتے۔ اگر اس روایت کو پیش نظر رکھ لیا جائے تو یہ معنی اقرب الی الفہم معلوم ہوتے ہیں۔

لیکن جو معنی ہم نے اختیار کئے ہیں وہ بھی بالکل صاف ہیں، وہ گاؤں سے نکل کر شہر میں آرہے ہیں، جہاں شہوت پرستی کے اسباب کثرت سے ملتے ہیں، جنگل میں خواہشات نفسانی پورا کرنے کا انہیں کوئی موقع نہ تھا، اس لئے انہیں حکم دیا گیا کہ شہر سے باہر دو رکعت نماز پڑھ لینا اور شہر میں داخل ہوتے وقت تمہارے سر اللہ کے حکم کے آگے جھکے رہیں۔ خلاف ورزی کا خیال بھی نہ آنے پائے، ورنہ برباد ہو جاؤ گے۔

(۲) ... قولوا حطة ای حط عن خطایان، ہماری خطا کاریاں معاف کر دی جائیں، یعنی انہیں استغفار کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ بنی اسرائیل نے ان دونوں حکموں کی پروانہ کی، زنا کے مرتکب ہوئے۔ پھر گناہوں میں مبتلا ہونے کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ شریعت کے احکام و اوامر کی عزت ان کے دلوں سے جاتی رہتی اور وہ ان کو تمسخر و استہزا کی نگاہ سے دیکھتے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور شریعت کے حکموں پر تمسخرانہ انداز میں نکتہ چینی شروع کر دی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے تمسخر و استہزا کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے:

• یہ شہرِ طیم معلوم ہوتا ہے، اس کے متعلق حسب ذیل آیات ملاحظہ ہوں:

”سو اسرائیل طیم میں مقیم ہوئے، اور لوگوں نے موآبیوں کی بیٹیوں سے حرام کاری شروع کی، انہوں نے اپنے معبودوں کی قربانیوں پر لوگوں کی دعوت کی، سو لوگوں نے کھایا اور ان کے معبودوں کو سجدہ کیا، اور اسرائیلی بھل عنور سے ملے، تب خداوند کا قہر بنی اسرائیل پر بھڑکا۔“ (گنتی ۳۱: ۲۵ و ۳۰) یہ قہر کیا تھا؟ اس کی تفسیر اگلی آے توں میں کی گئی ہے۔

”اور اس مرد کے پیچھے خیمہ میں گھسا، اور ان دونوں کو اسرائیلی مرد اور اس عورت کے پیٹ کو چھیدا، تب بنی اسرائیل میں سے وبا جاتی رہی، وہ جو اس وبا میں مرے چوٹیں ہزار تھیں۔“ (گنتی ۳۲: ۲۸ و ۲۹)

قیل بنی اسرائیل ادخلوا الباب سجدا و قولوا حطة فد خلوا یزحفون علی استأثمهم فبدلوا و قالوا حطة حبة فی شعرة:

”بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا کہ شہر کے دروازہ میں جھک کر گھسو اور زبان سے حطہ کہتے جاؤ، انہوں نے کیا کیا، سرین کے بل گھسٹتے ہوئے داخل ہوئے اور حطہ کے بدلے حبة فی شعرة (دانہ بالی کے اندر) کہنے لگے۔“  
یہ ان کے تمسخر کی انتہا تھی کہ شرعی احکام کی ذرہ برابر بھی عزت ان کے دلوں میں نہیں ہے۔ جب انہوں نے شریعت کے ساتھ استخفاف کیا اور گناہوں میں مبتلا ہوئے تو خدا کے غضب نے انہیں آلیا اور خود دنیا میں انہیں دکھا دیا کہ نافرمانی کی یہ سزا ہوا کرتی ہے۔

### پانی کی تلاش

وَ إِذِ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ ۖ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۖ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۖ كَلُوا وَ اشْرَبُوا مِنْ رِّزْقِ اللَّهِ وَ لَا تَعْتَوُوا الْاَرْضَ مُفْسِدِينَ ﴿۵﴾

”اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے پانی مانگا تو ہم نے کہا اپنے عصا کو پتھر پر مار، پھر اس سے بارہ چشمے بہہ نکلے، ہر قوم نے اپنا اپنا گھاٹ پہچان لیا۔ ہم نے کہا اللہ کی روزی سے کھاؤ اور پو اور ملک میں فساد پھیلاتے نہ پھرو۔“

شہر میں وبا پڑی اور ہزاروں مر گئے تو تنگ آ کر پھر انہوں نے جنگل کی راہ لی۔ یہاں پانی کا نام و نشان نہ تھا۔ آخر سب نے مل کر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے شکایت کی۔ چنانچہ انہوں نے دعا کی تو حکم ہوا کہ پتھر پر لکڑے مارو۔ لکڑی کا لگنا تھا کہ بارہ قبائل کے لئے بارہ چشمے بن گئے۔ انہیں اب بھی ہر چیز بغیر کسی زحمت کے مل جاتی تھی، اس لئے انہیں حکم دیا گیا کہ قانون کے پابند رہ کر ان چیزوں کو کام میں لائیں اور بے راہ روی اختیار نہ کریں۔

مگر وہ ایک مرتبہ شہر کی زندگی کو دیکھ چکے تھے، تمدن و عیش پرستی اور آرام و آسائش کے جس قدر سامان شہروں میں میسر آسکتے تھے، دیہات میں ان کا عشر عشیر بھی ملنا ناممکن سے تھا۔ اب وہ کس طرح اس سادہ زندگی پر قناعت کرتے۔ آخر ان سے نہ رہا گیا، گئے اور موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی۔

وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَاَدْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِنْ اَرْضٍ مِّنْ بَعْلٰهَا وُتَّاءُهَا وَ قَوْمُهَا وَ عَدَسُهَا وَ بَصِلٰهَا ۚ قَالَ اَسْتَسْتَبِدُّونَ الْاِذِى هُوَ اَذْنٰى بِالْاِذِى هُوَ خَيْرٌ ۚ اِهْبِطُوا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَأَلْتُمْ ۚ وَ ضَرَبْتَ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةَ وَ الْمَسْكَنَةَ ۚ وَ بَآءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِآيَاتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ النَّبِيَّيْنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۚ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۶﴾

”اور جب تم نے کہا اے موسیٰ، ہم ایک کھانے پر صبر نہ کریں گے، پس اپنے پروردگار سے ہمارے لئے دعا کرو۔ وہ ہمارے لئے اس چیز کو نکال دے جو زمین میں اگتا ہے، مثلاً ساگ اور لکڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز۔ موسیٰ نے جواب

دیا کہ کیا تم ایک بہتر چیز بدلے میں ادنیٰ چیز کو لینا چاہتے ہو، کسی شہر میں چلے جاؤ، جو تم ہانگتے ہو وہ تم کو وہاں مل جائے گی۔ اور ان پر خواری اور نامرادی کی مار پڑی اور خدا کے غضب کے سزاوار ہوئے، یہ اس لئے کہ وہ اللہ کا حکم نہ مانتے تھے اور نبیوں کا ناسخ خون کرتے تھے۔ یہ اس لئے کہ وہ تمام حدیں توڑ کر بے لگام ہو گئے تھے۔“

بنی اسرائیل کو ارض مقدس پر حملہ کرنے کے لئے تیار کیا جا رہا تھا، اس کے لئے ضرورت تھی سپاہیانہ زندگی کی، اب جو انہوں نے اپنے مطالبات پیش کئے، تو موسیٰ علیہ السلام نے انہیں سمجھایا کہ تمہارے لئے یہی بہتر ہے، جن چیزوں کی تمہیں تلاش ہے ان سے تمہاری بدویانہ زندگی کو نقصان پہنچے گا۔ مگر جب وہ کسی طرح نہ مانے تو ان سے کہا گیا کہ یہ چیزیں شہر میں مل سکتی ہیں، وہاں جا کر کاشتکاری کرو، شہری زندگی کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ ان میں کابلی اور سستی پیدا ہوتی۔ چنانچہ ان کے قوائے علیہ آہستہ آہستہ بیکار ہوتے چلے گئے اور آخر یہاں تک نوبت پہنچی کہ ان پر ذلت و مسکنت طاری کر دی گئی۔ اس آیت میں چند باتیں بیان کی گئی ہیں جن میں سے ایک دوسری کے لئے علت اور سبب بن رہی ہے۔ سب سے پہلے فرمایا کہ ان پر ذلت و مسکنت طاری کر دی اور اللہ کے غضب میں آگئے، یہ مصائب اس لئے نازل ہوئے کہ وہ کفر آیات اللہ اور قتل انبیاء کے مرتکب ہوتے تھے۔ ان امراض کے اسباب یہ تھے کہ ان کے اندر عصیان وعدوان کی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ اب ان میں سے ہر ایک کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

ذلت: قرآن نے خود دوسری جگہ اس کی تفسیر کر دی ہے۔ فرمایا:

ضَرَبْتُ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةَ اِنَّ مَا تَقْفُوْا اِلَّا بِحَبْلِ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلِ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضَرَبْتُ عَلَيْهِمُ الْمَسْكِنَةَ (سورة آل عمران ۱۱۲)

“ذلت کی مار پڑی جہاں کہیں بھی یہ پائے گئے، یہاں یہ خاکے عہد سے یا انسانوں کے عہد سے یا انسانوں کے عہد سے کہیں پناہ مل گئی ہو تو یہ بھی ذلت ہی کی پناہ ہوئی۔ خدا کا غضب ان پر چھا گیا، محتاجی اور بد حالی میں گرفتار ہو گئے۔“

یہاں ذلت کے معنی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتے کہ وہ دوسروں کے محکوم رہیں گے اور کبھی ان کو حکومت نہ ملے گی۔ خازن میں ہے الذلّة الجویة، یعنی ذلت کا مفہوم یہ ہے کہ دوسروں کی حکومت میں رہیں اور ان کو جزیہ یعنی ٹیکس ادا کریں، آل عمران کی اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

“ذلتهم انك لا تری فی اليهود ملکا قاهرا ولا رئیساً معتبراً بل هم مستضعفون فی جمیع البلاد۔“

“ان کی ذلت یہ ہے کہ نہ تو ان میں کوئی زبردست صاحب تاج و تخت ہے اور نہ صاحب اثر نفوذ بلکہ ہر جگہ ضعیف و کمزور ہی رہتے ہیں۔“

ان تمام تصریحات سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ ذلت غلامی و محکومی کے مترادف ہے۔

مسکنت: بعض کی رائے یہ ہے کہ اس سے بھی مراد جزیہ ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہودی کتناہی دولت مند کیوں نہ ہو، مگر

وہ فقر و تنگدستی ہی کا اظہار کرے گا۔ امام راغب اصفہانی کی رائے یہ ہے کہ وہ کیسے ہی صاحب جاہ و ثروت ہوں، مگر رعب و ہیبت ان سے کوسوں دور بھاگتی ہے۔

کفر بایات اللہ: اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرانی، اس کی آیات کا انکار اور اس کے ارشادات کے ساتھ تمسخر و استہزاء۔ قتل انبیاء: نبیوں کو قتل کرتے تھے، یہ یہودیوں کی خصوصیت بیان کی گئی ہے۔ وہ اس جرم کے مرتکب کیوں ہوتے تھے، اس سوال کا جواب معلوم کرنے سے قبل پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ نبی کی بعثت کس لئے ہوتی ہے۔ قرآن حکیم نے کہا:

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ (سورۃ براہیم ۵)

”اور ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دیکر بھیجا کہ اپنی قوم کو اندھیروں سے نکال کر نور میں لے آؤ۔“

سورۃ اعراف میں مختلف پیغمبروں کا ذکر کیا اور ان کی دعوت کا مقصد اصلی بیان کیا۔ يَقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَهٍ غَيْرُهُ (سورۃ اعراف ۳۰) کہ اللہ کے سوا تمام معبودان باطل کی غلامی سے انکار کرو، اگر ان تمام آیات کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو مستقل رسالہ بن جائے۔ بالجملة ان تصریحات سے واضح ہو جاتا ہے کہ ہر نبی کی زندگی کا مقصد وحید اپنی امت کی اصلاح و تجدید ہوتی ہے۔ وہ اپنے ساتھ ایک تحریک لے کر آتا ہے۔ اس کو کامیاب بنانے کے لئے اپنی تمام سعی و کوشش وقف کر دیتا ہے، اسے اپنی جان کی پروا نہیں ہوتی۔ مخالفین اگر اس کی زندگی کے درپے ہوتے ہیں تو اس لئے نہیں کہ انہیں اس کے خون اور گوشت کے ساتھ دشمنی ہوتی ہے، بلکہ اس لئے کہ اس کے وجود سے وہ تحریک قائم ہے، اگر اس کو جان سے مار ڈالیں گے تو ضرور وہ تحریک بھی فنا ہو جائے گی۔ یہودیوں نے جو اپنے انبیاء علیہم السلام کو قتل کیا تو صرف اس لئے کہ وہ ان کی غلط کاریوں پر تنبیہ کرتے تھے اور ان کی اصلاح کے آرزو مند، یہ لوگ اس غلط گمان میں مبتلا تھے کہ اگر ہم نے ان کو مار ڈالا تو یہ سلسلہ اصلاح و تجدید بھی ان کے ساتھ ہی فنا ہو جائے گا۔

پس یہ حقیقت اب کسی دلیل کی محتاج نہ رہی کہ نبی کا جان سے مار ڈالنا اور اس کی تحریک کا فنا کر دینا دونوں ایک ہی ہیں۔ اگر ایک شخص نبی کا نام تو عزت و تکریم سے لیتا ہے مگر اس کے طریق عمل کو مٹا رہا ہے، تو یہ بھی قتل نبی کا مرتکب ہو رہا ہے اور حدیث کی یہ وعید اس کے لئے تازیانہ عبرت کا کام دیتی ہے۔ امام احمد اپنی مسند میں عبد اللہ بن مسعود سے روایت کرتے ہیں۔

أشد الناس عذاباً رجل قتلہ نبی او قتلہ نبیاً، او امام ضلالة او مبطل من المبطلین۔

”شدید عذاب کا مستحق وہ شخص ہے جس کو نبی نے قتل کیا، یا اس نے نبی کو قتل کیا، یا جاہل اور گمراہ امام جسکی وجہ سے لاکھوں انسان گمراہ ہوں یا وہ شخص جو جاندار کی تصویر کھینچتا ہو۔“

نبی کی سنت کا زندہ کرنا خود اس رسول کو زندہ کرنا ہے، رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

من احیا سنتی فقد احیا منی ومن احیا منی کان معی فی الجنة۔

”جس نے میری سنت کو زندہ کیا اس نے مجھے زندہ کیا اور جس نے مجھے زندہ کیا وہ میرے ساتھ جنت میں ہوگا۔“

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

یا بنی وذلک من سنتی ومن احب سنتی فقد احبنی ومن احبنی کان معی فی الجنة۔  
 “پنا! یہ میری سنت ہے اور جس نے میرے طریق عمل سے دوستی رکھی، وہ مجھے محبوب رکھتا ہے اور مجھ سے دوستی رکھنے والا میرے ساتھ جنت میں ہوگا۔”  
 نبیؐ نے کتاب الزہد میں روایت کیا:

من تمسک بسنتی عند فساد امتی فله اجر مائة شهید۔

“جب امت میں فتنہ و فساد ہو اور ایک مسلمان میری سنت سے تمسک و اعتصام کرے تو اس کو سو شہیدوں کا ثواب ملے گا۔”  
 یہ تمام روایات ببالغ دہل اعلان کرتی ہیں کہ نبیؐ کی سنت کا زندہ کرنا خود اس نبیؐ کو زندہ کر دینا ہے۔

عصیان و عدوان: اس کے عام معنی تو نافرمانی ہی کے ہیں، مگر اس کا ایک اور مطلب بھی بیان کیا جاتا ہے۔ مذہب کے جس قدر احکام ہیں ان کی ایک تو صورت ہوتی ہے جس کی پابندی ہر شخص کو کرنی پڑتی ہے، مگر ایک روح اور حقیقت بھی ہوتی ہے جو اس صورت کی پابندی سے پیدا کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہر مسلمان صاحب استطاعت عید اضحیٰ کے ایام میں قربانی کیا کرے، پھر سورہ حج میں اس کی حقیقت پر بھی روشنی ڈال دی۔ لَنْ يَنْتَظِرَ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا دِمَاؤُهَا وَلَكِنْ يَنْتَظِرُ النَّفْسَ مِنْكُمْ ۖ (سورہ الحج ۳) گوشت اور خون میں سے خدا کے پاس کوئی چیز نہیں جاتی، بلکہ اس کا مقصد اصلی تو جذبہ ایثار و فدائیت کا پیدا کرنا ہے اور بس۔ حج سے فراغت کے بعد فرمایا کہ یہاں پر آکر لوگ دو قسم کے ہو جاتے ہیں۔ ایک وہ جنہیں صرف دنیا اور اس کی جاہ و منزلت مطلوب تھی اور یہ لوگ ملک و ملت کے لئے بیکار ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جن کی نظر دنیا اور آخرت دونوں پر ہوتی ہے۔ اصل میں کام کرنے والے یہی ہیں۔ فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۚ وَمِنْهُمْ مَّن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (سورہ البقرہ ۲۰۱، ۲۰۲) آیتوں میں وہی تقسیم بیان کی گئی ہے جس کا ہم نے تذکرہ کیا ہے۔

شریعت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ چند اخلاق فاضلہ قوم میں پیدا ہوں، مگر ان کے لئے بعض اعمال کا پابند بننا ضروری ہوتا ہے، ورنہ وہ حقیقت پیدا نہیں ہو سکتی۔

جب کسی قوم میں تنزل شروع ہوتا ہے تو سب سے پہلے وہ اعمال کی روح و حقیقت کو کھو بیٹھتی ہے اور صرف ظاہری شکل و صورت پر زور دیتی ہے، اس کو عدوان کہتے ہیں۔ لیکن اس عدوان کا انتہائی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اعمال کو بھی غیر ضروری سمجھنے لگ جاتی ہے، اس لئے کچھ مدت کے بعد احکام و اوامر کا ترک شروع ہو جاتا ہے اور لوگ شریعت کی پابندی کا خیال نہیں کرتے، اس کا نام عصیان ہے۔

عصیان و عدوان کے امراض جب حد سے بڑھ جائیں اور اعمال مذہبی سے بعد و ہجر اپنے کمال پر پہنچ جائے، تو ان

لوگوں کی قدر و قیمت جاتی رہتی ہے جن کے ذریعہ سے شریعت نوازش ہوئی تھی۔ ان کے ساتھ تمسخر و استہزاء کیا جاتا ہے، ان کو حقیر و ذلیل خیال کرنے لگ جاتے ہیں اور اگر ذرا انہوں نے حق و صداقت کے لئے آواز بلند کی، تو چونکہ وہ پہلے ہی سے ادنیٰ سمجھے جاتے تھے، ان کو قتل کیا جاتا ہے اور پھر اس کی آخری منزل اللہ کی آیتوں کا انکار کرنا ہے جس کے بعد ذلت و رسوائی ہے اور غضب الہی ۱۰۔

### رفع اشتباہ

گذشتہ آیات سے معلوم ہو گیا کہ یہودیوں کی غلامی و محکومی کا دائمی فیصلہ ہو چکا ہے، اب یہ کبھی حکومت سے سرفراز نہ ہوں گے بلکہ ہمیشہ ماتحت ہی رہیں گے۔ اس سے یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ اگر ان میں بعض افراد اچھے ہوں تو پھر بھی حکومت انہیں کو ملنی چاہئے، کیونکہ ذلت و مسکنت اجتماعی حیثیت سے نازل ہوئی ہے نہ کہ انفرادی اعتبار سے۔ اس کا جواب اس آیت میں دیا جاتا ہے کہ:-

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئِينَ مِنَ الْيَوْمِ الْآخِرِ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ  
عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۱۲۷﴾ (البقرة ۱۲۷)

”پیشک وہ لوگ جو مسلمان ہوئے اور جو یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابین، جو کوئی ان میں سے اللہ پر اور پچھلے دن پر یقین لایا اور نیک کام کیا تو ان کی مزدوری ان کے رب کے پاس ہے اور نہ ان کو ڈر ہے اور نہ وہ غم کھائیں۔“

رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت اس قسم کے لوگ موجود تھے جو اپنے سچے دین پر قائم اور راہ راست پر گامزن تھے، مگر ان کے کان آپ کی دعوت سے نا آشنا رہے تا آنکہ مر گئے۔ آپ سے دریافت کیا گیا کہ ان کے حق میں کیا فیصلہ ہو گا۔ اس سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کر دی، چنانچہ حسب ذیل روایت اس کی تائید کرتی ہے۔

روی ابن جریر عن مجاہد فی قصة سلمان، طویلة جدا، قال: سأل سلمان رسول الله ﷺ عن أولئك  
النصارى وما راى من أعمالهم، فقال لم يوتوا على الاسلام، قال سلمان فاظلمت على الارض وذكرت اجتها

۱۰ اس آیت میں یہودیوں کی چند خرابیاں ذکر ہوئی ہیں۔ (۱) عدوان (۲) عصیان (۳) قتل انبیاء (۴) کفر بایات اللہ۔ مسلمان اس آیت کو سرسری نظر سے دیکھ کر آگے نہ گزر جائیں بلکہ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ ان میں سے کوئی خرابی ہے جو ان پر صادق نہیں آتی۔ کیا عصیان و عدوان سے وہ اپنے آپ کو پاک سمجھتے ہیں۔ اکثر افراد کا مذہبی کو غیر ضروری خیال کرتے ہیں۔ جو پابند ہیں وہ روح و حقیقت سے بے خبر ہیں صرف کلمہ کے پیچھے چلے جا رہے ہیں۔ کس طرح رسول اللہ کی سنت کو مردہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے گویا دوسرے الفاظ میں رسول اکرم کے قتل کے درپے ہیں۔ پھر کفر بایات اللہ (بقیہ اگلے صفحہ پر دیکھیے)

تو اس کا لازمی اور قطعی نتیجہ ہے۔ جب نوبت یہاں تک آگئی تو یہودیوں کو ان حرکات کا جو صلہ ملا، مسلمان بھی اس سے محروم نہیں رہے یعنی ذلت و مسکنت اور اللہ کا غضب ان کی حکومتیں چھین گئیں، غیروں نے ان پر قبضہ کر لیا بلکہ خود ان کو مدد دی کہ ہمارے بھائیوں کو فاکر و اور ان کے ملکوں پر قبضہ کر لو۔ اب محکومی و غلامی ہے، ذلت و رسوائی ہے اور خدا کے غضب میں مبتلا ہیں فاعتبوا یا اهل الابصار۔

دھم، فنزلت هذه الآية، ان الذين امنوا والذين هادوا، فدعا سلمان فقال نزلت هذه الآية في اصحبك ثم قال من مات على دين عيسى قبل ان يسبح على فهو على خير ومن سب عيسى ولم يؤمن هو فقد هلك۔

“ابن جریر نے مجاہد سے سلمان کا بہت بڑا قصہ نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سلمان نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ ان انصاری کا کیا حال ہو گا اور ان کے اعمال کا جو اسی نے دیکھے تھے کہ جنہوں نے دیکھا تھا کہ وہ لوگ نہایت ہی زاہدانہ زندگی بسر کرتے تھے، آپ نے فرمایا ان کی موت کفر پر ہوئی۔ سلمان کہتے ہیں کہ سنتے ہی مجھ پر دنیا تاریک ہو گئی، میں نے ان کے ورع و تقویٰ کا ذکر کیا، پس یہ آیت ان الذین امنوا نازل ہوئی۔ آپ نے سلمان کو بلا کر کہا کہ تمہارے دوستوں کے حق میں آیت نازل ہوئی ہے، پھر فرمایا کہ جو شخص دین عیسیٰ پر مر گیا اور میری اطلاع اسے نہیں ہوئی تو وہ حالت اسلام میں مر اور جسکے پاس میری نبوت کی خبر پہنچ گئی اور پھر بھی وہ ایمان نہ لایا تو ہلاک ہو گیا۔”

اس شان نزول نے خود بتادیا کہ اس آیت کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو آپ کے وقت تک موجود تھے اور حق و صداقت کو کھو نہیں بیٹھے تھے۔ قرآن حکیم کی دوسری آیتیں اسی مطلب کی تائید کرتی ہیں۔ ایک جگہ فرمایا:

وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةَ لِّدِينٍ آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصْرِي ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَسِيصِينَ ۖ وَهُبَانًا ۖ وَأَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ۝ وَإِذَا سَبَّحُوا مَا أُنْزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ۝ وَمَا لَنَا لَا تُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا جَاءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۚ وَنَطْمَعُ أَنْ يُدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصَّالِحِينَ ۝ (المائدہ ۸۲، ۸۳)

“اور مسلمانوں کے لئے تبلیغ و دعوت کے اعتبار سے سب لوگوں میں ان کو قریب تر پاؤ گے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس لئے کہ ان میں علماء اور مشائخ ہیں اور نیز یہ کہ یہ لوگ تکبر نہیں کرتے اور جب قرآن کو سنتے ہیں جو اس رسول پر نازل ہوا ہے، تو ان کی آنکھوں کو دیکھتا ہے کہ ان سے آنسو جاری ہیں، اس لئے کہ انہوں نے حق بات کو پہچان لیا ہے۔ کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار! ہم تو اس پر ایمان لے آئے ہیں، تو تصدیق کرنے والوں کے ساتھ ہم کو بھی لکھ رکھ اور ہم کو کیا ہو گیا ہے کہ اللہ پر اور حق بات جو ہمارے پاس آئی ہے اس پر تو ایمان لائیں نہیں اور توقع یہ رکھیں کہ ہمارا پروردگار ہم کو نیک بندوں کے ساتھ بہشت میں لے جا کر داخل کرے گا۔

پھر سورہ آل عمران کے آخر میں یوں ارشاد ہوا:

وَإِنَّ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَمَنْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ خُشِعِينَ لِلَّهِ لَا يَشَتُّونَ بِآيَاتِ اللَّهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۖ أُولَٰئِكَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۖ (ال عمران ۱۹۹)

“اور اہل کتاب میں سے بیشک کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کتاب تم مسلمانوں پر اتاری ہے اور جو ان پر اتاری ہے، ان سب پر ایمان رکھتے ہیں اور ہر وقت اللہ کے آگے جھکے رہتے ہیں اور اللہ کی آیتوں کے عوض میں تھوڑے سے دام نہیں لیتے، یہی وہ لوگ ہیں جن کے اجر ان کے پروردگار کے ہاں تیار موجود ہیں۔



پس معلوم ہو گیا کہ اس آیت میں وہی لوگ مراد ہیں جو آپ کی بعثت کے وقت موجود تھے، پھر جو ایمان لے آئے وہ دنیا و آخرت میں فائز المرام ہوں گے۔ باقی رہا حکومت کا مسئلہ تو وہ بھی ضمناً سمجھ میں آ گیا کہ بعض افراد تو ہر قوم میں اچھے ہوتے ہیں، لیکن ان کی وجہ سے تمام قوم کو عزت کا مستحق نہیں قرار دیا جاسکتا، کیونکہ اس کا فیصلہ ہمیشہ اجتماعی حیثیت کو پیش نظر رکھ کر کیا جاتا ہے۔ غالباً یہ بات تو ہر ایک تسلیم کرے گا کہ ہر مذہب میں کچھ نہ کچھ ارباب صلاح و تقویٰ ضرور ہوتے ہیں، اگر چند افراد کی اچھائی یہودیوں کو حقدار حکومت بناتی ہے تو دوسرے مذاہب بھی اس کے دعویٰ دار بن سکتے ہیں، پس یہ مطالبہ ہی سرے سے غلط ہے۔ تم ذرا ان کی تاریخ کو اٹھا کر دیکھو۔ ان لوگوں سے کیسی کیسی غلیاں سرزد ہوئیں جن میں سے بعض کا ذکر آچکا ہے اور کچھ آگے آتی ہیں، پھر بتانا کہ ایسی قوم کے متعلق محکمہ تحقیق کا کیا فیصلہ ہونا چاہئے۔

### قانون سے نفرت

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ ۖ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ ۖ وَادْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۷﴾ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِمَّنْ بَعْدَ ذَلِكَ ۖ فَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَكُنْتُمْ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿۸﴾

”اور جب ہم نے تم سے اقرار لیا اور تم پر پہاڑ اونچا کیا، ہم نے کہا جو ہم نے تم کو دیا اس کو زور سے پکڑو اور جو اس میں ہے اسے یاد کرتے رہو، شاید تم پناہ میں آ جاؤ۔ پھر اس کے بعد تم نے روگردانی کی۔ پس اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم زیاں کاروں میں ہوتے۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معرفت اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ وہ توراۃ کے پابند رہیں گے، وہ دامن کوہ میں کھڑے تھے اور اپنے سامنے پہاڑ کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں خیال ہوا کہ وہ ان پر گر رہا ہے۔ اس کے گرتے ہی تمام لوگ فنا ہو جائیں گے اور ان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا۔ اللہ تعالیٰ انہیں یہ بتانا چاہتا تھا کہ جو قانون تم کو دیا گیا ہے وہی تمہارے لئے زندگی بخش ہے، اگر تم اس کو ترک کر دو گے تو مٹ جاؤ گے۔ اس حقیقت کو اس مثال سے اور زیادہ واضح کر دیا کہ یہ پہاڑ تمہارے سامنے رفیع و بلند دکھائی دے رہا ہے، جب تک یہ اپنی جگہ پر قائم ہے تم زندہ ہو، جہاں تمہارے اوپر گرا اور تم پس گئے، پس اسی طرح یقین کر لو کہ توراۃ کی پابندی میں زندگی ہے، اور ترک میں ذلت و رسوائی۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ پہاڑ ان کے سر پر بلند کر دیا گیا تھا، بلکہ اپنے سامنے اس کو دیکھ رہے تھے۔ حدیث میں آتا ہے فرفعت لنا صخرة، جس کے معنی صاحب بحر الانوار نے یہ کئے ہیں کہ ظہرت لابصارنا، یعنی چٹان ہمیں نظر آنے لگے۔ پس یہاں بھی یہی معنی مراد ہیں کہ وہ اپنے سامنے پہاڑ کو دیکھ رہے تھے۔

باوجود اس قدر پکے عہد کے ان لوگوں نے نفرت کا اظہار کیا اور کہا۔ سَبِعْنَا وَعَصَيْنَا (البقرہ ۹۳) ایک جگہ ان کا یہ قول نقل کیا: وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ (البقرہ ۸۸) اور کہتے ہیں ہمارے دل غلافوں میں ہیں، ہم اس نبی کی تعلیم قبول نہیں کرتے۔ اس عصیان اور نفرت کا نتیجہ تو یہی تھا کہ تم کو اسی وقت فنا کر دیا جاتا۔ مگر چونکہ اس وقت کوئی دوسری قوم تبلیغ



ودعوت کافر ادا کرنے اور دنیا میں قیام عدل کے لئے تیار نہ تھی، اس لئے ہم نے تم پر اپنا فضل کیا، تم میں برابر مجددین انبیاء بھیجے رہے جو تمہاری غلط کاریوں کی اصلاح کرتے اور پھر تمہیں راہِ راست پر لے آتے، انبیائے مجددین کے بھیجنے کو اس آیت میں فضل و رحمت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہاں تک ان کے مرضِ تولی اور نفرت کا ذکر کیا۔ اگلی آیتوں میں اس کی دو صورتیں بیان کی جاتی ہیں کہ انہوں نے کس کس طرح قانونِ الہی سے نفرت کی:

### حیلہ سازی

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ﴿۷۱﴾ فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِّبَايِنٍ يَذَّبْنَهَا  
وَمَا خَلَقَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ﴿۷۲﴾

“اور جن لوگوں نے تم میں سے ہفتہ کے دن زیادتی کی ان کو تم جان چکے ہو، تو ہم نے کہا ہو جاؤ بندر ذلیل، پھر ہم نے اس قصہ کو عبرت بنایا ان لوگوں کے لئے جو اس وقت شہر میں تھے اور بعد میں آنے والوں کے لئے اور پرہیزگاروں کے لئے ہند و نصیحت۔”

اس واقعہ کی شرح دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

وَسَلُّهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاصِرَةً الْبَحْرُ إِذْ يَعْدُونَ فِي السَّبْتِ إِذْ تَأْتِيهِمْ حِينَتُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرْعًا  
وَيَوْمَ لَا يَسْبِتُونَ لَا تَأْتِيهِمْ كَذَلِكَ ۖ بَلَّوْهُمْ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿۷۳﴾ (اعراف ۱۶۳)

“ان سے اس گاؤں کا حال دریافت کرو جو دریا کنارے واقع تھا، جب ان کے بڑے لگے بہت سی زیادتیاں کرنے کہ جب ان کے سبت کا دن ہوتا تو مچھلیاں پانی پر تیری ہوئی ان کے پاس آ جاتیں، مگر جس دن نسبت نہ مانتے نہ آتیں۔ اسی طرح ہم انہیں آزمائش میں ڈالتے تھے بسبب اس ی نافرمانی کے جو وہ کیا کرتے تھے۔”

بنی اسرائیل کے لئے شنبہ کا روز عبادت کے لئے مخصوص تھا، لیکن شرط یہ تھی کہ اس دن کوئی کام نہ کیا جائے، جیسے اب بھی مسلمانوں کو حکم ہے کہ جب جمعہ کی اذان سنیں تو تمام کاروبار دنیوی ترک کر کے فوراً مسجد میں آجائیں، إِذَا نُودِيَ لِلْمَسْلُوكِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ (الجمعة ۹) قانون کا تقاضا یہ تھا کہ یوم السبت کو مچھلی کا شکار بھی نہ کریں، مگر مصیبت یہ تھی کہ صرف شنبہ کے روز تو مچھلی بکثرت آتی اور باقی ایام میں ایک بھی نہ ملتی۔ دریا کے کنارہ پر رہتے تھے، ان کے لئے اس سے بہتر دوسری غذا نہ تھی، حیران تھے، آخر علمائے نے انہیں یہ حیلہ سکھا دیا کہ شنبہ کے روز دریا سے فاصلہ پر گھرے گڑھے کھود لیں تاکہ پانی آسکے، مچھلی بھی خود بخود آجائے گی، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ دن بھر مچھلی گڑھوں میں آتی رہتی اور شام کو جا کر شکار کر لیتے، اس میں بظاہر قانون کی صورت بھی قائم رہی اور ان کی غرض بھی حاصل ہو گئی۔

یہ ارباب حیل کی فریب کاری تھی، جب اس مرض کی انتہا ہو گئی اور باوجود تنبیہ و تادیب وہ لوگ باز نہ آئے تو ان پر عذاب نازل ہوا۔ ان لوگوں کے تین گروہ تھے، ایک وہ جو عوام الناس کو ان حیلوں کی تعلیم دیتا، دوسرا ان کی اس مکاری پر خاموش رہا اور تبلیغ و دعوت کا فرض ادا نہ کرتا۔ یہ دونوں گروہ عذاب الہی میں گرفتار ہوئے، تیسرا فرقہ بچ گیا جو ان کے اصرار و تمرد کے باوجود وعظ و ارشاد میں برابر مصروف رہا۔ چنانچہ اس کی تفصیل دوسری جگہ آئی ہے۔

وَإِذْ قَالَتْ أُمَّةٌ مِنْهُمْ لِمَ تَعِظُونَ قَوْمًا ۚ اللَّهُ مُهْلِكُهُمْ أَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا ۖ قَالُوا مَعَذِرَةَ إِلَىٰ رَبِّكُمۥ وَلَعَلَّهُمْ يَنْتَفِعُونَ ﴿١٦٥﴾ فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ أَنحَنَّا الَّذِينَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوءِ ۖ وَأَخَذْنَا الَّذِينَ ظَلَمُوا بِعَدَابِ بَٰئِسٍ ۖ بَٰئِسٌ كَانُوا يَنْسِفُونَ ﴿١٦٦﴾ (الاعراف ۱۶۵، ۱۶۶)

“اور جب ان میں سے بعض لوگوں نے دوسروں سے جو سبت کے دن شکار کرنے سے منع کرتے تھے کہا، کہ جن لوگوں کو خدا ہلاک کرنا یا ان کو سخت عذاب میں مبتلا کرنا چاہتا ہے، بھلا ان کو تم بے فائدہ کیوں نصیحت کرتے ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم تو تمہارے پروردگار کے حضور معذرت کر سکیں اور یہ بھی خیال ہے کہ شاید یہ لوگ باز آجائیں۔ تو جب ان لوگوں نے وہ نصیحتیں جو ان کو کی گئی تھیں بھلا دیں، تو جو لوگ برے کام سے منع کرتے تھے ان کو تو ہم نے بچا لیا اور جو لوگ شرارت پر اصرار کرتے رہے، ان کی نافرمانیوں کی پاداش میں ہم نے ان کو عذاب سخت میں مبتلا کیا۔”

جب قوم کا بیشتر حصہ اس مرض خبیث کا شکار ہو گیا تو ان کی اخلاقی حالت بھی مسخ ہوتی چلی گئی۔ ان کے اخلاق جانوروں کی طرح ہو گئے۔ وہ اگرچہ انسانوں کی صورت میں تھے، مگر اب ان میں اور حیوانوں میں کوئی چیز ماہہ الافراق نہ رہی تھی۔ اب وہ خیر البریہ کی بجائے شر البریہ، الاعمیٰ اور الذین لا یعلمون تھے۔ انجام کار، قوم کی قوم زنا کی عادی بن گئی اور جس کی آخری کڑی یہ تھی کہ وہ بندر اور سور بنا دیئے گئے۔ کیونکہ بعض امراض اس قسم کے ہوتے ہیں کہ انسان کی صورت مسخ ہو جاتی ہے اور وہ بالکل جانوروں کے مشابہ ہو جاتا ہے۔

جب تک انسان کی صحت عمدہ ہے، کوئی خارجی مضر چیز اس پر اپنا اثر نہیں ڈال سکتی، جہاں اس کی صحت نے جواب دیا کہ چاروں طرف سے امراض کا حملہ شروع ہو جاتا ہے اور طبیعت ان کو فوراً قبول کر لیتی ہے، یہی حال روحانی صحت و تندرستی کا ہے۔ جب ایک قوم بری عادتیں قبول کرنا شروع کر دیتی ہے تو سب سے پہلے اس کے اخلاق پر ان کا اثر نمودار ہوتا ہے اور یہ بالکل ممکن ہے کہ جن حیوانوں کے اخلاق اس نے ابتدا میں قبول کئے تھے، انہیں کا برا اثر عالم مثال تک پہنچنے پر ان کی صورتیں اخذ کر لیں اور انجام کار، ان کی صورتیں بھی ویسی ہی ہو جائیں۔ انسان اگر تنزل کے گہرے گڑھے میں گرنا شروع ہوا اور اس سے انسانیت چھین لی جائے تو سب سے پہلے وہ بندر بنتا ہے، اس لئے کہ حیوانات میں سے انسانوں کے قریب ترین یہی جانور ہے۔

سورہ نساء میں اہل کتاب کو دھمکی دی گئی ہے کہ اگر تم اس کتاب پر ایمان نہ لائے تو تمہارا بھی وہی حال ہو گا جو اہل سبت کا ہوا، چنانچہ فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّن قَبْلِ أَن نَّطْفِئَ سَوْءَهَا فَتَرْكُهَا عَلَىٰ أَذْبَارِهَا أَوْ  
نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّا أَصْحَابَ السَّبْتِ ۚ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا ﴿٢٤﴾ (النساء ۴۷)

”اے اہل کتاب قرآن پر ایمان لے آؤ جو ہم نے نازل فرمایا ہے اور وہ اس کتاب کی تصدیق کرتا ہے جو تمہارے پاس ہے، قبل اس بات کے کہ ان کے چہرے بگاڑ کر ان کی پشت کی طرف کر دیں اور اب وہ منزل کو ترقی خیال کرنے لگ جائیں یا جس طرح ہم نے اصحاب السبت کو پھینکا دیا تھا، ان کو بھی پھینکا دیں اور جو خدا کو منظور ہے وہ ہو کر رہے گا۔“  
قانون ترک کرنے کی ایک صورت تو یہ تھی کہ حیلہ جوئی سے کام لیا، اس کی ظاہری شکل بھی قائم رہی۔ دیکھنے والا اعتراض بھی نہیں کر سکتا اور اپنا مطلب بھی نکل آیا۔ اب اس کے چھوڑنے کی دوسری صورت بیان کی جاتی ہے۔

### باریک بینی

جب قانون پر عمل کرنا منظور نہ ہو تو اس میں فلسفیانہ موٹو گائیوں سے کام لیا جاتا ہے۔ بال کی کھال نکالی جاتی ہے اور مقصد یہی ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس سے نجات مل جائے۔ سوالات کثرت سے کئے جاتے ہیں۔ باتیں بہت سی پوچھی جاتی ہیں۔ فرضی صورتیں پیش کرتے ہیں اور ان تمام کا حاصل ترک قانون کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، ملاحظہ ہو:

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً ۚ قَالُوا أَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۚ قَالَ أَعُمِدُوا بِاللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ﴿٢٥﴾ قَالُوا اذْهَبْ لَنَا رَبِّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ ۖ لَا فَارِصٌ وَلَا بَكْرٌ ۚ عَوَانِ بَيْنَ ذَلِكَ ۚ فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ ﴿٢٦﴾ قَالُوا اذْهَبْ لَنَا رَبِّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا لَوْهَا ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ ۖ ذِي صَفْرٍ ۚ فَافْعَلْ لَّوْنَهَا تَسْمُ اللَّطِيطِينَ ﴿٢٧﴾ قَالُوا اذْهَبْ لَنَا رَبِّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ ۚ إِنَّ الْبَقَرَةَ تَشْبَهُ عَلَيْنَا ۚ وَإِنَّا إِن شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ﴿٢٨﴾ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ ۖ لَا ذَلُورٌ يُثْمِرُ ۖ وَلَا رِثٌ وَلَا تَسْقَى الْحَرْثَ ۚ مُسْلِمَةٌ ۖ لَا شَيْءَ فِيهَا ۚ قَالُوا النَّنْ جِئْتُ بِالْحَقِّ ۚ فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ﴿٢٩﴾

”اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا، اللہ تم کو ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے، وہ بولے، کیا تو ہم سے استہزا کرتا ہے، انہوں نے کہا، اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ نادانوں میں سے ہو جاؤں۔ بولے اپنے رب کو ہمارے لئے پکار کہ ہمیں بتادے وہ گائے کیسی ہے، کہا، وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہونہ بوڑھی اور نہ بن بیانی، ان کے درمیان ہے۔ پس جو حکم تم کو ملا ہے اس کو کرو۔ بولے اپنے رب کو ہمارے واسطے پکار ہمیں بتادے کہ اس کا رنگ کیسا ہو۔ کہا حکم الہی یہ ہے کہ اس کا رنگ پیدا ہو۔ کہ دیکھنے والوں کا جی خوش ہو جائے۔ بولے ہمارے لئے اپنے رب کو پکار کہ وہ بتادے کہ وہ کس قسم کی ہے کیونکہ ہم کو گایوں میں شبہ پڑ گیا ہے اور اللہ نے چاہا تو ہم راہ پائیں گے۔ کہا وہ فرماتا ہے ایسی گائے ہو، جو نہ تو کبھی بل میں جوتی گئی ہو نہ کبھی آپ پاشی کے لئے کام میں لائی گئی ہو، پوری طرح صحیح سالم، داغ دھبے سے پاک و صاف بولے اب ٹھیک بات بیان کی، پھر اس کو ذبح کیا اگرچہ ایسا کرنے پر وہ (دل سے) آمادہ نہ تھے۔“

اگر وہ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حکم سنتے ہی گائے ذبح کر دیتے تو انہیں اتنی تکالیف برداشت کرنے کی نوبت ہی نہ

آتی، مگر ان کی نیت نہ تھی، اس لئے کثرت سوال سے موسیٰ کو تنگ کر دیا۔ پس خود تنگی میں مبتلا ہو گئے۔ قاعدہ ہے کہ قانون اپنی ابتدائی شکل میں بہت سادہ اور سہل ہوتا ہے، مگر جوں جوں آپ سوالات کرتے جائیں گے، قیود اور پابندیاں بڑھتی جائیں گی اور اس کا دائرہ تنگ ہوتا جائے گا۔ حضرت موسیٰ انہیں بار بار کہتے ہیں اَعُوذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ مِثْرًا حکم بغیر کسی مصلحت کے نہیں بلکہ اس میں بہت بڑی حکمت پوشیدہ ہے، مگر وہ اپنی کٹ جھتی سے کیوں باز آنے لگے، اس لئے نتیجہ بھی دیکھ لیا۔

وَ اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادْرَأْتُمْ فِيهَا ۗ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ﴿۲۷﴾ قُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا ۗ كَذٰلِكَ يُعْطِي اللّٰهُ الْمَوْتِىَ ۖ وَيُرِيكُمْ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿۲۸﴾

“اور جب تم نے ایک شخص کو مار ڈالا پھر اس کے دوسرے پر قتل کا الزام لگانے لگے اور جو تم چھپاتے تھے اللہ کو اس کا باہر نکالنا تھا۔ پھر ہم نے کہا اس مردے کو اس گائے کا ایک ٹکڑا مارو، اسی طرح زندہ کرے گا اللہ مردوں کو اور تم کو اپنے نمونے دکھاتا ہے، شاید تم عقل کرو۔”

جب ان لوگوں نے گائے ذبح کر لی تو اتفاق سے وہاں ایک قتل ہو گیا اور باوجود سخت کوشش کے قاتل کا پتہ نہ لگا، اللہ تعالیٰ نے موسیٰ کو حکم دیا کہ گائے کا ایک ٹکڑا مقتول کی لاش پر مارو، چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا۔ مردہ زندہ ہو گیا اور اس نے قاتل کا پتہ بتا دیا۔ اب اس پر اللہ تعالیٰ انہیں متنبہ کرتا ہے کہ جس حکم کی تمہیں مصلحت معلوم نہ تھی وہ کس طرح تمہارے لئے زندگی بخش ثابت ہوا۔ آئندہ تمہیں چاہئے کہ نبی کا ہر حکم ماننے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ یہ یقین کر لو کہ نبی کے ہر حکم میں ضرور کوئی نہ کوئی مصلحت و حکمت ہوگی، مگر یہ ضروری نہیں کہ تمہیں بھی اس کا علم ہو جائے۔ دیکھو گائے ذبح کرنا تم بے سود خیال کرتے تھے، مگر موسیٰ کو خبر تھی کہ اس پر عمل کرنے سے تمہیں کس قدر فائدے حاصل ہوں گے، پس پھر کبھی یہ حرکت نہ کرنا۔

اللہ تعالیٰ انہیں گائے ذبح کرنے سے یہ بتانا چاہتا تھا کہ:

(الف) نبی کی اطاعت قوم کے لئے ضروری ہے کہ اس سے قوم زندہ ہو جاتی ہے۔

(ب) نبی کے ہر حکم میں حکمتوں اور دانائیوں کے خزانے مخفی ہوتے ہیں۔

(ج) حیات قومی کے لئے قربانی الزم اللوازم ہے۔

بعض مفسرین نے قتل کے واقعہ کو پہلے فرض کیا ہے اور گائے کے ذبح کرنے کو اس کے بعد، حالانکہ قرآن حکیم کی آیات اس کی تائید نہیں کرتیں، بلکہ ان سے وہی اقرب الی الصواب معلوم ہوتا ہے جس کو ہم نے اختیار کیا ہے کہ گائے ذبح کرنے کا حکم پہلے ہوا ہے، بعد ازاں اتفاقی طور پر دوسرا واقعہ پیش آگیا<sup>①</sup>۔

① (۱) آیات ماسبق میں علمائے یہود کی تین اصولی غریباں ذکر کی گئی ہیں:

(الف).... قانون الہی سے نفرت۔

(ب).... حیلہ سازی۔

(ج).... تعق اور بار یک بنی۔

اگر صادق و مصدق رسول اکرم ﷺ کا یہ قول صحیح ہے اور یقیناً صحیح ہے کہ:

لیاتین علی امتی ماتی علی بنی اسرائیل حذو النعل بالنعل۔

”جو کچھ بنی اسرائیل کے ساتھ ہوا وہی میری امت کے ساتھ ہو گا۔“

تو یقین کیجئے کہ علمائے یہود کے خرابیاں آج امت مسلمہ کے علمائے سومیں موجود ہیں۔ ہم پہلے حیلہ سازی کو لیتے ہیں، پھر بار یک بنی پر بحث کریں گے، مگر صرف اشارات پر اکتفا کیا جائے گا۔

رسول ﷺ نے حیلوں کا سد باب یہاں تک کیا کہ قاضیوں کو ہدایا قبول کرنے سے روک دیا کہ رشوت ستانی کا ایک حیلہ بن سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا ہدایا الولا غلغل ابو داؤد میں ہے: استعملنا علی عمل و درمناہ و درمناہ اخذنا بعد ذلك فهو غلغل ہم نے اسے کام پر لگایا اور تنخواہ معین کر دی اس کے علاوہ وہ جو کچھ لوگوں سے لے گا وہ غلغل ہے۔ ایک روایت میں فرمایا: اخذنا الامیر الہدیۃ سحت امیر کا ہدیہ قبول کرنا مال حرام کا لینا ہے۔ اسی طرح مقروض سے ہدیہ اور تحفہ کا لینا ناجائز قرار دیا کہ سود کے لئے حیلہ بن سکتا ہے۔ اذا اقترض احدکم قرضاً فاهدی الیہ او حبلہ علی ال دابتہ فلا یدکبھا ولا یقبلہ الا ان یکون جری بینہ و بینہ قبل ذلك اگر تمہارا مقروض تمہیں ہدیہ دے یا سواری کے لئے جانور پیش کرے تو اس پر سوار نہ ہونا اور ہدیہ بول نہ کرنا ہاں اگر پہلے ہی سے یہ سلسلہ ہو تو کوئی حرج نہیں۔ اسی بنا پر اجلہ صحابہ نے ہدیہ مقروض کی نسبت فتویٰ دیا کہ وہ ربوہ میں داخل ہے۔

باوجود کتاب و سنت کی تصریحات کے ارباب دجل و فریب اور اہل جدل و مکارہ نے وہ وہ حیلہ سازیوں کی ہیں کہ:

دائے گر در پس امروز بود فردائے!

دوسری صدی کے شروع ہی میں بعض علماء سو اور فقہاء نے حیلہ تراشیں شروع کر دی تھیں اور تیسری صدی کتاب الحیل کی باقاعدہ تدوین و ترتیب عمل میں آگئی تھی، اس میں انہوں نے اپنے پیشرو یہودیوں کو بھی مات کر دیا۔ خدا کا حکم تھا کہ ہر مالدار کو کوڑے، انہوں نے سال کے آخر میں تمام مال بیوی کے نام بہہ کر دیا کہ خدا دعوے میں آکر ہم کو مفلس و نادار سمجھے گا۔ و ما یخدعون الا انفسہم و ما یسعرون۔

اجیرہ زانیہ کے اجر مثل کا جزیہ کس سے مخفی ہے۔ اس نے صاف صاف زانیہ کی اجرت کو جائز قرار دیا اور تو سبیخ کار و بار زنا بن گیا، اس کے حلال و طیب ہونے کی صورت ملاحظہ ہو: ان یستأجرہا کنس بیۃ اولطی ثیابہ او طبخ طعامہ او نقل متاع من مکان الی مکان و یشتطیہا الزنا ثم ینزی۔

کسی شخص نے گھر کا کام کاج کرنے کے لئے یا کھانا پکانے کے لئے یا کسی اور فعل مباح کے لئے ایک عورت سے عقد اجارہ کیا کہ اتنی مزدوری پر میرا کام کر دینا اور ساتھ ہی یہ شرط بھی ٹھہرائی کہ تجھ سے زنا بھی کروں گا، تو چونکہ یہ مشروع باطل و غیر مشروع بوضفہ ہے اس لئے اجارہ فاسد ..... (بقیہ اگلے صفحہ پر دیکھے) ہوا، لیکن اجرت حلال ٹھہری۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اگر کسی فقہی حیلے نے ذرا چشم و ابرو دیکھ کر کسی اچھی سی اماں کو کام کاج کے لئے مزدوری پر رکھ لیا، ساتھ ہی یہ شرط بھی ٹھہرائی کہ گاہ کا کچھ اور مسئلہ بھی جاری رہے گا تو کسی اجرت اس ملا کے لئے جائز اور حلال و طیب ہے۔ تعالیٰ اللہ صلی علیہ وسلم علوٰ کہید۔

مسئلہ نفاذ قضاء قاضی ظاہر ادا ہونا بھی اسی قبیل سے ہے۔ عدالت میں قاضی کے دو روایت بتا لیجئے پھر جب عدالت نے فیصلہ دے دیا تو وہ حلال و طیب ہے اگر چہ صد ہا حیلوں اور مکاریوں کے بعد یہ فیصلہ صادر ہو ہو، گو باشریعت کے تمام اوامر و انوائی کا داور و داور اور مواخذہ آخرت کی بنا صرف دنیا کے احکام و ظواہر ہیں، روح و حقیقت اعمال اور محاسن و فضائل اخلاق سے کوئی تعلق نہیں۔

درازدستی ایں کو نہ آستیناں میں!

تعق اور بار یک بنی: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: هلك المتعقون بار یک بنی کرنے والے ہلاک ہوں گے، مگر مسلمانوں نے اس کی پروانہ کی اور اب تو ان کے مذہب کی ہر شاخ میں اس طرح تعق جاری و ساری ہو گیا ہے کہ حق کو باطل سے الگ کرنا قریب قریب ناممکن ہو گیا ہے، اس لئے کہ اس نے مذہب کی شکل اختیار کر لی ہے۔

پانی کتنا پاک ہو تا ہے۔ ہر شخص اس حقیقت سے واقف ہے، اس لئے کہ پیدا ہوتے ہی اس پاک و ناپاک پانی میں تیز کر دیتی ہے۔ اصل شریعت نے ہر انسان کی طبیعت اور سلامت و ذوق پر چھوڑ دیا تھا مگر ارباب فتاہت نے تو اس میں اتنی پابندیاں عائد کر دیں کہ مشکل پڑ گئی۔ اس میں فقہاء خرمان و بخارا کی تقریعات دیکھنے کے قابل ہیں۔ ان کے نزدیک اس کو نہیں پانی ناپاک ہے جس میں سے چر سا اور رہت کے ذریعہ پانی نکالا جاتا ہو کیونکہ ممکن ہے کہ اس میں گوبر وغیرہ گر جاتا ہو۔ یہی حال مسئلہ خلق قرآن اور امکان کذب باری کا ہے۔

## حیات قومی کی لئے تین قسم کے لوگوں کی ضرورت

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذَلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً ۚ وَإِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهَارُ ۚ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَاءٌ يَّسْقَىٰ فَيَكْبِتُ عَنْهُ النُّبَأُ ۚ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَاءٌ يَّهْبِطُ ۚ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ ۚ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٥٠﴾

”پھر اس کے بعد تمہارے دل پتھر کی مانند بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت ہو گئے، حالانکہ بعض وہ پتھر ہوتے ہیں جن سے نہریں بہہ نکلتی ہیں، وہ بھی ہیں جو پھٹتے ہیں اور ان سے پانی نکلتا ہے اور ان میں وہ بھی ہیں جو اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں اور اللہ تمہارے کام سے بے خبر نہیں۔“

اس قسم کے واقعات تمہارے سامنے ہوتے رہے، اگر دیدہ عبرت وا ہو تا تو ہدایت و سعادت انسانی کے صدمہ ہمارے تھے جن کا ان سے پتہ لگ سکتا تھا، مگر تمہارے دلوں پر ان کا کچھ بھی اثر نہ ہوا اور سختی میں پتھروں سے بھی آگے نکل گئے، حالانکہ پتھروں کی مختلف قسمیں تمہارے سامنے ہیں اور ان کے حالات تم سے جدا لگائے۔

اور اس آیت میں دراصل اللہ تعالیٰ نے پتھروں کی مثال دیکر کراہیک حقیقت کبریٰ کی طرف ہماری راہنمائی کی ہے اور وہ یہ ہے کہ قوموں کے نشو و ارتقا کے لئے تین قسم کے ارباب علم و فضل کی ضرورت ہے۔

(الف) وہ اہل علم و معرفت جن کے قلوب میں فیوض و برکات الہیہ کے دریا موجزن ہوں، جو اپنے حکیمانہ مواعظ اور کتاب و سنت کے درس و افتاء سے لاکھوں کروڑوں انسانوں کو مستفید کریں، چاروں طرف ان کے علم و فضل کی نہریں جاری ہوں اور ہر جانب کے تشنہ لب وہاں آکر اپنی پیاس کو دور کریں، ہزاروں دلوں کی زندگی کا باعث ہوں اور ان سابقین اولین کی فیض صحبت سے کوئی بھی محروم نہ رہے۔

(ب) ایسے صاحبان دانش و حکمت جو اپنے گرد و پیش کے لوگوں کی راہ نمائی کر سکیں، ان کی آس پاس کی آبادی سے مستفید ہو اور اپنے ارد گرد رہنے والوں کی اصلاح کرنے کے قابل ہوں۔

(ج) وہ ارباب ورع و تقویٰ جن کے قلوب اپنے خالق کے ساتھ وابستہ ہوں اور اللہ کا خوف ان کے رگ و پے میں جاری و ساری ہو، جب انہیں کوئی صحیح بات بتادی جائے ان کی گردنیں فوراً اس کے آگے جھک جائیں۔ وہ یکسر اطاعت و انقیاد ہوں اور اس کے سوا اور کچھ جانتے ہی نہ ہوں۔

جب تک کسی قوم میں مذکورۃ الصدر تین قسم کے لوگ موجود رہیں گے قوم زندہ رہے گی اور ان کا فہم ان اس کی تباہی و بربادی کا باعث ہو گا۔ بنی اسرائیل سے یہی کہا جاتا ہے کہ گذشتہ تین اصولی غلطیوں کے ارتکاب کے بعد تمہارے دل پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہو گئے اور تمہاری طبیعتیں اس درجہ کند ہو گئیں کہ اب وہ کسی صحیح تعلیم کو قبول کرنے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتیں، اس لئے تم پتھر سے بھی گزرے ہو، پھر خلافت و حکومت تمہیں کیسے دی جاسکتی ہے۔

## دست و بازو نہیں بن سکتے

گذشتہ آیات میں اس مضمون کو صاف کر دیا ہے کہ بنی اسرائیل مسلمانوں پر حکومت کرنے کے قابل نہیں ہیں، ان پر ہمیشہ کے لئے ذلت و مسکنت لازم کر دی ہے اور اب انہیں حکومت نصیب نہ ہوگی، اب یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ اس درجہ اپنے قوائے علیہ کو برباد کر چکے ہیں کہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر اور ان کے دست و بازو بن کر بھی تبلیغ و اشاعت مذہب کی قابلیت ان میں باقی نہیں اور ان کے ساتھ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی مساوی نہیں۔

أَقْتَضَىٰ مَوْزُؤُا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلِمَ اللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِن بَعْدِ مَا عَقَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٥٠﴾  
 “اب کیا تم مسلمانوں تو قریع رکھتے ہو کہ وہ تمہاری بات مان لینگے اور ایک گروہ تھا ان میں جو اللہ کا کلام سنتا تھا، پھر سمجھنے کے بعد اس کو بدل ڈالتا تھا اور وہ جانتے تھے۔”

علماء کی شان یہ ہے کہ جس قدر صحیح تعلیم ان کے پاس ہے، بغیر رد و بدل اور حک و اضافہ لوگوں کے سامنے پیش کر دیں۔ یہودیوں کے عالم اس بات سے واقف تھے کہ سرزمین حجاز میں نبی آخر الزماں کی بعثت ہوگی۔ انہیں اوس و خزرج کے مقابلہ میں جب کبھی شکست ہوتی تو ہمیشہ انہیں ڈراتے کہ وہ وقت بہت قریب ہے، جب ہم اس نبی کے ساتھ مل کر تمہیں فنا کر دیں گے، چنانچہ یہی تادیبی کلمات اوس و خزرج کے اسلام کا باعث بنے۔ لیکن جس وقت آپ کی بعثت ہوئی تو چونکہ آپ بنی اسرائیل میں نہیں پیدا ہوئے تھے، انکار کر بیٹھے اور جس قدر پیشین گوئیاں حضور اقدس کے ظہور کے متعلق ان کی کتابوں میں تھیں، ان کو لفظاً و معناباً لٹا شروع کر دیا۔

قرآن حکیم نے تحریف کا لفظ استعمال کیا ہے اور یہ لفظ و معنی دونوں پر مشتمل ہے، کتاب مقدس میں تحریف لفظی اور معنوی کا ہونا اس درجہ مسلم اور متفق علیہ امر ہے کہ اب اس پر کسی بحث کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ خود عیسائی محققین تسلیم کرتے ہیں کہ لفظی اور معنوی دونوں تحریفیں عمل میں آئی ہیں۔ دوسری جگہ اہل کتاب کی اس خرابی کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ ۚ وَنَسُوا حَظًّا مِمَّا ذُكِّرُوا بِهِ ۖ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلَى خَائِنَةٍ مِّنْهُمْ (المائدہ ۱۳)  
 “لفظوں کو ان کی جگہ سے پھیرتے ہیں اور ان کو جو نصیحت کی گئی تھی اس میں سے ایک بڑا حصہ بھلا بیٹھے اور ان میں سے چند لوگوں کے سوا سب کی چوری کی اطلاع تم کو ہوتی ہی رہتی ہے۔”

یعنی اللہ کے غضب اور اس کی لعنت کا اثر یہ ہوا کہ ایک حصہ کتاب کا بالکل چھوڑ بیٹھے اور جس پر عمل کرنے کا ارادہ ہوا اس میں اپنی مطلب پرستی کے لئے بجا تاویلات شروع کر دیں اور اس طرح تمام کتاب بیکار ہو گئی ❶۔

❶ قرآن حکیم تعریف لفظی سے تو محفوظ رہا مگر معنوی تحریف سے نہ بچ سکا۔ قرآن پڑھنے کا قاعدہ یہ ہے کہ ایک شخص خالی الذہن ہو کر اس میں غور و فکر کرے اور شارع علیہ کے اسوۂ حسنہ کو پیش نظر رکھے، پھر دیکھے قرآن کن عقائد و غیثیات کی تعلیم دیتا ہے اور کن اخلاق و اعمال پر زیادہ زور دیتا ہے۔ مگر اب حالت



پھر ایسے خائن اور بد دین مسلمانوں کے ساتھ مل کر کیا کریں گے، یہاں بھی ان ناپاک حرکات سے باز نہ آئیں گے بلکہ مسلمانوں کو ان کا خوگر بنانے کی کوشش کریں گے۔ وَلَنْ تَرْضَىٰ عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (البقرۃ ۱۲۰) حدیث میں آتا ہے۔ لایمان لمن لا امانۃ لہ ولا دین لمن لا عہد اللہ۔

### تہمتان حق

وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنُوا وَإِذَا خَلَا بِغَضُومِهِمْ إِلَىٰ بَعْضٍ قَالُوا أَتُحَدِّثُونَهُم بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاجُّوكُمْ بِهِ عِنْدَ رَبِّكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۸۱﴾ أَوَلَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ﴿۸۲﴾

”اور جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں، ہم مسلمان ہوئے اور جب ایک دوسرے کے پاس اکیلے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں، کیوں ان کو خبر دیتے ہو اس کی جو اللہ نے تم پر کھولا ہے تاکہ اس کی وجہ سے تمہارے رب کے آگے تم کو جھوٹا ثابت کریں، کیا تم کو عقل نہیں۔ کیا اتنا بھی نہیں جانتے کہ اللہ کو معلوم ہے جو چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں۔“

منافقین یہود کی حالت یہ تھی کہ مسلمانوں پر اپنا اخلاص و ایمان ظاہر کرنے کے لئے کبھی کبھی ان پیشین گوئیوں کو بیان کر دیا کرتے تھے جن میں حضور ﷺ کا ذکر ہوتا، مگر جس وقت انہیں علماء و احباء کی خدمت میں حاضر ہونا پڑتا تو ان کو تنبیہ کی جاتی کہ ان امور کی اطلاع مسلمانوں کو کس لئے دیتے ہو۔ یہی چیزیں قیامت کے دن ہمارے لئے الزام کا باعث بن جائیں گی اور ہم خدا کے روبرو ملزم قرار دیئے جائیں گے۔ مگر ان کے چھپانے سے ہوتا کیا ہے، اللہ تعالیٰ تو سب کچھ جانتا ہے، وہ وحی والہام کے ذریعہ آپ کو ان پیشین گوئیوں کی اطلاع دیدیگا۔ چنانچہ ابھی آپ مکہ ہی میں تھے کہ ناموس الہی نے آپ کو شیل موسیٰ قرار دیا۔ اِنَّا اَرْسَلْنَا اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا اَرْسَلْنَا اِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾ (الزلزلہ) (مسلمانوں کے علمائے سونے مسائل جہاد کو حکومت سے ڈر کر مخفی رکھا اور یہودیوں کے نقش قدم پر چلے۔)

### جہلائے یہود کی حالت

ان آیتوں میں یہودی عالموں کی چند کمزوریاں بیان کی ہیں، مسلمانوں کو خیال ہو سکتا تھا کہ اگر عالم ہمارا ساتھ نہ دیگئے تو شاید جاہل اس طرف رخ کریں اور نکثیر سواد ہی کا فائدہ حاصل ہو، اگلی آیت میں ان جاہلوں کے خیالات کا تذکرہ ہے، پس جن لوگوں کے افکار و خیالات اس قسم کے ہوں، ان سے کسی قسم کی توقع رکھنا فضول ہے۔

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتٰبَ اِلَّا اَمَاحٍ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿۸۳﴾

یہ ہے کہ عقائد پہلے معین کر لئے جاتے ہیں پھر ان کی تائید کتاب سے تلاش کی جاتی ہے اور اپنی رکیک تاویلات کا اس کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اسی کو تحریف معنوی کہتے ہیں جس کا ذکر صحیفون الحکم عن مواضع میں ہوا۔ ایک حنفی اھتے ہے اور تمام قرآن کو فقہ حنفی کے مطابق کر دکھاتا ہے۔ ایک شافعی کہتا ہے کہ قرآن کی ایک ایک آیت مذہب شافعی کی تائید کرتی ہے۔ یہی حال مالکیوں اور حنبلیوں کا ہے اور ارباب بدع و احداث کا کیا کہنا گویا قرآن صرف انہیں امور کے لئے نازل ہوا ہے۔ فواسقا!



”اور ان میں جاہل ہیں جو کتاب کی تو خبر نہیں رکھتے مگر آرزوئیں بنا رکھی ہیں اور اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ گمان کرتے ہیں۔“

امانی، امینۃ کی جمع ہے جس کے معنی تلاوت کے ہیں، ایک شاعر کہتا ہے۔

تبنی کتاب اللہ اول لیلۃ

تبنی داؤد الیہور علی رسل

یعنی جاہل توراۃ پڑھتے ہیں مگر مفہوم و مطلب سے کوئی غرض نہیں، صرف الفاظ پر قناعت کرتے ہیں اور طوطے کی طرح رٹ لیتے ہیں، باوجود اس کے یقین رکھتے ہیں کہ جنت میں داخل ہوں گے۔ معنی سمجھے بغیر کتاب الہی کس کام آسکتی ہے۔ بعض لوگوں نے اس کے معنی آرزو اور خواہش کے لئے ہیں، روح المعانی میں ہے:

”امانی جمع امینۃ واصلہا امنیۃ افعولۃ وھو فی الاصل مایقدر الانسان فی نفسه من منی اذا قدر ولذلك تطلق علی الکذب وعلی مایتمنی۔“

گویا لکھنا پڑھنا جانتے نہیں مگر خواہشات بڑی بڑی ہیں، اپنے علم سے جو کچھ سن رکھا ہے اسی کو مایہ ناز و سرمایہ آخرت تصور کرتے ہیں۔ ان کی آرزو ہائے باطلہ ملاحظہ ہوں:

”کہ جنت میں یہودی اور نصرانی کے سوا اور دوسرا کوئی شخص نہیں جاسکتا: لَنْ یَدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصْرٰی (البقرۃ ۱۱۱) اگر بہ فرض محال یہودی جہنم میں گئے بھی تو صرف چند روز کے لئے: وَقَالُوا لَنْ تَمْسَنَا النَّارُ اِلَّا اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً (البقرۃ ۸۰)“

اس قسم کے خیالات فاسدہ ہیں جو ان کو خوش رکھتے ہیں۔ حالانکہ جنت میں جانے کا قاعدہ یہ ہے کہ صرف ایک اللہ کی غلامی کی جائے اور قلب سلیم لے کر اس کے حضور میں حاضر ہو: اِلَّا مَنْ لَّی اللّٰہُ بِقَلْبٍ سَلِیْمٌ (الشعر ۸۹) نیز فرمایا: بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْہُہٗ لِلّٰہِ وَہُوَ مُخْصِیْنٌ فَلَہٗ اَجْرٌ کَاَعْدَدَ رَبِّہٖ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْہِمۡ وَلَا ہُمْ یَحْزَنُوْنَ (البقرۃ ۱۱۲) ❶

فَوَيْلٌ لِلَّذِیْنَ یُکْتَبُونَ الْکِتٰبَ بِاَیْدِیْہِمۡ ۚ ثُمَّ یَقُولُوْنَ ہٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ لَیْسَتْۡ اَیْہِ تَمْنٰۤی اَقْلِیْلًا ۚ فَوَيْلٌ لّٰہُمْ مِّمَّا کَتَبَتْ اَیْدِیْہِمۡ ۚ وَوَيْلٌ لّٰہُمْ مِّمَّا یُکْتَبُ عَلَیْہِمۡ ۚ (البقرۃ ۸۰)

❶ دونوں امراض مسلمانوں میں موجود ہیں، عام دستور ہے کہ فجر کی نماز کے بعد مفہوم سمجھے بغیر ایک دو جزو پڑھ لیں گے اور اس پر اپنے آپ کو ثواب کا مستحق خیال کریں گے۔ تفسیر کے ابتدائی اوراق میں تم پڑھ آئے ہو کہ صحابہ کا طرز عمل قرآن کے متعلق کیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آٹھ سال میں بقرہ ختم کی، خود صاحب وحی والہام رات رات بھر ایک آیت میں صرف کر دیتے۔

فائین الثبیا وائین الثری  
وائین معاویۃ من علی

یہی حال مسلمانوں کے عقائد کا ہے، اعمال صالحہ سے اجتناب، اخلاق فاضلہ سے پرہیز، بدعات و محدثات میں مبتلا اور جنت کے ٹھیکیدار:

وسوف تری اذا انکشف الغبار  
افس تحت رجلک امر حبار

”پس ان لوگوں کے لئے خرابی ہے جو اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں، پھر کہتے ہیں یہ اللہ کے پاس سے ہے تاکہ اس کے عوض میں تھوڑی سی قیمت لیں۔ پس خرابی ہے ان کے لئے کہ ان کے ہاتھوں نے لکھا اور خرابی ہے ان کے لئے کہ اس کو پیشہ بنالیا۔“

اس زمانہ میں دستور یہ تھا کہ کتاب الہی کی آیات کے ساتھ اہل علم اپنے تفسیری نوٹ اور حواشی بھی لکھ لیا کرتے تھے، آیت میں اور ان جملوں میں کسی قسم کا فرق و امتیاز نہ رکھتے تھے اور اس لئے دوسرا شخص دونوں میں تمیز نہ کر سکتا تھا، جب عوام ان سے کوئی مسئلہ پوچھتے تو یہ ان حواشی کو دیکھ کر جواب دے دیتے اور کہتے کہ یہی خدا کا حکم ہے، حالانکہ وہ ان کی اپنی خواہشات اور ابلیسی الہامات کا آئینہ ہو تا تھا اور یہ شیطن صرف اس لئے کی جاتی تھی کہ رؤسائے قوم کے یہاں ان کو قدر و منزلت نصیب ہو اور دولت ہاتھ آئے اور ہر جگہ آؤ بھگت ہو، قل متاع الدنیا قلیل، اگر دنیا کے تمام خزان بھی ایک شخص کے قبضہ میں آجائیں، یہ بھی اس کی خواہشات کو پورا نہ کر سکیں گے، کیونکہ آرزوں کا سلسلہ دراز تر ہو تا جائے گا<sup>۱۰</sup>۔

ویل کالفظ قرآن حکیم میں تین معانی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

(الف) اگر گناہوں کی حالت ابتدائی ہے تو ویل کے معنی افسوس کے ہوں گے، ایک شریف انسان کے لئے اتنا بھی بہت ہو تا ہے۔

(ب) درمیانی حالت میں اس کا مفہوم تباہی و بربادی ہو گا۔

(ج) اور آخری حالت میں اس سے دوزخ مراد لی جائے گی۔

## نجات کا قانون

وَقَالُوا لَنْ تَمْسَنَا النَّارُ إِلَّا آيَاتُ مَا مَعْدُودَةٌ ۖ قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللَّهِ عَهْدًا فَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَكَ أَفَرَأَيْتُمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝

”اور کہتے ہیں کہ ہم کو سوائے گنتی کے چند روز کے آگ نہ لگے گی، ان سے پوچھو کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لیا ہے کہ اللہ اپنے قول کے خلاف نہ کرے گا یا جاننے کے بغیر اللہ پر جھوٹ بولتے ہو۔“

کہتے ہیں کہ یہودی خواہ کتنا ہی گنہگار کیوں نہ ہو کبھی جہنم میں داخل نہ ہو گا۔ البتہ مجرموں کے لئے چند روز کا عذاب ضروری ہے، تعداد ایام کے متعلق روایات مختلف ہیں، بعض سات روز کہتے ہیں، بعض کا عقیدہ چالیس ایام کا ہے اور گیارہ ماہ یا ایک سال سے زیادہ تو کسی کا بھی عقیدہ نہیں۔

<sup>۱۰</sup> آج کل عربی مدرسوں میں تمام تر قوت تفسیروں اور ان کے حواشی میں صرف کی جاتی ہے حالانکہ قرآن میں غور و فکر کرنا اور تفسیروں میں بحث و نظر اور، جب لوگ علماء مسائل دریافت کرتے ہیں توفیق کی چند کتابوں کے حوالے لکھ کر جواب دیا جاتا ہے کہ خدا کا یہی حکم ہے۔ کتاب و سنت پر اصحابہ الرأی کے اقوال کو ترجیح دی جاتی ہے۔

عیسائی کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صرف اس لئے سولی پر چڑھے کہ تمام بدکاروں کے لئے کفارہ بن جائیں، اب جو شخص بھی ان پر ایمان لے آئے گا اس پر دوزخ کی آگ حرام ہوگی ❶۔

قرآن حکیم نے اگر ایک طرف کفارہ کا ابطال کیا لا تزودا زماخری، تو دوسری جانب یہ بھی بتا دیا کہ کسی بزرگ کی اولاد میں سے ہونا یا کسی ولی کی طرف منسوب ہونا نجات کا باعث نہیں ہو سکتا۔ نجات دنیوی و اخروی کے لئے عمل صالح اور ایمان باللہ کی ضرورت ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ نوح جیسے جلیل القدر پیغمبر نے اپنے بیٹے کی نجات کے لئے اللہ تعالیٰ سے التجا کی تو وہاں سے جواب ملا: إِنَّهُ كَيْسٌ مِنْ أَهْلِكَ ❶ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ (ہود: ۴۶)۔ تمہیں یہ بھی یاد ہو گا کہ نوح ولوط کی بیویوں کو صرف اس لئے جہنم میں بھیج دیا گیا کہ انہوں نے عمل صالح کو اپنے پاؤں سے ٹھکرا دیا اور پیغمبروں کی رشتہ داری کے گھمنڈ میں مغرور ہو گئیں: فَحَبَّ اللَّهُ مَثَلًا لِلَّذِينَ كَفَرُوا امْرَأَتِ نُوحٍ وَ امْرَأَتِ لُوطٍ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَاطَبَهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللَّهِ شَيْئًا وَقِيلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدَّٰخِلِينَ ❷ (التحریم: ۱۰)۔ تم اس کو بھی نہیں بھولو گے کہ جب رسول اللہ ﷺ کو وہ صفا پر تمام قبائل مکہ کو بلا کر ان کے سامنے دعوت حق پیش کی تو اس خطبہ کے آخری الفاظ کیا تھے: فاطمہ بنت محمد انقذی نفسك من النار فانی لا املك لك ضرا ولا نفسا، اے فاطمہ محمد کی بیٹی، اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچالے، اس لئے کہ میں تیرے نفع و ضرر کا ذرہ برابر بھی مالک نہیں ہوں، پھر یہ کس درجہ جہل و نادانی ہے کہ بزرگوں کے نام لیا ہونے کی بناء پر نجات کے دعویدار بنتے ہیں اور دل ایمان سے خالی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے حضور میں کوئی چیز کام نہ آئے گی، اس کے دربار میں مجازات عمل کا قانون یہ ہے:

بَلَىٰ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ❶ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ❷ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ❸ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ❹

”کیوں نہیں، جس نے گناہ کیا اور اس کو اس کے گناہ نے گھیر لیا، یہی لوگ دوزخ کے ہیں، اسی میں ہمیشہ رہیں گے اور جو ایمان لائے اور نیک کام کئے وہی جنت کے لوگ ہیں، اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔“

جب ایک شخص بدی کا مرتکب ہو اور اس سے بچنے کی کوشش نہ کرے بلکہ اور زیادہ لذت و حظ نفس محسوس کرے تا آنکہ ہدایت و رشد کے تمام راستے بند ہو جائیں، وہ شخص بد اخلاقی کی آگ سے کبھی بھی محفوظ نہیں رہ سکتا اور بڑی سے بڑی طاقت بھی اس کی نجات کا ذمہ نہیں لے سکتی، صرف اعمال صالحہ ہی سعادت اخروی کی کفالت کرتے ہیں۔ فَبِمَنْ يُعْمَلُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ❶ وَمَنْ يُعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ❷ (الزلزال: ۷، ۸) اور فیصلہ یہ ہو گا۔ فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ ❸ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ ❹ وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ ❺ فَأُمَّهُ هَادِيَةٌ ❻ وَمَا أَذْرَكَ مَا هِيَ ❼ نَارٌ حَامِيَةٌ ❽ (القارعة: ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰)۔

❶ یہی عقیدہ اب مسلمانوں میں رائج ہوتا جاتا ہے، جس نے امام حسین علیہ السلام کے عشق میں دو آنسو بہا دیئے، جو شیخ عبد القادر رضی اللہ عنہ کے سلسلہ میں داخل ہو گیا وہ بھی دوزخ میں نہ جائے گا۔ یہ خیالات فاسدہ یہودیوں اور عیسائیوں سے مسلمانوں میں آئے اور اب مسلمان اس پر لہنا دعویٰ جمائے پیٹھے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

انہا ہی اعمال کم تردد علیکم فمن وجد خیرا فليحب الله ومن وجد غیر ذلك فلا یلو من الانفسه،  
”یہ تمہارے اپنے اعمال ہیں جن کا احتساب تم سے کیا جا رہا ہے، اگر حسن ثواب ملا تو خدا کا شکر ادا کرو، ورنہ تم خود ملامت کے قابل ہو۔“

### عہود و موافق

اب تک یہودیوں کی غلط کاریاں ذکر کیں، علماء کے امراض پر اصولی بحث کی اور ان کے عقائد باطلہ کی تردید کی، آئندہ بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معرفت خداوند قدوس سے جو عہد و پیمان کیا تھا اس کا کیا حشر ہوا۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَءِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ ۖ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ  
وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا ۚ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ۖ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْكُمْ وَأَنتُمْ مُّعْرِضُونَ ﴿۱۰﴾

”اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے اقرار لیا کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرنا، ماں باپ اور شہ دار اور یتیم اور مسکین سے نیک سلوک کرنا اور لوگوں کو نیک بات کہنا اور نماز پڑھنا اور زکوٰۃ دینا، پھر تم میں سے تھوڑے سے آدمیوں کے سوا باقی سب پھر بیٹھے اور تم کو دھیان نہیں۔“

بنی اسرائیل سے حسب ذیل باتوں کا عہد لیا گیا تھا۔

(۱).... اللہ کے سوا کسی دوسرے کی غلامی نہ کریں، اپنی ضروریات زندگی میں اسی سے طالب اعانت ہوں اور سب سے باغی بن کر اس ایک کی اطاعت کا جو اپنی گردن میں ڈال لیں تاکہ سب کے سامنے سر بلند ہوں: میرے حضور تیرے لئے دوسرا خدا نہ ہووے، تو اپنے لئے کوئی صورت یا کسی چیز کی صورت جو اوپر آسمان پر یا نیچے زمین پر یا پانی میں زمین کے نیچے ہے مت بنا، تو ان کے آگے اپنے تئیں مت جھکا اور نہ ان کی عبادت کر، کیونکہ میں خداوند تیرا خدا غیور خدا ہوں۔ (خروج ۵: ۳، ۴)

(۲).... چونکہ اللہ تعالیٰ کے بعد شان ربوبیت میں والدین ہی ہوتے ہیں، عاصی و نافرمانہ دار اولاد پر احسان کرنے سے جی نہیں چراتے اور اپنی اولاد کے لئے ہر کمال کے آرزو مند رہتے ہیں، اس لئے ان کے ساتھ برواحسان کا حکم دیا، تو اپنے ماں باپ کو عزت دے تاکہ تیری عمر اس زمین پر جو خداوند تیرا خدا تجھے دیتا ہے دراز ہووے (خروج ۲۱: ۲۰) قرآن حکیم نے اس پر اور زیادہ زور دیا، ایک جگہ فرمایا:

وقضى ربك ألا تعبدوا إلا إياه وبالوالدين إحسانا أما يبلغن عندك الكبر أحدهما أو كلاهما فلا تقل لهما أف ولا تنهرهما وقل لهما قولا كريما - واخفض لهما جناح الذل من الرحمة وقل رب ارحهما كما ربينى

صغیرا۔ (بنی اسرائیل ۲۳)

”اور تمہارے پروردگار نے حکم قطعی دیدیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا۔ اگر والدین میں کا ایک یا دونوں تیرے سامنے بڑھاپے کو پہونچیں تو ان کے آگے“ ہوں ”بھی نہ کرنا اور نہ ان کو جھڑکنا اور ان سے کہنا تو ادب سے کہنا اور محبت سے خاکساری کا پہلوان کے آگے جھکائے رکھنا اور دعا کرتے رہنا کہ اے میرے پروردگار! جس طرح انہوں نے مجھے چھوٹے سے کوپالا ہے اسی طرح تو بھی ان پر رحم کی جیو۔“

(۳).... عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا، یہ بھی دراصل ماں باپ کی محبت کا ایک جز ہوتا ہے اور وہ صلہ رحمی کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں: اور ان میں سے جو میرے دوست ہیں اور میرے حکموں کو یاد رکھتے ہیں ہزاروں پر رحم کرتا ہوں (استثنائی ۵:۰۲)

(۴).... یتامیٰ اور مساکین کی نصرت و اعانت: اور لاری اس لئے کہ اس کا کوئی حصہ اور میراث تیرے ساتھ نہیں اور مسافر اور یتیم اور بیوہ جو تیرے پھانکوں کے اندر ہیں آویں اور کھادیں اور سیر ہوویں۔ (استثنائی ۹۲:۹۱)

(۵).... ان پر یہ بھی لازم کر دیا گیا کہ لوگوں سے ہمیشہ اچھی بات کہیں اور نماز و زکوٰۃ کی پابندی کریں۔ مگر تم ان میں پورے نہ اتارے۔

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُونَ اَنْفُسَكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَضْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُونَ  
 ثُمَّ اَنْتُمْ هَؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُونَ فِرَاقًا مِّنْكُمْ مِنْ دِيَارِهِمْ ۖ تَظْهَرُونَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ  
 وَ اِنْ يَأْتُوْكُمْ اَسْلَٰمٌ تَغْضُوْهُمْ وَهُوَ مَحْضَرٌ عَلَيْكُمْ ۖ اِخْرَاجُهُمْ ۚ اَفْتَوْا مَنْوُنٌ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ؕ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلَىْ اَشَدِّ الْعَذَابِ ۚ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿٥٠﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَشْتَرُوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ ۚ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنصَرُوْنَ ﴿٥١﴾

”جب ہم نے تم سے قول لیا کہ آپس میں خون نہ کرنا اور نہ اپنے لوگوں کو اپنے شہروں سے جلا وطن کرنا، پھر تم نے اقرار کیا اور تم اقرار کرتے ہو۔ پھر وہی تم ہو کہ اپنوں کو قتل کرتے ہو اور نیز اپنوں میں سے کچھ لوگوں کے مقابلہ میں ناحق اور زبردستی ایک دوسرے کے مددگار بن کر ان کو ان کے شہروں سے جلا وطن کرتے ہو اور اگر وہی لوگ قید ہو کر تمہارے پاس آویں تو فدیہ دے کر ان کو چھڑا لیتے ہو حالانکہ ان کا نکال دینا ہی تم پر حرام تھا، تو کیا یہ اس لئے ہے کہ کتاب الہی کا کچھ حصہ تو ماننے ہو اور کچھ حصے سے منکر ہو، پھر تم میں سے جن لوگوں کے کاموں کا یہ حال ہے انہیں پاداش عمل میں اس کے سوا کیا مل سکتا ہے کہ دنیا میں ذلت و رسوائی ہو اور قیامت کے دن سخت سے سخت عذاب اور تمہارے کاموں سے اللہ بے خبر نہیں، یہی ہیں جنہوں نے آخرت دیکر دنیا کی زندگی خریدی، سو نہ تو ان کے لئے عذاب ہی ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کو مدد ہی پہنچے گی۔“

علاوہ ان عہود و موافق کے جن کا ذکر گذشتہ آیت میں گذر چکا ہے، ان سے تین اور باتوں کا بھی اقرار لیا گیا تھا۔  
(الف) خانہ جنگی کر کے باہم خوں ریزی نہ کرنا کہ اس سے تمہاری اجتماعی قوت کو نقصان پہنچے گا اور حیات قومی فنا ہو جائے گی۔

(ب) اپنے عزیزوں کو ترک وطن پر مجبور نہ کرنا کہ ادھر تو تمہاری جماعت روز بروز کم ہوتی جائے گی اور اس طرح وہ جلا وطنی کی مصیبتوں اور تکلیفوں سے تنگ آکر تمہارے دشمنوں کے ساتھ سازش کر لیں گے اور اس طرح غیروں کو تم پر حملہ کرنے اور تمہیں غلام بنانے میں آسانیاں پیدا کر دیں گے۔

(ج) اپنی قوم میں سے کسی کو گرفتار نہ ہو تا دیکھو تو فدیہ ادا کر کے اسے چھڑا لینا۔ ان لوگوں نے پہلے دو حکموں کی تو پروانہ کی مگر تیسرے لئے خوب اہتمام کرتے۔ واقعہ یہ ہے کہ مدینہ میں اوس اور خزرج کی دو قومیں بستی تھیں جن کی ہمیشہ آپس میں جنگ رہتی۔ شہر کے اطراف میں یہودیوں کے بھی دو قبیلے آباد تھے، بنو نضیر اور بنو قریظہ، ان میں سے اوس اور بنو قریظہ باہم ایک دوسرے کے حلیف تھے، ایسے ہی خزرج اور بنو نضیر آپس میں معاہدہ تھے، جب کبھی اوس و خزرج میں جنگ ہوتی، ان قبائل کو بھی بوجہ دوستی اور حلفانہ کے ان کی مدد کرنی پڑتی۔ پھر جنگ کے نتائج میں جہاں اوس و خزرج بے خانماں برباد ہوتے، بنو قریظہ اور بنو نضیر بھی اس مصیبت سے محفوظ نہ رہ سکتے۔ اور یہ بالکل ظاہر بات ہے کہ بنو نضیر کے اخراج میں بنو قریظہ کا دخل ہوتا تھا اور بنو قریظہ کی جلا وطنی میں بنو نضیر حصہ دار ہوتے تھے، البتہ اتنا ضرور تھا کہ جب ایک جماعت میں سے کوئی اسیر ہو جاتا تو ہر جماعت اپنے دوستوں کو مال سے راضی کر کے قیدی کو رہا کر ادیتی۔ اگر کوئی ان کی اس حرکت پر اعتراض کرتا تو کہتے کہ اسیر کارہا کرنا ہمارا مذہبی فرض ہے اور جب لوگ یہ کہتے کہ قتل و اخراج میں تم نے کیوں دشمنوں کی مدد کی تو ان کا جواب یہ ہوتا کہ دوستوں کا ساتھ نہ دینا عار اور ننگ کی بات ہے۔

اس یہودہ حرکت پر انہیں کہا گیا کہ مرض بھی برابر پیدا کرتے رہیں اور علاج بھی جاری رکھیں، یہ کہاں کی دانشمندی ہے۔ اس طرح کبھی مرض نہیں زائل ہوا کرتا۔ پس ایسے لوگوں کی سزا اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے دنیا میں ذلیل کر دیئے جائیں اور کبھی انہیں عزت نصیب نہ ہو۔ چنانچہ بنو نضیر کو رسول اللہ ﷺ نے ملک شام کی طرف جلا وطن کر دیا۔ بنو قریظہ کے مردوں کو قتل کیا اور عورتوں بچوں کو لونڈی غلام بنالیا۔ سچ ہے ایسے لوگوں کی سزائیں نہ تو کسی قسم کی تخفیف ہو سکتی ہے اور نہ کوئی ان کی طرفداری کر سکتا ہے۔

ہمیشہ سے عادت ہے

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَفَعَّلْنَا مِنْ بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ ۖ وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ  
الْقُدُسِ ۖ أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَى أَنْفُسُكُمْ اسْتَكْبَرْتُمْ ۖ فَفَرِّقْنَاهَا كَذَبْتُمْ ۖ وَفَرِّقْنَاهَا تَفْتُلُونُ ۚ

”اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور ان کے بعد پے در پے رسول بھیجے اور مریم کے بیٹے عیسیٰ کو صریح معجزے دیئے اور پاک روح سے ان کی امداد کی، تو کیا جب تمہارے پاس کوئی رسول تمہاری خواہش کے خلاف کوئی حکم لے کر آیا تم تکبر کرنے لگے، پھر ایک جماعت کو جھٹلادیا اور ایک جماعت کو قتل کرتے۔“

اگر ایک قوم سے احیانا غلطی ہو تو درگزر کیا جاسکتا ہے مگر جس کی صدیوں سے یہی کیفیت ہو، اس کے لئے بہترین فیصلہ یہی ہے کہ اس کے ہاتھ سے ہمیشہ کے لئے تلوار پھین لی جائے اور نوع انسانی کا ہر فرزند اس بد بخت قوم سے نفرت کرے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ نوع انسانی پر معاش و معاد کے اعتبار سے کوئی بہت بڑی مصیبت نازل ہونے والی ہوتی ہے، اگر پہلے سے اس کا سد باب نہ کیا گیا تو نسل انسانی فنا ہو جائے گی، اس وقت خطیرۃ القدس میں ملأء اعلیٰ کے تمام فرشتوں کا اجتماع ہوتا ہے۔ آپس میں مشورہ کرتے ہیں کہ بنی آدم کو اس واہیہ کبریٰ سے کسی نہ کسی طرح بچانا ضروری ہے، اس بحث و مشاورہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نوع انسانی میں جو شخص ہر اعتبار سے بہترین ہو، اس کا انتخاب عمل میں آتا ہے اور تمام ہمت اس کی تعلیم و تربیت میں صرف کی جاتی ہے۔ اس کے احکام و اوامر نافذ کرنے کے لئے مختلف صورتیں اختیار کی جاتی ہیں۔ ارباب فہم و فراست کے قلوب میں الہام کیا جاتا ہے کہ اس کے لئے یکسر اطاعت و انقیاد بن جائیں اور اس طرح یہ پاک اور مزیں گروہ امة اخراجت للناس کی مصداق ہو۔

ازکی خلق اللہ کا قلب اب ان ملائکۃ الرحمن کے وحی والہام کا مورد بن جاتا ہے۔ اس کے دل میں ایسے خیالات و افکار پیدا کئے جاتے ہیں جو اس ملت کی رشد و ہدایت اور فلاح و کامرانی کا باعث ہوں۔ کبھی تو وحی والہام سے اس کی اعانت ہوتی ہے، کبھی رویائے صادقہ مدد کا باعث بن جاتے ہیں اور بعض اوقات ہاتف غیبی سے نصرت و یاوری ہوتی ہے، ایسا بھی ہوا کہ فرشتوں نے آکر اس سے بالمشافہ گفتگو کی ہے۔

فرشتوں کی یہ جماعت اس ازکی خلق اللہ کے دوستوں اور مددگاروں کی امداد و اعانت کو اپنا فرض اولین خیال کرتی ہے، ہر خیر و برکت سے انہیں حصہ دیا جاتا ہے، مگر جو لوگ اس کے مخالف ہوں ان کو رحمت سے دور کر دیا جاتا ہے۔ ہر تکلیف و مصیبت ان پر طاری کی جاتی ہے کہ ان کی ہمتیں پست ہوں اور دنیا و آخرت میں انہیں ذلت و رسوائی نصیب ہو۔ نبوت کے اصول و کلیات تو بہت کثرت سے ہیں، مگر ملا اعلیٰ کا اجماع بھی ان میں سے ایک اصل ہے۔ اسی اجماع کا نام شریعت کی اصطلاح میں تائید روح القدس ہے۔ جب اس کی خیر و برکت کسی نفس ذکی کے شامل حال ہو تو اس سے اس قدر عجیب و غریب برکات کا اظہار ہوتا ہے کہ عادیۃً ان کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ انہیں برکات کو معجزات سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہی وہ تائید روح القدس ہے جس کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے، اسی لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے معجزات بکثرت ظہور میں آئے۔



## ماتحت نہیں رہ سکتے

بنی اسرائیل کے متعلق اب تک دو باتوں کا فیصلہ ہوا ہے:

(۱) ان میں حکومت کرنے کی قابلیت نہیں اور تلوار ان سے ہمیشہ کے لئے چھین لی گئی ہے۔

(۲) مسلمانوں کے ساتھ مل کر اور ان کے دست و بازو بن کر دعوت و ارشاد کا فرض ادا نہیں کر سکتے۔

آئندہ بتایا جائے گا کہ ان لوگوں کو اپنے ماتحت رکھنا یا ان کے ساتھ کسی قسم کے تعلقات قائم کرنا بھی جائز نہیں۔ ان کی تمام قومی زندگی و غلبہ سازی اور حیلہ سازی کی تاریخ ہے۔ اس لئے مسلمانوں کی نگرانی میں رہ کر بھی چین سے نہ بیٹھیں گے، بلکہ اوّل تو ان کی کوشش ہی یہی ہوگی کہ یہی امراض و مفسد مسلمانوں میں پیدا ہوں اور اگر اس میں ناکام رہے تو ان کے ساتھ دھوکا کریں گے اور عین وقت پر نقصان پہنچائیں گے، اس لئے آگے چلکر یہ تعلیم دی جائے گی کہ ان سے ترک موالات کے بغیر چارہ ہی نہیں اور ان کے ساتھ ہر قسم کے تعلقات و روابط رکھنا ممنوع و ناجائز ہے۔

## تقلید اعلیٰ

وَقَالُوا اقْتُلُوا بُنَيَّا عَلْفًا ۖ بَلْ لَعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ ﴿۸۳﴾

”اور کہتے ہیں ہمارے دلوں پر غلاف ہے، یہ نہیں، بلکہ ان کے کفر کی بنا پر اللہ نے ان پر لعنت کی، پس بہت کم ایمان لاتے ہیں۔“

ان لوگوں نے امانت کے ادا کرنے میں، ہمیشہ خیانت سے کام لیا۔ وہ سر سے لے کر پاؤں تک گندگیوں اور نجاستوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ غلف، اغلف کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ چیز لی جاتی ہے جو پردہ کے اندر ہو۔ اس اعتبار سے آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ لوگ اپنے آپ کو قرآن حکیم کی تعلیم سے بے نیاز خیال کرتے ہیں اور غرور و تکبر کی بنا پر اس سے روگردانی اختیار کرتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ قرآن کی آیات بینات ان کے قلوب و اذہان پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتیں۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ غلف، بضم اللام، غلاف کی جمع ہے۔ یہودی کہتے ہیں کہ ہمارے دل خزینہ دار علم و حکمت ہیں۔ ہمیں آپ کے سامنے زانوے ادب نہ کرنے کی ضرورت نہیں: فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَرِحُوا بِمَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ (المؤمن ۸۳) اور جب ان کے رسول ان کے پاس کھلی ہوئی دلیلیں لے کر آئے تو یہ لوگ اپنی لیاقت علمی پر بڑے نازاں ہوئے۔“

جن لوگوں کا یہ دعویٰ ہو کہ وہ مذہبی امام و پیشوا ہیں، ان کے پاس اللہ کی کتاب ہے اور بغیر حساب و کتاب کے جنت میں داخل ہو گئے، ان کا اوّلین فرض یہ ہونا چاہئے کہ حق بات کو ماننے کے لئے تیار رہیں اور اس کو اس طرح لبیک کہیں جیسے بھوکا کھانے کو اور پیاسا پانی کو لینے کے لئے لپکتا ہے، مگر ان بد بختوں کی حالت یہ ہے کہ ایسی صحیح تعلیم کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں جو دنیا و آخرت کی ترقی کا ذمہ لیتی ہے اور تمسخر و استہزا کے طور پر کہتے ہیں کہ ہم لوگوں کو ان مضامین سے کیا



تعلق، گویا دوسرے الفاظ میں ان کا فیصلہ یہ ہے کہ، جس جگہ آج ہیں اس سے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھیں گے۔ پھر جس قوم نے خود ہی ترقی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہو، اپنے پاؤں میں اندھی تقلید کی بوجھل زنجیریں ڈال لی ہوں، ان سے اب کیا توقع ہو سکتی ہے۔

وہ تنزل و انحطاط کو پسند کرتے ہیں، پس اس جمود و استبداد کی بنا پر جس کا سبب وحید و کفر و عصیان ہے جس کا انہوں نے پہلے ارتکاب کیا، ان پر اللہ کی لعنت نازل ہو چکی ہے۔ ان کے دل حق بات قبول کرنے کے لئے تیار نہیں اور اس کی رحمت ان سے روٹھ گئی ہے۔<sup>۱</sup>

لَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ<sup>۲</sup> وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا<sup>۳</sup> فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ<sup>۴</sup> فَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ<sup>۵</sup>

“اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے وہ کتاب پہنچی جو اس کتاب کی تصدیق کرتی تھی جو ان کے پاس ہے اور اس سے پہلے کافروں پر فتح مانگا کرتے تھے۔ پھر جس کو انہوں نے پہچان رکھا تھا ان کے پاس آگیا تو انکار کر بیٹھے، پس منکروں پر اللہ کی لعنت ہو۔”

بنی اسرائیل کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ جس “شیل موسیٰ” کی خبر کتاب استثناء کے اٹھارویں باب کی ۱۵ تا ۱۹ آیات میں دی گئی ہے<sup>۶</sup>، ابھی تک دنیا میں ظاہر نہیں ہوا۔ وہ جانتے تھے کہ اس ذات مقدس کا ظہور مکہ مبارکہ میں ہو گا اور اس کا مقام ہجرت مدینہ منورہ قرار پائیگا، اسی لئے انہوں نے بنو نضیر، بنو قریظہ اور بنو قینقاع کو اطراف مدینہ میں آباد کر دیا تھا، ان کی اوس و خزر ج سے ہمیشہ جنگ رہا کرتی۔ ان کی کوشش یہ رہتی کہ جس طرح ممکن ہو ان کا نام و نشان مٹا دیں۔ جب کبھی انہیں شکست ہوتی تو والہانہ و مضطربانہ دعا کرتے کہ خداوند! بنی آخر الزماں کو بھیج کہ ہماری مصیبتوں اور تکلیفوں کے دن ختم ہوں اور کفار پر غلبہ حاصل کریں۔ چنانچہ یہی باتیں انصار کے مسلمان ہونے کا باعث بنیں۔ گویا یہودی اپنی تمام کامیابیوں اور کامرانیوں کو اس وجود اقدس کے ساتھ وابستہ یقین کرتے تھے، کیونکہ انہیں وعدہ دیا گیا تھا کہ:

• مسلمان بھی اس کو رائے تقلید کا شکار ہو گئے۔ تحقیق و اجتہاد کا درازہ بند کر دیا، کتاب و سنت سے بعد و بجز اختیار کیا۔ فقہ کی چند کتابوں میں مذہب کو مقید کر کے اصلی سرچشمہ حیات سے دور چاڑھے۔ اس کو غیر ضروری خیال کرنے لگ گئے اور اس طرح فہنہ ذودہ و داء ظہودہم کے مرتکب ہوئے۔ اسی الحاد فی العمل کا نتیجہ ہے کہ غیروں کے حکوم بن گئے ہیں اور لعنتی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

• پیشین گوئی کے الفاظ یہ ہیں: ”وہ خداوند تیرا خدا، تیرے لئے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا، تم اس کی طرف کان دھریو، اس سب کی مانند جو تو نے خداوند اپنے خدا سے حورب میں مجمع کے دن مانگا اور کہا کہ ایسا نہ ہو کہ میں خداوند اپنے خدا کی آواز پھر سنوں اور ایسی شدت کی آگ میں پھر دیکھوں، تاکہ میں مر نہ جاؤں اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ انہوں نے جو کچھ کہا سو اچھا کہا، میں ان کے لئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا، اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا۔ (کتاب استثنائی، ۹۱ تا ۵۱)

”اگر تو کوشش کر کے خداوند اپنے خدا کی آواز سنے.... تو خداوند تیرا تجھے زمین کی قوموں کی بہ نسبت سرفراز کرے گا۔ یہ ساری برکتیں تجھ پر آویں گی اور تجھے پہنچے گی۔“ (کتاب استثنائی ۱: ۸۲ و ۲) آگے چل کر فرمایا:

”اگر تو خداوند اپنے خدا کے حکموں کو حفظ کرے گا اور اس کی راہوں پر چلے گا تو خداوند تجھ کو اپنے لئے پاک قوم بنائیگا جیسا کہ اس نے تجھ سے قسم کی ہے اور زمین کے سارے فرقے دیکھیں گے کہ تو خداوند کے نام سے کہلایا سو وہ تجھ سے ڈرتے رہیں گے۔“ (کتاب استثنائی ۹۰، ۸۲)

اسی لئے قرآن حکیم ان سے بار بار مطالبہ کرتا ہے کہ اس رسول پر ایمان لے آؤ، کہ تمہاری پیشینگوئیوں کی تصدیق ہو، مگر کورانہ تقلید، قومی روایات اور تعصب و ہٹ دہرمی کی بنا پر صاف انکار کر بیٹھتے۔ حالانکہ جس طرح انہیں اپنی اولاد کے شناخت کرنے میں کبھی دھوکا نہیں ہوا، ایسے ہی وہ آپ کو بھی پہچانتے تھے۔ یعرفونہ کہا یعرفون ابناءہم، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ:

(الف).... موسیٰ علیہ السلام سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام تک کسی نبی نے کتاب استثناء کی پیشین گوئی کے مطابق مثل موسیٰ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا، حالانکہ اس دور ان میں ان کے پاس برابر نبی آتے رہے۔

(ب).... عیسیٰ علیہ السلام کے بعد چھ سو برس تک بنی اسرائیل میں ایک بھی نبی نہ آیا۔

(ج) وہ.... مانتے ہیں کہ موسیٰ کی مانند جس نبی کی بعثت کا وعدہ دیا گیا ہے، وہ نبی اسرائیل کے بھائیوں یعنی بنی اسمعیل میں سے ہوگا۔

(د) ضمناً اس حقیقت سے وہ آگاہ تھے کہ اب نبوت ہمارے خاندان سے منتقل ہو کر اسمعیل کے گھرانے میں چلی جائے گی۔

پس جب باوجود ان تمام حقائق ثابتہ کے وہ نہیں مانتے، تو ان پر خدا کی لعنت ہو اور اس کی خیر و برکت سے دور ہوں۔

### انکار کا سبب

بَسْمًا اشْتَرَوْا بِهٖ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِغَيَاۤ اَنْ يُنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰی مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ فَبَآءُ ذٰلِكَ بِغَضَبِ عَلٰی غَضَبٍ ۚ وَلِلْكَافِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِينٌ ۝

”اپنی جان کو انہوں نے بڑے مول خرید لیا کہ اللہ کے اتارے ہوئے کلام کے منکر ہو گئے اس ضد پر کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے اپنا فضل اتارے، سو غصہ پر غصہ ممالائے اور منکروں کے لئے ذلت کا عذاب ہے۔“

ان لوگوں کی توقعات یہ تھیں کہ وہ نبی ان کی قوم میں سے ہوگا، ان کے غلط عقائد اور بیجا توہمات کی تائید کرے گا، اور اس کا مذہب ان کی خواہشات و الوفات کے مطابق ہوگا، مگر جب دیکھا کہ وہ بنی اسمعیل کے خاندان میں پیدا ہوا ہے، ان

کے تمام عقائد باطلہ اور حریت فاسقہ کی مخالفت کرتا ہے تو ان کے بغض و حسد کی کوئی حد نہ رہی۔  
گو یا باوجود شناخت کرنے کے ان کے انکار کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ انہیں چھوڑ کر دوسری قوم کو اپنے فضل و اکرام کے لئے کیوں مخصوص کر لیا گیا، پس دوہرے غضب کے مستحق ہوئے۔ ایک عیسیٰ علیہ السلام کے انکار کی بنا پر اور دوسرے آپ کے نہ ماننے کی وجہ سے۔ ایسے کافروں کو اسی دنیا میں محکومی کی ذلیل زندگی بسر کرنی پڑے گی۔<sup>۶۵</sup>

پابندی توراۃ کا دعویٰ غلط ہے

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا بِمَا آتَيْنَاكُمْ قَالُوا اتُّوْمِنُ بِمَا وَرَّاءَ ۚ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۚ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُونَ أَنْبِيَاءَ اللَّهِ مِنْ قَبْلُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝

“اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے اتارے ہوئے کلام پر ایمان لاؤ تو کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لاتے ہیں جو ہم پر نازل کیا گیا ہے اور جو اس سے نیچے آیا ہے اس کو نہیں مانتے۔ حالانکہ وہ حق ہے، جو ان کے پاس ہے اس کو سچ بتاتا ہے، ان سے کہو کہ اگر تم مومن تھے تو اس سے پہلے خدا کے پیغمبروں کو کیوں قتل کرتے تھے۔”

علماء یہود نے اعتراض کیا تھا کہ قرآن ہم پر کیوں نہیں نازل کیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن ان تمام پیشین گوئیوں کی تصدیق کرتا ہے جو توراۃ میں موجود ہیں، پھر انکار کی کوئی وجہ نہیں۔

وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم صرف توراۃ کو مانیں گے اور کسی کتاب کو اپنا دستور العمل بنانے کے لئے تیار نہیں۔ اس پر ان سے کہا جاتا ہے کہ اگر یہ حقیقت میں ایسا ہی ہے جیسا تم کہتے ہو، تو ان انبیاء کو کیوں قتل کیا جو صرف توراۃ کی دعوت دیتے تھے۔ پس معلوم ہوا کہ پابندی توراۃ کا دعویٰ کرنا سرے سے غلط ہے، تم ہمیشہ سے کتاب الہی کے منکر رہے ہو۔

وَلَقَدْ جَاءَكُمْ مُوسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهَا وَ أَنْتُمْ ظَالِمُونَ ۝ وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ ۖ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاسْمِعُوا ۚ قَالُوا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۚ وَأَشْرَىٰ بَوَائِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ۚ قُلْ يُنْسَىٰ أَمْرُكُمْ بِهِ إِيْمَانُكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝

۶۵ یہی حال آج کل کے علمائے سوا اور ارباب عمام کا ہے۔ کتاب و سنت کی تصریحات کا انکار صرف اس بنا پر کر دیں گے کہ ان کی مزعومہ تفاسیر جلالین، بیضاوی، ابن کثیر، فتح البیان، خازن، کشف اور مدارک میں نہیں ہے۔ جمود و استبداد نے ان کے دل و دماغ کو معطل کر دیا ہے۔ تقلید اعلیٰ نے ان کی سوچنے اور غور کرنے کی قوت کو سلب کر لیا ہے۔ کسی عربی مدرسہ میں قرآن کی تعلیم نہیں ہوتی۔ جلالین و بیضاوی اور بعض جگہ مدارک کا درس ضرور ہوتا ہے، مگر قرآن پڑھنا اور چیر ہے اور زید و بکر کے اقوال میں غور و فکر کرنا اور۔ ہم حنیفوں کی یہ کیفیت ہے کہ قرآن کی عملی تفسیر حدیث سے بہت دور ہیں۔ اکثر مواقع میں ہمیں شوافع اور حنابلہ کے مقابلہ میں ضعیف و کمزور احادیث سے تمسک و اعتصام کرنا پڑتا ہے۔ ہدایہ کو اٹھا کر دیکھ لیجئے ہماری سب سے زیادہ قابل اعتماد اور مستند فقہ کی کتاب ہے۔ اس کی نسبت علامہ زلیعی بار بار اپنی تخریج میں لکھتے ہیں کہ صاحب ہدایہ متعدد جگہ موضوع احادیث سے اپنے مذہب کو ثابت کرتے ہیں۔ بہر حال علماء سوا اور اصحاب الرائے نے کتاب و سنت سے بعد و بجز اختیار کیا۔ اس لئے غضب بالائے غضب کے مستحق ہوئے اور حکومت و سر فرازی کے لئے دوسروں کو چن لیا گیا۔ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَنْ يَتَعَبَّ عَنْكُمُ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ (الانعام ۶۵) کہو کہ وہی اس پر قادر ہے کہ تمہارے اوپر سے کوئی عذاب تمہارے لئے نکال کھڑا کرے۔

”اور تمہارے پاس موسیٰ صریح معجزے لے کر آئے، پھر تم نے اس کے چھپے چھڑا بنالیا اور تم ظالم تھے اور جب ہم نے تم سے عہد لیا اور طور کو تم پر بلند کیا۔ ہم نے کہا جو ہم نے تم کو دیا اس کو قوت کے ساتھ پکڑو اور سنو، انہوں نے جواب دیا ہم نے سنا اور مانا نہیں اور ان کے کافر ہونے کی وجہ سے گو سالہ کی دوستی ان کے دلوں میں رچ گئی، تم کہو اگر تم ایمان والے ہو تو تمہارا ایمان بری چیز کا حکم کرتا ہے۔“

توراة کے تم پابند نہ بنے اور انبیاء مجد دین کو برابر قتل کرتے رہے۔ تم نے موسیٰ سے پابندی توراة کا عہد کیا، مگر اعمال حیات سے ثابت کر دیا کہ اس کتاب کو اپنی زندگی کا دستور العمل نہ بناؤ گے، اس انکار وجود کا اصل سبب یہ تھا کہ کفر و باطل پرستی نے تمہارے دلوں پر روپیہ کی محبت پیدا کر دی تھی، تم نے مال و دولت کو اپنا قبلہ بنالیا تھا اور تمہارے دلوں نے کفر کو اس طرح قبول کر لیا تھا، جیسے کپڑا رنگ کو جذب کر لیتا ہے۔

اگر ایمان کے یہی کارنامے ہیں اور وہ ایسی ہی غلط کاریوں اور بیہودہ حرکتوں کا حکم دیتا ہے، تو کیا پھر اس سے بدترین کوئی اور ایمان بھی ہو سکتا ہے۔ ضمیر فروشی کرو، دولت کو اپنا امام بنا لو اور روپیہ کے آگے سربسجود ہو جاؤ، اس پر بھی مومن رہو، کیا خوب!

## آخرت کے متعلق خیالات

یہاں تک ان کی دنیاوی زندگی، ان کے روزمرہ کے کارناموں اور ان کے عقائد و اخلاق پر بحث ہوئی ہے۔ اب بیان ہوتا ہے کہ باوجود ان ناشائستہ حرکتوں کے، اپنی نجات کے متعلق انہوں نے کیا کیا منصوبے باندھ رکھے ہیں۔

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ كُفْرًا فَاصْبِرُوا عَذَابَ اللَّهِ خَالَصَتْ مِنْكُمْ دُونَ النَّاسِ فَاصْبِرُوا أَمْ يَكُنْتُمْ أَصْدِقُينَ ۖ وَلَنْ يَسْتَنْوُوا أَبَدًا ۖ بَلَا قَدِّمَتْ آيَاتُهُمْ ۖ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ۝ وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَى حَيَاتِهِ ۖ وَمَنْ أَذِينَ أَشْرَكَوْا ۖ يَوْمَ أَحَدُهُمْ لَوْ يُعْتَرَفُ أَلْفَ سَنَةٍ ۖ وَمَا هُوَ بِمُخْرَجِهِ مِنَ الْعَذَابِ أَنْ يُعْتَرَفَ ۖ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ۝

”تم کہہ دو، اگر اللہ کے ہاں لوگوں کے سوا آخرت کا گھر تمہیں ملتا ہے، اگر سچے ہو تو مرنے کی آرزو کرو اور جو کچھ ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے، اس کی وجہ سے کبھی یہ آرزو نہ کریں گے اور اللہ گنہگاروں کو خوب جانتا ہے اور تو ان کو سب لوگوں سے زیادہ زندہ رہنے کے لئے حریص پائیگا، بلکہ مشرکین سے بھی بڑھ کر حریص، ان میں سے ہر ایک چاہتا ہے کہ کاش اسکی عمر ہزار ہزار سال کی ہو اور اتنا جینا عذاب سے اس کو بچانہ دے گا اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔“

دولت کو امام بنانا، توراة کی دعوت پر سبعینا و عصینا کہنا، اور انبیاء علیہم السلام کو قتل کرنا، پھر اس پر کہنا کہ لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصْرًا (البقرة ۱۱۱) اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہی اللہ کے محبوب اور برگزیدہ ہیں، پس اگر وہ اپنے دعوائے محبت میں سچے ہیں تو اللہ کے نام پر مرنے کے لئے تیار ہوں، اس کے قانون کی نشر و اشاعت میں لگ

جائیں اور اس کے لئے ہر قسم کی تکلیف برداشت کریں۔ جو شخص صحیح تعلیم کی خاطر اپنی ہر متاع حیات قربان کرنے کو تیار نہیں، اسے کوئی حق حاصل نہیں کہ اپنے آپ کو محبوب الہی کے نام سے مشہور کرے اور اس شخص پر ہر گز اعتماد نہیں ہو سکتا۔

رسول اللہ ﷺ نے نصاریٰ نجران کو اس امر کی دعوت دی: تَعَالَوْا نَدْعُكُمْ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ ۖ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّغَنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكُذِبِينَ ۖ (ال عمران ۶۱) کہ ہم دونوں اپنی اپنی تعلیم پر قربان ہونے کو تیار ہوں۔ مگر جھوٹوں سے یہ توقع کہاں، یہی حال ان یہودیوں کا ہے، یہ لوگ اپنی جانوں کو زیادہ عزیز سمجھتے ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ مرنے کے بعد ہی ہمارے اعمال فاسقہ کا احتساب شروع ہو جائے گا، اس لئے موت کی آرزو کرتے ہوئے گھبراتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کو ان ظالموں کی حقیقت کا پہلے ہی سے علم تھا، مگر عام لوگوں میں اپنی محبت الہی کا راگ الاپتے تھے، اب اس مطالبہ کی بنا پر ان کی قلبی کھل گئی اور کسی شخص کو ان کے ظاہری تقدس سے دھوکا نہ ہو گا۔

مشرکین کی حالت یہ ہے کہ قوم اور وطن کے لئے اپنی جانیں تک لڑا دیتے ہیں، عزت و ناموس اور شہرت و ناموری کی خاطر ہر چیز قربان کر دیتے ہیں، مگر یہ لوگ اہل علم ہونے کے باوجود اتنی تکلیف بھی گوارا نہیں کر سکتے اور مدت ہائے دوران تک دنیا میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ ایک جاہل آدمی اگر ایسا کرے تو اس کو معذور قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن ایک تعلیم یافتہ کا سب سے بڑا جرم یہی ہے کہ وہ تعلیمات صادقہ پر اپنے آپ کو قربان نہ کر سکے۔

جو لوگ مذہبی جذبات کو پاؤں تلے روند کر دنیا میں رہنا چاہتے ہوں وہ ہر گز عزت کے قابل نہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو نہایت ہی باریک بین نظر سے دیکھ رہا ہے۔ ان کو ضرور ذلیل کر کے غیروں کا محکوم بنادے گا ۝

● گذشتہ آیات میں علمائے یہود کی حسب ذیل خرابیاں ذکر کی گئی ہیں:

(الف) اپنی کتاب پر عمل کرنے کے دعویدار ہیں مگر ان کا یہ دعویٰ بھی غلط ہے۔

(ب) ان کا نصب العین اور مقصد حیات جمع مال و دولت ہے۔

(ج) خدا کے ساتھ محبت کا اظہار کرتے ہیں مگر اس کے لئے قربانی نہیں کر سکتے۔

(د) مذہبی جذبات کو پامال کر کے زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ اسی ترتیب سے اگر آپ امت مسلمہ کے علمائے سوکے حالات کی تفتیش کریں تو یہ تمام خرابیاں ان میں نظر آئیں گی۔

(۱) دعویٰ توفیق کی پابندی کا ہوتا ہے مگر عملاً وہ اپنے بزرگوں اور پیروں کے غیر مستند اقوال کو مذہب بنائے بیٹھے ہوتے ہیں۔ ایک شخص کی تمام زندگی گناہوں میں بسر ہوتی ہے، مرتے وقت اس کے وارث ایک قرآن بخش دیتے ہیں اور یہ بد بخت عالم کہتے ہیں کہ اس کے تمام گناہ معاف ہو گئے، ایک آدمی سال بھر نماز نہیں پڑھتا، جمعۃ الوداع کے روزہ دور کھتے قضاے عمری کی نماز پڑھ لیتا ہے اور اس کی تمام نمازیں معاف ہو جاتی ہیں۔

(۲) شادی اور موت کے وقت جن رسوم کو جائز قرار دیا جاتا ہے وہ سب کی سب مسلمانوں نے عجم سے مستعار لیں اور صرف روپیہ کمانے کی خاطر ان کو مذہبی رنگ دیدیا۔

(۳) اگر خدا سے محبت ہوتی تو اپنی زندگیاں اشاعت اسلام اور اعلائے کلمۃ الحق کے لئے وقف کر دیتے۔

## قابل نفرت ہیں

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلْجِبْرِيلِ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿٥٠﴾  
مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيلَ وَمِيكَلَ فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِلْكَافِرِينَ ﴿٥١﴾ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَيْكَ آيَاتٍ  
بَيِّنَاتٍ ۖ وَمَا يَكْفُرُ بِهَا إِلَّا الْفَاسِقُونَ ﴿٥٢﴾

”کہہ! جو کوئی ہو جبرئیل کا دشمن جبرئیل کا دشمن ہو گا سو اس نے تو اللہ کے حکم سے تیرے دل پر یہ کلام اتارا ہے جو کلام اس کے سامنے ہے اس کو سچ بتاتا ہے اور مومنین کے لئے ہدایت و خوش خبری ہے، جو کوئی اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور رسولوں کا اور جبرئیل کا اور میکائیل کا دشمن ہو گا تو اللہ ان کافروں کا دشمن ہے اور ہم نے تیری طرف واضح آیتیں اتاریں اور بدکار ہی ان سے منکر ہوں گے۔“

یہودی کفر و ضلالت کے انتہائی مراتب پر پہنچ چکے ہیں، ان کی ایک ایک غلطی واضح کر دی گئی ہے۔ آخر میں انہوں نے پابندیِ توراۃ کا دعویٰ کیا مگر جھوٹے ثابت ہوئے اور انہیں تسلیم کرنا پڑا کہ بغیر کسی جدید وحی والہام کے ان کی اصلاح نہ ہوگی۔ اس لئے انہوں نے یہ دریافت کرنا شروع کیا کہ آپ کے پاس وحی کون لاتا ہے؟ آپ نے فرمایا جبرئیل۔ انہوں نے جواب دیا کہ وہ تو ہمارا قومی دشمن ہے۔ جب کبھی ہم پر کوئی بلا نازل ہوئی اسی کے ذریعہ سے ہوئی، اگر کوئی دوسرا فرشتہ وحی لا تا تو ہم آپ کو نبی تسلیم کر لیتے۔ اس کے جواب میں ان سے کہا گیا کہ وہ اللہ کے حکم سے نازل ہوتا ہے۔ اس تعلیم سے تمہاری کتابوں کی تصدیق ہوتی ہے اور اربابِ ایمان و اخلاص کے لئے ہدایت و بشارت ہے۔

تمہیں جبرئیل سے عداوت اس لئے ہے کہ اس نے تمہیں منصبِ نبوت سے محروم کر دیا اور بنی اسمعیل کو مکالمہ الہی کے لئے منتخب کیا۔ اسی لئے تم رسول اللہ ﷺ سے دشمنی کا اظہار کر رہے ہو۔ مگر یاد رہے کہ جو آپ کا دشمن ہے وہ اللہ، اس کے ملائکہ اور تمام رسولوں کی دشمنی اپنے سر لیتا ہے۔ اس آیت میں میکائیل کا نام خاص طور سے ذکر کیا گیا، کیونکہ وہ لوگ اس کو اپنا دوست خیال کرتے تھے: ”اور اس وقت میکائیل وہ بڑا سردار جو تیری قوم کے فرزندان کی حمایت کے لئے کھڑا ہے۔“ (دانی ایل ۲۱:۱) اب اس سے بھی دوستی کی توقع نہ رکھو، کیونکہ وہ اس وقت رسول اللہ ﷺ کا ساتھ دے گا۔ تعلیم کے اصول کو دیکھئے، اس کے نتائج پر نظر ڈالئے، سچائی معلوم کرنے کا صحیح طریق یہی ہے، اس تعلیم پر عمل کر کے دیکھو، اس کے نتائج تمہیں معلوم ہو جائیں گے، البتہ بد اخلاق تو سوائے انکار کے اور کچھ نہیں جانتے۔

أَوَلَمْ نَكُنَّا عَهْدًا بِآبَائِهِمْ قَبْلَ نَزْلِهِمْ مِنْهُمْ ۖ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٥٣﴾ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقًا  
لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيقٌ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ ۖ كَتَبَ اللَّهُ وَرَأَوْا ظُهُورَهُمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٥٤﴾  
”آیا کیا، جب یہ عہد باندھیں گے تو ان میں سے ایک جماعت اس کو پھینک دے گی، بلکہ ان میں سے اکثر یقین نہیں

(۴) غیروں کے ساتھ مل کر غلط فتاویٰ شائع کر کے اور مسلمانوں کو دھوکا دے کر زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ آج ترکوں پر جس قدر مصیبتیں اور تکلیفیں نازل ہو رہی ہیں یہ ہندوستان کے علماء و سواد فقہائے دنیا کے فتاویٰ کے دردناک نتائج ہیں۔

کرتے اور جب اللہ کی طرف سے ان کے پاس رسول پہنچا جو اس کتاب کی تصدیق کرتا ہے جو ان کے پاس ہے، تو کتاب پانے والوں میں سے ایک جماعت نے اللہ کے کتاب کو اپنی پیٹھ کے پیچھے پھینک دیا، گویا جانتے ہی نہیں۔

کتاب پر عمل کرنا تمہارا مقصد نہیں، تمہاری قومی خصوصیت ہی عہد کرنا اور توڑنا۔ تمہارے پاس مختلف اوقات میں توراۃ کی تصدیق کرنے والے رسول آتے رہے، مگر تم نے ان کی کوئی پروا نہ کی، اب بھی مسلمانوں پر الزام رکھنے کے لئے تم نے یہ دریافت کیا کہ وحی لانے والا کون ہے، ورنہ یہ مقصد ہر گز نہ تھا کہ صداقت ظاہر ہونے کے بعد اس کو مان بھی لو گے۔ قاعدہ یہ ہے کہ جب ایک قوم اپنی تمام دنیاوی عزتوں کو کھو بیٹھتی ہے تو اس وقت یہ کہنا شروع کر دیتی ہے کہ مذہب کو دنیا سے کوئی تعلق نہیں، وہ صرف روحانیت کی تعلیم دیتا ہے اور آخرت کی کامیابی کا ذمہ لیتا ہے۔ مذہب ہی لوگ دنیا کی حکومت و سرفرازی اور عزت و رفعت سے محروم رہتے ہیں، اس لئے تزکیہ نفس کی ضرورت ہے کہ یہی جہاد اکبر ہے اور اسی پر نجات کا دار و مدار۔

کسی نبی کی تعلیم روحانیت تک محدود نہیں ہوتی، بلکہ وہ دین اور دنیا، مذہب اور سیاست، روحانیت و مادیت دونوں کی جامع ہوتی ہے۔<sup>۱</sup>

• آج کل مسلمان بھی اس مرض میں مبتلا ہیں۔ حالانکہ کتاب و سنت کی تصریحات پکار پکار کے کہہ رہی ہیں کہ سیاست اور مذہب ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ اس ذیل میں ہمارے سامنے سب سے پہلے سورۃ نور کی یہ آیت آتی ہے:

وَعَدَّ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَغْفِرَ لَهُمْ فِي الْأَخْزِ كَمَا اسْتَغْفَرَ لَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَ لَيَبْكَرَنَّ لَهُمْ دِينُهُمُ الَّذِي ارْتَضَى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خُفْيِهِمْ أَمْنًا (النور)

”تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے ہیں، ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کی خلافت ضرور نوازش کرے گا، جیسے ان لوگوں کو حکومت سے نوازش کی تھی جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں اور جس دین کو اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے، اس کو ان کے لئے جما کر رہے گا اور خوف و خطرہ جو ان کو لاحق ہے اس کے بعد ان کو اس کے بدلے میں امن دے گا۔“

اس آیت میں مسلمانوں کو خلافت ار ضی، دین کے جہاد اور امن بعد از خوف کا وعدہ دیا ہے اور یہ وعدہ پورا ہو کر رہا۔ دوسری جگہ فرمایا: وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (ال عمران ۱۳۹) اور ہمت نہ ہارو، اور آرزوہ خاطر نہ ہو اور اگر تم سچے مسلمان ہو تو آخر کار تمہارا ہی بول بالا ہے سورہ صف میں آیا: هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ، اس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق و نیکر بھیجا کہ تمام ادیان عالم پر اس کو غلبہ و اقتدار نوازش کرے۔ اس کے ہم معنی سورہ بقرہ میں فرمایا: وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا، شہید کے معنی یہ بھی ہیں کہ لوگوں کا نگران کار و محافظ ہو اور تمام قومیں اس کی سرپرستی میں کام کریں۔ موسیٰ کو جب فرعون کے پاس بھیجا گیا تو ان کا صرف ایک ہی مطالبہ تھا: ان ادوا لی عبادا للہ اور فارسل معنا بنی اسرائیل۔ یہی سیاست کا نچوڑ اور مغز تھا جو موسیٰ کی نبوت کا مقصد تھا۔ ان کے علاوہ قرآن حکیم کی اور آیات بھی پیش کی جاسکتی ہیں مگر طوالت کے خوف سے ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

احادیث بھی اس موضوع پر اس کثرت سے ہیں کہ ان کا استقصا اور احاطہ بہت مشکل ہے، صرف ایک حدیث پر ہم اکتفا کرتے ہیں۔

شَكُنَا إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَهُوَ مَتَوَسِدٌ بِرِدَاةٍ لَهُ فِي ظِلِّ الْكُعْبَةِ فَلَمَّا دَعَا اللَّهُ لَنَا، قَالَ: كَانَ الرَّجُلُ فِي مَنْ قَبْلِهِمْ يَحْضُرُ لَهُ فِي الْأَرْضِ فَيَجْعَلُ فِيهِ فَيَجْعَالُهُ بِنَشَارٍ فَيُوضَعُ عَلَى رَأْسِهِ فَيَشْقَى وَمَا يَصْدَقُ ذَلِكَ عَنْ دِينِهِ وَيَسْطُ بِأَمْسِلَاطِ الْحَدِيدِ مَا دُونَ لِحْبِهِ مِنْ عَظْمٍ وَعَصَبٍ وَمَا يَصْدَقُ ذَلِكَ عَنْ دِينِهِ وَاللَّهُ يَشْنُ هَذَا الْأَمْرَ حَتَّى يَسِيرَ الرَّكْبُ مِنْ مَنَعَةِ أَلِي حَضْرَ مَوْتٍ لَا يَخَافُ إِلَّا اللَّهَ وَلَكِنْ تَسْتَعْبِلُونَ،

ہجرت سے پیشتر بعض صحابہ نے عرض کیا کہ اعدائے حق کے ظلم و جور کی حد ہو گئی، آپ ہمارے لئے دعا نہیں کرتے؟ فرمایا تم سے پہلے بھی ایسے لوگ گزر چکے ہیں کہ ظالموں نے ان کو گڑھوں میں بٹھ کر اس پر بھی انہوں نے حق سے منہ نہ موڑا اور ایسا ہوا کہ حق پرستوں کی کھالوں پر لوہے کی



وَاتَّبِعُوا مَا تَنَزَّلُوا الشَّيْطَانُ عَلَىٰ مُلْكٍ سَلِيمٍ ۖ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٌ وَلَكِنَّ الشَّيْطَانَ كَفَرُوا يَعْلَمُونَ النَّاسَ  
السَّحَرُ ۖ وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَكِيدِينَ بَابِلَ هَارُوتَ وَمَارُوتَ ۖ وَمَا يَعْلَمِينَ مِنْ أَحَدٍ حَتَّى يَقُولَا إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ  
فَلَا تَكْفُرْ ۖ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ ۖ وَمَا هُمْ بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۖ  
وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۖ وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۖ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهِ  
أَنْفُسَهُمْ ۖ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿٥٨﴾ وَلَوْ أَنَّهُمْ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَكُنْهُنَّ أَمْوَاجًا ۖ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿٥٩﴾

”اور اس علم کے پیچھے پڑ گئے جس کو شیطان سلمان کی سلطنت میں پڑھتے تھے اور سلیمان نے کفر نہیں کیا بلکہ شیطانوں  
نے کفر کیا۔ لوگوں کو جادو سکھاتے اور اس علم کی پیروی کی جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت وماروت پر اترا اور وہ کسی کو نہ  
سکھاتے جب تک نہ کہتے کہ ہم آزمائش میں ہیں پس تم کافر مت بنو، پھر ان سے سکھتے وہ چیز جس سے مرد اور اس کی  
عورت میں جدائی ڈالتے اور اللہ کی اجازت کے بغیر وہ اس جادو سے کسی کو نقصان نہ پہنچا سکتے۔ اور وہ چیز سکھتے ہیں جس  
سے ان کو نقصان ہے اور فائدہ نہیں اور وہ جانتے ہیں کہ جو کوئی جادو کا خریدار ہو اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں  
اور وہ بہت بری چیز ہے جس پر انہوں نے اپنی جانوں کو بیچا ہے، کاش! انہیں سمجھ ہوتی اور اگر وہ یقین لاتے اور پرہیز  
کرتے تو اللہ کے پاس بہتر بدلہ تھا، کاش! انہیں سمجھ ہوتی۔“

کنگھیاں پھرائی گئیں جو گوشت کو ہڈی اور ہڈی سے جدا کر دیتی تھیں لیکن اس کو بھی انہوں نے برداشت کر لیا اور حق سے انحراف نہ کیا۔ اس خدا کی قسم دعوت  
حق کا جو کام شروع ہوا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا، یہاں تک کہ وہ وقت قریب ہے جب یمن سے حضر موت تک ایک سوار چلا جائے گا اور اس کے دل میں اللہ کے  
سوا اور کسی کا خوف نہ ہو گا۔ یعنی راہ میں ہر جگہ صرف مسلمان ہی ہوں گے، کوئی غیر نہ ہو گا جو حملہ کرے یا لوٹے۔ یہ ہونے والا ہے مگر تم جلدی کرتے ہو۔

ایک اور حدیث میں عدی بن حاتم سے بخاری روایت کرتے ہیں: لتزین الطعينة تحل عن الحيرة حتى تطوف بالكعبة اور لتفتح كنوز كسرى، آپ نے  
فرمایا عدی اگر تم جیتے رہے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے کہ حیرۃ سے ایک پردہ نشین عورت تن تنہا سفر کر کے آئے گی اور کعبہ کا طواف کرے گی، اور اس  
تمام سفر میں اللہ کے سوا کوئی چیز اس کے لئے موجب خوف نہ ہو گی۔ اور قریب ہے کہ مسلمانوں کے لئے کسریٰ کے خزانے کھول دیئے جائیں۔ عدی کہتے ہیں  
کہ میں زندہ رہا اور دونوں باتیں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں وکننت فی من افتتح كنوز كسرى! کتاب و سنت کے یہ چند اشارات صاحب فہم کے لئے کافی  
ہیں، کس طرح رسول اللہ ﷺ کی یہ پیشین گوئی مسلمانوں کے حق میں ثابت ہو رہی ہے کہ لتتبعن سنن من كان قبلكم، حتیٰ کہ لو دخلوا حوض ب لد  
خلتموه بھی پورا ہو گیا۔ اب انتظار کرنے والوں کے لئے بجز انتظار غفلت کے اور کچھ باقی نہ رہا۔ اس لئے کہ یہودیوں کی مغضوبیت، نصاریٰ کی ضلالت  
، مشرکین کی بت پرستی، اقتدار بغیر سنت ان میں سے ہر ایک خوست مسلمانوں پر چھائی اور اب بطن الارض خیر من ظہرہا کے سوا اور کچھ باقی نہ رہا۔ زمین  
کے کیزوں کے لئے زندگی میں عیش ہے اور جنگل کے درندوں کے لئے جینے میں راحت، مگر ایک مسلمان کے لئے اب زمین کی پیٹھ پر کوئی خوشی باقی نہیں  
رہی۔ مگر یہ غلامانہ اور محکومانہ زندگی بسر کرے اور اپنی ذلتوں کا بوجھ اٹھائے، اس کے نیچے چلا جائے!

نہ نگم، نہ برگ سبزم، نہ درخت سایہ دارم  
ہمہ حیرتم کہ دہقان بچہ کار کشت مارا؟

امت مسلمہ کے علماء سو کی کس قدر بد بختی ہے اور کس طرح یہودیوں کے نقش قدم پر چلے جا رہے ہیں کہ اجنبی حکومت کی خاطر مسلمانوں کو نقصان پہنچاتے  
ہیں، جہادی سبیل اللہ اور قتال فی سبیل الحق والحریت سے روکتے ہیں۔ ترکوں کے خلاف فتاوے شائع کرتے ہیں، مسلمانوں کو کافر بتانے کی انہیں بہت مشق  
ہے، خانہ کعبہ کی بے حرمتی ہوتی ہے اور ٹس سے مس نہیں ہوتے، خلیفۃ المسلمین سے جو بد بخت بغاوت کرتا ہے، اس کو مبارک باد دینے کے لئے ہندوستان سے  
سفر کرتے ہیں، ان تمام حرکات کو تعلیم قرآن کے مطابق خیال کرتے ہیں اور اگر کسی شخص نے قرآن کی طرف پشت کر دی تو فوراً فینڈ ولا داء ظہور دھم کی  
تلاوت کر کے اس پر کفر اور ارتداد عن اسلام کا فتویٰ صادر کر دیتے ہیں۔ پس وقت آگیا ہے کہ آج ایک نئی صف ماتم بچائی جائے اور ان ارباب عمام کی بد  
کرداریوں پر سینہ کوئی کی جائے۔



مذہبی لوگوں کی عزت و حرمت کا اصلی سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ کتاب الہی کے محافظ اور اس کی تعلیمات کے ناشر ہوتے ہیں، لیکن جس وقت اس فرض جلیل کو ترک کر دیتے ہیں تو ان کی عزت بھی جاتی رہتی ہے اور وہ شر البریہ بن جاتے ہیں۔ ان کی کوشش یہی رہتی ہے کہ باوجود اس بد عملی و بد کرداری کے لوگ ان کا احترام کریں، نذریں اور ہدیے ان کے سامنے پیش ہوں اور عوام الناس انہیں اپنا امام و پیشوا تسلیم کریں۔ چونکہ ان کے پاس صحیح تعلیم نہیں ہوتی اور اخلاق فاضلہ سے دور ہوتے ہیں، اس لئے خدع و فریب اور حیلہ سازی سے کام لے کر اپنی عزت برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، ان آیات میں اس قسم کی شرارتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

سورہ نمل میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے معجزات بیان کئے گئے ہیں، مگر بنی اسرائیل نے ان کی ذات اقدس کی طرف صدامت و خرافات اور مافوق الفطرت عجائب و غرائب منسوب کئے، جیسے مسلمانوں میں امیر حمزہ ایک فرضی ہیر و کی نسبت حیرت انگیز واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔ سلاطین کی پہلی کتاب میں سلیمان کی طرف کفر اور معبودان باطل کی پرستش بھی منسوب کی گئی ہے:

”اس کی سات سو جو روئیں و بیگمات تھیں اور تین سو حرمین اور اس کی جو روؤں لئے اس کے دل کو پھیرا کیونکہ ایسا ہوا کہ جب سلیمان بوڑھا ہوا تو اس کی جو روؤں نے اس کی دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کیا اور اس کا دل خداوند اپنے خدا کی طرف کامل نہ تھا جیسا اس کے باپ داؤد کا دل تھا.... اور سلیمان نے خداوند کی نظر میں بدی کی اور اس نے خداوند کی پوری پیروی اپنے باپ داؤد کی طرح نہ کی.... سوا بس کہ اس کا دل خداوند اسرائیل کے خدا سے جو اسے دوبارہ دکھائی دیا برگشتہ ہوا اس لئے خداوند سلیمان پر غضبناک ہوا۔“ (سلاطین ۱۱: ۶۱ و ۶۲)

یہودیوں نے فسق و فجور کی راہ اختیار کی۔ حضرت سلیمان کی حکومت میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑکاتے اور ان تمام باتوں کو سلیمان کی طرف منسوب کرتے۔ قرآن نے ایک جلیل القدر پیغمبر کی معصومیت اور طہارت کا اعلان کیا اور بتا دیا کہ خدا کا پیغمبر کبھی کفر و مشرکانہ رسوم کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ تمام تر شرارت یہودیوں کی ہے جو ایک پیکر قد و سیت اور مجسم پاکبازی کو کافر بتاتے ہیں اور اس طرح اعلان کرتے ہیں کہ عہد عتیق میں لفظی و معنوی تحریف ہوئی ہے۔ صحائف آسمانی میں سے قرآن صرف ان امور کی تصدیق کرتا ہے جو حقیقت میں ایسے ہی ہیں اور جہاں غلطی ہوتی ہے فوراً اس سے علیحدگی اختیار کرتا ہے اور سچائی کا اعلان کر دیتا ہے۔

بابل عہد قدیم کا نہایت ہی بارونق اور شاندار شہر تھا۔ کسی زمانہ میں وہ تہذیب و شائستگی کا مرکز تھا۔ اس کی جائے وقوع دریائے فرات کے کنارے تھی۔ عراق عرب کا دار السلطنت ہونا اس کی شہرت و عظمت کا اور زیادہ باعث بن گیا۔ اس کے کھنڈرات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عظیم الشان شہر تمدن و حضارت کا گھر تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کی فصیل ۵۵ میل لمبی، ۴۴ فٹ بلند اور ۸۵ فٹ چوڑی تھی۔ جس وقت بخت نصر نے یہودیوں کو تباہ کیا، یہ شہر اپنے انتہائی عروج پر تھا۔ یہودی قید ہو کر بابل میں آباد ہو گئے۔ اب ان کے لئے حکومت کی جگہ غلامی، عزت کے بجائے ذلت اور تخت سلطنت کی جگہ

گردن ملت و نکبت تھی۔ خدا کا وعدہ ان کے حق میں پورا ہو کر رہا۔ وَقَضَيْنَا إِلَىٰ يٰقُوْبِ اٰمْرًا عَظِيْمًا فِی الْکِتٰبِ لَتَنفَسِدُنَّ فِی الْاَرْضِ مَرَّتَیْنٍ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا کَبِيْرًا ۝ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اَوَّلٰھُمَا بَعَثْنَا عَلَیْکُمْ عِمْرًا اَوَّلٰی بَاسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوا حِلٰلَ الدِّیَارِ وَکَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا (بنی اسرائیل ۵، ۴) ”اور ہم نے بنی اسرائیل سے کتاب میں صاف کہہ دیا تھا کہ تم ضرور ملک میں دودفعہ فساد کرو گے اور بڑی زیادتیاں بھی کرو گے۔ تو جب ان میں پہلے فساد کا وقت آیا تو ہم نے تمہارے مقابلہ میں اپنے ایسے بندے اٹھا کھڑے کئے جو بڑے سخت گیر تھے۔ وہ تمہارے شہروں کے اندر پھیل گئے اور خدا کا وعدہ پورا ہونا ہی تھا۔“

ان لوگوں نے بائبل میں دیکھا کہ وہاں کے رہنے والے دو فرشتہ خصلت بزرگوں ہاروت و ماروت کو بہت زیادہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ بعض مفسرین نے لفظ ملک سے دھوکا کھا کر ان کو حقیقی فرشتہ قرار دیا ہے اور پھر ان تمام غلط اور دور از کار روایات کا انبار جمع کر دیا ہے جن کو کوئی سلیم الفطرت انسان قبول کرنے کو تیار نہیں۔ قرآن حکیم نے حضرت یوسف کی نسبت کہا: اِنَّ هٰذَا اِلَّا مَلٰکٌ کَرِیْمٌ (یوسف ۳۱) ایسے ہی یہاں بھی ان کو ملک کہا گیا، انہیں اپنی عزت رفتہ یاد آگئی اور اس کوشش میں لگ گئے کہ کس طرح اس گزشتہ عروج کو حاصل کریں۔ ہاروت و ماروت نے اذکار اور اوراد اور اسمائے حسنیٰ کے ذریعہ سے اپنی بزرگی اور تقدس کو قائم کیا ہوا تھا۔ بنی اسرائیل کاہل تو پہلے ہی سے تھے۔ مفت کی روٹیاں کھا کر کام کرنے کی قوت سلب کر چکے تھے اور چاہتے یہ تھے کہ بغیر کام کئے لوگ ان کی تعریف و توصیف کریں، ویجیون ان یحمدوا بسا لم یفعلوا، فَوَرَّان کی جانب متوجہ ہو گئے اور درخواست کی کہ انہیں بھی ان اشغال و وظائف کی تعلیم دی جائے۔ دونوں بزرگوں کا یہ دستور تھا کہ تعلیم دینے سے قبل لوگوں سے عہد لیتے اور انہیں کو سمجھا دیا کرتے تھے کہ ان دعاؤں کو ناجائز اور غیر مشروع مواقع پر استعمال نہ کرنا۔ ہمارا وجود اور ہماری تعلیم تم لوگوں کے لئے ایک قسم کی امتحان گاہ ہے۔ اس سے تمہارے ایمان و اسلام کی حقیقت کھل جائے گی۔ اس قسم کی باتیں کر کے دونوں بزرگ اپنے دامن کو آلود عصیاں ہونے سے بچا لیتے۔ اس کے بعد ان کی تعلیم شروع ہوتی۔ یہودی اب دو چیزوں کے مالک تھے۔ ایک وہ علوم جو کتاب مقدس میں موجود تھے، جن کی تبلیغ و دعوت کے لئے انہیں مامور کیا گیا تھا، دوسرے وہ شیطانی باتیں جو انہوں نے بائبل میں رہ کر حاصل کیں۔ مفسرین نے فتعلیون منہا میں منہا کی ضمیر کو ہاروت و ماروت کی طرف راجع کیا ہے، لیکن ابن کثیر نے یہی معنی اختیار کئے ہیں جن کو ہم نے اوپر درج کیا ہے اور ان تمام روایات کو غلط ثابت کیا ہے جن سے ہاروت و ماروت کی طرف ارجاع ضمیر معلوم ہوتا ہے۔

باوجود اس قدر تنبیہ و تادیب کے یہودی ان کی نصیحت پر عمل نہ کرتے اور ان وظائف و اوراد کو ایسی جگہ استعمال میں لاتے جہاں شر و فساد پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔ خاوند اور بیوی میں ناچاقی پیدا ہو اور ایک آباد بارونق گھر کھنڈرات کا ڈھیر دکھائے دے۔ ان بد بختوں کو اتنی تمیز نہ تھی کہ ہوتا وہی ہے جو اللہ چاہتا ہے، ان کی کوششوں کو کسی کے نفع و نقصان میں کیا دخل اور جو کچھ ان کے پاس اور دواذکار تھے وہ ان کے لئے یکسر نقصان و زیاں کا باعث تھے، انہیں ذرہ برابر بھی فائدہ حاصل نہ ہوتا تھا۔ کیونکہ جب یہ لوگ دیکھتے تھے کہ چاروں طرف سے روپیہ بکثرت آ رہا ہے، لوگ ان کو قدر و منزلت کی

نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ہر جگہ ان کی آؤ بھگت ہوتی ہے،۔ اپنے نفس کی اصلاح اور اخلاق کی تہذیب کو بھول جاتے تھے، حالانکہ اصل چیز اعمال و اخلاق کی درستی ہے۔ مرنے کے بعد صرف قلب سلیم اور فطرۃ صالحہ ہی سے فائدہ ہو سکتا ہے۔ دولت کسی کام نہیں آتی۔ کاش تعلیم صحیح اور عمل صالح اختیار کرتے تو دنیا میں بھی سرفراز رہتے اور آخرت میں بھی عزت کی زندگی بسر کرتے ❶۔

### علیحدگی کا حکم

انصار مدینہ کے رہنے والے تھے۔ زراعت پیشہ ہونے کی بنا پر یہودیوں کے ساتھ ان کے تعلقات تھے۔ یہودیوں نے اطراف شہر میں اپنے مدرسے قائم کر رکھے تھے جن کو بت المدارس کہتے تھے اور جن میں انصار کی اولاد تعلیم حاصل کیا کرتی تھی۔ اس لئے صحبت و ہم نشینی کی بنا پر ان میں کچھ نہ کچھ عادتیں یہودیوں کی آگئی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ ایک جدید امت پیدا کرنا چاہتے تھے جو تمام جغرافیائی حدود اور قومی پابندیوں سے آزاد ہو اور وہ شہد آء علی الناس کے مرتبہ کبریٰ پر فائز ہو۔ ضرورت تھی کہ انصار کو ان سے الگ کر دیا جائے مگر مدت ہائے وداز کے تعلقات کو ایک قلم توڑ دینا، ایک حکیم اجتماعی کی نظر میں ناموزوں تھا، اس لئے ان اور اق میں تفصیل کے ساتھ ان کی غلط کاریوں کو بیان کیا۔ ان کے علمی و عملی نقائص کو واضح کیا اور ان کی انفرادی و اجتماعی خرابیوں پر روشنی ڈالی، تاکہ مسلمانوں کو یقین ہو جائے کہ بنی اسرائیل میں حکومت کرنے، مسلمانوں کے ساتھ مل کر کام کرنے اور ان میں عمدہ رعایا بننے کی مطلق قابلیت نہیں ہے۔ فرزند ان اسلام کسی پر بھروسہ نہ کریں بلکہ خود اپنے اندر کام کرنے کی قوت پیدا کریں۔ یہودیوں کی طرف سے ان کے دلوں میں عام نفرت و حقارت پیدا ہو اور اس طرح ایک جدید قومیت صالحہ کی بنیاد پڑ جائے۔ چنانچہ اب وقت آگیا کہ مسلمانوں کو ان سے دائمی طور پر الگ رہنے کا حکم دیا جائے فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انظُرْنَا وَاسْمَعُوا ۚ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ⑤

”اے ایمان والو! تم“ راعنا“ مت کہو اور“ انظرنا“ کہو اور سنتے رہو اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے۔“

جس وقت رسول اللہ ﷺ وعظود تذکیر میں مصروف ہوتے اور مسلمانوں کو آپ کی کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تو عرض کرتے کہ مزید توضیح فرما دیجئے اور ایسے موقع پر“ راعنا“ کا لفظ استعمال کرتے۔ یہ مراعات سے ہے یعنی“ راعنا سبعك و فرغہ نکلا“ ہماری بات سن لیجئے، مگر یہودیوں کے نزدیک یہ شب و شتم کے موقع پر بولا جاتا تھا اور اس کے معنی یہ

❶ یہی حال آج عالموں اور صوفیوں کا ہے۔ کتاب و سنت تو درء ظہور ہم ہے جن سے ان کی عزت برقرار رہتی، اب تعویذوں اور گندوں پر زور ہے۔ یہی ان کی آمدنی کے ذرائع ہیں اور انہیں سے اپنی منزلت لوگوں کے دلوں میں قائم کئے ہوئے ہیں۔ بعض ارباب احسان و تصوف نے تو تمام قرآن ہی تعویذات کا مجموعہ بنا دیا ہے اور اعمال قرآنی ایک کتاب شائع کر کے اپنے زعم باطل میں تحقیقات کا جدید باب مفتوح کیا ہے۔ پھر جن مولویوں اور صوفیوں کا ذریعہ معاش صرف تعویذات رہ گئے ہوں وہ اللہ کے نام پر کہاں اپنے آپ کو قربان کر سکتے ہیں۔ وہ لوکاہلی اور سستی کے دنیا میں زندہ نمونے ہیں۔ کاش اس فریب خوردہ زندگی کو ترک کر کے تبلیغ و دعوت قرآن کو اپنا مقصد حیات بنائیں۔

ہوتے تھے کہ ”اسم لا سمعت“ خدا تمہیں سننے کا موقعہ ہی نہ دے۔ بعض کہتے ہیں کہ لفظ ”زَعُونَهُ“ سے مشتق ہے، جس کے معنی احمق اور بیوقوف کے ہیں، مسلمان اپنی سادگی کی بنا پر اس کو استعمال کرتے تھے، مگر اس سے یہودیوں کو ان کی تضحیک و تمحیق کا مشغلہ ہاتھ آ جاتا تھا اور کہتے کہ ہم تو اس رسول کے ساتھ استہزاء خفیہ خفیہ کیا کرتے تھے لیکن مسلمان تو علی الاعلان کرتے ہیں۔ چنانچہ حسب ذیل روایت اس پر مزید روشنی ڈالتی ہے۔

فلما سمعت اليهود هذه الكلمة من المسلمين، قالوا فيما بينهم: كنانا سب محمداً سراً فاعلنوا به الآن۔ فكلوا يا تونہ و يقولون ”راعنا يا محمد“ ويفضحون فيما بينهم، فسبعها سعد بن معاذ رضى الله عنه فقتل لها وكان يعرف لعنه۔ فقال لليهود لئن سمعتمنا من احد منكم يقولها لرسول الله ﷺ لا ضربين عنقه۔ فقالوا اولستم تقولونها فانزل الله تعالى هذه الآية۔

”جب یہودیوں نے مسلمانوں کو یہی کلمہ کہتے سنا تو انہوں نے ایک دوسرے سے کہا ہم تو سراً محمد کو گالی دیتے تھے مگر وہ تو علانیہ کہتے ہیں۔ اس کے بعد وہ آتے اور کہتے ”راعنا يا محمد“ اور آپس میں خوب ہنستے۔ اتفاقاً سعد بن معاذ نے ان کو ایسا کرتے دیکھ لیا، وہ تازہ لگے کہ یہ تمسخر و استہزاء کرتے ہیں کیونکہ وہ عبرانی سے بھی واقف تھے۔ انہوں نے کہا کہ اگر اب کے میں نے تمہیں یہ لفظ رسول اللہ ﷺ کی شان میں کہتے سن لیا تو میں مار ڈالوں گا۔ انہوں نے کہا تم بھی یہی کہا کرتے ہو۔“ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

یہودیوں کی اس شرارت کے متعلق دوسری جگہ آتا ہے وَرَاعِنَا لَيَّا بِالْأَسْتِمْتِمْ وَطَعْنَا فِي الدِّينِ (النساء ۴۶) زبان کو مروڑ مروڑ کر اور دین اسلام پر طعن کی راہ سے ”راعنا“ کہہ کر خطاب کرتے ہیں، اس لئے شریعت نے ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کو حکم دیدیا کہ ان کے اعمال حیات تو ایک طرف، ان کے الفاظ و محاورات سے بھی پوری نفرت کرنی چاہئے اور قولاً و اعتقاداً ان سے کلی اجتناب کیا جائے۔ ہاں اگر تم کوئی بات نہ سمجھ سکو تو ”اظنونا“ کہہ دیا کرو اور سمجھنے کی کوشش بھی کرو، رہے یہ گستاخ اور دریدہ دہن تو ان کو گستاخی کی سزا مل جائے گی اور دنیا و آخرت میں ذلیل و رسوا ہو کر رہیں گے۔

مَا يَوْمُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ أَنْ يُنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ مِنْ رَبِّكُمْ ۖ وَاللَّهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴿۵۵﴾

”کتاب والوں میں سے جو منکر ہیں اور مشرک، نہیں، چاہتے کہ تمہارے رب کی طرف سے تم پر کوئی نیک بات اترے اور اللہ جس کو چاہے اپنی رحمت کی وجہ سے خاص کر لیتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔“

یہود و نصاریٰ اور مشرکین کبھی اس بات کو پسند نہیں کر سکتے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اپنے مکالمہ و مخاطبہ کے لئے چن لئے اور پھر وہ ترقی کے اعلیٰ مراتب پر پہنچ جائیں۔ بلکہ ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو مسلمانوں کو ترقی سے روک دیں، انہیں سر اٹھانے کا موقعہ نہ ملے اور دائمی طور پر ہمارے ہی غلامی رہیں۔ حالانکہ شریعتوں کے نازل کرنے میں کبھی اس امر کا خیال نہیں کیا جاتا کہ ایک قوم جو حد درجہ کی نالائق ہو۔ کتاب الہی سے بعد و ہجر اختیار کر چکی ہو، فسق و فجور میں مبتلا ہو، اخلاق فاضلہ اور اعمال صالحہ سے منحرف ہو۔ پھر بھی اس کو اپنی رحمت کے لئے مخصوص کر لے؟ اس

کے فضل عظیم کی ایک ہی قوم اجارہ دار نہیں بن سکتی بلکہ وہ جس کو چاہتا ہے اپنے کام کے لئے منتخب کر لیتا ہے۔ اس آیت میں مشرکین کا نام لیا گیا ہے، اس لئے کہ یہ بھی اپنے آپ کو ملت ابراہیم کا متبع سمجھتے تھے۔ نماز، زکوٰۃ، حج، روزہ، ختنہ، اللہ کے نام پر جانوروں کا ذبح کرنا، اشہر حرم میں لڑائی نہ کرنا تمام رسمیں ان میں موجود تھیں، ان کو قرآن حکیم کا نزول اس لئے ناگوار تھا کہ اب عرب کی سیادت اور حکومت ان کے ہاتھوں سے نکل کر مسلمانوں کے قبضہ میں آجائے گی اور وہ تمام دنیا کی حکومت حاصل کریں گے۔ ظاہر ہے کہ جس قوم کی حکومت چھین جائے ضرور دوسروں کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرے گی۔

مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ دنیا کی کوئی قوم ان کی دوست نہیں بن سکتی بلکہ ان کے مقابلے میں تمام کفار و مشرکین اور اہل کتاب ایک ہو جایا کریں گے، اس لئے کہ کفر ملت واحدہ ہے۔ سورہ انفال میں فرمایا: “وَالَّذِينَ كَفَرُوا بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ”۔ (الانفال ۷۳) اسلام کی دشمنی میں تمام کفار ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ قرآن حکیم نے اس قدر صاف صاف اس موضوع پر آیات بنیاد پیش کی ہیں کہ شاید ہی اس سے زیادہ کسی اور مسئلہ پر گفتگو کی ہوگی۔ ایک جگہ فرمایا: “وَلَنْ تَرْضَىٰ عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَهُمْ وَفَلَّحَهُمْ”۔ (البقرہ ۱۲۰) پھر کہا: “وَلَا يَزَالُونَ يَقَاتِلُونَكُمْ حَتَّىٰ يَذُوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ إِنْ اِسْتَطَاعُوا”۔ (البقرہ ۲۱۷) آل عمران میں: “لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ”۔ (آل عمران ۲۸) پھر سورہ ممتحنہ کے آخر میں فرمایا: “يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا قَوْمًا غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ قَدْ يَسْؤُوا مِنَ الْآخِرَةِ كَمَا يَبِيسُ الْغَدَاؤُ مِنْ أَصْحَابِ الْقُبُورِ”۔ (المتحنہ ۱۳) کس درجہ کھول کھول کر بیان کیا: “يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِنْ دُونِكُمْ لَا يَأْمُرُكُمْ خِفَالًا وَذُوَا مَاعِنَتُمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تَخْفَىٰ صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ ﴿٥٠﴾ هَآئِنتُمْ أَوْلَاءُ تُحِبُّونَهُمْ وَلَا يُحِبُّونَكُمْ وَتُؤْمِنُونَ بِالْكِتَابِ كُلِّهِ وَإِذَا لَقُوكُمْ قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَاوْا عَصَوْا عَنْكُمْ الْاِتِّمَامَ مِنَ الْغَيْظِ”۔ (آل عمران ۱۱۹، ۱۱۸)۔

مگر مسلمانوں نے ان آیات کی بے حرمتی کی، ان کا احترام ان کے دلوں سے جاتا رہا، علمائے سونے ان کی تاویلات شروع کر دیں اور ان تمام حرکات کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام بلاد و امصار اسلامی یکے بعد دیگرے ان کے ہاتھوں سے نکلے چلے جا رہے ہیں۔ ان کی عورتوں اور لڑکیوں کو بے آبرو کر کے آگ کی نذر کیا جاتا ہے، ان کے شہروں پر ہل چلائے جاتے ہیں، کھیتیاں برباد کی جاتی ہیں، ارض مقدس چھین جاتی ہے۔

مگر آہ ٹم آہ! ان کے بدن پر جوں تک نہیں ریگیتی اور ذرا بھی ٹس سے مس نہیں ہوتے، فیما لیتنی مت قبل اھذا وکنت نسیا منسیا۔

اعتراض کی بوچھاڑ

گذشتہ آیات میں اس مسئلہ کو صاف کر دیا کہ مسلمان اہل کتاب سے کسی قسم کی تعلقات بھی نہیں رکھ سکتے اور ان

سے اتحاد کلیۃً ممنوع و ناجائز ہے، ان سے علیحدہ ہونے کے بعد مسلمانوں کو مستقل قانون اور دستور العمل کی ضرورت ہوگی تاکہ ان کا وجود قائم رہ سکے۔ یہ قانون توفیقاً کر دینی اذکر کم سے شروع ہو گا مگر یہاں سے اس کی تمہید بیان کی جاتی ہے۔ کہیں کہیں آپ نے دیکھا ہو گا کہ یہودی قرآن حکیم پر اعتراض کرتے ہیں اور وحی الہی ان کا جواب دیتی ہے، لیکن اب انقطاع تعلقات ہو چکا ہے، ترک موالات کی بنا پر وہ نہ تو مجلس نبوی میں کھلے ہندوں شریک ہو سکتے ہیں اور نہ مسلمانوں کے عام مجامع میں انہیں شرکت کا موقعہ حاصل ہے۔ اس اجتناب کی بنا پر وہ مسلمانوں پر کوئی برا اثر نہیں ڈال سکتے، مگر نیش عقرب کی طرح مقتضائے طبیعت سے بچنا بھی مشکل، اس لئے انہوں نے تجویزیہ کی کہ جب کبھی کوئی اکاد کا مسلمان راہ میں مل جائے تو اس کو بہکانے کی پوری کوشش کریں: ”إِنْ يَتَّبِقُوا يَكُونُوا لَكُمْ أَعْدَاءً“ (الممتحہ ۲) اور ان کے سامنے ایسے اعتراضات کئے جائیں جن کا ان کے پاس کوئی جواب نہ ہو اور اس طرح ان کے ایمان میں خلل واقع ہو: ”وَذَكِّرْهُمْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يُدْذِنُكُمْ مِنْ بَعْدِ إِيسَاءِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ“ (البقرۃ ۱۰۹) بغض وعداوت کی بنا پر اہل کتاب کی سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ ایمان کے بعد تم کو پھر کفر و ضلالت میں لے جائیں۔

رسول اللہ ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ نے ایک مدت تک بیت المقدس کی جانب نماز پڑھی۔ آخر میں ہمیشہ کے لئے امت مسلمہ کا قبلہ بیت اللہ بنادیا گیا۔ یہ اس امر کی تمہید تھی کہ مسلمان دنیا کی تمام اقوام و امم سے الگ ہو کر اپنا مرکز جداگانہ قائم کرتے ہیں اور ایک جدید قومیت صالحہ کی اساس و بنیاد محکم و استوار کرنے کی فکر میں ہیں، اس لئے وقت آگیا کہ مخالفین و معاندین اسلام بھی پوری قوت کے ساتھ اس تحریک کو فنا کرنے میں مصروف ہوں۔ تحویل قبلہ نے انہیں بہترین موقع دیدیا اور تمام آلات سے مسلح ہو کر مسلمانوں پر حملہ آور ہونے لُح قبلہ پر اعتراض کرنا شروع کر دیا، اللہ تعالیٰ کے ازلی وابدی اور محیط الکل علم پر نکتہ چینی کی۔ شارع علیہ السلام کی ذات اقدس کو مورد طعن و تشنیع بنایا کہ اپنی خواہشات کو مذہب کا نام دے رکھا ہے، جس طرح جی چاہتا ہے منہ کر لیتا ہے، اگر یہ مذہب الہامی ہو تا تو قبلہ بار بار نہ بدلتا۔ آئندہ آیات میں ان تمام مباحث کو صاف کر دیا جائے گا اور قبلہ کی حقیقت پر روشنی ڈالی جائے گی، مگر اس بحث کے دو پہلو ہوں گے (۱) الزامی (۲) تحقیقی، جواب دینے سے قبل ارشاد ہوتا ہے:

مَا تَسْأَلُ مِنْ آيَةٍ أَوْ نَذِيرٍ فَذَرْهَا ۖ أَوْ مِثْلَهَا ۚ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَٱلْأَرْضِ ۚ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ۝ (البقرۃ ۱۰۷، ۱۰۸)

”ہم جب کسی آیت کو موقوف یا فراموش کر دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی پہنچا دیتے ہیں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ آسمانوں اور زمین کی سلطنت اللہ ہی کے لئے ہے اور تمہارا اللہ کے سوا کوئی حمایتی اور مددگار نہیں۔“

پہلے رکوع میں بتایا گیا ہے کہ یہودیوں کو مسلمانوں کے ساتھ جس قدر بغض وعداوت ہے، اس کا اصلی سبب صرف یہ ہے کہ بنی اسمعیل پر کیوں وحی الہی نازل ہوئی اور بنی اسرائیل کو کس لئے اس فضیلت کبریٰ سے محروم کر دیا گیا؟ ظاہر ہے

کہ وحی والہام کے بدلتے ہی حکومت کا مسئلہ بھی جدید صورت اختیار کرے گا۔ یعنی یہودی ذلیل ہوں گے اور مسلمانوں کو حکومت نوازش ہوگی، اسی لئے وہ بد بخت زیادہ چیخ و پکار کرتے تھے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ جب ہم کسی ملت کو منسوخ کرتے ہیں تو پھر دو صورتیں ہمارے سامنے ہوتی ہیں، اس سے بہتر قوم کو اس کی جگہ کھڑا کر دیں یا اس جیسی ہی ہو۔ چنانچہ یہودیوں کی مفضوبیت کے بعد اس کے مساوی درجہ کی قوم عیسائیوں کی کھڑی کر دی گئی، اب ان سے بہتر قوم کو پیدا کیا جاتا ہے: کنتم خیر امة اخراجت للناس، جو تمام دنیا میں پھیل جائے گی اور ارض الہی کا ایک ایک گوشہ نفعہ توحید سے معمور ہو جائے گا۔

زمین و آسمان کی بادشاہت اللہ کی ہے۔ وہ ایک قوم کو حکومت نوازش کرتا ہے، جب اس میں ناقابلیت پیدا ہو جاتی ہے تو اس کی جگہ دوسری ملت قائم کی جاتی ہے کہ نظام عالم میں خلل نہ واقع ہو، اور ارض الہی فساد کا گہوارہ نہ بن جائے۔ پھر اقوام و امم کے تغیر و تبدل پر اللہ تعالیٰ کا علم کس طرح محل اعتراض بن سکتا ہے، اگر عرب کے ظہور و شہود کو ہم نے باقی قوموں سے موخر کر دیا تھا اور کائنات خلعت ابراہیم کے بعد اس پر گمنامی کا پردہ ڈال دیا تھا تو یہ کسی نہ کسی مصلحت کی بناء پر تھا، چنانچہ اس تاخیر کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ آج دنیا کی تمام قومیں اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہیں اور وہ جہاں جاتی ہے فتح و نصرت اس کے قدم چوم لیتی ہے۔

ناسخ و منسوخ؟

فن تفسیر میں ناسخ و منسوخ ایک اہم ترین باب ہے، جس سے ناواقفیت زلتہ قدم کا باعث ہوتی ہے۔ نسخ کی تعریف میں متقدمین و متاخرین کا اختلاف ہے۔ اسی اختلاف کی بنا پر اس کے متعلق عجیب و غریب مباحث پیدا ہو گئے۔ حضرات صحابہ و تابعین کے کلام کا استقرا بتاتا ہے کہ وہ نسخ کو اس کے لغوی معنی میں استعمال کرتے تھے، یعنی ایک چیز کو دوسری چیز کے ذریعہ زائل کر دینا، اس لئے اگر عمل کی مدت ختم ہو گئی، کلام کو اس کے متبادر معنی سے غیر متبادر کی جانب پھیر دیا، یہ بتایا کہ پہلے جو قید تھی وہ صرف اتفاقی طور پر لگائی گئی تھی۔ لفظ کی عمومیت میں کچھ تخصیص کر دی، منصوص اور مقیس علیہ ظاہری میں امر فارق کو بیان کر دیا، یا جاہلیت کی کسی عادت اور قانون کو دور کر دیا، تو ان کے نزدیک یہ تمام صورتیں نسخ میں داخل ہوں گی۔

ابن حزم نے کہا:

”النسخ فی اللغة موضوع باء معنیین احدهما الزوال علی جهة الانعدام والثانی الی جهة الانتقال“

لغت میں نسخ کے دو معنی آتے ہیں (۱) ایک، حکم بالکلیہ زائل کر دینا (۲)، حکم کی مدت عمل ختم ہو گئی اس کی جگہ دوسرا حکم دینا۔

ایک مثال سے یہ مضمون اور زیادہ واضح ہو جائیگا، طبیب اپنے مریض کی حالت کا اندازہ کر کے اس کے لئے منضج کا نسخ



تجویز کرتا ہے، جب اس کا اثر مکمل ہو جاتا ہے اور اس کی ضرورت باقی نہیں رہتی تو مسہل کا نسخہ دیتا ہے، یہی مثال ہے تمام احکام شرعیہ کی۔ مگر متاخرین ارباب تفسیر نے نسخہ کی جو تعریف کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ایک ہی وقت میں دو متناقض حکم صادر ہوں تو دوسرا پہلے کے لئے نسخ ہوگا، مگر انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ منطقیوں نے تناقض کے لئے آٹھ شرطیں معین کی ہیں۔

درتنا قض ہشت وحدت شرط داں  
 وحدت موضوع و محمول و مکاں  
 وحدت شرط و اضافت جزو و کل  
 قوت و فعل است در آخر ماں

لیکن کیا کوئی صاحب علم و بصیرت ثابت کر سکتے ہیں کہ جن آیتوں میں وہ نسخ و منسوخ کو تسلیم کرتے ہیں ان میں کہیں یہ شرطیں بھی پائی جاتی ہیں یا نہیں والنبیۃ علی البدعی، اگر ہم اس وقت، جبکہ الیوم اکملت دینکم کی آیت ہمارے سامنے ہو، نسخ و منسوخ کو قرآن میں تسلیم کر لیں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ قریباً تمام قرآن بیکار ہے۔ خود زمانہ رسالت میں نسخ کا ہونا مسلم اور اس کی مثال بیمار اور طبیب کی ہے، ایک امت کو وجود میں لانے کے لئے ان تمام منازل میں سے گزرنا ضروری ہے، مگر اب تو وہ ایک مکمل قانون کی صورت میں ہمارے سامنے ہے اور کسی کو اس میں تغیر و تبدل کا حق نہیں۔ بعض لوگوں نے پانسو آیات کو منسوخ تسلیم کیا۔ شیخ محی الدین ابن عربی کے نزدیک بیس آیات ہیں اور امام المتاخرین شاہ ولی اللہ نے اپنی کتاب الفوز الکبیر میں صرف پانچ آیتوں پر اکتفا کیا۔ یہ رفتار خود بتا رہی ہے کہ کسی طرح آہستہ آہستہ نسخ و منسوخ کے اصول کو اس وقت قرآن سے زائل کیا جا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر شاہ ولی اللہ کی پانچ آیتوں میں آپ زراقت نظر سے کام لیں تو ان کا نسخ بھی جاتا رہتا ہے اور اس طرح تمام کتاب اول سے لے کر آخر تک قابل عمل بن جاتی ہے۔ چنانچہ ہم نے ان پانچ آیات کی اپنے مقام پر ایسی توجیہ کر دی ہے کہ کوئی سلیم الفطرة انسان اس سے انکار ہی نہیں کر سکتا۔

اور اس آیت سے تو کسی طرح استدلال ہو ہی نہیں سکتا، اس لئے کہ اس میں ملتوں اور قوموں کے عروج و زوال پر بحث کی گئی ہے۔

اعتراض کی اصلی غرض

أَمْ تَرْيَدُونَ أَنْ نَسْأَلَكُمْ كَمَا سَأَلَ مُوسَىٰ مِنْ قَبْلُ ۚ وَمَنْ يَتَّبِعْ لَ الْكُفْرِ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ ﴿٨٥﴾

”کیا تم مسلمان بھی چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے ایسے سوال کرو، جیسے اس سے قبل موسیٰ سے کئے گئے تھے اور جو کوئی



یقین کے بدلے انکار لیوے، وہ سیدھی راہ بھول گیا۔

جس وقت مسلمانوں نے یہودیوں سے قبلہ پر اعتراضات سنے تو ان کے دل میں بھی خلجان پیدا ہوا اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کے متعلق کچھ سوالات کئے، انہیں جواب دیا گیا کہ جب تم نے شارع ﷺ کو اللہ کا رسول (ﷺ) تسلیم کر لیا، اب اس کے احکام و اوامر میں شبہ کی گنجائش ہی نہیں رہی۔ جو شبہات تمہارے دل میں پیدا کئے گئے ہیں، ان کی اصل غرض تو یہ ہے کہ تمہارے ایمان و اسلام میں خرابی آجائے اور بنیادی اصول غلط نظر آنے لگیں۔ کثرت سے سوال کرنا، فلسفیانہ مشکافیاں اور دور از کار مباحث لا کھڑے کرنا، ان یہودیوں کا کام ہے۔ ان کی تاریخ تمہارے سامنے ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کو اپنے سوالات سے تنگ کر دیا اور پھر اس سوال و جواب کا نتیجہ بھی کچھ نہ نکلا۔ ایسے سوالات کرنا مسلمانوں کی شان سے بعید ہے۔

جن لوگوں میں کام کرنے کی استعداد ہوتی ہے اور وہ نوع انسانی کی خدمت کرنا چاہتے ہیں انہیں سوالات کا بہت ہی کم موقع ملتا ہے کیونکہ انہیں فرائض کی ادائیگی ہی سے فرصت نہیں ہوتی کہ سوالوں کی طرف ان کا دماغ متوجہ ہو، البتہ بیکار لوگ برابر سوال کرتے رہتے ہیں کثرة الکلام تبغی عن قلت العمل، اسی لئے عرب میں یہ ضرب المثل مشہور ہے کہ کن بد اولات کن لسانا زبان کی بجائے درست عمل بننے کی کوشش کرو۔

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُّوْكُمْ مِّنْ بَعْدِ إِسْلَامِكُمْ كُفَّارًا ۖ حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنْفُسِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْتَصُواْ وَاصْفَحُواْ حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرٍ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٠٩﴾ (البقرۃ ۱۰۹)

”بہت سے کتاب والے چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان کے بعد تمہیں کافر بنادیں اور یہ اس لئے ہے کہ ان کے دلوں میں تمہارے لئے حسد ہے باوجود اس بات کے کہ حق ان پر کھل چکا ہے پس تم درگزر کرو اور خیال میں نہ لاؤ جب تک اللہ اپنا حکم بھیجے، بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

اس آیت میں یہودیوں کے اعتراض کی اصلی غرض بیان کر دی کہ وہ مسلمانوں کو دین حق سے منحرف کرنا چاہتے ہیں اور وہ بھی بغض و عداوت کی بنا پر کہ بنی اسمعیل پر کیوں کروچی نازل ہوئی۔ حالانکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ اب زمانہ کی ضروریات اسی بات کی مقتضی ہیں کہ قرآن کا نزول ہو۔ کیونکہ تورات، زبور اور انجیل میں سے کوئی کتاب بھی انسان کے لئے مفید نہیں ہو سکتی۔

جب ایک عالم آدمی قانون کا اتباع چھوڑ دیتا ہے تو اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ دوسرے لوگ بھی راہ حق سے منحرف ہو جائیں۔ ورنہ اس پر اعتراضات ہوں گے۔ یہی حال یہودیوں کا ہے۔ اپنی کتاب کو دواعظہو دھم کر دیا: اب مسلمانوں میں بھی یہی بے عملی کا مرض پیدا کرنے کی فکر میں ہیں، اسی لئے اعتراض کی بوچھاڑ ہو رہی ہے۔

مسلمانوں کو معلوم ہوا کہ ان لوگوں کا اصلی مقصد اسلام سے الگ کرنا ہے تو ان کے غصہ و انتقام کی کوئی حد نہ رہی، کہ ان کی عزیز ترین متاع حیات پر حملہ ہو رہا تھا۔ مگر انہیں سمجھا دیا گیا کہ بدلہ لینے کا ابھی وقت نہیں آیا، اس وقت تو درگزر

سے کام لینا زیادہ مناسب ہے تاکہ اللہ تعالیٰ جہاد فی سبیل اللہ کے احکام نافذ کرے۔ چنانچہ جب مسلمان اس کے لئے تیار ہو گئے تو یہ آیت نازل ہوئی: ”أَذِنَ لِلَّذِينَ يُقَتِّلُونَ بِأَنفُسِهِمْ ظُلُمًا ۖ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ۝۱۰۰“ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَنْ يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۚ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفُتَّ مَثَاصِوَامُ وَيَبْعُ وَصَلَوْتُ ۚ وَمَسْجِدُ يُذَكِّرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ۚ وَلَيَنْصُرَنَّ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ۝۱۰۱“ (الحج ۳۹، ۴۰)، جن مسلمانوں سے کافر لڑتے ہیں، ان کو بھی ان کافروں سے لڑنے کی اجازت ہے، اس واسطے کہ ان پر ظلم ہو رہا ہے اور کچھ شک و شبہ نہیں کہ اللہ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے۔ یہ وہ مظلوم لوگ ہیں جو صرف اتنی بات کہنے پر کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے، ناحق اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے۔ اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ہاتھ سے نہ ہٹواتا رہتا تو نصاریٰ کے صومعے اور گرجے اور یہودیوں کی عبادت خانے اور مسلمانوں کی مسجدیں، جن میں کثرت سے خدا کا نام لیا جاتا ہے کبھی کے ڈھائے جا چکے ہوتے اور جو اللہ کی مدد کرے گا، اللہ بھی ضرور اس کی مدد کرے گا۔ کچھ شک و شبہ نہیں کہ اللہ زبردست اور سب پر غالب ہے۔

یہ فرصت کا وقت ہے اس کو غنیمت جانو اور لڑائی کے لئے جن ابتدائی امور اور اخلاق و جذبات کی ضرورت ہوتی ہے، ان کی مشق ان ایام میں کر لو۔ نماز، زکوٰۃ، روزے اور حج ابتدائی تعلیم کے قائم مقام ہیں، جب تک ان میں کمال نہ پیدا ہو گا جہاد میں کامیابی کی کوئی صورت نہیں۔ اس آیت میں دو چیزوں کا حکم دیا کہ عفو اور صفحہ سے کام لو۔ ”عفو“ سے مراد یہ ہے کہ ان کی حرکات کو اس وقت اپنے دل سے اس طرح فراموش کر دو کہ باوجود زور دینے کے پھر بھی یاد نہ آئیں اور ”صفحہ“ کا منشا یہ ہے کہ ان باتوں کی طرف توجہ تک نہ کیجئے۔ کیونکہ جب ان باتوں کی یاد تمہارے دل میں تازہ ہوگی فوراً بھڑک اٹھو گے۔ اس لئے عفو سے کام لو اور آنے والے وقت کے لئے تیار ہو جاؤ، ان ایام میں تمہارے فرائض یہ ہوں گے:

### ارکان اسلامی کی انتہائی غرض

وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ۚ وَمَا تَقَدَّمُوا لَأَنفُسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِنْدَ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝۱۰۲

”اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور جو بھلائی اپنے لئے آگے بھیجو گے وہ اللہ کے پاس پاؤ گے، بیشک اللہ تمہارے کام دیکھتا ہے۔“

نماز پڑھنا اور زکوٰۃ دینا، بچپن کی تعلیم، اور جوانی میں عمل صالح کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بڑھاپے میں انسان کو آرام ملتا ہے، پس اس فرصت کو غنیمت سمجھ کر نماز اور زکوٰۃ کی مشق کرو اور یہ محنت ضائع نہ جائے گی، بلکہ اب جس قدر مشقت برداشت کرو گے، میدان جنگ میں اتنا ہی فائدہ ہو گا، تم میں جوش و ولولہ، عزم و ثبات قدم اور استقلال و استقامت کے جذبات حقہ پیدا ہوں گے اور ایثار و فدویت کی بنا پر کفار و منافقین کے مقابلہ میں کامیاب ہو جاؤ گے، کیونکہ جنگ کے موقع پر یہی اخلاق کام آتے ہیں۔ تعداد اور سامان حرب کی کثرت کچھ بھی مفید نہیں ہوتی: کم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة باذن الله کا یہی مطلب ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہارا ایک ایک کام نہایت ہی گہری نظر سے دیکھ رہا ہے، اس کی مصلحت چاہتی ہے

کہ ابھی جہاد کا حکم نافذ کرنے میں تاخیر ہو۔

قرآن حکیم نے صدامقامات پر نماز کو مسلمانوں کا اولین فرض قرار دیا، کہیں فرمایا: **وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرُّكُوعِ** (البقرہ ۴۳) ایک جگہ آیت: **حَفِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ ۖ وَقُومُوا لِلَّهِ قَنِتِينَ** (البقرہ ۲۳۸) بعض مواقع پر یوں ارشاد ہوا: **إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَّوْقُوتًا** (النساء ۱۰۳) **أَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ** (الروم ۳۱)، **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ** (البقرہ ۱۵۳)، **وَإِذْ كَرِهَ اللَّهُ لِسْمِ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا** (الزلزلہ ۸)، **وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي** (طہ ۱۳)، مومنین کے خصائص بیان کرتے ہوئے کہا: **الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ** (المؤمنون ۲)، **وَالَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ** (المؤمنون ۹)، **رِجَالٌ لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَإِقَامِ الصَّلَاةِ** (النور ۳۷)، **كَانُوا قَلِيلًا مِّنَ الَّذِينَ آمَنُوا بِهَاجَتُونَ** (الذريت ۱۸، ۱۷) **يَسْتَغْفِرُونَ** (الذريت ۱۸، ۱۷)

ان آیات کے علاوہ اور بہت کثرت سے آیات ملتی ہیں جن میں نماز کی تاکید کی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس تاکید کو ان الفاظ میں واضح کیا:

عن ابن مسعود قال سألت النبي ﷺ أي الأعمال أحب إلى الله تعالى قال الصلاة لوقتها۔

“ابن مسعود کہتے ہیں میں نے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے پوچھا، انفرادی حیثیت سے اعمال انسانی میں سے کو نسا عمل اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ آپ نے فرمایا نماز اپنے وقت پر ادا کرنا۔”

حضرت جابر سے ہے کہ الفرق بین العبد و بین الکفر ترک الصلوٰۃ، بندہ اور کفر میں فرق کرنے والی چیز نماز کا ترک کر دینا ہے، ایک حدیث میں فرمایا: مروا اولادکم بالصلوٰۃ وهم ابناء سبع سنین و اضربوهم علیہا وهم ابناء عشر سنین و فراقوا بینہم فی المضاجع، سات سال عمر والی اولاد کو نماز پڑھنے کا حکم دو، دس سال ہونے کے باوجود نہ پڑھیں، تو ان کو مارو اور اپنے پاس مت سونے دو۔ عبد اللہ بن شقیق کہتے ہیں کہ صحابہ صرف ترک صلوٰۃ ہی کو کفر سے تعبیر کرتے تھے۔ کان اصحاب رسول اللہ ﷺ لا یرون شیئاً من الاعمال ترکہ کفرًا غیر الصلوٰۃ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے گورنروں کو حسب ذیل خط لکھا: ان اہم امور کم عندی الصلوٰۃ، من حفظہا وحافظ علیہا حفظ دینہ ومن ضیعہا فہو لہا سواھا اضیع تمہارے جس قدر اعمال و امور ملکی ہیں ان میں میرے نزدیک اہم و اعظم ترین نماز ہے، جس نے اس کی نگرانی کی اس نے اپنے دین کو بچا لیا اور جس نے اس ادنیٰ ترین مشقت کو برداشت نہ کیا، اس سے اب کیا توقع ہو سکتی ہے اور کسی بڑے ملکی کام میں اس پر اعتماد نہیں ہو سکتا۔

ایسے ہی زکوٰۃ کے لئے بھی قرآن حکیم میں مختلف آیات نازل کی گئیں۔ مومنین کی شان یہ بیان کی: **وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ** (المؤمنون ۴) **انبیاء کو ان چیزوں کا الہام ہوا۔ وَجَعَلْنَاهُمْ أَكْبَرًا يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَإِقَامَ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءَ الزَّكَاةِ** (الانبیاء ۷۴) **وَكَانُوا لَنَا عِبِيدِينَ** (الانبیاء ۷۴) عیسیٰ علیہ السلام نے دنیا میں آتے ہی اعلان کیا: **أَوْصِيَنِ بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ مَا**

دُمْتُ حَيًّا ۝ (مریم ۳۱) اسلحیل کی تعلیم کے اصول اساسی یہ تھے: وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ (مریم ۵۵)  
قرآن حکیم میں جہاں کہیں زکوٰۃ کا لفظ آتا ہے، اس سے فقہاء کی اصطلاحی زکوٰۃ مراد نہیں بلکہ اللہ کے نام پر خرچ کرنا  
اور فقر و مساکین کو کھانا کھانا، خصوصاً کی آیات میں تو اس کے سوا اور دوسرے معنی ہو ہی نہیں سکتے۔ مدینہ میں آکر اس کا  
قانون مرتب ہوا اور شارع علیہ السلام نے حضرت معاذ بن جبل کو یمن کا گورنر بناتے وقت یہ وصیت کی:

ان الله قد فرض عليهم صدقة تؤخذ من اغنياءهم فتدفع على فقرائهم۔

”اللہ نے ان پر صدقہ فرض کیا ہے کہ ان کے دو تہمندوں سے لے کر ان کے فقر و مساکین میں تقسیم کیا جائے۔“

اور اسی زکوٰۃ کے ادا نہ کرنے پر ابو بکر نے اصحاب الروۃ سے جنگ کی اور فرمایا:

والله لا قاتلن من فرق بين الصلوة والزكاة، فان الزكاة حق المال والله لو منعوني عناقا كانوا يؤدونها الى رسول الله ﷺ لقاتلتهم على منعها،

”واللہ جو شخص نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا میں اس کے ساتھ جنگ کروں گا، اس لئے کہ یہ مال کا حق ہے واللہ اگر یہ  
بکری کا ایک بچہ بھی مجھے نہ دیں گے جبکہ یہ رسول اللہ ﷺ کو دیا کرتے تھے، تو نہ دینے پر ضرور لڑوں گا۔“

نماز اور زکوٰۃ دونوں کو مسلمانوں پر فرض کیا گیا اور یہ وہ وقت تھا جبکہ جہاد کے لئے ایک آیت بھی نازل نہ ہوئی تھی، یہ  
ترتیب نزول خود اس امر پر شاہد ہے کہ شریعت کی نظر میں نماز۔ زکوٰۃ۔ روزہ۔ اور حج بالکل ابتدائی تعلیم کے درجہ پر ہیں۔  
اعلیٰ ترین تعلیم اور انتہائی اسلامی ڈگری دوسری ہے، جس کا نزول ایک مدت کے بعد ہوا۔ اور سورہ بقرہ میں فرمایا:

لَيْسَ الذِّبَانُ أَنْ تَوَلَّوْا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ (البقرہ ۱۷۷)

”مشرق و مغرب کی جانب رخ کر کے نماز پڑھنا ہی بڑی نیکی نہیں بلکہ آگے چل کر تمہیں اس سے اعلیٰ ترین نیکی بھی  
بتائی جائے گی۔“

سورہ صف میں اور زیادہ واضح کر دیا:

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَانَتْهُمْ بُيُوتًا مَرْصُوعًا ۝ (صف ۴)

”اللہ ان لوگوں کو محبوب رکھتا ہے جو کہ اس کی راہ میں ایسے صف باندھ کر جنگ کرتے ہیں گویا کہ وہ دیوار ہیں جس میں  
سیسہ پلایا گیا ہے۔“

خود اس سورہ کا شان نزول ہی بتاتا ہے کہ صحابہ، جو تمام اعمال اسلامی کی پابند تھے، اس امر کے متلاشی ہوئے کہ اب  
انہیں وہ کام بتایا جائے جو اصحاب الہ اعمال الی اللہ ہو، اس سوال کے جواب میں صف کا نزول ہوا، پھر سورہ توبہ میں تو صاف  
صاف کہہ دیا کہ:

أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ أَمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَجَهَدَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَوُونَ  
عِنْدَ اللَّهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝ (توبہ ۱۹)

”کیا حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کی آبادی کو اس شخص کے برابر کر دیا جو اللہ اور یوم آخرۃ پر ایمان رکھتا ہے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے۔ اللہ کے نزدیک یہ دونوں گروہ کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔“

سورہ نساء کو دیکھو! نماز جو تمہارے نزدیک جہاد اکبر تھی، قرآن کی نظر میں جہاد فی سبیل اللہ کے مقابلہ میں کس طرح ابتدائی درجہ میں آگئی۔ قصر صلوٰۃ کی تین ہی صورتیں ہو سکتی ہیں (۱) قصر جماعت (۲) قصر رکعات (۳) قصر اوقات، پہلی صورت کو اسی سورہ نساء نے صاف کر دیا: وَإِذَا كُنْتَ فِيهِمْ فَأَقِمْ لَهُمُ الصَّلَاةَ فَلْتَقُمْ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ مَعَكَ (النساء ۱۰۲) رکعات کے متعلق یہ حکم ہوا کہ چار کی جگہ سفر میں دو پڑھ لیا کرو: وَإِذَا صَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلَاةِ (النساء ۱۰۱) اب رہا قصر اوقات کا مسئلہ۔ تو شارع ﷺ نے اپنے عمل سے بتا دیا کہ جمع صوری ہو سکتی ہے، تمام دن سفر کرتے کرتے ایک شخص دوپہر کو ضرور قیام کرے گا۔ پس ظہر و عصر کو ملا کر پڑھ لے، رات کو کسی نہ کسی جگہ آرام کرے گا۔ اس وقت مغرب اور عشاء ادا کرے، بلکہ غزوہ خندق میں آپ نے چار نمازیں ایک ہی وقت میں ادا کیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: احس ليلة في سبيل الله افضل من الف ليلة يقام ليلها ويصام نهارها، اللہ کی راہ میں ایک رات کی چوکیداری، ہزار شب کی ایسی عبادت سے بہتر ہے کہ تمام راتوں میں قیام ہو اور دن کو روزہ ہو۔ ایک حدیث میں آیا: رباط يوم في سبيل الله خير من الدنيا وما عليها، فی سبیل اللہ ایک روز چوکیداری کرنا، دنیا اور اس کے تمام سامانوں سے بہتر ہے۔

فضیل بن عیاض، بیت اللہ الحرام میں مصروف عبادت تھے، عبد اللہ بن المبارک نے انہیں حسب ذیل اشعار لکھ کر بھیجے:

يا عابد الحرمين لو ابصرتنا  
لعلبت انك بالعبادة تلعب!  
من كان يخضب خده بدموعه  
فخورنا بدمائنا تنتخب!  
ريح العبير لكم ونحن عبيدنا  
دهج السنايك والغبار الاطيب!

حقیقت تو یہی تھی جو اوپر بیان کی گئی۔ مگر بد بختانہ ہم نے جہاد فی سبیل اللہ کو بالکل فراموش کر دیا اور آج اس کے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ نماز اسی لئے ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض کر دی گئی کہ جنگی خدمت تمام مسلمانوں پر لازم ہو۔ بیک وقت ایک لشکر جہاد تیار ہو جس کے اندر قربانی اور امیر کی اطاعت کا جذبہ صادقہ راسخ ہو اور جو ہر قسم کی بدنی تکلیف کو برداشت کر سکے۔ زکوٰۃ کا منشا یہ تھا کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی عادت ہو تا کہ جب کبھی خلافت اسلامی کو روپیہ کی ضرورت ہو تو ہر مسلمان اپنی تمام جائیداد خلافت کی نذر کر دے اور ایک کوڑی بھی اپنے پاس نہ رکھے اور ابو بکر کے اسوہ

حسنہ پر عمل کرے، جس نے اللہ کی راہ میں تمام گھر بار لٹا دیا تو رسول نے دریافت کیا، بال بچوں کے لئے کیا رکھا؟ ابو بکر نے عرض کیا: ابقیت لہم اللہ ورسولہ، سچ ہے۔

آنکس کہ ترا بخواست جاں راچہ کند؟  
فرزند و عیال و خانماں راچہ کند؟  
دیوانہ کنی ہر دو جہا نش بخشی  
دیوانہ تو ہر دو جہاں راچہ کند؟

وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَى ۚ تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ ۚ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۱۱۰﴾  
بَلَىٰ ۚ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرٌ عِنْدَ رَبِّهِ ۖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۱۱۱﴾

”اور کہتے ہیں کہ جنت میں ہر گز نہ جائیں گے مگر وہ جو یہودی ہوں گے یا نصاری۔ یہ ان کی باطل آرزوئیں ہیں، ان سے کہہ دو کہ اگر وہ سچے ہوں تو کوئی دلیل لائیں۔ بیشک جس نے اپنا منہ اللہ کے لئے فرمانبردار بنا دیا اور وہ نیکی پر ہے تو اس کی مزدوری اس کے رب کے پاس ہے اور نہ ڈر ہے ان پر اور نہ ان کو غم۔“

یہودیوں کی ایمانی حالت تو یہ ہے کہ کسی شخص کو بھی راہ حق اختیار نہیں کرنے دیتے، مگر باوجود ان حرکتوں کے نجات کے متعلق ان کا عقیدہ یہ ہے۔ حالانکہ دخول جنت کے لئے اولین شرط یہ ہے کہ وہ یکسر اطاعت و فرماں برداری بن جائے، اس کا اٹھنا اور بیٹھنا، سونا اور جاگنا، کھانا اور پینا، چلنا اور پھرنا، جینا اور مرنا سب اسی کے لئے ہو: إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۱۲﴾ لَا شَرِيكَ لَهُ ۚ وَبِذَلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ﴿۱۱۳﴾ (الانعام ۱۶۳، ۱۶۴) جس کی فطرت صالح اور قلب سلیم ہوا لا من لق الله بقلب سليم، اور جو الذین امنوا و عملوا الصلحت کے گروہ میں شامل ہو۔

## تنبیخ ملل

وَقَالَتِ الْيَهُودُ نَبِيُّهُمْ عَلِيٌّ شَوْءٌ ۖ وَقَالَتِ النَّصَارَىٰ نَبِيُّهُمْ عَلِيٌّ شَوْءٌ ۖ وَهُمْ يَتَّبِعُونَ الْكِتَابَ ۚ كَذَلِكَ قَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿۱۱۴﴾ (البقرة ۱۱۳)

”اور یہود نے کہا کہ نصاریٰ کسی راستی پر نہیں اور نصاریٰ نے کہا یہودی راستی پر نہیں، حالانکہ وہ کتاب پڑھتے ہیں۔ ایسا ہی ان لوگوں نے بھی کہا جن کے پاس علم نہیں، پس جس بات میں وہ جھگڑتے تھے اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز کرے گا۔“

جب نصاریٰ خیر ان کا وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو علماء و احبار یہود بھی ان سے ملنے کے لئے آئے، باہمی گفتگو ہوتی رہی تا آنکہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں نہایت ہی گستاخانہ الفاظ استعمال کئے اور کہا کہ

نصاری بالکل غلط راستہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ ادھر عیسائیوں نے حضرت موسیٰ کی نبوت کا انکار کیا اور کہا کہ سب کے سب یہودی ضلالت و گمراہی میں مبتلا ہیں اور لطف کی بات یہی ہے کہ دونوں گروہوں کا توراۃ پر ایمان ہے جس میں حضرت موسیٰ و عیسیٰ دونوں کی نبوت کا اعلان ہے۔ ایک دوسرے کو گمراہ کہنا اور راہ حق پر نہ سمجھنا، اس لئے ہے کہ ان میں سے کوئی فریق اقوام و ملل کے بدلنے اور منسوخ ہونے کا قائل نہیں۔

نسخ قبلہ پر اعتراض کرنے سے قبل یہ دونوں آپس میں فیصلہ کر لیں کہ ان میں سے حق پر کون ہے؟ اور یاد رہے جب تک وہ تنبیخ ادیان و ملل کے اصول کو تسلیم نہ کریں گے خود ان کا وجود ثابت نہ ہو سکے گا۔ یہودی دنیا میں اس وقت رہ سکتے ہیں، جب موسیٰ علیہ السلام سے پہلے جتنے مذاہب تھے ان کو منسوخ مان لیا جائے اور اگر یہود و نصاریٰ باہمی رضامندی سے ایک نتیجہ پر پہنچ بھی جائیں تو ان سے دست و گریبان ہونے کے لئے مجوسی ہیں۔ جن کا دعویٰ یہ ہے کہ ملت ابراہیمی کے اصلی پیروکار وہی لوگ ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کے اعتراضات کرنا اور اصول تنبیخ ملل کو تسلیم نہ کرنا، تعلیم یافتہ جماعت کی شان سے بالکل بعید ہے۔ یہ جاہلوں کی باتیں ہیں جو ارتقاء و نزول اقوام کے اصول و ضوابط سے واقف نہیں ہوتے۔ اس جھگڑے کے طے کرنے کی بہترین صورت یہ تھی کہ گھر میں بیٹھ کر غور و فکر کرتے، اس وقت انہیں معلوم ہو جاتا کہ دنیا میں قوموں کا بننا اور بگڑنا، اسی اصول پر قائم ہے اور اس کے سوا اور کوئی چارہ کار ہی نہیں۔ جب یہ لوگ اس طرح فیصلہ کرنے کے لئے تیار نہیں تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ اسلام کی راہ ترقی میں رکاوٹیں پیدا کرنا، ان کی زندگی کا اصلی مقصد ہے۔ اور صرف اسی ایک غرض کی خاطر سوالات کا سلسلہ جاری ہے۔ پس جب حق کی تلاش نہیں تو ان جھگڑوں کے طے ہونے کی بھی کوئی صورت نہیں۔ ان سب کا فیصلہ قیامت پر اٹھا رکھئے کہ وہ احکم الحاکمین حقیقت اصل یہ کو واضح کرے گا۔

### حقیقت قبلہ

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَّ اللَّهُ أَنْ يُدْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ وَسُئِلَ فِي خَرَابِهَا ۖ أُولَٰئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا إِلَّا خَائِفِينَ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١١٣﴾ (البقرة ۱۱۳)

”اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جس نے اللہ کی مسجدوں میں اس کا نام لینے سے منع کیا اور اس کے اجازت کی کوشش کی، ایسے لوگوں کو مناسب نہیں کہ مسجدوں میں آئیں مگر ڈرتے ڈرتے، ان کے لئے دنیا میں ذلت ہے اور آخرت میں عذاب عظیم ہے۔“

دنیا میں ہر قوم کی زندگی کے لئے ضروری ہے کہ اس کا ایک نہ ایک مرکز ہو، تمام افراد ملت اسی کے ساتھ وابستہ ہوں۔ ہر ایک شخص کو اسی کے ساتھ پیوستگی اور مواصلت ہو اور یہ ایک ایسا قاعدہ کلیہ ہے کہ زمین و آسمان کی ہر چیز اس کے ماتحت کام کر رہی ہے۔ ہزاروں لاکھوں نجوم و کواکب اور ثوابت و سیارات ہیں، مگر سب کا تعلق سورج کے ساتھ ہے جس



سے وہ اپنی روشنی حاصل کرتے ہیں، ایک درخت کی صد ہا ٹہنیاں اور شاخیں ہیں، مگر تمام کارزق جڑ سے آتا ہے۔ ہر دریا اور نہر کے لئے چشمہ ہے، پس اسی قاعدہ کے مطابق ضروری تھا کہ امت مسلمہ کی ہدایت و راہ نمائی کے لئے ایک مرکزی درس گاہ ہوتی جس کی شاخیں تمام دنیا میں پھیل جاتیں جو ان تمام متفرق اور منتشر اجزاء کے لئے اتحاد کا مرکزی نقطہ ہوتی جو سب کے لئے جڑ کا کام دیتی۔ جس کے سرچشمہ سے تمام عالم اسلامی کے دریا اور نہریں سیراب ہوتیں، چنانچہ اس غرض کے لئے واد غدیدی ذمہ کو منتخب کیا گیا۔ وہ سب سے اعلیٰ تعلیم گاہ قرار پائی اور دنیا بھر کی تمام مساجد کو اس کے ساتھ ملحق کر دیا گیا کہ سب درس گاہوں کی نگراں کار و محافظ ہو۔ جب مختلف بلاد و امصار اسلامی کے مسلمان اپنی اپنی تعلیم گاہوں سے فارغ ہوں تو ایک مرتبہ اس مرکزی درس گاہ میں بھی ضرور حاضر ہوں۔

یہودیوں نے نسخ قبلہ پر اعتراض کیا کہ بیت اللہ قبلہ نہ بنے۔ لیکن دراصل ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں لامرکزیت کی ترویج و اشاعت ہو، ایک مرکز سے وابستہ نہ رہ سکیں، ان کی قوتیں منتشر ہو جائیں، ان کی متحدہ طاقت فنا ہو جائے۔ ان کا کوئی تعلیمی مرکز نہ رہے اور جب مرکز نہ ہو گا تو وہ دنیا بھر کی مسجدیں خود بخود ذکر الہی سے خالی ہو جائیں گی، کوئی قوت ان کی نگراں کار نہ ہوگی، ان کا نظام قائم نہ رہ سکے گا۔ پھر ان سے بڑھ کر بھی کوئی دوسرا شخص ظالم ہو سکتا ہے؟ ایسے لوگوں کو مسجد میں قدم رکھتے ہوئے ڈرنا چاہئے کہ کہیں ان پر عذاب نہ نازل ہو جائے۔ آخر میں ان کا انجام بتا دیا کہ وہ دنیا میں بھی ذلیل رہیں گے اور آخرت میں عذاب عظیم کے مستحق ہوں گے۔

وَاللّٰهُ الْمَشْرِقِيُّ وَالْمَغْرِبِيُّ ۚ فَآيِنَّمَا اتَّوَلَّوْنَا فَمَنْ وَجْهَ اللّٰهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ وَاَسَمٌ عَلِيمٌ ﴿۱۱۵﴾ (البقرة ۱۱۵)

“اور اللہ ہی کے لئے ہے مشرق اور مغرب سو جس طرف تم رخ کرو ادھر ہی کو اللہ متوجہ ہے، بیشک وہ گنجائش والا ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔”

مذہبی آدمی ہونے کے باوجود بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ کی رحمت کو بیت المقدس ہی میں محدود کرنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ صرف اسی طرف رخ کرنے سے انوار تجلیات الہیہ کا نزول ہو سکتا ہے، یہ خیال بالکل غلط ہے۔ بلکہ اس کے لئے تو مشرق و مغرب سب برابر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جس جگہ کچھ لوگ جمع ہو کر اس کے ذکر میں مصروف ہوں گے اس کی رحمت فوراً اس طرف متوجہ ہو جائے گی۔ اس کی رحمت کا کوئی احاطہ نہیں کر سکتا اور وہی جانتا ہے کہ اس کا صحیح محل نزول کونسا ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ جب ایک بزرگ کسی جگہ بیٹھ کر اللہ کی یاد کرتا ہے تو وہاں اس کی رحمت نازل ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اگر عام لوگ اس کا اتباع کریں تو اور زیادہ انوار الہیہ نازل ہونا شروع ہو جائیں گے۔ سب جانتے ہیں کہ بیت اللہ کی بنیاد ابراہیم و اسمعیل دونوں نے مل کر رکھی اور اس وقت سے لے کر رسول اللہ ﷺ تک ہر نبی نے اس کا حج کیا، گویا بنا کی تاریخ سے لے کر امت مسلمہ کے وجود تک کوئی ایک زمانہ بھی اس پر ایسا نہیں گزرا کہ کوئی نہ کوئی پیغمبر جلیل طواف کعبہ کی غرض سے یہاں نہ آیا ہو۔ بیت اللہ بننے کے چالیس سال بعد حضرت اسحق علیہ السلام نے بیت المقدس کی بنیاد ڈالی اور آخر داؤد و سلیمان نے اس کی عمارت بنائی۔ اب ظاہر ہے کہ بیت اللہ جس قدر اس کی رحمت کے نزول کا باعث بن



سکتا ہے، بیت المقدس اس کا عشر عشر بھی نہیں۔

بعض لوگوں نے اس آیت کے یہ معنی لئے ہیں کہ اس میں مسلمانوں کے غلبہ و اقتدار کی پیشین گوئی ہے، وہ جس طرح بھی رخ کریں گے فتح و نصرت ان کے ساتھ ساتھ ہوگی۔ دنیا کے گوشہ گوشہ اور کونہ کونہ میں پھیل کر رہیں گے اور مشرق و مغرب پر انہیں کا قبضہ ہوگا، اللہ کی وسعت کو کون پاسکتا ہے، دوسری جگہ سورہ قدر میں اسی قسم کی پیشین گوئی کی: تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ أَمْرٍ ۝ سَلَّمَ ۚ هِيَ حَقُّ مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝ لَيْلَةُ الْقَدْرِ فِيهَا آمَنَ ۚ وَاسْلَامَتِي ۚ كَاجِو پیغام نازل ہوا ہے وہ مشرق و مغرب تک پھیل کر رہے گا۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا ۚ سُبْحَنَهُ ۚ بَلْ لَّهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ كُلُّ لَّهُ قَنْتُونَ ۝ بِدِيْعِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَاِذَا قُضِيَ اَمْرًا فَاَنشَا يَقُوْلُ لَهُ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝

“اور کہتے ہیں کہ اللہ اولاد رکھتا ہے حالانکہ وہ اس سے پاک ہے، بلکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کا ہے، سب اس کے فرماں بردار ہیں، آسمانوں اور زمین کا وہی موجد ہے اور جب کسی کام کے کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اسے کہتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔”

اہل کتاب کا دعویٰ یہ ہے کہ اللہ کی رحمت صرف بیت المقدس ہی میں مل سکتی ہے۔ اس غلط عقیدہ کی بنیاد یہ ہے کہ اس سے پہلے یہودی عزیز علیہ السلام کو اور عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا تسلیم کرتے ہیں، حالانکہ اس کی ذات اقدس ان تمام تعلقات اور قیود سے پاک ہے اور زمین و آسمان کی ہر چیز اس کی مملوک ہے۔

بنی اسرائیل کی شریعت میں علماء و مشائخ کیلئے ابن اللہ کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا جس کے معنی محبوب الہی ہوتے تھے، مگر جس وقت عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم کے خلاف یونانیوں کو اپنے مذہب کی جانب بلانے کی کوشش کی، تو ان کے عقول عشرہ کے مسئلہ سے فائدہ اٹھا کر کہنے لگے کہ عقل اول کی روح ان میں حلول کر گئی ہے۔ اس لئے اگر پہلے احبار یہود مجازی طور پر ابناء اللہ کہے جاتے تھے تو عیسیٰ علیہ السلام حقیقی معنی کے اعتبار سے ابن اللہ ہیں۔

عقول کا سلسلہ چلانا بالکل غلط ہے۔ اس نے اپنی حکومت کسی کے حوالہ نہیں کی بلکہ ہر چیز کا تعلق براہ راست اس کی ذات سے ہے۔ ابداع کہتے ہیں: ایجاد شیء لا من شیء فیخبرہ الشیء من کتم العدم بغیر مادۃ کہ بغیر مادہ کے کسی چیز کو عدم محض سے وجود میں لانا، پس زمین و آسمان اور اس کی ہر چیز کا مبدع وہی ہے، اس میں عیسیٰ علیہ السلام بھی داخل ہیں اور اس کے فرماں بردار بندے۔ دوسری جگہ آیہ: لَنْ يَسْتَنكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَكُوْنَ عَبْدًا لِلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ (النساء ۱۷۲) مسیح کو خدا کا بندہ ہونے سے ہر گز کسی قسم کا عار نہیں اور نہ فرشتوں کو جو خدا کے مقرب ہیں۔ قیامت کے روز جب ان سے پوچھا جائے گا کہ کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اپنا خدا مانو، تو وہ اپنی بریت و پاک دامنی کا اظہار کریں گے۔ وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ لِيَعِیْسٰی ابْنَ مَرْیَمَ اَنْتَ قُلْتُ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاٰمِیْ الْهٰیۡنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا یَكُوْنُ لِیْ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ ۚ بِحَقِّ ۚ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٖ فَقَدْ عَلِمْتُهٖ ۚ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَا اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ عَلٰمُ الْغُیُوْبِ ۝ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا

مَا أَمَرْتَنِي بِهِ أَنْ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ (المائدہ ۱۱، ۱۱۶)

پس جس طرح عزیر و عیسیٰ کو خدا کا بیٹا ماننے میں وہ غلطی پر ہیں، ایسے ہی اس کی توجہ کو بیت المقدس کی جانب محدود کرنے میں غلط راستہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔

وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللَّهُ أَوْ تَنْزِيلًا آيَةً ۖ كَذَلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۖ تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ ۖ قَدْ بَيَّنَّا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ ﴿۱۱۶﴾

“اور جن کو علم نہیں وہ کہتے ہیں کہ خدا خود ہم سے کیوں نہیں کلام کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی، ایسے ہی جو لوگ ان سے پہلے ہو گزرے ہیں، ان ہی جیسی باتیں کہا کرتے تھے، ان سب کے دل ایک ہی طرح کے ہیں۔ ہم نے یقین والوں کے لئے اپنی نشانیاں صاف طور پر بیان کر دیں۔”

توراة کو کتاب الہی اور موسیٰ کو نبی ماننے کے باوجود تحویل قبلہ پر اعتراض کرنا اور تنسیخ ملل کے اصول کو تسلیم نہ کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ مذہب سے بہت دور جا پڑے ہیں، اس صورت میں قبلہ کی بحث تو بعد میں آئے گی، پہلے ان لوگوں کو مطمئن کر لیں جو اپنی جہالت و لاعلمی کی وجہ سے کہتے ہیں کہ نبی بھیجنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سے کیوں نہیں براہ راست گفتگو کرتا یا ہم میں سے ہر ایک کو کس لئے نبی نہیں بنایا جاتا، ہم پر بھی اللہ کی آیتوں کا نزول ہو اور ہم سے معجزات ظہور میں آئیں، دوسری جگہ ان جاہلوں کا اسی قسم کا مطالبہ بیان کیا: وَإِذَا جَاءَهُمْ آيَةٌ قَالُوا لَنْ نُؤْمِنَ بِحَقِّ نَبِيِّهِ مِثْلَ مَا أُوتِيَ رَسُولُ اللَّهِ (الانعام ۱۲۴) ان کے جواب میں کہا گیا: أَنَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ (الانعام ۱۲۴) اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ رسالت کا مستحق کون ہے، اسی کو نوازش کرے گا۔

اس قسم کے سوال و جواب وہی لوگ کرتے ہیں، جو جاہل ہوں اور دین سے بے بہرہ، یہودی بھی ان جاہلوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ دونوں جماعتوں میں کوئی فرق نہیں۔ اگر طبیعت میں کبھی اور جہالت نہ ہوتی تو آیات کے سنتے ہی ان میں یقین و اذعان پیدا ہو سکتا تھا۔

## بعثت کی ضرورت

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۖ وَلَا تُسْأَلُ عَنْ أَصْحَابِ الْجَحِيمِ ﴿۱۱۷﴾ (البقرۃ ۱۱۷)

“ہم نے تمہیں حق دے کر خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور تم سے دوزخ والوں کی نسبت سوال نہیں کیا جائے گا۔”

ممکن تھا اہل کتاب کی کج بختیوں اور جاہلانہ باتوں سے رسول اللہ ﷺ تنگ دل ہوتے، جیسے سورہ شعراء میں فرمایا: لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسًا أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ﴿۲﴾ (الشعراء ۲) اس لئے آپ کے اطمینان قلب کے لئے فرمایا کہ ہم نے تم کو خواہ مخواہ رسول بنا کر نہیں بھیجا، بلکہ دنیا کے حالات و واقعات اسی امر کے مقتضی تھے، اس لئے کہ:

(الف).... بنی اسرائیل کو زمانہ ہوا مسیح سے قبل ہی غضب الہی میں مبتلا ہو چکے تھے، ان کو سانپ اور سانپ کے بچے کہا جاتا تھا۔ مسیح علیہ السلام کی لعنت نے ان کو اور زیادہ مسخ کر دیا اور اب ان میں انسانیت کا ذرہ برابر بھی شائبہ باقی نہ رہا۔ ہمسایہ قوموں کی صحبت و یک جانی سے ان میں بت پرستی آگئی۔

(ب).... یورپ قرون مظلمہ میں سے گزر رہا تھا اور چاروں طرف جہالت کا دور دورہ تھا۔ انگلستان میں برٹن اور سکسن وحشی قومیں آباد تھیں۔ نار تھمبر لینڈ، مڈ لینڈ، کون ٹیز، نار فوک، سوفوک اور ساسیکس اضلاع انگلستان میں ووڈن بت کی پوجا ہوتی تھی۔

فرانس، برن ہلڈ سگ برٹ، فرے دی گوئن دی، اور مل ہے رک کے نصف پر افسانوں کی حکومت تھی، جبکہ پادریوں کے ایماء سے بہت سی بیہودہ گیاں روار کھی جاتی تھیں۔ فرانس ہمیشہ سکین قوم سے دریائے الب پر جنگ کرتا رہتا تھا۔ یہ لڑائی ۸۲ء کے بعد تک جاری رہی۔ جبکہ ہزار سکین قیدی نہایت ہی بے رحمی سے شہر ووڈن میں قتل کئے گئے۔ ہنگری ان دنوں بے انتہا وحشی و بربری اقوام کے قبضہ میں تھا جس کو ظالمانہ وسائل سے اپنی مذہب میں لایا گیا تھا۔

(ج).... ایران میں مجوسیت و کیہ کا زور تھا جنہوں نے زر، زن اور زمین کو وقف عام کر دینے سے اخلاق انسانی اور نوعی ارتقا کا ستیاناس کر دیا تھا۔

(د).... ہندوستان میں پرانوں کا زمانہ تھا۔ ایام مارگی فرقہ قابو یافتہ تھا جو اپنے ناپاک اور گندے اصولوں کی طرف لوگوں کو بلاتا تھا۔ مندروں میں عورتوں اور مردوں کی برہنہ تصاویر بنا کر رکھی جاتی تھیں۔ انہی کی پرستش ہوتی تھی۔ عبادت خانوں کے درودیوار پر ایسی تصویریں آویزیں ہوتی تھیں جن کو ایک لمحہ کے لئے بھی کوئی شریف اور مہذب انسان دیکھنا گوارا نہ کرتا تھا۔

(ه).... چین کے رہنے والے اپنے ملک کو آسمانی فرزند کی بادشاہت تصور کر کے خدا سے منہ موڑ چکے تھے۔ ہر کام کے جد اجدا بت مقرر تھے۔ کوئی بارش کا ہے، کوئی امن کا ہے اور کوئی جنگ کا۔ عام خیال یہ ہے کہ کنفیوشس نے آکر چین کی اصلاح کی ہے، مگر اس وقت تک اس کا بھی ظہور نہ ہوا تھا۔

(و).... مصر میں عیسائیت کا دور دورہ تھا۔ مسیح علیہ السلام کی شخصیت اور انبیت کے متعلق نئے عقیدے بنتے تھے، جن کی وجہ سے ایک فرقہ دوسرے کی تکفیر کرتا، باہمی خون ریزی ہوتی اور اگر موقع بن پڑتا تو آگ میں بھی جلادیتے۔

(ز).... عرب میں خود سری تھی، اپنے ہی بھائیوں کو قتل کرتے، جو اور شراب کا عام دستور تھا۔ بیٹوں کو زندہ دفن کر دیتے، پتھر، درخت چاند، سورج، پہاڑ اور دریا ان کے معبود تھے۔ انسانی حقوق کا کوئی ضابطہ نہ تھا، اسی لئے قتل انسان، رہزنی، جس بیجا، ناجائز تصرف، بیجا مدخلت کے مرتکب ہوتے تھے۔

پس عین ضرورت کے مطابق آپ کی بعثت ہوئی، اس لئے آپ اپنا فرض برابر ادا کرتے رہیں، جو لوگ راہ حق اختیار

کریں ان کی ہمتوں کو اور زیادہ بڑھائے اور دنیا و آخرت کی کامیابی کی ان کو بشارت دیجئے، لیکن جو آپ کی مخالفت کریں ان کی کمر ہمت کو توڑیے اور ان کو عذاب الیم کی بشارت دیجئے۔ رہے ضدی اور ہٹ دھرمی لوگ، ان کا سمجھنا آپ کے ذمہ نہیں اِنَّمَا اَنْتَ مَذْكُرٌ ﴿۱۰﴾ لَسْتُ عَلَيْهِمْ بِمُصَيِّطٍ ﴿۱۱﴾ (الغاشیہ ۲۲، ۲۱) ان کی ناپاک اور طحندانہ زندگی کے متعلق تم سے کوئی سوال نہیں کیا جائے گا۔

وَلَنْ تَرْضَىٰ عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۖ قُلْ اِنْ هَدَىٰ اللّٰهُ هُوَ الْهَدٰى ۚ وَلَئِنْ اَتَّبَعْتَ اَهْوَاءَهُمْ  
بَعْدَ الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۚ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلٰى ۚ وَلَا نَصِيْرٌ ﴿۱۲﴾ الَّذِيْنَ اَتَيْنَهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهُ حَقَّ  
تِلَاوَتِهِ ۚ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۳﴾

“اور تم سے یہود و نصاریٰ ہرگز خوش نہ ہوں گے جب تک ان کا دین اختیار نہ کر لو۔ ان لوگوں سے کہہ دو کہ اللہ کی ہدایت وہی اعلیٰ ہدایت ہے اور اگر اس علم کے بعد جو تمہارے پاس آگیا ہے، انکی خواہشوں کی پیروی کی تو پھر اللہ سے بچانے والا نہ کوئی دوست ہو گا اور نہ مددگار۔ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے، وہ اسکو پڑھتے ہیں جیسا پڑھنے کا حق ہے۔ اور وہی اس پر ایمان بھی رکھتے ہیں اور جو کوئی اس سے منکر ہو گا، وہی نقصان میں رہے گا۔

یہاں بالکل صاف صاف کہہ دیا اور “نہ لانے سے اس کے دوام اور ہمیشگی کی طرف اشارہ کیا کہ یہود و نصاریٰ ایک لمحہ کے لئے بھی مسلمانوں سے خوش نہیں ہو سکتے۔ اسلام کے لئے بغض و عداوت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کا سب سے بڑا جرم یہی ہے کہ ان یقول بنی اللہ، اسی معصیت کی طرف سورہ بروج میں اشارہ کیا: وَمَا نَقِبُوا مِنْهُمْ اِلَّا اِيْوَمَنَا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ، سچ ہے۔

حياتك ذنب لا يقاس به ذنب!

البتہ اگر مسلمان اپنے قرآن کو ترک کر دیں اور ان کی اطاعت قبول کر لیں تو پھر وہ ان کے ساتھ ہیں، مگر ان اہل کتاب کی اطاعت کو قرآن حکیم کفر سے تعبیر کرتا ہے۔ سورہ آل عمران میں فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنْ طٰطِعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اٰوْتُوْا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْسَانِكُمْ كُفْرًا ۚ ﴿۱۴﴾ وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ  
وَ اَنْتُمْ تُثَلِّىٰ عَلٰىكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهُ ۚ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هَدٰى اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۵﴾

(آل عمران ۱۰۱، ۱۰۰)

“مسلمانو! اگر تم اہل کتاب کے کسی فرقہ کا بھی کہا مانو گے وہ تمہیں راہ حق سے پھر دیں گے اور ایمان کے بعد پھر کفر میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ اور تم کیسے کفر کرنے لگو گے؟ حالانکہ اللہ کی آیتیں تم کو پڑھ پڑھ کر سنائی جاتی ہیں اور اس کے رسول تم میں موجود ہیں اور جو شخص اللہ کے دین کو مضبوطی سے پکڑے رہے بلاشبہ اس پر سیدھی راہ کھل گئی۔“

اطاعت کی ضرورت اس وقت محسوس ہوا کرتی ہے، جب کسی قوم کے پاس قانون نہ ہو۔ مگر مسلمانوں کے پاس

قانون بھی ہے اور اس کی شرح بھی، رسول اکرم ﷺ کی حیات مقدس قرآن کی عملی تفسیر ہے، باوجود اس کے پھر وہ یہود و نصاریٰ کی فرماں برداری کریں تو انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ اللہ کی رحمت سے دور جا پڑے ہیں۔ سورہ بنی اسرائیل میں فرمایا:

وَلَوْلَا اَنْ تَبْتَئِكَ لَعَدَّتْ كَيْدُكَ تَتَرَكْنُ اِيْنِهِمْ شَيْئًا قَلِيْلًا ۝ اِذَا لَا دُفْنُكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ۝ (بنی اسرائیل ۷۵، ۷۴)

”اگر یہ بات نہ ہوتی کہ ہم نے تم کو ثابت رکھا تو تم ضرور جھکنے لگ جاتے ان کی طرف تھوڑا سا۔ ایسا ہوتا تو ہم ضرور دونا عذاب زندگی کا اور دونا عذاب موت کا چکھاتے، پھر تم ہمارے مقابلہ میں کسی کو مددگار نہ پاتے۔“

رسول اکرم ﷺ کی تمام تر زندگی اس بات پر شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی ہمیشہ نصرت و یادری کی اور کبھی ان کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑا، پس معلوم ہوا کہ آپ نے یہود و نصاریٰ کے اتباع کا خیال بھی نہیں کیا۔ اس آیت سے یہ استدلال کرنا کہ رسول اللہ ﷺ معاذ اللہ اہل کتاب کا اتباع کر سکتے ہیں، سخت غلطی کا مرتکب ہونا ہے۔ اس آیت کے معنی دو طریق پر ہو سکتے ہیں۔

(الف) رسول اللہ ﷺ کی معرفت تمام امت مسلمہ سے خطاب کیا جا رہا ہے کہ اگر تم نے اہل کتاب کا اتباع کیا تو ظالم بن جاؤ گے۔ چنانچہ آل عمران کی آیت ابھی آپ پڑھ چکے ہیں۔

(ب) غیر ممکن اور محال کو فرض کیا گیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا لَوْ كَانَ فِيْهِمَا اِلَهٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (الانبیاء ۲۲)

اگر محال اور ناممکن کے حسب ذیل اقسام کو پیش نظر رکھ لیا جائے تو اکثر اشکالات خود بخود رفع ہو جائیں گے۔

(۱).... عقلی، جو کبھی نہ ہو سکی مثلاً نظیر باری تعالیٰ۔

(۲).... فطری، جو نیچر کے خلاف ہو، آفتاب کا ایک غائب ہو کر پھر کبھی نہ نکلتا۔

(۳).... عادی، نیچر کے جس قدر قوانین ہمیں معلوم ہیں، ان کے خلاف، چنانچہ انبیاء علیہم السلام کے معجزات اسی تیسری قسم میں داخل ہیں۔

محال عقلی تو اس لئے نہیں ہو سکتا کہ اس میں وجود کے قبول کرنے کی قابلیت اور استعداد ہی نہیں ہوتی۔ محال فطری، اس حکیم علی الاطلاق کی حکمت کلی کے خلاف ہے، اس لئے نہیں ہوتا، مگر اس میں وجود کی قابلیت ضرور ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت اس سے متعلق ہو سکتی ہے۔

محال عادی، ہمیشہ حضرات انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ہاتھ پر ہوا ہے۔

قرآن حکیم صرف ارباب صلاح و تقویٰ کے لئے نازل کیا گیا ہے، وہی اس میں درس و فکر کرتے ہیں اور اس پر عمل کرنے کے لئے پوری ہمت صرف کرتے ہیں۔ جو بات انہیں سمجھ میں نہ آئے آپ سے دریافت کر لیتے ہیں۔ یہی لوگ مومن ہیں، اس لئے صرف انہی کی تعلیم کی طرف آپ کی توجہ ہونی چاہئے۔ یہود و نصاریٰ بات کی بچ کرتے ہیں۔ ان پر

وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود ہی اپنی ذلت و رسوائی کے اسباب پیدا کر رہے ہیں اور آخر میں یہی لوگ ناکام و خاسر رہیں گے۔

## انصاف سے کام لیں

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنْعَمُوْا عَلٰى الَّذِيْنَ اٰتٰوْا بِكُمْ اَمْوَالَهُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۱۸۱ وَ اَتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يَقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُوْنَ ۝۱۸۲

”اے بنی اسرائیل! میرا احسان یاد کرو جو میں نے تم پر کیا اور یہ کہ سارے جہان پر تم کو بڑا کیا اور اس دن سے ڈرو کہ کوئی شخص کسی کے کچھ کام نہ آئے اور نہ اس کی طرف سے معاوضہ قبول کیا جائے نہ کسی کی سفارش کام دے اور نہ لوگوں کی ان کو مدد پہنچے۔“

گذشتہ آیات میں تحویل قبلہ کے متعلق الزامی جواب دیا گیا۔ اب تحقیقی اعتبار سے گفتگو کی جاتی ہے۔ ان کی قومی دیانت، خاندانی بزرگی اور احتساب اعمال کو پیش کر کے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ جھوٹ بولنے سے پرہیز کریں اور صحیح جواب دیں۔

وَ اِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهُ بِكَلِمٰتٍ فَاَتٰتَهُنَّ ۚ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۖ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِیْ ۖ قَالَ لَا يَنْبَلٰٓى عَهْدِیْ الظَّالِمِیْنَ ۝۱۸۳

”اور جب ابراہیم کے پروردگار نے ان کو چند باتوں میں آزمایا، پھر انہوں نے ان کو پورا کر دیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تجھ کو تمام لوگوں کا پیشوا بنائوں گا۔ ابراہیم نے عرض کیا: اور میری اولاد میں سے؟ فرمایا کہ ظالموں کو میرے عہد سے کچھ حصہ نہ ملے گا۔“

یہاں سے امت مسلمہ کی مؤسس اوّل حضرت ابراہیم علیہ السلام، ان کی ترک وطن اور ذہاب الی اللہ کی مختلف منازل، قربانی کے مراتب اور بنائے کعبہ کی تاریخ بیان کی جاتی ہے۔ یہ تفصیل خود ان کی کتابوں میں موجود ہے، اس کو پڑھ لینے کے بعد بتائیں کہ ابراہیم کے وارث کا قبلہ کونسا ہونا چاہئے؟ اگر باوجود اس کے پھر بھی نہ مانیں تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ تمام سعی و کوشش فتنہ و فساد برپا کرنے کے لئے ہے، ورنہ توراۃ کی تعلیم کے مطابق رسول اللہ ﷺ کا قبلہ یہی ہونا چاہئے۔

امتحان اور آزمائش کی غرض یہ ہوتی ہے کہ:

(الف) .... امتحان لینے والا خود اس شخص کی قابلیت اور استعداد کو دریافت کرنے کی فکر میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اس کی ضرورت نہیں۔

(ب) .... دوسروں پر اس کے فضائل و محاسن اور کمالات کا اظہار کرنا چاہتا ہے۔

(ج) .... اس کی کمزوریوں کو دور کر کے کامل و مکمل بنانا مقصود ہے۔

چنانچہ اس جگہ دوسرے معنی مراد ہیں، وہ کلمات کیا تھے جن میں ابراہیم علیہ السلام کا امتحان لیا گیا؟ قرآن نے خود، دوسرے مقامات پر ان کو بیان کر دیا ہے اور وہ حسب ذیل ہیں۔

(الف) .... قوم سے علیحدگی، حضرت ابراہیم کی قوم ستارہ پرست تھی، انہوں نے بہت سمجھایا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا، آخر انہیں اپنی قوم سے علیحدگی اختیار کرنی پڑی اور اعلان کر دیا: **إِنَّا بَرِئُوا مِنْكُمْ وَبِمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّى تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ** (الممتحنہ: ۴) اور اس طرح بتا دیا کہ حق و حریت کی راہ میں قومیت کی آہنی زنجیریں پاؤں کو بوجھل نہیں کر سکتیں، اسلام ان پابندیوں سے آزاد اور ایک بالاتر حقیقت ہے۔ تمام قومیں اور ملتیں اس کے دائرہ میں داخل ہوتے ہی اپنے امتیازات و خصائص کو مٹا دیتیں ہیں اور صرف ان اکرامک عند اللہ اتفاق ہو ہی ان کے لئے باعث فخر و افتخار رہ جاتا ہے۔ پس اگر قومیت اور اسلام میں کبھی تصادم ہو تو ایک مسلم قانت کا فرض ہے کہ وہ فوراً اس کی پابندیوں سے اپنے آپ کو آزاد کر دے۔

(ب) جانی قربانی، جب قوم کی مخالفت حد سے بڑھ گئی تو سب نے مل کر انہیں آگ میں ڈال دیا۔ **قَالُوا حَرِّقُوهُ وَانصُرُوا آلِهَتَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ لَفُعِلِينَ** (الانبیاء: ۶۸) کلمہ حق کی خاطر اس کائنات غلت نے آگ میں کود پڑنا گوارا کیا، اس لئے قدوس حق نواز کی طرف سے حکم ہوا **قُلْنَا إِنَّا نُؤْتِيكَ بِزَوْجٍ سَلَمَاءَ أَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ** (الانبیاء: ۶۹)

(ج) ترک وطن، باوجود ان تکالیف و شدائد کے انہوں نے دعوت الی اللہ کے اہم و اقدم فرض کو ترک نہیں کیا۔ آخر چار و ناچار انہیں وہ منزل اختیار کرنی پڑی جو ہر داعی حق کے لئے ضروری اور ناگزیر ہے اور فرمایا: **إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَىٰ رَبِّي سَيِّدِينَ** (الصافات: ۹۹) توحید کے لئے انہیں وطن چھوڑنا پڑا اور بتا دیا کہ وطنیت، اسلام کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ مسلمان ایک خاص جگہ کے رہنے والے نہیں، وہ شہداء علی الناس بنا کر بھیجے گئے ہیں، کہ دنیا بھر کی قوموں کی نگرانی کریں اور سب جگہ ان کی حکومت ہو، اس لئے تمام روئے زمین ان کا وطن ہے۔

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا!

(د) بیٹے کی قربانی، ایک شخص اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال سکتا ہے، اس کے لئے قوم اور وطن کا قربان کرنا بھی کچھ مشکل نہیں۔ مگر وہ ایک لمحہ کے لئے یہ نہیں دیکھ سکتا کہ اس کی عزیز ترین متاع حیات بیٹے کو کسی قسم کی تکلیف پہنچے۔ یہی سب سے زیادہ کٹھن منزل ہوتی ہے، اس لئے سب سے آخر میں اس کو رکھا گیا: **فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيُ قَالَ يَتِيمٌ إِنِّي أَنَا فِي الْمَتَامِ أَتَىٰ أَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَأْمُرُ ۖ قَالَ يَا بَتِ اِفْعَلْ مَا تَأْمُرُ ۖ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّادِقِينَ** (۷) **فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ** (۸) **وَنَادَيْنَاهُ أَنِ يَا إِبْرَاهِيمُ** (۹) **قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا ۚ إِنَّا كَذَبُكَ نَجْوَىٰ الْمُنْجِسِينَ** (۱۰) (الصافات: ۱۰۵، ۱۰۶)

حضرت ابراہیم علیہ السلام ان چاروں امتحانات میں کامیاب ثابت ہوئے۔ دوسری جگہ آتا ہے: **وَإِبْرَاهِيمَ الَّذِي وَفَّىٰ** (۱۱)



(الجم ۷۳) دنیا کو معلوم ہو گیا کہ اس زمین کی پشت پر ابراہیم سے بڑھ کر اور کوئی مسلم نہیں اور وہ خود پکار اٹھے:  
 اَسَلْتُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۳۱﴾ (البقرة ۱۳۱) ایک اور جگہ کہا: اِنَّ صَلَاحَ وَنُسُكًا وَمَحْيَايَ وَمَمَلِكًا لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۳۲﴾ لَا شَرِيكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُحَرِّثُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ﴿۱۳۳﴾ (الانعام ۱۳۳، ۱۳۲) دوسرے مقام پر یوں توحید کا اقرار کیا: اِنِّیْ بِرَبِّیْٓ اَوْفٰی تَشْبٰرًا ۚ کُوْنُ ۙ اِنِّیْ وَجْهٌ وَجْهٌ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ﴿۷۸﴾ (الانعام ۷۸، ۷۹)

جب ابراہیمی کمالات ظاہر ہو گئے تو فرمایا: ہم تم کو دنیا کا امام و پیشوا بناتے ہیں، اگر حکومت و فرمانروائی کے دروازہ میں کسی قوم کو داخل ہونے کی خواہش ہو تو وہ تمہاری امامت و پیشوائی میں کام کرے، ایثار و فدویت اور فداکاری و سرفروشی اس کے لئے الزم اللوازم ہے، گویا اس وجود مقدس نے دنیا کو بتا دیا کہ کامیابیوں کی بنیاد قربانی ہے، جو لوگ اس کے لئے تیار نہ ہوں گے، وہ بھی زندہ نہ رہ سکیں گے۔ چنانچہ اس کے بعد ہی فوراً فرمایا کہ: لَا یَنَالُ عَهْدُ الظَّالِمِیْنَ۔

یہ عہد صرف حضرت اسحق کے ساتھ مخصوص نہ تھا جیسے یہودیوں نے سمجھا، بلکہ حضرت اسمعیل بھی اس میں شریک تھے تفصیل ملاحظہ ہو:

(۱) خدا نے درود غم کو سنا، ہاجرہ کے ۶۱:۲۱ کتاب پیدائش

سارہ کے، ۵۲:۲۱ کتاب پیدائش

(۲) خدا نے نام رکھا، ہاجرہ کے فرزند اسمعیل کا ۶۱:۲۱ کتاب پیدائش

سارہ کے فرزند اسحق کا ۷۱:۹۱ کتاب پیدائش

(۳) خدا نے برکت دی ہاجرہ کے فرزند اسمعیل کو ۷۱:۹۲ کتاب پیدائش

سارہ کے فرزند اسحق کو، ۵۲:۰۲ کتاب پیدائش

(۴) خدا ساتھ تھا، اسمعیل کے ۲:۰۲ کتاب پیدائش

اسحاق کے ۶۲:۴۲ کتاب پیدائش

(۵) قوموں اور پادشاہوں کا باپ ہو گا، اسمعیل ۵۲:۶۱ کتاب پیدائش

اسحق ۷۱:۶ کتاب پیدائش

ان آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے امامت و پیشوائی کا جو عہد کیا تھا، اس میں ان کے دونوں صاحبزادے اسمعیل و اسحق شریک تھے۔ دو آیتیں اور بھی پیش نظر رکھ لیجئے کہ مزید وضاحت ہو:

جو تیری صلب سے پیدا ہو گا وہ ہی تیرا وارث ہو گا اور وہ اس کو باہر لے گیا اور کہا کہ اب آسمان کی طرف نگاہ کر اور ستاروں کو گن، اگر تو انہیں گن سکے اور اسے کہا کہ تیری اولاد ایسے ہو گی (کتاب پیدائش ۵:۱۴) حضرت اسمعیل یقیناً



ابراہیم کی صلب سے تھے، آگے چل کر اسمعیل کا نام لیا: اور اسمعیل کے حق میں میں نے تیری سنی، دیکھو میں اسے برکت دوں گا اور اسے بروہد کروں گا اور اسے بہت بڑھاؤں گا اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اسے بڑی قوم بناؤں گا۔ (پیدائش ۱۲:۷۱)

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ وہ کلمات جن میں ابراہیم کا امتحان ہوا یہ ہیں:

(۱) موچھوں کا کم کرنا (۲) ڈاڑھی کا بڑھانا (۳) مسواک کرنا (۴) ناک میں پانی ڈالنا (۵) ناخنوں کا کترنا (۶) ناک صاف کرنا (۷) بغل کے بال مونڈنا (۸) موئے زیر ناف مونڈنا (۹) پانی سے استنجا کرنا (۱۰) اور کلی کرنا۔ ان کا اعتماد اس روایت پر ہے جس کو ترمذی نے عائشہ سے نقل کیا ہے: ”عشر، من الفطرة، قص الشارب، واعفاء الدحية، والسواك، والاستنشاق، وقص الاظفار، وغسل البداجم، وتنف الابط، وحلق العانة، وانتقاض الباء، والمبضضة“۔ لیکن ہم نے جو معنی اختیار کئے ہیں وہی حضرت ابن عباس کی رائے ہے:

الكلمات التي ابتلى بها ابراهيم فراق قومه في الله حين امر الله بفقا رقتهم ومحا جته نهرو في الله حين قال احي واميت، ومبره على قذفهم اياك في النار ليحرقوه في الله، والهجرة بعد ذلك من وطنه وبلادته حين امره بالخروج عنهم وما امره به من والصبر عليها، وما ابتلى به من ذبح ولده۔

مگر ترمذی کی روایت بھی ہمارے مخالف نہیں، اصل بات یہ ہے کہ انسان کی فطرۃ اولیٰ تو محض نیکی ہی ہے، اس میں بدی کی مطلق آمیزش نہیں۔ مگر اس کی ثانوی تخلیق میں خیر و شر، دونوں کو ودیعت کیا گیا ہے، اگر ایک شخص کا قلب سلیم ہے اور خارجی اثرات ضلالت سے اس کے آئینہ کو گرد آلود نہیں کیا گیا تو وہ ضرور اپنے خالق کے آگے جھکے گا اور جو چیزیں اس کے تزکیہ نفس اور طہارت و پاکیزگی میں خلل انداز ہوگی، ان کو دور کرنے کی کوشش کریگا۔ اس طہارت کے پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ ان خصائل فطرت کا اپنے آپ کو عادی بنالیا جائے۔

اگر ایک شخص چالیس روز تک ان خصائل فطرت کو ترک کر دے تو اسے معلوم ہوگا کہ اس کے ارادہ میں ضعف، اس کے عزم میں کمزوری اور اس کی طبیعت میں کدورت پیدا ہوگئی ہے، خیالات میں پرآگندگی اور افکار میں تشنت ہے۔ حضرت ابراہیم اس رواج کے بانی ہیں، قوم میں ایک خاص کریکٹر پیدا کرنا، ان کا مقصود ہے اور وہ یہ ہے کہ جو چیزیں ہمارے بدن میں کدورت پیدا کرنے والی ہوں، ان کو فوراً کاٹ دیا جائے تاکہ آہستہ آہستہ طبیعت اس درجہ پر آجائے کہ صحیح فرض معلوم ہونے پر انسان اپنی زندگی بھی قربان کر سکے۔

طہارت و پاکیزگی کے یہ اصول اساسی اس قدر آسان ہیں کہ عام انسانوں میں ان کی اشاعت نہایت سہولت کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ حضرت ابراہیم نے ان کو عام کر دیا اور ہر شخص ان کا عادی بن گیا تاکہ مجددین ملت اور دعاۃ اسلام کی تعلیم کو لوگ قبول کرنے کو تیار ہوں اور ان کی راہ میں جو رکاوٹیں حائل ہو سکتی ہیں، وہ ایک حد تک دور ہو جائیں۔

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا ۚ وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّٰی ۖ وَعَهْدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَنَّ

طَهْرًا يَتَّبِعِي لِبَلَّائِيَيْنِ وَالْعَافِيَيْنِ وَالْمُحْسِنِينَ الشُّجُودِ ﴿٩٦﴾

“اور جب ہم نے اس گھر کو لوگوں کے اجتماع اور پناہ کی جگہ بنایا اور لوگوں کو حکم دیا کہ ابراہیم کی جگہ کو نماز کی جگہ مقرر کرو اور ابراہیم اور اسٹعلیل سے کہا کہ میرے اس گھر کو طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک رکھو۔”

سرزمین عرب میں بیت اللہ کے سوا اور کوئی عبادت گاہ نہ تھی۔ یمن، حضر موت، خلیج فارس کے کناروں، شام کے جنگلوں اور حرہ و عراق عرب سے لوگ ہر سال یہاں جمع ہو کر فریضہ حج ادا کیا کرتے تھے۔ مورخین اس کی قدامت کی کوئی تاریخ معین نہیں کر سکتے۔ یہودی اور عیسائی متفق ہیں کہ بیت المقدس کی بنیاد اسحق نے ڈالی اور سلیمان نے اس کی تکمیل کی۔ اس لئے کعبہ کی تعمیر یروشلم سے قریباً ۹۲۱ سال اور مسیح علیہ السلام سے ۱۹۲۱ سال پیشتر کی ہے۔

ہندوستان کی تہذیب کا اولین دور جو وید کا ابتدائی زمانہ ہے، مسیح سے تین ہزار چار سو سال پیشتر کا تھا، اس دور میں یہاں کوئی مندر نہ تھا۔ پس معلوم ہوا کہ عبادت الہی کے لئے دنیا میں جو اولین گھر تعمیر ہوا، وہ بیت اللہ ہی تھا۔ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِلْعَالَمِينَ ﴿۹۶﴾ (ال عمران ۹۶)

“مثلاً” مشتق ہے ثاب یثوب سے، جس کے معنی ہیں بار بار رجوع کرنے کے۔ گویا ابراہیم نے جو گھر بنایا ہے وہ زیارت گاہ خلائق ہو گا۔ دنیا کے ہر گوشہ سے زخمی دل یہاں آکر شفا کا مرہم پائیں گے۔ مضطرب روحوں کو اس کی آغوش میں آرام نصیب ہو گا۔ گناہ کی کثافتوں سے آلودہ جسم اس جگہ آکر اپنی گندگیوں اور ناپاکیوں کو دھوئیں گے۔ اسی روشنی کی طرف سب پروانے دوڑیں گے اور اسی آشیانہ کی جانب تمام پرندے اڑیں گے۔ اس فریضہ حج کو نہ تو کوئی دنیوی طاقت روک سکے گی اور نہ یہ گھر ہی برباد ہو گا۔

پھر یہی نہیں بلکہ وہ امن کا گھر ہو گا۔ اَمِنًا يُنْفِیْ اِلَيْهِ مَنُتِلُ كُلِّ شَیْءٍ (القصص ۵) عرب کے لوگ باوجود اپنی وحشت و بربریت کے حرم کے اندر نہ تو کسی کا خون بہاتے تھے اور نہ کسی سے جنگ کرتے تھے۔ ایک عیسائی بادشاہ ابراہہ والی یمن نے اس پر حملہ کیا اور برباد ہو گیا ①۔ امن والا گھر اس لئے بنایا گیا کہ لوگ اس جگہ آئیں اور امن و اطمینان قلب کے ساتھ خدا کی یاد کر سکیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد کا دستور تھا کہ میدان میں جس جگہ کو عبادت گاہ مقرر کرتے، وہاں ایک لمبا بن گھڑا پتھر ستون کی طرح کھڑا کر دیتے تھے۔ جیسے اب بھی مسلمان کھلی جگہ میں نماز پڑھتے وقت اپنی چھڑی وغیرہ گاڑ لیا کرتے ہیں، جسے سترہ کہتے ہیں۔ مقام ابراہیم ایک مشہور جگہ ہے، جس کے دیکھنے سے خودی نشان یاد آجائے گا اور بار بار اس

① یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ کی پیدائش کے سال ہوا۔ اس میں دراصل یہ بتانا تھا کہ مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن عیسائی ہوں گے۔ یہی خانہ کعبہ پر اپنے پیٹروا برہہ کی طرح حملہ آور ہوں گے اور آخر ان کا وہی انجام ہو گا جو ان کے ہم مذہب کا ہوا۔ چنانچہ موجودہ واقعات اس کی حرف بحرف تصدیق کرتے ہیں، اس کا ایک ٹکڑا پورا ہو گیا دوسرے کا انتظار ہے وما ذلک علی اللہ بعزیز وکان وعدا مفعولاً۔

کی زیارت کرنے سے وہی جذبات پیدا ہوں گے جو کائنات خلعت اور اس کے فرزند جلیل میں تھے۔ اس لئے حکم ہوا کہ مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ بناؤ، تاکہ اس جگہ قدم رکھتے ہی تمام واقعات ذہاب الی اللہ یاد آجائیں۔ ہر شخص اسلام کی خاطر اپنی جان، اپنا مال، وطن، دیار اور شعوب و قبائل کو قربان کرنے کو تیار ہو۔ ان قربانیوں نے ابراہیم کو دنیا کا امام و پیشوا بنادیا۔ پس تم بھی ان چیزوں کی مشق کر کے امامت و پیشوائی کے لئے دعا کرو! واجعلنا للمتقین اماما۔

یہ گھر اس لئے بنایا گیا تھا کہ خدائے واحد کی غلامی کرنے والے یہاں آئیں اور اپنے محبوب حقیقی سے قرب و وصال کی فکر کریں۔ جب ہم کو یہ معلوم ہے کہ دنیا کے تمام کام اسی خدائے یگانہ کے اختیار و ارادہ سے انجام پاتے ہیں۔ ہر قسم کی داد و ستد، سلب و عطا اور نفع و ضرر اسی کے ہاتھ میں ہے۔ ہر قسم کا کمال اور حسن و خوبی اسی کی ذات اقدس میں موجود ہے۔ اور اس کے سوا اس عالم کا اور کوئی مربی و محسن نہیں، تو بے شبہ عقل کے نزدیک ایسے خدا کی اطاعت سے سر موخراف جائز نہ ہو گا۔ اور یہ لازم ہو گا کہ اس کی خدمت گزاری میں انسان مصروف رہے۔ اسی کا ہر دم دھیان رکھے۔ اسی کی محبت میں اپنے آپ کو دیوانہ بنائے۔ جسے تو اسی کی خاطر اور مرے تو اسی کا کلمہ پڑھتا رہے۔

پس اگر اس خدا کو محبوب حقیقی خیال کرتے ہو تو اس سے مواصالت اور اتحاد و یگانگی کی فکر میں ہر ایک ماسوائے اللہ سے بیزار ہو کر آب و طعام اور لذت جماع کو ترک کر دینا، اس کی تجلی گاہ کی جانب پاؤں نہ سر برہنہ لبیک کہنا، والہا نہ و مجنونانہ دوڑنا اور وہاں پہنچ کر کبھی شوق و وجد میں اس تجلی گاہ کے گرد گھومنا، کبھی جنگلوں میں بھٹکتے پھرنا، کبھی دشمن محبوب کے خاص مکان پر سنگ باری کرنا، کبھی جان و مال سے فدا ہونے کو تیار رہنا اور کلمہ حق کی عظمت اور خدائے واحد کی محبت و پرستش کے لئے جمع ہونا، ہی طواف ہے۔ گویا اللہ کے خوف اور اس کی تلاش و جستجو نے ان لوگوں کے اندر ایک آتش کدہ محبت مشتعل کر دیا ہے اور اس کا دھواں، والہانہ صداؤں اور بے قرارانہ فریادوں کی صورت میں ان کی زبانوں سے اٹھ رہا ہے۔

جمال کعبہ مگر عذر ہر داں خواہد  
کہ جان خستہ دلاں سوخت دریا بانش!

دعائے رزق

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ لِهَذَا بَكَدًا آمِنًا وَارْزُقْ أَهْلَكَ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ آمَنَ مِنْهُمْ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۖ قَالَ  
وَمَنْ كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿۸۸﴾

”اور جب ابراہیم نے دعا مانگی کہ اے میرے پروردگار! اس شہر کو امن کا شہر بنا اور اسکے رہنے والوں میں سے ان لوگوں کو روزی دے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان لائیں۔ اللہ نے فرمایا اور جو منکر ہو گا، اسکو بھی چند روز کے لئے فائدہ اٹھانے دوں گا، پھر مجبور کر کے دوزخ کے عذاب میں داخل کروں گا اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔“

چونکہ یہ وادغید ذی زہر تھی، اس لئے ابراہیم علیہ السلام نے دو باتوں کے لئے دعا کی۔

(۱) اس کو امن والا گھر بنا اور یہ جنگل ہے، اس کو آباد کر کے شہر بنا۔

(۲) یہاں کے رہنے والوں کو رزق کو نوازش کر، چنانچہ جو لوگ مکہ مبارکہ جاتے ہیں وہ دیکھتے ہیں کہ اس کی سرزمین

پیداوار سے خالی ہے اور وہاں زراعت نہیں ہوتی۔ مگر باوجود اس کے بازاروں میں سبز و تریوے اور ترکاریاں

نہایت ہی ارزان قیمت پر مل جاتی ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا مقصد یہ تھا کہ اس جگہ صرف ایمان والے آباد ہوں اور انہیں کو رزق ملے، مگر اللہ تعالیٰ

نے اس کے جواب میں فرمایا کہ کفار کو بھی اس سامان سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ دیا جائے گا، آخر ایک وقت ایسا آئے گا کہ ان کا بالکل خاتمہ ہو جائے گا اور ایک کافر بھی دکھائی نہ دے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ قرآن حکیم نے کھلے الفاظ میں اعلان

کر دیا: ”انما المشا کون نجس فلا یقرہوا المسجد الحرام بعد عامہم ہذا“۔ مسجد حرام کے حدود صرف توحید کی پاکی کے

لئے مخصوص ہیں، اب آئندہ کوئی غیر مسلم اس کے قریب بھی نہ آنے پائے۔ یعنی نہ صرف یہ کہ وہاں غیر مسلم نہ رہیں،

بلکہ کسی حال میں داخل بھی نہ ہوں۔ مرض الموت میں شارع علیسلم نے تین باتوں کی وصیت فرمائی تھی، ان میں سے

ایک یہ تھی: ”آخر جو المشا کین من جزیرۃ العرب“، حضرت عمر کی روایت میں ہے: لاخر جن اليهود والنصارى من جزیرۃ

العرب حتی، لا ادم الامسلم امام احمد کی روایت میں ہے: اخر مات حکم بہ رسول اللہ ﷺ اخر جو یہود اهل الحجاز و اهل

نجران من جزیرۃ العرب، ابن شہاب زہری نے ان الفاظ میں روایت کیا: لا یحب تنعم دینان فی جزیرۃ العرب۔

چونکہ مسلمانوں کا مذہب عالمگیر تھا، اس لئے اس کی ارضی وسعت و انتشار کے لئے عبادت مکہ ابراہیمی کا کعبۃ اللہ، اس

کی سرزمین حجاز اور اس کا ملک جزیرہ عرب دائمی مرکز قرار پایا۔ پس ضروری ہوا کہ اس تمام سرزمین کو غیروں کے عنصر

سے پاک و صاف کر دیا جائے اور صرف خدائے واحد کے ماننے والے اس جگہ کو آباد کر سکیں۔

دعائے خلیل

وَ اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۱۲۵﴾ رَبَّنَا  
وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۗ وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَ تَبَّ عَلَیْنَا ۖ اِنَّكَ اَنْتَ الثَّوَابُ  
الرَّحِیْمُ ﴿۱۲۶﴾

”اور جب ابراہیم اور اسماعیل، خانہ کعبہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے اور دعا مانگ رہے تھے کہ اے ہمارے پروردگار! ہماری یہ خدمت قبول کر، بے شک تو ہی سننے والا جاننے والا ہے اور اے ہمارے پروردگار! ہم کو اپنا فرمانبردار بندہ بنا اور ہماری نسل میں ایک امت پیدا کر جو تیری حکم بردار ہو اور ہم کو ہماری عبادت کے طریقے بتا اور ہمیں معاف کر، بیشک تو ہی بڑا معاف کرنے والا مہربان ہے۔“

کعبہ کی پہلی تعمیر حضرت ابراہیم اور اسمعیل نے کی پھر بنو جرہم، بنو عمالقہ، قصی، اور قریش نے اس کی تجدید کی۔ تجدید عمارت کی ضرورت مرور زمانہ کے اثر یا سیلاب کے صدموں کی بنا پر ہوتی تھی۔ پانچ ہزار سال تک کسی غیر قوم نے قبضہ کر کے اس کو نہیں گرایا اور یہ ایسا شرف ہے جو دنیا کے کسی عبادت خانہ کو حاصل نہیں ہوا۔ جس وقت یہ پیغمبر ان جلیل خانہ کعبہ کی اساس و بنیاد کو بلند کر رہے تھے تو ان کی زبان پر یہ دعائیہ کلمات جاری تھے، خداوند! جس مقصد کے لئے ہم اس گھر کی تعمیر کر رہے ہیں اس کو ضرور پورا کی جیو، تو ہماری دعاؤں کو سنتا اور نیتوں کو جانتا ہے، شہرت و ناموری کی آرزو نہیں بلکہ منشا یہ ہے کہ اس کو توحید کا مرکز بنا دیا جائے۔

ہماری اولاد میں ایک ایسی جماعت ہمیشہ رہے جو تیرے احکام کی پیروی اور اتباع کو اپنی زندگی کا مقصد اصلی بنائے اور چونکہ وہ الگ تھلگ ہوگی، اگر اس کے پاس کوئی قانون نہ ہو تو راہ حق سے بھٹک جائے گی۔ اس لئے تو اس کو دائمی اور ابدی قانون نوازش کر۔ اور اگر قانون ملنے کے باوجود اس سے کوئی غلطی سرزد ہو تو ان کے ساتھ لطف و نوازش سے پیش آ۔ یہ دعائیہ کلمات صاف بتا رہے ہیں کہ جس امت مسلمہ کی تخلیق کے لئے درخواست کی جا رہی ہے ضروری ہے کہ وہ ان کی اولاد میں سے ہو۔ اسحق علیہ السلام اور ان کی اولاد سے اس دعا کو کوئی تعلق نہیں۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٦٦﴾

”اور اے ہمارے پروردگار! ان ہی میں سے ان میں ایک رسول بھیج کہ تیری آیتیں انہیں پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب اور عقل کی باتوں کی تعلیم دے اور ان کی اصلاح کرے، بیشک تو ہی زبردست حکمت والا ہے۔“

ان میں ایک رسول بھیج جو حسب ذیل فرائض انجام دے۔

(الف) تلاوت آیات۔ تیری آیات کو پڑھ کر سنائے تاکہ لوگ ان کا مفہوم و مطلب سمجھ لیں اور جو لوگ عربی نہ جانتے ہوں وہ ترجمہ کے ذریعہ واقفیت بہم پہنچائیں۔

(ب) تعلیم کتاب، تلاوت کے بعد جس قدر شکوک اور شبہات پیدا ہوں ان کو دور کرنا، کیونکہ جب تک اعتراضات کو دور نہ کیا جائے گا قانون کی جانب توجہ نہ ہوگی۔

(ج) تعلیم حکمت، بعض لوگوں نے حکمت سے نبی کی منہاج عمل اور سنت مراد لی ہے اور اس کی تائید میں مقداد کی روایت پیش کرتے ہیں کہ آپ نے تین مرتبہ زور دیکر فرمایا: الا وانی اوتیت الكتاب ومثله، یعنی کتاب اللہ اور مثل اس کے سنت واسوۃ حسنہ رسول اللہ۔ اس میں شک نہیں کہ یہ معنی فی نفسہ ٹھیک ہیں مگر قرآن حکیم کی تصریحات اس سے بلند نظری کی طالب ہیں۔ یوسف علیہ السلام کی نسبت فرمایا: وَلَقَدْ بَدَّلْنَا أَشِدَّةً اِتِّينَهُ حُكْمًا وَعَلَّمْنَا (یوسف ۲۲) عِيسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ کی نسبت کہا: وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (ال عمران ۴۸) لوط علیہ السلام کے متعلق کہا: وَلَوْطًا اِتِّينَهُ حُكْمًا وَعَلَّمْنَا (الانبیاء ۷۴) قرآن کی نسبت کہا: یس والقمران الحکیم۔ سورۃ بقرہ میں حکمت کو خیر کثیر سے تعبیر کیا: وَمَنْ يَتَّقِ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اتَّقَى خَيْرًا كَثِيرًا، تو یہ اور اسی قسم کی صدہا آیات بتاتی ہیں کہ حکمت سے مراد علم

اور دانائی کی باتیں ہیں جن تک صرف ارباب فہم و فراست ہی کی دسترس ہو سکتی ہے۔ گویا قرآن کی تعلیم کو ایسے اصول کلیہ پر حل کرنا کہ دنیا کے تمام مذاہب ان سے انکار نہ کر سکیں اور اس کی عالمگیر دعوت کے آگے اپنی گردنیں خم کر دیں۔ ابن وہب کہتے ہیں: نقلت لہا لک ما لہ حکمة قال المعرفة بالدين والفقہ فیہ والاتباع لہ، میں نے امام مالک سے دریافت کیا کہ حکمت کسے کہتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ دین کی معرفت، اس میں درس و فہم اور اس کے اتباع کا نام حکمت ہے۔ بعض کے نزدیک مصالح شرعیہ اور احکام دین کا معلوم کرنا حکمت ہے۔ حق و باطل میں تمیز کرنا اور حقائق اشیاء کی معرفت بھی اسی قبیل سے ہیں۔

(د) تزکیہ نفس۔ انسان کی سعادت و نیک نجات کے لئے تعلیم محض بالکل بیکار ہے جب تک اس کے زندہ نمونے بھی انسانوں کے سامنے دکھائی نہ دیں۔ انسانی طبیعت منفعل اور اثر پذیر واقع ہوئی ہے۔ محض تعلیم کی سماعت وہ اثر نہیں پیدا کر سکتی جو انسانی نمونہ عمل کا پڑتا ہے، پس نبی اس نمونہ کو پیش کرتا ہے اور اپنی صحبت و ہم نشینی سے لوگوں کو پاک اور مڑکی بناتا ہے۔

تو عزیز ہے، اس دعا کو شرف اجابت بخش اور رسول پیدا کر۔ یہ ضرور نہیں کہ اسی وقت وہ رسول آجائے، نہیں بلکہ جب تیری حکمت اور مصلحت تقاضا کرے، لیکن ایک دفعہ ضرور ہو کر رہے۔ آپ نے فرمایا ہے: ”انادعوا ابی ابراہیم“۔ انجام کار یہ دعائیں قبول ہو کر رہیں، اس رسول نے آیات کی تلاوت بھی کی اور نہ صرف عرب کے لوگوں کو پاک بنایا، بلکہ وہ خود دوسروں کے پاک ہونے کا ذریعہ بنے جن کو آپ نے تعلیم دی۔ وہی دنیا کے رہبر اور معلم بن گئے اور قیصر و کسری کے خزانوں کی کنجیاں ان کے ہاتھ میں آ گئیں:

یہ اسی کا تھا کرشمہ کہ عرب کے بچے

کھیلنے جاتے تھے ایواں گہہ کسریٰ میں شکار!

وَمَنْ يَرْغَبْ عَنْ مِلَّةِ إِبْرَاهِيمَ ۖ إِلَّا مَن سَفِهَ نَفْسَهُ ۚ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنَا فِي الدُّنْيَا ۖ وَأَنفَقْنَا الْآخِرَةَ لِبَنِي الصَّالِحِينَ ۝

”اور کون ہے جو ابراہیم کے دین سے اعراض کرے مگر وہی جو احمق ہو۔ اور ہم نے اس کو دنیا میں بھی منتخب کیا اور آخرت میں بھی وہ نیکوں کے زمرے میں ہو گا۔“

یہودی، عیسائی اور مشرکین عرب، سب کے سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا امام و پیشوا تسلیم کرتے ہیں، اب ان کی تعلیم سے وہی شخص منحرف ہو گا جسے دنیا اور آخرت کی عزت مطلوب نہیں۔ کیونکہ ابراہیم کو ہم نے نہ صرف دنیا میں معزز و محترم کیا، بلکہ آخرت میں بھی وہ نیکو کاروں کے گروہ میں ہوں گے۔ پس دنیا اور آخرت کی کامیابی صرف ان کے نقش قدم پر چلنے سے مل سکتی ہے۔ دوسرے مذاہب میں ترک دنیا اور رہبانیت کی تعلیم ملے گی، مگر ابراہیم کا طریق ایسا ہے کہ وہ دین اور دنیا، سیاست اور مذہب سب کو حاوی اور جامع ہے اور یہی مذہب ہر قسم کی ترقی کا ذمہ دار و کفیل ہے۔

تحویل قبلہ سے پہلے اہل کتاب خاموش تھے، مگر اس کے بدلتے ہی شدید مخالفت شروع کر دی۔ قرآن نے ان وعدوں

کی طرف توجہ دلائی جو ابراہیم کے ساتھ کئے گئے تھے، پھر ان کی دعاؤں کا تذکرہ کیا اور یک وقت ان تینوں فرقوں پر حجت قائم کر دی۔ اگر اب بھی یہ لوگ آپ کی رسالت تسلیم نہ کریں تو ان سے بڑھ کر اور کون احمق ہو گا؟

إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ ۖ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۳۰﴾ وَوَعَىٰ بِهَا إِبْرَاهِيمُ بَنِيهِ وَيَعْقُوبُ ۖ يٰٓيُنَىٰ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ لَكُمُ الدِّينَ فَلَا تَبْتُغُوا إِلَٰهًا وَانْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴿۱۳۱﴾

“جب ان سے ان کے پروردگار نے کہا کہ ہماری ہی فرمانبرداری کرو، تو اس نے عرض کیا کہ میں سارے جہان کے پروردگار کا حکم بردار ہوں۔ اور ابراہیم اپنے بیٹوں کو یہی وصیت کر گئے اور یعقوب بھی کہ بیٹا! اللہ نے تمہارے لئے اسی دین کو پسند کیا ہے پس تم مسلمان ہی مرنے۔“

وہ قانون جس کی بنا پر ابراہیم علیہ السلام کو دنیا و آخرت میں سرفراز کیا گیا یہی ہے کہ: إِنَّ صَلَاحَ وَنُسُخَی وَمَحْيَاۤیَ وَمَمَلِکَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ﴿۱۳۰﴾ لَا شَرِیْکَ لَهُ ۚ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۱۳۱﴾ (الانعام ۱۶۳، ۱۶۴) اسی کی وصیت انہوں نے اپنی اولاد سے کی کہ اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں مسلم قانت بن جاؤ اور یہی چیز ہے جس کی جانب رسول اللہ ﷺ دعوت دے رہے ہیں: قُلْ هٰذِهِ سَبِیْلُیْ اَدْعُوْا اِلَیَّ اللّٰهَ عَلٰی بَصِیْرَةٍ اَنَا وَمَنْ اَتَّبَعَنِیْ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ﴿۱۰۸﴾ (یوسف ۱۰۸)

## ایک اور حجت

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوبُ الْمَوْتُ ۚ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِیْ ۚ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اَبَائِكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۖ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۱﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْأَلُوْنَ عَنْهَا کَاۡنُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۲﴾

“کیا تم اس وقت موجود تھے جس وقت یعقوب کو موت آئی۔ اس وقت انہوں نے اپنے بیٹوں سے پوچھا کہ میرے بعد کس کی عبادت کرو گے انہوں نے جواب دیا کہ ہم تیرے معبود اور تیرے بڑوں یعنی ابراہیم اور اسمعیل اور اسحق کے معبود خدائے واحد کی غلامی کریں گے اور ہم اسی کے تابع فرمان ہیں۔ وہ ایک جماعت تھی جو اپنے زمانہ میں ہو گزری ان کا کیا ان کو اور تمہارا کیا تم کو اور جو کچھ وہ کر گزرے ہیں تم سے اس کی متعلق کوئی باز پرس نہ ہوگی۔“

اسلام کی تعلیم تو وہی ہے جو اوپر ذکر کی گئی، مگر یہودی کہتے ہیں کہ یعقوب علیہ السلام نے اپنی وفات کے قریب وصیت فرمائی تھی کہ یہودیت کے پابند رہنا۔ یہی وصیت سینہ بسینہ ہم تک پہنچی ہے، اس کا جواب ان آیات میں دیا گیا کہ ان کی وصیت تو یہی تھی کہ خدائے واحد کی غلامی کرنا اور ان کی اولاد نے بھی یہی اقرار کیا تھا۔ اگر تم سچے ہو تو بتاؤ، ان کی وفات کے وقت کون شخص موجود تھا جس پر تمہاری روایت کی انتہا ہوتی ہے۔ اور تھوڑی دیر کے لئے مان لو کہ انہوں نے ایسا کیا تو تمہیں کیا؟ ہر شخص اپنے اعمال کا آپ ذمہ دار ہے، اپنے لئے تم خود راہ نجات تلاش کرو اور دیکھو کہ یہ تعلیم صحیح ہے یا نہیں۔

وَقَالُوْا كُفُّوْا هٰذَا اَوْ نَصْرٰی تَهْتَدُوْا ۚ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِیْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ﴿۱۳۲﴾







أَعْمَلْنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ ۖ وَنَخْنُ لَهُ مُخْلِصُونَ ﴿٦٠﴾

”ہم نے اللہ کا رنگ قبول کیا اور اللہ کے رنگ سے کس کا رنگ بہتر ہے اور ہم اسی کی عبادت کرتے ہیں، ان سے کہہ دو کہ، کیا تم لوگ اللہ کے بارے میں ہم سے جھگڑتے ہو، حالانکہ وہی تمہارا بھی اور ہمارا بھی پروردگار ہے اور ہم کو ہمارے اور تم کو تمہارے عمل، اور ہم خالص اسی کو مانتے ہیں۔“

اسلام نے اپنا عقیدہ پیش کرتے وقت کمال درجہ کی بے تعصبی اور فراخ دلی کا اظہار کیا، مگر یہودی اب بھی یہی کہتے ہیں کہ مذہبی رنگ پیدا ہی نہیں ہو سکتا جب تک ایک شخص یہودی یا نصرانی نہ بن جائے۔ رنگ دینے اور دین اختیار کرنے کی دو ہی صورتیں ہیں۔

(الف) اللہ تعالیٰ کی تعلیم کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنالے اور تمام انبیاء علیہم السلام کی صداقتوں کا اقرار کرے۔ یہی اللہ کا رنگ اور دین ہے اور صرف اسی تعلیم پر کاربند ہو کر ہم میں یہ جذبہ صادق پیدا ہو سکتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی انسان کے آگے ہماری گردن نہ جھکے اور تمام انسانوں سے باغی ہو کر ایک اللہ کی حکومت کو مان لیں۔ بخاری میں ابن عباس سے روایت ہے کہ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا: ”ای الدین احب الی اللہ“، آپ نے فرمایا: ”الحنيفية السبعة حاکم“ اور ابن عساکر نے سعد بن عبد اللہ بن مالک خزاعی سے آپ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: ”احب الدین الی اللہ الحنیفیۃ السبعة“۔

(ب) دوسرا رنگ انسانوں کا خود تجویز کردہ ہے جس کو قبول کرنے کے بعد انسان تو حید سے نکل جاتا ہے اور انبیاء علیہم السلام کی مخالفت شروع کر دیتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جس تعلیم سے فطری جذبات کی تربیت ہوتی ہو وہی بہترین مذہب ہے۔ اور ہم اسی خدائے واحد کے پرستار ہیں۔ یہ کس قدر جہالت کا سوال ہے کہ اللہ کا رنگ کس قسم ہو گا؟ تعلیم یافتہ کے لئے مناسب نہیں کہ وہ اس قسم کی باتیں کرے۔ ایسے لوگوں سے تو جس قدر بھی جلد انقطاع تعلقات کیا جائے اتنا ہی بہتر ہے۔

أَمَرُ تَقُولُونَ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ كَانُوا هُودًا أَوْ نَصَارَى ۖ قُلْ أَعْلِمْتُ أَنَّ اللَّهَ وَمَنْ أَوْلَاهُ أَكْبَرُ مِنْكُمْ شَهَادَةً عِنْدَ اللَّهِ ۖ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٦١﴾ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْأَلُونَ عَنْهَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٦٢﴾

”یاد رکھو کہ ابراہیم اور اسمعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اولاد یعقوب، یہ سب یہودی یا نصرانی تھے، ان سے کہو کہ کیا تم بڑے جاننے والے ہو یا اللہ۔ اور اس سے بڑھ کر اور کون ظالم ہے جس کے پاس اللہ کی گواہی تھی۔ اور اس نے اس کو چھپایا اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں۔ وہ ایک جماعت تھی جو گزر گئی اس کا کیا اس کو اور تمہارا کیا تم کو اور تم سے ان کے کاموں کی پوچھ نہ ہو گی۔“

ذرا انصاف سے بتاؤ تو سہی کہ ان لوگوں میں سے کون یہودی تھا۔ توراۃ کے ابتدائی اور اق کو دیکھو وہاں یہودیت کی

تاریخ موجود ہوگی۔ دوسری جگہ فرمایا: يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَاجُّوْنَ فِیْ اٰیٰتِہِمْ وَمَا اُنْزِلَتْ الشُّرَاحُ وَالْاَنْجِلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِہٖۙ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۵﴾ (ال عمران ۶۵)

”اے اہل کتاب! ابراہیم کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو حالانکہ تورات و انجیل کا نزول ان کے بعد ہوا کچھ تو عقل سے کام لو۔“ ایک جگہ کہا: مَا كَانَ لِاٰیٰتِہِمْ یُھُوْدِیًّا وَلَا نَصْرًا یَیْسَیًّا وَلٰكِنْ كَانَ حٰنِیْفًا مُّسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ﴿۱۶﴾ (ال عمران ۶۷)

شہداء علی الناس

سَيَقُولُ السُّفَهَاۗءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلٰہُمْ عَنْ قِبَلَتِہِمْ الَّتِیْ کَانُوْا عَلَیْہَا قُلُوبُہِمْ اَلَمْ یَكُنْ لِلّٰہِ الشَّرَیْقُ وَالْمَغْرِبُ یُھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۱۷﴾

”یہ قوف اب بھی یہی کہیں گے کہ جس قبلہ پر مسلمان پہلے تھے اس سے کیوں پھر گئے کہہ دو کہ مشرق و مغرب اللہ ہی کے لئے ہے جس کو چاہتا ہے سیدھا رستہ دکھاتا ہے۔“

توراة کی شہادت پیش کی گئی۔ کتاب پیدائش کے واقعات بیان کئے گئے اور سب کو معلوم ہو گیا کہ ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کو یہودیت اور نصرانیت سے کوئی تعلق نہیں۔ انہوں نے بیت اللہ کی تعمیر کی کہ قبلہ عالم بن جائے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ملت ابراہیم کا پابند ہو گا اس کا قبلہ بیت اللہ ہی ہونا چاہئے، لیکن باوجود ان حقائق ثابتہ کے احمق یہی کہتے ہیں کہ یہ لوگ بیت المقدس کو چھوڑ کر بیت اللہ کی جانب کیوں پھر گئے۔ یہ اعتراض ان کی سفاهت و کم عقلی کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی توجہ تو مغرب و مشرق کی طرف یکساں ہے، مگر جس قدر مرکز اعلیٰ ترین ہو گا اس کے نتائج بھی نہایت ہی شان دار ہوں گے۔ اس لئے امت مسلمہ کو بہترین مرکز نوازش کیا گیا کہ وہی اس عزت و کرامت کی مستحق تھی اور ایک عالمگیر مذہب کے لئے یہی موزوں و مناسب تھا کہ توحید کا پہلا گھر آخری نبی کا قبلہ ہو۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شٰہِدًا عَلٰی النَّاسِ وِیَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْكُمْ شٰہِدًا

”اسی طرح ہم نے تم کو معتدل امت بنایا تاکہ اور لوگوں کے مقابلہ میں گواہ بنو اور تمہارے مقابلہ میں رسول تم پر گواہ ہو۔“

جس طرح تمہیں بہترین مرکز نوازش کیا گیا ہے، ایسے ہی ہم نے تم کو امت عادلہ پیدا کیا ہے جس میں یکسر خیر و برکت ہی ہے، تاکہ تم تمام دنیا کے لئے راہ اعتدال و توسط میں نمونہ ہو۔ ہر قوم و ملت تمہاری نگرانی میں رہ کر صراط مستقیم حاصل کرے کہ طریق استقامت صرف تمہارے ہی پاس ہے اور تمہارے لئے رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس نمونہ ہو۔ وسط کے معنی عدول اور خیال کے آتے ہیں۔ چنانچہ زہیر کہتا ہے۔

ہم وسط یرضی الانام بحکمہم

اذنزلت احدی الیالی بمعظم۔

بعض کے نزدیک اس کے معنی درمیان کے ہیں یعنی غلو و تفصیر کے درمیان اسلام کی تعلیم ہے۔ نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ کے بارے میں غلو کیا اور یہودیوں نے تحریف و تبدیل سے کام کیا لیکن قرآن حکیم اس افراط و تفریط سے پاک راہ اعتدال اختیار کئے ہوئے ہے۔

پھر یہ نگرانی اسی جگہ دنیا ہی میں ختم نہ ہوگی بلکہ قیامت کے روز بھی تمہیں بطور شہید اور گواہ کے کام دینا پڑے گا۔ حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کے روز جب تمام قومیں میدان محشر میں موجود ہوں گی اللہ تعالیٰ انبیاء کرام سے سوال کرے گا کہ کیا تم نے تبلیغ حق و صداقت کا فرض ادا کر دیا؟ سب اثبات میں جواب دیں گے، مگر ان کی امتیں انکار کریں گی، اس پر امت مسلمہ شہادت دے گی کہ بیشک ان پیغمبران جلیل نے اپنا فرض ادا کیا<sup>۱</sup>۔

بیت المقدس عارضی قبلہ کیوں بنا؟

وما جعلنا القبلة التي كنت عليها الا لنعلم من يتبع الرسول ممن ينقلب على عقبيه وان كانت لكبيرة الا على الذين هدى الله،

اور جس قبلہ پر تم پہلے تھے اس کو قبلہ ہم نے اس لئے بنایا تھا کہ معلوم کر لیں کہ رسول کی پیروی کون کرتا ہے اور کون الٹے پاؤں پھر جائے گا اور قبلہ کا بدلانا سب کے لئے تکلیف دہ تھا مگر ان لوگوں کے لئے آسان ہو گیا جن کو اللہ نے ہدایت دی۔

رسول اللہ ﷺ کی عادت تھی کہ جس مسئلہ کے متعلق کوئی حکم موجود نہ ہو تا اس میں اہل کتاب کے اتباع کو ترجیح دیا کرتے تھے۔ نماز تو آغاز نبوت ہی میں فرض ہو چکی تھی، مگر قبلہ کے متعلق کوئی صاف حکم موجود نہ تھا۔ اس لئے آپ مکہ

۱).... اس آیت میں دو چیزوں کو بیان کیا:

(الف) مسلمان دنیا کے امام و پیشوا ہیں اور ان کی زندگی دوسروں کے لئے نمونہ ہوگی، ہر نیکی کے قائم کرنے والے اور ہر برائی کے دور کرنے والے یہی ہوں گے کُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْعُرْوَةِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (ال عمران)

(ب) قیامت کے روز ان لوگوں کو بطور گواہ کے پیش کیا جائے گا۔ اس دعوے کے ثبوت میں کہ ہر نبی نے اپنا فرض ادا کیا۔ ان دو چیزوں کو پیش نظر رکھ کر ہر مسلم کا مقصد حیات خود بخود معلوم ہو جاتا ہے۔ اور وہ یہی ہے کہ قرآن حکیم کو اپنے ہاتھ میں لے لے اور اس کی نشر و اشاعت میں سربکف کوشش کرے۔ دنیا کا ایک ایک کو نہ چھان مارے اور کوئی امت ایسی نہ رہ جائے جس میں اس نے اسلام کی تبلیغ نہ کی ہو۔ اگر ایسا نہ کرے تو قیامت کے روز شہادت دینے کے قابل نہ ہوگا اور یہی رسول علیکم السلام شہید اسے محروم ہو جائے گا۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی شہادت اسی صورت میں میسر ہو سکتی ہے جبکہ وہ اس فرض کو ادا کرے۔ لیکن مسلمانوں کی موجودہ حالت زبان حال سے پکار پکار کے کہہ رہی ہے کہ عوام تو ایک طرف تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی اس طرف توجہ نہیں۔ آہ! وہ کتاب جو دنیا کی ہدایت و راہنمائی اور عالمگیر امن و سلامتی کے لئے آئی تھی اس کی طرف سے بے اعتنائی اختیار کی جا رہی ہے۔

اے فرزند ان اسلام! وائے عزیزان ملت! ایسا نہ ہو کہ آج تم اس فرض اہم و اقدم سے اجتناب کرو اور کل جبکہ تمام اقوام عالم ایک میدان میں جمع ہوں گی، سب کے سامنے تمہیں ذلیل و سوا ہونا پڑے اور خود رسول بھی تمہاری نسبت یہ شکایت کرے: يَا رَبِّ اِنِّي قَتَوْتُ اتَّخَذُوا هَذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا (الفرقان ۳۰) پس ابھی وقت ہے خواب غفلت سے بیدار ہو اور کتاب عزیز کو ہاتھ میں لے کر اپنے فرض کو ادا کر۔ نہیں معلوم کل کیا ہونے والا ہے، اور یوم تبیض وجود و تسود وجود کو کس کا چہرہ سفید ہوگا اور کس کا سیاہ۔ وشر النداة يوم القيامة۔

مبارک کہ میں بیت المقدس کی جانب نماز پڑھتے رہے اور بیت اللہ کی جانب بھی پشت نہ ہوتی تھی، اس لئے اگر بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ اقامت مکہ کے دوران میں آپ نے بیت اللہ کی جانب نماز ادا کی ہے تو ایک لحاظ سے بالکل ٹھیک ہے۔

جب آپ مدینہ منورہ تشریف لائے تو بیت المقدس ہی قبلہ رہا، مگر ہجرت کے دوسرے سال ۷ ماہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے قبلہ بدل دیا اور اول بیت وضع للناس کو مسلمانوں کا قبلہ گاہ بنا دیا، جسے مکعب شکل ہونے کی وجہ سے کعبہ، صرف عبادت الہی کے لئے بنائے جانے کے سبب بیت اللہ اور عظمت و حرمت کی بنا پر مسجد الحرام کہا جاتا تھا۔ بیت المقدس کو عارضی قبلہ بنانے کے اسباب حسب ذیل تھے۔

(الف) جب تک آپ مکہ مبارک میں رہے بیت المقدس قبلہ رہا کیونکہ مشرکین مکہ بیت المقدس کے احترام کے قائل نہ تھے اور کعبہ کو تو انہوں نے خود ہی اپنا بڑا معبد بنا رکھا تھا، اس لئے شرک چھوڑ دینے اور اسلام قبول کرنے کی بین علامت مکہ میں یہ رہی کہ مسلمان ہونے والا بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھے۔

(ب) مدینہ میں زیادہ تو یہودی اور عیسائی آباد تھے۔ ان کے نزدیک بیت اللہ کی کوئی عزت نہ تھی۔ وہ صرف بیت المقدس ہی کو انوار تجلیات الہیہ کا مہبط یقین کرتے تھے، اس لئے مدینہ میں اسلام قبول کرنے کی نشانی یہ قرار پائی کہ بیت اللہ کی جانب نماز پڑھیں۔

(ج) دنیا معلوم کر لے کہ عرب نے رسول اللہ ﷺ کا اتباع اس لئے نہیں کیا کہ آپ ان کے آبائی قبلہ کو اپنا سجدہ گاہ بنا رہے ہیں، بلکہ وہ آپ کی دعوت کو حق و صدق پر مبنی خیال کرتے ہیں اور اس لئے جس طرح آپ کا ارشاد ہوتا ہے فوراً اپنے آپ کو پھیر لیتے ہیں، اگرچہ ایک قوم کے لئے یہ بہت مشکل ہے کہ وہ کسی کی خاطر اپنے آبائی قبلہ کو ترک کر دے، مگر چونکہ حق ان پر واضح ہو چکا تھا اس لئے وہ ہر ایک بات کے لئے تیار ہو گئے۔

(د) جس قدر منافقین ہیں اور اپنے ایمان کو چھپائے پھرتے ہیں الگ ہو جائیں تاکہ آئندہ صرف راسخ الایمان ہی میدان عمل میں نکلیں۔

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِلَّ عَمَّا يُنَاصِرُكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَخَبِيرٌ ۝ (۳)

”اور اللہ ایسا نہیں کہ تم مسلمانوں کے ایمان کو ضائع ہونے دے، خدا تو لوگوں پر شفقت رکھنے والا مہربان ہے۔“

اللہ تعالیٰ کو تمام جہات سے یکساں تعلق اور نسبت ہے۔ اس کی تجلیات زمین و آسمان کے ذرہ ذرہ میں جاری و ساری ہیں اور عالم تکوین کے اطراف و جوارب اس کے نزدیک ایک ہی درجہ رکھتے ہیں نوللہ المشرق والمغرب فالینما تولوا فثم وجہ اللہ اور اللہ نود السبوت والارض کا یہی مطلب ہے، لیکن جب کسی جگہ میں اللہ کا کوئی برگزیدہ بندہ ایک مدت تک اس کی یاد میں مصروف رہتا ہے، اس کے پاک نام پر قربانی کرتا ہے اور اس کے شوق وصال میں ریاضتیں اور مجاہدے کرتا ہے تو اس جگہ دوسرے مقامات کی نسبت انوار الہیہ زیادہ نازل ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور اگر مدت ہائے دراز تک وہاں ہمیشہ کوئی نہ کوئی بزرگ موجود رہے اور برابر خدا کو یاد کرتا رہے تو پھر اس مقام کو ایک قسم کی خصوصیت حاصل ہو جاتی ہے کہ دوسرے مقامات اس سے محروم

رہتے ہیں۔ گرد و پیش کے لوگ خود بخود اس جگہ کی طرف کشاں کشاں چلے آتے ہیں۔ اس کی عزت و توقیر ان کے دلوں میں بیٹھ جاتی ہے اور باقی مقامات کے مقابلہ میں اس کے احترام کو لازمہ قومیت خیال کرنے لگ جاتے ہیں۔

جب لوگ اس کے لئے یکسر طلب بن جائیں تو علماء اعلیٰ کی دعائیں ان کی امداد و اعانت میں مصروف ہو جاتی ہیں اور اس جگہ کو ان کا قبلہ بنا دیا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر ہر نبی نے اس گھر کا طواف کیا اور برابر حج کرتے رہے۔ اہل عرب نے اس کی عظمت شروع کر دی۔ زمانہ جاہلیت میں باوجود وحشت و بربریت کے اس کی عزت کرتے۔ یہ تمام باتیں اس امر کی داعی ہوئیں کہ اسے قبلہ بنا دیا جائے اور دینا تقبل منا انک انت السميع العليم کو شرف اجابت نصیب ہو۔

قبلہ بننے کے لئے ہزار ہا سال کی سعی و کوشش کی ضرورت ہے۔ یہ ابراہیمی تعلیم کا اثر تھا کہ عرب ابابعد بیت اللہ کو اپنا قبلہ مانتے رہے اور اس کے مجاورین کو اشرف ترین عرب شمار کرتے رہے۔ اس لئے یہ کیسے ممکن تھا کہ اللہ تعالیٰ ہزار ہا سال کی محنت و جانکاهی اور ابراہیم و اسطیل کی دعاؤں کو ضائع کر دیتا۔ جدید قبلہ بنانے کے لئے اتنی ہی کوشش دوبارہ کرنی پڑتی اور اس لئے مزید دقتوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ کوئی عقلمند یہ تجویز نہیں کر سکتا کہ اس پرانی کوشش کو برباد کر کے بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کے حکم کو داعی قرار دے۔

چونکہ بیت المقدس عارضی قبلہ تھا اور یہ اولین فرزند ان اسلام کے ایمان و اسلام کی آزمائش تھی، اس لئے ان لوگوں کے دلوں میں اس خیال کا پید ا ہونا ایک قدرتی امر تھا، کہ ایام امتحان کی نمازوں کا کیا حشر ہو گا۔ خصوصاً صحابہ کرام کی زیادہ فکر تھی جو اسی زمانہ میں فوت ہو چکے تھے۔ اس آیت نے یہ شبہ دور کر دیا کہ ان لوگوں کا اجر ثواب کبھی ضائع نہیں ہو گا۔ ابن عباس نے ایمان کم کے معنی صلاتکم الی بیت المقدس کئے ہیں۔

تحویل قبلہ

قَدْ نَرَى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا ۚ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۚ وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ ۚ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ ﴿۱۴۴﴾ وَلَئِنْ أَتَيْتَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آيَةٍ مَا تَتَّبِعُوا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَا أَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۚ وَلَئِنْ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۚ إِنَّكَ إِذًا لَمِنَ الظَّالِمِينَ ﴿۱۴۵﴾

”تمہارا منہ پھر پھر کر آسمان کی جانب دیکھنا ہم ملاحظہ کر رہے ہیں پس ہم اس قبلہ کی طرف تجھے پھیر دیں گے جس کو تو چاہتا ہے، تو اب مسجد حرام کی طرف اپنا منہ پھیر اور جس جگہ تم ہوا کرو اسی کی طرف منہ پھرو اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ یہی ٹھیک ہے اور ان کے رب کے حکم سے ہے اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں اللہ اس سے بے خبر نہیں اور اگر تم کتاب والوں کے پاس تمام دلائل لے آؤ پھر بھی تمہارے قبلہ کی پیروی نہ کریں اور نہ تم ہی ان کے قبلہ کی پیروی کرنے والے ہو اور نہ ان میں کا کوئی فریق بھی دوسرے فریق کے قبلہ کی پیروی کرنے

والا ہے اور تمہیں جو علم نوازش کیا گیا ہے اگر اس کے بعد تم ان لوگوں کی خواہشوں پر چلے تو بے شک تم بھی بے انصافوں میں سے ہو جاؤ گے۔“

رسول اللہ ﷺ کو معلوم تھا کہ ایک قوم کی ہزار ہا سال کی سعی و کوشش یوں رائیگاں نہ جائے گی اور عرب کو جو بیت المقدس کی جانب رخ کرنے کا حکم دیا گیا ہے صرف ان کے امتحان کی خاطر ہے، جب آزمائش میں پورے اترے تو اب قدرتی طور پر آپ اس امر کے لئے یکسر انتظار بن گئے کہ کس وقت تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوتا ہے، چنانچہ اسی حالت میں ان آیات کا نزول ہوا اور بیت اللہ کو ہمیشہ کے لئے دنیائے اسلام کا مرکز و حید بنا دیا گیا، آپ کا ارشاد مبارک ”انا دعوة ابراہیم“ بتاتا ہے کہ آپ ہی ابراہیمی دعاؤں کے حقیقی مصداق ہیں اور دونوں باپ بیٹوں کی یہی دعا تھی کہ ”ربنا تقبل منا انک انت السميع العليم“۔ اہل کتاب کے نزدیک اس جگہ کا قبلہ قرار پانا اور آپ کا نبی ہونا اعلیٰ بدیہیات میں سے تھا، مگر وہ لوگ آپ کی نبوت کو صرف عرب تک محدود خیال کرتے تھے اور اس لئے خاموشی سے آپ کے دعاوی کو سن لیتے تھے، لیکن جس وقت قبلہ بدلا تو انہیں معلوم ہوا کہ یہ تو ہم پر حملہ کیا جا رہا ہے اور اب نبوت بنی اسرائیل سے منتقل ہو کر بنی اسمعیل میں چلی جا رہی ہے، اس لئے فوراً ناخ و منسوخ کی بحث چھیڑ دی۔

اہل کتاب کے بغض و حسد کی یہ حالت ہے کہ اگر آپ ان کے سامنے تمام دلائل پیش کر دیں پھر بھی وہ بیت اللہ کو قبلہ نہ مانیں گے اور چونکہ آپ کو بہترین مرکز نوازش کیا گیا ہے، اس لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ اس ادنیٰ ترین قبلہ کی طرف متوجہ ہوں، خود اہل کتاب کو دیکھو، ایک ہی توراۃ پر سب کا ایمان ہے، لیکن قبلہ میں سب مختلف ہیں، ایک دوسرے کا اتباع نہیں کرتے۔ سامریوں کا قبلہ اور ہے یہودیوں کا دوسرا اور عیسائیوں کا رخ مشرق کی جانب ہوتا ہے، یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے کہ آج چہل کروڑ نفوس اسی بیت اللہ الجلیل کو اپنا قبلہ تسلیم کرتے ہیں۔

الَّذِينَ آمَنُوا أَتَيْنَهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ آبْنَاءَهُمْ ۖ وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٨٦﴾  
الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ﴿٨٧﴾

”جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ (حقیقت استقبال کعبہ) کو ایسے ہی پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو اور ان میں ایک گروہ ایسا ہے جو دیدہ و دانستہ حق بات کو چھپاتا ہے، حق وہی ہے جو تمہارے رب کا حکم ہے پس شک کرنے والوں میں سے نہ ہو جانا۔“

کوئی شخص اپنے بیٹوں کے شناخت کرنے میں غلطی نہیں کر سکتا، پس جس طرح یہ ایک یقینی اور قطعی بات ہے، ایسے ہی اہل کتاب کو خوب معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا قبلہ بیت اللہ ہی ہو سکتا ہے، مگر بددیانتی کی وجہ سے اس کو مخفی رکھتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے اس آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے: کسانیکہ داوہ ایم ایشاں را کتاب، می شنوے رابعنی حقیقت استقبال کعبہ را چنانکہ می شناسند فرزندان خویش را۔

مسلمانوں کا دائمی قبلہ یہی ہونا چاہئے اس لئے دل میں کبھی کوئی شک نہ پیدا ہونے پائے۔

## مرکز قائم کرنا ہے

اب تک بنی اسرائیل کو الزامی و تحقیقی جواب دیا گیا اور تحویل قبلہ کی بعض مصلحتوں پر روشنی ڈالی گئی۔ اب بیان کیا جاتا ہے کہ تمام امت مسلمہ کے لئے ایک ہی قبلہ مقرر کرنے سے اصلی مقصد کیا ہے اور کونسی غرض و غایت پیش نظر ہے:

وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ۚ أَيْنَ مَا تَكُونُوا يَأْتِ بِكُمُ اللَّهُ جَنِينًا ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِن رَّبِّكَ ۚ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝

”اور ہر جماعت کو ایک ہی طرف منہ کرنا ہے سو تم نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو جس جگہ بھی تم ہو گے اللہ تم کو جمع کر دے گا بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور جس جگہ سے تم نکلو تو مسجد حرام ہی کی طرف منہ کرو اور یہی حقیقت میں تیرے رب کی طرف سے ہے اور اللہ تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں۔“

بیت اللہ کا قبلہ بنانا اس لئے ہے کہ ایک عالمگیر اخوت قائم کر کے اس کے لئے تمام عالم میں ایک مرکز بنادے کہ وحدت مقصد کے ساتھ وحدت مرکز ہونا ضروری ہے۔ پس مسلمانوں کی ہر جماعت کا فرض ہے کہ وہ جس طرف بھی جائے اور جدھر کا سفر کرے، نماز پڑھتے وقت اسی بیت اللہ کی جانب رخ کرے۔ جب مرکز ایک ہی ہے تو ہم میں سے ہر ایک اس امر کی سعی و کوشش کرے کہ خیر و صلاح، نیکی و پاکدامنی، طہارت و پاکیزگی اور ایثار و فدویت میں ایک دوسرے سے آگے بڑھے اور سابق القدم رہے۔ سبقت کی ایک صورت یہ ہے کہ ہم اپنے دوستوں میں پیش پیش رہنے کی کوشش کریں اور دوسری شکل یہ ہے کہ جس مرکز پر امت مسلمہ کے تمام فرزندان جلیل جمع ہوں، ان کے ساتھ مقابلہ کرنے اور ہر ایک سے آگے رہنے کا جنون دامن گیر ہو اور حقیقت میں اعلیٰ ترین عزت و کرامت کا وہی مستحق ہو گا جو اس میدان مسابقت میں سب کا امام و پیشوا بن جائے۔ مرکز کی وحدت ہم میں اس قدر جوش و ولولہ، عزم و استقلال، صبر و استقامت، علو ہمتی اور بلند پروازی پیدا کر دے گی، کہ ایک ایک مسلمان تمام دنیا سے مقابلہ کرنے کو تیار ہو جائے گا اور وہ یقین کر لے گا کہ صرف وہی کامیاب ہو سکتا ہے۔ جب اعمال و اخلاق میں ہم بہترین بن جائیں گے، پھر کسی کو ہم سے یارائے دم زدن نہ ہو گا۔ وَاِنِّي لَفِي تَنَافُسٍ مِّنَ الْمُتَنَافِسِينَ۔

سورۃ تغابن میں اسی طرف توجہ دلائی گئی ہے: يَوْمَ يَجْعَلُكُمُ لِلْجَنَّةِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ (التغابن ۹) تمہیں اقوام عالم سے مقابلہ کرنا ہے، میدان محشر میں ان سے مقابلہ کرتے وقت اگر ان سب سے آگے بڑھ گئے تو کامیاب رہے ورنہ اصلی ناکامی وہی ہوگی۔ گویا ایک فرزند اسلام دنیا میں بھی ہر ایک سے آگے رہنے کی کوشش کرے کہ: الدنیا مزدرة الاخرة، اس لئے قرآن نے تعلیم دی کہ: ”واجعلنا للمتقين اماما“ کی دعا کیا کرو۔ پھر سورۃ غاشیہ میں فرمایا: والی السباء کیف دفعت گویا ایک مسلمان کا مقصد آسمان کی طرح بلند و برتر ہونا چاہئے۔

مرکز قائم کرنے کا یہی مقصد ہے کہ جب ہر ایک مسلم کو حج بیت اللہ کے لئے جانا ضروری ہے اور وہاں دنیا کے بہترین



مسلمان جمع ہوں گے تو ہمارا فرض ہے کہ اپنے اندر اس قدر طہارت و پاکیزگی پیدا کر لیں کہ ان کے سامنے ذلیل و رسوا نہ ہوں، اگر ایک مرکز نہ ہوتا تو اس قدر جوش و ولولہ نہیں پیدا ہو سکتا تھا، رہا اس جگہ پر دنیا کے ہر گوشہ سے مسلمانوں کا جمع کرنا، سو یہ اللہ کے قبضہ میں ہے۔ وہ ضرور سب کو یہاں لا کر چھوڑے گا۔ تمہارا فرض یہ ہونا چاہئے کہ جہاں کہیں سے تم نکلو تمہارا رخ اسی جانب ہو اور باقی تمام مسلمان بھی اسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھیں، اگر تم اس مرکز کا احترام کرو گے تو ضرور دنیا و آخرت میں سرفراز رہو گے۔

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۚ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ ۚ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي ۚ وَلَئِمَّتْ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿٥٥﴾

”اور جہاں سے تو نکلے اپنا منہ مسجد حرام کی طرف کر لیا کرو اور جہاں کہیں تم ہو کرو تو اسی کی طرف اپنا منہ کرو تاکہ لوگوں کو جھگڑنے کی جگہ نہ رہے مگر ان میں سے وہ جو بے انصاف ہیں سو ان سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو اور اس لئے کہ تم پر اپنی نعمت پوری کروں اور شاید تم راہ پاؤ۔“

اس آیت میں مزید تاکید کے طور پر رسول اللہ ﷺ اور تمام مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ وہ ہمیشہ اسی کو اپنا قبلہ بنائیں، ایک لمحہ کے لئے بھی کسی مسلمان کو قبلہ بدلنے اور رسول کے طرز عمل سے استدلال کرنے کا خیال نہ پیدا ہو، بلکہ اب اس میں کبھی تبدیلی نہ ہوگی، ورنہ لوگوں کو یہ کہنے کا موقع مل جائے گا کہ مسلمانوں کا کوئی اصول بھی قابل اعتماد نہیں، رہے ظالم و بدکار سو وہ اپنی کٹ جھتی سے کبھی باز نہ آئیں گے۔ عیسائی اب تک یہی کہتے ہیں کہ عربوں کو اپنے ساتھ ملانے کی خاطر بیت اللہ قبلہ بنایا گیا حالانکہ ابراہیمی عہد انہیں خوب یاد ہے۔ اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ جس شخص نے صد ہا سال کی بت پرستی کو فنا کر دیا، جو اس قوم کے نزدیک بے انتہا عزیز و محبوب اور لازمہ قومیت تھی، وہ اپنی قوم کو خوش کرنے کے لئے ایسا کس طرح کر سکتا ہے۔

پس آئندہ کے لئے یہ قاعدہ مقرر ہو گیا کہ بیت اللہ ہی دنیا بھر کے مسلمانوں کا مرکز رہے گا، جب یہ لوگ دوسری اقوام میں تبلیغ و دعوت کے لئے جائیں تو ان کی خاطر اپنے قبلہ اور دوسرے اصول اساسی کو ترک نہ کر دیں، تم لوگوں کو اعلیٰ ترین مرکز دیا گیا، اس لئے اس کے حقوق ادا کرنے میں میرے سوا اور کسی انسان کا خوف تمہارے دل میں نہ آنے پائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تم پر اتمام نعمت کروں گا، خلافت ارضی نوازش ہوگی اور چونکہ یہ تعلیم عین فطرت انسانی کے مطابق ہے، اس لئے بہت جلد ترقی کر جاؤ گے۔ دوسری قوموں کو اگر اخلاق حسنہ و اعمال صالحہ کے کسب و حصول میں صد ہا سال صرف کرنے پڑے ہیں تو تم اس تعلیم کی بدولت چند سال میں ان نیکیوں کے مالک بن جاؤ گے اور دنیا و آخرت کی تمام کامیابیاں تمہیں مل جائیں گی۔



قبلہ ایک ہی ہوگا

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُوا عَلَيْنَكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴿۸۰﴾

”جیسا ہم نے تم میں سے ایک رسول بھیجا، جو ہماری آیتیں تم کو پڑھ کر سنا تا ہے اور تم کو سنوارتا ہے اور تم کو کتاب سکھاتا ہے اور عقل کی باتیں اور تم کو ایسی باتیں سکھاتا ہے جو تم نہ جانتے تھے۔“

کسی کو یہ خیال نہ آنے پائے کہ اہل کتاب کے ساتھ مصالحت کرنے کی خاطر ان کے قبلہ کو بھی دوسرے درجہ پر ہی تسلیم کر لیا جائے۔ اس لئے کہ جب تمام نوع انسانی کے لئے ایک ہی رسول بھیجا گیا ہے، اس کی بعثت میں کسی قوم کی تخصیص نہیں بلکہ اس کا روئے سخن عام اور سب کی طرف ہے اس لئے قبلہ بھی ایک ہی ہو سکتا ہے۔

قرآن حکیم کے نزول سے قبل عرب خانہ جنگی اور خون ریزی میں مبتلا تھے، نظام صالح اور قومیت متحدہ سے بہت دور جا پڑے تھے۔ اب ان کو ایسی تعلیم دی گئی جس نے ان شتر بانوں کو جہانباں بنادیا اور رسول امی کی گود میں تاجداران عالم نے پرورش پائی۔

چند لطیف نکتے

اہل کتاب خوب جانتے تھے کہ جو مسجد آخر میں قبلہ قرار پائے گی وہ درجہ میں بھی پہلی مسجد سے برتر ہوگی۔ دیکھئے ان آیات میں مکہ کی تعریف کی گئی ہے۔

(۱) سمندر کی فراوانی تیری طرف پھرے گی اور قوموں کی دولت تیرے پاس فراہم ہوگی، اونٹوں کی قطاریں اور مدیان اور عیفا کی سائڈ نیاں آکے تیرے گرد بے شمار ہوں گی، وہ سب جو سب کے ہیں آئیں گے وہ سونا اور لباس لائیں گے اور خداوند کی تعریفوں کی بشارتیں سنائیں گے۔ قیدار کی ساری بھیڑیں تیرے پاس جمع ہوں گی۔ مینط کے مینڈھے تیری خدمت میں حاضر ہوں گے۔ وہ میری منظوری کے واسطے میرے مذبح پر چڑھائے جائیں گے اور میں اپنی شوکت کے گھر کو بزرگی دوں گا۔ (یسعیاہ ۶۰:۵)

مدیان، عیفا، سبا، قیدار اور مینط پانچوں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے یا پوتے ہیں، جو عرب میں آکر آباد ہو گئے تھے، ان کی نسل کے قبائل رسول اللہ ﷺ کے دین میں داخل ہوئے۔ یہ لوگ نہ تو یہودی تھے اور نہ عیسائی ان سب نے مل کر صرف ایک مذبح منی پر اپنی قربانیاں پیش کی تھیں۔ قوموں کے نام، منی، کاپتہ، عرب کا قاطبہ مسلمان ہونا، حجة الوداع میں سب کا آپ کی خدمت میں حاضر ہونا یہ تمام تاریخی واقعات بتا رہے ہیں کہ شوکت کا گھر دراصل بیت الحرام ہے۔

(۲) حجی نبی کی کتاب میں ہے:

”اس پچھلے گھر کا جلال پہلے گھر کے جلال سے زیادہ ہوگا۔ رب الافواج فرماتا ہے: اور میں اس مکان میں سلامتی بخشوں

گا، رب الافواج فرماتا ہے۔“ (جی، ۹:۲)  
مسلمان ہر نماز کے بعد یہ دعا پڑھتے ہیں:

اللهم انت السلام ومنك السلام تباركت يا ذا الجلال والاكرام۔

(۳) مکاشفات یوحنا میں ہے:

”جو غالب آئے میں اسے اپنے خدا کے مقدس میں ایک ستون بناؤں گا۔ وہ پھر کبھی باہر نہ نکلے گا اور میں اپنے خدا کا نام اور اپنے خدا کے شہر یعنی اس نئے یروشلیم کا نام جو میرے خدا کے پاس سے آسمان سے اترنے والا ہے اور اپنا نیا نام اس پر لکھوں گا، جس کے کان ہوں وہ سنے کہ روح کلیساؤں سے کیا کہتا ہے۔“ (مکاشفات یوحنا ۲۱:۳ و ۳۱)

عارف یوحنا نے اپنے مکاشفہ میں دو باتوں کا ذکر کیا ہے (۱) نیبا یروشلیم، (۲) نیا نام،

نئے یروشلیم سے مراد کعبہ ہے۔ آسمان سے اترنے کے یہ معنی ہیں کہ کعبہ کو قبلہ بنانے کے لئے آسمان سے حکم نازل ہو گا قرآن میں ہے: قَدْ نَزَّلَ نَفْثًا فِي السَّمَاءِ ۚ فَلَنُؤَيِّنَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا (البقرة ۱۴۴)

صلح حدیبیہ کے وقت عہد نامہ میں اسم رحمن لکھا گیا تو ہسیل سفیر کفار نے کہا واما الرحمن فوالله ما لغرفه (خدا کی قسم ہم نہیں جانتے رحمن کون ہے) قرآن میں ایک جگہ آیا وَهُمْ يَذَّكَّرُ الرَّحْمَنُ هُمْ كُفَرُونَ ۝ (الانبیاء ۳۶) ایک مقام پر یوں ارشاد ہوا: وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ اسْجُدُوا لِلرَّحْمَنِ قَالُوا وَمَا الرَّحْمَنُ (الفرقان ۶۰) یہی وہ نیا نام تھا جس سے اہل عرب باوجود اہل زبان ہونے کے واقف تھے۔ قرآن نے اگر انہیں روشناس کرایا۔

(۴) زبور میں داؤد علیہ السلام کی مدح و ستائش کرتے ہیں:

”مبارک وہ ہیں جو تیرے گھر میں بستے ہیں، وہ سدا تیری ستائش کریں گے (سلاہ) مبارک وہ انسان جس میں قوت تجھ سے ہے، ان کے دل میں تیری راہیں ہیں، وہ بکا کی وادی میں گزر کرتے ہوئے اسے ایک کو آن بناتے۔ پہلی برسات اسے برکتوں سے ڈھانپ لیتی۔ (زبور: ۴۸: ۴، ۵، ۶)

ان آیات سے حسب ذیل باتیں ثابت ہوتی ہیں:

(الف) یہ خدا کا ایک گھر ہے، وہاں کے باشندے مبارک ہیں اور وہ ہمیشہ خدا کی تقدیس اور بزرگی بیان کرتے رہیں گے۔

(ب) ان لوگوں کی قوت و شوکت کا سبب خود اللہ تعالیٰ ہو گا۔

(ج) بکا ایک ایسا نام ہے جو معرفہ معلوم ہوتا ہے اور اس میں تبدیلی نہیں ہوئی۔

(د) وادی بکا میں سے گزرتے وقت ایک کنواں بنائیں گے۔

اب ان کا مصداق ملاحظہ ہو۔

(۱) بسنے والوں سے مراد حضرت اسمعیل کی اولاد ہے۔ حضرت ابراہیم دعا کرتے ہیں رَبَّنَا اِنِّیْ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذٰلِہِمْ عِنْدَ بَیْتِکَ (ابراہیم ۷۳) خداوند! میں نے اپنی اولاد کو اس وادی میں تیرے عزت والے گھر کے پاس آباد کیا ہے جس میں زراعت نہیں ہوتی۔

(۲) جس وادی کا نام بکا زبور میں ہے اس کی نسبت قرآن یوں کہتا ہے اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّةَ (ال عمران ۹۶) پہلا گھر جو لوگوں کے لئے بنایا گیا وہ وہی ہے جو بکا میں ہے۔

(۳) کنوئیں کے متعلق بخاری میں ہے، فلما بلغت الوادی سعت جس وقت ہاجرہ اس وادی میں پہنچیں تو پانی کے لئے دوڑیں پھر فرمایا و غنم عقبیہ علی الارض قال فانبعث الماء فدهشت امر اسمعیل فجعلت یحضر ف رشتہ نے اپنی ایڑی زمین پر ماری پانی ابل پڑا اسمعیل کی ماں حیران رہ گئی اور سے کھود کر کنواں بنانے لگی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے جدا علی ہیں۔ ان شان دار قوموں کے پدر بزرگوار کی مسجد کو قبلہ قرار دینا گویا تینوں قوموں کو اتحاد نسبی و جسمانی کی یاد دلا کر اتحاد روحانی کے لئے دعوت دینا اور متحد بن جانے کا پیغام سنا دینا ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ مسلمان، خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے اس کی پرستش کرتے ہیں اور یہ پرانی بت پرستی اب تک ان میں قائم ہے۔

عبادت کرنے کے لئے تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے اولاً جس چیز کی پرستش کی جائے اس کی عظمت سے دل بھر پور ہو، اس کے جلال و کبریائی سے جسم انسانی پر روٹ گئے کھڑے ہوتے ہوں، اور یکسر توجہ بن کر اس کے حضور میں کھڑا ہو۔ ثانیاً اس کی حمد و ستائش کے گیت زبان سے گائے جائیں اور تیسرے یہ کہ اپنی آرزو بر آنے کی اس سے درخواست ہو۔ لیکن ان میں سے کوئی بات بھی توجہ الی قبلہ سے نہیں ثابت ہوتی، بلکہ نماز کے تمام اجزا میں خدائے قدوس کی طرف توجہ ہوتی ہے اس کی پاکی بیان کی جاتی ہے، اور اسی کے آگے دست سوال دراز ہوتا ہے۔ مسلمان تو ایک طرف خود مشرکین بھی اس گھر کو نہیں پوجتے تھے بلکہ وہ ان بتوں کی پرستش کرتے جو اس کے اندر رکھے گئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان بتوں کو پاش پاش کر کے ایک اللہ کی عبادت کے لئے اس کو خاص کر دیا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حجر اسود کو بوسہ دینا بھی بت پرستی کی بقایا میں سے ہے۔ اس اعتراض کا جواب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان سے سن لینا چاہئے: انک جبر لا ضر ولا تنفع تو ایک پتھر ہے کسی کے نفع و نقصان سے تمہیں کوئی سروکار نہیں۔ یہ پتھر صرف اس لئے ہے کہ طواف کی ابتداء اور انتہاء معلوم کرنے کا کام دے۔ ہمیں زبور میں اس کے متعلق حسب ذیل الفاظ ملتے ہیں: ”وہ پتھر جسے معماروں نے رد کیا کوئے کا سر اہو گیا ہے۔ یہ خداوند سے ہوا جو ہماری نظروں میں عجیب ہے۔“ (زبور ۸۱: ۲۲، ۳۲) دانیال میں ہے: ”جیسا کہ تو نے دیکھا کہ وہ پتھر بغیر اس کے کہ کوئی ہاتھ سے اس کو پہاڑ سے کاٹ نکالے آپ

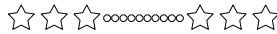
سے آپ نکلا۔ (دانیال ۵۴:۲) انجیل میں انگوری باغ کے ٹھیکیداروں کی تمثیل میں یوں فرمایا: انہوں نے اس سے کہا ان بڑے آدمیوں کو بری طرح ہلاک کرے گا اور باغ کا ٹھیکیدار باغبانوں کو دے گا جو موسم پر اس کو پھل دیں۔ یسوع نے ان سے کہا کیا تم نے کتاب مقدس میں کبھی نہیں پڑھا جس پتھر کو معماروں نے رد کیا۔ وہی کونے کے سر کا پتھر ہو گیا۔

یہ خداوند کی طرف سے ہوا۔

اور ہماری نظر میں عجیب ہے۔

اس لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی پادشاہت تم سے لے لی جائے گی۔ اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے، دے دی جائے گی۔ اور جو اس پتھر پر گرے گا اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے، مگر جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا۔ (متی ۱۲:۱۲ تا ۱۴)

پس حجر اسود وہی نشان ہے جس کا ذکر کتاب مقدس کی ان آیات میں آیا ہے۔ قبلہ کی بحث نے دراصل اس بات کو واضح کر دیا کہ ابراہیمی دعائیاتی کے لئے تھی۔ یہودیوں نے اپنے قوائے علیہ کو بیکار کر دیا۔ دعوت و تبلیغ کے فرض کو چھوڑ بیٹھے، کتاب الہی میں تحریف کے مرتکب ہوئے۔ اس لئے اب خود بخود زمین و آسمان سے ندا بلند ہونے لگی کہ دعوت ابراہیم کا مصداق ظاہر ہو۔ کیونکہ دنیا تباہی و بربادی کے گڑھے میں جاری ہے۔ چھ صدی تک یہ زمین الہام الہی سے محروم رہی تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو مبعوث فرمایا، جنہوں نے ایک جدید قومیت کی بنیاد ڈالنے کے لئے وہ تعلیم دی جس کا تذکرہ اگلی آیتوں میں آتا ہے۔



## باب ۳

## تہذیب اخلاق

جب یہودیوں کی نسبت یہ فیصلہ ہو گیا کہ وہ ناکارہ محض ہیں تو اب خود بخود اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی کہ دوسری قوم اٹھ کر کرہ ارضی کی تہذیب و شائستگی کے فرض کو اپنے ہاتھ میں لے لے۔ قرآن نے دعویٰ کیا کہ وہ اس اہم واقعہ فرض کو ادا کرنے کے لئے تیار ہے اور یہاں سے اس نے اپنی تعلیم شروع کی جس نے چند سال کے اندر عرب میں ایسا مہر العول انقلاب پیدا کر دیا کہ دنیا اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔

اگرچہ اسلام کے سامنے جملہ اقوام و ملل پر برتری حاصل کرنا ہے۔ نہو الذی ارسل رسولہ بالہدی و دین الحق لیظہرہ علی الدین کلمہ مگر اس نے اس کی طرف تدریجی قدم بڑھایا کہ اولین سنگ بنیاد ٹھیک طور سے رکھا جائے تاکہ اس پر قومیت صالحہ کی جدید عمارت محکم و استوار ہو سکے۔ اس نے سب سے پہلے اخلاق انسانی پر نگاہ ڈالی اور ان کی اصلاح و تہذیب کو مطمح نظر بنالیا کہ قوم میں صحیح کیر کٹر پیدا ہو اور ان اکہ مکہ عند اللہ اتقا کم کا مصداق بن جائے۔ یہی اخلاق اعمال کا سرچشمہ ہیں اور ان ہی پر حیات قومی کا دار و مدار۔

## اخلاق کی تفصیل

انسانی ارتقا اور اس کے مدارج علو و رفعت ان چار عنوانوں سے باہر نہیں: (۱) تہذیب اخلاق (۲) تدبیر منزل (۳) سیاست مدینہ (۴) خلافت کبریٰ۔ جس قدر انبیائے کرام دنیا میں تشریف لائے ان کا روئے سخن ایک ایک قوم کی طرف تھا، اس لئے ان کی انتہائی ترقی بھی سیاست مدینہ سے آگے نہ بڑھ سکی، مگر رسول اللہ ﷺ تمام عالم کے لئے بھیجے گئے تھے: وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا (سبا ۲۸) اس لئے آپ کو خلافت کبریٰ کا وعدہ دیا گیا اور آپ کی امت کو شہداء علی الناس کے درجہ پر فائز کیا گیا۔

یہاں سے تہذیب اخلاق کا باب شروع ہوتا ہے جس میں حسب ذیل اخلاق پر زور دیا گیا ہے۔

فَاذْكُرُونِي اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ ﴿۱۶﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۷﴾

پس تم مجھے یاد رکھو میں تمہیں یاد رکھوں گا اور میرا احسان مانو اور ناشکری مت کرو، اے مسلمانو! صبر اور دعا سے مدد طلب کرو بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

ان دونوں آیتوں میں حسب ذیل اخلاق پر زور دیا گیا ہے:

(الف) ذکر، ہر حالت میں خدا کو یاد رکھنا الست برکم کے جواب میں جو ملی کہا تھا فراموش نہ ہوئے پائے۔ ایاک نعبد وایاک نستعین کی حقیقت طاری ہو اور الا بذکر اللہ تطمئن القلوب سے حلاوت اندوز ہو، ان صلاحی و نسکی و محیای و مصلاتی اللہ رب العلمین لاشریک لہ و بذلک امرت وانا اؤل المسلمین کا جذبہ عشق و شیفگی پیدا ہو، اور اسلمت لرب العلمین اس کے ہر رگ و پے میں جاری و ساری ہو، جس طرح دنیا میں ہر قوم کے لئے مرکز ہونا ضروری ہے، نجوم و کواکب کا تعلق سورج کے ساتھ ہے۔ درخت کی مختلف شاخیں جڑ سے متعلق ہیں، ایسے ہی نوع انسانی اپنے مرکز حقیقی سے وابستہ ہو کہ وہی سرچشمہ حیات ہے اور وہی ہماری ضروریات زندگی کو پورا کرنے والا۔ جھکے تو اسی کے آگے، عاجزی و فروتنی ہو تو اسی کی خاطر اور مانگو تو اسی سے وہی دے گا۔

(ب) شکر۔ جو کچھ اس نے دیا اس کو صحیح موقع و محل پر صرف کرنا شکر ہے، لَیْن شَکَرْتُمْ لَکَزِيدْنٰکُمْ وَلَیْن کَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابَیْ لَشَدِیْدٌ ﴿۱﴾ (ابراہیم ۷) اگر اس کو بیجا خرچ کیا تو یہ کفر ہو لہذا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ لَیْبَلِّغُہٗ اَشْکُرُ اَمَّا اَکْثَرُ ۚ وَمَنْ شَکَرَ فَاِنَّمَا یُشْکِرُ لِنَفْسِہٖ ۚ وَمَنْ کَفَرَ فَاِنَّ رَبِّیْ غَفِیْ ۚ کَرِیْمٌ ﴿۲﴾ (النمل ۴۰) لوط علیہ اسلام پر نعمتوں کے نزول کا سبب شکر قرار دیا نَجِّیْنٰہُمْ بِسَحَابٍ ۚ نُّعِیْنُہٗ مِنْ عِندِنَا ۚ کَذٰلِکَ نَجْزِیْ مَنْ شَکَرَ ﴿۳﴾ (القر ۳۵، ۳۴) چونکہ وہ خدا کی دی ہوئی چیز کو صحیح موقع و محل پر صرف کرتے تھے اس لئے ہم نے ان کو عذاب سے نجات دی۔

(ج) صبر، ہر مقصد کے حصول میں تکلیفوں اور مصیبتوں کا پیش آنا لازمی ہے۔ تمام دنیا سے شرک و بت پرستی کو دور کرنا، اس کے گوشہ گوشہ اور کونہ کونہ میں توحید کی نشر و اشاعت اور اقوام عالم پر برتری کا حصول بے انتہا قربانیوں کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اپنے مقصد حیات پر مرنے کے لئے تیار رہنا اور مصائب و موانع کی بنا پر اپنے نصب العین کونہ چھوڑنا صبر ہے۔ سورہ آل عمران کے آخر میں خلافت ارضی کی شرط اسی صبر کو قرار دیا: اَصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللہَ لَعَلَّکُمْ تَفْلَحُونَ، ایک جگہ اس کو اعلیٰ ترین اخلاقی قوتوں میں سے شمار کیا: وَتَتَّقُوا فَاِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْر ﴿۱۸۶﴾ (ال عمران ۱۸۶) دوسری جگہ اس کو اولو العزم پیغمبروں کے محضات میں شامل کیا قَاصِدٌ کَمَا صَبَرْ اُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ ﴿۳۵﴾ (الاحقاف ۳۵) قرآن حکیم ہر صابر مسلمان سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ دس کافروں پر بھاری ہو اِنْ یَکُنْ مِنْکُمْ عَشْرُوْنَ صَابِرُوْنَ یُغْلِبُوْا مَا تَتَّبِعُوْنَ (الانفال ۶۵) جنگ میں کامیابی کے مختلف اصول بیان کرتے ہوئے فرمایا: وَاطِیْعُوا اللہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذٰہَبَ رِیْحُکُمْ وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللہَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ ﴿۱۶۱﴾ (الانفال ۱۶۱) لڑائی کے موقع پر اسی صبر و استقامت کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے: رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکَافِرِیْنَ ﴿۲۵۰﴾ (البقرۃ ۲۵۰) اسی صبر پر امامت و پیشوائی عالم نوازش کی گئی وَ جَعَلْنَا مِنْہُمْ اٰیۃً یَّہْدُوْنَ بِاَمْرِنا لَمَّا صَبَرُوْا ﴿۲۴﴾ (السمۃ ۲۴) اسی کی خاطر بنی اسرائیل ہر قسم کی خیر

وبرکت کے نزول کا باعث بن گئے وَ تَمَثَّلْتَ بِكَ الْخُسْفَى عَلَى بَنِي إِسْرَءِيلَ بِمَا صَبَدُوا (الاعراف ۱۳۷) بہترین جزا صرف صابرین کو ملے گی وَ لَنَجْزِيَنَّ الَّذِينَ صَبَدُوا أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۰﴾ (النحل ۹۶) ان کو بغیر حساب ہر چیز نوازش ہوگی إِنَّمَا يُعِطِي الضَّالِّينَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۱۰﴾ (الزمر ۱۰) اسی صبر و استقامت پر پانچ ہزار فرشتوں کی اعانت کا وعدہ دیا گیا: اِنْ تَصَبَّرُوا وَتَتَّقُوا وَآتَوْكُمْ مِّنْ قُدْرِهِمْ هَذَا يُمِدَّكُمْ رَبُّكُم بِخَمْسَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ (ال عمران ۱۲۵) آل عمران کی اس آیت نے تو صبر کے معنی بالکل ہی واضح کر دیے: وَكَانَ مِّنْ بَنِي إِسْرَءِيلَ قَوْمًا يَّسْتَفِيزُونَ كُنُوزَهُمْ فَجَاءُوا هَؤُلَاءِ بِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا ۚ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطِيعِينَ ﴿۱۳۶﴾ (ال عمران ۱۳۶) یہاں تو مقصد پر مرنے کے سوا اور کوئی مطلب ہی نہیں لیا جاسکتا۔

(د) دعا۔ اللہ تعالیٰ سے اعانت کے طلبگار رہنا، آدم علیہ السلام مدتوں پریشان پھرتے رہے تاکہ آنکہ انہوں نے دعا کی اور مصیبت سے نجات حاصل کی، ادعوتی استعجب لکم اسی لئے کہا گیا، مومنین کے خصائص بیان کرتے ہوئے فرمایا: وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۚ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ﴿۶۵﴾ (الفرقان ۶۵) ذکر یا علیہ السلام کے خصائص و امتیازات بیان کرتے ہوئے کہا: إِنَّهُمْ كَانُوا يُسْهِمُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَ يَدْعُونَ تَنَاوُغًا وَ رَهَبًا (الانبیاء ۹۰) گناہوں کی مغفرت صرف دعا کے ذریعہ ہو سکتی ہے: وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ وَمَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُ ۖ إِلَّا اللَّهُ (آل عمران ۱۳۵)۔

امام احمد نے اپنی مسند میں نعمان بن بشیر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا: الدعاء هو العبادة ایک روایت میں آتا ہے: الدعاء مخ العبادة۔ ابن ماجہ میں ہے: ليس شيء اكرم على الله من الدعاء دعا سے بڑھ کر اللہ کے نزدیک اور کوئی چیز بزرگ و برتر نہیں۔ بیہقی نے دعوات کبیر میں روایت کیا ہے: ان ربکم سی کریم یستجی من عبده اذا رفع یدیه الیه ان یردھما صغرا تمہارا پروردگار باحیاء ہے، جب ایک بندہ اس کے حضور میں ہاتھ پھیلاتا ہے تو خالی واپس کرتے ہوئے اسے شرم آتی ہے۔

مواعظ صبر

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ ﴿۱۰﴾

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے جائیں انہیں مردہ مت کہو بلکہ زندہ ہیں لیکن تمہیں خبر نہیں۔

یہاں سے ان مواعظ کا ذکر کیا جاتا ہے جہاں صبر کے بغیر چارہ نہیں اور جو ہر راہ روح کے لئے ضروری و ناگزیر ہیں کہ بغیر ان تکالیف و مصائب کے اچھے اور برے میں تمیز نہیں ہو سکتی۔ قرآن حکیم نے اکثر مقامات پر جہاں لڑائیوں کا فلسفہ بیان کیا ہے وہاں بار بار اس حقیقت کبریٰ کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جنگ صرف اس لئے ہوئی، اور ان مصیبتوں کا نزول اس بنا پر ہوا کہ منافق اور مومن میں تمیز ہو جائے۔ چنانچہ فرمایا: وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ ۚ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ

الطَّالِبِينَ ﴿٦٥﴾ وَلِيُبَيِّنَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّحِقَ الْكُفْرَانُ ﴿٦٦﴾ (ال عمران ۱۴۱، ۱۴۰) دوسری جگہ کہا وَلِيُبَيِّنَ اللَّهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ وَلِيُبَيِّنَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ (ال عمران ۱۵۴) اور ایک موقع پر یوں ارشاد ہوا وَمَا أَصَابَكُمْ يَوْمَ التَّتْيِ الْجَنُّنِ فَبِأَذْنِ اللَّهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٦٧﴾ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ كَافَرُوا (ال عمران ۶۵، ۶۶)

اصل بات یہ ہے کہ قوموں کی زندگی شہدائے خون اور گوشت سے وابستہ ہے، کھیتی کے لئے پانی اور سورج کی حرارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے ہی آزادی حاصل نہیں ہو سکتی جب تک اس کے لئے گردنیں نہ کٹیں، ہزاروں انسانوں کا خون نہ بہے۔ قوموں کی کھیتی کو خون سے سینچا جاتا ہے۔ جب تک کسی قوم کے بہترین افراد قتل نہ ہوں، اس میں کبھی جوش و ولولہ انتقام نہیں پیدا ہوتا۔ اسی کی طرف قرآن نے ارشاد کیا جب کہا: وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّحِقَ مِنْكُمْ شُھَدَاءُ (ال عمران ۱۴۰) جب قوم کی قوم میں جذبہ ایثار و فدویت پیدا ہو جائے گا اور بچہ بچہ یکسر جوش و انتقام بن جائے گا تو کس کو ہمت ہوگی اس سے مقابلہ کرنے کی۔ یہی وہ حیات قومی ہے جو شہداء کے خون بہنے سے پیدا ہوتی ہے۔ دنیا میں سب سے بڑی لعنت یہ ہے کہ ایک قوم پر غیروں کو مسلط کر دیا جائے۔ اس لئے فرمایا کہ جو لوگ ہماری راہ میں اپنی جانیں دیں گے ان کی قوم کبھی غیروں کی غلام و محکوم نہیں بن سکتی، بلکہ وہ ابدی زندگی کی وارث بن جاتی ہے مگر یہ زندگی عظیم الشان قربانی کے بعد شروع ہوتی ہے۔

دور حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد

ہے ابتداء ہماری تری انتہا کے بعد!

بنی اسرائیل کو جب بیت المقدس پر حملہ کرنے کے لئے کہا گیا تو وہ اسی قربانی سے ڈرتے تھے اور مرنے سے جی چراتے تھے۔ پھر تمہیں معلوم ہے ان کا کیا حشر ہوا؟ قرآن خود اس کو بیان کئے دیتا ہے۔

قَالَ فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً يَتِيهُونَ فِي الْأَرْضِ ۚ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ﴿٢٦﴾ (المائدہ ۲۶)

خدا نے فرمایا اچھا تو وہ ملک چالیس برس تک ان کو نصیب نہ ہو گا۔ مصر کے جنگل میں بھٹکے بھٹکے پھریں گے تو تم نا فرمان لوگوں کے حال پر کچھ افسوس نہ کرنا۔

گویا چالیس سال تک ان کو حکومت و سرفرازی سے محروم کر دیا گیا۔ یہی وہ قتال فی سبیل اللہ ہے جس کی نسبت قرآن اعلان کرتا ہے کہ اس راہ میں مرنے کے بعد تمام گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں، اس کے سوا اور کوئی نیکی نہیں جس کے لئے اس قسم کا وعدہ کیا گیا ہو: تُوْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿١١٠﴾ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ (الصف ۱۱، ۱۲) حدیث میں آتا ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کی آرزو شہید فی سبیل اللہ کے سوا اور کوئی نہیں کرتا: ما من احد يدخل الجنة يحب ان يرجع الى الدنيا وله ما في الارض من شيء الا الشهيد يتنى ان يرجع الى الدنيا فيقتل عشر مرات لبإیری من الكرامة شهيد چاہتا ہے کہ دنیا میں آئے اور راہ حق و حریت میں بارہا قتل ہو۔ اور یہ خواہش اسی عزت و کرامت نے پیدا کی جو مرنے کے بعد اسے میسر آئی، اور اس لئے کہ اس کی راہ میں جان



دینے کی لذت و سعادت ایک ہی مرتبہ میں ختم نہ ہو جائے۔

تنبت سلیمی ان نبوت بحیہا۔  
واہون شی عندنا ماتنبت!

ایک جگہ فرمایا: مامن میت بیوت الا ختم عملہ الا من مات مرابطاً سبیل اللہ، فانہ ینولہ عملہ الی یوم القیمة وامن من فتنۃ القبر کوئی ایسی موت نہیں جس کے ساتھ اعمال کا سلسلہ بھی ختم نہ ہوتا ہو، الا وہ شخص جس کے جہاد کی راہ میں دشمن کے حملے کا انتظار کرتا ہو دنیا سے گیا، پس اس کا عمل ایسا ہے جو مرنے کے بعد بھی قیامت تک بڑھتا رہے گا۔

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حسنات جاریہ تین ہیں: اولاد صالح، علم نافع اور اوقاف و تعمیرات خیرہ۔ گزشتہ حدیث سے پتہ لگتا ہے کہ جہاد کا ہر کام بھی اس قسم میں داخل ہے کیونکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ اپنے بعد کے زمانے اور آنے والی نسلوں کی حفاظت و سعادت کے لئے اپنا وجود قربان کر دیا جائے۔ پس کوئی عمل نہیں جو اس سے زیادہ سچی اور بے لاگ انسانی خدمت اور نوعی حفاظت کے جذبات رکھتا ہو۔ اور اس لئے ضروری ہوا کہ اس کا اجر بھی وقتی نہ ہو دائمی ہو۔ عمل کا اجر تو نتائج پر موقوف ہے۔ جب نتائج بعد کے زمانوں اور نسلوں کو ملیں گے، تو صاحب عمل کا اجر بھی فوراً کیوں منقطع ہو جائے؟ اسی چیز کی طرف آیت زیر بحث نے ارشاد کیا کہ جب حق پر کبھی موت طاری نہیں ہو سکتی تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس کی راہ میں قربان ہونے والے پر موت طاری ہو، اس کے اعمال حسنہ کے ثمرات و نتائج میں کسی قسم کا انقطاع نہیں ہوتا۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۖ وَبَشِيرِ الصَّابِرِينَ ﴿١٥﴾ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ﴿١٦﴾ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَواتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿١٧﴾

اور البتہ ہم تم کو تھوڑے سے خوف سے اور بھوک سے اور مال اور جان اور میوہ جات کی کمی سے آزمائیں گے، اور صبر کرنے والوں کو خوش خبری دے دو۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ کا مال ہیں اور اسی کی طرف ہمیں لوٹ کر جانا ہے۔ ایسے لوگوں پر ان کے رب کی طرف سے رحمت اور عنایت ہے۔ اور یہی لوگ راہ راست پر ہیں۔

موت تو سب سے بڑی مصیبت تھی جو انسان کو بالکلیہ دنیا اور اس کی ہر چیز سے، الگ کر دیتی ہے۔ اب ان چیزوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو بظاہر اس کا مقابلہ تو نہیں کر سکتیں، مگر ان کا تسلسل اور برابر رہنا مصیبت اور تکلیف میں موت سے بھی بڑھ جاتا ہے۔ اور اکثر لوگ ایسے موقعوں پر کمزوری اور بزدلی کا اظہار کرتے ہیں۔ دشمن کا خوف دامن گیر ہے، قید خانہ کی کوٹھریاں، نظر بندی کی مصیبت اور جلا وطنی کی تکلیف کا ڈر لگا ہوا ہے۔ حکومت نے سامان رسد پر قبضہ کر لیا ہے۔ مصنوعی قحط سے ملک کو تنگ کر رکھا ہے۔ اموال و اجناس ادا میں روز بروز کمی ہو جاتی ہے۔ یار و مددگار اور عزیز و قریب فنا ہوتے جاتے ہیں۔ کھانے پینے کی چیزوں میں قلت ہوتی جاتی ہے۔

یہ سنت اللہ ہے اور ہر داعی حق کو اس منزل سے گزرنا پڑتا ہے۔ دوسری جگہ آتا ہے: اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُم مَّثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَاءُ وَزُلُّوا حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَى نَصُرُ اللّٰهُ ۚ اَلَا اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيبٌ ﴿۲۱۴﴾ (البقرہ ۲۱۴) ایک مقام پر یوں ارشاد ہوا: اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُتْرَكُوْا اَنْ يَقُولُوْا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ﴿۲۱۵﴾ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ اٰلَتْنٰهُمْ فَلْيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلْيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۱۶﴾ (العنکبوت ۲، ۳) سورہ آل عمران میں ہے: وَكَانَ مِنْ نَّبِيِّ قَتْلٍ مَّعَهُ رَیْبُوْنَ كَثِيْرٌ ۖ فَبَا وَهَنُوْا لِمَا اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا (ال عمران ۱۷۶) جو لوگ ان مصائب و تکالیف سے پریشان خاطر انہیں ہوتے بلکہ: انا للہ وانا الیہ راجعون کے الفاظ ان کی زبانوں پر جاری ہو جاتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو فتح و کامرانی کے مستحق ہیں۔ بے شک

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا!

الفاظ و بشا، الصبرین کس درجہ حقیقت صبر کو ظاہر کرنے والے ہیں کہ ان مصیبتوں کو برداشت کرتے ہیں مگر راہ حق میں دعوت الی الخیر کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اور آخر یہی لوگ رحمت عامہ اور خاصہ کے مستحق قرار پاتے ہیں۔  
تعلیم گاہ حریت

اِنَّ الصَّفَا وَالْمُرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوْ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَوِّفَ بِهِمَا ۚ وَمَنْ تَطَوَّعَ حَيْثُ ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۷﴾

صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں، پھر جو شخص اس گھر کا حج یا عمرہ کا ارادہ کرے اس پر ان دونوں کی درمیان طواف کرنے میں کوئی گناہ نہیں، اور خوش دلی سے نیک کام کرے تو اللہ تعالیٰ قدر دان جانے والا ہے۔  
ہر تعلیم کی کامیابی کے لئے تین چیزوں کی ضروری ہے۔

(۱) نصاب تعلیم بہترین ہو کہ اسی سے قوم کے بچوں میں حس و بیداری پیدا ہوگی۔ جوش و ولولہ عمل سے قوم زندہ ہو جائے گی اور جذبہ قومیت و وطنیت ہر شخص میں نظر آئے گا۔

(۲) معلم کا وجود اس تعلیم کا بہترین نمونہ ہو کہ تعلیم محض بالکل بیکار ہے جب تک اس کے ساتھ انسانی نمونہ عمل نہ ہو۔

(۳) تعلیم گاہ ایسی ہو جس کی روایات شاندار ہوں اور جس کی تربیت نے بہترین افراد امت پیدا کئے ہوں۔

اسلام نے ان تینوں ضرورتوں کو بہترین طریق سے پورا کیا۔ اس نے قرآن حکیم کو نصاب تعلیم تجویز کیا کہ لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ۚ تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَنِيدٍ ﴿۲۱۸﴾ (حم السجدہ ۲۱۸) اسی کی نسبت حضرت عمرؓ نے کہا سبنا کتاب اللہ، رسول اللہ اس کے معلم ہیں یعلمہم الكتاب والحكمة جو خود اس تعلیم کے اکمل ترین نمونہ ہیں لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ اُسُوًّا حَسَنَةً ﴿۲۱۹﴾ (الاحزاب ۲۱) کی تفسیر میں حضرت عائشہؓ نے فرمایا: کان خلقہ القرآن، درس گاہ حریت یہی بیت الحرم ہے

جس میں آنے کی ہر مسلمان کو دعوت دی: **وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مِنْ اَسْطَافِ الْيَهُودِ سَبِيلًا**۔  
 تہذیب اخلاق کے باب میں جن جذبات حقہ کی تعلیم دی گئی ان کی تربیت و تکمیل کے لئے فرمایا کہ صفا اور مروہ کا طواف کر لیا کرو اور بار بار سعی بین الصفا والبروۃ تو اور بھی زیادہ مفید ثابت ہوگی کہ کثرت کار و مشق کی بنا پر ہر وقت ابراہیم واسمعیل کے مقامات ذہاب الی اللہ یاد آتے رہیں گے اور بتدریج وہی اخلاق و جذبات جڑ پکڑیں گے۔ ابراہیم نے اس گھر کی بنا اس لئے ڈالی تھی کہ اس جگہ مجاہدین فی سبیل اللہ تیار ہوں۔ اس لئے سپاہیانہ زندگی کے لوازمات کی تکمیل بھی اسی جگہ ہو سکتی ہے۔ آپ آگے چل کر دیکھیں گے کہ جس جگہ سورہ بقرہ میں احکام حج بیان کئے گئے ہیں، اسی کے ساتھ جہاد کے فرائض کا بھی تذکرہ ہے۔ اگر قرآن کی آیات باہم دگر مربوط مسلسل ہیں تو وہاں اس کے سوا اور کوئی معنی ہو نہیں سکتے کہ حج اور جہاد کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔

جو لوگ اس کا بار بار طواف کر کے اپنے جذبات حقہ کی تکمیل کریں گے، اللہ تعالیٰ ان امتیازات کو ضائع نہ کرے گا بلکہ صحیح موقع پر ان سے کام لے لیگا۔ وہ موقعہ کونسا ہوگا اس کو اللہ کے سوا دوسرا نہیں جانتا۔ جب میدان جنگ میں مسلمانوں اور کافروں کی صفیں آراستہ ہوں گی کامیابی کے لئے صبر و استقامت اور عزم و استقلال کی ضرورت ہوگی، اس وقت مسلمان دعا کریں گے رَبَّنَا آفِرْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿۲۵۰﴾ (البقرہ ۲۵۰) اس وقت ان جذبات حقہ سے کام لیا جائے گا۔ جب فرعون کو عین دربار میں جادو گروں نے لٹکارا اور اس نے جواب میں ان کے ہاتھ پاؤں کاٹنے کی دھمکی دی تو انہوں نے بھی یہی دعا کی تھی: وَمَا تَنْفَعُ مِنَّا اِلَّا اَنْ اَمْنًا بِاَيْتِ رَبِّنَا لَمَّا جَاءَتْنَا رَبَّنَا آفِرْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَوِّقْنَا مُسْلِمِينَ ﴿۱۲۶﴾ (الاعراف ۱۲۶) ہمارا اس کے سوا اور جرم ہی کیا ہے کہ جب اللہ کی آیات ہمارے پاس آگئیں تو ہم نے ان کے آگے اپنی گردنیں خم کر دیں۔ اب تم ہمیں قتل سے ڈراتے ہو تو خداوند اہم پر صبر انڈیل دے کہ خوف کے مارے پھسل نہ جائیں اور مریں تو مسلمان ہوں۔

یاد رکھنا چاہئے کہ خواتیم آیات دراصل تمام آیت کے مطالب و معانی کا مغز اور لب لباب ہوتے ہیں۔ افسوس ہے کہ مفسرین نے اس موضوع کی طرف بالکل توجہ نہ کی۔ اور ایک اہم ترین باب اب تک بند کا بند ہی رہا کہ تَرَكَ الْاَوَّلَ لِلَاخِرِ۔

### تبلیغ و دعوت

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَا اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدٰى مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ ۚ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۚ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاصْلَحُوْا وَبَيَّنُّوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ؕ وَاَنَا السَّوَابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفٰرٌ ۙ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۳۱﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْقَرُوْنَ ﴿۳۲﴾

وہ لوگ جو ان صاف حکموں اور ہدایت کی باتوں کو چھپاتے ہیں، بعد اس کے کہ ہم نے انہیں نازل کیا۔ اور کتاب میں

لوگوں کو صاف صاف سمجھا دیا، ان پر خدا لعنت کرتا ہے اور سب لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں مگر جن لوگوں نے توبہ کی، اور اپنی حالت درست کر لی اور صاف صاف بیان کر دیا تو ان کی توبہ ہم قبول کرتے ہیں اور ہم بڑے قبول کرنے والے مہربان ہیں۔ البتہ جن لوگوں نے انکار کیا اور انکار ہی کی حالت میں مر گئے تو ان پر خدا کی لعنت اور فرشتوں اور آدمیوں کی سب کی، وہ ہمیشہ اسی لعنت ہی میں رہیں گے، نہ تو ان سے عذاب ہی ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی۔

یہ وہ اخلاق ہیں جن کو ہر مذہب و ملت میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ کتاب الہی میں ان کے بیان کرنے سے مقصد یہی ہے کہ ان کی نشر و اشاعت ہو۔ اور لوگ ان سے فائدہ حاصل کریں۔ مگر جو بد بخت ان کی تبلیغ و دعوت سے گریز کرتے ہیں، ان کی مثال اس شخص کی ہے جو جنگل میں پانی کے ایک شیریں چشمہ پر قابض ہے مگر نہ تو انسان کی تشنہ لبی کو دور کرتا ہے اور نہ کسی جانور کو اپنی پیاس بجھانے دیتا ہے ایسے شخص پر زمین و آسمان کی ہر چیز لعنت کرے گی۔ یہی حال ان ارباب علم کا ہو گا جو اپنے علم کو چھپاتے ہیں۔ حالانکہ ان سے وعدہ لیا گیا تھا کہ وہ اس کی نشر و اشاعت میں مصروف ہو جائیں گے۔ اہل کتاب کی سب سے بڑی خرابی یہی تھی کہ وہ دعوت و ارشاد کے فرض کو ترک کر چکے تھے: **وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُونَهُ فَنَبَذُوهُ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ وَاشْتَقُوا بِهِ شَتًّا قَلِيلًا فَبُيِّنَ مَا يَشْكُرُونَ** (ال عمران ۱۸۷) شارح علیہ السلام کو یہی حکم دیا گیا: **وَأَوْحَىٰ إِلَيْنَا هَذَا الْقُرْآنَ لِأُنْذِرَكُمْ بِهِ وَمَنْ بَلَغَ** (الانعام ۱۹) رسول کو اسان الہی نے ان الفاظ میں خطاب کیا: **يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ بَلِّغُوا مَا آتَاكُم مِّن رَّبِّكُمْ وَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَمَا يَبَلِّغُوا رَسُولَهُ** (المائدہ ۶۷)

ان تمام آیات سے معلوم ہوا کہ تبلیغ و دعوت رسول اور اس کے جانشینوں کا فرض ہے، مگر جو اس مقصد حیات کو ترک کر دیں گے وہ اللہ کی رحمت سے دور ہو جائیں گے۔ ملائکہ الرحمن سے دوری نصیب ہو گی۔ اور اس طرح خیر و صلاح سے یک قلم الگ ہو جائیں گے۔ کیونکہ نیکی کا الہام فرشتوں ہی کی طرف سے ہوتا ہے اور عام لوگوں کے دلوں میں ان کے لئے بغض و عداوت کے جذبات پیدا ہوں گے ❶۔

❶ امت مسلمہ کے علماء و مشائخ ان آیات میں درس و فکر سے کام لیں کہ تبلیغ و دعوت پر کتنا زور دیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **وَمَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِي بَيْتٍ مِنْ بُيُوتِ اللَّهِ يَتْلُونَ كِتَابَ اللَّهِ وَيَتَادَرُونَهُ بَيْنَهُمْ إِلَّا نَزَلَ عَلَيْهِمُ السَّكِينَةُ وَغَشِيَتْهُمْ الرَّحْمَةُ وَحَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ وَذَكَرَهُمُ اللَّهُ فِي مَنْ عِنْدَهُ** اور جب ایک قوم مسجد میں اس لئے آتی ہے کہ قرآن حکیم کی تلاوت کرے اور اس کے درس و افتاء کو اختیار کرے تو اس پر اللہ کی سکینت و رحمت نازل ہوتی ہے ملائکہ اپنی خیر و برکت میں انہیں لے لیے ہیں، اور ملا علی میں ان کا ذکر ہوتا ہے۔ ترمذی نے ابن مسعود سے اور داری نے ابو ذر سے روایت کی کہ **نُصِرَ اللَّهُ أَمْرًا سَمِعَ مِنْ شَيْءٍ فَبَلَغَهُ كَمَا سَمِعَهُ فَرَبَّ مَبْلَغٍ أَوْ لَوْ أَنَّ كُلَّ نَفْسٍ كَانَتْ تَبْلُغُ مَا تَسْمَعُ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ لَفُتِحَتْ أَبْوَابُ الْجَنَّةِ** اس لئے کہ بہت سے سننے والے داعی سے زیادہ سمجھدار ہوتے ہیں اور وہ زیادہ نفع حاصل کرتے ہیں۔ داری نے حسن سے مرسل روایت کیا ہے کہ: **مَنْ جَاءَهُ الْمَوْتُ وَهُوَ يَتْلِي الْعِلْمَ يَحْيِي بِهِ الْإِسْلَامَ فَيُبَيِّنُهُ وَبَيْنَ النَّبِيِّينَ** درجۃ واحدہ فی الجنۃ جو شخص اس حال میں مر گیا کہ احیاء و تجدید ملت کے لئے علم دین حاصل کر رہا تھا تو اس میں اور نبیوں میں درجات کے اعتبار سے جنت میں صرف ایک ہی درجہ کا فرق ہو گا، ایک روایت میں ہے کہ آپ کے سامنے بنی اسرائیل کے دو شخصوں کا ذکر کیا

گیا۔ ایک وہ قہاجو صرف فرائض نمازی ادا کرتا اور باقی اپنا تمام وقت تبلیغ و دعوت میں صرف کرتا اور دوسرا صائم الدہر اور قائم اللیل تھا۔ لوگوں نے آپ سے دریافت کیا کہ ان دونوں میں سے افضل کون ہے؟ آپ نے فرمایا: افضل هذا العالم الذی یصلی المکتوبة ثم یجلس فیعلم الناس الخیر علی العابد الذی یصوم النهار ویقوم الیل کفضل علی ادناکم، وہ عالم جو فرض نماز پڑھنے کے بعد لوگوں کی تعلیم میں مصروف ہوتا ہے اس عابد کے مقابلہ میں جو صائم الدہر اور قائم اللیل ہے ایسا ہی بزرگی اور شرافت میں اعلیٰ ہے جیسے میری فضیلت و برتری تم میں سے ادنیٰ ترین پر ہے۔ عبد اللہ بن عمرو کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ اپنی مسجد میں گئے تو دیکھا دو گروہ ہیں۔ فرمایا دونوں نیکی میں مصروف ہیں مگر ایک دوسرے سے افضل ہے۔ جو لوگ اللہ کے ذکر میں مصروف ہیں اور اس کی طرف توبہ و انابت کر رہے ہیں خدا کی مرضی پر موقوف ہے انہیں کچھ نوازش کرے یا کچھ بھی نہ دے واما هؤلاء فیتعلمون الفقه او العلم ویعلمون الجاهل فہم افضل مگر یہ لوگ دوسروں کو فقط علم کی باتیں سکھاتے ہیں اور جاہلوں کو تعلیم دیتے ہیں، یہ ان سے افضل و اعلیٰ ہیں پھر فرمایا انما یبحث معلما ثم یجلس فیہم کہ میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں اور انہی کے درمیان بیٹھ گئے۔

حضرت عمر بن عبد العزیز نے ابو بکر بن حزم مدینہ کے قاضی کو لکھا:

انظر ماکان من حدیث رسول اللہ ﷺ فاکتبه فانی خفت دروس العلم وذہاب العلماء ولا تقبل الاحادیث النبویة ﷺ ولیفشو العلم ولیجسوا حق ینعلم من لا ینعلم فان العلم لایہلک حتی یکون سہا۔

دیکھو جو آپ کی حدیثیں تمہیں ملیں ان کو لکھ لو کیونکہ مجھے علم دین کے مٹنے اور علما کے چل بسے کا خوف ہے اور صرف حدیث ہی قبول کرنا کسی اور کا قول نہ ہو۔ علما کا فرض ہے کہ وہ اشاعت علم میں مصروف ہوں تعلیم دینے میں لگ جائیں تاکہ جاہل علم حاصل کر لیں۔ اس لئے کہ جہاں علم پوشیدہ ہو اور وہ ضائع ہو گیا۔ علما کا فرض تو یہ تھا کہ وہ اپنی تمام عمر اسی فرض جلیل میں صرف کرتے مگر ان بد بختان ملت نے کتاب و سنت کی ان تصریحات کی پروا نہ کی اور علم کو چھپانا شروع کر دیا اور اب تو دعوت و ارشاد میں ایک عالم بھی مصروف نہیں فیاللاسف ویاللعاء کیا ان علمائے سوء کو یاد نہ رہا کہ من سئل عن علم فکتہ الجہہ اللہ یوما لقیۃ بلجام من نار جس عالم سے کوئی بات دریافت کی گئی اور باوجود جاننے کے اس نے بتانے سے گریز کیا تو قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس کے منہ میں آگ کی لگام ڈالے گا۔ بیشک اس صادق و مصدوق نے سچ فرمایا تھا کہ الا ان شر الشرار العلماء کہ بدترین خلائق اور شر البریہ یہی۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

عالم ہیں جو اپنے علم کی نشر و اشاعت سے غافل ہیں۔ بنیقی نے شعب الایمان میں حضرت علیؑ سے روایت کی کہ علمائہم شہ من تحت اہیم السباع من عندہم تخرج الفتنة وفہم تعود۔ اس آسمان کی چھت کے نیچے جو کچھ ہے اس میں بدترین یہی علماء ہیں کہ یہی فتنہ و فساد کے بانی ہوں گے اور پھر انہی پر ہر قسم کی مصیبت نازل ہوگی۔

علامہ ابن تیمیہ اپنی کتاب مدارج السالکین میں ماسی تبلیغ و دعوت کی حقیقت پر ان الفاظ میں روشنی ڈالتے ہیں۔

المرتبة السادسة مرتبة البیان العام وهو تبیین الحق وتبیؤة من الباطل با دلته وشواہدہ واعلامہ بحیث یصیر مشہودا للقلب کمشہود العین للبریات وھذا المرتبة هی حجة اللہ علی خلقہ التی لا یعذب احدہا۔ ولا یفعلہ الا بعد وصولہ الیہلہو هذا البیان هو الذی یبحث بہ الرسل وجعل الیہم والی العلماء بعدہم وبعد ذلک یضل الہ من یشائی۔

چھٹے درجہ میں بیان عام کا شمار ہو گا جس کا مشاہدہ ہے کہ دلائل و براہین اور شواہد و اعلام کے ذریعہ حق و باطل میں ایسی تمیز کر دیجائے کہ قلب ان میں ایسے ہی فرق و امتیاز کر سکے جیسے آنکھ۔ اسی تبلیغ و ارشاد کے بعد اللہ کی حجت قائم ہوتی ہے اور اسی سے انکار و جود عذاب کا باعث ہوتا ہے۔ اسی کی خاطر انبیاء کی بعثت ہوئی اور یہی فرض کیے بعد دیگرے علمائے امت کے ذمہ عائد ہوتا رہا۔

حضرت شاہ ولی اللہ اپنی عدیم النظیر کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں ارشاد فرماتے ہیں۔

اما المجازات بالوجه الرابع فلا تكون الا بعد بعثة الانبیاء وکشف الشبهة وصحة التبلیغ لیهلک من ہلک عن بینة ویحیی من حی عن بینة۔ مجازات کی چوتھی صورت یہ ہے کہ انبیاء مبعوث ہوں، مخالفین کے شبہات دور کئے جائیں، صحیح معنی میں تبلیغ ہو تاکہ جو ہلاک ہو تو جہت قائم ہونے کے بعد اور جو زندہ رہے وہ دلائل و براہین سے اطمینان حاصل کر کے۔

اس وقت ہمارے عالموں کی جو حالت ہے وہ صاف بتا رہی ہے کہ ان میں یہودیوں کی مغضوبیت اور نصاریٰ کی ضلالت آچکی ہے۔ کتاب اللہ ان کے وراہ ظہور ہم ہی فیہلک ہم ثم ویلک ہم۔

## باب ۴

## تدبیر منزل

اب تک انفرادی حیثیت سے تہذیب اخلاق کی تعلیم دی گئی تھی، مگر ظاہر ہے کہ حقیقت میں یہ کوئی زندگی نہیں۔ زندگی اگر ہے تو اجتماعی۔ اسی لئے نبی عربی نے ہمیشہ حیات اجتماعی پر زور دیا، مگر قوم ہمیشہ افراد سے بنتی ہے، اس لئے ضروری تھا کہ پہلے فرد افراد پر ایک شخص میں صحیح کریکٹر پیدا کر دیا جائے تاکہ آئندہ چل کر قومی عمارت محکم استوار ہو۔ جب اس سے فراغت ہو گئی تو اجتماعی زندگی کی طرف توجہ کی۔ یہاں آکر انسانوں کے ایک دوسرے سے تعلقات و روابط قائم ہوتے ہیں۔ نکاح کی بنا پر اولاد پیدا ہوتی ہے۔ ان تمام ضروریات زندگی کا بہم پہنچانا اور بچوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام باپ کے ذمہ عائد ہوتا ہے۔ گھر دراصل ایک چھوٹی سی حکومت ہے جس میں نظم و نسق اور عدل و انصاف کی ضرورت ہے۔ ان تمام امور پر اس باب میں بحث ہوگی۔

جب خانگی زندگی شروع ہوئی تو سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ روزی کمانے کی صورت کیا ہو اور روپیہ کس طرح حاصل کیا جائے؟ اس لئے سب سے پہلے ان ذرائع و وسائل کو بیان کیا جائے، جن سے روپیہ مل سکے۔

دولت کمانے کے ذرائع

وَالْهَيْكُمُ إِلَهُ وَاحِدٌ ۖ لَّا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ ﴿٢٥﴾

”اور تمہارا معبود تو وہی ایک خدا ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، رحمن ہے رحیم ہے۔“

اسلام کا مایہ ناز اور سرمایہ افتخار مسئلہ توحید کا ہے جس کی وجہ سے وہ مذہب وادیان عالم سے ممتاز و نمایاں ہے۔ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں توحید خالص دیکھنے کا متمنی ہے، اس لئے تہذیب اخلاق سے لے کر خلافت کبریٰ تک ہر جگہ اس کی حفاظت الزم اللوازم ہوگی۔ تدبیر منزل میں گھر کی زندگی کا ذکر ہے، کھانے کمانے کے مسائل ہیں، مگر یہاں بھی اس جبل اللہ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور سب سے پہلے اسی کی تعلیم دیا اور بتا دیا کہ اسی کی ذات اقدس تمہاری تمام ضروریات زندگی کی ذمہ دار و کفیل ہے، وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (ہود) پس یہ نہ ہو کہ اگر کسی دقت کوئی دقت پیش آئے تو غیر اللہ سے طالب اعانت ہو، نہیں! اسی کی طرف توجہ ہو اور اسی کے آگے دست سوال دراز ہو۔ اس قدر تمہید کے بعد اب دولت کمانے کے ذریعوں کی تفصیل آتی ہے۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْغُلُوكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبُحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ

اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ ۖ وَتَصْرِيفِ الرِّيحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿۲۵﴾

“بیشک آسمان وزمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کی آمد و شد میں اور جہازوں میں جو آدمیوں کے نفع کی چیزیں لیکر سمندر میں چلتے ہیں اور بارش میں جس کو اللہ آسمان سے نازل کرتا اور زمین کو اس کے خشک ہونے کے بعد شاداب کرتا ہے اور حیوانات میں جو زمین میں پھیلا رکھے ہیں اور ہواؤں کے پھیرنے میں اور بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان گھرے رہتے ہیں، غرض ان سب میں ان لوگوں کے لئے جو عقل رکھتے ہیں نشانیاں ہیں۔”

اسلام کی تعلیم صرف احسان و تقصوف اور رہبانیت کے لئے نہیں نازل کی گئی، بلکہ اس کی اصلی غرض یہ ہے کہ اس کی وجہ سے شہداء علی الناس کا درجہ حاصل ہو اور کنتم خیر امة اخراجت للناس کی عزت نصیب ہو۔ وہ صرف حکومت و سر فرازی کے لئے ہے، اس لئے دولت کمانا اس کے اصول اساسی میں سے ہے، اس نے مال کو خیر سے تعبیر کیا: يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ ۖ قُلْ مَا أَكْفَقْتُم مِّنْ خَيْرٍ (البقرة ۲۱۵) اس نے دولت کو امتوں اور ملتوں کے قیام کا باعث بتایا: وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا (النساء ۵) پھر اس نے بار بار اتفاق فی سبیل اللہ اور صدقات و خیرات پر زور دیا، البتہ اس کے لئے حدود اور قوانین ہیں جو اپنی جگہ پر بیان کئے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ دولت کمانا کسی شریف انسان کا مقصد حیات نہیں ہو سکتا، بلکہ اسے ملک و ملت کی راہ میں صرف کرنا اس کی انتہائی غرض ہونی چاہئے۔

سب سے پہلے انسان کی صدا ہر دور تیس ہیں جو زمین و آسمان کی پیدائش اور اختلاف لیل و نہار سے پوری ہوتی ہیں۔ پانی کے شیریں چشمے جنگلوں اور پہاڑوں میں تشنہ لبوں کی سیرابی کا باعث ہوتے ہیں۔ درختوں کی ٹہنیاں میوؤں کے بوجھ سے جھکی جاتی ہیں، ان چیزوں کی پیداوار میں انسانی کوشش کو دخل نہیں، بلکہ قدرت خود بخود مہیا کر رہی ہے اور موسم کے تغیر و تبدل نے ان کے پورے کرنے کا ذمہ لے رکھا ہے۔ سورہ نمل میں فرمایا: هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً لَّكُمْ مِنْهُ شَرَابٌ وَمِنْهُ شَجَرٌ فِيهِ تُسِيمُونَ ۖ يُنْبِتُ لَكُمْ بِهِ الزُّؤَرَ وَالزَّيْتُونَ وَالنَّخِيلَ وَالْأَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ ۚ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴿۱۰۱﴾ (النمل ۱۰۱) وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسیا جس میں سے کچھ تمہارے پینے کا ہے اور اس سے درخت پرورش پاتے ہیں جنہیں تم اپنے مویشیوں کو چراتے ہو۔ اسی پانی سے خدا تمہارے لئے کھیتی اور زیتون اور کھجور اور انگور اور ہر طرح کے پھل پیدا کرتا ہے۔ جو لوگ سوچ سمجھ کو کام میں لاتے ہیں ان کے لئے اس میں ایک نشانی ہے۔

پھر جہازوں اور کشتیوں کے لئے بحری تجارت کے راستے کھلے ہیں۔ سورہ روم میں فرمایا: لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْ فَضْلِهِ (الروم ۴۵) سورہ جاثیہ میں آیا: اللَّهُ الَّذِي سَخَّرَ لَكُمْ الْبَحْرَ لِيَجْزِيَ الْفُلْكَ فِيهِ بِأَمْرِهِ وَلِيَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ (الجاثیہ ۱۲) ایک جگہ کہا: وَعَلَى الْفُلْكَ تُخْمَلُونَ (المؤمنون ۲۲) ان تمام آیات میں بتایا کہ کشتیوں کے ذریعہ تم دریاؤں اور سمندروں میں تجارت کر کے اللہ کا فضل تلاش کرو۔

زمین جب امساک باران کی بنا پر مردہ ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ بارش نازل کرتا ہے اور مردہ زمین کو زندگی بخشتا



ہے: **وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَاصْبَا بِهٖ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (النحل ۶۵)** ایک موقعہ پر یوں ارشاد ہوا: **وَمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ رِزْقٍ فَاصْبَا بِهٖ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (الباقیہ ۵)** تو زمین کی زندگی سے مراد یہ ہے کہ لوگ اس میں کاشتکاری کر سکیں اور وہ زراعت کے قابل بن جائے، گویا اس آیت میں بتا دیا کہ زراعت اور کھیتی باڑی بھی زرق کمانے کا ایک ذریعہ ہے۔

جانور کثرت سے زمین میں پھیلانے گئے ہیں۔ دوسری جگہ اس کی اغراض پر بحث کی، مجملہ ان کے ایک آیت یہ بھی ہے کہ **وَتَخْبِلُ اَعْيَالَكُمْ اِلٰیٰ بَدَلٍ لَّمْ تَكُونُوْا بِلِغِيْهِ اِلَّا بِشَيْءٍ اَلْفَنَسِ (النحل ۷)** اور جن شہروں تک تم بے جان کاہی نہیں پہنچ سکتے، چارپائے وہاں تک تمہارے بوجھ اٹھا کر لے جاتے ہیں علاوہ اس کے ایک مصلحت یہ بیان کی: **وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَ مَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ (النحل ۵)** اور اسی نے چارپایوں کو پیدا کیا جن میں تم لوگوں کی زینت ہے اور فائدے ہیں اور ان میں سے تم کھاتے ہو۔

اس میں جانوروں کی تجارت سے فائدہ اٹھانے کی تعلیم دی۔

ہواؤں کا تغیر و تبدل خود ایک حقیقت کی طرف راہنمائی کرتا ہے، مگر صرف ارباب عقل و خرد ہی اس کی جانب توجہ کر سکتے ہیں۔ سورہ جاثیہ میں آیا: **وَتَصْرِيفِ الرِّيحِ اِلَيْتِ يَقُوْرُ يَعْقِلُوْنَ (الباقیہ ۵)** آج ہم اپنے گرد و پیش نگاہ دوڑائیں تو معلوم ہو گا کہ دنیا ہوا سے کیا کیا کام لے رہی ہے۔ اور علوم و معارف کے ذریعہ سے اس کو کسی طرح اپنے تابع فرمان بنالیا ہے۔ آسمان وزمین کے درمیان جس قدر بادل نظر آتے ہیں، وہ سب انسانوں کے مطیع و فرمانبردار ہیں کہ صاحبان دانش و بینش انھیں اور ان سے قوت برقی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں ضروریات پیدا کیں، اسی کے ساتھ ساتھ اسباب و وسائل بھی بہم پہنچا دیئے۔ پھر ان سے فائدہ حاصل کرنے اور ان کو اپنی ضروریات میں لانے کے لئے عقل نوازش کی۔ دولت کمانے کے ان قدرتی ذریعوں کو چھوڑ کر دوسری طرف متوجہ ہونا عقل والوں کا کام نہیں۔

غیر اللہ کی غلامی

**وَمِنَ النَّاسِ مَنۢ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰدَآءِیْحِیُّوْنَهُمْ كُحْبِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ وَلَوْ یَرِیَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اٰذِیْرُوْنَ الْعَذَابِ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا ۚ وَاَنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعَذَابِ ۝**

“اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے سوا اوروں کو بھی اس کا شریک بناتے ہیں اور ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی محبت خدا سے رکھنی چاہئے اور جو ایمان والے ہیں انہیں اللہ کے ساتھ بہت محبت ہے اور اگر یہ ظالم عذاب دیکھنے کے وقت جس بات کو سمجھیں گے اب سمجھ جاتے کہ سب قوت اللہ ہی کی ہے اور اللہ کا عذاب بڑا سخت ہے تو کیا اچھا ہوتا۔”



انسان کو چاہئے تو یہ تھا کہ وہ ان خزانِ قدرت میں غور کرتا، ان سے کام لیتا اور اپنی ضروریات پوری کرتا۔ اگر بالفرض زرق کمانے میں کوئی دقت محسوس ہوتی تو اسے برداشت کرتا، مگر بعض بد بختوں کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اللہ سے علیحدہ ہو کر غیروں سے اپنا رشتہ جوڑ لیتے ہیں، دوسروں کو اپنا رازق اور مربی خیال کرنے لگ جاتے ہیں۔ ان کی غلامی و محکومی کو اپنے لئے باعث عزت سمجھتے ہیں، ان کے آگے خاک مذلت چاٹتے ہیں اور اس طرح اپنی تمام عمر صرف کر دیتے ہیں مگر ایک مسلمان کی شان اس سے کہیں زیادہ رفیع و بلند ہے۔ اس کے گردن اللہ کی سوا اور کسی کے آگے نہیں جھک سکتی، بلکہ اسے جس قدر تکلیف ہوگی اس کے عشق خداوندی میں اور زیادہ اضافہ ہوگا۔

ارباب ایمان اس حقیقت سے خوب واقف ہیں کہ انجام کار، یہی صحیح تعلیم کام آئے گی اور دنیا و آخرت میں صرف اسی شخص کو آرام نصیب ہو سکتا ہے جو اس قانون کا پابند ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تکلیفوں اور مصیبتوں کو برداشت کر لیتے ہیں مگر غیر اللہ کے آگے ان کی گردن نہیں جھکتی، البتہ جو لوگ مشرکانہ رسوم کے پابند ہیں، راہ حق میں ذرا سی تکلیف بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ مگر ایک وقت ایسا آئے گا جب وہ تمام قوتیں بیکار ثابت ہوں گی جن پر انہوں نے اعتماد کیا تھا، اس وقت انہیں معلوم ہوگا کہ ان قوتوں پر اعتماد کرنا سخت غلط کاری تھی، مگر اب یہ ندامت کس کام آئے گی؟ لَیْسَ الْبُلْکُ الْیَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (المومن ۱۶)، یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ ﴿۱۷﴾ اِلَّا مَنْ لَّیَّ اللّٰهُ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ ﴿۱۸﴾ (الشعر ۸۸، ۸۹) جس دن کی نسبت یہ خبر دی گئی ہے: یَوْمَ یَغْفِرُ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ ﴿۱۷﴾ وَاَمَّهٖ وَاَبِیْہٖ ﴿۱۸﴾ وَصَاحِبِیْہٖ وَبَنِیْہٖ ﴿۱۹﴾ لِّکُلِّ اَمْرِیْ مِنْہُمْ یَوْمَ مِیْدَیْنٌ شَآءَ یُغْفِرُہٗ ﴿۲۰﴾ (العنکبوت ۳۳، ۳۴)۔

اِذْ تَبَرَّأَ الَّذِیْنَ اَتَّبَعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اَتَّبَعُوْا وَرَآوْا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِہِمُ الْاَسْبَابُ ﴿۲۱﴾ وَقَالَ الَّذِیْنَ اَتَّبَعُوْا لَوَ اَنَّیْ لَنَا کَرَمًا فَتَنَّبَکَا مِنْہُمْ کَمَا تَبَرَّءُوْا مِثْلًا کَذٰلِکَ یُرِیْہُمُ اللّٰهُ اَعْمَالُہُمْ حَسٰتٍ عَلَیْہُمْ وَمَا ہُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۲۲﴾

”جبکہ وہ لوگ جن کے کہنے پر دوسرے چلتے تھے ان لوگوں سے بالکل الگ ہو جائیں گے جو ان کے کہنے پر چلتے تھے اور اپنی آنکھوں سے عذاب دیکھ لیں گے اور تمام باہمی تعلقات ٹوٹ جائیں گے اور یہ تابع لوگ یوں کہیں گے، کاش! ہمیں ایک دفعہ جانا مل جائے تو ہم بھی ان سے صاف الگ ہو جائیں گے جس طرح یہ ہم سے الگ ہو گئے، یوں اللہ ان کے اعمال کو انہیں سرتاسر موجب حسرت دکھائے گا اور ان کو دوزخ سے نکلتا کبھی نصیب نہ ہوگا۔“

دنیا کی زندگی میں بارہا تجربہ ہوتا ہے کہ ایک جھوٹے انسان کی تقلید آنکھیں بند کر کے شروع کی جاتی ہے، حکومت کے آگے اندھا دھند سجدہ کیا جاتا ہے، مگر عین وقت پر آکر ان میں سے کوئی چیز بھی کام نہیں آتی، ہر ایک اپنی براعت و پاک دامنی کا اظہار کرتا ہے اور وہ شخص بے یار و مددگار رہ جاتا ہے۔ یہ تو دنیا کا حال تھا، قیامت کی کیفیت اس سے زیادہ درد انگیز ہے۔ جن لوگوں کو آج خدا بنایا جا رہا ہے، ان کے سامنے نذر و نیاز پیش کی جاتی ہے، مرنے پر ان کی قبروں کے گرد طواف کیا جاتا ہے اور انہیں سجدہ گاہ بنالیا جاتا ہے وہ اس روز صاف صاف کہہ دیں گے کہ ہم نے ان سے اپنی عبادت

کے لئے کبھی نہیں کہا۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قیامت کے روز سوال ہو گا کہ کیا تم نے لوگوں سے یہ کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اپنا معبود بنا لو تو وہ جواب دیں گے: مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَا أَمَرْتَنِي بِهِ أَنْ اعْبُدُوا اللَّهَ بَنِي وَرَبِّكُمْ (المائدہ ۱۷) یہ تو ایک پیغمبر معصوم کا حال تھا، اب ان معبودانِ باطل کی کیفیت ملاحظہ ہو: وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَقُولُ أَأَنْتُمْ أَضَلَلْتُمْ عِبَادِي هَؤُلَاءِ أَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيلَ ۝ (الفرقان ۱۸، ۱۷) اور جس دن خدا کافروں کو اور ان معبودوں کو جن کو یہ لوگ خدا کے سوا پوجتے ہیں اپنے حضور میں جمع کرے گا، پھر پوچھے گا کہ، کیا میرے ان بندوں کو تم نے گمراہ کیا تھا یا یہ آپ ہی راستے سے بھٹک گئے؟ ان کے معبود عرض کریں گے کہ، تو پاک ہے ہم کو یہ بات کسی طرح زبیا ہی نہ تھی کہ تیرے سو اپنے لئے دوسروں کو کار ساز بناتے، بلکہ بات یہ تھی کہ تو نے ان کے بڑوں کو آسود گیاں دیں یہاں تک کہ تیری یاد بھلا بیٹھے اور یہ آپ ہی ہلاک ہونے والے لوگ تھے۔

جب ان مشرکین کے اسبابِ شفاعت ناکام ثابت ہوں گے تو غصہ و انتقام کے مارے دنیا میں دوبارہ جانے کی کوشش کریں گے کہ ان معبودانِ باطل سے اپنی علیحدگی کا اظہار کر سکیں۔ مگر بے سود۔

### صرف کرنے کا قانون

روپیہ کمالیا، اب بتایا جاتا ہے کہ اس کے صرف کرنے کا صحیح موقعہ و محل کونسا ہے؟

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ۝ (إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝)

”لوگو! زمین کی چیزوں میں سے جو حلال طیب ہیں کھاؤ اور شیطان کے قدم بقدم مت چلو وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ وہ تم کو بدی اور بے حیائی کے باتوں کی تعلیم دے گا اور یہ چاہے گا کہ تم اپنے اللہ کی ذمہ وہ باتیں لگاؤ جن کو تم نہیں جانتے۔“

مسلمانوں کو خلافتِ ارضی حاصل کرنا ہے، اس لئے انہیں صرف اس چیز کا استعمال کرنا چاہئے جس کی طہارت و پاکیزگی کا انہیں یقین ہو، جس کو ناجائز ذرائع سے نہ حاصل کیا گیا ہو اور جس کی قانونِ الہی نے اجازت دیدی ہو۔ اس مقصدِ عظیم کے کسب و حصول کے لئے ضرورت ہوگی بہترین دل و دماغ کی۔ اور یہ تروتازگی انہیں پیدا ہو سکتی جب تک عہدہ سے عہدہ پاکیزہ اشیاء استعمال میں نہ ہوں۔ پس دنیا کی ہر اچھی چیز ایک مسلمان ہی کے لئے پیدا کی گئی ہے کہ کھائے اور حکومت کے لئے تیار ہو۔ البتہ ان چیزوں سے پرہیز لازمی ہے جو روحانی و جسمانی صحت کے لئے مضر ہوں، جن سے جذباتِ خبیثہ اور اخلاقِ فاسقہ پیدا ہونے کا اندیشہ ہو اور جن سے ارادوں میں ضعف و کمزوری آجائے۔ یہ خصوصیت صرف نبی کی تعلیم کو حاصل ہے کہ اس سے انسانی ارادہ میں قوت پیدا ہوتی ہے اور شیطان ہمیشہ بے حیائی اور بد خلقی کی تعلیم دیتا ہے جس کا انتہائی

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نبی کی تعلیم ہی سے نفرت ہو جاتی ہے، رسول کی شان میں گستاخانہ الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں، خواہشات نفسانی کو پورا کرنے کے لئے قانون بنایا جاتا ہے اور اس کو اللہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ﴿۷۰﴾ وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِبَئَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً صُمُّ بِكُمْ عَنْهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴿۷۱﴾

“اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو حکم خدا نے اتارا ہے اس پر چلو تو کہتے ہیں نہیں ہم تو اسی پر چلیں گے جس پر اپنے بڑوں کو چلتے پایا، اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ عقل رکھتے ہوں اور نہ راہ راست پر ہوں اور ان کافروں کی مثال اس شخص کی سی ہے کہ جو ایک ایسے جانور کے پیچھے چلا رہا ہے جو سوائے بلانے اور پکارنے کے کوئی بات نہیں سنتا، یہ کافر بہرے گونگے اور اندھے ہیں سو کچھ نہیں سمجھتے۔”

جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ صرف کرنے میں نبی کے قانون کا اتباع کرو تو کہتے ہیں کہ، ہم اپنے باپ دادا کی رسم کو کبھی نہ چھوڑیں گے، اگر ان کی تقلید نہ کی تو خاندان بھر میں ناک کٹ جائے گی۔ حالانکہ اگر ذرا غور سے کام لیتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ ان رسوم میں نہ تو عقل و دانائی کی کوئی بات ہے اور نہ ان سے کسی شخص کو رشد و ہدایت نصیب ہو سکتی ہے۔ جب وہ خود ہی فہم و تدبر سے محروم تھے تو دوسروں کو ان کی تقلید سے کیا نفع مل سکتا ہے؟ جو لوگ تعلیم قرآن سے اعراض کر کے ان رسوم کی پابندی کا دم بھرتے ہیں، ان جانوروں کی طرح ہیں جن کو ایک شخص پیچھے سے آواز دے رہا ہو اور یہ سوائے آواز کے اور کچھ نہ سمجھیں۔ اولئک کالانعام بل هم اضل،

“نعق” اس آواز کو کہتے ہیں جس سے چرواہا بکریوں کو بلاتا ہے، یہاں ناعق تو حضور اقدس ہیں اور تمام کفار جانور ہیں جو آپ کی آواز سننے کے باوجود اس میں غور سے کام نہیں لیتے۔<sup>۱</sup>

۱۔ جن لوگوں نے اندھی تقلید کی زنجیریں اپنے پاؤں میں ڈال رکھی ہیں جو دنیا کو ان پابندیوں سے آزاد کرنے آئے تھے، مگر اب خود ان اغلال و سلاسل کو پہنچنے ہوئے ہیں جن کے نزدیک فقہ کی چند جزئیات وحی والہام سے بڑھ کر ہیں، جو اماموں کے اقوال کے ہوتے ہوئے صحیح احادیث کو پائے استغناء سے ٹھکرادیتے ہیں، جن کے نزدیک بیضاوی و جلالین اور دوسرے مفسرین کے اقوال کا یاد رکھنا ہی سب سے بڑی قرآن دانی اور تفقہ فی الدین ہے، جو صرف فقہاء و مشائخ کے جزئیات ہی سے استدلال کرنا اپنے لئے مایہ ناز و سرمایہ افتخار سمجھتے ہیں، وہ ان آیات میں غور و فکر سے کام لیں۔ جن ائمہ عظام کی تقلید کا آج دعویٰ کیا جاتا ہے خود ان کی یہ کیفیت تھی کہ لہٰذا کو رائے تقلید سے روکتے تھے۔ مرنے نے امام شافعی کا قول نقل کیا ہے کہ وہ لہٰذا اور دوسروں کی تقلید سے روکتے تھے۔ امام ابو حنیفہ نے فرمایا: لا ینبغی لمن لم یعرف دلیل ان ینفی بکلامی جو شخص میرے دلائل سے واقف نہیں وہ میرے مذہب پر فتویٰ نہیں دے سکتا۔ جب کبھی امام ابو حنیفہ کوئی فتویٰ دیتے تو کہہ دیا کرتے کہ نعمان بن ثابت کی رائے ہے، اگر کسی کے پاس اس سے بہتر جواب ہو تو وہ احق بالقبول اور اولی بالصواب ہے: وکان رضی اللہ عنہ اذا افتقروا یقول ہذا رای النعمان بن ثابت یعنی نفسہ وہو احسن ماقدرا نا علیہ فمن جاءہ بحسن منه فهو اولی بالصواب۔ امام مالک کا یہ قول آب زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ: مامان احد الادوہ ماخوذ من کلامہ ومردود علیہ الا رسول اللہ ﷺ آپ کے سوا ہر شخص سے اس کے اقوال کی باز پرس ہوگی۔ حاکم اور بیہقی نے امام شافعی کا یہ قول نقل کیا ہے: اذا صحت الحدیث فہو مذہبی۔ ایک روایت میں اس طرح آتا ہے: اذا رایتہم کلامی ینالحدیث فاعملوا بالحدیث وادعوا بکلامی الحائظ، اگر میرا کوئی مسئلہ حدیث کے مخالف ہو تو اسے دو پر وار دے مارو اور حدیث

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ﴿۳۱﴾ إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ  
الْمَيْتَةَ وَالْدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أَهْلَ بِهِ لغيرِ اللَّهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ  
رَّحِيمٌ ﴿۳۲﴾

”مسلمانو! جو طیب چیزیں ہم نے تم کو دے رکھی ہیں ان میں سے کھاؤ اور اللہ کا شکر کرو اگر تم اسی کی غلامی کرتے ہو، اس  
نے تو تم پر صرف مردہ جانور اور خون اور سور کا گوشت حرام کیا ہے اور وہ جانور بھی جس کو اللہ کے سوا کسی اور کے لئے  
نامزد کیا گیا ہو، پھر جو شخص بے قرار ہو جائے بشرطیکہ عدول حکمی کرنے والا اور حد سے بڑھ جانے والا نہ ہو تو اس پر کچھ  
گناہ نہیں ہوتا، بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم والا ہے۔“

ایک مسلمان جس نے اپنی ہر چیز خداوند قدوس کے نام پر قربان کر دی ہو، لذت طعام و شراب ہی کو اپنی زندگی کا  
مقصد نہیں بنا سکتا، بلکہ بہترین چیزیں کھائے اور خدائے واحد کے سوا اور کسی کے آگے اس کی گردن نہ جھکے، پاکیزہ چیزیں تو  
بہت کثرت سے ہیں، اس لئے صرف ان اشیاء کو بیان کیا جاتا ہے جن کا استعمال ممنوع و ناجائز ہے۔

(۱) مردہ۔ اگر ایک جانور کا ذبح کرنا ضروری تھا اور وہ ذبح کئے بغیر مر گیا تو اس کا گوشت حرام ہو گا۔ ایسے وحشی جانور  
جن کے ذبح کرنے پر قدرت نہ ہو اگر بسم اللہ کہہ کر تیریا اور کسی تیز ہتھیار سے زخمی کر دیا تو وہ حلال ہو گا، البتہ  
بندوق کے شکار کو ذبح کرنا ضروری ہے۔ مڈی اور مچھلی کو بغیر ذبح کئے کھانے کی اجازت ہے۔ آپ نے فرمایا:  
”هو الطهور ماء الحل ميتته“۔ مڈی کے متعلق شیخین کی روایت ہے کہ: روى عن ابن ابی اوفی قال غزونا مع  
رسول الله ﷺ سبع غزوات اوستأ وكننا ناكل الجراد ونحن معه، “ابن ابی اوفی کہتے ہیں کہ ہم نے آپ کے  
ساتھ مل کر چھ یا سات لڑائیاں لڑیں اور ان ایام میں مڈی کھاتے رہے۔“

مردار کی حرمت پر یہود و نصاریٰ بھی متفق ہیں “اور جو کوئی کسی حیوان کو جو از خود مر گیا ہو یا اسے درندے نے پھاڑا ہو  
کھاوے تو وہ شخص خواہ تمہارے دیس کا ہو خواہ پردیس کا وہ اپنے پکڑے دھوے اور پانی سے غسل کرے اور شام تک  
ناپاک رہے تب وہ پاک ہو گا۔“ (احبار: ۵۱: ۷۱)

(۲) خون۔ ہر قسم کا خون حرام ہے، لیکن شارع نے جگر اور تلی مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ دارقطنی میں ہے: “احل لنا من

پر عمل کرو۔ امام احمد فرماتے تھے: لا تقلدنی ولا تقلد مالک ولا الاوزاعی ولا النخعی ولا غیہم نہ تو میری تقلید کرو اور نہ مالک اور زاعی اور نخعی اور کسی  
دوسرے کی تقلید کرو۔ امام ابو حنیفہ نے فرمایا: اذا قلت قولا و کتاب الله یخالفه اتروا قولي بکتاب الله قلیل اذا کان خبر الرسول الله ﷺ یخالفه قال  
اتروا قولي بخبر رسول الله ﷺ، جب میرا کوئی قول کتاب و سنت کے مخالف ہو تو میرے اقوال کو ترک کر کے کتاب و سنت کا اتباع کرو۔  
یہ تصریحات ان ائمہ عظام کی ہیں جن کی کو رائہ تقلید پر ناز کیا جاتا ہے۔ جن کے اقوال کو کتاب و سنت پر ترجیح دی جاتی ہے، وہ پکار پکار کے کہہ رہے ہیں کہ  
کتاب و سنت سے اعتصام و تمسک ہی نجات کا ذریعہ ہے، مگر ان لوگوں نے اتخذا احبارہم و دھبناہم ارہابا من دونی اللہ پر عمل کر کے معصوم کی تقلید کو  
ترک کر کے غیر معصوم کو اپنا امام و قدوہ بنالیا ہے۔ دنیا میں علم ہمیشہ آزاد رہا اور اس نے کبھی کسی کی تقلید نہ کی، مگر آہ! مسلمانوں نے اس کی آزادی بھی سلب  
کر لی اور اپنے دماغوں کو دوسروں کا غلام بنالیا، پھر اس تقلید کے ہوتے ہوئے نہ تو ان میں اجتہاد فکر پیدا ہو سکتا ہے اور نہ حریت رائے۔

الدم دمان ومن الميتة ميتتان الحوت والجراد ومن الدم الكيد والطلال، ”کتاب احبار میں ہے: “اور تم کسی پر ندے اور چرندے کا کچھ لہو اپنے سب مکانوں میں نہ کھائیو اور جو انسان کسی خون میں سے کھائے گا وہ اپنی قوم سے کٹ جائے گا۔“ (احبار ۷۲، ۷۳: ۲۷)

(۳) سور کا گوشت۔ “اور سور کہ کھر اس کا دوحے ہوتا ہے اور اس کا پاؤں چرہ ہے پر وہ جنگلی نہیں کرتا، وہ بھی تمہارے لئے ناپاک ہے۔“ (احبار ۷: ۱۱)

(۴) ماہل بہ لغیر اللہ۔ وہ جانور کبھی حلال نہ ہو گا جو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے یا اس کے لئے نامزد کیا گیا ہو اور اس حرمت میں صرف جانور ہی داخل نہیں ہیں، بلکہ ہر نذر و نیاز جو خدا کے سوا دوسرے کے نام پر کی جائے۔ نووی نے شیخ ابراہیم مروزی شافعی سے نقل کیا ہے کہ: اگر کسی حاکم کے آنے پر بطور بھیونت کے کوئی جانور ذبح کیا جائے تو اگرچہ ذبح کرتے وقت اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو، مگر وہ ماہل بہ لغیر اللہ میں داخل ہو کر حرام ہو جائے گا، کذا فی الدر المختار۔ تفسیر نیشاپوری میں ہے: اجمع العلماء ان مسلماً ذبح ذبیحة وقصد بذبحها التقرب لی غی اللہ صار مرتداً و ذبیحتہ ذبیحة مرتد، جمہور علماء کی رائے ہے کہ اگر ایک مسلمان غیر اللہ کے تقرب کی خاطر جانور ذبح کرے تو وہ مرتد ہو جائے گا۔ مسلم میں ہے: لعن اللہ من ذبح غیر اللہ، اس شخص پر خدا کی لعنت جو غیر اللہ کے لئے ذبح کرے۔ شاہ عبد العزیز دہلوی سے دریافت کیا گیا کہ: کسے گاؤ یا بڑیا مرغ بنام کدام شہید یا یالی دبح نہاید چہ حکم است؟ انہوں نے جواب دیا: ذبح کہ آں جانور بنام مرغ خداوند خواہ پیغبر باشد خواہ ولی خواہ شہید خواہ غیر انسان حرام است، و اگر بقصد تقرب بنام اینا ذبح کردہ باشد ذبیحہ آن جانور ہم حرام و مردار می شود و ذبح کنندہ مرتد می شود، توبہ ازین فعل منع لازم است۔

انسان بالطبع آزاد پیدا کیا گیا ہے۔ غیر اللہ کے نام پر جانور ذبح کرنا اور نذر و نیاز دینا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ اپنی آزادی دوسرے کی خاطر بیچ رہا ہے۔ حالانکہ یہ حق صرف اللہ کے لئے مخصوص تھا۔ اللہ تعالیٰ غیور ہے وہ کبھی اس بات کو پسند نہیں کر سکتا کہ اس کا بندہ کسی اور سے بھی تعلق رکھے، اس لئے کوئی مسلمان ایسے جانور کا گوشت نہیں کھا سکتا۔ آج کل پیروں اور بزرگوں کے لئے جس قدر منتیں مانی جاتی ہیں سب اسی حرمت میں داخل ہیں۔ اضطراری حالت میں ان چیزوں کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے، مگر اس میں دو شرطیں لازم کر دی گئی ہیں۔ انسان خود اس کی خواہش اور آرزو نہ کرے۔ قانون توڑنا اس کا مقصد نہ ہو اور کھاتے وقت اپنی ضرورت سے تجاوز نہ کرے۔ ایسی صورت میں اس پر کوئی گناہ نہ ہو گا۔ اور یہ اس کی رحمت ہے کہ گناہ کی چیز سے گناہ اٹھالیا۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَسْتَوْتُونَ بِهِ شِمْنَا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكْنَهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ٥ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلٰةَ بِالْهٰدٰی وَالْعَذَابِ

بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَإِنَّ الْاٰدِیْنَ اَخْتَلَفُوْا فِی الْكِتٰبِ لَفِیْ شِقَاقٍ بَعِیْدٍ ۝

“بیشک جو لوگ اللہ کی بھیجی ہوئی کتاب کو چھپاتے ہیں اور اس کے معاوضہ میں تھوڑی سی قیمت لیتے ہیں، ایسے لوگ اپنے پیٹ میں آگ کے سوا اور کچھ نہیں بھرتے اور قیامت کے روز اللہ ان سے کلام نہ کرے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا اور ان کو دردناک عذاب ہو گا۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت دیکر گمراہی خرید لی اور بخشش چھوڑ کر عذاب سودوزخ کے لئے کیسے باہمت ہیں! یہ اس لئے کہ اللہ نے کتاب کو ٹھیک ٹھیک بھیجا تھا اور جو لوگ کتاب میں اختلاف پیدا کریں وہ بہت دور کے خلاف میں ہوں گے۔“

علماء کا فرض ہے کہ وہ تدبیر منزل کے ان بنیادی اصول و عقائد کو تمام دنیا میں پھیلا دیں، تاکہ لوگ خانگی زندگی میں قدم رکھتے ہی صراطِ مستقیم پر چلنے لگیں اور شرک و بدعت سے پرہیز کریں۔ لیکن جو علماء و مشائخ ان تعلیمات صالحہ کی نشر و اشاعت نہیں کرتے اور مذہبی پیشوا ہو کر ان حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں، انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ وہ اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں اور کبھی بد اخلاقی کے نتائج فاسدہ سے محفوظ نہ رہ سکیں گے۔ ایسے حریص و طامع عالموں کی خدا کے نزدیک کوئی قدر نہ ہو گی۔ انہیں شرف ہم کلامی نصیب نہ ہو گا اور ان کے نیک کام ان کی غلطیوں کا کفارہ نہ بن سکیں گے۔ عذاب کی یہ سختی صرف اس لئے ہے کہ کتاب تو عین ضرورت کے مطابق نازل کی گئی، مگر انہوں نے اس کی شرح و تفسیر میں اختلافات پیدا کر دیئے اور اب کوئی شخص اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ ایسا کرنے میں وہ خود بھی راہِ حق و صراطِ مستقیم سے دور جا پڑتے ہیں۔

قرآن حکیم نے تبلیغ و دعوت ہر مسلم کا فرض قرار دیا ہے اور اس امت مرحومہ کی خصوصیت ہی یہ بیان کی ہے کہ: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (ال عمران ۱۱۰) مگر جو لوگ تبلیغ و اشاعت سے انحراف کریں اور ستمان حق کے مرتکب ہوں ان کو اشد شدید عذاب کا مستحق قرار دیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا: اَوَّلِيْكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ (البقرۃ ۱۵۹)، بنی اسرائیل کی سب سے بڑی خرابی یہی ذکر کی گئی ہے کہ وہ ستمان حق کیا کرتے تھے۔

### حکومت کی قابلیت

قوموں کا ارتقاء ہمیشہ تدریجی ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ ابتداء میں تہذیب اخلاق کی تعلیم دی گئی، بعد ازاں تدبیر منزل کے اساسی اصول بیان کئے گئے۔ اب ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ قرآن حکیم یہ چاہتا ہے کہ ہر مسلمان کا گھر ایک مستقل درس گاہ ہو جس میں اولاد کی تربیت اس طریق پر کی جائے کہ گھر کی چار دیواری سے باہر نکل کر حکومت کرنے کے قابل بن جائیں۔ تفسیر کے ابتدائی اوراق میں تم پڑھ آئے ہو کہ شارع کی زندگی میں جس قدر علمی اعزازات ملتے تھے ان کا معیار قرآن حکیم تھا۔ چنانچہ آپ نے فرمایا: “خیرکم من تعلم القرآن وعلمه”، مگر عملی غر و افتخار کی لئے خود اس شخص کی گھر کی

زندگی کو دیکھا جاتا تھا۔ اہل و عیال کے ساتھ وہ کس طرح پیش آتا ہے، گھر میں نظم و نسق کیسے قائم کرتا ہے اور جھگڑوں کے وقت فیصلہ کی کیا صورت ہوتی ہے: خید کم خید کم لاہلہ میں اسی طرف اشارہ کرنا مقصود تھا۔ پس ایک مسلمان کا گھر چھوٹی سی سیاسی در سگاہ ہے جس میں حکمرانی اور جہانداری کے مسائل کی تعلیم ہوتی ہے اور جہاں سے فرمانروا بن کر نکلتے ہیں۔

لَيْسَ الْبِرُّ أَنْ تُولُوكُمْ وَجُوهَكُمْ قَبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَ النَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الصَّلَاةَ وَالْزَّكَاةَ وَالْمُؤْتُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا وَكَانُوا فِي الْبُيُوتِ وَالصُّلَىٰ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ﴿٥٠﴾

”یہی نیکی نہیں کہ مشرق و مغرب کی طرف اپنا منہ کر لو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ ایک شخص اللہ اور روز آخرت اور فرشتوں اور کتابوں اور نبیوں پر ایمان لاوے اور خدا کی محبت کی راہ میں اپنا مال رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور سوال کرنے والوں اور گردنوں کے آزاد کرنے میں صرف کرے اور نماز پڑھے اور زکوٰۃ دے اور جب عہد کریں تو اس کو پورا کریں اور سختی اور تکلیف اور لڑائی کے وقت ثابت قدم رہیں۔ یہی لوگ سچے ہیں اور یہی لوگ پرہیزگار ہیں۔“

تہذیب اخلاق کے باب میں صرف ذکر، شکر، صبر اور دعا پر زور دیا گیا کہ انفرادی طور پر تہذیب و شائستگی کے لئے یہی صفات حسنہ کافی تھیں۔ جب ترقی کر کے تدبیر منزل میں قدم رکھا تو فرائض میں بھی اضافہ ہو گیا۔ ابتدائی جماعتوں میں کتابیں کم ہوتی ہیں اور طالب علم پر ذمہ داری بھی کچھ زیادہ نہیں ہوتی، مگر جب وہ ثانوی تعلیم کے لئے کسی درس گاہ میں داخل ہو گا تو اس کی ذمہ داریاں بھی بڑھ جائیں گی۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ تہذیب اخلاق کے لئے تو صرف مشرق و مغرب کی طرف منہ کر لینا کافی تھا، مگر تدبیر منزل میں آکر ان پر اکتفا نہیں کیا جاسکتا بلکہ فرائض میں اضافہ ہو جائے گا اور اب ان امور میں بھی درخورانی حاصل کرنا ہو گا۔

(۱) تہذیب اخلاق کے لئے جن امور کو ضروری قرار دیا گیا تھا وہ اب بھی بدستور ثابت قائم رہیں گے۔

(۲) بخیل میں حاکم بننے کی قابلیت نہیں ہوتی۔ سمول بن عادیانے کیا خوب کہا ہے:

إذا البرء لبیدنس من اللوم عراضہ

فکل رداء یرتدیہ جبیل!

وان ہو لم یحمل علی النفس ضیہا

فلیس الی حسن الشناء سبیل!

تم اپنے اندر خرچ کرنے کی عادت پیدا کرو اور مال و دولت کی محبت پر غالب آؤ۔ ایک شخص نے آپ سے دریافت کیا: ای الصدقة اعظم اجرا، اجر و ثواب کے اعتبار سے بہترین صدقہ کس قسم کا ہے؟ آپ نے فرمایا: ان تصدق وانت صحیح



شحیح تخشى الفقر وتامل الغنى ولا تبهل حقاً اذا بلغت الحلقوم قلت لفلان كذا ولفلان كذا، وقد كان فلاحاً ایسے وقت میں تو صدقہ کرے کہ تندرست و جوان ہو، مال کی محبت دل میں اور فقر کا اندیشہ دماغ میں ہو، اگر جاں کنی کے وقت خیرات کرنی شروع کی تو اس کا کچھ فائدہ نہیں۔ اس لئے کہ وہ خود بخود تقسیم ہو جائے گا۔ ان صدقات و خیرات کے مستحق سب سے پہلے تمہارے عزیز و رشتہ دار ہیں کہ حمیت و عصیت قومی کی وجہ سے وہ تمہارے دست و بازو بن جائیں گے، جہاں تمہارا پسینہ گرے گا وہاں وہ اپنا خون بہانے کو تیار ہوں گے۔ قرآن حکیم نے رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کی بہت زیادہ تاکید کی ہے۔ ایک جگہ آتا ہے: **وَإِذَا الْقَرْبَىٰ حَقَّ** (بنی اسرائیل ۲۶) سورہ روم میں فرمایا: **قَالَتْ ذَا الْقَرْبَىٰ حَقَّ وَ الْمُسْكِينُ وَابْنُ السَّبِيلِ** <sup>۱</sup> **ذَلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ يُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ** <sup>۲</sup> **وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ** (الروم ۲۸) حدیث میں آیا ہے کہ: مسکین کو خیرات دینا صرف صدقہ ہی ہوگا، مگر ایک رشتہ دار کو خیرات دینے میں دو حیثیتوں سے ثواب ملے گا۔ ایک صدقہ کے اعتبار سے دوسرے صلہ رحمی کی بنا پر۔

یتامیٰ ہیں جن کا کوئی نگران کار نہیں، اگر ان کی تعلیم کا خیال نہ کیا گیا تو نارتبیت یافتہ کی کثرت قوم کو برباد کر دے گی اور ان کی تھوڑی سی مدد نہایت ہی مفید نتائج پیدا کرے گی۔ سورۃ الضحیٰ میں فرمایا: **فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ** (الضحیٰ ۹)، مبلغین و دعاۃ کے لئے ضروری ہے کہ وہ سب سے پہلے ایک قوم کے یتامیٰ کو اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ تھوڑی سی تربیت بے انتہا مفید ثابت ہوگی۔ ادھر لڑائیوں کی وجہ سے جس قدر یتامیٰ ہوں گے، قوم کے لئے بار دوش ثابت ہونے کی بجائے بہترین افراد بن جائیں گے۔ ان اسرار و مصالح کی بنا پر حامل نبوت نے فرمایا: ”انا و کافل الیتیم کھاتین“۔

انکے علاوہ مساکین، مسافر اور سائل ہیں۔ مسکین سے مراد وہ شخص ہے جو اپنی حاجت دوسروں کے پاس نہیں لے جاتا اور اس کے ظاہری حالات فقر و تنگدستی کا اظہار کرتے ہیں، بلکہ دیکھنے والوں کو اس کے دولت مند ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے: **ليس المسكين الذي ترده التمرة والتبرتان واللقمة واللقمتان ولكن المسكين الذي لا يجد غنى يغنيه ولا يظن له في تصدق عليه**، مسکین وہ نہیں جو در بدر بھیک مانگتا پھرتا ہے، بلکہ اس شخص کو مسکین کہتے ہیں جس کے پاس اتنا سامان نہیں کہ اپنی ضروریات پوری کر سکے اور نہ لوگوں کو اس کی خبر ہے کہ صدقات و خیرات ہی کا مستحق سمجھا جائے۔

گردنوں کے آزاد کرنے میں روپیہ صرف کرنا بھی ضروری ہے۔ اگرچہ عام مفسرین نے اس کے معنی کو صرف غلاموں کے آزاد کرنے تک محدود کر دیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کا مطلب عام ہے اور اس کی عمومیت میں نہ صرف غلام ہیں، بلکہ وہ لوگ بھی شامل ہیں جو قرض لے کر سودر سود میں مبتلا ہیں، پھر اس سے بھی بڑھ کر اس کا اعلیٰ ترین مفہوم یہ ہے کہ ایک مسلمان جب شہداء اعلیٰ الناس کی فضیلت کبریٰ کے لئے مخصوص کیا گیا ہے تو اس کا فرض ہے کہ دنیا کی ہر غلام و محکوم قوم کو آزاد کر کے اس کو حق آزادی نوازش کرے اور یہ حق صرف مسلمان ہی کو پہنچتا ہے۔ اسی کو سورہ بلد میں مشکل ترین گھاٹی سے تعبیر کیا: **فَكَ رَقَبَةً** (البد ۱۳) پھر اس سے صرف سیاسی آزادی



ہی مراد نہیں بلکہ تمدنی، اخلاقی، عمرانی، اجتماعی اور علمی، سب افراد غلامی اس میں شامل ہیں اور سب سے آزاد کرنا فرزند اسلام کا فرض ہے۔

یہ نہ ہو کہ اوروں کو تیار کرتے کرتے اپنے آپ کو بھول جاؤ اور روپیہ خرچ کرنے پر قناعت کر بیٹھو، بلکہ خود بھی نماز اور زکوٰۃ کے پابند رہو تا کہ جانی و مالی قربانی کی مشق ہوتی رہے، اسی کے ساتھ پابندی عہد ضروری ہے ورنہ دوسروں کو تمہارے عہد و مواعیت پر اعتبار نہ ہو گا۔ قرآن نے ایقائے عہد پر بے انتہا زور دیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا: وَالَّذِينَ هُمْ لَا يُخَالِفُونَ عَهْدَهُمْ (المومنون ۸) یہودیوں پر لعنت کے نزول کا سبب، نقض عہد کو قرار دیا: وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ ۚ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا (بنی اسرائیل ۳۴) نصاریٰ میں بغض وعداوت صرف عہد پورا نہ کرنے کے باعث پھیل گئی۔ وَمِنَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نُنْصَرِي ۚ أَخَذْنَا مِيثَاقَهُمْ فَنَسُوا حَظًّا مِمَّا ذُكِّرُوا بِهِ ۚ فَأَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ (المائدہ ۱۳)۔

سیاست کے ابتدائی احکام میں یہ چیز بھی داخل ہے کہ خواہ فقر و تنگدستی ہو، علالت و بیماری ہو، خواہ میدان جنگ ہو اور لڑائی کی وجہ سے تکلیفوں اور مصیبتوں کا سامنا ہو، مقصد حیات کو اپنے ہاتھ سے نہ جانے دے۔ جن لوگوں نے ان فرائض کو اخلاص و حسن نیت سے ادا کیا، وہی ارباب صلاح و تقویٰ ہیں اور وہی دنیا کی امامت و پیشوائی کے مستحق۔

### فوجداری قانون

یہ عمومی احکام تھے اب حکومت کی جانب توجہ ہوتی ہے۔ گھر ایک چھوٹی سی حکومت ہے جس کا فرمانروا شوہر ہے، بیوی اور بچے اس کی رعایا ہیں۔ جب کبھی گھر میں لڑائی ہو تو شوہر کا فرض ہے کہ عدل و انصاف سے کام لے اور اپنی اولاد کو بہترین سیاست کی تعلیم دے، ان کے مناقشات باہمی کا ایسا فیصلہ کرے کہ کسی کو شکایت کا موقع نہ ملے۔ اگلی آیتوں میں ایسا قاعدہ کلیہ بیان کیا جاتا ہے جس سے تمام جھگڑے آسانی طے ہو سکتے ہیں اور پھر اسی قاعدہ کو ہم وسعت دیکر حکومت کے انتہائی فرائض میں شمول کر سکتے ہیں۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر فسادات ہوتے ہیں، اگرچہ ان کے اسباب بہت کثرت سے ہوں، مگر ان سب کی انتہا دو چیزوں پر ہوتی ہے: یا تو کسی کی عزت و حرمت برباد کرنے کے لئے اس کو ہلاک کیا جاتا ہے یا مال و دولت کی حرص اس کا سبب بن جاتی ہے۔ اس لئے قرآن حکیم نے قانون کے دو حصے کر دیئے: (۱) فوجداری (۲) دیوانی۔

سورہ بقرۃ کے ابتدائی اور اق میں تم پڑھ آئے ہو کہ فرعون نے بنی اسرائیل کی مختلف جماعتیں بنادی تھیں، ان کو آپس میں لڑاتا رہتا تھا، تا کہ ان کی خانہ جنگی سے اس کی حکومت اور زیادہ محکم ہو جائے۔ فوجی طاقت کو فنا کرنے کے لئے لڑکوں کو ذبح کرتا اور اس طرح اخلاقی قوت بھی تباہ ہو جاتی۔ اس صورت میں لڑکیوں کیلئے عصمت فروشی کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ مناصب ملکی تو حکمران جماعت کے حصہ میں آتے اور تمام ذلیل ترین عہدوں پر بنی اسرائیل کو مقرر کیا جاتا۔

لیکن قرآن اس طرز حکومت کا شدید ترین دشمن ہے۔ اس کی تباہی و بربادی کے لئے موسیٰ عمران بھیجا جاتا ہے کہ جمہوریت صالحہ اور حکومت عادلہ کے قیام کے لئے بنی اسرائیل کو تیار کرے۔ اسلام چاہتا ہے جس طرح شوہر اپنے گھروالوں پر حکمرانی کرتا ہے۔ ان کی اصلاح و تہذیب اس کا اولین مقصد ہوتا ہے، دن رات ان کی ترقی کی فکر دامن گیر رہتی ہے، اور جب ان میں قابلیت و استعداد دیکھتا ہے تو فوراً ان کے لئے جگہ خالی کر دیتا ہے، ایسے ہی مسلمان اپنے گھروں سے باہر نکل کر قوموں اور ملکوں پر حکومت کریں گے۔ اس طرز حکومت کا نتیجہ یہ ہوا کہ باوجودیکہ مختلف ممالک میں اب مسلمانوں کی حکومت نہیں رہی، مگر ان کا تمدن، ان کی تہذیب اور ان کی زبان کی ہمہ گیری اب تک وہاں کے آثار باقیہ میں سے ہیں اور باوجود سخت کوشش کے کوئی ہاتھ ان کو مٹانہ سکا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلِ ۚ الْحَرُّ بِالنُّصْرَةِ وَالْعَبْدُ بِالنُّصْرَةِ ۚ فَتَنَ عُفَىٰ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعُ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ۚ ذَٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۚ فَتَنَ اخْتَلَا بِعَدُوِّكَ فَلَمْ يَدَّأِبْ أَلَيْسَ ۖ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَوةٌ لَّيْلًا وَلِيَ الْأَنْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿٥٠﴾

”مسلمانو! مقتولین کے بارہ میں تم پر مساوات لازم کر دی جاتی ہے۔ آزاد کے بدلے آزاد اور غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت، پھر جس کو اس کے بھائی سے کوئی حصہ معاف کر لیا جائے تو معقول طور پر مطالبہ کرنا اور خوبی کے ساتھ اس کے پاس پہنچا دینا، یہ تمہارے رب کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے۔ پھر جس نے اس کے بعد زیادتی کی تو اس کے لئے دردناک عذاب ہے۔ اور اے عقلمندو! تمہارے لئے مساوات ہی میں زندگی ہے تاکہ تم متقی بن جاؤ۔“

زمانہ جاہلیت میں دستور تھا کہ طاقتور قومیں کمزوروں سے پورا قصاص لے کر بھی راضی نہ ہوتی تھیں اور نہ قصاص دینے والے شرافت اور دیانت کا خیال رکھتے۔ اگر ایک آزاد اور شریف آدمی کو غلام مار ڈالتا تو وہ اس کی جگہ شریف آدمی کو قتل کرنے کی کوشش کرتے۔ قاتل اگر عورت ہوتی تو پھر بھی عورت کے قتل پر قناعت نہ کرتے، بلکہ اس کا سلسلہ دراز تر ہوتا جاتا۔ اسلام نے آکر اس قسم کی تفریق کو بالکل مٹا دیا اور فرمایا کہ مساوات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ قصاص کے معنی مساوات اور مماثلت فی القتل کی ہیں۔ کما صرح بہ الخازن۔

قرآن حکیم کا دستور یہ ہے کہ وہ ایک قانون کلی بیان کر دیتا ہے اور عام طور پر جزئیات کو ذکر نہیں کرتا۔ مگر چونکہ بعض اوقات قانون آسانی سے سمجھ میں نہیں آسکتا، اس لئے اس کو اور زیادہ واضح کرنے کے لئے بعض ضروری مسائل بیان کر دیتا ہے کہ کسی قسم کا خفا باقی نہ رہے۔ چنانچہ یہاں بھی مقتولین کے بارے میں مساوات کا قانون ذکر کر کے اس کی بعض اصولی جزئیات کو بیان کر دیا کہ، اگر قاتل آزاد ہے تو اسی سے قصاص لیا جائے، غلام نے قتل کیا تو وہی سزا کا مستحق ہے اور عورت ہے تو وہی عقوبت کی مستوجب۔

قانون تو وہی تھا جس کا اوپر ذکر کیا گیا، مگر بعض اوقات مقتول کے وارث اس مقدمہ کو قابل معافی خیال کرتے ہیں یا اس جرم کو اتنا خفیف سمجھتے ہیں کہ بجائے قصاص کے صرف فدیہ پر راضی ہو جاتے ہیں۔ تو اسلام اس وقت نرمی کرنے کے لئے تیار ہے۔ قاتل کو خون بہا ادا کرنا ہوگا، مگر اس میں شرط یہ ہے کہ فدیہ وصول کرتے وقت سختی سے کام نہ لیا جائے اور قاتل کے لئے ضروری ہے کہ وہ شریفانہ طور پر تمام رقم ادا کرے، نہ تو مقدار میں کمی کرے اور نہ خواہ مخواہ ٹالتا رہے۔

بنی اسرائیل میں جرمانہ کا دستور نہ تھا بلکہ قاتل ہی قتل ہوتا تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے ساتھ لطف و نوازش کا برتاؤ کیا اور سزا میں تخفیف کر دی، ورنہ سزائے قتل کے سوا اور کوئی صورت ہی نہ ہوتی۔ جرمانے سے فائدہ یہ ہوگا کہ مقتول کے وارثوں کو جس قدر نقصان پہنچا ہے، اس کی ایک حد تک تلافی ہو جائے گی اور فقر و تنگدستی سے بچ جائیں گے، اگر اس قدر رعایت کے بعد بھی کسی نے ظلم وعدوان سے کام لیا، قتل کا جھوٹا دعویٰ کر دیا یا معاف کر کے دوبارہ خون کا مطالبہ کیا تو اس سے قانونی مواخذہ ہو گا اور حکومت مداخلت کرے گی۔

مسلمانوں کی ترقی کا لازمی مساوات میں پوشیدہ ہے۔ جو قوم سپاہیانہ زندگی کی خوگر ہو، جسے دنیا کی امامت و پیشوائی کے لئے منتخب کیا گیا ہو، جو دنیا اور آخرت میں اعمال و اخلاق کے اعتبار سے فضیلت و برتری کی لئے جن لی گئی ہو، وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتی جب تک اس کے تمام افراد کو برابر کے حقوق نہ دیئے جائیں، کہ ہر ادنیٰ ترین مسلمان انتہائی ترقی کے لئے اپنے آپ کو تیار کر سکے۔ ایک دوسرے سے بڑھنے کی غرض سے بہترین اخلاق و اعمال کی عادت ڈال سکے، جب تمام افراد ملت میں یہ جوش و ولولہ عمل پیدا ہو جائے گا تو کوئی قوم ان کا مقابلہ نہ کر سکے گی۔

### ضابطہ دیوانی

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدُكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَٰلِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۚ حَقًّا عَلَى  
الْمُتَّقِينَ ۖ فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَبِيحٌ عَلِيمٌ ﴿٧٠﴾ فَمَنْ  
خَافَ مِنْ مُّوَسَّعٍ أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٧١﴾

”جب تم میں سے کسی کو موت کا وقت نزدیک معلوم ہو اور کچھ مال چھوڑنے والا ہو تو اس پر لازم ہے کہ ماں باپ اور رشتہ داروں کے لئے دستور کے مطابق وصیت کر جائے، متقین پر یہ ایک قسم کا حق ہے۔ پھر جو وصیت سن لینے کے بعد اسے بدل دے، تو اس کا گناہ ان لوگوں پر ہے جو اسے بدل دیں۔ بیشک اللہ سننے والا جاننے والا ہے، البتہ جس شخص کو وصیت کر نیوالے کے طرف سے طرفداری یا جرم کا اندیشہ ہو اور وہ ان میں صلح کر اے تو پھر اس پر کوئی گناہ نہ ہو گا۔ بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔“

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے قرآن میں جن پانچ آیتوں کو منسوخ تسلیم کیا ہے، ان میں سے پہلی یہی ہے۔ ان کا

خیال یہ ہے کہ چونکہ سورہ نساء میں وارثوں کے حصے معین کر دیئے گئے ہیں، اس لئے وصیت کا حکم منسوخ ہو گیا۔ آیت یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثلاً حظ الانثیین الخ کو نسخ قرار دیتے ہیں اور حدیث لا وصیة لوارث اس نسخ کو اور زیادہ واضح کرتی ہے، لیکن ہمارے نزدیک یہ آیت منسوخ نہیں ہو سکتی بلکہ اب بھی واجب العمل ہے اور اس کے لئے حسب ذیل دلائل ہیں۔

(۱) قرآن حکیم نے جن مواقع میں وارثوں کے حصے معین کئے ہیں وہاں من بعد وصیة کے الفاظ بھی ساتھ ساتھ آتے ہیں۔ دیکھئے بھائیوں کے ہوتے ہوئے جب ماں کا چھٹا حصہ مقرر کیا تو یہ شرط لگادی کہ ان حصوں کے مطابق تقسیم اس وقت ہوگی جبکہ وصیت پر عمل ہو چکا ہوگا: فَإِنْ كَانَ لَكَ إِخْوَةٌ فَلِأَمِّهِ الشُّدُسُ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةِ يُوصِي بِهَا (النساء ۱۱) اس کے بعد کی آیات بھی دیکھ لیجئے۔ فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمْ الرُّبُومُ وَمِمَّا تَرَكْنَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةِ يُوصِيْنَ بِهَا (النساء ۱۲) فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّلُومُ وَمِمَّا تَرَكْتُمْ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةِ تُوصُونَ بِهَا (النساء ۱۲) فَإِنْ كَانُوا أَكْثَرًا مِنْ ذَلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُومِ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةِ يُوصِيْنَ بِهَا (النساء ۱۲) ان تمام آیات میں حصص بیان کئے گئے ہیں، مگر ہر آیت کے آخر میں من بعد وصیة کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ وصیت جائز قرار دی گئی ہے۔

(۲) نزول کے اعتبار سے سورہ مائدہ سب سے آخر میں نازل ہوئی ہے۔ اس میں فرمایا: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهِادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ أَحَدُكُمْ الْمَوْتُ حِينَ الْوَصِيَّةِ اِثْنَانُ ذَوَا عَدْلٍ مِنْكُمْ اَوْ اَخْرَجَ مِنْ غَيْرِكُمْ (المائدہ ۱۰۶) جب موت کا وقت آجائے اور وصیت کرنے لگو تو دو عادل شخصوں کو اپنی وصیت کا گواہ بنالو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سورہ مائدہ نے بقرہ کے حکم وصیت کو بدستور قائم رکھا۔

(۳) بخاری نے کتاب الوصایا میں سعد بن ابی وقاص سے روایت کیا ہے کہ: وہ قیام مکہ کے دوران میں بیمار ہو گئے، رسول اللہ ﷺ ان کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے اور آپ اس امر کو نا پسند فرماتے تھے کہ ایک مسلمان مکہ سے ہجرت کرنے کے بعد پھر اسی جگہ مرجائے۔ آپ نے سعد کے حق میں دعا کی تو سعد نے عرض کیا: یا رسول اللہ اوصی بھالی مکہ قال لا قلت فالشط قال لا قلت فالثلث قال لا قلت فالثلث کثیر انک ان تدع ورثتک اغنیاء خیر من ان تدعهم عالة یتکفون الناس فی ایدیہم وانک مہمبا انفق من نفقة فانہا صدقة حق القمۃ التقی ترفعها الی فی امراتک، سعد بار بار آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ اپنا تمام مال و متاع خدا کی راہ میں صرف کر دوں، مگر آپ روکتے ہیں تا آنکہ تہائی مال کی وصیت کی اجازت مل جاتی ہے، اس کی وجہ آپ یہ فرماتے ہیں کہ وارثوں کو غریب و تنگ دست چھوڑنے سے دولت مند رہنے دینا زیادہ بہتر ہے۔ اس حدیث میں چند باتیں قابل غور ہیں۔

(الف) مکہ مبارکہ ہجرت کے آٹھویں سال فتح ہوا ہے۔

(ب) سورہ بقرہ کی آیت زیر بحث اور نساء کی آیات ۸ سے قبل نازل ہو چکی تھیں۔

(ج) فتح مکہ تک وصیت والی آیت پر مسلمان برابر عمل کرتے تھے۔ کوئی شخص اس کو منسوخ تسلیم نہ کرتا تھا۔ سعد کو وصیت کرنے سے روکتا کہ جب آیت وصیت منسوخ ہو چکی ہے تو تمہیں وصیت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں، مگر آپ یہ نہیں فرماتے، بلکہ آپ کا اصرار یہ ہے کہ ثلث میں وصیت کرو، کیونکہ اگر تمام مال فی سبیل اللہ خرچ کر دیا تو اہل و عیال بھوکے رہیں گے۔

پس ان تمام باتوں سے معلوم ہو گیا کہ زمانہ رسالت میں یہ آیت منسوخ نہ تھی اور تمام صحابہ کرام اس کو قابل عمل خیال کرتے تھے، البتہ اب یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ جب شریعت نے وارثوں کے حصے معین کر دیے ہیں تو پھر یہاں والدین اور رشتہ داروں کے ذکر کی کیا ضرورت تھی؟ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ والدین اور رشتہ داروں کو شریعت کے مطابق حصہ مل گیا، مگر وہ ان کے لئے بالکل ناکافی ہے، بڑھاپے اور ضعف کی وجہ سے کوئی کام بھی نہیں کر سکتے تو اس صورت میں اگر مرنے والا ان میں سے کسی کے لئے وصیت کر جائے تو شریعت اس کو پسند کرتی ہے۔ یا بعض اوقات یہ لوگ وارث نہیں بن سکتے، مثلاً وہ کافر ہیں تو ایسی حالت میں بھی ان کے لئے وصیت کر جانا شرعی نقطہ نظر سے پسندیدہ ہو گا۔ چنانچہ ابن عباس، حسن، مسروق، ضحاک اور مسلم بن یسار کا یہی مذہب ہے۔

ارباب تقویٰ کے لئے یہی مناسب ہے کہ اپنے والدین اور رشتہ داروں کا خیال رکھیں۔ کوئی شخص وصیت میں تغیر و تبدل کرنے کا مجاز نہیں، البتہ اگر وصیت کرنے والے نے حق تلفی کی ہو اور جائز وارثوں کو محروم کر دیا ہو تو حاکم اس میں مناسب تبدیلی کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اگر بدلنے میں حکومت سے نادانستہ غلطی ہو گئی تو اس کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے معاف کر دے گا۔ پس اگر وقف خلاف مصلحت ہے تو اس میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔

مذہبی تعلیم کی نشر و اشاعت

تدبیر منزل کا جس قدر قانون بیان کیا گیا ہے بظاہر اس کا تمام تر تعلق دنیا ہی سے معلوم ہوتا ہے ممکن ہے۔ بعض لوگ اس میں اتنا شغف اور انہماک پیدا کر لیں کہ اپنی زندگی کے اصلی مقاصد کو بالکل فراموش کر دیں، صرف اسی کو اپنا حقیقی مقصد قرار دے اور خیال یہ ہو کہ اپنے نصب العین کے کسب و حصول کی خاطر یہ تمام جدوجہد ہو رہی ہے، اس لئے ضروری ہو کہ ان کی توجہ کو دوسری طرف پھیر دیا جائے تاکہ یہ حقیقت ان کے سامنے رہے کہ تدبیر منزل کے ابتدائی فرائض کے علاوہ انہیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔

جب ایک شخص اپنے گھر والوں کے نان و نفقہ اور باقی تمام ضروریات زندگی کا ذمہ دار و کفیل ہے اور اس چار دیواری میں فرماں روائی کر رہا ہے تو اس کا صرف یہی فرض نہیں کہ اپنی اولاد کے لئے روپیہ کمائے، بلکہ اس سے یہ بھی سوال ہو گا کہ جن لوگوں کی باگ اس کے ہاتھ میں تھی، ان کی مذہبی تعلیم کا کیا انتظام کیا اور مذہب سے وابستگی پیدا کرنے کے لئے کونسے اسباب فراہم کئے؟ الا کلکم راع و کلکم مسؤول عن رعیتہ میں اسی حقیقت کو بے نقاب کیا ہے۔ آئندہ آیات میں

مذہبی تعلیم کی نشرو اشاعت کی جانب توجہ دلائی جائے گی، مگر اس بحث پر گفتگو کرنے سے قبل ان باتوں کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے:

(الف) ہر قوم کے لئے سال بھر میں جشن و مسرت کے اظہار کے لئے کوئی نہ کوئی دن مقرر ہوتا ہے، اس روز وہ اپنی شادمانی کا اظہار کرتی اور ضروریات زندگی سے آزاد رہتی ہے۔ اس دن کو عید سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس تاریخ میں یا تو اللہ تعالیٰ نے اس پر کوئی اعلیٰ ترین نعمت نازل کی تھی یا اسے کسی شدید ترین عذاب سے نجات دی تھی۔ یہود و نصاریٰ مشرک و مجوس اور دوسرے مذاہب صرف ان ایام میں عید مناتے ہیں جن میں وہ کسی خاص نعمت و کرامت سے سرفراز کئے گئے ہوں۔ ایک یہودی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اگر الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی والی آیت ہم پر نازل ہوتی تو اس روز کو ہم عید مناتے۔ حضرت عمر نے جواب دیا کہ ہمیں وہ دن خوب یاد ہے جس روز اس کا نزول ہوا اور وہ دن ہمارے لئے شریعت نے عید مقرر کر رکھا ہے اور وہ یوم الجمعہ ہے۔

رمضان میں قرآن کا نزول ہوا، جس نے تمام دنیا کو امن و سلامتی اور آزادی کا پیغام دیا، جس نے دنیا و آخرت کی بادشاہی کا اعلان کیا اور جس نے امت مسلمہ کو شہداء علی الناس کا مژدہ جاں فزا سنایا، پھر اس سے بڑھ کر مسلمانوں کے لئے اور کونسا دن مسرت و شادمانی کا ہو سکتا ہے؟ دنیا کے جملہ مذاہب کا روئے سخن اپنی ہی مخصوص قوموں کی طرف رہا، اس لئے ان کے پیروکار صرف ایک ہی روز عید کرتے رہے۔ مگر قرآن کی دعوت عالمگیر ہے۔ تمام اقوام عالم اس کے مخاطب ہیں اور اس کے اتباع دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس لئے پورا ایک مہینہ عید کے لئے مقرر کیا گیا، تاکہ نزول قرآن کی تذکار قائم رہے۔

(ب) ان ایام عیش و نشاط میں مسلمانوں کو زیادہ کام کرنے اور روزی کمانے کی ضرورت نہ ہوگی، بلکہ ان کا بیشتر حصہ اسی مسرت و شادمانی میں صرف ہوگا۔ لیکن اگر محض عید ہی رہتی تو ممکن تھا کہ لوگ افراط و تفریط میں مبتلا ہو کر بد عملی و بطالت کے مرتکب ہوتے اور آخر تمام قوم فنا ہو جاتی، اس لئے خوشی کے ساتھ ساتھ ایک عبادت بھی لازم کر دی گئی تاکہ تدبیر منزل میں مشغول ہونے کی وجہ سے ان کی ملکیت اور روحانیت میں جس قدر کمی ہو گئی ہے اس طرح پوری ہو۔ اور اپنی اصلی حالت پر عود کر آئے۔ ان ایام فراغت میں قرآن پڑھو، گھر والوں کو تعلیم دو اور اگر اتنی قابلیت نہ ہو تو دوسروں سے سنو اور بال بچوں کو سننے کے لئے لے جاؤ۔

(ج) اندیشہ تھا کہ چونکہ رمضان میں ضروریات ایک حد تک خود بخود کم ہو گئی ہیں، کھانا بھی صرف دو ہی مرتبہ کھایا جاتا ہے، کہیں بخل و امساک کا مرض لوگوں میں نہ پیدا ہو جائے جس سے قومی ترقی رک جائے گی، اس لئے رمضان کے آخر میں صدقۃ الفطر لازم کر دیا گیا۔

## روزہ کی فریضیت

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۱۸۷﴾

”مسلمانو! تم پر روزے ایسے ہی فرض کئے گئے ہیں جیسے تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے، تاکہ تم متقی بن جاؤ۔“

”صوم“ کے معنی لغت میں مطلق امساک کے آتے ہیں، خدا نے مریم کو حکم دیا کہ اگر تمہاری قوم کے لوگ تمہارے پاس آئیں اور بات چیت کرنے کے آرزو مند ہوں تو یہ جواب دینا: اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اَکَلِمَ الْیَوْمَ اِنْسِیًّا (مریم: ۲۶) یعنی میں نے آج کلام نہ کرنے کا روزہ رکھا ہے، مگر شریعت نے اس لفظ صوم کو بھی مخصوص معنی میں استعمال کیا ہے، یعنی الصوم فی الشہار عبارة عن الامساک عن الاکل والشرب والجماع فی وقت مخصوص وهو من طلوع الفجر الی غروب الشمس مع النیة، طلوع فجر سے غروب آفتاب تک طعام و شراب اور لذت جماع سے پرہیز کرنے کا نام روزہ ہے۔

دنیا کی ہر قوم میں روزہ رکھنے کا دستور ہے۔ عاشورہ کے دن حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو فرعون کے پنجہ قہر و استبداد سے نجات ملی تو یہودیوں نے اس دن کا روزہ رکھنا شروع کر دیا۔ عیسائیوں میں روزہ رکھنے کا قانون تھا، مگر انہوں نے کفارہ کی آڑ پکڑی اور تمام اعمال صالحہ سے الگ ہو گئے۔ روزوں کے متعلق کتاب مقدس کی حسب ذیل آیات ملاحظہ ہوں: ”اور چالیس دن اور چالیس رات فاقہ کر کے آخر کو اسے بھوک لگی“ (۴:۲) دوسری جگہ آیا: ”اور جب تم روزہ رکھو تو ریاکاروں کی طرح اپنی صورت اوداس نہ بناؤ، کیونکہ وہ اپنا منہ بگاڑتے ہیں تاکہ لوگ انہیں روزہ دار جانیں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ، وہ اپنا اجر پانچے بلکہ جب تو روزہ رکھے تو اپنے سر میں تیل ڈال اور منہ دھو، تاکہ آدمی نہیں بلکہ تیرا باپ جو پوشیدگی میں ہے تجھے روزہ دار جانے، اس صورت میں تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے، تجھے بدلہ دے گا“ (متی ۶: ۱۷، ۱۸، ۲۱، ۲۳) اور انہوں نے اس سے کہا کہ یوحنا کے شاگرد اکثر روزہ رکھتے اور دعائیں مانگا کرتے ہیں اور اس طرح فریسیوں کے بھی، مگر تیرے شاگرد کھاتے پیتے ہیں، یسوع نے ان سے کہا، کیا تم برائیوں سے جب تک دلہا ان کے ساتھ رہے روزہ رکھو سکتے ہو؟ مگر وہ دن آئیں گے اور جب دلہا ان سے جدا کیا جائے گا تب ان دنوں میں وہ روزہ رکھیں گے۔“ (لوقا ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴)

لعلکم تتقون۔ میں روزہ کی حقیقت اور اس کے فلسفہ کو واضح کیا کہ اس سے صحت و تندرستی پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ غریب لوگوں کی حالت سے اُمرا عملی طور پر باخبر ہوتے ہیں، شکم سیروں اور فاقہ مستوں کو ایک سطح پر کھڑا کر دینے سے قوم میں مساوات کے اصول کو ترقی ہوتی ہے، قوائے ملکیہ میں قوت، اور حیوانی خواہشوں میں کمزوری پیدا ہوتی ہے۔ خدا تر سی کی طاقت انسان کے اندر محکم و استوار ہوتی ہے۔ گرمی کا موسم ہے۔ سخت پیاس لگ رہی ہے، تنہا مکان میں ٹھنڈا پانی رکھا ہے، مگر نہیں پیتا۔ روزہ دار کو سخت بھوک لگی ہوئی ہے۔ بھوک کی وجہ سے جسم میں ضعف بھی محسوس کرتا ہے، کھانا



موجود ہے، دیکھنے والا کوئی نہیں، مگر نہیں کھاتا، دل پسند بیوی پاس بیٹھی ہے۔ محبت کے جذبات دونوں میں موجزن ہیں، لیکن وہ اس سے احتراز کرتا ہے، اس لئے کہ خدا کے حکم کی عزت و حرمت اس کے دل میں گھر کر گئی ہے۔ اب کوئی دوسری قوت اس پر غالب نہیں آسکتی اور جب اس نے خدا کے حکم سے جائز حلال اور پاکیزہ خواہشات کو چھوڑنے کا اپنے آپ کو عادی بنالیا ہے تو حرام، ناجائز اور مکروہ عادتوں کے چھوڑنے میں اسے کوئی دقت محسوس نہ ہوگی۔ یہی وہ اخلاقی پاکیزگی ہے جس کا روزہ دار کے اندر پیدا کر دینا شرع کا مقصود اصلی ہے۔ حدیث میں آتا ہے: **مَنْ لَمْ يِدْعَ قَوْلَ الزُّورِ وَالْعَمَلِ بِهِ فَلَيْسَ لِلَّهِ حَاجَةٌ أَنْ يَدْعَ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ**، اگر ایک روزہ دار جھوٹ کہنا، لغو بکنا اور فضول کاموں کو نہیں چھوڑتا تو خدا کو اس کے کھانا پینا چھوڑ دینے کی پروا نہیں۔ دوسری حدیث میں آتا ہے: **إِذَا كَانَ يَوْمَ صَوْمِ أَحَدِكُمْ فَلَا يِفْثُ وَلَا يَضْحَكُ وَلَا يَنْسَابُ أَحَدٌ فَلْيَقُلْ إِنِّي أَمْرٌ عَصَائِمٌ**، جب کوئی شخص کسی دن روزہ رکھے تو نہ کوئی بیہودہ لفظ زبان سے نکالے اور نہ شور و شغب کرے اور اگر کوئی شخص اس کو گالی دے تو کھدے میں روزہ دار ہوں، گالی دینا اور جھگڑنا مجھے شایان نہیں۔

تقویٰ و طہارت، ورع و پاکیزگی اور توبہ و انابت الی اللہ کا ذریعہ یہی روزہ ہے۔ عزم و استقلال، صبر و تحمل اور ثبات قدم اسی سے پیدا ہوتا ہے۔ جنگ میں کامیابی کا ذمہ دار یہی ہے اور اسی لئے ہرمان طالوت چلتے چلتے نہر کے کنارہ پر رہ گئے، کیونکہ انہیں روزہ کی عادت نہ تھی، سفر کی تکالیف، بھوک اور پیاس کی شدت کو برداشت نہ کر سکے اور اس لئے طالوت نے ان کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔

### صدقۃ الفطر

**أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ ۖ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مَسْكِينٍ ۖ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ ۚ وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۱۸۵﴾**

”وہ گنتی کے چند دن ہیں پھر جو شخص تم میں بیمار ہو یا سفر میں تو دوسرے دنوں سے شمار پورا کر دے اور جو لوگ کھانا دینے کی طاقت رکھتے ہوں ان پر ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا ہے اور جو شخص اپنی خوشی سے نیک کام کرے تو یہ اس کے حق میں

بہتر ہے اور تم روزہ رکھو تو یہ تمہارے لئے اور بھی بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔“

”وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مَسْكِينٍ“ سے اکثر لوگ مختلف شبہات میں پڑ گئے اور غلط راہ اختیار کر لی، حالانکہ مطلب بالکل صاف تھا اور یہ غلط فہمی اس لئے پیدا ہوئی کہ انہوں نے روزہ کی حقیقت کو بالکل نظر انداز کر دیا اور یہ سمجھ گئے کہ شریعت کے احکام بغیر کسی علت اور مصلحت کے ہوتے ہیں۔ اس آیت میں ”فِدْيَةُ طَعَامِ مَسْكِينٍ“ مبتدا مؤخر ہے اور ”عَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ“ اس کی خبر مقدم، طعام مسکین، فدیہ سے بدل واقع ہو رہا ہے اور یطیقونہ کی ضمیر طعام مسکین کی طرف راجع ہے۔ مطلب یہ ہو گا کہ روزہ ایک مستقل عبادت ہے اور اس سے مقصد یہ ہے کہ انسان کے اندر چند اخلاق فاضلہ پیدا ہوں، لیکن بالکل ممکن ہے کہ باوجودیکہ روزہ اصلی معنوں میں رکھنے کی کوشش کی جائے اور پھر بھی کسی نہ کسی قسم



کی کوتاہی سرزد ہو اور ہمیں اطلاع تک نہ ہو۔ بعض لوگوں کو یہ خیال پیدا ہو کہ روزہ کی وجہ سے ہمارے مصارف تو ویسے ہی کم ہو گئے ہیں، کچھ اور زیادہ کفایت شعاری کریں اور پھر آہستہ آہستہ بخیل بن جائیں۔ ان امراض کو روکنے کے لئے شریعت نے یہ لازم کر دیا کہ ارباب دولت و ثروت روزہ رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک مسکین کا کھانا بھی اللہ کے نام پر دیدیا کریں تاکہ بخل کا مرض نہ پیدا ہو۔

لیکن اگر یہی حکم رہتا کہ ہر روز ایک مسکین کو کھانا دیدیا کرو تو رمضان میں دگنی محنت کرنی پڑتی۔ تمام دن کام میں مصروف رہنا پڑتا اور قرآن میں غور کرنے کا موقع نہ ملتا، اس لئے شریعت نے یہ قانون بنا دیا کہ رمضان ختم ہوتے ہی عید کی نماز پڑھنے سے پہلے فقر و مساکین میں تقسیم کر دو۔ چاہئے تو یہی تھا کہ ہر روزہ کے مقابلہ میں ایک مسکین کا کھانا دیا جاتا، مگر شارع نے اس کثرت کا یہ علاج کیا کہ: ان رسول اللہ ﷺ فرض زکوٰۃ الفطر صاعاً من تمر و صاعاً من شعیر علی کل حرا و عبد ذکرا و انثی من المسلمین، ہر ایک صاحب استطاعت مسلمان اپنے اہل و عیال، بال بچوں اور لونڈی غلام کی جانب سے صدقۃ الفطر ادا کرے۔

اس صورت میں کثرت بھی محفوظ رہی اور فرض بھی ادا ہو گیا۔ قاعدہ تو یہی ہے کہ وہ صدقۃ الفطر ایک مسکین کا کھانا ہو لیکن اگر ایک شخص اس سے زیادہ صرف کرنا چاہتا ہے تو شریعت کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں، بلکہ یہ اس کے حق میں مفید ہو گا۔

بیشک روزہ رکھنا مشکل کام ہے، مگر تمہارے لئے یہی بہتر ہے کیونکہ جو طہارت و پاکیزگی اسلام کے پیش نظر ہے اس کے بغیر تم میں نہیں پیدا ہو سکتی اور آئندہ ارتقائے ملت کے لئے تمہیں جس قدر تکلیفوں اور مصیبتوں کو برداشت کرنا ہو گا ان کے لئے ابتدا ہی سے تیار رہنا ضروری ہے، کہ عادت پڑ جائے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَن شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدٰكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٢٨﴾

”رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو لوگوں کے لئے ہدایت ہے اور فرقان کی کھلی کھلی باتیں ہیں، پھر تم میں سے جو شخص اس مہینے میں زندہ ہو وہ ضرور روزے رکھے اور جو بیمار ہو یا سفر میں ہو تو گنتی کے دوسرے دن پورے کر لے، اللہ تمہارے ساتھ آسانی کرنا چاہتا ہے اور تمہارے ساتھ تنگی نہیں کرنا چاہتا اور تاکہ تم لوگ اس شمار کو پورا کرو اور اس بات پر اللہ کی بزرگی بیان کرو کہ اس نے تم کو ہدایت دی اور تاکہ تم شکر گزار بن جاؤ۔“

جس ماہ مقدس میں تمہیں حکم دیا گیا ہے کہ اپنے گھروں میں مذہبی تعلیم کی نشر و اشاعت کے لئے کمر بستہ ہو جاؤ، وہ یہی رمضان کا مہینہ ہے۔ اسی میں قرآن کا نزول ہوا، جس کی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

(الف) نوع انسانی کے لئے سرچشمہ رشد و ہدایت ہے۔

(ب) ہدایت و رہنمائی کے وہ اصول و ضوابط جو نظر و فکر کے محتاج ہیں، قرآن حکیم نے ان کو اس طرح کھول کھول کر بیان کیا ہے کہ بدیہی معلوم ہونے لگتے ہیں اور ہر شخص آسانی سے ان کو سمجھ لیتا ہے۔

(ج) جو لوگ اس کتاب عزیز کے درس و مطالعہ میں مصروف ہوں ان کی قوت فیصلہ اور زیادہ زبردست ہو جاتی ہے، حق و باطل میں تمیز کرنے لگ جاتے ہیں، علمائے سواور جاہل صوفیوں کے دھوکے میں نہیں پھنستے۔

یہ ماہ مقدس قرآن حکیم کے نزول کی سالگرہ کا مہینہ ہے، دوسری جگہ آیا: **إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ** (القدر) سورہ دخان میں اس کی نسبت فرمایا: **إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ مُبْرَكَةٍ** **إِنَّا كُنَّا مُنْذِرِينَ** ﴿۱﴾ **فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ** ﴿۲﴾ (الدخان ۴، ۳) ان دونوں آیتوں سے مراد یہی ہے کہ رمضان میں قرآن کا نزول ہوا، اس لئے ہر وہ مسلمان جو اس مہینہ میں زندہ ہو ضرور روزہ رکھے کہ جشن و مسرت کا اظہار ہو۔ البتہ مرض اور سفر کی حالت میں رخصت دی جاسکتی ہے کہ بعد کو اس کی کوپورا کر لیا جائے۔ ایک طالب علم کا فرض تو یہی ہے کہ باقاعدہ کالج میں حاضر ہو، لیکن اگر کسی ضرورت سے نہ آسکے تو اسے گھر پر سبق کو تیار کرنا ہو گا تا کہ باقی طالب علموں کے ساتھ درس میں شریک ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں کسی تکلیف میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ بلکہ وہ تمہاری سہولت و آسانی کو ہمیشہ پیش نظر رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے سفر اور مرض میں رخصت دیدی۔ اگر غور سے کام لو تو یہ حقیقت تم پر واضح ہو جائے گی کہ تمہاری انفرادی و اجتماعی زندگی کے لئے اس سے بہتر کوئی دوسرا قانون نہیں ہو سکتا، تم اس پر عمل کر کے دائمی زندگی حاصل کر لو گے۔ اس تکلیف کے برداشت کرنے سے تمہارے لئے صد ہا سہولتوں اور آسانیوں کے دروازے کھل جائیں گے۔ پس اس کو تکلیف کون کہے گا؟ جس کا نتیجہ فضیلت علی العلمین اور خلافت ارضی ہو۔ یہ ایک ایسی نعمت ہے جو صرف تمہارے لئے مخصوص کر دی گئی ہے اور اس پر تم جس قدر بھی اس کی تجید و تقدیس بیان کرو کم ہے۔

اس قانون پر عمل کرنے کا ایک نتیجہ یہ نکلے گا کہ تم میں عملی قوت پیدا ہو جائے گی، تمہاری مخفی قوتیں منصفہ شہود پر جلوہ افروز ہوں گی، جوش و ولولہ عمل پیدا ہو گا۔ قرآن کو اپنے ہاتھ میں لے کر دنیا بھر میں اس کی نشر و اشاعت کرو گے اور کوئی بڑی سے بڑی قوت تمہاری راہ میں مزاحم نہ ہوگی۔

ممکن ہے دن بھر روزہ رکھنے کی وجہ سے قرآن کی تلاوت نہ ہو سکے، اس لئے شارع نے رات معین کر دی کہ کھانے پینے سے طبیعت سیر ہو جائے گی، دن بھر جس قدر قوتیں مضحل ہو چکی ہیں عود کر آئیں گی اور رات کو اطمینان کے ساتھ پڑھ سکیں گے۔ آپ نے فرمایا: ”من قام رمضان ایامنا واحتسا باغفرله ماتقدم من ذنبه“۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا دستور تھا کہ رمضان کے ایام میں جبرئیل کے ساتھ قرآن کا دور کیا کرتے تھے اور وفات کے قریب آپ نے دو مرتبہ دور کیا۔ گویا اگر ایک شخص رمضان میں ایک مرتبہ قرآن سن لے تو اس نے نصاب پورا کر لیا۔

## روح مذہب کی پابندی

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِلَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ

(۷۷)

”اور جب میرے بندے تم سے میرے متعلق دریافت کریں تو میں ان کے قریب ہی ہوں۔ جب کبھی مجھ سے کوئی دعا کرے تو ہر دعا کر نیوالے کی درخواست کو میں قبول کرتا ہوں، پس انہیں چاہئے کہ میرے احکام مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ وہ رشد و ہدایت حاصل کریں۔

گذشتہ آیات میں قانون کی ظاہری شکل و صورت پر زور دیا گیا کہ اس کی پابندی کے بغیر کوئی جذبہ صادقہ نہیں پیدا ہو سکتا، اب اس کی حقیقت و اصلیت کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔ کیونکہ اگر محض اشکال و صورت پر نظر ہو اور مقصد کی جانب سے غفلت و بے اعتنائی اختیار کی جائے تو نتائج و ثمرات کے نکلنے کی کوئی توقع نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ قرآن نے اس موضوع پر مختلف درس دیئے ہیں، مگر سورہ تکوین کا اثر ایک جامع و حاوی درس ہے۔ لن ینال اللہ لھومھا ولا دماؤھا ولکن ینالہ التقویٰ منکم میں اسی طرف اشارہ ہے۔

مذہب کی روح و حقیقت یہ ہے کہ انسان سب سے کٹ کر صرف ایک اللہ کا ہو کر رہے۔ اسی سے اپنی ہر مراد مانگے اور اسی کے آگے دست سوال دراز کرے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (الذریٰۃ ۵۶) اس کی زندگی اور موت اس کا اقدام و ادبار اس کی عبادت اور قربانی اسی کے لئے ہو، إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱﴾ لَا شَرِيكَ لَهُ ۚ وَبِذَلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ (الانعام ۱۶۳، ۱۶۴) ایام رمضان میں روزوں کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ چونکہ ان ایام میں قرب الہی کی راہیں کھل جاتی ہیں، اس لئے تم خدا سے دعا کرو، تَنْزِيلُ الْمَلَكَةِ وَ الزُّوْمُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ أَمْرٍ ﴿۵﴾ سَلَّمَ (القدر ۵۳)، سورہ دخان میں اسی لیلہ مبارکہ میں قرآن حکیم کے نزول کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ ۚ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۶﴾ (الدخان ۶) حدیث میں آتا ہے: ینزل ربنا کل لیلۃ الی السماء الدنیا حین یتیقی ثلث الدلیل بالاخر فیقول من یدعون فاستجب لہ من یسألنی فاعطیہ ومن یستغفرنی فاغفر لہ، ”ہر شب کے آخری ثلث میں خداوند قدوس آسمان دنیا پر نزول اجلال فرما کر اعلان کرتا ہے، کوئی مانگنے والا ہے کہ اس کی دعا کو استجاب بخشوں، سوال کرنے والا کہ اس کو نوازش کروں اور طلب مغفرت کے لئے کوئی مضطرب روح کہ اس کو تسکین دوں۔“

تمام مذاہب و ادیان کی اصل و اساس یہی دعا ہے۔ ہر ملک اور ہر زمانہ کے نیک لوگوں اور راست بازوں نے اپنے مقاصد مہمہ محض اس دعا کی بدولت حاصل کئے ہیں، جب تمام ظاہری اسباب و وسائل ناکام رہے تو دعائے گرہ کشائی کی اور ان کی تمام تکالیف و مصائب دور ہو گئیں۔ انبیائے کرام کی کامیابی کا راز اسی میں پنہاں تھا، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: الدعاء مخ العبادۃ، ”دعا حاصل عبادت اور عصارہ بندگی ہے۔“ دوسری روایت میں آیا کہ: الدعاء هو العبادۃ، مگر

اس کے متعلق حسب ذیل امور کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

(الف) دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ہم اسباب و وسائل سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ دعا بھی ان میں سے ایک سبب ہے، اس کی بدولت بعض ایسے آسان و سہل ترذریعوں کی اطلاع ہو جاتی ہے جو اب تک ہم پر مخفی تھے۔

(ب) ہم اللہ کو حاکم علی الاطلاق تسلیم کر کے دعا مانگتے ہیں، اس لئے ضروری نہیں کہ ہر دعا قبول ہو، کیونکہ بالکل ممکن ہے کہ اس دعا کی قبولیت ہمارے حق میں مضر ہو۔ ایک جگہ فرمایا: بَلْ اِتَاٰكَ تَدْعُوْنَ فَيَنْكُشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَاءَ (الانبیاء ۴۱) حدیث میں آتا ہے: ما من احد يدعوا لالا اتاه الله ما سال او كف عنه من السوء مثله ما لم يدع باثم او قطعية رحم، “جب تک ایک شخص کسی گناہ یا قطع رحم کی دعا نہ کرے اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول کرتا ہے، جو مانگتا ہے اس کو دیتا ہے یا اس سے کسی برائی کو روکتا ہے، ابو داؤد نے سلمان سے روایت کیا ہے: ان ربکم محی کریم یستجی من عہدہ اذا رفع الیہ یدیہ ان یردہما صفرا خالیین، “اللہ تعالیٰ اس درجہ باحیا اور کریم ہے کہ وہ کسی دعا کرنے والے کو خالی ہاتھ واپس نہیں کرنا چاہتا۔“

مگر قبولیت دعا کے لئے شرط یہ ہے کہ قلب غافل اور بے پروا دل نہ ہو۔ ترمذی نے ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے: ادعوا للہ واتم مواظبون بالاجابۃ، واعلموا ان اللہ لا یرد دعا من قلب غافل لاه، ایک اور حدیث میں آتا ہے: یرد دعا من لا یرد دعا من قلب غافل لاه۔

(ج) بعض دعاؤں کے قبول نہ ہونے کی وجہ سے یہ کہنا غلط ہے کہ دعا کا کوئی فائدہ نہیں، ہم حالت مرض میں دوا کا استعمال کرتے ہیں، بسا اوقات دوا مفید نہیں ہوتی مگر علاج ترک نہیں کرتے، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ دعا قبول نہ ہونے پر اس کو ترک کر دیا جائے۔ ترمذی میں ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں: من لم یسأل اللہ یرفع علیہ۔

(د) اگر ہم کسی کو بتانا چاہیں کہ کھیتی کس طریق پر ہوتی ہے؟ اور پودے کس طرح پھل دیتے ہیں؟ تو اس کو مخصوص موسم ہی میں دکھائیں گے۔ ایسے ہی دعا کے بھی آداب و مراسم اور خاص مواقع ہیں جن میں اس کو شرف اجابت بخشا جاتا ہے۔ گذشتہ روایات میں بعض شرطوں کا تذکرہ آگیا ہے۔ اسی ذیل میں ایک اور حدیث بھی پیش نظر رکھ لیجئے! من ساء ان یرد دعا من عند اللہ عند الشدائد والکرب فلیکثر الدعاء فی الرخاء۔ جو شخص تکالیف و مصائب کے وقت اجابت دعا کا آرزو مند ہے، وہ فراخی و فارغ البالی کے ایام میں خوب دعا کرے۔ اس آیت کے آخری ٹکڑے نے بتا دیا کہ ہمارے قانون کی کامل فرماں برداری کرو گے تو دعا ضرور قبول ہو کے رہے گی۔

## اتباع قانون

روزہ کے دو مقاصد کا تذکرہ گذشتہ آیات میں کیا گیا ہے، اب تیسرے مقصد قانون کی پابندی پر بحث کی جاتی ہے۔ جو قانون صحیح اس کو دیا جائے بلاچوں و چرا اس پر عمل کرنے کو تیار ہو، تاکہ بد نظمی نہ ہونے پائے۔ اس جذبہ کی تربیت اور

مکمل حسب ذیل احکام سے کی جائے گی۔

أَحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَى نِسَائِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَهُنَّ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ فَالْآنَ بَاشِرُوهُمْ وَأَنْبِغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ أَتُوا الصِّيَامَ إِلَى الْآيِلِ وَلَا تَبَاشِرُوهُمْ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسْجِدِ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْزُوهَا كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لِنَاسٍ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿۱۸۵﴾

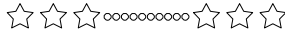
”روزہ کی شب میں اپنی بیویوں سے مشغول ہونا تمہارے لئے حلال کیا گیا۔ وہ تمہارا اوڑھنا بچھونا ہیں اور تم ان کے لئے لباس ہو۔ اللہ اس بات کو جانتا تھا کہ تم اپنے آپ کو خیانت میں مبتلا کرتے تھے تو اس نے تم پر مہربانی کی اور تمہارے گناہ کو معاف کر دیا تو اب ان سے مباشرت کرو اور جو خدا نے تمہارے لئے مقدر کر دیا ہے اس کو تلاش کرو اور جب تک تمہیں سفید خط صبح سے سیاہ خط سے متمیز ہو جائے اس وقت تک کھاؤ اور پیو، پھر رات تک روزہ پورا کیا کرو اور جس زمانہ میں تم مسجدوں میں اعتکاف کر رہے ہو اس وقت اپنی بیبیوں سے مت ملنا، یہ اللہ کی حدیں ہیں ان کے قریب بھی نہ جانا، اسی طرح اللہ اپنے احکام کو لوگوں کے لئے بیان کرتا ہے تاکہ وہ پرہیزگار بن جائیں۔“

اگر روزوں میں مشکل ترین احکام کی پابندی کا اپنے آپ کو عادی بنالیا تو پھر خواہ کیسا ہی سخت سے سخت اور دقت طلب قانون دیا جائے کوئی تکلیف محسوس نہ ہوگی۔ مسلمانوں کو دنیا بھر میں حق و صداقت کی نشر و اشاعت کرنی ہے، ہر قوم ان کی مخالفت کرے گی اور ان کے فنا کرنے کی فکر میں رہے گی، ان مخالفین و معاندین کے تباہ و برباد کرنے کے واسطے خود مسلمانوں کو بھی تیار رہنا ہوگا۔ اس جنگی جذبہ کو بھڑکانے اور تیز کرنے کے لئے کھانے پینے کی ضرورت ہوگی کہ خوب موٹے تازے ہوں اور تو مند سپاہی بن جائیں، لیکن اگر قوت پیدا ہوگئی اور نکاح نہ کیا تو شدید ترین خرابیوں کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ زنا اور لواطت کی طرف رخ کریں گے یا یہود و نصاریٰ کی طرح رہبانیت کو اختیار کریں گے اور ان میں سے ہر ایک چیز مسلمانوں کے لئے تباہ کن ہے۔ اس لئے فرمایا کہ ماہ رمضان میں شب کے وقت تم اپنی عورتوں کے پاس جاسکتے ہو، اس سے

ایک تو تمہارے اخلاق پر برا اثر نہ پڑے گا اور دوسرے اپنی ظاہری وجاہت اور زیب و زینت کو محفوظ رکھ سکیں گے۔ جب تک اللہ کی طرف سے کوئی حکم نازل نہ ہوتا، رسول اللہ ﷺ اہل کتاب کا اتباع کیا کرتے تھے، چنانچہ نزول رمضان سے قبل مدینہ میں آپ عاشورہ کا روزہ رکھتے تھے۔ نصاریٰ کا روزہ آٹھ پہر کا ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کی عادت تھی کہ عشاء کی نماز تک کھاپی لیتے اور عورتوں کے پاس بھی چلے جاتے تھے، اس کے بعد وہ ان تمام چیزوں کو حرام سمجھتے، مگر یہ حکم نہ تھا۔ اس لئے اللہ نے ان کی طرف نظر رحمت کی اور کھول کر فرمادیا کہ رات کو کھانا پینا اور عورتوں کے پاس جانا جائز ہے اور اس مباشرت سے مقصد یہ ہے کہ اولاد پیدا کرو تاکہ مسلمانوں کی جماعت میں ترقی ہو اور تمہارے مقاصد حیات کی تکمیل۔

آگے چل کر کھانے پینے کے اوقات معین کر دیئے اور بتا دیا کہ طلوع فجر سے غروب آفتاب تک ان میں سے کوئی چیز استعمال نہیں کر سکتے۔ عدی بن حاتم کہتے ہیں کہ: ”یہ آیت نازل ہوئی تو میں نے سفید اور سیاہ رنگ کی رسیاں لے کر اپنے تنکے کے نیچے رکھ لیں کہ جب دونوں ایک دوسرے سے ممتاز نظر آنے لگیں گی تو سمجھ لوں گا کہ وقت ہو گیا“، آپ نے فرمایا کہ: ”اس سے تاریکی شب اور سپیدہ صبح مراد ہے“: انما ذلك سواد الليل وبياض النهار، ”البتہ ایام اعتکاف میں رات کے وقت بھی عورتوں کے پاس نہیں جاسکتے۔“

یہ حدود الہیہ ہیں، ان کے قریب جانے کا خیال بھی دل میں نہ آئے، کیونکہ بالکل ممکن ہے کہ ان کا قرب و اتصال بتدریج حدود کے توڑنے کی دعوت دے اور تم گناہ میں مبتلا ہو جاؤ، اس لئے دور ہی رہنا اسلم و احوط ہے۔ حدیث میں آتا ہے: ان لكل ملك حى وان حى الله محارمه فمن رتم حول الحى يوشك ان يقيم فيه، ”ہر بادشاہ کی حى ہوتی ہے، اللہ کی حى<sup>۱</sup> وہ فواحش و منہیات ہیں جن کے ارتکاب سے اس نے منع فرمایا ہے۔ جو شخص اس کے گرد پھر گیا عجب نہیں کہ اس میں داخل بھی ہو جائے۔“ اللہ نے ان قوانین کو شرح و بسط سے بیان کیا کہ لوگوں میں صلاح و تقویٰ پیدا ہو اور قوم بد عملی و بد کرداری سے محفوظ رہے۔



• سلاطین و امرا کا دستور ہے کہ وہ حکمران کی خاطر جنگل کے ایک حصہ کو اپنے لئے مخصوص کر لیتے ہیں، اس میں کسی دوسرے شخص کو شکار کی اجازت نہیں ہوتی، اسی مخصوص رقبہ کو عربی میں حى کہتے ہیں۔

## باب نمبر ۵

## معاملات

تدبیر منزل میں صرف ایک گھر کی اصلاح پیش نظر تھی، لیکن انسان کبھی اکیلا نہیں رہ سکتا۔ وہ فطرۃً مدنی الطبع پیدا کیا گیا ہے، مل کر رہنا اس کا طبعی تقاضا ہے۔ جب چند آدمی مل کر رہیں گے تو تقسیم عمل کے اصول کے مطابق ہر شخص اپنی اپنی طبیعت کے مناسب کام اختیار کر لے گا اور اس طرح ایک دوسرے کی ضروریات میں مدد دیں گے۔ آپس میں مبادلہ اشیاء کریں گے، اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ معاملات باہمی اور لین دین کے متعلق ایک قاعدہ کلیہ بیان کر دیا جائے جو زندگی کے ہر شعبہ میں دلیل راہ و مشعل ہدایت کا کام دے سکے، فرمایا:

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتَذَلُّوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۸۹﴾

”اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ اور ان کو حکام کے پاس اس لئے نہ لیجاؤ کہ لوگوں کے مالوں کا ایک حصہ جان بوجھ کر گناہ کے ذریعہ کھاؤ اور تم جانتے ہوں کہ حقیقت حال کیا ہے۔“

قانون بنانے کے دو ہی مقصد ہو سکتے ہیں:

(الف) جھگڑے کثرت سے پیدا ہوں، عدالت کو مداخلت کا موقع ملے اور حکومت کی جانب مرافعہ کرنے کے لئے لوگ مجبور ہوں، اس سے حکومت کی آمدنی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ خدع و فریب کا دروازہ کھل جاتا ہے، کذب آفرینی میں ترقی ہوتی ہے اور جھوٹے مقدمات سے عدالت کو فرصت نہیں ملتی ❶۔

(ب) جہاں تک ممکن ہو لوگوں میں جھگڑے کم ہوں، اس کے لئے بہترین صورت یہ ہے کہ پہلے قوم کے اندر صحیح کریکٹر پیدا کیا جائے، ہر شخص اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتا ہو اور احتساب اعمال کا خوف دل میں ہو، اس صورت میں ہر معاملہ کا فیصلہ ان کی دیانت اور لمانت پر چھوڑ دیا جائے گا۔ حکومت کو صرف خاص خاص حالتوں میں مداخلت کرنے کی ضرورت محسوس ہوگی۔ قرآن حکیم یہی چاہتا ہے اور اس کا قانون یہی مقصد عظمیٰ پیش نظر رکھتا ہے۔

اس ایک آیت میں قرآن نے دراصل ان تمام مباحث اور فقہی مسائل کو بیان کر دیا جو کتب فقہ کے صداہا اوراق میں بھی نہ سما سکے۔ قرآن نے روزوں کو فرض کیا کہ اللہ کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے وہ حرام چیزوں کو ترک

❶ یورپین اقوام کا طرز حکومت اسی قسم کا ہے، جہاں ان کا قدم جاتا ہے ہر قسم کی بد اخلاقی وہاں نشوونما پاتی اور رعایا کو تباہ کرتی ہے۔

کرنے کی اپنے اندر عادت پیدا کریں، تاکہ آئندہ ناجائز طریق سے حاصل کیا ہوا مال ان کے نزدیک حرام ہو اور اس سے پرہیز کریں۔

متبادلہ اشیاء ہونے لگے اور خرید و فروخت کی صورت ہو تو ظلم و جور سے کسی کامال کھانے کی کوشش نہ کرنا۔ اکل المال بالباطل کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں: لوٹ مار کر کے وصول کرنا، قمار بازی، گانے بجانے کی اجرت، شراب کی قیمت اور کھیل کود سے روپیہ حاصل کرنا، رشوت لینا اور جھوٹی گواہی دینا، امانت میں خیانت کرنا اور اسی قسم کی صورتیں بیان کی جاسکتی ہیں، ام سلمہ کہتی ہیں کہ، ایک مرتبہ آپ نے اپنے صحیحہ کے دروازہ کے قریب لوگوں کو جھگڑتے سنا تو آپ باہر تشریف لائے اور فرمایا: انا انا بشرا وانه ياتيني الخصم فلعن بعضهم الحن بحجته من بعض فاحسب انه صادق فاقض له فمن قضيت له بحق مسلم فانما هي قطعة من النار فليصلها او يذرها۔

”میرے پاس مقدمہ آتا ہے، مدعی اپنی چرب زبانی سے دعویٰ ثابت کر دیتا ہے حالانکہ حق دوسری جانب ہوتا ہے۔ میں اس بیان کے مطابق اس کے حق میں فیصلہ نافذ کرتا ہوں، مگر وہ یہ سمجھ لے کہ ایک مسلمان کامال ناجائز طریق سے لینا آگ کو لینا ہے۔ اب وہ آزاد ہے اسے قبول کرے یا چھوڑ دے۔ قاضی شریح نے فرمایا: لايسعني الا ان اقضي بها يحضرنى من البيئتين وان قضائي لا يحل لك حراما۔“ شہادت کی بنا پر میں تمہارے حق میں فیصلہ کرتا ہوں، مگر اس بات کو خوب ذہن نشین کر لو کہ میرے حلال کرنے سے وہ چیز حلال نہ ہوگی، جب حرام ہے تو حرام ہی رہے گی۔“

تدو ابھالی الحکام سے مراد یہ ہے کہ رشوت دیکر کسی کامال نہ کھاؤ، جھوٹے مقدمے نہ بناؤ اور جھوٹی گواہی نہ دو۔

قمری حساب ہو

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْاَهْلِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقَىٰ وَآتُوا الْبُيُوتَ مِنْ اَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٢٦﴾

”اور تم سے چاند کے بارے میں سوال کرتے ہیں، کہہ دو، کہ لوگوں کے معاملات اور حج کے اوقات اس سے معلوم ہوتے ہیں اور گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے آنا نیکی نہیں، بلکہ نیکی یہ ہے کہ ایک شخص تقویٰ اختیار کرے اور دروازوں میں سے ہو کر گھروں میں آئے اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔“

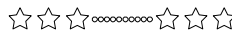
تدبیر منزل کے احکام بیان کر دیئے گئے، فصل خصوصیات کا قانون بھی مرتب ہو گیا، لیکن سوال یہ ہے کہ تبادلہ اشیاء اور لین دین کے جس قدر معاملات ہوں گے، ان کے حساب کتاب کن ہنسیوں کے مطابق ہوا کرے گا: شمسی یا قمری؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شمسی حساب میں بڑی دقتوں اور تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، وہ ایک ہی حالت میں رہتا ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، اگر طلوع و غروب کے لحاظ سے اس میں معمولی سا تغیر ہوتا ہے تو عام نظریں اس کو محسوس نہیں کر سکتیں، اس کے لئے اعلیٰ ترین محاسبوں کی ضرورت ہے، جنہوں کے بغیر کام نہ چل سکے گا اور ایسے دیہات و قصبات بکثرت ملیں گے جہاں کے لوگ تہذیب و تمدن کے نام سے نا آشنائے محض ہوں گے، وہاں عمدہ ترین حساب



دانوں کا ملنا تکلیف سے خالی نہ ہو گا، اس لئے مسلمانوں کے واسطے قمری حساب مناسب رہے گا۔ ان کا مذہب عالمگیر ہے اور تمام اقوال عالم کی طرف اس کا روئے سخن ہے۔ چاند کی شکلوں میں جلد تخییر ہو تا رہتا ہے۔ ہر تعلیم یافتہ اور جاہل اس فرق کو دیکھ کر اوقات معین کر سکے گا اور وہی تغیرات ضبط اوقات کا کام دیں گے۔ چنانچہ امت مسلمہ کے مؤسس اوّل ابراہیم نے قمری حساب کے مطابق حج کے ایام مقرر کئے ہیں۔ اگر حساب شمسی ہو تا تو اس میں یہ بھی ایک تکلیف رہتی کہ رمضان و حج کے جو اوقات مقرر ہو جاتے وہی رہتے، ان میں تغیر و تبدل نہ ہو سکتا، اگر ایک قوم اس دوام کی وجہ سے آرام میں ہوتی تو دوسری کو مصیبت برداشت کرنی پڑتی۔ اب قمری حساب کے بموجب سال بھر کے مختلف موسموں میں ان فرائض کو ادا کرنے کا موقع ملے گا اور ہر قوم ان سے بہرہ اندوز سعادت ہو سکے گی۔

زمانہ جاہلیت میں دستور تھا کہ احرام حج باندھنے کے بعد گھر میں جانا ممنوع خیال کیا جاتا تھا، اس لئے پشت کی جانب سے نقب لگا کر اندر آ جاتے اور اس کو باعث ثواب خیال کرتے۔ خدا نے کہا، یہ لغو اور مہمل حرکت ہے۔ بہتر یہ ہے کہ تمام محرمات الہیہ سے پرہیز کرو، خدا کا خوف دل میں رکھو اور پھر اگر تم دروازہ میں سے گھر کے اندر آ گئے تو گناہ کی بات نہیں۔ قرآن حکیم کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ ایک مثال بیان کر کے اس سے مختلف قسم کے قوانین و ضوابط کا استنباط کرتا ہے۔ سورہ آل عمران میں غزوہ احد کا تذکرہ کر کے صد ہا مسائل کا استخراج کیا، انفال میں صرف غزوہ بدر کو پیش نظر رکھ کر پورا قانون جنگ مرتب کر دیا۔ اس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ ان قاعدوں کو اچھی طرح ضبط نہ کر سکیں وہ اس مثال کو خوب ذہن نشین کر لیں، پھر قوانین خود بخود سمجھ میں آ جائیں گے۔

شریعت نے جو قانون بنایا ہے اسے گھر تصور کیجئے۔ دستور یہی ہے کہ اس میں داخل ہونے کے لئے جو دروازہ بنایا گیا ہے، اسی میں سے ہو کر اندر جانا چاہئے۔ اگر ایک شخص اس کو بدلنے کی کوشش کرتا ہے اور دیوار پھاند کر اندر داخل ہونا چاہتا ہے تو گویا وہ مقصد اصلی کو فوت کر رہا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے حج کے لئے جو ایام مقرر کئے وہ قمری مہینوں ہی میں آتے ہیں اور ان کا منشاء یہی ہے کہ مسلمان اپنا تمام حساب کتاب چاند پر رکھیں۔ اب جو لوگ اس میں رد و بدل کی کوشش کرتے ہیں وہ دراصل قوم کے نظام صالح کو برباد کرنا اور شریعت کی بلند عمارت کو گرانا چاہتے ہیں۔ کوئی عقلمند اسے نیکی کے نام سے تعبیر نہیں کر سکتا کہ قانون کے اصول اساسی فتاہوں، اس کی اصلی شکل و صورت میں تغیر آجائے۔ بلکہ برواحسان اور تقویٰ و طہارت یہی ہے کہ اپنے تعلقات الہیہ کو درست کر لو، امام ملت نے جو قانون بنادیا ہے اس کو مضبوطی سے پکڑ لو۔ اگر تم نے اللہ کے قانون کی پابندی کی اور مذہب تمہاری زندگی کی ہر شاخ میں کار فرما رہا تو یقیناً علو و رفعت اور برتری تمہارے ہی لئے ہے۔ کیونکہ اوائل عمر ہی سے گھروں میں ایسی تعلیم دی جائے گی جس سے ایک طرف تو مذہبی جذبات و عواطف فرزندان اسلام میں راسخ ہوتے جائیں گے اور اس کے ساتھ ساتھ تدبیر منزل کے قانون پر عمل کر کے ملکوں اور قوموں کی باگ اپنے ہاتھ میں لے سکیں گے، لیکن یہ نتائج و ثمرات صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتے ہیں، جبکہ قانون الہی میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے اور اخلاقی السلم کافیہ پر پورا پورا عمل ہو۔

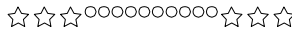


## باب نمبر ۶

## سیاست مدن

گذشتہ اوراق میں جس قدر قوانین و ضوابط بیان کئے گئے ہیں، ان کا تمام تر تعلق مسلمانوں کی تمدنی اور معاشرتی زندگی سے ہے کہ ان کی داخلی اصلاح ہر اعتبار سے مکمل ہو، جب ہم سب مل کر ایک جگہ رہتے ہیں اور ہماری ضروریات زندگی برابر پوری ہوتی رہتی ہیں تو ہمیں اپنا مقصد حیات بھی معین کر لینا چاہئے، اس لئے کہ مقصد کے بغیر انسان کی تمام زندگی بالکل بیکار ہے۔ گذشتہ تعلیم نے ہم میں حس و بیداری پیدا کر دی ہے۔ اخلاق فاضلہ اور جذبات صادقہ نے ہماری حیات انفرادی و اجتماعی کو مہذب و شائستہ بنا دیا ہے۔ تدبیر منزل کے بنیادی اصولوں نے ہمارا رشتہ خدائے واحد کے ساتھ جوڑ دیا ہے، فوجداری اور دیوانی قانون نے اصول مساوات کی بنا پر ہمارے لئے ترقی کی تمام راہیں کھول دی ہیں۔ پس جو قانون اس قدر زندگی بخش ہو، کیوں نہ اسی کی نشر و اشاعت اور تبلیغ و دعوت کو اپنی غایۃ الغایات بنا لیا جائے۔

تمام دنیا جہالت و تاریکی میں مبتلا ہے، اوہام و دوساوس کے پنجے میں گرفتار ہے، اصنام و طواغیت اور دجا جملہ کفر و شیطنت کے آگے سرنگوں ہے۔ خدائے واحد کو چھوڑ کر معبودان باطل اور ارباب متفرقون کو اپنا خدا مانتی ہے۔ پس تم مسلمان اس قانون الہی کی نشر و اشاعت کے لئے سر یکف کوشش کرو، اعلائے کلمۃ اللہ تمہارا مقصد حیات ہو، اسی کی سرفرازی و سر بلندی کے لئے اپنی ہر متاع عزیز قربان کر دو کہ دنیا میں پھر ایک مرتبہ حق کی روشنی پھیل جائے اور لوگ خدائے واحد کے پرستار بن جائیں۔



## فصل اول جہاں گیری

### کوئی مقام مستثنیٰ نہیں

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴿٥﴾

”جو لوگ تم سے جنگ کریں تم بھی ان سے اللہ کی راہ میں لڑو اور زیادتی نہ کرو اور اللہ زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔“

تمام دنیا مسلمانوں کی جولان گاہ ہے۔ کرہ ارضی کے گوشہ گوشہ میں انہیں اسلام کی نشر و اشاعت کرنی ہے کہ خیرامۃ اخراجت للناس کے مصداق حقیقی بن جائیں۔ مگر جس وقت حق و صدق کی دعوت کے لئے نکلیں گے تو دوسری قومیں ضرور ان کی راہ ترقی میں رکاوٹ پیدا کریں گی کہ ہر ایک میں اپنی زندگی کا عشق اور بقا کی محبت رکھی گئی ہے۔ ”تنازع للبقا“ کا قانون کائنات ارضی کی ہر چیز میں موجود ہے۔ دنیا میں زندہ رہنا صرف ایک مسلم ہی کا حق ہے، اس لئے وہ اصل و اصل ہے، پس مخالفین کو اتنی مہلت ہی نہ دی جائے کہ وہ مبلغین اسلام کے فنا کرنے کی تیاریاں کریں، بلکہ واعدوا لہم ما استطعتم من قوۃ پر عمل پیرا ہو کر انہیں فوراً کچل دیا جائے۔

لیکن یہ تمام تر جنگ و جدل صرف کلمہ حق کی خسروی و نفوذ اور سچائی کی بادشاہت کے لئے ہو۔ قانون الہی کی نشر و اشاعت اور اس کی تمکین فی الارض غایت الغایات ہو، نہ تو حمایت قومی اس کا سبب ہو اور نہ شہرت و ناموری کی بنا پر اس قدر خونریزی ہو۔ دوسری جگہ آیا: وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ (البقرہ ۱۹۳) ابو موسیٰ کہتے ہیں کہ، ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ بعض لوگ غنیمت کی خاطر جنگ کرتے ہیں، بعض کا مطمح نظر شہرت و ناموری ہوتا ہے، کسی کا مقصد عزت و مرتبت ہوتا ہے ان میں سے فی سبیل اللہ کون ہے؟ آپ نے فرمایا، فی سبیل اللہ اس شخص کو کہا جائے گا جو صرف اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے لڑتا ہے۔ جاء رجل الى النبي صلى الله عليه وسلم فقال الرجل يقتل للمغنم والرجل يقتل للذکر والرجل يقتل لیری مکانه فمن فی سبیل اللہ؟ قال من قاتل لتكون کلمۃ اللہ ہی العليا فهو فی سبیل اللہ، ابو داؤد نے ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے: ان رجلا قال یا رسول اللہ رجل یرید الجہاد فی سبیل اللہ وهو یتغنی عرضا من عرض الدنیا فقال النبی ﷺ لا جہاد، ”ایک نے آپ سے سوال کیا کہ، ایک شخص جہاد فی سبیل اللہ میں شریک ہوتا ہے مگر دنیا کی عزت و کرامت اور جاہ و حشمت کا طالب ہے۔ آپ نے فرمایا کہ، اسے ذرہ برابر بھی اجر نہ ملے گا۔“

کائنات خلت حضرت ابراہیم کے مقامات ذہاب الی اللہ میں تم پڑھ آئے ہو کہ انہوں نے قوم اور وطن کو توحید خالص کے لئے قربان کیا تو پیشوائے عالم کے لئے چن لئے گئے، پس یہ تمام تصریحات واضح کرتی ہیں کہ جہاد کی اصلی غرض وغایت صرف اعلائے کلمۃ اللہ ہو۔ مگر جنگ صرف ان لوگوں سے ہو جن سے مخالفت کا اندیشہ ہے یا جو اسلام کو تباہ کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں، ایسے لوگوں کو فوراً قتل کر دینا چاہئے، اگر انہیں مہلت دی اور وہ اس درمیان میں آلات حرب سے مسلح ہو گئے تو پھر کامیابی کی کوئی صورت نہ ہوگی۔ البتہ ان لوگوں سے تعرض کرنے کی ضرورت نہیں جو خطرۃ جنگ کرنے سے عاجز ہیں۔ ان میں لڑنے کی استعداد و قابلیت ہی نہیں اور نہ وہ کسی قسم کی تیاری کر سکتے ہیں۔ اگر ان سے بھی جنگ شروع کر دو گے تو ہماری برکتوں کا سلسلہ بند ہو جائے گا۔ حدیث میں آتا ہے کہ، عورتوں بچوں اور بوڑھوں کو قتل نہ کرنا چاہئے، ہاں اگر ان میں سے کوئی امام کی حیثیت رکھتا ہو اور اس کے وجود پر فتح و شکست کا دار و مدار ہو تو اس کا قتل کرنا سیاسی مصالح کی بنا پر ضروری ہو گا۔ نہی رسول اللہ ﷺ عن قتل النساء والصبيان، ابن عباس نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے: ولا تقتلوا النساء والصبيان والشیوخ والرهبان ولا من اتقى اليكم السلام۔

یہودیوں میں بچے، عورتیں اور بوڑھے سب کے سب تہ تیغ کر دیئے جاتے بلکہ جانوروں تک کو مار ڈالتے۔ کھیت، باغات اور گھروں کا تمام مال و متاع آگ کی نذر ہوتا۔ یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے کہ وہ عین انتہائی جوش و غضب کے موقع پر بھی اعتدال کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا اور بار بار تقویٰ و طہارت اور عفو و درگزر کی تعلیم دیتا ہے۔ مکہ کی فتح اور حضرت عمر کا داخلہ بیت المقدس صد ہا امثال و نظائر میں سے دو ہیں۔

وَأَقْتُلُوهُمْ حَيْثُ تَقْتُلُوهُمْ وَآخَرُ جُوهُمْ مِّنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّى يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ فَإِنْ قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ كَذَلِكَ جِزَاءُ الْكَافِرِينَ ﴿١٩﴾ فَإِنْ اتَّبَعْتُمُ اللَّهَ غُفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٢٠﴾

”اور ان کو جہاں پاؤ قتل کرو اور جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ہے وہاں سے تم انہیں نکال دو اور فتنہ قتل سے بڑھ کر ہے اور جب تک وہ لوگ تم سے مسجد حرام کے پاس جنگ نہ کریں تم بھی اس جگہ ان سے نہ لڑو، لیکن اگر وہ تم سے لڑیں تو تم بھی ان سے لڑو۔ کافروں کی یہی سزا ہے، پھر اگر باز آجائیں تو بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔“

ایسے مخالفین و معاندین اسلام کو جو ہر وقت تمہارے فنا کرنے کی تیاریاں کرتے رہتے ہیں جہاں پاؤ قتل کر دو، ان کو چھوڑ دینا اور مخالفت کا موقع دینا ہر گز قریں عقل و انصاف نہیں۔ جب وہ تمہارے قتل کے لئے ہر مناسب موقع کی تلاش میں رہتے ہیں تو تم انہیں کیوں چھوڑتے ہو۔ ایک جگہ آیا: لَا يَرْجُونَ فِي مُؤْمِنٍ (التوبہ ۱۰) ایک دوسرے مقام پر یوں ارشاد ہوا: أَلَا تَتَذَكَّرُونَ قَوْمًا نَّكَثُوا أَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوا بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ وَهُمْ يَدْعُوكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ (التوبہ ۱۳)

بیت اللہ الجلیل کے اصلی وارث مسلمان تھے، اس لئے کہ یہ ابراہیمی ملت کے پابند تھے: إِنَّ أَوَّلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ وَهَذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا (آل عمران ۶۸) مگر کفار نے ان کو وہاں سے نکال دیا اور خود اس پر غاصبانہ قبضہ

کر لیا۔ اب مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس مرکز سے ان کو الگ کر دیں اور اس جگہ کو واپس لے لیں۔ مگر مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ صرف بیت اللہ پر قبضہ کر کے ان کا فرض نہیں ختم ہو جاتا، وہ شہداء علی الناس کے درجہ پر فائز کئے گئے ہیں، وما ارد سلنک الا کافة للناس بشیدا و نذیرا کا طغرائے امتیازی خیر امة اخراجت للناس ان کی خصوصیت کبریٰ ہے۔ دنیا میں جس قدر انبیاء علیہم السلام آئے، ان کے وارث اصلی اب مسلمانوں کے سوا اور کوئی نہیں۔ ان رسولوں نے اپنی امتوں کے لئے مرکز قائم کئے، مگر کچھ مدت کے بعد ناخلف ان پر قابض ہو گئے۔ اس لئے بیت اللہ کو اپنے قبضہ میں لینے کے بعد ان کا دوسرا فرض یہ ہو گا کہ دنیا بھر میں جس قدر مذہبی مرکز ہیں ان پر بھی قبضہ کر لیں، تاکہ صحیح معنی میں شہداء علی الناس کے مصداق بن سکیں۔

آگے چل کر اس حکم کی علت بتادی کہ بلاشبہ یہ جنگ قتل ہے اور انسانی قتل بہت بڑی برائی ہے، لیکن اس سے بھی بڑھ کر یہ کتنی بڑی خرابی ہے کہ لوگ اپنی آبادیوں اور حکومتوں پر قناعت نہیں کرتے، دوسروں کے حقوق آزادی و حریت اور حکومت و فرماں روائی چھیننا چاہتے ہیں، توحید کی جگہ کفر و شرک کے ماتحت مسلمانوں کو لانا چاہتے ہیں، اگر اس کے دفع کا انتظام نہ کیا جائے تو پھر دنیا میں کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی۔ پس ایک بڑی برائی کے دور کرنے کیلئے چھوٹی برائی اختیار کر لینی چاہئے۔ یہ خود قدرت کا عالمگیر قانون اور کارخانہ قدرت کا دائمی عمل ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو خدا کبھی جنگ کا حکم نہ دیتا۔

جب کبھی انفرادی و اجتماعی اغراض کا تصادم ہو تو ہمیشہ انفرادی فوائد کو قومی مقاصد پر قربان کیا جاتا ہے۔ کلی مصلحت کے مقابلہ میں جزئی مصلحت کی پرواہ نہیں کی جاتی۔ اگر ایک انسان کا قتل ہونا تمام ملک کے حق میں مفید ثابت ہو تو کوئی حرج کی بات نہیں۔ پس قتل و قتال اس قدر مذموم نہیں جتنا فتنہ و فساد اور یہ فتنہ بغیر قتال کے فرو نہیں ہو سکتا۔

مسجد حرام میں جنگ کی ابتدا کرنا جائز نہیں کہ کرہ ارضی میں صرف وہی ایک مقام ہے جس کو امن و سلامتی کا گھر بنایا گیا ہے۔ واذ جعلنا البیت مشابة للناس وامناء، البتہ اگر کفار کی طرف سے جنگ کی ابتدا ہو تو اس وقت مسلمانوں کو مجبوراً تلوار ہاتھ میں لینی پڑے گی، پھر یہ استثناء باقی نہ رہے گا۔

کوئی شخص بھی مستثنیٰ نہیں

گذشتہ آیات سے دو باتیں ثابت ہو گئیں:

(الف) کوئی جگہ قتال فی سبیل اللہ سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتی۔

(ب) کوئی مسلم اپنے آپ کو جہاد سے مستثنیٰ خیال نہیں کر سکتا۔ جو لوگ بیت اللہ میں گوشہ گیر ہوں، ذکر الہی اذکا

مقصد و حید ہو اور شب و روز اسی کی عبادت میں مصروف ہوں، تزکیہ نفس و تہذیب اخلاق ان کے پیش نظر ہو وہ

بھی جنگ کی شرکت سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتے، کیونکہ جب خود بیت اللہ ہی میں جنگ شروع ہو جائے گی تو کون ان کی اعانت کے لئے آئے گا، بلکہ انہیں خود اس کے لئے تیاری کرنی پڑے گی اور تسبیح و سجادہ کو خیر باد کہنا پڑے گا۔ پیچھے اور اراق میں تم پڑھ آئے ہو کہ حضرت عبد اللہ بن مبارک نے فضیل بن عیاض کو جو اشعار لکھ کر بھیجے تھے تو وہ رو پڑے تھے اور مان گئے تھے کہ عبد اللہ سچ کہتا ہے۔ اگر یہ بھی تمہارے اطمینان کے لئے کافی نہ ہو تو خود لسان الہی اپنی غیر مشتبہ آواز میں اعلان کرتی ہے: **أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ أَمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَجَاهَدَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَوُونَ عِنْدَ اللَّهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ** (التوبہ ۱۹) اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ جہاد فی سبیل اللہ کی تیاری سے کسی مسلمان کو مفر نہیں۔

ہاں جب مخالفین اپنی شرارت سے باز آجائیں، اسلام کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنا ترک کر دیں اور قرآن کی فناسامانی کے لئے خفیہ خفیہ تیاریاں کرنی چھوڑ دیں تو پھر جنگ کی ضرورت نہیں۔ قتل و قتال کا فتویٰ اس صورت میں دیا گیا ہے جبکہ اسلام کے بچاؤ کی صورت نہ رہے۔ دوسری جگہ حکم قتال اور جواز جنگ کی اصلی علت بتادی: **حَتَّى تَضَعُوا أَوْدَانَهَا** (محمد ۴) ”لڑتے رہو یہاں تک کہ لڑائی موقوف ہو جائے۔“ دنیا میں عالمگیر صلح و امن قائم ہو جائے، ساری دنیا ایک قوم اور تمام نوع انسان ایک گھرانے کی طرح زندگی بسر کرے۔

**وَلَقَدْ قَاتَلْتُمُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ فَإِنْ اتَّبَعْتُمُ الْفِتْنَةَ أَفَلَا تَعُدُّونَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ** (۵)

”اور ان سے لڑتے رہو تا آنکہ فساد باقی نہ رہے اور ایک خدا کا حکم چلے، پھر اگر باز آجائیں تو سوائے زیادتی کرنے والوں کے اور کسی کے ساتھ سختی نہیں۔“

حضرت عبد اللہ بن عمر نے فتنہ کے متعلق بیان کیا ہے: الاسلام قلیلاً فکان الرجل یفتن فی دینہ اما قتلوا واما یعذب بوجہ حتی کثر الاسلام فلم تکن فتنۃ، اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب اسلام کمزور و ناتوان تھا تو دشمنان دین و ملت مسلمانوں کو فتنہ کرنے کی فکر میں رہتے، مگر جب اسے حکومت و سلطنت نوازش کی گئی اور اسے تمکین فی الارض حاصل ہو گئی تو اب کسی مخالف میں اتنی ہمت نہ رہی کہ فرزند ان اسلام کو نیچا دکھا سکے۔ اور ان کی راہ ترقی میں رکاوٹ پیدا کر سکے۔ گویا سر زمین عرب میں اسلام کو غلبہ و اقتدار حاصل ہو گیا اور اس کے دشمن ذلیل و رسوا ہو گئے۔

یکون الدین للہ کا مطلب بھی عبد اللہ بن عمر سے دریافت کرنا چاہئے، وہ فرماتے ہیں:

اتاہ رجلان فی فتنۃ ابن الزبیر فقال ان الناس صنعوا وانت ابن عمر، وصاحب النبی ﷺ فما یمنعک ان تخرج فقال ینعنی ان اللہ حرم دم اخی فقال الم یقل اللہ فقاتلوہم حتی لا تكون فتنۃ فقال قاتلنا حتی لم تکن فتنۃ وکان الدین للہ واتم تریدون ان تقاتلوا حتی تكون فتنۃ ویکون الدین لغير اللہ۔

”عبد اللہ بن زبیر کے فتنہ میں دو شخص ابن عمر کے پاس آئے اور کہا، لوگوں نے کیا کچھ کیا ہے آپ عمر کے

صاحبزادے اور رسول ﷺ کے صحابی ہیں کیوں نہیں نکلتے؟ انہوں نے جواب دیا، مجھے یہ بات منع کرتی ہے کہ اللہ نے میرے بھائی کا خون حرام کر دیا ہے۔ انہوں نے عرض کیا، کیا اللہ کا یہ حکم نہیں فقائلوہم حتی لا تکن فتنۃ؟ ابن عمر نے کہا، ہم نے جنگ کی یہاں تک کہ فتنہ فرو ہو گیا اور صرف اللہ کا دین ہو گیا، اور تم اس لئے جنگ کرتے ہو کہ فتنہ پیدا ہو اور غیر اللہ کے لئے دین ہو جائے۔“

دونوں روایات کے ملانے سے اس آیت کے معنی خود بخود صاف ہو جاتے ہیں کہ تم برابر جنگ کرتے رہو تا آنکہ فتنہ و فساد کے اجزاء عناصر محو و باطل ہو جائیں۔ کلمۃ اللہ اور قانون الہی بلند و برتر ہو، کسی شخص کو خدائی قانون کی خلاف ورزی کی طاقت نہ ہو اور اگر کوئی شخص اس کی توہین کرے تو حکومت اس کو فوراً سزا دے۔ اسلام اس امر کا آزر و مند ہے کہ قانون الہی عام ہو جائے۔ جملہ مذاہب امن و اطمینان سے اس کے ماتحت زندگی بسر کر سکیں۔ مذہبی مقامات، گرجے، عبادت گاہیں اور مسجدیں بدکار لوگوں کی دست برد سے محفوظ رہیں، اسلام کی راہ ترقی میں رکاوٹ نہ پیدا کریں، خود آپس میں لڑنے نہ پائیں۔ جب کبھی ان میں سے کوئی اسلام کے قانون کی علی الاعلان توہین کرے تو اس سے مواخذہ کیا جائے اور سلطنت جس قانون کے بقا و استحکام کو اپنی غایت الغایات بنالے وہ قرآن حکیم تسلیم کیا جائے۔

صرف یہی ایک صورت ہے جس سے دنیا میں امن قائم رہ سکتا ہے، ورنہ فتنہ ہمیشہ سراٹھاتا رہے گا اور لوگ کبھی چین سے زندگی بسر نہ کریں گے۔ اگر یہ لوگ اسلام کی مخالفت سے باز آجائیں اور اس کی صرف دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں:

(الف) جس وقت مسلمانوں نے ان کو اسلام کی دعوت دی ان کے شبہات و شکوک کو دور کر دیا تو وہ لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

(ب) اسلام قبول کرنے کو تیار نہیں، مگر اس کی مخالفت نہ کرنے کا بھی عہد کرتے ہیں اور لوائے توحید کے ماتحت رہنا پسند کرتے ہیں تو شوق سے رہیں۔ مگر انہیں جزیہ ادا کرنا ہو گا۔

اگر ان دو باتوں میں سے کوئی بھی ان کو اسلام کی مخالفت سے باز نہ رکھ سکے۔ اللہ کے قانون کی خلاف ورزی کرتے رہیں اور برابر اسلام کی تباہی کے لئے تدبیریں سوچتے رہیں تو پھر ان کی سزا قتل ہوگی اور انہیں کبھی معاف نہیں کیا جائے گا۔

کوئی وقت مستثنیٰ نہیں

اَلْشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمَتُ قِصَاصٌ فَمَنِ اعْتَدَىٰ عَلَيْنَا مَا اَعْتَدَىٰ  
عَلَيْكُمْ وَانْتَفُوا اللَّهَ وَاَعْلَمُوا اَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ﴿١٣﴾

”ادب والے مہینوں کا معاوضہ ادب والے مہینے ہیں اور ادب کی تمام چیزوں میں مساوات ہے تو جو تم پر زیادتی کرتے تو جس قدر زیادتی اس نے تم پر کی ویسی ہی زیادتی تم، اور اللہ سے ڈرو اور یہ جان لو کہ اللہ ڈرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

اشہر حرم، جن میں جنگ کرنے کی ممانعت ہے چار ہیں: رجب، ذیقعدہ، ذی الحجہ اور محرم۔ ان مہینوں کا احترام، زمانہ جاہلیت میں کیا جاتا تھا، جنگ بند کر دی جاتی، راستے کھل جاتے اور تجارت شروع ہو جاتی۔ مسلمانوں کو اب بھی یہی حکم ہے

کہ ان مہینوں میں جنگ نہ کریں، لیکن اگر کفار کی طرف سے ابتدا ہو تو ان کو جواب دینا مسلمانوں کا اولین فرض ہے۔

مگر اس کا بہترین جواب یہ ہو گا کہ چونکہ کفار و مشرکین نے ہمارے مہینوں کی حرمت کو برباد کیا ہے، اس لئے ہم ان کے پاک مہینوں میں ان پر حملہ کریں اور اس طرح ان کو ذلیل و رسوا کر دیں، جب انہوں نے ہماری عزت و حرمت کا خیال نہیں کیا تو ہم کیوں ان کی پروا کریں؟ یہی قصہ باقی قابل احترام چیزوں کا ہے۔ اگر وہ تمہاری مسجدوں کو شہید کریں تو تم ان کی عبادت گاہوں کو زمین کے برابر کر دو، اگر وہ تمہاری عورتوں کی عصمت و آبرو برباد کریں تو تم ان کی عورتوں کو لونڈی بنالو کہ یہ اس سے بھی زیادہ ذلت و رسوائی ہے۔ یہ مساوات کا سلوک ہے، ان کی بد اخلاقی کی سزا صرف اسی صورت میں ہو سکتی تھی۔

کسی قوم پر اللہ کا سب سے بڑا انعام یہ ہوا ہے کہ اس کے ارادہ میں جزم و استحکام پیدا ہو، ہمت بلند اور عزم و استقلال پورا ہو، مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے ارادوں کو مضبوط رکھیں، اللہ کے قانون کی عزت و حرمت ان کے پیش نظر رہے۔ ایسے لوگوں کی ہر موقع پر دستگیری کی جائے گی۔

جہاد ہی میں زندگی ہے

جہاد فی سبیل اللہ کے لئے قدم قدم پر روپیہ کی ضرورت ہوگی، اگر ہر ایک مسلمان لڑنے کے لئے تیار ہو گیا اور حکومت کے پاس روپیہ نہ ہوا تو سخت دقتیں پیدا ہوں گی، سامان حرب کی خریداری نہ ہو سکے گی، پھر اس کے علاوہ سلطنت کے اور سینکڑوں کام ہیں جو روپیہ کے بغیر پورے نہیں ہو سکتے۔ خصوصاً ایسے وقت میں تو روپیہ کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے جبکہ دشمن نے مسلمانوں کا نام و نشان مٹانے کی ٹھان لی ہو، اس لئے فرمایا:

وَأَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ وَأَحْسِنُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿۹۰﴾

”اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے تئیں اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو اور قانون کی پابندی اچھی طرح کرو، اللہ اچھی طرح قانون کی پابندی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔“

اس آیت کا مفہوم سمجھنے میں اکثر لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے، حالانکہ اس کے الفاظ اپنا مفہوم ادا کرنے میں بالکل صاف اور غیر مشتبہ ہیں۔ ابویوب انصاری کی روایت اس کی بہترین تفسیر ہے، وہ فرماتے ہیں:

نزلت هذه الآية فينا، معشر الانصار! لما اعز الله الاسلام وكثرنا صرورة، قال بعضنا لبعض سوا ان اموالنا قد ضاعت وان الله اعز الاسلام فلو اقمنا في اموالنا فاصلحنا ما ضاع منها فانزل الله علينا نيرد علينا ما قلنا، وانفقوا في سبيل الله ولا تلقوا بايديكم الى التهلكة فكانت التهلكة الاقامة على الاموال واصلاحها وتركتنا الغزو۔

”ہم انصاریوں کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی، جس وقت اللہ نے اسلام کو عزت دی اور اس کے مددگار بہت ہو گئے تو ہم میں سے بعض نے خفیہ طور پر کہا کہ، ہمارے اموال برباد ہو گئے، اب جبکہ اسلام کو اللہ نے غالب کر دیا ہے۔ اگر ہم



اپنی زراعت کا خیال کریں اور زمین کو درست کر لیں تو برباد شدہ حصہ ٹھیک ہو جائے گا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اپنی زمین پر جا کر اقامت گزین ہونا اس کو درست کرنا اور جہاد ترک کرنا ہلاکت تھا۔

مذکورۃ الصدر روایت نے بتا دیا کہ جہاد ترک کر دینا تباہی و بربادی ہے۔ صرف روپیہ دے کر اپنی جان چھڑالینا کافی نہیں، بلکہ روپیہ دینے کے ساتھ ساتھ خود جنگ کی تیاری اور جہاد میں شرکت ضروری ہے۔ ایسے موقع پر جن اور بخل سے کام لینا اپنے آپ کو ضعیف و کمزور اور مخالف کو قوی و طاقتور بنانا ہے۔ پس جان اور مال دونوں کو حاضر کرو، و جاهدوا باموالکم و انفسکم اور جو قانون تم کو دیا گیا ہے نیک نیتی سے اس کی پابندی کرو، اللہ تمہاری نصرت و دستگیری کرے گا۔ البتہ جن لوگوں کی نیت صالح نہیں ہوتی اور صرف لوگوں کو دکھانے کے لئے قانون پر عمل کرتے ہیں، اللہ کے نزدیک ان کی کوئی عزت نہیں ہوتی<sup>۱</sup>۔

### فریضہ حج

جہاد فی سبیل اللہ کے مسائل بیان کرتے کرتے درمیان میں قرآن نے حج بیت اللہ الحرام کا تذکرہ شروع کر دیا اور کچھ دور تک اس کا ضابطہ بیان کیا، اس سے فارغ ہونے کے بعد پھر جہاد فی سبیل اللہ کی طرف توجہ کی گئی، اگر ماقبل و مابعد میں درس و فکر سے کام لیا جائے تو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ قتال فی سبیل اللہ اور حج بیت اللہ میں نہایت ہی اعلیٰ درجہ کا ربط و تعلق ہے، مگر اس ربط کو معلوم کرنے سے قبل تمام اعمال اسلامی پر نظر ڈالئے۔

نماز ہر مسلمان مرد و عورت پر لازم کر دی گئی، کہ جنگی خدمت ہر فرزند اسلام کے لئے ادا کرنا ضروری ہے۔ بیک وقت ایک لشکر جہاد تیار ہو جس کے اندر قربانی کا جذبہ صادقہ اور اپنے امیر کی اطاعت راسخ ہو اور جو ہر قسم کی تکلیف و مصیبت برداشت کر سکے۔

زکوٰۃ: اپنی آمدنی کا چالیسواں حصہ فقرا و مساکین کو دے کہ ایک طرف تو اسے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی عادت ہو، تاکہ جب خلافت اسلامی کو اس کی دولت کی ضرورت ہو تو اپنی تمام جائیداد راہ حق میں لٹا سکے اور ایک کوڑی بھی اپنے پاس نہ رکھے اور دوسری جانب ابنائے جنس کے ساتھ ہمدردی و رحم پیدا ہو جو ایک جذبہ فطری ہے۔ بخل و امساک کے عیوب سے پاک رہے اور قوم بھیک مانگنے سے بچ جائے۔

رمضان کے روزوں سے غرض یہ تھی کہ مسلمان اپنے اندر بھوک، پیاس اور دوسری تکلیفوں کے برداشت کرنے کی عادت پیدا کریں اور اگر کبھی انہیں مخالفین و معاندین اسلام کے مقابلہ میں مصائب و شدائد کا سامنا ہو تو ہمت نہ ہار دیں۔

<sup>۱</sup> آج ہندوستان کے مسلمانوں کا سب سے بڑا فرض یہی ہے کہ وہ اپنی تمام جائیداد اللہ کی راہ میں قربان کر دیں۔ یورپ نے ان کے فنا کرنے کا عزم کر لیا ہے ہم لوگ اگر بد بختانہ ششیر کا قبضہ ہاتھ میں لینے کی طاعت نہیں رکھتے تو کیا ہوا! ہماری جبین تو سونے کے سکوں سے بھر پور ہیں۔ کیوں نہ انہیں کو خلافت اسلامی کی بھاد قیام کے لئے کھول دیں۔ یہ کیا مصیبت ہے کہ ترکوں کے سینے نو گولیوں سے چھلنی ہوں اور ہم سے اتنا بھی نہ ہو کہ ایک وقت صرف خشک روٹی ہی پر قتا عت کر لیں۔

ایک فوج کے لئے جن امتیازات و خصائص کی ضرورت ہے اور جن کے بغیر کوئی لشکر کامیاب نہیں ہو سکتا وہ تو یہی ہیں۔ عام مسلمانوں نے ان کی پابندی کر لی، مگر ابھی یہ دیکھنا باقی ہے کہ ان میں کتنوں نے صرف ظاہری صورت کی پرستش کی اور حقیقت سے بالکل غافل رہے اور وہ کس قدر ہیں جو مشکل سے مشکل کام میں بھی ہاتھ ڈال سکتے ہیں اور ہر کٹھن منزل میں قدم رکھنے کے قابل ہیں، اس لئے کام شروع کرنے سے قبل ان کا امتحان ضروری ہے۔ وہ امتحان یہی فریضہ حج ہے تاکہ مضبوط اور توانا سپاہیوں کا انتخاب ہو سکے۔

اسلام ایک پیغام محبت ہے جو پھٹڑے ہوؤں کو ملاتا، بیگانوں کو اپنا اور آشناؤں کو صدیق حمیم بنادیتا ہے۔ اہل محلہ میں محبت و یگانگت پیدا کرنے کے لئے پنجگانہ نمازوں کے وقت محلہ کی مسجد میں جمع ہونا واجب کیا گیا۔ شہر والوں کے تعلقات کو محکم و استوار کرنے کے لئے ہفتہ میں ایک مرتبہ مسجد جامع میں نماز جمعہ ادا کرنا ضروری ٹھہرایا گیا۔ اہل شہر اور قرب و جوار کے دیہات کے رہنے والوں میں تعارف اور شناسائی کو پیدا کرنے کے لئے سال میں دوبار عید کی نماز قائم کی گئی اور آخر کار عالم اسلامی میں رابطہ دین و مذہب مضبوط تر کرنے کی خاطر مختلف قوموں، مختلف نسلوں، مختلف زبانوں، مختلف رنگوں اور مختلف ملکوں کے رہنے والوں پر عمر بھر میں ایک دفعہ حج بیت اللہ فرض کیا گیا کہ دین واحد کی وحدت میں سب کے سب شامل ہو سکیں۔

حج کے احکام ملاحظہ ہوں، ان کو جنگ کے ساتھ کس قدر شدید مناسبت ہے:

(۱) تمام حاجیوں کو سادہ بن سلا لباس پہننا پڑتا ہے، جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ایک ہی رسول، ایک ہی قرآن اور ایک ہی کعبہ پر ایمان رکھنے والے ایک ہی صورت، ایک ہی لباس اور ایک ہی سطح پر نظر آئیں۔ چشم ظاہر بین کو ان اتحاد معنوی رکھنے والوں کے اندر کوئی ظاہری اختلاف محسوس نہ ہو۔ یہ اللہ کا لشکر ہے اور سب کے سب ہیں۔ فوج میں یو نیفارم ہونا ضروری ہے۔

(۲) ان لوگوں کو ایک خاص قانون کی پابندی کرنی پڑتی ہے: سر منڈانا، ناخن کترانا۔ شکار کرنا اور عورتوں سے مباشرت کرنا ممنوع ہے، اگر کوئی شخص ان کا مرتکب ہو تو اسے جرمانہ ادا کرنا پڑے گا، کہ حاکم علی الاطلاق کی اطاعت راسخ ہو اور اس کے احکام ہماری مصلحتوں کے خواہ کیسے ہی مخالف ہوں، مگر ہماری گردنیں ان کے آگے جھک جائیں۔

(۳) ایک شخص نے حضور اقدس سے دریافت کیا کہ حج کسے کہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ، ”عرفات کے میدان میں جانے کا نام حج ہے۔“ جو شخص تمام ارکان حج ادا کرے اور میدان عرفات میں حاضر نہ ہو تو اس کا حج نہ ہو گا۔ گویا جس طرح آج تم خدائے واحد کی غلامی کا اظہار کرنے کے لئے اس میدان میں آئے ہو، آئندہ جب کبھی مسلمانوں کے خلیفہ کو کسی میدان جنگ میں اعلائے کلمۃ الحق کی خاطر تمہارے اجتماع کی ضرورت ہو تو اسی طرح عزیز و قریب، وطن و دیار اور مال و جائیداد کو چھوڑ کر حاضر ہو جانا۔ اس میدان کی حاضری ایک طرح کی فوجی

نمائش ہوگی کہ کس قدر لوگ جنگ کے لئے تیار ہوئے ہیں۔

(۳) ہر حاجی کے لئے ضروری ہے کہ جب حج کو روانہ ہو تو اپنا زادراہ لے کر جائے تاکہ دوسروں کے لئے باردوش نہ بن جائے۔ ایسے ہی ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ جہاد کی تیاری میں مصروف رہے اور ہر قسم کا ضروری سامان حرب اپنے پاس رکھے۔

(۵) ارکان حج سے فارغ ہو کر اپنی طاقت کے مطابق جانور ذبح کرے تاکہ معلوم ہو کہ ہم خود بھی خداے قدوس کے نام پر قربان ہونے کو تیار ہیں، لَنْ يَتَّالِ اللَّهُ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلَكِنْ يَتَّالِ التَّقْوَىٰ مِنْكُمْ۔ (الحج ۳۷)

(۶) حج میں تین چیزوں کی ممانعت ہے:

(۱) بے حیائی کی باتیں اور ناشائستہ کلام۔

(۲) ناشائستہ باتوں سے اپنے بھائیوں کو مخاطب کرنا۔

(۳) لڑنا، جھگڑنا، اس میں تعلیم دی کہ جب مسلمانوں کا لشکر ایک جگہ پر جمع ہو تو اسے ان باتوں سے پرہیز کرنا چاہئے تاکہ آپس میں اختلاف و منازعت نہ ہونے پائے۔

(۷) ایک مرکز پر اجتماع سے مقصد یہ تھا کہ ان میں عالمگیر اتحاد و اشتراک پیدا ہو، شوکت اسلام کا اظہار ہو، بحری اور بری سفر کے فوائد حاصل ہوں، اللہ کے بندوں کا عظیم الشان دربار منعقد ہو، فوجی نمائش ہو، عالمگیر اتحاد اسلامی کا سالانہ جلسہ ہو، آثار قدیمہ کے جویا، صنایع عالم کے متلاشی، عالمان طبقات الارض، واقفان علم الاسماء اور محققین تاریخ اقوام و جغرافیہ عالم اپنی علمی تحقیقات کو فروغ دیں۔

(۸) جب فرزندان اسلام ان نکالیف و شدائد کو برداشت کر لیں گے تو کوئی قوم ان کا مقابلہ نہ کر سکے گی۔ وہی حزب اللہ ہوگی جس کی فلاح و کامرانی کا وعدہ لسان الہی نے بار بار دیا ہے: إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (المجادلہ ۲۲)، وَإِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ (الصف ۱۷۳)۔

(۹) حج اگر مقصد اصلی ہو اور پھر تجارت بھی کر لے تو جائز ہے۔ ایسے ہی جہاد فی سبیل اللہ میں قانون الہی کی بلندی و برتری تو اصلی مقصد ہو، اس کے بعد اگر مال غنیمت بھی مل جائے تو کوئی حرج کی بات نہیں۔

(۱۰) حج کے بعد دو قسم کے آدمی فوراً ممتاز ہو جائیں گے۔ ایک وہ جن کے سامنے دنیا اور اس کی مآلوفات ہیں، مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا اتِّنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَنَا فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (البقرہ ۲۰۰) اور دوسرے وہ جو دنیا اور آخرت دونوں کے طالب ہیں، وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا اتِّنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (البقرہ ۲۰۱) یہی دوسری جماعت جنگ میں کام کرنے کے قابل ہوگی، تِلْكَ عَشْرَةٌ كَامِلَةٌ۔

## حج کے احکام

وَاتَّبِعُوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ فَإِنْ أُخْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ وَلَا تَخْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتَّى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِنْ رَأْسِهِ فَفِدْيَةٌ مِنْ صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَمَنْ تَبَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ تِلْكَ عَشْرَةٌ كَامِلَةٌ ذَلِكَ لِيَسُنَّ أَهْلَهُ حَافِزِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿٣٦﴾

“اور حج و عمرہ کو اللہ کے لئے پورا کرو اور اگر محصور ہو جاؤ تو جیسے کچھ میسر آئے قربانی کرو اور جب تک قربانی ٹھکانے نہ پہنچ جائے اپنا سر نہ منڈاؤ، پھر جو شخص تم میں بیمار ہو یا اسے سر کی طرف سے تکلیف ہو تو بدلہ ہے روزے یا خیرات یا قربانی، پھر جب با امن ہو جاؤ تو جس قدر قربانی میسر آئے اور جس کو میسر نہ ہو تو زمانہ حج میں تین دن کے روزے رکھے اور جب واپس آؤ تو سات، یہ پورے دس ہو گئے، یہ قانون اس شخص کے لئے ہے جس کے گھر والے مسجد حرام کے پاس نہ ہوں اور اللہ سے ڈرو اور اس بات کو جانے رہو کہ اللہ سخت عذاب والا ہے۔”

مسلمانوں کو مضبوط اور طاقتور سپاہی بنانے کے لئے حج و عمرہ کا حکم دیا جاتا ہے۔ حج کے مقامات حسب ذیل ہیں:

(۱) .... بیت اللہ، جس کا طواف کیا جاتا ہے۔

(۲) .... صفا اور مروہ کی پہاڑیاں، جو بیت اللہ الجلیل کے پاس ہیں۔

عمرہ میں صرف بیت اللہ کا طواف کیا جاتا ہے اور ان دو پہاڑیوں کے درمیان دوڑا جاتا ہے۔

(۳) .... شہر سے مشرق کی جانب میں میل کے فاصلہ پر منی ہے۔

(۴) .... منی سے آگے بڑھ کر تین میل پر مزدلفہ ہے۔

(۵) .... مزدلفہ سے تین میل پر عرفات کا میدان ہے۔

فریضہ حج تین طریق پر ادا کیا جاتا ہے۔

(الف) افراد، ایام حج میں صرف حج ہی ادا کیا جائے، اس سے فارغ ہونے پر عمرہ کا احرام باندھے۔

(ب) تمتع، حج کے مہینوں میں عمرہ کا احرام باندھے، اس کے تمام ارکان پورے کرے اور پھر اسی سال حج بھی کرے۔ تمتع کے معنی فائدہ اٹھانے کے ہیں۔ ایک شخص عمرہ سے فارغ ہو کر احرام کھول دیتا ہے اور اپنے وقت پر حج کر لیتا ہے، اس درمیانی وقت میں وہ ان چیزوں سے فائدہ حاصل کرتا ہے جو احرام کی حالت میں ناجائز تھیں، گویا عمرہ کی وجہ سے حج کے لئے تمتع کرتا ہے، اس لئے اس کو تمتع کہا گیا۔

(ج) قرآن، حج کے مہینوں میں حج اور عمرہ دونوں کی یکجائی کرے اور دونوں کے لئے احرام باندھ لے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ موسم حج میں صرف عمرہ کا احرام باندھے، مگر اس کا احرام کھولنے سے قبل حج

بھی ساتھ ہی ملائے۔

چونکہ حج اور عمرہ کا مقصد فوجی تربیت کی تکمیل ہے، اس لئے بہتر ہے کہ مسلمان دو جداگانہ سفر کریں، ایک حج کے لئے دوسرا عمرہ کے لئے۔ اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ عمرہ کے ایام میں مکہ مبارکہ کے تمام ضروری حالات سے واقفیت ہو جائے گی۔ اس لئے حج کے موقع پر اس امر کے لئے آسانی پیدا ہو جائے گی کہ امت مسلمہ کے بہترین دل و دماغ سے تبادلہ افکار و خیالات کرے، ان کی صحبت و ہم نشینی سے فیض یاب ہو اور دنیا بھر کے مسلمانوں کے نشو و ارتقاء اور حیات اجتماعی پر غور کرے۔

البتہ اگر کوئی شخص راہ کی بد امنی یا بیماری کی وجہ سے رک گیا اور حج و عمرہ کے لئے نہ جاسکا تو اپنی استطاعت کے مطابق قربانی کا جانور وہاں بھیج دے یا کسی معتبر آدمی سے کہہ دے کہ، قربانی کے روز میری طرف سے بھی وہاں ایک جانور ذبح کر دینا۔ جب اسے گمان غالب ہو کہ میرا جانور ذبح ہو گیا ہو گا تو احرام کھول دے۔ اس سے قبل سر منڈانے، یا بال کتروانے اور احرام کھولنے کی اجازت نہ ہوگی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حج کی صورت مقصود نہیں بلکہ قربانی کا جذبہ پیدا کرنا منظور ہے، کیونکہ اگر صرف صورت ہی پیش نظر ہوتی تو جب تک حج ادا نہ ہوتا احرام کھولنے کی اجازت نہ ہوتی۔ سر منڈانے کی اجازت حالت احرام میں اس شخص کو مل سکتی ہے جو بیمار ہو جائے، اس کے سر میں جو یس پڑ جائیں یا اور کوئی مرض ہو، مگر باوجود اس کے اسے جرمانہ ادا کرنا ہو گا۔ جرمانہ ادا کرنے کی تین صورتیں ہیں:

(۱) سر منڈا کر تین دن روزے رکھے۔

(۲) چھ مسکینوں کو صدقۃ الفطر کی مقدار کے مطابق الگ الگ دیے دے یعنی فی مسکین پونے دو سیر۔

(۳) بکری ذبح کر کے فقرا میں تقسیم کر دے۔

ان میں سے جو بھی صورت چاہے اختیار کر سکتا ہے۔

جب دشمن کا خوف دامن گیر نہ ہو اور چاروں طرف امن قائم ہو جائے تو جو شخص تمتع یا قرآن کے طریق پر حج ادا کرے اسے ایام حج میں حرم کے اندر ایک جانور ذبح کرنا ہو گا۔ اور اگر قربانی کی طاقت نہ ہو تو اس کے عوض میں دس روزے رکھنے پڑیں گے۔ تین دن کے روزے نویں ذی الحجہ سے قبل اور باقی حج سے فارغ ہو کر وطن میں آکر رکھ لے۔ حج افراد تو ہر شخص کر سکتا ہے، مگر تمتع اور قرآن کی صرف ان لوگوں کو اجازت ہے جو دور دراز کے رہنے والے ہوں اور میقات کی حدود میں ان کے گھر نہ ہوں۔ میقات کے اندر رہنے والوں کو صرف افراد کی اجازت ہوگی۔ میقات سے مراد وہ جگہ ہے جہاں سے احرام باندھ کر مکہ میں داخل ہونا پڑتا ہے، خواہ عمرہ کی نیت ہو یا حج کی۔

یہ اعلیٰ ترین قانون ہے، اس کی پابندی کرو۔ تمہاری حیات قومی کا دار و مدار اسی پر ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان ایک مرکز پر جمع ہوں، ان میں اتحاد و یگانگت پیدا ہو، ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوں اور جسم واحد بن جائیں۔ اگر تم نے اس کو ترک کر دیا تو اللہ تعالیٰ سخت عذاب میں مبتلا کرے گا۔ تمہاری وحدت و جمعیت جاتی رہے گی اور اختلافات پیدا

ہونے کی وجہ سے تم پر غیروں کو مسلط کر دیا جائے گا۔

الْحَجُّ أَشْهُرٌ مَّعْلُومَةٌ ۖ فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفْثَ وَلَا فُسُوقَ ۚ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۚ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمُهُ اللَّهُ ۚ وَتَذَكَّرُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَىٰ ۚ وَاتَّقُوا يَوْمَ الْأَكْبَابِ ﴿٢٥﴾

”اور حج کے چند مہینے معلوم ہیں، پس جس نے ان میں حج کو لازم کر لیا تو پھر ایام حج میں نہ کوئی فحش بات ہے اور نہ بے حکمی اور نہ نزاع اور جو کچھ نیکی تم کرو گے اللہ اس کو جان لے گا اور زاد راہ لیا کرو، بیشک بڑا فائدہ خرچ کرنے میں بچنا ہے اور اے عقلمند و امجد مجھ سے ڈرتے رہو۔“

حج کے لئے تین مہینے مقرر ہیں: شوال، ذیقعدہ اور ذی الحجہ کے دس ایام۔ ان دنوں میں حسب ذیل چیزوں کی ممانعت ہے:

(الف) رفث، فحش باتوں سے پرہیز کرنا۔ حدیث میں آتا ہے: اذا كان يوم صوم احدكم فلا يرفث ولا يفض، تمام لغو اور فضول باتیں جو حج سے پہلے حرام تھیں، اب ان میں اور زیادہ حرمت آجائے گی۔ اپنی بیوی سے بے حجابی کی باتیں کرنا قبل از حج جائز تھا، مگر ان دنوں وہ بھی حرام ہو گا۔

(ب) فسوق، اس میں ہر قسم کا گناہ شامل ہے۔ ابن عباس، طاؤس حسن، سعید بن جبیر، قتادہ، زہری، ربیع، اور قرظی کی بھی یہی رائے ہے۔ خوشبو لگانا، بال کتر وانا بھی جائز نہیں۔

(ج) جدال، رقیقوں سے لڑنا جھگڑنا، گالی گلوچ دینا اور ناشائستہ الفاظ سے خطاب کرنا بھی ممنوع ہے۔

ایام حج میں صرف یہ تین باتیں ناجائز ہیں۔ ان کو ترک کر کے جو اچھا کام ہو شوق سے کرو، اس کی ضرورت جزا ملے گی۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہر شخص اپنا زاد راہ لے کر جائے، دوسروں کے لئے باردوش نہ ہو۔ یمن کے لوگوں کا دستور تھا کہ سفر خرچ لیے بغیر گھروں سے حج کے لئے نکل کھڑے ہوتے۔ وہاں جا کر بھیک مانگتے، چوریاں کرتے اور دوسروں کا مال غصب کرنے کی فکر میں رہتے۔ بظاہر ان کا مقصد صبر و توکل پیدا کرنا تھا، مگر تقویٰ و طہارت حاصل کرنے کا یہ طریق نہیں۔ اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ انسان اپنا زاد راہ ہمراہ لے کر نکلے، اس طرح ایک تو سوال کرنے سے بچ جائے گا دوسرے صدمہ گناہوں سے محفوظ رہے گا۔

ارباب عقل و خرد تو وہی ہیں جو خدا کی یاد میں اپنا تمام وقت صرف کرتے ہیں اور ان کے پیش نظر ہر وقت خدا کے نام پر قربان ہونے کا خیال رہتا ہے، مگر جو لوگ دنیا سے علیحدگی اختیار کر کے بھیک مانگنا شروع کر دیتے ہیں انہیں کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ جب مسلمان حج کے زمانہ میں ان خصلتوں کے عادی بن جائیں گے تو انہیں زمانہ جنگ میں شریفانہ طور پر رہنا آسان ہو جائے گا اور یہ ایک خصوصی امتیاز ہو گا اسلامی لشکر کا کہ اس میں فسق و فجور اور تمام فواحش و منہیات کا ارتکاب نہیں ہوتا جبکہ دوسری قوموں کے لشکر ہر قسم کی بدکاری کے مرتکب ہوتے ہیں۔

## تجارت بھی جائز ہے

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّن رَّبِّكُمْ ۖ فَإِذَا أَقَضْتُمْ مِّنْ عَرَفَاتٍ فَأَذْكُرُوا اللَّهَ عِندَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۖ وَاذْكُرُواْ كَمَا هَدَيْتُمْ ؕ وَإِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهِ لَبِنَ الضَّالِّينَ ﴿٢٥﴾

”تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو تو تم پر کچھ گناہ نہیں، پھر جب تم عرفات سے لوٹو تو اللہ کو “مشعر الحرام” کے پاس یاد کرو اور اس طرح یاد کرو جس طرح اس نے تم کو بتایا ہے اور بیشک اس سے پہلے تم ناواقف تھے۔“

ابن عباس کہتے ہیں کہ، زمانہ جاہلیت میں عکاظ، مجنہ اور ذوالحجاز منڈیاں تھیں۔ حج کے ایام میں یہاں خوب تجارت ہوا کرتی تھی، اسلام قبول کرنے کے بعد لوگوں نے اس کو مناسب خیال نہ کیا کہ حج کے دنوں میں تجارت کی جائے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ جب مقصود اصلی محض حج بیت اللہ ہے اور اس ذیل میں اگر تجارت بھی کر لی تو کوئی گناہ کی بات نہیں، البتہ یہ ضروری ہے کہ تجارت حقیقی غرض نہ بن جائے۔ فضل کے معنی رزق ہیں۔ چنانچہ سورہ جمعہ میں فرمایا: فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللَّهِ (الجمعة ۱۰) ایک اور مقام پر یوں ارشاد ہوا: يَصْرِفُونَ فِي الْأَرْضِ يَتَّبِعُونَ مِّن فَضْلِ اللَّهِ (الزلزلہ ۲۰) آل عمران میں آیہ: فَانْقَلِبُوا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ وَفَضْلٍ (آل عمران ۱۷۴)

۹ ذی الحجہ کو عرفات کے میدان میں تمام حاجیوں کو قیام کرنا پڑتا ہے۔ دنیا بھر کے عالموں کی کافر نس باہمی مشورہ کر کے چند امور کا فیصلہ کرتی ہے جو تمام دنیا کے مسلمانوں کے لئے ناگزیر و ضروری ہوں۔ امیر حج ایک خطبہ دیتا ہے، اس میں ان امور کا اعلان کیا جاتا ہے جو اجتماعی حیثیت سے دنیائے اسلام کے واسطے مفید و نافع ہوں۔ اور بتایا جاتا ہے، کہ سال نو میں فرزند ان اسلام کا پروگرام یہ ہوگا۔ جو شخص اس روز عرفات کے میدان میں موجود نہ ہوگا، وہ ان تعلیمات سے محروم رہے گا اور حج سے جو اصلی غرض تھی فوت ہو جائے گی، اس لئے شارع نے فرمادیا کہ “الحج عرفة”۔

عرفات کو جاتے ہوئے راستہ میں منیٰ اور مزدلفہ کے پاس سے گزرنا پڑتا ہے، جب میدان عرفات سے فراغت ہوگی تو واپسی کے وقت دسویں رات کو مزدلفہ میں ٹھہرنا ہوگا۔ مغرب اور عشا کی دونوں نمازوں کو عشا کے وقت میں یکجا پڑھنا پڑے گا۔ “مشعر حرام” اسی مزدلفہ میں ایک پہاڑ ہے۔ “عند المشعر الحرام” سے مراد تمام مزدلفہ ہے، وہاں رہ کر اللہ کا ذکر کرنا ہوگا۔

اسلام سے قبل جتنے مذاہب تھے، ہر ایک کا روئے سخن اپنی اپنی قوم کی طرف تھا۔ یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے کہ اس کی دعوت عالمگیر اور اس کے مخاطب تمام ادیان و مذاہب ہیں۔ ایسا قانون نوازش کیا گیا ہے جس سے مسلمان تمام دنیا پر فضیلت و برتری حاصل کر سکتے ہیں۔ نزول قرآن سے پہلے عرب میں حکومت و جہانداری کی قابلیت نہ تھی اور نہ اس قسم کا کوئی قانون ان کے پاس موجود تھا۔ پس اس موہبت کبریٰ اور نعمت عظمیٰ پر جس قدر ممکن ہو خدائے برتر کی حمد و تقدیس بیان کریں۔

## اتحاد عمل شرط ہے

ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٣٥﴾

”پھر جہاں سے دوسرے لوگ چلیں تم بھی اسی جگہ سے چلو، اور اللہ سے مغفرت طلب کرو، بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔“  
زمانہ جاہلیت میں قریش بیت اللہ کے مجاور ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو ”حمس“ کہتے تھے۔ زمانہ حج میں عام لوگ عرفات کے میدان میں جا کر قیام کرتے، مگر یہ مزدلفہ ہی تک رہتے۔ کیونکہ وہ حرم کی حد میں ہے اور عرفات اس سے باہر، انہیں خیال تھا کہ حدود حرم سے باہر جانا ان کی شرافت، وجاہت اور عزت کے خلاف ہے اور عوام الناس سے ملنا تقدس مذہبی کے منافی۔ قرآن حکیم نے اس آیت میں دو عظیم الشان غلطیوں کو دور کیا جن میں دنیا ہمیشہ سے مبتلا رہی ہے اور آج بھی باوجود تمدن و تہذیب میں انتہائی ترقی حاصل کرنے کے اس کا قدم اسی جگہ پر ہے:

(الف) اللہ کے نزدیک قومی امتیازات و خصائص کوئی چیز نہیں، بلکہ اس کی نظر میں سب یکساں ہیں۔ وہاں اگر کسی چیز کی پرشش ہے تو ورع و تقویٰ کی: إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (الحجرت)، اس لئے نسل انسانی میں حقیقی مساوات ہونا ضروری ہے اور یہ نہیں ہو سکتا جب تک تمام امتیازات قومی مٹانے دیئے جائیں۔

(ب) قوموں کی تباہی و بربادی کی ابتداء ہوتی ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ اور عوام الناس میں تعلقات و روابط قائم نہ رہیں اور ایک دوسرے سے ملنا ترک کر دیں۔ بہترین دل و دماغ کو دست و بازو کی تلاش و جستجو رہتی ہے۔ جب عام لوگوں سے میل جول نہ رہے گا تو اعوان و انصار کا فقدان ان کی فاسامانی کا باعث بن جائے گا۔ عوام الناس کو قدم قدم پر راہ نما اور مصلح کی ضرورت رہتی ہے، جب انہیں راہ حق و حریت بتانے والا کوئی نہ ملے گا تو روز بروز ضلالت و گمراہی میں بڑھتے جائیں گے، تا آنکہ ان میں اور حیوانوں میں کوئی فرق و امتیاز باقی نہ رہے گا۔

ان دونوں خرابیوں کو دور کرنے کے لئے اللہ نے کہا کہ کوئی شخص مزدلفہ میں نہیں ٹھہر سکتا، بلکہ سب کے سب عرفات میں قیام کریں اور اسی جگہ سے ان کی واپسی ہو۔ اب تک جو کچھ ہو گیا، اس کو صرف اس بنا پر نظر انداز کیا جاتا ہے کہ اس کا اعادہ نہ ہو۔

## شریف النسب کو دعوت اسلام دو

فَإِذَا قُضِيَتْكُمْ مَنَاسِكُكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا ۚ فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِن خَلْقٍ ﴿٣٦﴾

”پھر جب حج کے ارکان پورے کر چکو تو جس طرح تم اپنے باپ دادا کے ذکر میں لگ جاتے تھے ویسا بلکہ اس سے بڑھ کر خدا کا ذکر کرو۔“



جاہلیت میں دستور تھا کہ حج سے فارغ ہو کر منیٰ کے میدان میں تین دن تک مجالس و مجامع منعقد کرتے اور ان میں اپنے باپ دادا کے مفاخر و فضائل بیان کرتے۔ قرآن نے اس بیہودہ رسم کی اصلاح کی اور حکم دیا کہ اس کی جگہ پر اللہ کا ذکر ہونا چاہئے، جو خود بڑا ہے اور دوسروں کو بڑائی بخشتا ہے۔ باپ دادا کی بزرگی بیان کرنے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔

باپ دادا کا ذکر وہی لوگ کرتے ہیں، جو شریف اور خاندانی ہوں۔ جن کا ماضی مشہور آفاق ہو، جن میں درخشندگی اور تابناکی کے سوا کچھ نہ ہو اور جنہوں نے جو انردی و شجاعت، فیاضی و سخاوت اور مہمان نوازی و صلہ رحمی کے عظام امور انجام دیئے ہوں۔ ادنیٰ درجہ کے لوگوں کی نہ کوئی حیثیت ہوتی ہے اور نہ وہ اپنے بزرگوں پر کسی قسم کا فخر کر سکتے ہیں۔ پس اس آیت سے ضمنیہ بات بھی سمجھ میں آگئی کہ ہر مسلمان کا یہ اولین فرض ہونا چاہئے کہ جس وقت تبلیغ و دعوت اسلام کے لئے میدان میں قدم رکھے تو اس کا روئے سخن شریف اور خاندانی لوگوں کی طرف ہو، ان کو وہ مذہب کی طرف متوجہ کر دے۔ ان میں اعلیٰ ترین اخلاق اور شریفانہ جذبات پہلے سے موجود ہوتے ہیں، صرف راستہ دکھانا باقی رہتا ہے۔ گویا بارود تیار ہے شنبہ دکھانے کی دیر ہے خود بخود بھڑک اٹھے گی۔ جب ان لوگوں کے سامنے اسلام کی تعلیم پیش کی جائے گی تو ان کے لئے سونے پر سہاگہ کا کام دے گی اور بہترین خدمات مذہبی انجام دیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: الناس معادن كمعادن الذهب والفضة، لوگ بھی سونے اور چاندی کی کانوں کی مانند ہیں۔ سونے کی کان سے سونا ہی نکلے گا اور چاندی کی کان سے چاندی، یہی حال خاندانوں اور قبیلوں کا ہے۔ ایک دوسری حدیث میں آتا ہے: خیارکم فی الجاہلیۃ خیارکم فی الاسلام اذا فقهوا، جو شخص زمانہ جاہلیت میں اچھا تھا اس کی اچھائی اسلام قبول کرنے کے بعد بھی باقی رہے گی، بلکہ جس وقت وہ قرآن میں درس و فکر کرے گا تو اس کی شرافت کو چار چاند لگ جائیں گے<sup>۱</sup>۔

## دو قسم کے آدمی

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۳۷﴾ أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا ۖ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿۳۸﴾

• ہندوستان کے طول و عرض میں بیٹھار عربی درس گاہیں مصروف تعلیم ہیں، مگر جو لوگ وہاں سے فارغ ہو کر نکلتے ہیں عام طور پر ملک و ملت کے لئے عضو معطل ثابت ہوتے ہیں، اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ عربی تعلیم حاصل کرنے کے لئے وہی لوگ آتے ہیں جو بیکار اور معذور ہوں۔ گھر کا کام کاج نہ کر سکیں، ادنیٰ خاندانوں کے ہوں، فہم و فراست سے کورے اور بلید الذہن ہوں۔

مگر جب انگریزی درس گاہوں کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قوم کا بہترین ذخیرہ یہاں تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ خاندانی روایات اور ظاہری و جاہلیت کے اعتبار سے وہ کسی سے کم نہیں ہوتے۔ دل و دماغ اور عقل و دانائی میں کامل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام تحریکات قومی میں یہی لوگ پیش پیش ہوتے ہیں، لیکن مذہب سے بعد و بجران کے حاسن و فضائل کے آئینہ کو گرد آلود اور مکدر کر دیتا ہے۔ تعلیم یافتہ طبقہ میں بہترین جذبات ہوتے ہیں، مذہبی جوش، حمیت وطن اور خدمت اسلام میں وہ کسی سے پیچھے نہیں ہوتے، مگر ان کی اکثر کوشش بے موقع صرف ہوتی ہے۔ اس غلط کاری کو دور کرنے کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت کے لئے صرف قرآن کی تعلیم کو عام کر دیا جائے اور انگریزی خوانوں کے کان اس کی آیات سے آشنا ہو جائیں تو انشاء اللہ تمام خرابیاں دور ہو جائیں گی، پھر مذہبی رنگ میں یہ لوگ جس قدر جوش و ولولہ کیساتھ کام کریں گے علماء ان کی گرد کو بھی نہیں پا سکیں گے۔

”پھر لوگوں میں کچھ ایسے ہیں جو دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں دنیا ہی میں سب کچھ دیدے اور ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور لوگوں میں ایسے بھی ہیں جو دعا مانگتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی خیر و برکت دے اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا، یہی وہ لوگ ہیں جن کو ان کے کئے کا حصہ ہے اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔“

تعلیم حاصل کر لی، مذہبی اعمال کے پابند بن گئے مگر مقاصد و اغراض کے اعتبار سے جس قدر باہمی فرق مراتب ہوتا ہے اس کا ظہور نہ ہوا۔ بعض لوگ محض دکھانے کی غرض سے ان تمام تکالیف کو برداشت کر رہے تھے، اور بعض کے پیش نظر مقاصد عالیہ اور مصالح شرعیہ تھے۔ اس امتحان گاہ میں آتے ہی دونوں جماعتوں میں فرق و امتیاز ہو گیا اور ایک کی صف دوسرے سے جدا گانہ قائم ہو گئی۔ منافقین پکار پکار کے اپنے کفر و انفاق باطنی اور الحاد فی العمل کا اظہار کر رہے تھے اور مومنین قانتین کا خلوص و ایثار اپنا رنگ الگ دکھا رہا تھا اور یہ تفریق اس لئے ضروری تھی کہ حج سے فارغ ہوتے ہی جہاد فی سبیل اللہ کا حکم دیا جائے گا، اگر ارباب عمل اور نااہل لوگوں میں علیحدگی نہ کی جائے تو میدان جنگ میں شہداء و تکالیف کا سامنا کرنا پڑے گا۔ پس مناسب یہی تھا کہ ان کو پہلے سے جدا کر دیا جائے۔

منافقین کی کیفیت یہ تھی کہ وہ بیاگ دہل کہہ رہے تھے کہ: رہنا اتنا فی الدنیا، ان کے سامنے دنیا تھی، اس کا عیش و آرام، قدر و منزلت، اور عزت و اکرام تھا، شہرت و ناموری ان کی غایت الغایات تھی۔ نہ تو اعمال صالحہ اور اخلاق فاضلہ ان کے پیش نظر تھے اور نہ انہیں اپنی اصلاح و درستی کا خیال تھا۔ اس لئے وہ دنیا ہی میں اپنی کوششوں کے تمام ثمرات و نتائج حاصل کرنا چاہتے تھے، مگر ایک دوسرا گروہ بھی تھا جو اپنے جذبہ توحید پرستی کی وجہ سے تمام دنیا کی فلاح و بہبود کا اپنے آپ کو ذمہ دار گردانتا تھا، جس کی اعلیٰ ترین غرض یہی تھی کہ ہر انسان صرف خدائے واحد کا غلام ہو، سب کی اسر و تعبد کی بیڑیاں کٹ جائیں اور کرۂ ارضی عدل و انصاف سے معمور ہو جائے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام دنیا و آخرت پر حاوی ہیں، اس لئے اس کی دعا یہ تھی:

رَبَّنَا اتِّنْفِیْ الدُّنْیَا حَسَنَةً وَفِی الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ پس کام کرنے کے لئے یہی لوگ زیادہ مفید و نافع ثابت ہوں گے اور پہلے گروہ کو فوراً الگ کر دیا جائے گا، تاکہ اس کی صحبت و ہم نشینی دوسروں پر برا اثر نہ ڈالے۔

مقطع سخن

وَادْكُرُوا اللَّهَ فِي أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ ۖ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا أَثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَأَخَّرَ فَلَا أَثْمَ عَلَيْهِ ۚ لَبِئْسَ اتَّخَذَ  
وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٢٠﴾

”اور گنتی کے ان چند دنوں میں اللہ کو یاد کرتے رہو پھر جو دو ہی دن میں جلدی چلا گیا تو اس پر کچھ گناہ نہیں اور جو ٹھہرا رہا اس پر بھی کچھ گناہ نہیں یہ اس کے لئے ہے جو ڈرے اور اللہ سے ڈرتے رہو اور اس بات کو جان لو کہ تم اسی کے پاس جمع

کئے جاوے۔”

فریضہ حج کے قریب تمام ضروری احکام آگئے، اب صرف ایک مسئلہ کو بیان کر کے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے کہ حج کا مقصد اصلی کیا ہے اور یہ عظیم الشان اجتماع کس غرض کے لئے کیا گیا ہے، تاکہ لوگوں میں تنبیہ و اعتبار پیدا ہو اور ہر شخص آنکھیں کھول کر دیکھے۔

قربانی سے فارغ ہونے کے بعد قاعدہ یہ ہے کہ حاجی تین دن تک منی میں ٹھہرے۔ ان دنوں کو ایام تشریق کہا جاتا ہے۔ ان میں ذکر کی صورت یہ ہوتی ہے کہ دسویں تاریخ کو بڑے پتھر ”جرہ عقبی“ پر سات کنکریاں مارے اور ہر کنکری کے ساتھ اللہ اکبر کہتا جائے۔ کنکریوں کے مارنے کا وقت صبح صادق کے طلوع سے شروع ہوتا ہے۔ گیارہ اور بارہ تاریخ کو تینوں پتھروں پر سات سات کنکریاں مارے، مگر ان دونوں تاریخوں پر زوال آفتاب کے بعد ماریں ہوں گی اور اس کے بعد مکہ جانے کی اجازت ہے اور اگر وہاں تیرہویں تاریخ کی صبح ہو گئی تو پھر تینوں پتھروں کو طلوع فجر کے بعد کنکریاں ماریں پڑیں گی۔

اصلی مقصد قربانی کا جذبہ صادقہ پیدا کرنا ہے۔ جب یہ حقیقت طاری ہو گئی تو خواہ اب دودن کا قیام ہو یا تین دن کا، قانون الہی کی پابندی الزم اللوازم ہے۔ اس بات کو خوب ذہن نشین کر لو کہ جس طرح آج اللہ کے حکم سے اس میدان میں اپنا اپنا زاد راہ لے کر آگئے ہو، آئندہ بھی وہ تم کو خلفائے اسلام کی معرفت، جہاد فی سبیل اللہ کے لئے میدان جنگ میں آنے کی دعوت دیگا کہ اس کا قانون بلند و برتر ہو اور دنیا میں فساد نہ ہونے پائے۔ اس وقت تمہارا فرض ہو گا کہ اپنا اپنا سامان جنگ لے کر میدان حرب میں حاضر ہو جاؤ۔

وَمِنَ النَّاسِ مَن يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهَدُ اللَّهُ عَلَى مَا فِي قَلْبِهِ ۖ وَهُوَ أَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿٣٧﴾ وَإِذَا تَوَلَّى سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَاسِدَ ﴿٣٨﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللَّهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ ۖ وَلَيْشَسَّ الْبِهَادُ ﴿٣٩﴾

”اور بعض آدمی ایسا ہے کہ دنیا کی زندگی میں تم کو اس کی بات پسند آتی ہے اور جو کچھ اس کے دل میں ہے اس پر اللہ کو گواہ لاتا ہے، حالانکہ وہ سخت جھگڑالو ہے اور جب لوٹ کر جاتا ہے تو دوڑتا پھرتا ہے تاکہ ملک میں فساد پھیلانے اور کھیتی اور نسل کو تباہ کرے اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈرو تو غرور اس کو گناہ پر آمادہ کرتا ہے۔ پس اس کے لئے دوزخ کافی ہے اور وہ واقعی برا ٹھکانا ہے۔“

شریعت نے چند اعمال ہر مسلم پر لازم کر دیئے ہیں کہ ان کی پابندی سے اخلاق فاضلہ اور جذبات صادقہ پیدا ہوں۔ اللہ کی نظر ہمیشہ ان اخلاق پر ہوتی ہے اور اس کے نزدیک وہی اعمال معتبر ہوتے ہیں جن کا اثر اخلاق پر پڑے۔ جو لوگ ان اعمال شریعہ کے مقاصد کو فراموش کر دیتے ہیں ان کی محنت رائیگاں جاتی ہے۔ گزشتہ آیات میں دو قسم کے آدمی بیان کئے گئے، اب ان کے خصائص و امتیازات پر اور زیادہ روشنی ڈالی جاتی ہے تاکہ اہل و نااہل میں تمیز ہو جائے اور وہ حسب ذیل ہیں:

(۱).... دنیاوی امور میں نہایت ہی دور بینی اور حزم و احتیاط کا اظہار کرتے ہیں، مصلحت اندیشی اور عاقبت بینی کے پیکر مجسم ہوتے ہیں، حب قومی، جوش ملی اور ولولہ دینی ان کے فقرے فقرے سے ٹپکتا ہے۔ فداکاری اسلام اور سرفروشی ملت ان کا دعویٰ ہوتا ہے۔

(۲).... عام مجامع میں قسمیں کھا کھا کر اپنے مذہبی جوش کا اعلان کرتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہوتا ہے کہ ان کو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ان کے اعمال حیات ہی ان کی پردہ دری کر دیتے ہیں اور دنیا جانتی ہے کہ: چوں، مخلوت می روند آں کار دیگر می کنند۔

(۳).... جب ان کی غداری اور ملت فروشی کا اظہار ہوتا ہے اور لوگ ان سے احتساب کرتے ہیں تو اپنی غلط کاری تسلیم کرنے بجائے جھگڑا کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

(۴).... اس قسم کے بد بخت جب مسلمانوں سے الگ ہوتے ہیں تو ملک میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑکاتے ہیں، ہنگامہ آرائی ان کا کام ہوتا ہے اور قوم کو مختلف گروہوں میں تقسیم کرنا ان کا مقصد، تاکہ لوگ ان کی طرف متوجہ ہوں اور روپیہ وصول ہو۔

(۵).... عورتوں سے قانون کے خلاف فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں اور زنا کے مرتکب ہوتے ہیں، اس طرح کھیتوں کی تباہی عمل میں آتی ہے۔

(۶).... لڑکوں کے ساتھ بد کاری کرتے ہیں اور لواطت کے ذریعہ اپنی نسل بھی برباد کرتے ہیں۔

یہ لوگ ذبح کرنے کے قابل ہیں اور ان کو دنیا و آخرت میں ہر گز عزت نصیب نہ ہوگی۔ اگر قوم ان کو ان کی غلط کاریوں پر متنبہ کرتی ہے اور اس کا مطالبہ ہوتا ہے کہ تعلیم صحیح کے مقاصد سامنے رکھو ورنہ مسند امامت سے الگ ہو جاؤ تو گھبرا کر ناراضی کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر ہم نے اپنا طریق عمل بدل دیا اور قوم کی متفقہ آواز کے آگے اپنی گردن جھکا دی تو دنیا بھر میں ذلت و رسوائی ہوگی۔ اس لئے عزت اسی میں ہے کہ مستبدانہ کارروائی کریں تاکہ کوئی باز پرس نہ کر سکے۔ اس قسم کے بدکار دزد زح کا ایندھن بنیں گے اور کبھی ان کا نام روشن نہ ہوگا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَن يُشِيرُ إِلَىٰ نَفْسِهِ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ ﴿۷۶﴾

اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کی رضا جوئی کے لئے اپنی جان دے دیتے ہیں اور اللہ بندوں پر بڑی شفقت رکھتا ہے۔ اصلی معنی میں قوم کے راہ نمایہ لوگ ہیں جو اعمال کی صورت کے ساتھ مقاصد کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔ خداوند قدوس کی رضا طلبی ان کی غایۃ الغایات ہوتی ہے۔ اگر آج انہیں مکہ میں جمع کیا گیا ہے تو کل خلیفہ اسلام کے حکم پر چین میں جاسکتے ہیں، قربانی کا جذبہ کامل طور سے ان میں پیدا ہو چکا ہے۔ اللہ اپنی رحمت سے ان کی کوششوں کو ضائع نہیں کرے گا۔

پورے پورے مسلم بن جاؤ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿٢٨٩﴾ فَإِنْ زَلَلْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْكُمْ الْبَيِّنَاتُ فَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٢٩٠﴾

مسلمانو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ، اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو، بیشک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے، پھر اس کے بعد کہ تمہارے پاس نشانیاں آچکیں اگر تم نے لغزش کی تو جان رکھو، اللہ زبردست حکمت والا ہے۔

جس طرح اخلاص و حسن نیت کے ساتھ تم نے احکام حج ادا کئے ہیں ایسے ہی تم میں سے ہر شخص جہاد فی سبیل اللہ میں شریک ہو اور آئندہ تمہیں جو حکم دیا جائے اس کو پوری پابندی کے ساتھ ادا کرو۔ اسلام یہی نہیں کہ نماز و روزہ ادا کر دیا اور مطمئن ہو گئے، بلکہ تمام احکام کا پورا کرنا اور ان صلاقی و نسکی و محیای و مصلقی اللہ رب العلمین، کی حقیقت کو اپنے اوپر طاری کر لینا اسلام ہے۔ اس کے وجود سے دنیا میں ہر نیکی کا قیام ہو اور ہر برائی دور ہو۔ عیش پرستی اور آرام طلبی شیطان کی تعلیم ہے اور تباہی و بربادی کا پیش خیمہ۔ اس کی ہمیشہ یہی کوشش رہتی ہے کہ تم مسلمان اللہ کی راہ میں قربان ہونے سے پرہیز کرو۔ مگر تمہیں ان باتوں کا خیال نہ کرنا چاہئے۔ تمہاری حیات قومی اور اجتماعی زندگی کے لئے بہترین قانون نوازش کیا گیا ہے جس کا ایک مرتبہ تجربہ بھی ہو چکا ہے کہ شربانی سے جہانبانی تک پہنچ گئے۔ اس حقیقت صادقہ کے بعد اگر تم نے قرآن چھوڑ دیا تو اللہ اپنے غلبہ و اقتدار سے کام لے کر تمہیں فنا کر دے گا اور یہی اس کی حکمت کا تقاضا ہو گا۔

هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلُلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالسَّحَابِ وَقُضِيَ الْأَمْرُ ۚ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ﴿٢٩٠﴾

کیا وہ اس بات کے منتظر ہیں کہ اللہ فرشتوں کیساتھ سائبانوں میں ان کے پاس آئے اور قصہ طے کر دیا جائے اور سب کام اللہ ہی کی جانب لوٹائے جاتے ہیں۔

اعلیٰ ترین قانون تمہارے پاس ہے، اس پر عمل کر کے نتائج بھی سامنے آگئے، اب کیوں نہیں اس پر عمل کرتے اور کس انتظار میں ہو؟ کیا یہ چاہتے ہو کہ اللہ خود نزول اجلال کرے، ملائکہ اولیٰ الجحہ کا لشکر جرار اس کی جلو میں ہو اور بایں شان و شوکت تم سے آکر کہے کہ یہ میرا حکم ہے۔ اسے مانو اور اس پر عمل کرو۔ تمہارے لئے اتنا بس کرتا ہے کہ نبی عربی نے اس قانون کی تبلیغ کر دی۔ عمل کرنا تمہارا فرض ہے اور اگر باوجود ان دلائل واضحہ کے تمہیں یقین نہیں تو انتظار کرو۔ اللہ کا عذاب آکر تمہاری بیخ کنی کر دے گا۔ عذاب کے فرشتے تمہیں نیست و نابود کر دیں گے اور دنیا سے تمہارا نام و نشان مٹ جائے گا۔ جب تمہیں صاف صاف کہہ دیا کہ تمہاری زندگی کا راز جہاد فی سبیل اللہ میں پوشیدہ ہے، اس لئے اس کے بعد کس دلیل و برہان کی ضرورت ہے۔

آفتاب آمد دلیل آفتاب

گر دلیلے باید از دے رخ متاب!

جہاد سے منہ موڑ گئے تو فنا ہو جاؤ گے اور یہ بات ہو کر رہے گی۔ کیونکہ زمین و آسمان کے تمام امور کا نظم و نسق خود اللہ ہی کرتا ہے۔

سَلِّفِيْ اَسْمٰى اَعْيَلْ كَمْ اَتَيْنَهُمْ مِّنْ اٰيَةٍ بَيِّنَةٍ ۚ وَمَنْ يُضِلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُ فَلَاَ اللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝  
بنی اسرائیل سے پوچھ لو ان کو ہم نے کتنی کچھ کھلی نشانیاں دیں اور جو شخص اس کے بعد کہ اللہ کی نعمت اس کے پاس پہنچ چکی ہو بدلتا ہے تو بیشک اللہ سخت عذاب والا ہے۔

اگر تمہیں کسی قسم کا شک و اشتباہ ہو کہ یہ قانون کس طرح ایک قوم کے لئے زندگی بخش ہو سکتا ہے اور محض جہاد فی سبیل اللہ پر کیسے حیات قومی کا انحصار ہے؟ تو بنی اسرائیل سے پوچھ لو، ان کو توراۃ دی گئی کہ اس کے ذریعہ سے دنیا میں ترقی کر سکیں اور جہاد فی سبیل اللہ ان پر فرض کیا گیا۔ جب تک وہ ان دونوں کے پابند رہے خلافت ارضی ان کے پاس تھی اور جہاں انہوں نے ان سے بعد و ہجر اختیار کیا فنا ہو گئے۔ ان کے تزل و انحطاط کے اعظم ترین اسباب یہی دو تھے۔

(الف) کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیا: كَذَبَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اٰتُوْا الْكِتٰبَ ۚ كَتَبَ اللّٰهُ وِرَآءَ ظُهُورِهِمْ (البقرۃ ۱۰۱)  
(ب) جہاد فی سبیل اللہ کو چھوڑ بیٹھے: فَلَمَّا كَتَبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ (البقرۃ ۲۴۶)  
حقیقت یہ ہے کہ ان سے بڑھ کر بنی اسرائیل کے لئے اور کوئی نعمتیں ہو سکتی تھیں؟ مگر انہوں نے قدر نہ کی۔ ایسے ہی تم مسلمانوں کو دو چیزیں نوازش کی گئی ہیں:

(۱) قرآن حکیم: لَاۤ اٰتٰیْهِهٖ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ (حم سجدہ ۴۲)

(۲) جہاد فی سبیل اللہ: وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادٍ (الحج ۷۸)

اگر تم بھی ان کو چھوڑ بیٹھے تو تمہیں سخت عذاب دیا جائے گا اور تم پر فتناری ہوگی۔

## جہاد فی سبیل اللہ کی غرض

اللہ کی راہ میں لڑنے کا حکم دیا گیا۔ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا: ای اعمال افضل آپ نے ارشاد فرمایا: الصلوٰۃ لوقتہا، مگر جس وقت صحابہ کرام کو احب الاعمال الی اللہ کی تلاش ہوئی تو اس کے جواب میں سورۃ بقرہ صف نازل کی گئی: ان اللہ یحب الذین یقتلون فی سبیلہ صفا کانہم بنیان مرموص۔ صرف قتال فی سبیل الحق والحریت ہی اللہ کو محبوب ہے۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ آپ سے سوال کیا گیا: ای اعمال افضل قال الایمان باللہ ورسولہ قیل ثم ماذا قال الجہاد فی سبیل اللہ قیل ثم ماذا قال حج مبرور، دراصل ان تمام روایات میں کوئی اختلاف نہیں۔ اس لئے کہ ہر جگہ فضیلت کا معیار جدا گانہ ہے۔ پہلا سوال انفرادی حیثیت رکھتا تھا، فرداً فرداً بہترین اعمال نماز ہی ہے کہ یہی عماد الدین ہے اور اسی پر آگے چل کر دین کی عمارت محکم و استوار ہوگی، لیکن جب احب الاعمال الی اللہ کا سوال کیا گیا تو اس کا

منشایہ تھا کہ قومی نقطہ نگاہ سے افضل ترین اعمال، ارشاد ہوا، جس کا نتیجہ اعلیٰ کلمۃ اللہ اور ظہور شعائر الہیہ ہو، تو وہ یقیناً جہاد فی سبیل اللہ ہی ہو سکتا ہے کہ اسی پر قومی زندگی کا دارومدار ہے۔ ایک شخص نے آپ سے پوچھا، ذرۃ الاسلام، یعنی اسلام میں چوٹی کا عمل کیا ہے؟ تو جواب یہی تھا کہ الجہاد فی سبیل اللہ۔ اگلی آیات میں جہاد کے اغراض و مقاصد بیان کئے جاتے ہیں۔

زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا ۚ وَالَّذِينَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ ۗ وَاللَّهُ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۱﴾

کافروں کے لئے دنیا کی زندگی عمدہ کر دکھائی گئی ہے اور وہ مسلمانوں کے ساتھ تمسخر کرتے ہیں اور جو لوگ پرہیزگار ہیں وہ قیامت کے روز درجہ میں ان سے اوپر ہوں گے اور اللہ جس کو چاہتا ہے بے حساب روزی دیتا ہے۔ جو لوگ مذہب کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، جب ان کے سامنے صحیح تعلیم پیش کی جاتی ہے تو اس کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے سامنے صرف یہی چند روز عیش و نشاط زندگی ہے۔ اگر یہ اسی پر قناعت کرتے تو بھی ایک بات تھی، مگر وہ ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں۔ مسلمانوں کے ساتھ تمسخر و استہزاء کرتے ہیں اور ان پر آوازے کتے ہیں، حالانکہ قیامت کے روز فرزند ان اسلام ہی مدارج عالیہ کے مالک ہوں گے۔ کیونکہ وہ اخلاق فاضلہ کے طالب ہیں، دولت کی انہیں پروا نہیں۔

مجاہدین فی سبیل اللہ کا اولین فرض یہ ہو گا کہ ان کفار کو اتنا ذلیل و رسوا کر دیں کہ آئندہ انہیں سر اٹھانے کا موقع نہ ملے اور ہمیشہ کے لئے غلامانہ زندگی بسر کریں۔ اس لئے کہ اگر انہیں کھلے بندوں چھوڑ دیا تو قانون کا احترام جاتا رہے گا، کسی شخص کے دل میں اس پر عمل کرنے کا شوق پیدا نہ ہو گا، آنے والی نسلوں کے لئے صحیح راہ گم ہو جائے گی اور بہت جلد یہ دستور العمل مٹ جائے گا۔

جب ارباب اخلاق و اعمال قیامت میں مناصب جلیلہ پر فائز ہوں گے تو ضروری ہے کہ دنیا میں بھی وہ اعلیٰ ترین زندگی بسر کریں، تاکہ ارادہ خداوندی پورا ہو کر رہے۔ جس وقت بھی مسلمان اس فرض جلیل کے لئے اٹھ کھڑے ہوں گے اور بالفرض نہ تو سامان حرب ہو گا اور نہ جنگ کرنے کے لئے سپاہی، اللہ ضرور ان کی دست گیری کرے گا، ان کو کامیاب کر کے تمسخر کرنے والوں کو ذلیل و رسوا کر دے گا۔ ضرورت ہے آگے بڑھنے کی، جب عزم مصمم، مستقل ارادہ، استقلال و ثبات قدم اور توکل و اعتماد علی اللہ ہے تو کامیابی قطعی و یقینی ہے۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً ۗ فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّنَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ ۖ وَاتَّخَذَ اللَّهُ نَبِيَّهُمُ الْكَتَابَ بِالْحَقِّ لِيُخَكِّمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ ۚ وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمْ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۗ فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ ۗ وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿۳۲﴾



تمام لوگ ایک جماعت تھے، پھر اللہ نے نبیوں کو بھیجا جو خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے تھے اور ان کی معرفت سچی کتابیں بھیجیں، تاکہ جن باتوں میں لوگ اختلاف کرتے ہیں ان میں کتاب الہی فیصلہ کر دے، مگر انہی لوگوں نے آپس کی ضد سے کتاب میں اختلاف کیا جن کو کتاب دی گئی تھی اور ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں آچکی تھیں، اللہ نے اپنی مہربانی سے وہ راہ حق مسلمانوں کو دکھادی جس میں وہ اختلاف کرتے تھے اور اللہ جس کو چاہے سیدھی راہ دکھائے۔

تمام انسانوں کو ایک ہی فطرۃ صالحہ پر پیدا کیا گیا تھا: وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ اور کل مولود یولد علی الفطرة سے یہی مراد ہے اور اس لئے وہ امت واحدہ ہی تھے، اس پر ثابت و قائم رہنے کے لئے اللہ اپنے انبیاء و رسل بھیجتا رہا کہ الست بد بکم کے جواب میں جو بلی کہا تھا اس کی یاد دل میں برابر تازہ رہے اور قلب سلیم کے ساتھ اس کے حضور میں حاضر ہوں، اسی کی حفاظت و نگرانی دنیا و آخرت میں ہر قسم کی ترقی کی ذمہ دار و کفیل ہوگی۔ انبیاء کا کام یہ تھا کہ مومنین کی ہمتیں بڑھائیں اور مخالفین میں ضعف و کمزوری پیدا کریں۔

چونکہ نبی ہمیشہ زندہ نہیں رہتا، اس لئے ساتھ ہی کتاب بھی نازل کر دی۔ کہ آنے والی نسلیں اس سے فائدہ اٹھائیں اور اپنے اختلاف باہمی کا فیصلہ اسی کے مطابق کریں۔ آفتاب کے غروب ہونے پر چاند کی روشنی اندھیرے گھروں کا اجالا بن جاتی ہے۔ باوجودیکہ ان لوگوں کو منشاء الہی معلوم تھا، مگر پھر بھی انہوں نے اختلاف کیا اور یہ جو کچھ ہوا صرف ضد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر ہو۔ گزشتہ امتیں تو اختلاف کا شکار بن گئیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ایک جدید قومیت صالحہ پیدا کی اور امت مسلمہ کو ان اختلافات کی حقیقت واضح کر کے صحیح راہ دکھادی، کیونکہ شہد اعدی الناس ہونے کی وجہ سے صراط مستقیم پر چلنے اور دنیا بھر کی راہ نمائی کی قابلیت صرف مسلمانوں ہی میں تھی۔ سورہ مائدہ میں ہے کہ ہم نے توراۃ نازل کی جو یکسر ہدایت و نور تھی، مگر ان لوگوں نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا، پھر انجیل ان خصوصیات کے ساتھ اتری، لیکن بیکار، اختلاف بڑھتا گیا، یہاں تک کہ قرآن کے نزول کی ضرورت محسوس ہوئی: وَ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيِّئًا عَالِيَهُ (المائدہ ۴۸)

جہاد فی سبیل اللہ کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ ان لوگوں کو مٹا دیا جائے جو کتاب الہی میں اختلاف پیدا کرنے کی کوشش کریں، عام طور پر دنیا میں دو ہی قسم کے آدمی نظر آتے ہیں:

(۱).... کتاب الہی کے ساتھ تمسخر و استہزا کرنے والے۔

(۲).... قرآن میں اختلاف کرنے والے۔

ان دونوں گروہوں کو ذلیل کرنا اور ان کی نقل و حرکت کی نگرانی مسلمانوں کا فرض ہو گا، تاکہ پھر کبھی ان کے دل میں قانون الہی کی مخالفت اور اس سے تمسخر و استہزا کرنے کا خیال نہ پیدا ہو۔ اگر ان کو مقہور و ذلیل نہ کیا گیا تو دنیا میں قانون الہی کی عزت باقی نہ رہے گی اور اس کا رعب و دبدبہ جاتا رہے گا۔ دنیا کی ہر سلطنت اپنے قانون کا احترام و اکرام کرتی ہے، اگر کوئی اس کی توہین کرے تو اسے فوراً سزا دی جاتی ہے، یہی اسلام کا مقصد ہے کہ اس کے قانون کی



اہانت نہ ہو۔

اس قسم کے لوگ دنیا کے مختلف گوشوں میں چھپتے پھریں گے اور ہر وقت موجود رہیں گے، اس لئے ہمیشہ کے واسطے مسلمانوں کو تمام دنیا کے لوگوں سے جنگ کے لئے تیار رہنا پڑے گا، کیونکہ کوئی زمانہ ان بد بختوں سے خالی نہ ہوگا۔ اسی حقیقت کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا: وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّى يَرُدُّوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا (البقرۃ ۱۷) اور اسی لئے شارع نے فرمایا کہ الجہاد ماضی لیوم القیمۃ "جہاد کا سلسلہ قیامت تک رہے گا" تا آنکہ ویكون الدين كله الله کی پیشین گوئی صادق ہو۔

تکالیف کا آنا ضروری ہے

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُدْخِلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسْتَهْطِمِينَ الْبَاسَاءُ وَالضَّآلُّونَ وَذُرُوبُهُمْ  
حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَى نَصُرَ اللَّهُ ۖ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ ﴿۱۷﴾

کیا تم خیال کرتے ہو کہ جنت میں چلے جاؤ گے، حالانکہ تم کو ان لوگوں کی سی حالت پیش نہیں آئی جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں، ان کو سختیاں بھی پہنچیں اور تکلیفیں بھی اور جھڑپیں بھی گئے یہاں تک کہ پیغمبر اور ایمان والے جو ان کے ساتھ تھے پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی، سن لو اللہ کی مدد قریب ہے۔

تم دنیا کے اختلافات مٹانے کے لئے آئے ہو اور تمہیں خلافت ارضی کے لئے چن لیا گیا ہے، مگر کیا اس بہشت زار ارضی میں بغیر کسی محنت و تکلیف کے داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی ان مشکلات و موانع کی ابتدا ابھی نہیں ہوئی جو انبیاء و رسل کو راہ حق و صدق میں پیش آتی ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ ان ارباب صدق و صفا کو چاروں طرف سے مصیبتوں نے گھیر لیا، غنیم کی فوجیں محاصرہ کئے ہوئے تھیں، قدم قدم پر دشمن کا خوف دامن گیر تھا، جان کے لالے پڑے ہوئے تھے، سامان خوراک کے تمام ذرائع و وسائل مسدود تھے، بھوک اور پیاس کے مارے تڑپ رہے تھے، یہ بیرونی تکلیفوں کی حکایت تھی، ادھر گھر میں اختلاف پیدا ہو گیا، پریشانی و اضطراب کی وجہ سے کم ہمتوں میں بزدلی اور نامردی کے آثار ظاہر ہونے لگے اور ان میں باہمی منازعت شروع ہو گئی، آپس میں لڑنے جھگڑنے کی وجہ سے سب کے سب مبتلائے مصیبت ہو گئے، مگر باوجود ان روح فرساحالات اور الم ناک حوادث کے رسول اور اس کے اعوان و انصار اپنے فرائض کے ادا کرنے میں برابر مصروف رہے۔ جب ان کی تمام سعی و کوشش ختم ہو گئی اور انہوں نے کام کرنے میں کسر باقی نہ رکھی، ادھر خارجی اعانت کی بھی کوئی توقع نہ رہی تو نہایت ہی الحاح و تضرع کے ساتھ پکار اٹھے کہ خداوند! اب تیری مدد کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں، تو اپنا دست اعانت دراز کر اور ہمارے مخالفین کو تباہ کر۔ اس وقت چارہ ساز حقیقی نے ان کی دست گیری کی اور انہیں کامیاب کر دیا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دو مختلف اصول بیان کئے ہیں۔ پہلا قاعدہ یہ ہے کہ راہ حق میں تکالیف کا آنا ضروری ہے، اس کے بغیر کامیابی نہیں ہو سکتی۔ سورہ عنکبوت میں فرمایا: أَحْسِبَ النَّاسُ أَنْ يَتَزَكَّوْا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ۚ وَلَقَدْ

فَتَمَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَذِبِينَ ﴿٢٥﴾ ایک جگہ آیہ: إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنْ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِآلِهِمُ الْجَنَّةَ ۖ يُعَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ (التوبہ ۱۱۱) دوسرے یہ حقیقت واضح کر دی کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت کس وقت نازل ہوا کرتی ہے؟ جب تک ایک شخص اپنی تمام قوتوں کو اس کی راہ میں وقف نہ کر دے، مدد نہ آئے گی۔ اسی قانون کی طرف سورۃ یوسف میں اشارہ کیا: حَتَّىٰ إِذَا اسْتَيْسَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ قَدْ كُذِّبُوا جَاءَهُمْ نَصْرُنَا (یوسف ۱۱۰) سورۃ آل عمران کے آخر میں گناہوں کے کفارہ کی نسبت فرمایا کہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ راہ حق میں ہر چیز قربان کر دیتے ہیں: فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي قَاتِلُوا وَقَاتِلُوا لَا تَكْفُرْ عَنْهُمْ سَبِيلُهُمْ (آل عمران ۱۹۵)

پس فرزند ان اسلام کے لئے ضروری ہے کہ وہ محض دعا کے بھروسہ پر قناعت نہ کر بیٹھیں، بلکہ زور بازو سے بھی کام لیں۔ لوگوں کے جھوٹے وعدوں پر نہ جائیں، اپنی قوت کا اظہار کریں۔ اس لئے کہ دنیا میں اسی قوم نے دائمی زندگی حاصل کی ہے جس نے اپنے ہاتھ پاؤں سے کام لیا ہو، قدرت بھی اسی کو زندہ رکھتی ہے جو اصل و اصل ہو۔

کہاں روپیہ صرف کریں

يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ ۖ قُلْ مَا آفَقْتُكُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلَّهِ الدِّينُ وَالْآخِرُ لِلَّذِينَ وَلِيَئِلَىٰ وَيَسْأَلُونَكَ سَبِيلَ ۖ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ﴿٢٦﴾

تم سے پوچھتے ہیں کہ کہاں خرچ کریں، کہہ دو کہ جس قدر مال تم خرچ کرو وہ تمہارے ماں باپ اور رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں کا حق ہے اور تم جو کچھ بھلائی کرو گے اللہ اسے جانتا ہے۔

مقصد نہایت ہی بلند ہے، اس کے لئے خود تو تیار ہونا پڑے گا، مگر اس کے ساتھ ان لوگوں کو بھی تیار کرنا ہو گا جو غربت و افلاس کی بنا پر سامان حرب نہیں خرید سکتے اور اگر بالفرض ان لوگوں نے تمہارے روپیہ کو جہاد فی سبیل اللہ کے لئے صرف نہ کیا تو اس کے متعلق تم سے باز پرس نہ ہوگی، تمہیں اس سخاوت و فیاضی کا اجر مل جائے گا۔

جہاد کب تک رہے گا

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢٧﴾

تم پر جہاد فرض کیا گیا اور وہ تمہیں گراں گزرتا ہے اور عجب نہیں کہ تم ایک چیز کو گراں سمجھو اور وہ تمہارے لئے بہتر ہو اور عجب نہیں کہ تم ایک چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے حق میں بری ہو اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

جب تیاریاں اس زور شور سے ہوں تو خود بخود سوال پیدا ہوتا ہے کہ جنگ کب تک جاری رہے گی اور یہ قتل و قتل کب ختم ہوگا؟ اس کے جواب میں فرمایا کہ لڑنے بھڑنے میں تکلیف تو ضرور ہوتی ہے، بال بچوں سے دور رہنا پڑتا ہے اور

چین سے بیٹھنا نصیب نہیں ہوتا، مگر یاد رہے کہ جس چیز کو تم اپنی کوتاہ بینی سے باعث تکلیف خیال کر رہے ہو وہی تمہارے لئے خیر و برکت کا سبب ہے۔ اس لئے کہ تم زندہ رہو گے اور تمہاری قوم کو دائمی زندگی نصیب ہوگی۔ آرام طلبی اور عیش پرستی بظاہر دلفریب ہیں، مگر ان کا انجام تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں۔ خدا خوب جانتا ہے کہ تمہاری انفرادی و اجتماعی حیات کا راز اسی میں پوشیدہ ہے۔ سورۃ انفال میں اس کی نسبت فرمایا: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُولِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (انفال ۲۴)

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۚ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ۚ وَصَدَّ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ وَكَفَرٌ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَ الْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا يَزَالُوْنَ يَقَاتِلُوْكُمْ حَتّٰى يَكُوْلُوْكُمْ اَوْ تَكُوْلُوْهُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ ۚ اِنْ اسْتَطَاعُوْا ۚ وَمَنْ يَّزِدْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيُبْتَغَ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحَابُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۸۶﴾

تم سے حرمت کے مہینوں میں لڑائی کرنے کی بابت پوچھتے ہیں، کہہ دو کہ اس میں لڑنا گناہ ہے اور اللہ کی راہ سے روکنا اور اس کا کفر کرنا اور مسجد حرام سے روکنا اور اس کے لوگوں کو وہاں سے نکال دینا اللہ کے نزدیک اس سے بڑھ کر ہے اور فساد مار ڈالنے سے بھی بڑھ کر ہے اور یہ ہمیشہ تم سے جنگ کرتے رہیں گے یہاں تک کہ اگر قدرت پائیں تو تم کو تمہارے دین سے لوٹادیں اور تم میں سے جو اپنے دین سے پھر جائے گا اور پھر وہ کفر ہی کی حالت میں مر جائے گا تو ان لوگوں کے اعمال دنیا اور آخرت میں اکارت جائیں گے اور یہی دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے، جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا وہ اللہ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں۔ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

ان آیات میں بتادیا کہ مخالفین اسلام ہمیشہ بغض و عداوت کا اظہار کرتے رہیں گے اور ان کی برابریہ کو شش رہے گی کہ تم کو دین حق سے برگشتہ کر دیں۔ اس لئے مسلمانوں کو بھی جنگ کے لئے ہمیشہ تیار رہنا پڑے گا، پس معلوم ہو گیا کہ جنگ ہمیشہ رہے گی۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ الجہاد ماضی الی یوم القیۃ، اگر تم نے جہاد ترک کر دیا، تو یہ راہ ارتداد کا اختیار کرنا ہو گا اور اگر اسی کفر کی حالت میں مر گئے تو تمہارے اعمال صالحہ کا کوئی اعتبار نہ ہو گا۔ جو شخص تمام عمر وفادار رہ کر آخر وقت میں بغاوت کرے، اس کی یہی سزا ہے۔ اللہ کی رحمت واسعہ کے صرف وہی لوگ امیدوار ہو سکتے ہیں جو اعلائے کلمۃ اللہ کو اپنی زندگی کا مقصد وحید بنالیں۔ اسی کی خاطر ترک وطن کے لئے تیار ہوں اور اسی کے لئے اپنی ہر چیز قربان کر دیں۔ ان لوگوں کی تمام غلطیوں کو نظر انداز کیا جائے گا اور انہیں ہمیشہ کامیابی نصیب ہوگی۔

قرآن حکیم میں دوسری جگہ آیا کہ جنگ ختم ہونے کا وقت یہ ہے: حَتّٰى تَضَعَ الْحَضْبُ اَوْزَارَهَا (محمد ۴) ”لڑتے رہو یہاں تک کہ لڑائی موقوف ہو جائے“، یعنی جب تک جنگ کرنے والی ظالم و حریص قوتیں باقی ہیں، عالمگیر صلح و امن کے حصول کی کوئی توقع نہیں۔ اس لئے پہلے ان قوموں کو پامال کر دو۔ دوسری جگہ آیا کہ حَتّٰى اَتَخَشَّعُوْهُمْ (محمد ۴) ”یہاں

تک لڑو کہ جنگ آزما دشمن چور چور ہو جائیں۔ ”قاتلوں کا جب تک خون نہ بہایا جائے گا، مقتولوں کا خون بہنا بند نہ ہو گا، پس جب تک دنیا جنگ اور بواغ جنگ سے باز نہ آئے گی، مسلمانوں کو بھی جنگ کرنی پڑے گی۔ جنگ صرف اسی وقت ختم ہو گی جب تمام دنیا اسلام کی دعوت امن و اخوت کے آگے جھک جائے گی: هُوَ الَّذِي اَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (اصف ۹)۔

ناجائز ذرائع کا استعمال حرام ہے

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالنَّبِيْزِ قُلْ فِيْهِمَا اَثَمٌ كَبِيْرٌ مِّنْ مَّنَافِعِ النَّاسِ ۚ وَ اِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِمِّنْ نَّفْعِهِمَا ۚ

شراب اور قمار بازی کے متعلق تم سے دریافت کرتے ہیں، ان سے کہہ دو کہ ان دونوں چیزوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے کچھ فائدے بھی ہیں، مگر ان کے نفع سے ان کا نقصان بڑھ کر ہے۔

گزشتہ آیات نے بتا دیا کہ جہاد قیامت تک جاری رہے گا، جس کے لئے ہر مسلمان کو تیاری کرنی پڑے گی، لیکن بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ فوج کم ہے، روپیہ بھی کافی نہیں، مخالف دونوں اعتبار سے بڑھ چڑھ کر ہے، کیا اس حالت میں شراب اور قمار بازی کی اجازت ہو سکتی ہے؟ عرب کے لوگ عام طور پر ان امراض میں مبتلا تھے، جنگ کے لئے جو اکیلے ان کی عادت تھی۔ آج کل یورپ بھی ان دونوں سے کام لیتا ہے۔ لڑائی کے سپاہیوں کو شراب پلا دی جاتی ہے کہ بے باکانہ دشمن پر حملہ کریں، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس سے مصنوعی دلیری پیدا ہوتی ہے، شراب پی کر جائز حدود سے دور جا پڑتے ہیں اور جہاں نشہ اتر اور طبیعت اصلی حالت پر آگئی تو اور زیادہ ضعف و کمزوری محسوس ہونے لگتی ہے۔ شجاعت کا حقیقی جوہر فنا ہو جاتا ہے اور مختلف امراض کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ اس لئے شریعت نے شراب اور قمار بازی دونوں کی ممانعت کر دی اور ساتھ ہی ممانعت کا سبب بھی بیان کر دیا کہ اس میں نقصانات بہت زیادہ ہیں۔ دوسری جگہ اس کو اور واضح کر دیا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالنَّبِيْزُ وَ الْاَذْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُثَوِّبَ بَيْنَكُمْ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَا فِي الْخَمْرِ وَ النَّبِيْزِ وَ يَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُنْتَهُوْنَ ۝ (المائدہ ۹۰، ۹۱)

”مسلمانو! شراب اور جو اور بت اور پاسے ان میں کا ہر ایک کام بس ناپاک شیطانی کام ہے، تو اس سے بچتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ، شیطان تو بس یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کی وجہ سے تمہارے آپس میں دشمنی اور بغض ڈلوادے اور تم کو یاد الہی سے اور نماز سے باز رکھے، تو کیا شیطان کے مکر پر اطلاع پائے پیچھے اب بھی تم باز آؤ گے یا نہیں۔“

ان آیات میں بیان کر دیا کہ شراب ام الخبائث ہے اور جو اتہائی و بربادی کا پیش خیمہ۔ حدیث میں آتا ہے نعن رسول اللہ ﷺ فی الخبر عشرة عاصرها معتصمها وشاربها وساقیها وحاملها ومحبولة اليه وبائعها ومتاعها واهلها واكل ثمنها۔

## کتنا خرچ کریں؟

وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ ۖ قُلِ الْعَفْوَ ۚ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ﴿٢٦٥﴾ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ

اور تم سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں، ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضرورت سے زائد خرچ جائے۔ اسی طرح اللہ اپنے احکام تم سے کھول کھول کر بیان فرماتا ہے، تاکہ تم دنیا اور آخرت کے معاملہ میں غور و فکر کرو۔

ناجائز ذرائع کا استعمال حرام قرار دیا گیا تو اس کے بعد یہ سوال پیدا ہونا ضروری تھا کہ کتنا روپیہ اللہ کی راہ میں خرچ کیا کریں۔ اس لئے فوراً بعد فرمادیا کہ تمہاری ضروریات سے جس قدر خرچ جائے سب جہاد فی سبیل اللہ کے لئے وقف کر دو، اسی سے تمہارے جوش دینی اور دلولہ مذہبی کی حقیقت آشکارا ہو جائے گی۔ اگر تمہیں خدمت ملت اور ارتقاء اسلام کا خیال ہو گا تو خود بخود اپنی ضروریات کو کم کر لو گے اور اگر صرف لوگوں کو دھوکا دینے کے لئے ملک اور قوم کا نام لیتے ہو گے تو اپنی ضروریات کا دائرہ اتنا وسیع کر لو گے کہ ایک کوڑی بھی باقی نہ رہے گی۔ خدا نے اپنے احکام کھول کر بیان کر دیئے ہیں، تاکہ تمہیں اس بات کا یقین ہو جائے کہ دنیوی اور اخروی زندگی کے لئے اس سے بہتر کوئی قانون نہیں۔

## یتیمی کی تربیت

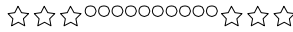
وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَىٰ ۖ قُلِ إِصْلَاحٌ لَهُمْ خَيْرٌ ۚ وَإِنْ تُخَالِطُوهُمْ فَارْحَمُوا أَمْكُم ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَأَعْتَبْتُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٢٦٦﴾

”اور تم سے یتیموں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں، ان سے کہہ دو کہ ان کے لئے بہتری کا کام کرنا اچھا ہے اور اگر تم ان سے مل جل کر رہو تو وہ تمہارے بھائی ہیں اور اللہ بگاڑنے والے اور سنوارنے والے دونوں کو جانتا ہے اور اگر اللہ چاہتا تو تم کو مشکل میں ڈال دیتا، بیشک اللہ زبردست حکمت والا ہے۔“

لڑائیوں کی کثرت کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ یتیم بہت زیادہ ہوں۔ اس لئے ایک قانون کی ضرورت محسوس ہوئی، مگر اس میں کسی مستقل ضابطہ کو بیان نہیں کیا۔ اس لئے کہ شریعت اس سے پہلے مسلمانوں میں صحیح کیر کڑ پیدا کر چکی ہے، وہ چاہتی ہے کہ لوگ خود فیصلہ کر لیں۔ شارح نے اس کے لئے ایک اصل و اساس معین کر دی کہ: الاثم ملحاك في نفسك، ”گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکے۔“ ایسی قوم کو قوانین و ضوابط میں جکڑنا مصلحت کے خلاف ہے۔ پس قرآن نے صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا کہ وہ تمہارے بھائی ہیں، جیسے اپنے بھائیوں کا خیال رکھو گے اور ان کی غور و پرداخت کرو گے، ایسے ہی ان یتیموں کا خیال رکھنا۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ کس کے پیش نظر اصلاح ہے اور کون اس یتیم کی دولت برباد کرنے کی غرض سے اس کی دولت کو اپنے مال کے ساتھ ملا رہا ہے۔ خداوند قدوس اگر چاہتا تو اس کے لئے ایک ضابطہ معین کر دیتا، مگر اس نے تمہیں تکلیف میں ڈالنا پسند نہ کیا۔ باوجود اس قدر سہولت اور آسانی کے تم نے اب بھی ان کے مال میں خیانت کی تو کبھی ترقی نہ کر سکو گے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس سے بہتر کوئی دوسرا قانون نہیں ہو سکتا۔ جب جنگ میں جانے والوں کو اس امر کا یقین ہو گا کہ اگرچہ ہم لڑائی میں مارے جائیں، ہماری اولاد پر کوئی برا اثر نہیں پڑے گا۔ کیونکہ مسلمان ان کو اپنے بھائیوں کی طرح رکھیں گے اور بیٹوں کی مانند پرورش کریں گے۔ یہ خیال ان میں اور زیادہ جوش و ولولہ پیدا کرے گا اور بالکل بے فکر ہو کر داد شجاعت دیں گے۔

یتامیٰ کے متعلق بحث کرنے سے قبل فرمایا تھا کہ جس قدر روپیہ تمہاری ضرورتوں سے بچ جائے اسے جہاد فی سبیل اللہ کے لئے خلافت کی نذر کر دو۔ یہ فیصلہ کرنا کہ اصلی ضرورتیں کس قدر ہیں اور غیر ضروری کو نہی، ان کو ایک مثال سے واضح کر دیا کہ یتامیٰ کے لئے تمہاری کوشش ہمیشہ یہ رہے گی کہ ان کا روپیہ صرف ضروری مواقع پر صرف ہو اور کہیں ضائع نہ ہونے پائے۔ پس جو احتیاط اور دوراندیشی تم یتامیٰ کے معاملہ میں برتو گے، ویسی ہی کفایت شعاری اور عاقبت اندیشی اپنے مال کے صرف کرنے میں ملحوظ رکھو۔



## فصل ثانی

### جہاں داری

توطیہ و تمہید

ہر قوم اپنی جداگانہ تہذیب رکھتی ہے۔ وہ اپنے تمدن کے پھیلانے میں کوشاں رہتی ہے۔ آج تک بیشمار قوموں کا ظہور ہوا اور ہر ایک نے اپنی شانستگی اور حضارۃ کو رواج دیا۔ اگر آپ ان تمام تہذیبوں کے اجزائے ترکیبی کو الگ کر کے صرف قدر مشترک کی تلاش کریں تو سب میں یہی چیز نظر آئے گی کہ فطرت انسانی میں جس قدر اوصاف و کمالات اور محاسن و فضائل رکھے گئے ہیں، ان کی تولید و تربیت اور نشو و ارتقا ہو۔ کوئی تعلیم صحیح ان فطرت جذبات کو بدلنا نہیں چاہتی، بلکہ ان کی تکمیل اس کے پیش نظر رہتی ہے۔ اگر انسان کو مطلق تعلیم نہ دی جاتی اور کسی تہذیب سے اس کو آشنا نہ کیا جاتا، پھر بھی ایک مدت کے بعد اس کے اندر سے ایک صدابلند ہوتی اور جذبہ فطرت سے متاثر ہو کر ضرور قدم آگے بڑھاتا۔ البتہ اتنا فرق ضرور رہتا کہ اسے راہ نمائے ملنے کی وجہ سے دیر لگتی اور دوسرے لوگ تعلیم و تربیت کی وجہ سے منازل مختلفہ کو جلد طے کر لیتے۔

جنگل میں ایک شخص زخمی ہو گیا، کوسوں تک انسانی آبادی دکھائی نہیں دیتی، طبی مدد کا پہنچنا غیر ممکن اور محال ہے، اس کی طبی آرزو ہے کہ زخم اچھا ہو۔ اس لئے وہ صحرا میں تنگ و دو کرے گا، تا آنکہ مختلف اشیاء کے استعمال سے اس کا زخم مدت ہائے دراز کے بعد اچھا ہو جائے گا۔ یہ تمام سعی و کوشش اور بھاگ دوڑ صرف اس جذبہ فطرت کی تکمیل کے لئے کی گئی۔ اگر اس وقت جبکہ وہ زخموں سے چور چور ہو رہا تھا اور یار و مددگار نہ ہونے کی وجہ سے کراہ رہا تھا، طبی اعانت میسر آ جاتی تو بہت تھوڑی دیر میں اس کا زخم اچھا ہو جاتا۔ پھر دیکھتے کہ اس کی مسرت و شادمانی کی کوئی انتہا نہ رہتی اور وہ طبیب کے لئے یکسر تشکر و امتنان بن جاتا۔

یہی حال تہذیب و شانستگی کا ہے۔ وہ انسان کے فطری جذبات و احساسات کو کم از کم وقت میں اعلیٰ ترین معیار پر پہنچا دیتی ہے اور یہ کسی کی طاقت نہیں کہ کوئی انسانی تہذیب اور داعیہ فطرت کو بدل دے۔ رسول ﷺ نے فرمایا: اذا سمعتم بجبل زال عن مکانہ فصد قوۃ واذا سمعتم برجل زال عن خلقه فلا تصد قوۃ پہاڑ اپنی جگہ سے ہل سکتا ہے، سمندروں کی روانی بند ہو سکتی ہے اور دریا اپنا راستہ چھوڑ سکتے ہیں، مگر یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ ایک انسان اپنی فطرت کو چھوڑ دے۔

## نکاح کی غرض

مرد و عورت کو دیکھئے، ان میں فطرت نے ایک ربط و تعلق قائم کر دیا ہے۔ اب آپ ان کو الگ رکھنے کی لاکھ کوشش کیجئے، مگر وہ ضرور کسی نہ کسی طرح اپنے تعلقات قائم کر کے خواہشات طبعی کو پورا کریں گے۔ فرض کیجئے ایک لڑکا اور ایک لڑکی آج پیدا ہوتے ہیں، دونوں کو ایک ایسے جزیرہ میں بند کیا جاتا ہے جہاں انسانی آبادی کا نام و نشان تک نہیں، انہیں تعلیم سے بے بہرہ رکھا جاتا ہے اور مرد و عورت کے تعلقات کا نمونہ ان کے سامنے نہیں پیش کیا جاتا، مگر آپ دیکھیں گے کہ نوجوان ہوتے ہی جب ان کے قوائے شہوانیہ میں جوش و بھجان پیدا ہو گا تو ان کی فطرت خود اندر سے پکار اٹھے گی اور مجبور ہوں گے کہ دونوں مل کر رہیں، ایک دوسرے کے ہم خیال ہوں، ہر ایک کے رنج اور خوشی میں شریک ہوں، تمام کام مشورہ سے کریں، کبھی ایک دوسرے سے ناراض نہ ہوں، ایک ہی جسم کے اجزاء ہوں، اولاد ہو جو ان کے بعد ان کے فرائض کی تکمیل کر سکے۔ جو قانون ان تعلقات و روابط کو مضبوط و محکم تر بناتا ہے اس کو اصطلاح میں تدبیر منزل کہتے ہیں۔ انسان مدنی الطبع ہے وہ مل کر رہے گا۔ اس وقت جو قانون اس کے لئے مفید و نافع ہو گا وہ یہی ہے۔

سورۃ بقرہ کے ابتدائی اوراق میں تم پڑھ آئے ہو کہ تہذیب اخلاق کے بعد تدبیر منزل کا قانون دیا جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں عام طور پر انتظامی مادہ پیدا ہو، گھر کی چار دیواری سے بہتر اور کوئی درس گاہ نہیں ہو سکتی، گھر میں خاوند بیوی اور تمام بچے ہوتے ہیں، خاوند حاکمانہ زندگی بسر کرتا ہے، بیوی ہر بات میں اس کو مشورہ دیتی ہے، دونوں مل کر گھر کا انتظام کرتے ہیں، بچوں کی تعلیم و تربیت ان کے پیش نظر رہتی ہے اور ان کو بد اخلاقی سے بچاتے ہیں۔ اولاد کی حیثیت رعایا کی ہوتی ہے اگر خاوند اور بیوی میں اختلاف رائے ہو تو خاوند کی رائے کو ترجیح ہوتی ہے۔

یہ تو اس قانون کی عمومی حیثیت تھی۔ اب جو لوگ اس قانون کی مزید تعلیم کے آرزو مند ہوں گے اور بجائے گھر کی چار دیواری کے قوموں اور ملکوں پر حکومت کرنا اپنا مقصد بنالیں گے، وہ تدبیر منزل کا خصوصیت سے مطالعہ کریں گے، اسی کو آگے چلا کر سیاست مدن اور خلافت کبریٰ پر محمول کریں گے اور انہی مسائل سے استنباط و استخراج نتائج کر کے مختلف اقوام و ملل پر حکومت کرنے کے قابل بن جائیں گے۔

البتہ اتنا فرق ضرور ہو گا کہ یہاں جو قانون تھا وہ صرف ایک مرد اور عورت کے لئے تھا، جب آگے بڑھے تو اسی کو ایک ملک اور ایک قوم پر پھیلا دیا۔ مرد و عورت کے تعلقات باہمی کو حاکم و محکوم کے روابط کے ساتھ ملا دیا کہ دونوں کا انداز ایک اور طریق عمل متحد۔ ملک کیا ہے؟ بہت سے گھروں کے مجموعہ کا نام۔ پس جو قانون ایک گھر کے لئے کافی ہو سکتا ہے، وہی بہت سے گھروں کے لئے بھی کفایت کرے گا اور جو ضابطہ ایک گھر کا نظم و نسق قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور خاوند اور بیوی میں کشیدگی نہیں ہونے دیتا وہی راعی و رعایا اور حاکم و محکوم پر چسپاں ہو سکے گا۔ اگر گھر میں اس کو تدبیر منزل



کہیں گے تو قوموں اور ملکوں میں سیاست مدن اور خلافت کبریٰ کے نام سے تعبیر کریں گے۔

آئندہ آیات میں بتایا جاتا ہے کہ مرد و عورت کے تعلقات کس قسم کے ہیں، ان کے رشتہ کو کونسی چیز مضبوط رکھ سکتی ہے، اگر خاوند اور بیوی میں اختلاف ہو جائے، لڑائی جھگڑے تک نوبت پہنچے اور تعلقات قائم نہ رہ سکیں، تو اس وقت منازعات باہمی کے فیصلہ کرنے کی کیا صورت ہوگی۔ نکاح و طلاق کے مسائل بیان ہوں گے اور انہی میں مزید غور فکر ہماری راہ نمائی کرے گا کہ ان کو خلافت کبریٰ پر منطبق کریں اور ان سے سیاسی مسائل کا استنباط و استخراج کریں۔

ارباب اصول نے کلام کی مختلف قسمیں بیان کی ہیں جن کو پیش نظر رکھ کر ہم آسانی معلوم کر سکتے ہیں کہ متکلم کی غرض و غایت کیا ہے۔ ان میں سے بعض اقسام یہ ہیں:

(الف).... حوائے کلام۔ یہ بالکل بدیہی قیاس ہے اور ایک معمولی آدمی بھی اس کا مطلب سمجھنے میں غلطی نہیں کر سکتا۔ قرآن حکیم میں ہے: ولا تقل لهما اف جب والدین کو اف تک کہنا جائز نہیں تو ان کو مارنا پیٹنا بدرجہ اولیٰ حرام ہے۔

(ب).... اقتضائے کلام۔ اسی کو دلالت التزامی کہتے ہیں۔ ان لوازمات کی بنا پر کلام کا مفہوم ذہن میں آتا ہے جو عادات یا عقلاً یا شرعاً اس کے لئے ضروری ہوں، مثلاً جب ایک شخص نے کہا کہ میں نے نماز پڑھی تو اقتضایہی ہے کہ وہ با وضو تھا۔ اقتضا میں مسکوت عنہ دراصل موقوف علیہ ہوتا ہے۔ پس جب موقوف ثابت ہے تو موقوف علیہ جو مذکور نہیں بدرجہ اولیٰ ثابت ہے۔

(ج).... ایسی عبارت کے ساتھ اپنا مفہوم و مطلب ادا کرنا جو اعتبارات مناسبہ کو اپنے اندر لئے ہوئے ہو، ان مدارج تلاش کے بعد اعتبار کا درجہ آتا ہے۔

ہم نے نکاح و طلاق کے مسائل سے سیاست کے مباحث اخذ کئے، اس طرز عمل سے یہ غلط فہمی نہ پیدا ہونے پائے کہ ہم ان مسائل کو تفسیر کا درجہ دے رہے ہیں، بلکہ جس طرح اعتبار کے طور پر چند نتائج کا استنباط کیا جاسکتا ہے اسی طرح ان مسائل کی کیفیت ہے۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ہم نے ان تمام باتوں کو حواشی میں ڈال دیا ہے کہ کسی قسم کا خفا باقی نہ رہے۔

مسلمان کی عظمت

وَلَا تَنْكِحُوا النِّسَاءَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا ۖ وَلَا مِمَّا مُؤْمِنَةً خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ ۖ وَلَا تَنْكِحُوا النِّسَاءَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا ۖ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ ۖ وَلَا تَعْجَبْكُمْ ۖ أُولَٰئِكَ يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ ۖ وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِ ۖ وَيُبَيِّنُ لِنَاسٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿۴۸﴾

اور مشرک عورتوں سے نکاح مت کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں اور یقیناً ایک مسلمان باندی مشرک عورت

سے بہتر ہے اگرچہ وہ تم کو بھلی معلوم ہو اور مشرکوں سے اپنی عورتوں کا نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں اور یقیناً ایک مسلمان غلام مشرک سے بہتر ہے اگرچہ وہ تم کو بھلا لگے، وہ تو دوزخ کی طرف بلا تے ہیں اور اللہ اپنی عنایت سے جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے اور اپنے احکام لوگوں سے کھول کھول کر بیان فرماتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

لڑائیوں کی کثرت کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ بہت بڑی تعداد میں یتیمیٰ نظر آئیں اور ساتھ ہی رانڈوں کی بھی کثرت ہو۔ اگر مسلمانوں نے مفتوحہ اقوام کی عورتوں سے حسن و جمال اور دولت و ثروت کی وجہ سے نکاح کرنے شروع کر دیئے، تو اس کا یہ لازمی نتیجہ ہو گا کہ مسلمان عورتیں برباد ہو جائیں گی۔ مگر ان کا رہنے کی وجہ سے مجبور ہو کر بد عملی و بد کاری کی مرتکب ہوں گی۔ ادھر جب لڑنے والوں کو یہ معلوم ہو گا کہ ان کی عورتوں کی حفظ و نگہداشت نہیں ہوتی، تو ہمت ہار دیں گے۔ اس لئے ہمیشہ کے واسطے مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ مشرک عورتوں سے نکاح نہ کریں۔

نکاح کی اصلی غرض یہ ہوتی ہے کہ عورت اور مرد میں دائمی اتحاد و اشتراک عمل پیدا ہو، ان کی اولاد کی اسلامی طریق پر نشو و نما ہو۔ ماں باپ کے اخلاق و عقائد کا اثر اولاد پر پڑتا ہے۔ اگر ماں بے دین ہوگی تو اولاد میں اتحاد و زندگی کے امراض خبیثہ کا پیدا ہونا ضروری ہے، جس سے اسلام کی بنیاد کھوکھلی ہو جائے گی، پھر خاوند اور بیوی کے باہمی اختلاف کی بنا پر تدبیر منزل کے فرائض میں خلل واقع ہو گا اور امور خانہ داری میں کبھی نظم و نسق قائم نہ رہ سکے گا۔ ان تمام مصالحوں کی بنا پر مشرک عورتوں سے نکاح کی ممانعت کی گئی۔ حدیث میں آتا ہے: **تَنْكِحُ الْمَرْأَةَ لَا رِبْعَ لِمَالِهَا وَلِحَسْبِهَا وَلِحَبْلِهَا وَلِدِينِهَا** فاعلم بذات الدین تربت یداک، عورتوں سے نکاح کرنے میں لوگ مال و دولت، خاندان، حسن و جمال اور عفت و پاک دامنی کو دیکھتے ہیں، تم صرف طہارت و پاکیزگی کو پیش نظر رکھو۔

اس آیت میں دوسرا حکم یہ دیا گیا کہ اپنی لڑکیوں کو مشرکین و معاندین اسلام کے نکاح میں نہ دینا۔ اس مسئلہ پر تمام دنیائے اسلام کا قاطبہ اتفاق ہے کہ ایک کافر، خواہ کیسا ہی صاحب اثر و نفوذ، جاہ و حشمت اور دولت و ثروت ہو، مگر اس کے ساتھ کسی مسلمان عورت کا نکاح نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ اول تو عورت عام طور پر منفعل اور اثر پذیر ہوتی ہے، صحبت و ہم نشینی کا اثر ہو کر رہے گا یا ممکن ہے وہ بتدریج اسلام کو چھوڑ کر کفر و ارتداد قبول کرے۔ دوسرے اگر وہ اسلام سے منحرف نہ ہوئی تو خاوند اور بیوی میں جنگ رہے گی اور تمام گھر بار میدان جنگ بن جائے گا<sup>①</sup>۔

① اللہ تعالیٰ اپنی آیات کھول کھول کر بیان فرماتا ہے، تاکہ ان سے مسائل سیاست کا استخراج کیا جائے۔ آپ اس کے دوسرے حکم پر نظر ڈالئے، اس میں بتا دیا کہ مسلمان عورتوں کو کفار کے نکاح میں دینا جائز نہیں اور ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ اپنی لڑکی کے لئے مسلمان خاوند ہی تلاش کرے۔ یہ ایک گوشہ اور خون کا رشتہ ہے جس کی حفاظت پر اس قدر زور دیا گیا کہ ایک مسلمان ہی اس کا نگران کا رو محافظ بن سکتا ہے۔ ہمارا ایمان و اسلام اس سے کہیں زیادہ عزیز و محبوب ہے۔ اولاد کو مذہب پر قربان کیا جاسکتا ہے، مگر دین کو اس کی خاطر نہیں چھوڑا جاسکتا۔ اس لئے ایک مسلمان کا مقصد حیات یہی ہونا ضروری ہے کہ وہ اپنے ایمان کی باگ بھی صرف مسلمان ہی کے ہاتھ میں دے اور اس کا پادشاہ مسلمان ہی ہو۔ کفار و مشرکین کبھی مسلمانوں کے حاکم نہیں بن سکتے۔ آل عمران

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ ۖ قُلْ هُوَ أَدْنَىٰ ۚ فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ ۖ وَلَا تَقْرُبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَطْهُرْنَ ۚ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّوَابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ ﴿٣٠﴾

”اور تم سے حیض کا حکم پوچھتے ہیں، ان سے کہہ دو کہ وہ گندگی ہے، پس تم زمانہ حیض میں عورتوں سے الگ رہو اور جب تک وہ پاک نہ ہو لیں ان کے قریب نہ جاؤ، پھر جب نہاد ہو لیں تو جدھر سے تم کو حکم دیا ہے ان کے پاس آؤ، بیشک اللہ تو بہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور صاف رہنے والوں سے محبت کرتا ہے۔“

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ جنگ کی وجہ سے مسلمان عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے پر زور دیا گیا۔ نکاح ہی کے سلسلہ میں حیض، طلاق اور عدت کے ضروری مباحث ہیں، اس لئے ان کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوا۔ حیض کے متعلق دنیا افراط و تفریط میں مبتلا رہی ہے۔ یہودیوں اور مجوسیوں کے نزدیک ایام حیض میں عورتوں کے قریب جانا، ان سے بات چیت کرنا، ان کے پاس بیٹھنا اور ان کے ساتھ کھانا پینا ممنوع و حرام ہے۔ عرب بھی اسی قانون کے پابند تھے، مگر نصاریٰ ان سے بظط مستقیم مخالف تھے۔ وہ ان دنوں میں صحبت سے بھی پرہیز نہ کرتے۔

اسلام نے راہ وسط و اعتدال اختیار کی، ایام حیض میں زنا شوئی کے تعلقات مختلف امراض و مفاسد کے باعث تھے، اس لئے ان کو تو حرام قرار دیا گیا کہ انسان ضرر اور نقصان سے محفوظ رہے۔ میل جول اور اختلاط میں کوئی حرج نہ تھا، اس لئے اس کی اجازت دی گئی۔

## افزائش نسل

نِسَاءُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۖ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنْتُمْ شَتْتُمْ ۖ وَقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ مُّسْلِمُونَ ۚ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٣١﴾

”تمہاری بیویاں تمہاری کھیتیاں ہیں، تو اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو آؤ اور اپنے لئے پہلے بھیج دو اور اللہ سے ڈرو اور جانے رہو کہ تم اس سے ملنے والے ہو اور ایمان والوں کو خوش خبری سنا دو۔“

مرد و عورت کے باہمی تعلقات و روابط میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا حقیقی مقصد نسل انسانی کی زیادتی اور اس کی نشو و تربیت ہے۔ اس کے لئے قرآن حکیم نے ”کھیتی“ کا بہتر لفظ استعمال کیا، جس سے ایک طرف تو یہ مقصد تھا کہ خاوند اور بیوی کے نازک تعلقات کو ایسے اشارات و کنایات میں بیان کیا جائے کہ ہر گھر میں مرد و عورت، لڑکے اور لڑکیاں، چھوٹے اور بڑے اس کتاب کو پڑھ سکیں اور کسی قسم کا حجاب نہ پیدا ہو۔ یہ ایک ایسا عظیم الشان معجزہ ہے جو دنیا میں قرآن کے سوا اور کسی کتاب کو حاصل نہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ قرآن یہ بھی چاہتا تھا کہ ان تعلقات کی حقیقی

میں فرمایا: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ عَلَيْكُمْ لَفِي حَقٍّ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ يَرُدُّوكُم بَعْدَ إِتِّصَانِكُمْ كُفْرًا (البقرۃ ۱۰۰) پس جب اہل کتاب کی اطاعت جائز نہیں تو کفار و مشرکین ان سے کہیں زیادہ اس ممانعت میں داخل ہوں گے۔

غرض و غایت بھی بیان کر دے۔ حیض کے ایام میں امراض خبیثہ اور مفسدہ کا اندیشہ تھا اور ضرر و نقصان کی وجہ سے یہ غرض نہیں حاصل ہو سکتی تھی، اس لئے پہلی آیت میں صحبت کی ممانعت کر دی۔

اب فرمایا کہ پاک ہونے کے بعد جب اور جس طریق پر آرزو ہو، اس کے قریب جاسکتے ہو۔ کوئی شخص اپنی کھیتی کو برباد کرنا نہیں چاہتا۔ اصلی غرض پیداوار ہوتی ہے، کسان ایک قانون کے ماتحت خاص وقت میں بیج بوتا ہے، ہل چلاتا ہے، اس کی آبیاری کرتا ہے اور وقت پر فصل کاٹ لیتا ہے۔ ایسے ہی ایک شخص تمام ان لغو و مہمل طریقوں کو یک قلم ترک کر دے جس سے انسانی نطفہ کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو اور شریعت کے قاعدہ کے مطابق صحبت کرے تاکہ اولاد پیدا ہو جو ان مقاصد کی تکمیل کرے جن کے لئے باپ کی زندگی وقف تھی۔

خداوند قدوس نے تمہیں ایک قانون نوازش کر دیا ہے، اس کی پابندی کا خیال رہے۔ یہود و نصاریٰ اور مجوس و مشرکین عرب کا دستور العمل تمہیں معلوم ہے، مسلمانوں کو خوش ہونا چاہئے کہ قانون اسلام میں ان تمام تکالیف و شدائد کا سد باب کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر گز تنگی اور مصیبت ڈالنے کا آرزو مند نہیں ❶۔

برو تقویٰ کی حفاظت

وَلَا تَجْعَلُوا اللَّهَ عُرْصَةً لِّآيَاتِكُمْ اَنْ تَبْكَدُوا وَتَتَّقُوا وَبَيْنَ النَّاسِ ۚ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۱۸﴾  
يُؤْخِذْكُمْ اللَّهُ بِالتَّقْوَىٰ اَيُّهَا كُمْ وَلٰكِنْ يُّؤْخِذْكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿۱۹﴾

”اور اپنی قسموں کے سبب اللہ کو مانع نہ بنا لو کہ نہ سلوک کرو اور نہ پرہیز گار بنو اور نہ لوگوں میں میل ملاپ کرو اور اللہ سنا جانتا ہے۔ تمہاری قسموں میں سے یہود پر تم سے کوئی مواخذہ نہیں کرے گا، مگر ان قسموں پر گرفت کرے گا جن کا تمہارے دلوں نے ارادہ کیا اور اللہ بخشنے والا بردبار ہے۔“

قانون بنانے کی اجازت دی گئی ہے، مگر اس کے اصول اساسی اور مقاصد مہمہ کبھی نظر انداز نہ ہوں، اور وہ یہ ہیں:  
(الف) .... برو احسان: دوسروں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا۔

(ب) .... تقویٰ و طہارت: اپنے اندر اخلاق فاضلہ پیدا کرنا اور ورع و پاکیزگی سے آراستہ ہونا۔

(ج) .... اصلاح بین الناس: لوگوں میں اگر منازعات و مناکشات پیدا ہوں تو ان کا رفع و انسداد اور ان کو آپس میں صلح و آشتی سے رہنے کی تاکید کرنا۔

❶ ان آیات میں مرد و عورت کے معاملات کے لئے ایک قاعدہ کلیہ بیان کیا، مگر ان کی جزئیات کو خود ان کے ایمان و دیانت پر چھوڑ دیا کہ اپنی ضروریات کے مطابق ہر قسم کا قانون وضع کر سکتے ہیں، مگر یہ خیال رہے کہ قانون اساسی نہ ٹوٹنے پائے اور افزائش نسل کا مقصد سامنے رہے۔ ایسے ہی یہ بھی معلوم ہو گیا کہ شریعت نے جس قدر قانون مرتب کر دیا اس کا اتباع تو ہر حالت میں ضروری ہو گا، لیکن اگر اس سے مزید براں جدید حوادث و واقعات کی بنا پر اور زیادہ دستور العمل کی ضرورت محسوس ہو تو جدید قانون وضع کیا جاسکتا ہے، مگر اس کی تعظیم و تقبیل میں مقاصد شریعت فوت نہ ہوں اور قانون اساسی پر زدن نہ پڑے ورنہ اس پر مواخذہ ہو گا۔ اور تمام قانون بنانے والے مجرم قرار دیئے جائیں گے۔

ایک مسلم کی زندگی کے اعظم ترین مقاصد یہی ہیں۔ اس لئے کوئی ایسا قانون نہ بنے جو ان کے مخالف ہو، بلکہ اگر کبھی اتفاقاً ایسا ہو جائے تو اس قانون کو منسوخ کرنا ضروری ہو گا۔ اگر اس پر عمل کرنے کی قسم کھالی تھی تو اس کے لئے کفارہ ادا کیا جاسکتا ہے۔ قسم کی خاطر قانون صحیح کو ترک نہیں کیا جاسکتا۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات کو خوش کرنے کی خاطر شہد کو حرام کر دیا تو یہ آیت نازل ہوئی: لِمَ تَحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ ۖ تَبْتَغِي مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝ قَدْ فَضَّ اللَّهُ لَكُمْ تُحِلَّةَ آيَاتِكُمْ (التحریم ۱۰۲) ایک اور موقع پر آپ نے ارشاد فرمایا کہ ”اگر میں کسی کام کے نہ کرنے کے لئے قسم کھاؤں، بعد میں معلوم ہو کہ اس کا کرنا بہتر ہے تو اپنی قسم فوراً توڑ دوں گا“، اس لئے کسی مسلمان کو جائز نہیں کہ اللہ کی قسم کھا کر نیک کاموں سے رک جائے۔ اللہ تعالیٰ اس بات کو خوب جانتا ہے کہ یہ قانون کس نیت سے بنایا گیا تھا اور کس ارادہ سے اس پر عمل کیا جا رہا ہے۔

قسمیں کئی طرح کی ہوتی ہیں:

(۱).... یمین لغو: جس کے دو معنی ہیں۔

(الف).... کسی گزری ہوئی بات پر جھوٹی قسم بلا ارادہ زبان سے کھائی گئی۔

(ب).... قسم تو ارادہ سے کھائی گئی مگر گمان یہ تھا کہ جس بات پر قسم کھائی گئی ہے درست ہوگی۔ دونوں قسموں پر شریعت کوئی مواخذہ نہ کرے گی اور نہ ان کا اعتبار ہو گا۔

(۲).... منعقدہ: آئندہ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے پر قسم کھائی جائے۔ اگر اس نے قسم پر عمل کر لیا تو بہتر، ورنہ ترک کرنے کی صورت میں کفارہ واجب ہو گا اور اس کی صورت یہ ہوگی کہ:

(الف).... ایک غلام آزاد کر دے۔

(ب).... اگر اس کی طاقت نہ ہو تو دس مسکینوں کو پیٹ بھر کر کھانا کھلا دے۔

(ج).... یہ بھی نہ ہو سکے تو برابر تین دن تک روزہ رکھے۔

(۳).... غموس: ارادۃً ایک معاملہ کے متعلق جھوٹی قسم کھائی، اس کا گناہ اس قدر اشد شدید ہے کہ محض کفارہ کافی نہ ہو گا، بلکہ نہایت ہی الحاج و تضرع کے ساتھ توبہ و انابت الی اللہ کرنی ہوگی۔ تب جا کر یہ جرم عظیم معاف ہو گا یہ

قسم ہمیشہ ماضی سے تعلق رکھتی ہے ①۔

① مذکورۃ الصدراۃ نے قانون کے اصول اساسی بیان کر دیے، ان کو پیش نظر رکھ کر ہم جزئیات کے لئے قانون بنانے کے مجاز ہیں۔ یہ دستور العمل نذر اور یمین کے درجہ کا ہو گا اس میں برو تقویٰ اور اصلاح بین الناس کا خیال رکھنا ضروری ہو گا۔ اگر کوئی جدید قانون ان کی مخالفت میں بن گیا تو اس کا توڑنا ضروری ہو گا۔ اگر ارباب حل و عقد نہایت ہی غور و فکر اور کافی بحث و مشاورت کے بعد ایک قانون پر اتفاق کر کے اس کے نافذ کرنے کا عزم کر لیا، بعد میں اس کی

لِّلَّذِينَ يُؤَلُّونَ مِن نِّسَابِهِمْ تَرِثُصْ اَرْبَعَةُ اَشْهُرٍ ؕ فَاِنْ فَاَعُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۴۰﴾ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَبِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۴۱﴾

”جو لوگ اپنی عورتوں سے علیحدہ رہنے کی قسم کھالیں ان کے لئے چار ماہ کی مہلت ہے، پھر اگر رجوع کر لیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے اور اگر طلاق کا عزم کر لیں تو اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔“

قسموں کے سلسلہ میں طلاق کی ایک خاص قسم کا ذکر کیا جاتا ہے جو عرب میں ایلاء کے نام سے مشہور تھی۔ اگر مرد و عورت میں اختلاف پیدا ہو جاتا اور وہ یہ بھی نہ چاہتا کہ میری عورت کسی دوسرے کے پاس جائے تو قسم کھا لیتا کہ میں اس کے قریب نہ جاؤں گا اور اس طرح پر اس کو چھوڑ دیتا کہ نہ تو وہ خاوند والی ہوتی اور نہ دوسری جگہ نکاح کر سکتی، تاکہ اسے تکلیف ہو اور مصیبت میں مبتلا رہے۔ یہ نہایت ہی بدترین رسم تھی، اس لئے ضروری ہوا کہ سب سے پہلے اس غلط کاری کی اصلاح ہو۔ اگر کوئی شخص قسم کھالے کہ وہ اپنی بیوی سے صحبت نہ کرے گا تو اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔

(الف).... کوئی مدت معین نہ کرے۔

(ب).... چار ماہ کی مدت معین کر دے۔

(ج).... چار ماہ سے زائد کی قید لگا دے۔

(ک).... چار ماہ سے کم مدت کا تذکرہ کر دے۔

پہلی تین صورتوں کو شریعت کی اصطلاح میں ایلاء کہتے ہیں۔ ان تینوں کے متعلق حکم یہ ہے کہ اگر خاوند چار ماہ کے اندر اندر اپنی قسم توڑ ڈالے اور بیوی کے پاس چلا جائے تو اسے اپنی قسم کا کفارہ ادا کرنا ہو گا اور اگر چار ماہ گزر گئے اور قسم نہ توڑی تو اس عورت پر طلاق کا نفاذ ہو گیا۔ اب بلا نکاح رجوع جائز نہ ہو گا، البتہ اگر دونوں رضامندی سے پھر نکاح کر لیں تو درست ہے اور حلالہ کی ضرورت نہ ہوگی۔ چوتھی صورت کا حکم یہ ہے کہ اگر قسم توڑ دی تو کفارہ ادا کر دے اور قسم پوری کر لی جب بھی نکاح باقی ہے۔

شریعت طاہرہ نے ہمیشہ کے لئے ایک قاعدہ معین کر دیا کہ ایلاء کی مدت زیادہ سے زیادہ چار ماہ ہو سکتی ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ مرد و عورتوں کے حقوق بھی ادا نہ کریں اور ان کو اس طرح سے رکھیں کہ وہ اپنے متعلق کوئی فیصلہ نہ کر سکیں، بلکہ خاوند کو چار ماہ غور کے لئے مل سکتے ہیں، اگر وہ اپنی بیوی کے حقوق ادا کرنے کو تیار ہے تو بہتر اور نہ علیحدگی اختیار کرنی پڑے گی۔ کیونکہ جب موانست کی کوئی صورت نہیں اور مزید فتنہ و فساد کا اندیشہ ہے تو حکومت مداخلت کر کے خاوند اور بیوی میں تفریق کر دے گی۔

غلطیاں معلوم ہوئیں اور فوراً اس کی اصلاح کر دی، اس پر اصرار نہ کیا تو اللہ اپنے علم اور بردباری سے کام لے کر ان غلطیوں کو نظر انداز کر دے گا۔

## طلاق کے متعلق چند الفاظ

دنیاۓ قدیم میں عورت کی کوئی قدر و منزلت نہ تھی، عیسائیت کے پرستار جناب پولوس نے فرمایا: عورت ہی کے ذریعہ گناہ دنیا میں آیا اور عورت ہی کے طفیل میں ہم کو موت دیکھنی پڑی۔ برنارڈ، انٹونی، جیروم اور گریگوئے اعظم نے نہایت بلند آہنگی سے عورت کے متعلق شیطان کا آلہ، شیطان کے ہتیاروں کی جڑ، شیطان کا دروازہ، بچھو، شاہراہ عصیاں اور زبور کا زہر کے الفاظ استعمال کئے۔ خود یورپ کو اس بات کا فیصلہ کئے ہوئے زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ عورت میں روح موجود ہے۔

ان مختلف اقوال سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ازمنہ قدیمہ میں عورت کی نسبت کس قسم کے خیالات تھے۔ وہ کسی قدر شکوک و شبہات کی آماجگاہ رہی ہے۔ اس کے حق احترام و حریت کو خود غرض مرد نے ہمیشہ چھیننے کی کوشش کی۔ اس لئے یہ ایک قدرتی بات تھی کہ اس کے تمام حقوق کو یک قلم فراموش کر دیا جاتا۔ باوجود اس قدر ادعائے تہذیب و تمدن کے یورپ میں اب تک یہ حالت ہے کہ عورت کی کوئی حیثیت نہیں۔ جب تک وہ ناکندہ ہے، باپ کے نام سے مشہور ہوتی ہے، جب نکاح ہو گیا تو خاوند کے نام میں اس کی شہرت فنا ہو جائے گی۔ کوئی عورت اپنے نام سے جائیداد نہیں خرید سکتی، یہی وجہ ہے کہ نکاح و طلاق کے مسائل میں ہر قوم افراط و تفریط میں مبتلا رہی ہے۔

عرب طلاق دینے میں بالکل آزاد تھے، ان کے نزدیک عورت کی کوئی عزت نہ تھی۔ اپنی لڑکیوں کو زمین میں زندہ دفن کر دیا کرتے تھے، طلاق کی کوئی حد نہ تھی، جب چاہا رجوع کر لیا اور ذرا سی ناراضی پر الگ کر دیا۔ یہودی بھی اس باب میں عرب کے ہم آہنگ تھے۔ عیسویت کا مقصد یہ تھا کہ یہودیوں کی اصلاح کرے، مگر اس نے طلاق کے متعلق ایسا قانون مرتب کیا کہ آج دنیا اس پر عمل کرنے سے عاجز ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: یہ بھی کہا گیا تھا کہ جو کوئی اپنی بیوی کو چھوڑے، اسے طلاق نامہ لکھ دے، لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنی بیوی کو حرام کاری کے سوا کسی اور سبب سے چھوڑ دے وہ اس سے زنا کرتا ہے اور جو کوئی اس چھوڑی ہوئی بیوی سے بیاہ کرے وہ زنا کرتا ہے۔ (متی ۵: ۳۱، ۳۲)

ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ کے بڑے بڑے لارڈ اور ڈیوک جب اپنی بیویوں سے تنگ آ جاتے ہیں اور ان سے نجات کی کوئی صورت نہیں ہوتی تو ان پر زنا کا الزام لگاتے ہیں، جس کے ثبوت میں جھوٹے گواہ پیش کئے جاتے ہیں اور اس طرح چھٹکارا حاصل کیا جاتا ہے۔

ہندوؤں نے یہ خیال کیا کہ خاوند اور بیوی کے تعلقات ایسے ہی ہیں جیسے خدا کے روابط اپنی مخلوق سے ہیں۔ اس لئے انہوں نے فیصلہ کیا کہ عورت ہمیشہ خاوند کی غلام رہے، اس کی پرستش کرے، مگر اس کے مرنے پر وہ بھی آگ میں جل جائے، دوسری شادی نہ کرے۔ اسی قسم کی اور پابندیاں بڑھادیں۔

قرآن حکیم نے ان تمام بندشوں کو دور کر دیا اور فرمایا کہ جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں ایسے ہی مردوں پر بھی بہت سی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں: **وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ** (البقرہ ۲۲۸) طلاق کے بارے میں جس قدر



افراط و تفریط تھی اس کو دور کر کے راہ اعتدال معین کر دیا، قیود و شرائط لگا دیں اور لسان نبوت نے ان مختصر الفاظ میں طلاق کی حقیقت پر روشنی ڈالی کہ ابغض السباحات عند الله الطلاق، ”تمام جائز اور حلال اشیاء میں سے اللہ کے نزدیک مبغوض ترین طلاق ہے۔“ گویا طلاق دینے میں بہت زیادہ دوراندیشی سے کام لینا پڑے گا۔ قرآن نے ان وجوہ و اسباب پر زیادہ وضاحت سے گفتگو نہیں کی۔ بعض مقامات پر صرف اشاروں سے کام لیا ہے اور اس کا قطعی و آخری فیصلہ ہر ملک اور قوم کی اپنی اپنی تہذیب و شائستگی پر چھوڑ دیا ہے۔ البتہ اس نے پابندیوں کا ذکر کیا ہے کہ اس کی آزادی کو محدود کر دیا جائے ❶۔

### تین حیض کا انتظار

وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ ۚ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَنْ يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ إِنْ كُنَّ يُؤْمِنُ  
بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ وَبَعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ  
بِالْمَعْرُوفِ ۚ وَلِلرِّجَالِ جَالٌ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۚ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ❷

”اور مطلقہ عورتیں تین حیض تک اپنے آپ کو روکے رکھیں اور اگر وہ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتی ہیں تو انہیں جائز نہیں کہ جو کچھ اللہ نے ان کے رحم میں پیدا کیا ہے اس کو چھپا رکھیں اور اگر شوہر اصلاح کا قصد رکھیں تو اس مدت میں ان کے لوٹا لینے کے وہی زیادہ حق دار ہیں۔ اور جیسا کہ مردوں کا عورتوں پر حق ہے ویسے ہی دستور کے مطابق عورتوں کا بھی حق ہے اور مردوں کو عورتوں پر فوقیت ہے اور اللہ زبردست حکمت والا ہے۔“

یہاں سے طلاق کے مختلف احکام بیان کئے جاتے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) جس عورت سے خاوند نے صحبت یا خلوت صحیحہ کی ہو، اس کو حیض آتا ہو اور وہ آزاد بھی ہو، اس کو جب طلاق دی جائے گی تو اسے تین حیض تک انتظار کرنا پڑے گا۔ یہ مدت تقریباً تین ماہ ہو جاتی ہے، اس زمانہ انتظار کو شریعت کی اصطلاح میں ”عدت“ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس مدت میں دوسرے شخص سے نکاح کرنا جائز نہیں۔ اس انتظار کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ خاوند اور بیوی میں مصالحت کی کوئی صورت نکل آئے۔ جن عورتوں سے شوہر نے صحبت یا خلوت صحیحہ نہ کی ہو، تو طلاق کی صورت میں ان کے لئے کوئی عدت نہیں، جس

❶ ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رعایا کے حقوق ادا کرنا، اس کے جان و مال کی حفاظت، اس کی تعلیم و تربیت اور تمام ضروریات کی فراہمی حاکم کے ذمہ ہے، لیکن اگر وہ غفلت سے کام لیتا ہے، حقوق کی نگرانی نہیں کرتا اور اسکی حریت و آزادی کو سلب کر لیتا ہے تو وہ حکومت کا حق دار نہیں رہا، بلکہ رعایا حقیق ہو کر اس سے اپنے حقوق کا مطالبہ کرے اور اس کو حکومت سے دستبردار ہونے کے لئے مجبور کرے۔ مگر اسے فوراً ہی الگ نہیں کیا جائے گا، بلکہ اسے چار ماہ کی مہلت دی جائے گی۔ ممکن ہے وہ اپنی اصلاح کر لے اور حقوق ادا کرنے کو تیار ہو جائے، لیکن اگر باوجود تنبیہ کے اس کی حالت میں تغیر نہ ہو تو چار ماہ کے بعد رعایا اس کو تخت سے اتار دے گی اور اس کی جگہ دوسرے کو منتخب کر لے گی۔ سورہ توبہ میں جب کفار کو انداز حرب دیا گیا تو غور کرنے کے لئے انہیں بھی چار ماہ کا زمانہ دیا گیا۔ بِرَأْفَةٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى الَّذِينَ هَدَيْتُمْ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ ❷ فَسَيُخَوِّفُ الْكَافِرُ أَزْوَاجَهُ أَشْهُو (التوبہ ۱۰۲) اس سے معلوم ہوا کہ غور کرنے کے لئے شریعت نے سال کا تیسرا حصہ مقرر کر رکھا ہے، مرد کو چار ماہ کی مہلت دی گئی کہ فوراً دوسری جگہ نکاح مشکل ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ خاوند اور بیوی کے تعلقات اچھے ہو جائیں، ایسے ہی حاکم چار ماہ تک غور کرے، شاید اس مدت میں باہمی صلح و صفائی ہو جائے یا اس درمیان میں رعایا کوئی دوسرا حاکم تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائے۔



عورت کو حیض نہ آتا ہو اس کی تین صورتیں ہیں۔

(الف).... کسی نے نابالغ لڑکی سے شادی کر لی اس کی عدت تین ماہ ہے۔

(ب).... اگر کوئی عورت بہت بوڑھی ہے کہ حیض کا خون بند ہو گیا، اس کو بھی تین ماہ انتظار کرنا پڑے گا۔

(ج).... اگر وہ حاملہ ہے، اس کی عدت وضع حمل کے وقت ختم ہوگی۔

(۲) اگر ان عورتوں کے دلوں میں اللہ کا خوف ہے اور اعمال کی ذمہ داری محسوس کرتی ہیں، تو اپنے حمل یا حیض کو مخفی نہ رکھیں۔ کیونکہ اخفا کا نتیجہ یہ ہو گا کہ عدت کے شمار کرنے میں دقت پیدا ہو جائے گی۔

(۳) اگر خاوند اور بیوی اصلاح کے آرزو مند ہوں تو پھر زیادہ مناسب یہی ہے کہ ان عورتوں کو پہلے خاوندوں ہی کی طرف لوٹا دیا جائے۔ تین ماہ کے زمانہ میں انسان کافی غور و فکر سے کام لے سکے گا۔ الگ رہنے کی وجہ سے عارضی رنجش اور ناراضگی دور ہو جائے گی۔ سابقہ الفت و محبت پھر عود کر آئے گی، پہلا تعلق قائم ہو جائے گا اور اس طرح ان جلد بازیوں کا تدارک ہو جائے گا جو طلاق کے متعلق تصور کی جاسکتی ہیں۔

(۴) مردوں کو توجہ دلائی کہ نکاح کی بنا پر جس طرح تمہارے حقوق عورتوں پر عائد ہوتے ہیں ایسے ہی ان کے حقوق تم پر ہیں، ان کا خیال رکھنا تمہارا فرض ہے۔ اس ایک جملہ نے درحقیقت طلاق کے ناجائز استعمال کو روک دیا اور تمام دنیا میں عورت کی قدر و منزلت قائم کر دی جو اس سے پہلے اُس کو نصیب نہ تھی۔ البتہ جب خاوند اور بیوی میں اختلاف رائے ہو گا تو توفیق رکھنے کی وجہ سے خاوند کی رائے کو ترجیح ضرور حاصل ہوگی۔

خاوند کا فرض ہے کہ اپنی بیوی کے حقوق کا خیال رکھے، اس لئے کہ وہ اس کی نگرانی میں رکھی گئی ہے، اگر مرد اپنے فرائض کے ادا کرنے میں کوتاہی سے کام لے گا تو اسے یاد رکھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ عزیز ہے اپنے غلبہ و اقتدار سے کام لے کر اُسے ذلیل کر دے گا<sup>۱</sup>۔

۱۔ گزشتہ آیات میں اگر مزید درس و فکر سے کام لیا جائے تو ان سے حسب ذیل مسائل کا استنباط ہو گا۔

(۱) اگر حاکم و محکوم میں اختلاف شدید ہو گا اور مصالحت کی کوئی صورت باقی نہیں رہی، بلکہ رعایا نے اس کو معزول کر دیا، اس وقت رعایا کے لئے مناسب یہی ہے کہ معزول شدہ حاکم کے تمام سابقہ مطالبات ادا کر دے۔

(۲) راعی و رعایا میں اگر مصالحت ہو جائے اور حاکم اداۓ حقوق کا عہد و پیمان کرے تو زیادہ قرین عقل و انصاف یہی ہے کہ اس کے ہاتھ میں قوم کی عتائ سیاست رہے۔

(۳) مگر حاکم یہ امر ہمیشہ اپنے ذہن نشین کر لے کہ جس طرح میں چاہتا ہوں کہ رعایا میرے تمام حقوق کی حفظ و نگہداشت کرے اور میرا حکم ماننے کو تیار ہو ایسے ہی رعایا کے بھی بہت سے حقوق ہیں جن کا پورا کرنا حاکم کا اولین فرض ہے۔ مثلاً اس کی جان و مال کی حفاظت، بیرونی و اندرونی مصائب سے حفظ و صیانت، تعلیم و تربیت کا بہترین انتظام اور تمام داخلی و خارجی معاملات میں کامل حریت و استقلال وغیرہ وغیرہ۔

(۴) البتہ اگر راعی و رعایا میں کسی مسئلہ پر اختلاف ہو جائے اور ارباب حل و عقد دونوں جانب برابر ہوں تو جس طرف حاکم کی رائے ہوگی اسے ترجیح دی جائے گی۔

## طلاق رجعی

گزشتہ آیات میں مردوں کے حقوق بیان کئے گئے، اب عورتوں کے حقوق کا تذکرہ آتا ہے۔

الطَّلَاقُ مَرْئِنٌ فَاِمْسَاكِ بِمَعْرِوْفٍ اَوْ تَسْرِيْعٍ بِاِحْسَانٍ ۚ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّا اَتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا اِلَّا اَنْ يَخَافَا اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۚ فَلَا جُنَآءَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهٖ ۚ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظَّالِمُوْنَ ﴿٣١﴾

”طلاق دوہی مرتبہ ہے، پھر یا تو دستور کے مطابق روک رکھنا ہے یا خوبی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے اور جو مال تم نے ان کو دیا ہے، تمہیں جائز نہیں کہ اس میں سے کوئی شے لے لو، مگر یہ کہ خاوند اور بیوی کو اس بات کا خوف ہو کہ اللہ کی حدوں کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو اس صورت میں کہ تم لوگوں کو اس بات کا خوف ہو کہ میاں بی بی اللہ کے احکام کو پورا نہ کر سکیں گے اور عورت اپنی جان بچانے کے لئے کچھ دیدے تو اس میں دونوں پر کچھ گناہ نہیں۔ یہ اللہ کی حدیں ہیں، ان سے آگے مت بڑھو اور جو اللہ کی باندھی ہوئی حدود سے آگے بڑھ جائیں تو یہی لوگ ظالم ہیں۔“

پہلی آیت میں فرمایا تھا کہ بعولتھن احق بہر دھن، اب اس طلاق کی مزید تفصیل بیان کی جاتی ہے، طلاق کی ایک قسم رجعی بھی ہے جس کا اس آیت میں تذکرہ ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) ایسی طلاق جس کے بعد عورت اپنے پہلے خاوند کی طرف لوٹائی جاسکتی ہے صرف دوہی مرتبہ ہے، بشرطیکہ ادائے حقوق کا خیال ہو۔ اس سے مقصد یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو طلاق کا وقوع نہایت ہی شاذ حالات میں ہوں۔

(۲) عرب میں دستور تھا کہ صدہا مرتبہ طلاق دینے کے بعد بھی خاوند رجوع کر سکتا تھا، جس سے عورتوں کے حقوق بالکل ہی فنا ہو جاتے تھے۔ اسلام نے آتے ہی مرد کی آزادی کو چھین لیا اور فرمایا کہ اگرچہ ایک شخص دودفعہ طلاق دے کر رجوع کا حق رکھتا ہے، مگر تیسری مرتبہ بھی طلاق دینے کے بعد یہ حق سلب ہو جائے گا اور اب خاوند اور بیوی میں علیحدگی ہو جائے گی، دو طلاقیں کے بعد اسے اجازت دی گئی کہ۔

(الف) عدت کے اندر رجوع کرے، اس سے حسن سلوک کے ساتھ پیش آئے اور اس کے حقوق و مراعات کا خیال رکھے۔

(ب) ورنہ تیسری مرتبہ طلاق دیکر نیکی کے ساتھ رخصت کر دے۔

(۳) جب خاوند اپنی بیوی کو بغیر کسی قصور اور جرم کے طلاق دیتا ہے تو وہ مہر وغیرہ سے ایک پائی بھی واپس لینے کا مجاز نہیں اور اگر اب تک مہر ادا نہیں کیا تو طلاق کے وقت ایک ایک کوڑی شمار کر کے دینی ہوگی۔ یہ بھی

(۵) اگر دوبارہ حکومت لینے کے باوجود اس نے پھر بھی رعایا کے حقوق ادا نہ کئے تو اسے یاد رکھنا چاہئے کہ اس سے بالاتر ایک اور قوت بھی موجود ہے جو اس نظام عالم کو قائم کئے ہوئے ہے، وہ فوراً اس پادشاہ کو ذلیل کر دے گی اور جب تک کوئی دوسرا شخص اس کی سرکوبی کے لئے تیار نہ ہو گا اس کو عدوان و سرکشی میں ترقی کرنے کا اور موقع دے گی، تا آنکہ اللہ کے غضب کا ہاتھ چکے اور اس کے خرم حکومت کو جلا کر خاکستر کر دے۔

طلاق کی آزادی کو روکنا ہے۔ جب اتنی مدت تک دونوں کی صحبت و یکجائی رہی، نکاح کے وقت یہی عہد و پیمان ہوا تھا کہ ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔ اب اگر بعض اسباب کی بنا پر ناچاقی ہو گئی تو پھر بھی دیا ہوا مہر واپس نہیں لیا جاسکتا۔

(۴) مہر واپس لینے کی صرف یہی صورت ہے کہ اس وقت جبکہ مرد و عورت میں اختلاف انتہا تک پہنچ گیا ہو اور مصالحت کی کوئی صورت باقی نہ رہی ہو، جانبین سے بذریعہ حکم کے فیصلہ کی کوشش کی گئی، مگر ناکام رہی، لیکن مرد طلاق دینے پر رضامند نہیں، عورت اس فکر میں ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو اس سے نجات حاصل کرے، ایسی حالت میں اگر عورت خود بخود اپنے خاوند کو کچھ دینے پر رضامند ہو جائے تو خاوند اس رقم کے وصول کرنے پر شریعت کے لحاظ سے گنہگار نہ ہوگا۔ اس قسم کی طلاق کو شریعت کی اصطلاح میں خلع کہا جاتا ہے۔ اس روایت سے اس مسئلہ پر اور زیادہ روشنی پڑتی ہے۔

عن ابن جریج قال نزلت هذه الآية في ثابت بن قيس وفي حبيبه وكانت اشتكت الى رسول الله ﷺ فقال اتردين عليه حديقته قالت نعم فدعا فذكر ذلك له قال وتطيب لي بذلك قال نعم قال قد فعلت فنزلت ولا يحل لكم ان تآخذوا مما آتيتموهن شيا الاية

ابن جریر کہتے ہیں کہ یہ آیت ثابت بن قیس اور حبیہ کے حق میں نازل ہوئی، حبیہ نے رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر طلاق چاہی، آپ نے فرمایا تم اس کا باغ واپس کرنے کو تیار ہو جو اس نے تمہیں مہر میں دیا تھا؟ اس نے اپنی رضا مندی کا اظہار کیا۔ آپ نے قیس کو بلا کر اس کی رضامندی لی اور طلاق دلوا دی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس آیت نے بتا دیا کہ جس طرح مرد کو طلاق دینے کا حق حاصل ہے ایسے ہی عورت بھی اپنے خاوند سے طلاق لینے کی مجاز ہے۔ یہ قانون کی حدود ہیں ان سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ ہو۔

حلالہ

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ ۖ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا إِنْ ظَنَّا أَنْ يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ ۖ وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿۳۱﴾

”پھر اگر عورت کو طلاق دیدے، تو اس کے بعد وہ عورت اس کو حلال نہیں جب تک کہ وہ دوسرے شوہر سے نکاح نہ کرے، پھر اگر دوسرا شوہر بھی طلاق دے دے تو دونوں میاں بیوی پر کچھ گناہ نہیں کہ ایک دوسرے کی طرف رجوع کریں، بشرطیکہ دونوں کو امید ہو کہ اللہ کی باندھی ہوئی حدود کو قائم رکھ سکیں گے، یہ اللہ کی حدیں ہیں جن کو ان لوگوں کے لئے کھول کھول کے بیان فرماتا ہے جو سمجھتے ہیں۔“

تین طلاقیں کے بعد خاوند اور بیوی میں تفریق ہو گئی، اب یہ عورت اس وقت تک کے لئے اس پر حرام ہے جب تک کوئی دوسرا شخص اس سے نکاح نہ کر لے، پھر یا تو وہ مر جائے، یا اس کو طلاق دیدے۔ اس کے بعد وہ عورت اپنے پہلے خاوند

کی طرف رجوع کر سکتی ہے۔ اس کو شرعی اصطلاح میں حلالہ کہا جاتا ہے۔ شریعت کے اعتبار سے تو یہی دو صورتیں نکاح کے جواز کی تھیں، مگر بعض ارباب حیل یہاں بھی خدع و فریب سے باز نہیں آتے اور حیلہ کی ایک صورت پیدا کرتے ہیں یعنی جب پہلے خاوند نے طلاق دے دی پھر اس کو اپنی حرکت پر ندامت ہوئی اور اس نے دوبارہ نکاح کی آرزو کی تو اس کی خاطر ایک شخص نے نکاح کر لیا اور اس کے بعد اسے طلاق دے دی، تاکہ اس طرح وہ اپنے پہلے شوہر کے لئے حلال ہو سکے، مگر تمام ائمہ و فقہاء اس امر پر متفق ہیں کہ یہ نکاح حرام و ناجائز ہے۔

عکرمہ نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ: سئل رسول اللہ ﷺ عن المحلل فقال لا الا نکاح رغبت لا نکاح دلستہ ولا استہزاء بکتاب اللہ ثم یدوق العسيلة، “آپ سے محلل کی نسبت سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا نہیں، نکاح رغبت اور شوق سے ہونا ضروری ہے، اس میں فریب اور خدا کی کتاب کے ساتھ استہزاء و تمسخر نہ ہو۔ نکاح میں ضروری ہے کہ خاوند اور بیوی باہم متتبع ہوں۔” حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: لا اوقی بمحلل ولا محلل لہ الا رجعتہ “جب کبھی میرے پاس کوئی حلالہ کرنے والا یا وہ جس کے لئے تحلیل کی گئی، لایا گیا تو میں نے دونوں کو سنگ سار کیا۔” سلیمان بن یسار کہتے ہیں کہ: دفع الی عثمان رجل تزوج امرأة یحلها لزوجها ففرق بینہما وقال لا ترجع الیہ الا بنکاح رغبة غیر دلستہ، “حضرت عثمان کے پاس ایک مرد لایا گیا جس نے ایک عورت سے صرف اس لئے شادی کی تھی کہ اس کو پہلے شوہر کے لئے حلال کر دے۔ آپ نے ان دونوں میں تفریق کرادی اور فرمایا کہ یہ صرف اس نکاح کے ذریعہ اس کی طرف لوٹ سکتی ہے جس میں رغبت ہو نہ کہ فریب کاری۔” اسی قسم کی الفاظ حضرت علی سے بھی منقول ہیں: لا ترجع الیہ الا بنکاح رغبة غیر دلستہ، حضرت ابن عباس نے محلل اور محللہ کو ملعون فرمایا ہے: عن شعث عن ابن عباس قال لعن اللہ المحلل والمحلل لہ، حضرت حسن بصری کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا: ان رجلا من قومی طلق امراتہ ثلاثا فندم وندمت فاردت ان انطلق فاتزوجها واصلقها صداقا ثم ادخل بها کما یدخل الرجل بامرأتہ ثم اطلقها حتی تحل لزوجها فقالہ الحسن البصری اتق اللہ یا فتی ولا تکنن مسبا رنا ولحدود اللہ، “میری قوم میں سے ایک نے اپنی بیوی کو تین طلاق دیدیں، اس پر وہ دونوں نادم ہوئے، یہ میرا ارادہ ہے کہ اس عورت سے نکاح کر لوں، اس کا مہر ادا کر دوں اور پھر جس طرح شوہر اپنی بیوی کے پاس جاتا ہے جاؤں اور اس کے بعد اسے طلاق دیدوں، تاکہ وہ اپنے شوہر کے لئے حلال ہو جائے۔ حسن بصری نے جواب دیا کہ اے نوجوان! اللہ سے ڈر اور اس کی حدود کے لئے آگ کی کھوٹی نہ بن۔”

پھر یہ کسی فرد واحد کی رائے نہیں کہ نکاح تحلیل حرام و ناجائز ہے، بلکہ سعید بن المسیب، حسن بصری، ابراہیم غنمی، عطاء بن ابی رباح، ابو الشعثاء جابر بن یزید، شعبی، قتادہ، بکر بن عبد اللہ المزنی، مالک بن انس، اوزاعی، لیث بن سعد، سفیان ثوری، احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، سلیمان بن داؤد البہاشمی، ابو خیشمہ زہیر بن حرب، ابو بکر بن شیبہ اور ابو اسحاق الجوزجانی جیسے اساطین امت و ائمہ اعلام اس کے عدم جواز پر متفق ہیں۔

یہ رکاوٹ تو اس لئے پیدا کی گئی تھی کہ تیسری طلاق سوچ سمجھ کر دی جائے، مگر حلالہ کی یہ صورت تو بے حیائی، بے غیرتی اور بد اخلاقی کا فتح باب کرتی ہے۔ ایک شخص اپنی عورت کو تین مرتبہ طلاق دیتا ہے، وہ دوسرے مرد سے نکاح کرتی ہے، مگر مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس سے طلاق لے کر پھر پہلے خاوند کے پاس جائے۔ نکاح کی غرض تو یہ تھی کہ خاوند اور بیوی ہمیشہ مل کر رہیں اور کبھی ان میں افتراق نہ ہو، یہ بد بخت اس مقصد اصلی کو فنا کر چکے، اب صرف قانون کی ظاہری صورت کے پابند بننا چاہتے ہیں۔ بلکہ اگر موجودہ خاوند اور بیوی میں اتحاد ہو گیا تو پہلے خاوند کے لئے جائز نہیں کہ وہ ان میں لڑائی کرانے کی فکر میں لگ جائے۔ البتہ اگر اتفاق سے موافقت نہ ہو سکی، طلاق تک نوبت آگئی اور ادھر پہلے خاوند نے بھی نکاح کا شوق ظاہر کیا تو شریعت کی جانب سے ممانعت نہیں۔ ان حدود الہیہ کا توڑنا مناسب نہیں، ورنہ بے حیائی کا مرض پیدا ہو جائے گا<sup>۱</sup>۔

ضرر دینا جائز نہیں

وَ اِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ فَلَنْتَنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ اَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ ۚ وَلَا تُنْسِكُوهُنَّ ضَرَارًا

۱۔ گزشتہ آیات سے سیاست و ملک داری کے حسب ذیل مسائل کا استخراج کیا جاسکتا ہے۔ ہم مزید سہولت و آسانی کی خاطر فقہی احکام کو بھی ساتھ ہی درج کئے دیتے ہیں کہ تطابق میں دقت نہ ہو۔

(۱) نکاح ایک قسم کا معاہدہ ہے، طلاق دیتے وقت خاوند مہر وغیرہ لینے کی کوشش نہ کرے، جن شرائط پر کسی شخص کے ہاتھ میں ایک قوم کی باگ دی جاتی ہے وہ بھی دراصل ایسا ہی معاہدہ ہے جس طرح خاوند اور بیوی کے درمیان ہوتا ہے۔ حاکم جب ان عہد و موافق کا پابند نہیں اور قوم اسے معزول کر رہی ہے تو اسے جائز نہیں کہ جن اصلاحات کو اس نے اپنے زمانہ حکومت میں نافذ کیا تھا عزل کے وقت برباد کر دے۔ کیونکہ اس سے قومی نشو و نما تقابلیں رکاوٹ پیدا ہو جائے گی۔

(۲) مرد و عورت میں اصلاح نہیں ہو سکتی مگر خاوند طلاق دینے پر رضامند نہیں، اس صورت میں فدیہ دے کر عورت اپنے آپ کو آزاد کر سکتی ہے۔ امیر جب نالا ئق و بدکار ہو، رعایا کے حقوق کی مطلق پروا نہ کرتا ہو، بادجو و صدائے احتجاج بلند کرنے کے اصلاح کی طرف توجہ نہ کرے اور حکومت سے بھی دست بردار نہ ہو، تو قوم حکمت عملی اور دانائی سے کام لے کر امیر کو تخت سے اتارے، تاکہ ملک میں بد نظمی اور فساد بھی نہ ہو اور وہ برطرف بھی ہو جائے۔

(۳) حلالہ کی صورت یہ ہے کہ اگر تفریق کے بعد عورت نے دوسری جگہ شادی کر لی اور اتفاقاً وہاں سے بھی طلاق لینی پڑی اور پہلا خاوند بھی نکاح کے لئے تیار ہو گیا اور آئندہ حقوق کی نگہداشت کا وعدہ کیا، مگر اس کے لئے جائز نہیں کہ اپنے نکاح کی خاطر دوسرے خاوند اور بیوی میں خواہ مخواہ لڑائی کرادے۔ ایسے ہی جب امیر معزول کر دیا گیا، رعایا نے دوسرے شخص کو اپنا امیر منتخب کر لیا، مگر تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ یہ اس سے بھی گیا گزرا ہے، اس پر پہلے امیر کو دعوت دی گئی کہ اگر حکومت سنبھال لے اور اس نے بھی پابندی قانون کا عہد کیا، اس امیر کے لئے ضروری ہے کہ اپنے زمانہ عزل میں جدید امیر کو ناقابل ثابت کرنے اور نقصان دینے کی فکر نہ کرے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ تین مرتبہ طلاق دینے کے بعد خاوند اور بیوی میں مصالحت ہوتی غیر ممکن ہو جاتی ہے اور ان کا باہمی ازدواج خلاف مصلحت ہی معلوم ہوتا ہے۔ ایسے ہی جو امیر رعایا کی صدائے احتجاج بلند ہونے پر تین مرتبہ معزول ہو چکا ہو، اب اس سے یہ توقع رکھنی فضول ہے کہ اپنی اصلاح کرے گا، بلکہ بہتر یہی ہے کہ آئندہ انتخاب میں اس کو امیدوار بننے کا موقعہ ہی نہ دیا جائے۔

(۵) جو شخص اپنی عورت کو اس غرض سے دوسرے کے حوالہ کرتا ہے کہ وہاں سے طلاق لے کر پھر اس سے نکاح کر لے تو وہ بے حیائی کا مرتکب ہوتا ہے، اپنے جذبہ صادق کو فنا کرتا ہے اور شریعت کی زبان میں اس کو ملعون کہا گیا ہے۔ پس اگر ایک مسلمان اپنی عورت کی عصمت و آبرو بچانے کے لئے جان دینے کو تیار ہو جاتا ہے تو اسے یاد رکھنا چاہئے کہ ایمان و اسلام اور اللہ کا گھر اس سے کہیں زیادہ عزیز و محترم ہیں، کیا کلمہ اسلام کے حفظ و بقا اور قرآن حکیم کی دعوت و ارشاد کے لئے اس کے اندر جوش و ولولہ نہ پیدا ہو گا۔

لَتَعْتَذِرُوا ۖ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۖ وَلَا تَتَّخِذُوا إِلَهَ إِلَّا اللَّهَ هُذً ۚ وَادْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا  
أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهِ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٣١﴾

”اور جب تم نے عورتوں کو طلاق دے دی پھر وہ اپنی عدت تک پہنچ گئیں تو ان کو دستور کے مطابق روک رکھو یا اچھی طرح رخصت کرو اور ان کو ستانے کے لئے نہ روک رکھو کہ زیادتی کرنے لگو اور جو ایسا کرے گا تو بیشک اس نے اپنے اوپر ظلم کیا اور اللہ کے احکام کو ہنسی نہ بناؤ اور اللہ کے اس احسان کو یاد کرو جو تم پر ہے اور جو اس نے تم پر کتاب اتاری اور کام کی باتیں جن سے تم کو نصیحت کرتا ہے، اور اللہ سے ڈرو اور جانے رہو کہ اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔“

چونکہ زمانہ جاہلیت میں طلاق رجعی کے متعلق سخت بد نظمی اور بے ترتیبی تھی، اس لئے پھر تاکید مزید کی کہ اگر رجوع کرنا ہو تو بہتر، ورنہ دستور کے مطابق شریفانہ طور پر اس بیوی کو الگ کرو اور یاد رہے کہ بے زبان عورت کو صرف تکلیف و مصیبت میں ڈالنے کی غرض سے گھر میں بند نہ رکھنا، کیونکہ اس اختلاف کی صورت میں تمہیں بہت سی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ گھر میں ہر وقت جنگ رہے گی، عورت تمہاری عزت کا مطلق خیال نہ رکھے گی، تمہیں ہر وقت اس کی غلامی کرنی پڑے گی، وہ اپنی اولاد کو تمہاری نافرمانی کی تعلیم دے گی اور اس کو بد اخلاق بنانے کی کوشش کریگی۔ پس جو شخص اپنی بیوی پر ظلم کرتا ہے وہ حقیقت میں خود اپنے اوپر ظلم کرتا ہے اور ایسا کرنا قانون الہی سے تمسخر و استہزاء کرنا ہے۔ تمہارا فرض یہ ہو کہ اللہ کا قانون اپنے محل اصلی پر استعمال ہو۔ عورت تمہاری نگرانی میں رکھی گئی ہے، خانہ داری کے لئے ایک دستور العمل نوازش کیا، جس کے اصول اساسی تمہارے ذہن نشین کر دیئے گئے، ان اعلیٰ ترین نعمتوں کی قدر یہی ہے کہ ان سے عبرت اندوز ہو کر تذکیر و موعظت پیدا کرو۔ اگر تم نے اس قانون کو بیجا طریق پر استعمال کیا اور اس میں ایسی پیچیدگیاں پیدا کر دیں کہ حکومت بھی مواخذہ نہ کر سکے، تو یاد رہے اللہ تعالیٰ ہر چیز سے واقف ہے، تمہارا دل و فریب اس پر مخفی نہیں رہ سکتا۔

رکاوٹ پیدا نہ کرو

وَإِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَنْكِحْنَ إِذَا وَاجِهَهُنَّ إِذَا تَرَاصُوا يَنْكِحُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ ذَٰلِكَ يُوعِظُ  
بِهِ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ ذَٰلِكُمْ أَزْكَىٰ لَكُمْ وَأَطْهَرُ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٣٢﴾

● امیر کافر فرض ہے کہ حکومت لیتے وقت جو عہد و پیمان کیا تھا اس کو پورا کرے۔ اگر ایسا نہیں کرتا، رعایا اسے معزول کرنا چاہتی ہے اور وہ الگ نہیں ہوتا بلکہ اپنے آپ کو محام و استوار کرنے کی غرض سے اور زیادہ سخت گیر قانون وضع کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اس سے کامیابی ہوگی، اس کا اقتدار قائم رہے گا، اس کی قوم کے تمام افراد عزت و آبرو کی زندگی بسر کریں گے۔ تمام جلیل القدر عہدے ان کے قبضہ میں ہوں گے اور رعایا ذلت و رسوائی کی زندگی کے لئے مجبور ہوگی۔ مگر اسے یاد رکھنا چاہئے کہ وہ اپنے اوپر آپ ظلم کر رہا ہے۔ رعایا کے دل سے اس کی عزت و حرمت جاتی رہے گی، بغاوت انگیز تحریکوں کے لئے راستہ کھل جائے گا، اس کے قتل کی تدبیریں ہوں گی، تمام ملک فتنہ و فساد کا گھر بن جائے گا اور اس بد بخت امیر کو ایک لمحہ بھی چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوگا۔

”اور جب تم اپنی بیویوں کو طلاق دید و پھر وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو انہیں اس سے نہ روکو کہ اپنے شوہروں سے نکاح کر لیں جب وہ جائز طور پر آپس میں راضی ہو جائیں، یہ اس کو نصیحت کی جاتی ہے جو تم میں اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہے یہ تمہارے لئے بڑی پاکیزگی اور صفائی کی بات ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔“

اگر عورت کو طلاق دے چکے اور اس کی عدت کا زمانہ بھی ختم ہو گیا اب وہ جس جگہ چاہے نکاح کر سکتی ہے، خواہ پہلے شوہر سے کرے خواہ کسی اور شخص سے، دونوں صورتوں میں کوئی شخص اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں پیدا کر سکتا۔ بعض اوقات خود پہلا خاوند ہی طلاق دینے کے بعد اس عورت کو دوسری جگہ نکاح کرنے سے روکتا ہے، کیونکہ وہ اسے ذلت خیال کرتا ہے اور کبھی اس عورت کے رشتہ دار ہی سد راہ بن جاتے ہیں۔ اس آیت میں دونوں کو روک دیا گیا ہے، انہیں تو اپنی عزت بچانے کی فکر ہے اور یہ خیال نہیں آتا کہ اگر وہ نکاح نہ کر سکی تو ممکن ہے اس سے زیادہ خرابیوں کی مرتکب ہو۔<sup>۱</sup>

اس آیت کے متعلق حسب ذیل مسائل کا یاد رکھنا ضروری ہے۔

- (۱) عورت جس سے نکاح کا ارادہ کرے وہ غیر کفو نہ ہو، مہر مثل سے کم مقرر نہ ہو، ورنہ عورت کے ولی کو روکنے کا حق حاصل ہو گا۔ اگر وہ نکاح کر لے گی تو عدالت اس کو فسخ کر سکے گی۔
- (۲) اگر شرعی گواہوں کے بغیر نکاح کرنے لگے، نابالغہ بغیر ولی کی اجازت کے نکاح کر لے یا ایسے شخص سے ازدواج کی تجویز کی گئی ہو جس سے نکاح حرام ہے تو یہ تمام صورتیں باطل ہوں گی اور ہر شخص کو روکنے کا حق ہو گا۔
- (۳) شوہر اول سے نکاح کے جواز کی صورت یہ ہو گی کہ اس نے تین طلاق نہ دی ہوں، ورنہ حلالہ کے بغیر نکاح نہ ہو سکے گا۔

### مسئلہ رضاعت

مباحث طلاق میں اولاد کو دودھ پلانے کا سوال ضرور پیدا ہوتا ہے، اس لئے فرمایا:

وَالْوَالِدَتُ يُرَضِّعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُنْعِمَ الرِّضَاعَةَ وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۖ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَارُّ وَالِدَةُ بَوْلِدِهَا وَلَا مَوْلُودٌ لَّهُ بِوَلَدِهِ ۖ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَلِكَ ۚ فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ۚ وَإِنْ أَرَدْتُمْ أَنْ تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَأَلْتُم مَّا آتَيْتُم بِالْمَعْرُوفِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿۴۰﴾

• جب راعی در عایا کی تفریق کی بنا پر ایک امیر کو معزول کر کے دوسرے کے تقرر کی تجویز ہوئی اور باہمی عہد و پیمان بھی ہو گیا تو معزول شدہ امیر کو جدید فرمانروا کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنے کا حق نہ حاصل ہو گا، وہ لوگوں کو اس کی جانب سے بدگمان کرنے کی کوشش میں نہ مصروف ہو جائے۔ اس سے ملک میں نظم و نسق قائم نہ رہ سکے گا اور جب راعیا کے سر پر کوئی نگران کار نہ ہو گا تو خانہ جنگی شروع ہو جائے گی اور قتل و خونریزی کے سوا اور کچھ نظر نہ آئے گا۔



”جو شخص چاہے کہ دودھ کی مدت پوری کرے، تو مائیں اپنے بچوں کو پورے دو برس دودھ پلائیں اور باپ پر جس کا وہ بچہ ہے دستور کے مطابق ان کا کھانا اور کپڑا ہے۔ کسی کو تکلیف نہ دی جائے، مگر اس کی برداشت کے موافق، نہ تو ماں کو اس کے بچہ کی وجہ سے نقصان دیا جائے اور نہ باپ کو اس کے بچہ کے سبب، اور ایسا ہی وارث پر بھی لازم ہے، پھر اگر وہ دونوں اپنی مرضی اور مشورہ سے دودھ چھڑانا چاہیں تو ان پر کچھ گناہ نہیں اور اگر تم اپنی اولاد کو کسی دایہ سے دودھ پلوانا چاہو تو بھی تم پر کچھ گناہ نہیں، جبکہ دستور کے مطابق جو تم نے مقرر کیا ہے، حوالہ کر دو اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ دیکھ رہا ہے۔“

دودھ پلانے کی مدت دو سال ہے۔ اس زمانہ میں خاوند اپنی حیثیت کے مطابق تمام مصارف برداشت کرے۔ اگر خاوند اور بیوی کا متفقہ فیصلہ یہ ہو کہ کسی دوسری عورت سے دودھ پلوائیں تو اس کی اجازت ہے، مگر اجرت ادا کرنا ضروری ہے۔ دوسری جگہ دودھ چھڑانے کی مدت ڈھائی سال قرار دی ہے وَحَبْلُهُ وَفِصْلُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا (الاحقاف ۱۵) دراصل اس میں حمل کے چھ ماہ بھی شامل کئے گئے ہیں۔ اگرچہ حمل کی مدت تو نو ماہ ہے مگر ابتداء کے تین ماہ ویسے ہی ہوتے ہیں۔ کیونکہ حمل کا ظہور تین ماہ کے بعد ہوتا ہے۔ پس دودھ کا زمانہ تو وہی دو سال رہا اور چھ مہینے حمل کے ہوئے۔

اس آیت میں حسب ذیل مسائل بیان کئے گئے ہیں۔

(۱) خاوند اور بیوی دونوں مل کر اولاد کی تربیت کریں۔

(۲) خاوند کا فرض ہو گا کہ بیوی کے تمام مصارف کا انتظام کرے اور کسی قسم کی تکلیف نہ دے۔

(۳) دونوں کو اجازت ہے کہ اگر چاہیں تو اپنی اولاد کو دوسری عورتوں سے دودھ پلوائیں۔

(۴) جب دونوں کا مشورہ ہو تو دودھ چھڑا سکتے ہیں<sup>۱</sup>۔

۱ جس ترتیب سے اوپر مسائل بیان کئے گئے ہیں اسی ترتیب سے نتائج ملاحظہ ہوں۔

(الف) عورت اور مرد اگر متحد ان خیال ہوں تو ان سے اولاد پیدا ہونا ضروری ہے جس کی تربیت ان پر عائد ہوتی ہے، ایسے ہی جب حاکم و محکوم میں اتحاد و یگانگت ہوگی تو ضرور ہے کہ دوسری قومیں ان کی مفتوح ہوں یا ان کے ماتحت رہنا پسند کریں۔ ان سب اقوام کی حیثیت اولاد کی ہوگی راہی و رعایا کا مشترک مقصد یہ ہو گا کہ ان کی تعلیم و تربیت میں کوشاں رہیں۔

(ب) رعایا علوم و معارف کا سامان فراہم کرے گی۔ حکام کا یہ فرض ہو گا کہ ملک میں امن قائم رکھیں۔ مصارف کا بندوبست کریں اور آزادانہ کام کرنے کا موقع دیں۔ ہر ایک جماعت اپنے اپنے فرائض کو محسوس کرے کوئی فرزند آدم دودھ سے انکار نہیں کرتا۔ یہ علوم بھی دودھ کی جگہ پر ہوں گے۔ اگر اشاعت تعلیم کے بعد جدید اقوام نے اسلام قبول کر لیا تو وہ ہمارے مساوی ہو جائے گی اور ان کو برابر کے حقوق ملیں گے۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(ج) خاوند اور بیوی اپنے مشورہ سے دوسری عورت کا دودھ بھی پلو سکتے ہیں، پس اگر ضرورت ہو تو راہی و رعایا دونوں مل کر دوسری قوموں سے بعض وہ علوم اور صنعت و حرفت سیکھ سکتے ہیں جن کی اب تک انہیں خبر نہ تھی۔

(د) متفقہ مشورہ سے بچہ کا دودھ چھڑا سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ ضروری نہیں کہ ہر مفتوحہ قوم کے سامنے ہم اسلام ہی پیش کریں، بلکہ اگر مناسب ہو تو ابتدا میں انہیں ماتحت رہنے دیں، اس درمیان میں انہیں مسلمانوں کے اخلاق و اعمال اور اسلام کے محاسن و فضائل کے درس و مطالعہ کا کافی موقع مل جائے گا۔ جب انہیں وہ خود بخود دائرۃ اسلام میں داخل ہونا شروع کر دیں۔



## عورت انتظار کرے

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا ۖ فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيهَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿٣١﴾

”اور جو لوگ تم میں مرجائیں اور اپنی بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ بیویاں اپنے آپ کو چار ماہ اور دس دن روکے رکھیں، پھر جب اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو جو وہ اپنے حق میں جائز طور پر کریں اس میں تم پر کچھ گناہ نہیں اور جو تم کرتے ہو اللہ اس سے خبر دار ہے۔“

جن عورتوں کے خاوند مرجائیں اور انہیں حمل نہ ہو تو خاوند کی وفات پر انہیں چار ماہ دس روز اپنے خاوند کے گھر میں رہنا ہو گا۔ رات کو کسی دوسرے کے گھر میں نہیں رہ سکتیں۔ اس زمانہ عدت میں خوشبو لگانا، بناؤ سنگار کرنا، سرمہ، تیل اور مہندی بلا ضرورت استعمال کرنا اور رنگین کپڑے پہننا درست نہیں۔ عدت کے بعد انہیں نکاح کی اجازت ہے ۴۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا عَرَضْتُمْ بِهِ مِنْ خُطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنُتُمْ فِي أَنْفُسِكُمْ ۖ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَكِنْ لَا تَأْوِعِدُوهُنَّ سِرًّا إِلَّا أَنْ تَقُولُوا قَوْلًا مَعْرُوفًا ۚ وَلَا تَعْرِمُوا عَقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّى يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا فِي أَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ ۚ وَاللَّهُ عَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿٣٢﴾

”اور اگر تم نے کسی بات کی آزمائش میں ان عورتوں کو نکاح کا پیغام دیا یا تم اپنے دل میں چھپائے رکھو تو اس میں بھی تم پر کچھ گناہ نہیں۔ اللہ کو معلوم ہے کہ تم ان کا ذکر کرو گے لیکن ان سے چپکے چپکے وعدہ نہ کر لو، مگر یہ کہ جائز طور پر کوئی بات کہہ دو اور جب تک میعاد مقررہ اپنے اختتام تک نہ پہنچ جائے، نکاح کی کرہ نہ باندھو اور جانے رہو کہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اللہ جانتا ہے تو اس سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اللہ بخشنے والا بردبار ہے۔“

عدت کے زمانہ میں صرف اشارۃً عورت کو نکاح کا پیغام دیا جاسکتا ہے، عدت ختم ہونے سے قبل نکاح کرنا حرام ہے۔ اگر مرد عزم کر لے کہ انقضائے عدت کے بعد اس سے نکاح کر لے گا تو اس کا کوئی حرج نہیں۔ ان احکام کی مصلحت یہ ہے کہ اگر ان دونوں میں نکاح کرنے یا اس کا پیغام دینے کی اجازت مل جائے تو نکاح کا اصلی مقصد فوت ہو جائے گا۔ نکاح کی غرض تو یہ تھی کہ خاوند اور بیوی تمام عمر مل کر رہیں اور یہ اتحاد آخر تک رہے گا۔ اب اگر اتفاق سے خاوند پہلے مر گیا تو اظہار

- معلوم ہوا کہ خاوند کی وفات پر عورت کو ایک مدت تک خاموشی کے ساتھ گھر میں رہنا ہو گا اور انتظام خانہ داری خود ہی کرنا ہو گا۔ ایسے ہی جب رعایا کو عادل حاکم نہ مل سکے تو اس فتنہ کے زمانہ میں وہ بد عملی کی مرتکب نہ ہو بلکہ گزشتہ احکام کی پیروی کرے اور جدید حاکم کی تلاش میں رہے اور یہ پہلے صاف ہو چکا ہے کہ مسلمان عورت صرف مسلم خاوند کو تلاش کرے گی، ایسے ہی مسلمان رعایا پر بھی فرض ہو گا کہ کسی غیر مسلم کو اپنا حاکم نہ بنائے بلکہ اس کی عنان سیاست مسلمان ہی کی ہاتھ میں رہے۔

افسوس کے لئے ضرور کچھ نہ کچھ مدت ہونی چاہئے، ورنہ آئندہ رشتہ پر کوئی اطمینان نہیں ہو سکتا۔ عورت کو جب اس امر کا یقین ہو گا کہ وہ آسانی سے دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہے تو اس کی محبت اپنے خاوند کے ساتھ کبھی محکم واستوار نہ رہ سکے گی۔ ہندو قانون نے اسی اتحاد کو لیا مگر حدود سے تجاوز کر گئے۔<sup>۱</sup>

## طلاق قبل الوطی

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمْسُسُوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً ۖ وَ مَتَّعُوهُنَّ ۚ عَلَى الْمَوْسِعِ قَدَرًا وَعَلَى الْمُقْتَرِ قَدَرًا ۚ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ ﴿۴۱﴾

اگر ایسی حالت میں عورتوں کو طلاق دیدو کہ ان کو ہاتھ تک نہیں لگایا یا ان کے لئے مہر مقرر نہیں کیا تو تم پر کچھ گناہ نہیں اور ان کے ساتھ سلوک کرو، مقدور والے پر اس کے موافق اور بے مقدور پر اس کے موافق دستور کے مطابق سلوک کرنا ہے، یہ نیک لوگوں پر لازم ہے۔

نکاح کے وقت اگر مہر مقرر نہ ہو تو پھر بھی نکاح ہو جاتا ہے۔ ایسی عورت کو صحبت اور خلوت صحیحہ سے قبل ہی طلاق دے دی تو مہر کچھ بھی ادا نہ کرنا پڑے گا، البتہ اس شخص کو اپنی استطاعت کے موافق کپڑوں کا ایک جوڑا ضرور دینا ہو گا اور یہی کپڑے مہر کے قائم مقام ہو جائیں گے۔<sup>۲</sup>

وَإِنْ طَلَقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمْسُسُوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوا الذِّي يَبْدُو عَقْدَةَ النِّكَاحِ ۚ وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى ۚ وَلَا تَنْسُوا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿۴۲﴾

“اور قبل اس کے کہ تم ان کو ہاتھ لگاؤ تم نے ان کو طلاق دیدی اور ان کے لئے مہر ٹھہرا چکے تھے تو جو مقدار تم نے ٹھہرائی تھی اس کا آدھا لازم ہے مگر یہ کہ عورتیں چھوڑ بیٹھیں، یا وہ مرد چھوڑ بیٹھے جس کے ہاتھ میں عقد نکاح ہے اور یہ بات کہ تم چھوڑ دو، یہ پرہیز گاری کے زیادہ قریب ہے اور آپس میں احسان کرنا مت بھولو بیشک جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ دیکھ رہا ہے۔”

یہ دوسری صورت ہے نکاح کے وقت مہر معین ہو چکا تھا، خاوند نے بغیر صحبت اور خلوت صحیحہ کے اس کو طلاق دے

۱۔ گزشتہ قانون سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ جب رعایا کے سر پر کوئی حاکم نہ ہو اور وہ کسی کی تلاش میں پھر رہی ہو، اس وقت کسی شخص کو جائز نہیں کہ اپنے آپ کو اس ذمہ داری کے لئے پیش کر دے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: من سال القضاء وكل الى نفسه ومن جبر عليه ينزل عليه ملك فيسدره، ترمذی نے حضرت انس بن مالک سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جو شخص قضا کا خود طلبگار ہو، اللہ کی نصرت اس کے لئے بند ہو جاتی ہے۔ جس کو لوگ جبراً حاکم بنادیں ملائکہ الرحمن اس کی تائید کرتے ہیں۔

۲۔ رعایا نے اپنا حاکم منتخب کر لیا، عتات حکومت بھی اس نے اپنے ہاتھ میں لے لی، کام شروع کرنے سے قبل اسے خیال ہوا کہ میں اس بار کا مقفل نہیں ہو سکتا اس لئے اس نے استفادے دیا، اس صورت میں اگرچہ اس کے رعایا سے کوئی فائدہ نہیں حاصل کیا مگر پھر بھی تقاضائے انصاف یہی ہے کہ اپنے مشوروں اور تجربوں سے لوگوں کو فائدہ اٹھانے کا موقع دے اور جن اصلاحات کو وہ اپنے زمانہ حکومت میں نافذ کرتا ان کے لئے جدید حاکم کو مشورہ دے۔

دی، اب اس کے ذمہ نصف مہر ادا کرنا واجب ہو گا۔ کیونکہ نہیں معلوم اس بیچاری کے دل میں کس قسم کے خطرات و وساوس پیدا ہوں اور لوگ اس کی نسبت کیا کیا خیالات آفرینیاں کریں۔ اگر عورت خود ہی مہر لینا پسند نہیں کرتی، یا جس شخص کے ہاتھ میں عقد نکاح ہے وہ نہیں لینا چاہتا تو کوئی حرج کی بات نہیں۔ آخر میں خاوندوں سے کہا جاتا ہے کہ اگر وہ عفو و درگزر سے کام لیں تو یہ طہارت و تقویٰ کے زیادہ قریب ہو گا یعنی انہیں شرعی طور پر نصف مہر ادا کرنا پڑتا تھا مگر انہوں نے پوری رقم دے دی یہ احسان و مروت اور بزرگانہ طرز عمل مفید نتائج پیدا کرے گا۔

حَفِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ ۖ وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ ﴿۴۰﴾ فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا ۖ فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَأَذْكُرُوا اللَّهَ ۚ كَمَا عَلَّمَكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴿۴۱﴾

”تمام نمازوں اور خصوصاً درمیانی نماز کی حفاظت کرو اور اللہ کے آگے مودب کھڑے رہو، پھر اگر تم کو خوف ہو تو پیدل یا سوار پر بڑھ لو، پھر جب مطمئن ہو جاؤ تو اللہ کو یاد کرو جس طرح اس نے تم کو وہ تعلیم دی ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔“  
گزشتہ آیات میں نکاح و طلاق کے مسائل بیان کئے گئے، ممکن تھا بعض لوگ دنیاوی مسائل خیال کر کے ان کی پابندی نہ کرتے، اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے فوراً نماز کی محافظت کا حکم دیا اور بتا دیا کہ نکاح و طلاق اور نماز کے احکام میں فرق کرنا ٹھیک نہیں، بلکہ جس طرح تم نماز کی حفظ و صیانت کا خیال رکھو ایسے ہی ان مسائل کا بھی لحاظ کرنا اور ان کی روح و حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا۔

وَالَّذِينَ يَتَّبِعُونَ مَنكُم وَيَذَرُونَ أَذْوَاجَهُمْ ۖ وَصِيَّةً لِّأَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرِ إِخْرَاجٍ ۖ فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوفٍ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۴۲﴾ وَلِلَّهِ نِصْفُ مَا نَبَاغَتْ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿۴۳﴾ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿۴۴﴾

”اور جو لوگ تم میں مرجائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو چاہئے کہ ایک سال تک بغیر اخراج کے بیویوں سے سلوک کرنے کی وصیت کر مریں، پھر اگر وہ خود نکل جائیں تو اپنے حق میں جائز طور پر وہ جو کریں اس میں تم پر کچھ گناہ نہیں اور اللہ زبردست حکمت والا ہے۔ اور طلاق دی ہوئی عورتوں کے لئے دستور کے مطابق سلوک ہے۔ یہ پرہیز گاروں پر حق ہے، اسی طرح اللہ تمہارے لئے اپنے احکام کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم سمجھو۔“

خاوند مرنے سے قبل اپنے وارثوں کو وصیت کر دے کہ اگرچہ شریعت نے اس عورت کے لئے جس کا خاوند مر جائے چار ماہ دس روز کی عدت مقرر کی ہے، مگر تم اس بیچاری کو عدت کے گزرتے ہی گھر سے نہ نکال دینا، بلکہ ایک سال تک اس کے قیام و طعام کا بند و بست تمہارے ذمہ ہے۔ اب اگر وہ خود بخود چلی جائے، اس جگہ رہنا پسند نہ کرے یا دوسری جگہ نکاح کرے تو اس کی اجازت ہے۔

عام مفسرین کا خیال ہے کہ ایک سال تک گھر میں عورت کو رکھنے اور سامان دینے کا حکم منسوخ ہو چکا ہے اس لئے کہ:

(الف) اس آیت میں عورت کی عدت ایک سال ہے، مگر والذین یتوفون منکم ویزرون ازواجاً یتربصن بانفسھن اربعۃ اشھر وعشرا میں چار ماہ دس روز ہے، پس اس نے سال بھر کے حکم کو منسوخ کر دیا۔

(ب) اس آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ اپنی بیوی کے لئے خاوند ایک سال کے مصارف کی وصیت کرے، سورۃ نساء میں بیوی کا حصہ مقرر کیا گیا ہے: ولکم نصف ماترک ازواجکم، اس لئے وصیت کا حکم منسوخ ہے۔ مگر ہمارے نزدیک یہ آیت منسوخ نہیں، کیونکہ:

(۱) اس آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ اگر وہ ایک سال پورا نہ کریں اور چار ماہ دس روز گزرنے کے بعد نکاح کر لیں تو سال بھر تک ان کو بند رکھنا اور ان کی ضروریات زندگی ادا کرنا ضروری نہیں، پس معلوم ہوا کہ عدت اور چیز ہے اور یہ سال کچھ اور ہے۔

(۲) خورد و نوش کا جس قدر سامان دیا جائے گا اس کو وراثت سے کوئی تعلق نہیں۔ اگلی آیت اس کو واضح کرتی ہے، وللمطلقت متاع بالمعروف حقاعلی المتقین، گویا اسلام عورتوں کے ساتھ احسان و مروت کا آرزو مند ہے اور وہ سلوک یہی ہو سکتا ہے کہ مہر کے علاوہ ایک سال تک اس کے کھانے پینے اور رہنے کا انتظام کر دیا جائے۔

(۳) بخاری نے مجاہد سے روایت کی ہے: قال جعل اللہ تمام السنۃ سبعة اشھر وعشرین لیلة وصیۃ ان شاء سکننت فی وصیتھا وان شاعت خربت، انہوں نے کہا کہ چار ماہ دس روز کے علاوہ سال کا بقیہ حصہ سات ماہ بیس روز بطور وصیت کے قرار دیئے گئے ہیں، اگر چاہے تو ایام وصیت میں رہے اور اگر مرضی ہو تو چلی جائے۔

(۴) ایام جاہلیت میں دستور تھا کہ خاوند مرتے وقت وصیت کر جاتا اور ضروری ہوتا کہ اس کی عورت سال بھر کسی جگہ نکاح نہ کر سکتی۔ قرآن نے اس دستور کی اصلاح کی، چار ماہ دس روز عدت کے لئے ضروری قرار دیئے اور باقی کو عورت کی مرضی پر چھوڑ دیا۔<sup>۱</sup>

۱۔ جس طرح خاوند اپنی بیوی کے لئے ایک سال تک کے مصارف کی وصیت کر جاتا ہے ایسے ہی حاکم اگر اپنے فرائض منصبی کے علاوہ رعایا کے دوسرے امور کی بھی نگرانی کرے اور اس کے ساتھ احسان و مروت سے پیش آئے تو یہ خود حاکم کے لئے مفید ہو گا اور باہمی تعلقات زیادہ محکم و استوار ہوں گے، ورنہ راعی و رعایا کے تعلقات تاجرانہ رہ جائیں گے، رعایا کے دل میں اس کی محبت جاگیر نہ ہوگی۔

## فصل ثالث

## ضروریات جہاد

جہانگیری اور جہانداری کے احکام و ضوابط ضرورت کے مطابق بیان کئے گئے، تمام مسلمانوں میں ان کی نشر و اشاعت ہو گئی، ہر گھر میں ان کی تعلیم ہو گی اور ایک ایک بچہ ان سے واقف ہو گا۔ مشق کرتے کرتے ان کے اندر کام کرنے کی استعداد اور قابلیت پیدا ہو جائے گی، تا آنکہ ان کے سامنے دعوت عمل پیش کی جائے۔ چنانچہ جہاد فی سبیل اللہ شروع کر تے وقت جن چیزوں کی ضرورت محسوس ہو گی ان کو اس فصل میں بیان کیا جائے گا۔

## میدان جنگ اور موت

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۖ فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا ۖ ثُمَّ أَحْيَاهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴿۳۱﴾

”کیا تم نے ان لوگوں کے حال پر نظر نہیں کیا جو موت کے ڈر کے مارے ہزاروں کی تعداد میں اپنے گھروں سے نکلے، پس اللہ نے ان کو حکم دیا کہ مر جاؤ، پھر ان کو زندہ کر دیا، بیشک اللہ لوگوں کے لئے بڑے فضل والا ہے لیکن اکثر آدمی شکر نہیں کرتے۔“

بنی اسرائیل قریباً چار سو سال تک مصر میں غلامانہ زندگی بسر کرتے رہے، تا آنکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پنجہ فرعون سے ان کو نجات دلوائی۔ فرعون کی قوم ان کو ہلاک کرنا چاہتی تھی، ایک لشکر جرار ان کے تعاقب کے لئے نکلا، جس وقت یہودیوں نے اس عظیم الشان اجتماع کو دیکھا تو ان کے اوسان خطا ہو گئے اور ان کو اپنی جانوں کا خطرہ ہوا، فَلَمَّا تَرَاءَتِ الْجُنُودُ قَالَ أَصْحَابُ مُوسَىٰ إِنَّا لَمُدْرِكُونَ (الشعر آء ۶۱) جو قوم صدیوں تک غلام و محکوم رہ چکی ہو، اس کے تمام جذبات حق و حریت فنا ہو جاتے ہیں، ارادہ میں ضعف و کمزوری محسوس ہوتی ہے، جوش و دلولہ سر دپڑ جاتا ہے۔ یہی حال بنی اسرائیل کا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ محکومیت اور غلامی سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی لعنت نہیں ہو سکتی۔

یہاں سے فارغ ہو کر موسیٰ نے ان کی حمیت قومی اور عصیت میں جوش پیدا کرنے کے لئے فرمایا: يَقَوْمِ ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوا خِصِينِ (المائدہ ۲۱) ارض مقدس تمہارا آبائی وطن ہے اس وقت غیروں نے اس پر قبضہ کر رکھا ہے اپنے وطن کو آزاد کرنے کی کوشش کرو۔ مگر ان کا جوش و طغیت اس درجہ

مردہ ہو گیا تھا کہ انہیں ذرہ برابر بھی احساس نہ ہوا اور بد بختانہ یہ جواب دیا کہ وہ صاحب صولت و ہیبت ہیں، ہم میں ان سے جنگ کرنے کی طاقت نہیں، مگر جب موسیٰ کا اصرار بڑھتا گیا تو انہیں کہنا پڑا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هُنَا مُعِدُّونَ (المائدہ ۲۴)، ”تم جاؤ اور تمہارا خدا دونوں جا کر لڑو ہم یہاں بیٹھ کر تمہاری جنگ کا تماشا دیکھیں گے۔“ اس بد بختانہ جواب کی سزا ملی کہ چالیس سال تک ارض مقدس میں ان کا داخلہ بند کر دیا گیا: فَالْتَمِمْوْهُمْ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً يَتِيَهُونَ فِي الْاَرْضِ (المائدہ ۲۶) موجودہ نسل تباہ ہو گئی، دوسری نسل نے آکر اس کو فتح کیا۔

قوموں کی زندگی اور موت ہمیشہ یہی ہوا کرتی ہے کہ اگر خود حاکم و فرمانروا ہوں تو زندہ ہیں اور اگر دوسروں کے مقہور و ذلیل ہیں تو انہیں مردہ کہا جائے گا۔ بنی اسرائیل نے ارض مقدس فتح کرنے سے انکار کیا اور مردہ ہو گئے۔ ایک مدت کے بعد اللہ نے ان پر اپنا فضل کیا، دوسری نسل کے ذریعہ سے آبائی وطن نوازش کر کے زندگی بخشی۔ قوموں اور ملتوں پر اللہ تعالیٰ اسی قسم کا فضل و احسان کیا کرتا ہے، مگر وہ توجہ نہیں کرتیں۔

انسان جب کام کرنے کے لئے گھر سے باہر قدم نکالتا ہے، مخالفین و معاندین کی کثرت ہوتی ہے۔ اسے ہر وقت اپنی جان کا خطرہ رہتا ہے۔ اگر یہی خوف ترقی کر جائے تو کبھی کام کرنے کی ہمت نہ پیدا ہوگی اور دشمن سے مقابلہ نہ ہو سکے گا۔ اس لئے کام شروع کرنے سے قبل ہی فرمایا کہ انفرادی و اجتماعی حالت میں زندگی اور موت کسی انسان کے ہاتھ میں نہیں، اللہ تعالیٰ ہی انسانوں کو زندگی بخشتا اور مارتا ہے۔ تمہاری حیات و ممات اسی خدائے واحد کے قبضہ میں ہے۔ اگر اس نے تمہیں زندہ رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو کوئی انسانی طاقت تمہیں فنا نہیں کر سکتی اور یہ ضروری نہیں کہ تم میدان جنگ میں جا کر مر ہی جاؤ گے، بلکہ اس کا تعلق شہنشاہ اعظم اور مالک السبوت والارض سے ہے پس تم موت و حیات کی الجھن میں پھنس کر جہاد فی سبیل اللہ کے فرض سے نہ رک جاؤ۔

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ سَبِّحُهُ عَلَيْهِ ۝

”اور اللہ کی راہ میں لڑو اور جانے رہو کہ اللہ سنا جانتا ہے۔“

پس جب موت و حیات کسی انسان کے قبضہ میں نہیں اور جنگ میں بھی مرنا یقینی نہیں، تو اٹھ کھڑے ہو، اللہ کا قانون بلند و برتر کرنے کے لئے جہاد و قتال کرو کہ اسلام کو غلبہ و اقتدار حاصل ہو، کرۂ ارضی امن کا گہوارہ بن جائے اور چونکہ تم محض اللہ کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے جنگ کرو گے، اس لئے ضروری ہے کہ وہ تمہاری ہر دعا کو سنے، اس کو اجابت بخشنے اور تمہیں مخالفین کے مقابلہ میں کامیابی نصیب کرے۔

روپیہ بھی دو

مَنْ ذَا الَّذِي يَغْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضِعُّهُ لَهُ اَضْعَافًا كَثِيرًا ۚ وَاللَّهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُطُ ۚ وَالْيَهُ تَرْجَعُونَ ۝

کون شخص ہے جو اللہ کو قرض دے اچھا قرض تاکہ اللہ اس کے قرض کو اسکے لئے کئی گنا بڑھائے اور اللہ ہی تنگ دست

کرتا ہے اور کشائش دیتا ہے اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

محض جان قربان کرنا کافی نہیں، بلکہ روپیہ خرچ کرنے کی بھی سخت ضرورت ہے۔ سامان حرب خریدو، دوسروں کو تیاری میں مدد دو اور خلافت اسلامی کو اپنی تمام دولت نذر کرو۔ میدان جنگ میں جاتے ہی تمہیں فتح و کامرانی نصیب ہوگی۔ اس قدر مال غنیمت ملے گا کہ سمیٹ نہ سکو گے اور جس قدر تم نے اسلام کے بقا و قیام کے لئے صرف کیا تھا اس سے کئی گنا زیادہ مل جائے گا۔ صد ہا ممالک پر ہلائی جھنڈا اڑے گا اور ہزاروں کافرو مشرک دائرۃ اسلام میں داخل ہوں گے۔

تم غربت و افلاس کا خیال نہ کرو کہ قبض و بسط اور تنگدستی اور کشائش اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ تمہارے پاس لاکھوں روپیہ ہو مگر اللہ ایسے سامان پیدا کر دے کہ تمام دولت تمہارے لئے بیکار ثابت ہو اور ناداری و تنہی و سستی کی زندگی بسر کرو اور یہ بھی اسکے اختیار میں ہے کہ غربت کے ایام میں تمہیں ایسی فرحت و شادمانی نوازش کرے کہ بڑے بڑے دولتمندوں کو بھی نصیب نہ ہو۔

## انتخاب امیر

تیار ہو چکی ہے۔ ہر ایک فرزند اسلام جہاد فی سبیل اللہ کے جوش و ولولہ سے سرفروشی کے لئے تیار ہے۔ مگر جب تک اس عظیم الشان اجتماع کے لئے کوئی امیر نہ ہو اس کو حرکت نہیں دی جاسکتی۔ آئندہ آیات میں امیر کی ضرورت، اس کے خصائص و امتیازات اور وجوہ انتخاب پر گفتگو کی جاتی ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الْبَلَاءِ مِنْ يُحَىٰ إِسْرَءِيلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَىٰ ۖ إِذْ قَالُوا لِنَبِيِّهِمْ لَهُمْ الْعِثْ لَنَا مِلَكًا نُفَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ كُنِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُفَاتِلُوا ۚ قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَّا نُفَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ أَخْرَجَنَا مِنْ دِيَارِنَا وَأَبْنَاءِنَا ۖ فَلَمَّا كُنِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ﴿٣٦﴾

”کیا تم نے موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کی ایک جماعت کے حال پر نظر نہیں کی جب انہوں نے اپنے نبی سے کہا کہ ہمارے لئے ایک پادشاہ مقرر کرو تا کہ ہم اللہ کی راہ میں لڑیں، نبی نے کہا کیا عجب ہے کہ اگر تم پر جہاد فرض کیا جائے تو تم نہ لڑو۔ انہوں نے جواب دیا کہ کیا چیز اللہ کی راہ میں ہمارے لڑنے میں مانع ہے۔ ہماری حالت یہ ہے کہ ہم اپنے گھروں اور بچوں سے نکال دیئے گئے ہیں، پس جب ان پر جہاد فرض کیا گیا تو بجز چند آدمیوں کے سب پھر گئے اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔“

تعلیمی کام اور ملکی انتظام و دوجہ اگانہ فرائض ہیں، مگر کبھی کبھی اللہ تعالیٰ ان دونوں کو ایک ہی وجود میں جمع کر دیتا ہے، ورنہ عام طور پر الگ الگ ہوتے ہیں۔ سموئیل نبی صرف تعلیمی امور کے منتظم اعلیٰ تھے، ان سے بنی اسرائیل نے درخواست کی کہ جہاد فی سبیل اللہ کے لئے سپہ سالار کی ضرورت ہے جس کی امارت و سرکردگی میں ہم مخالفین سے جنگ کر سکیں۔ سموئیل کو معلوم تھا کہ یہ لوگ ابھی اس کام کے لئے تیار نہیں، اسی لئے انہوں نے دریافت کیا کہ عین وقت پر بھاگو گے تو نہیں۔ سب نے متفقہ طور پر جواب دیا کہ ملک پر غیروں کا قبضہ ہے، ہماری اولاد کو ہم سے جدا کر دیا

گیا ہے، قومیت اور وطنیت دونوں فنا ہو چکی ہیں، اب بھی ہم لڑنے کو تیار نہ ہوں گے تو پھر اور کونسا وقت ہو گا؟ مگر انجام کار وہی ہوا جس کا کھکا تھا۔

جنگ میں جانے سے قبل اس امر کی ضرورت ہے کہ فوج ہر قسم کے سامان جنگ سے مسلح ہو، فنون حرب کی مشق کر لی ہو اور لڑائی کے وقت جن دسائس اور چال بازیوں کی ضرورت ہو انکی مہارت بہم پہنچالی ہو، یہ لوگ اس کے لئے تیار نہ تھے۔ ایک عارضی اور ہنگامی جوش تھا جس نے ان کو لڑنے کے لئے ابھارا تھا۔

اس نبی کا نام سموئیل تھا جس کے لئے حسب ذیل شہادت کافی ہے: ”تو بھی لوگوں نے سموئیل کی بات سننے سے انکار کیا اور کہا، نہیں ہم تو بادشاہ چاہتے ہیں جو ہمارے اوپر مقرر ہو، تاکہ ہم بھی اور سب گروہوں کی مانند ہوویں اور ہمارا بادشاہ ہماری عدالت کرے اور ہمارے آگے آگے چلے اور ہمارے لئے لڑائی لڑے۔“ (سموئیل ۸:۹۱ و ۹۲)

اس آیت سے یہ نتیجہ نکلا کہ کام شروع کرنے سے قبل امیر کا انتخاب ضروری ہے، آگے چل کر ان شرائط کا تذکرہ آتا ہے جن خصوصیات کی بنا پر اس کا تقرر عمل میں آئے گا۔

### شرائط انتخاب

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ۚ قَالُوا أَنَّى يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِنَ الْمَالِ ۚ قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۚ وَاللَّهُ يُؤْتِي مَنْ يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿۱۲﴾

”اور ان سے ان کے پیغمبر نے کہا کہ اللہ نے تمہارے لئے طالوت کو پادشاہ مقرر کیا ہے، انہوں نے کہا، اس کو ہمارے اوپر کیونکر حکومت ہو سکتی ہے؟ حالانکہ اس کی نسبت ہم حکومت کے زیادہ حقدار ہیں اور اس کو تو مال کی وسعت بھی نہیں دی گئی۔ نبی نے جواب دیا کہ اللہ نے اس کو تم پر پسند فرمایا ہے اور علم اور جسم میں اس کو فراخی دی ہے اور اللہ اپنا ملک جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ فراخی والا واقف کار ہے۔“

ان کی درخواست پر طالوت کو پادشاہ مقرر کیا گیا۔ بنی اسرائیل کو خیال تھا کہ حکومت و فرماں روائی اور فوجوں کی امارت کے لئے وجہ انتخاب صرف دولت ہی ہو سکتی ہے، ان کو اپنی فراخی و فارغ البالی پر ناز تھا، وہ طالوت جیسے غریب و مفلس شخص کو اپنا امیر کیسے دیکھ سکتے تھے۔ اس لئے اعتراضات شروع کر دیئے۔ نبی نے کہا کہ امارت کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔

(الف) .... علم۔ ملک کا نظم و نسق قائم رکھ سکے، بہترین طریق سے حکومت کرنے کے قابل ہو اور سیاسی مسائل کی پیچیدگیاں سلجھا سکے۔

(ب) .... جسم۔ اس کی ظاہری شکل و صورت پر رعب و داب ٹپکتا ہو۔ لوگوں پر اسکی ہیبت طاری ہو، فن حرب کا ماہر



اور فنون جنگ سے اچھی طرح واقف ہو اور فوجوں کو نظم و ترتیب کے ساتھ لڑا سکے۔ یہ دونوں اوصاف طالوت میں علی وجہ الکمال موجود ہیں اور یہی باتیں ہیں جن کی بنا پر ایک شخص امیر یا پادشاہ منتخب کیا جاسکتا ہے۔ اللہ کا علم بہت وسیع ہے، اس کی نظر تمام لوگوں پر ہوتی ہے، وہ جس میں قابلیت اور استعداد دیکھتا ہے اس کو حکومت کے لئے چن لیتا ہے۔

دنیا نے ہمیشہ اپنے خاندان اور نسلی امتیازات کی پرستش کی ہے، نسل و قوم کے بت کے آگے برابر سر بسجود رہی ہے۔ اسلام نے آتے ہی ان قومی و نسلی امتیازات کو مٹا کر ہمیشہ کے لئے صرف انسانیت کی بے قید و عام عظمت کو قائم کر دیا اور عمل کے قانون الہی پر زور دیا۔ اس نے اپنی دعوت کی سب سے پہلی اور کاری ضرب اسی غرور نسل و قوم کے بت پر لگائی اور اعلان کر دیا کہ: **يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ** (الحجرات ۱۳) یعنی ہر طرح کی فضیلت اور بزرگی کی بنیاد صرف عمل ہے اور کوئی شے نہیں۔ قوموں اور خاندانوں کی تفریق صرف اس لئے ہے کہ باہد گر پہچان اور تمیز کا ذریعہ ہو۔ سب سے بڑا انسان وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔

جس وقت رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی میں سب سے آخری مہم بھیجی تو اس کی سرداری اسامہ کو دی جن کے والد زید آپ کے غلام تھے۔ بعض ظاہر بینوں پر یہ بات گراں گزری تو آپ نے فرمایا: **لقد طعنتم فی امارۃ ایبہ وقد کان لها اھلا وان اسامة لها اھل، تم لوگ پہلے زید کی سرداری پر بھی طعن کر چکے ہو، حالانکہ وہ اس کا اہل تھا اور اب اسامہ سردار بنایا گیا ہے اور وہ اس کا اہل ہے۔** اہل کے لفظ پر زور دیا یعنی طعن بیکار ہے، کیونکہ امارت و سرداری کے معاملہ کی بنیاد صرف اہلیت و قابلیت ہے اور کچھ نہیں۔

قرآن حکیم اس پادشاہ کا نام طالوت بیان کرتا ہے اور کتاب مقدس میں اس کا نام ساؤل آیا ہے، لیکن دراصل دونوں میں کوئی اختلاف نہیں، اس لئے کہ ساؤل کے متعلق حسب ذیل آیات ملاحظہ ہوں:

”تب وہ دوڑے اور اسے وہاں سے لائے اور وہ جماعت کے درمیان کھڑا ہوا تو شانوں سے لے کر اوپر تک سب لوگوں سے زیادہ لمبا تھا“ (سومیل ۱۰:۳۲) طالوت طول سے مشتق ہے اور اس سے قد کی لمبائی معلوم ہوتی ہے۔ کتاب مقدس سے یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ اسی ساؤل کے انتخاب پر نکتہ چینی کی گئی تھی۔

سو ساؤل جواب میں بولا کیا میں بینیمینی نہیں، جو اسرائیل کے سب فرقوں سے چھوٹا ہے؟ اور کیا میرا گھرانہ بینیمینی کے فرقے کے سارے گھرانوں میں سب سے زیادہ چھوٹا نہیں؟ پس کیا سبب جو تو مجھ سے یوں بولتا ہے۔ (سومیل ۱۲:۹) پر نبی بلعال بولے کہ یہ شخص ہم کو کس طرح بچائے گا؟ اور اس کی تحقیر کی اور اس کے لئے نذرانے نہ لائے پر اس نے آپ کو ایسا بنایا کہ گویا نہ سنا تھا (سومیل ۱۰:۷۲)

نزول برکات

امیر کا انتخاب ہو گیا مگر بنی اسرائیل اس پر مطمئن نہیں، ان کا خیال یہ ہے کہ صاحب دولت ہی اس جلیل القدر

منصب کا اہل ہو سکتا ہے، ضرورت ہے کہ ان کے شبہات کو دور کر دیا جائے، ورنہ آگے چل کر رکاوٹیں پیدا ہوں گی، عام رائے کا احترام ضروری ہے۔ اس لئے فرمایا:

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّنْ رَبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ الْبَنِيُّ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ إِن كُنتُمْ مُّؤْمِنِينَ ﴿۸۸﴾

“اور ان سے ان کے نبی نے کہا کہ ان کے پادشاہ ہونے کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس ایک صندوق آئے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے دلجمعی ہے اور وہ بچی ہوئی چیزیں ہیں جن کو موسیٰ اور ہارون کی اولاد چھوڑ گئی تھی، اس کو فرشتے اٹھائے ہوں گے، اگر تم ایمان رکھتے ہو تو بیشک تمہارے لئے اس میں پوری نشانی ہے۔”

اگر یہ انتخاب صحیح ہے اور اللہ بھی اس کو پسند کرتا ہے تو اس کی نشانی یہ ہوگی کہ وہ صندوق تمہارے پاس واپس آئے گا جس کو تمہارے دشمن تم سے چھین کر لے گئے ہیں۔ بنی اسرائیل کے پاس ایک صندوق تھا جس میں موسیٰ و ہارون کے تبرکات تھے۔ ان کا قاعدہ تھا کہ جنگ کے وقت ان کو اپنے ساتھ رکھتے، ان کی برکت سے ان میں جوش و ولولہ اور استقلال و ثبات قدم پیدا ہوتا اور اپنی تمام قوت جنگ میں صرف کر دیتے۔ پوری ہمت سے کام لیتے اور مظفر و منصور واپس آتے۔ ایک دفعہ بعض ناگہانی حوادث کی بنا پر اس صندوق پر دشمنوں نے قبضہ کر لیا، اس کے چھتے ہے انہیں اپنی شکست کا یقین ہو گیا۔ جہن و نامر دی نے ان کو گھیر لیا اور ہمت ہار بیٹھے۔ جس وقت دشمن تابوت کو لے گیا ہے تو اللہ کے کرشمہ ہائے قدرت کا ظہور ہوا، جہاں تابوت ہوتا وہاں پھیل جاتی اور تمام آبادی برباد ہونا شروع ہو جاتی۔ انہیں خیال ہوا کہ یہ اس صندوق کی نحوست کا نتیجہ ہے، اس لئے بیل گاڑی پر لاد کر بیلوں کو شہر سے باہر تک ہانک دیا۔ ملا سافل کے فرشتوں نے ان بیلوں کو بنی اسرائیل کی طرف متوجہ کر دیا اور گاڑی صندوق کے ساتھ شہر میں آگئی۔ اس واقعہ نے یہودیوں کے شبہات کو زائل کر دیا اور انہیں یقین ہو گیا کہ انتخاب صحیح ہے اور ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔

### فوج کا امتحان

میدان جنگ میں جانے سے پہلے فوج کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ جھوٹے اور سچے، کھوٹے اور کھرے اور کمزور اور طاقتور میں تمیز ہو جائے۔ لڑائی میں صرف بہادر اور طاقتور ہی مفید ہو سکتے ہیں، اعلان جنگ کے وقت چونکہ طبیعتوں میں جوش و ہيجان پیدا ہو جاتا ہے، اس لئے ہر شخص اپنے اندر لڑنے کا شوق پاتا ہے، مگر محض شوق مفید نہیں جب تک فنون حرب سے واقفیت نہ ہو، تکلیفوں اور مصیبتوں کے برداشت کرنے کی عادت نہ ہو اور سخت سے سخت خوف کے وقت بھی گھبراہٹ طاری نہ ہو، اس لئے امتحان لینا ضروری ٹھہرا۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ ۚ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ

فَإِنَّهُ مَتَّعَ إِلَّا مَنِ اعْتَرَفَ عُرْفُهُ بِيَدِهِ ۚ فَشَرَّ بَوًّا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ ۖ فَلَمَّا جَاوَزَهُ الَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ ۚ قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ ۚ قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلْكُوا اللَّهَ ۚ كَمِ مِّنْ فِتْنَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئْتَهُ كَثِيرُهُ يَآذِنِ اللَّهُ ۚ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿٢٥﴾

”پھر جب طالوت فوجوں سمیت روانہ ہوا تو کہا کہ اللہ تم کو ایک نہر سے آزمائے گا پس اس میں سے جو پانی پئے گا تو وہ میرا نہیں ہے اور جس نے اس کو نہ چکھا تو بیشک وہ میرا ہے مگر جو ایک چلو اپنے ہاتھ سے بھر لے۔ پس ان میں سے چند آدمیوں کے سوا سب نے پی لیا، پھر جب طالوت اور ایمان والے جو اس کے ساتھ تھے نہر کے پار ہو گئے تو کہنے لگے کہ جالوت اور اس کے لشکر سے مقابلہ کرنے کی آج ہم میں طاقت نہیں ہے۔ وہ لوگ جو یقین رکھتے تھے کہ وہ اللہ سے ملنے والے ہیں بول اٹھے کہ تھوڑی سی جماعت بڑی جماعت پر اکثر اللہ کے حکم سے غالب آجاتی ہے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

طالوت ایک عظیم الشان فوج لے کر روانہ ہوئے اور کہا کہ راستہ میں ایک نہر آتی ہے، شدت تشنگی کے وقت تمہارا اس پر سے گزر ہو گا اور اسی جگہ تمہارے استقلال نفس کا امتحان ہو جائے گا۔ قانون تو یہی ہے کہ کوئی شخص ایک گھونٹ بھی پانی نہ پئے، مگر تمہاری حالت کو پیش نظر رکھ کر صرف ایک چلو پانی کی اجازت دی جاتی ہے۔ ان لوگوں کو مصیبتوں کے برداشت کرنے کی عادت نہ تھی، معدودے چند کے سوا سب نے خوب پانی پی لیا۔ اب ان میں یہ طاقت نہ رہی کہ نہر کو عبور کر سکیں، پیٹ پھول گئے اور آخر اسی کنارہ پر انہیں ٹھہرنا پڑا۔ طالوت باقی ماندہ نوجوانوں کو لے کر پار ہوئے۔ دونوں فوجیں صف آرا ہوئیں تو انہیں اپنی قلت تعداد، فقدان اسباب اور ضعف ظاہری کا احساس ہوا اور پکارا اٹھے کہ ہم میں ان سے مقابلہ کی طاقت نہیں، مگر ان میں کچھ لوگ ایسے بھی پیکر صدق و اخلاص تھے جو صرف خدائے واحد کی ذات پر اعتماد توکل رکھتے تھے، انہیں یقین تھا کہ ہم صرف اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر جنگ کر رہے ہیں، جن لوگوں کو احتساب اعمال کا یقین ہو وہ صرف خدا ہی کی قاہرانہ قوت سے دب سکتے ہیں، ان کی قوت ارادہ اس درجہ مضبوط و مستحکم ہو جاتی ہے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی ان کے پائے استقلال میں تزلزل نہیں پیدا کر سکتی۔ ان کی نظر قلت و کثرت پر نہیں ہوتی، بلکہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ اگر اخلاص و ولولہ عمل اور ثبات قدم ہے تو چھوٹی سی جماعت عظیم الشان لشکر پر غالب آسکتی ہے اور اللہ تعالیٰ صرف ان لوگوں کو کامیابی نوازش کرتا ہے جو اپنے مقصد حیات پر فناء ہونے کو تیار ہوں۔

مشہور جرمن فوجی جنرل برن ہارڈی اس مسئلہ پر اس طرح روشنی ڈالتا ہے:

”چند تنقیدات کا لحاظ کر کے جو تعداد سے عائد ہوتی ہیں اگر موجودہ عظیم الشان فوجی نظام کا صحیح طور سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ کامیابی کے ضروری و صحیح عناصر روحانی و اخلاقی قوتیں ہیں۔ یقین رکھئے کہ بڑی بڑی فوجیں ایک مختصر، سرفروش، مگر حسن قیادت والی فوج کے مقابلہ میں ہمیشہ عاجز و ناکام رہیں گی۔“

وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالُوا رَبَّنَا آفِرْغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿٢٥﴾  
 فَهَزَمُوهُمْ بِإِذْنِ اللَّهِ ۖ وَكَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ وَابْنَهُ اللَّهُ الْبُتْلَكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَيْتُهُ مِمَّا يَشَاءُ ۖ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ  
 النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّفُتْسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿٢٦﴾

”اور جب جالوت اور اس کے لشکر سے لڑنے کو وہ میدان میں آئے تو دعا کی کہ اے ہمارے رب! ہم پر صبر ڈال اور ہمارے پاؤں جمائے رکھ اور کافر قوم پر ہماری مدد فرما۔ پس انہوں نے ان کو اللہ کے حکم سے شکست دیدی اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ نے داؤد کو سلطنت اور حکمت دیدی اور جو چاہا ان کو سکھایا اور اگر بعض کو بعض کے ذریعہ سے اللہ کا لوگوں کو دفع کرنا نہ ہوتا تو زمین ضرور تباہ ہو جاتی، لیکن اللہ دنیا والوں پر بڑے فضل والا ہے۔“

میدان کارزار گرم ہو گیا تو مسلمانوں نے استقلال صبر واستقامت کی دعا کی، اللہ نے ان کی دعا کو شرف اجابت بخشا اور داؤد نے کفار کے سپہ سالار جالوت کی گردن اڑادی۔ چنانچہ ساؤل یا طالوت کے بعد داؤد کو بنی اسرائیل کی بادشاہت نوازش کی گئی اور وہ حکومت و نبوت سے سرفراز کئے گئے۔

دنیا میں اگر لڑائی کا سلسلہ بند ہو جاتا تو تمام کرہ ارضی شروفساد کا گھر بن جاتا، مگر اللہ کو ابھی اس کا باقی رکھنا منظور ہے۔ اس لئے کفر و ارباب کفر کی باطل پرستار نہ سعی و کوشش کو فنا کرنے کے لئے سرفروشن کو کھڑا کر دیا جاتا ہے، انسانوں کے مقابلہ میں انسان ہی لاتے جاتے ہیں کہ کفار و معاندین اسلام کتے کی موت نہ مریں بلکہ دل کی بھڑاس نکال کر جہنم میں داخل ہوں: لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ ۖ وَآخَرُونَ يَأْتُونَكَ فِي الْيَوْمِ الْقِيَمَةِ ۚ لِيَكُونَ لِلَّهِ الْأَمْرُ كُلُّهُ ۚ وَيَوْمَئِذٍ يَكْفُرُ الْمُنَافِقُونَ ۚ ذَرْهُمْ ۚ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ كَانُوا كَذِبِينَ ﴿٢٧﴾

تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ تَنْزِلُهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۖ وَإِنَّكَ لَبِنُ الْمُرْسَلِينَ ﴿٢٨﴾

یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو تمہاری ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر ہم تم پر پڑھتے ہیں اور بلاشبہ تم پیغمبروں میں سے ہو۔

گزشتہ قصہ پر دوبارہ نظر ڈالئے، آپ دیکھیں گے کہ اس سے حسب ذیل مسائل کا استنباط واستخراج ہوتا ہے۔

(۱) جنگ شروع کرنے سے قبل امیر کا انتخاب ضروری ہے۔

(۲) امیر کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے:-

(الف) جہانگیری و جہانداری کے مسائل سے خوب واقف ہو۔

(ب) فنون جنگ میں اسے درخور دانی حاصل ہو۔

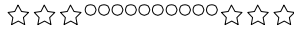
(۳) رائے عامہ کا احترام ضروری ہے، اگر اس کے خلاف کوئی بات کہی جائے تو عام لوگوں کو اطمینان دلایا جائے، ورنہ

کام میں رکاوٹ پیدا ہو جائے گی۔

(۴) امارت کے لئے دولت پر نظر نہ ہو اور صدر نشینی کے لئے مال داروں کو تلاش نہ کیا جائے۔

- (۵) جو لوگ اپنی خدمات پیش کریں ان کا امتحان لینا ضروری ہے کہ کھوٹے اور کھرے میں تمیز ہو۔  
 (۶) صرف مقصد حیات پر مرنے والوں سے کام لیا جائے۔  
 (۷) کامیابی کے لئے امیر کی نظر قلت و کثرت تعدا پر نہ ہو بلکہ جذبات حقہ اور اخلاق فاضلہ پر ہو۔  
 (۸) نتائج کو اللہ پر چھوڑ دیا جائے اور یہی توکل ہے۔

(۹) حق و صدق کی مدافعت اور کفر و باطل پرستی کے استیصال کے لئے سرفروشنوں کا ایک گروہ ہمیشہ تیار رہے۔  
 (۱۰) بنی اسرائیل نے حکومت قائم کی، اس لئے مسلمان اپنی حکومت قائم کریں۔ یہ تمام قصہ اس لئے بیان کیا گیا تھا کہ جس طرح بنی اسرائیل نے اپنی حکومت قائم کی، ایسے ہی رسول اللہ ﷺ کے حق میں پیشین گوئی کی گئی ہے کہ آپ کو بھی مخالفین و معاندین اسلام سے جنگ کرنی پڑیگی، انجام کار آپ غالب رہیں گے اور آپ کو امت مسلمہ کے بقا و قیام کے لئے سلطنت قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوگی، اس لئے آپ کی آئندہ ضروریات کو پیش نظر رکھ کر یہ قصہ اس وقت بیان کیا جاتا ہے اور اس قصہ میں ان تمام سیاسی امور کی تعلیم دی گئی ہے جو قیام حکومت میں پیش آئیں گے اور آپ آسانی سے ان کی بنا پر تنظیم مملکت کر سکیں گے۔ حضرت داؤد انبیاء مرسلین میں سے تھے، ان کو جہانگیری و جہانداری کے علوم نوازش کئے گئے۔ آپ بھی نبی مرسل ہیں، اس لئے ضرور ہے کہ ان نوازش ہائے گونا گوں سے آپ بھی سرفراز کئے جائیں۔



## باب ۷ خلافت کبریٰ

### ایک لطیف نکتہ

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۚ مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللَّهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ ۚ وَاتَّخَذْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيْتَ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمْ الْبَيِّنَاتُ وَلَكِنْ اخْتَلَفُوا فَبُيِّنَتْ مِنْهُمْ مَنْ آمَنَ وَمِنْهُمْ مَنْ كَفَرَ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلُوا ۚ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُؤِيدُ ﴿۳۳﴾

”یہ تمام پیغمبر ہیں کہ ہم نے ان میں ایک کو دوسرے پر برتری دی، بعض ان میں وہ ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا اور بعض کو درجوں میں بلند کیا اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو معجزات دیئے اور ہم نے ان کو روح القدس سے قوت دی اور اگر اللہ چاہتا تو وہ لوگ جو ان کے پیچھے آئے آپس میں نہ لڑتے بعد اس کے کہ ان کے پاس نشانیاں آچکیں، لیکن وہ مختلف ہوئے تو ان میں سے کوئی تو ایمان لے آیا اور کسی نے کفر کیا اور اگر اللہ چاہتا تو وہ باہم نہ لڑتے، لیکن اللہ جو چاہے کرتا ہے۔“

اگرچہ ما قبل میں کئی انبیاء و رسل کا تذکرہ آچکا ہے جو نبوت میں مساوی ہیں، مگر پھر بھی ان کے فرائض کے اعتبار سے ان میں فرق مراتب ضرور ہے اور یہی امور ایک دوسرے پر ان کی فضیلت و بزرگی کا اظہار کرتے ہیں۔ جس مقصد کے لئے موسیٰ کی بعثت ہوئی اس سے داؤد کا نصب العین جداگانہ تھا۔ یہی حال عشق و محبت اور شیفتگی و وارفتگی کا ہے۔ بعض صرف ایک نظر سے اپنے محبوب حقیقی کی زیارت سے شرف اندوز ہوتے ہیں، کسی کو باتوں کا موقع دیا جاتا ہے۔ بعض کے جنون کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ ان کو دیدار اور کلام دونوں سے حصہ وافر ملتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام جلیل القدر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام میں سے تھے جن کو خداوند قدوس نے شرف ہم کلامی بخشا۔

تعلیم و تربیت کو دیکھئے تو یہاں بھی وہ ایک دوسرے سے مختلف نظر آئیں گے، ان مراتب کی تقسیم یوں ہو سکتی ہے: (الف) تہذیب اخلاق (ب) تدبیر منزل (ج) سیاست مدن (ک) خلافت کبریٰ۔ تمام انبیاء و رسل کا روئے سخن اپنی اپنی قوم کی طرف تھا، اس لئے ان میں سے کوئی بھی سیاست مدن سے آگے نہ بڑھ سکا۔ و ما من قریۃ الا خلا فیہا نذیر۔ رسول اللہ ﷺ جملہ اقوام و امم اور مذاہب و ادیان کی اصلاح کے لئے مبعوث ہوئے۔ لتخرج الناس من الظلمت الى النور اور یہی وہ خصوصیت و حریت ہے جس نے آپ کو خلافت کبریٰ نوازش کی اور آپ کی امت کو شہداء علی الناس کا منصب جلیل عطا کیا۔ بنی اسرائیل کے مؤسس اول تو حضرت موسیٰ ہیں مگر ان کو انتہائی عروج، ارض مقدس کی حکومت

و فرماں روائی داؤد کے زمانہ میں نصیب ہوئی۔ دنیاوی کمالات اور ظاہری شان و شوکت کے لحاظ سے ان کو جو نمایاں اور ممتاز خصوصیت حاصل ہے، وہ کسی اور بنی اسرائیلی نبی کو نصیب نہیں۔ دوسری طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام دکھائی دیتے ہیں، جن کی وساطت سے یہودیوں کو روحانی ترقیاں، اخلاقی کمالات اور باطنی فضائل حاصل ہوئے اور اس طرح جو سلسلہ موسیٰ بن عمران سے شروع ہوا تھا، ان دونوں بزرگوں کی تعلیم و تربیت نے اس کو کمال تک پہنچا دیا اور اس اعتبار سے ان کی جس قدر مدح و ستائش کی جائے کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے پہلے داؤد کا ذکر کیا اور ان کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کا نام لیا۔ مگر ان دونوں کی عجیب کیفیت ہے۔ دونوں نبی عربی کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ آپ کی تشریف آوری کو خدا کی آمد سے تعبیر کرتے ہیں۔ جب اپنے فضائل و کمالات اور ظاہری و باطنی ترقیات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بزرگیوں سے مقابلہ کرتے ہیں تو ان کو رسول مکی کی ظاہری و باطنی رقت قدر میں اللہ کی شان نظر آتی ہے۔

اس سے معلوم ہو گیا کہ گزشتہ آیات میں دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت و برتری کا اظہار کرنا تھا کہ آپ رحمۃ اللعالمین ہیں۔ ارسل الی الناس كافة بشیدا و نذیرا ہیں۔ آپ کی تعلیم میں گزشتہ صد اقتوں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے اور آپ کی ذات اقدس میں نوح علیہ السلام کی سی سرگرمی، ابراہیم علیہ السلام جیسی نرم دلی، یوسف علیہ السلام کی سی درگزر، داؤد علیہ السلام کی سی فتوحات، یعقوب علیہ السلام کا سامبر، عیسیٰ علیہ السلام کی سی خاکساری، زکریا علیہ السلام کا ساز ہد اور اسماعیل علیہ السلام کی سی سبک روی موجود ہے۔

اے کہ بر تخت سیادت زائل جا داری

انچہ خواباں ہمہ دارند تو تنہا داری!

فطرت انسانی تو محض خیر اور نیکی پر پیدا کی گئی تھی، مگر خارجی اثرات ضلالت اور بادر صرصر کے تیز و تند جھوکوں نے اس کے آئینہ فطرت کو گرد آلود کر دیا۔ صحیح تعلیم ان لوگوں کے پاس آئی کہ اپنی فطرت اصلہ کو قائم رکھیں، مگر ان لوگوں نے اختلاف پیدا کر کے اپنے آپ کو تباہ کر دیا۔ تین نبی قریب قریب ہوئے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس لئے آئے کہ بنی اسرائیل کو فرعون کے پنجہ قہر و استبداد سے نجات دلوائیں: اَنْ اَرْسِلَ مَعَنَا یٰمُوسٰی (الشعراء ۱۷۷)۔ عیسیٰ علیہ السلام ماقبل کے مصدق اور مابعد کے لئے مبشر بنا کر بھیجے گئے۔ مُصَدِّقًا لِّمَا یَبِئْنَ یَدَیْهِ مِنَ التَّوْحٰدَةِ وَ مُبَشِّرًا بِرُسُوْلٍ یُّلٰقِیْ مِنْۢ بَعْدِیْ اٰیٰتُہٗ اٰحْمَدُ (الصافات ۶) اور آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام دنیا کے لئے آیت رحمت بنا کر بھیجا گیا۔ جن لوگوں نے انبیاء بنی اسرائیل کی تعلیم کو صحیح طور پر اخذ کر لیا وہ نبی عربی کی تعلیم کے آگے فوراً سر جھکا دیں گے اور جن پر ان کی صحبت نے کوئی اثر نہیں ڈالا وہ ضرور اس تعلیم کی مخالفت کریں گے۔ یہودیت، نصرانیت اور اسلام میں کشمکش ہو کر رہے گی اور جنگ ایک لازمہ انسانیت ہو جائے گی۔

کسری مشرقی نبوتوں کا مرکز تھا اور قیصر بنی اسرائیلی رسالت کا، دونوں کی آپس میں جنگ ہو رہی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر شہنشاہی اختیارات سے کام لے کر ان کے اختلافات کو رفع کیا اور ان کو اے توحید کے ماتحت زندگی

بسر کرنے پر مجبور کیا کہ آئندہ لڑنے نہ پائیں: تَبَرَّكَ الَّذِي ذَلَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا (الفرقان ۱) گویا آپ کا روئے سخن عالمگیر ہے اور قرآن کا مقصد یہ ہے کہ اس کی تعلیم عام ہو، اس غرض کی تکمیل خلافت کبریٰ سے ہوگی اور آپ کی امت کو یہ عزت و سربلندی نوازش کی جائے گی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِمَّنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ بِيَوْمِهِ لَا يَتِمُّ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿۱۲۵﴾

مسلمانو! اس مال سے جو ہم نے تم کو دیا ہے خرچ کر لو قبل اس کے کہ وہ دن آجائے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی اور نہ دوستی اور نہ سفارش، اور کافر ہی ظالم ہیں۔

قومی حیات وابستہ ہے حکومت و خلافت کے ساتھ، جس کے بقایا استحکام کے لئے ہر وقت روپیہ کی ضرورت ہوگی۔ اس لئے زمین میں گاڑنے اور بینکوں میں جمع کرنے کی بجائے اپنی تمام دولت خلافت کی نذر کر دو۔ جو سب سے زیادہ روپیہ دے گا اسی کی قدر ہوگی اور اگر بالفرض دنیا میں اس کا کوئی اجر نہ مل سکا تو مرنے کے بعد اس کی قدر و قیمت بہت زیادہ ہو جائے گی اور یہی روپیہ تمہیں عذاب الیم سے نجات دلائیگا۔ جو لوگ خلافت کی مدد نہیں کرتے وہ نادانی و جہالت میں مبتلا ہیں اور اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں۔ اگر مسلمانوں کی حکومت نہ ہوگی تو ان کو زندگی کا کیا لطف آئے گا۔

خلیفہ اسلام کے فرائض

مختلف اقوام و ملل میں جنگ ہو کر رہے گی، ارباب ایمان و اخلاص اپنی ہر چیز قربان کر دیں گے کہ دجاہلہ کفر و شیطنت کو مٹادیں، مگر شیاطین و طواغیت بھی اپنی باطل پرستانہ سعی و کوشش سے باز نہ آئیں گے۔ اس خلافت کا فرض ہوگا کہ اپنی قاہرہ قوت اور عالمگیر اقتدار سے کام لے کر ان کوششوں کو دبا دے۔ حکومت کے صدامشاغل ہوں گے، ہزار ہا صیغے اور محکمے قائم ہو جائیں گے۔ ماتحت حکام ملک کے نظم و نسق کا خیال رکھیں گے۔ خلیفۃ اللہ فی الارض ان کا نگران کا رو محافظ ہوگا اور جہاں یہ کسی بد عملی کے مرتکب ہوں گے فوراً ان کو تنبیہ کر دے گا۔ اس لئے اگلی آیات میں خلیفہ کے فرائض بیان کئے جاتے ہیں۔

اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ ۚ لَا تَأْخُذُهُ سِنَّةٌ وَلَا نَوْمٌ ۚ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ ۚ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ ۚ وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ ﴿۱۲۶﴾

”اللہ کی وہ ذات ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زندہ ہے سب کا تھانے والا، اس کو اونگھ اور نیند نہیں آتی، جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اسی کا ہے کون ہے، جو اس کی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرے۔ جو کچھ خلق کے روبرو ہے اور جو ان کے پیچھے ہے وہ جانتا ہے اس کی معلومات میں سے وہ کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر



جتنا وہ چاہے، اس کی کرسی آسمانوں اور زمین کو گھیر ہوئے ہے اور ان کی حفاظت اس کو گراں نہیں گزرتی اور وہ عالیشان عظمت والا ہے۔

انسان بالطبع آزاد پیدا کیا گیا ہے۔ صرف خدائے قدوس ہی کی ذات ہے جس کی غلامی کرنا انسان کے لئے باعث صد ہزار فخر و امتیاز ہے۔ وہی ایک قوت قدسی ہے جو تمام زمین و آسمان میں مصروف عمل ہے۔ اصل میں بمنزلہ حقیقیہ الحقائق صرف اللہ کا ذکر ہوتا ہے، مگر جب بد بختان نوع انسانی اس کے ساتھ دوسروں کو بھی شریک کرنے لگیں تو ذکر الہی تو حید سے بدل جاتا ہے یعنی اللہ کا اثبات اور غیر اللہ کی نفی، گویا تو حید کے سوا کوئی چیز مطلوب نہیں۔

دنیا میں جس قدر چیزیں ہیں، مادہ اور صورت سے ترکیب دی گئی ہیں۔ جس صفت الہی کے عکس سے صورتیں بنتی ہیں اس کو حی سے تعبیر کرتے ہیں اور جس پر مادوں کی انتہا ہوتی ہے اس کا نام قیوم ہے۔ حی جو خود زندہ ہے اور دوسروں کو زندگی بخشتا ہے وَيَبْقَىٰ وَجْهَ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ (الرحمن ۲۷) اور قیوم جو خود قائم ہے، اور دوسروں کے قیام کا موجب ہے۔ نظم و نسق قائم کرنے والا إِنَّ اللَّهَ يُنَسِّكُ السَّحَابَ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُولَا وَلَئِنْ زَالَتَا إِنْ أَمْسَكَهُمَا مِنْ أَحَدٍ مِّنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ (فاطر ۴۱) گویا یہ دونوں نام اللہ لا الہ الا هو کی شرح و تفسیر ہیں۔ غزوہ بدر میں رسول اللہ ﷺ نہایت ہی الحاح و تضرع کے ساتھ یاجی یا قیوم بار بار پڑھتے تھے کہ کفار و مشرکین کے مقابلہ میں اسلام زندہ و قائم رہے۔

وہ اگرچہ ہر چیز کو زندگی بخشتا ہے اور زمین و آسمان کا قیام اسی کی ذات کے ساتھ وابستہ ہے، مگر باوجود اس کے یہ کبھی نہیں ہوتا کہ قوتوں کے اضمحلال اور ضعف و ناتوانی کی وجہ سے اس پر اونگھ طاری ہو، بلکہ وہ برابر مصروف عمل رہتا ہے۔ کمزوری اور نقاہت کا نام و نشان نہیں، اس پر تعطل و بیکاری کا زمانہ نہیں آتا اور نہ کام کرتے کرتے اس کو آرام کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، بلکہ نیند سے پاک ہے۔

اللہ کے سوا جو کچھ ہے، زمین و آسمان میں جس قدر چیزیں ہیں، سب پر اسی کا قبضہ ہے۔ اور وہی ہر انسان کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ اگر تم نے ایسے باجروت پادشاہ کی مخالفت کی تو یاد رہے اس کے دربار میں کسی کو شفاعت کرنے کی جرات نہ ہوگی، مگر ہاں جس کو وہ خود نجات دینے کا آرزو مند ہو اور اس کے لئے کسی کو شفاعت کرنے کی اجازت دے دے۔ حقیقت یہ ہے کہ شفاعت کی ضرورت وہاں محسوس ہوتی ہے، جس جگہ واقعات کا حاکم کو پورا علم نہ ہو اور اللہ کو تو ایک ایک ذرہ کی خبر ہے، اس کے علم کا کون احاطہ کر سکتا ہے۔ ہاں وہ خود ہی اپنے علم کے بحر ناپیدا کنار میں سے کسی کو ایک قطرہ نوازش کر دیتا ہے، مگر یہ کبھی نہیں ہوا کہ ایک ہی انسان کو اتنا علم دے دے جتنا اس کو ہے۔

اس کی حکومت و پادشاہت تمام آسمان و زمین کو گھیرے ہوئے ہے، کوئی نہیں جو اس کے دائرہ حکومت سے نکلنے کی کوشش کرے اور وہ خارج بھی ہو جائے۔ يَبْعَثُ الْجَنِّ وَالْإِنْسَ إِنَّ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ تَنْفُذُوا مِنْ أَقْطَارِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ فَانْفُذُوا لَا تَنْفُذُونَ إِلَّا بِسُلْطَانٍ (الرحمن ۳۳) بلکہ جس جگہ جائے گا اسی کی حکومت ہوگی۔ فلینا تو لو افشم وجہ اللہ، زمین و آسمان اور ان دونوں کے درمیان جو کچھ ہے، وہ ان کی حفاظت سے نہیں جھکتا۔ اس کی ذات اقدس

بہت بزرگ و برتر ہے اور انسانی فہم و ادراک سے وراء الودی ثم وراء الودی ثم وراء الوری ہے۔ تمام چیزیں اس کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔

ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنا تعلق، اللہ کے ساتھ اسی قسم کا رکھے جو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے اور اس میں کمی نہ آنے دے۔ کیونکہ تمام خرابیوں اور بربادیوں کا سرچشمہ توحید کا چھوڑ دینا ہے۔ تمام مذاہب و ادیان کو اس توحید کے ماننے سے انکار نہیں ہو سکتا اور یہی غلیفہ کا اولین فرض ہے کہ اس آیت کو اپنی خلافت کے اطراف و جوانب میں شائع کر دے اور جملہ اقوام و ملل کو اس کی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کرے۔

جبر و اکراہ کی ضرورت نہیں

لَا اِكْرَاهِي الدِّينَ ۚ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ  
الْوُثْقٰى ۚ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللّٰهُ سَبِيحٌ عَلَيْهِمُ ۝۱۶۱

“دین کے بارے میں کچھ زبردستی نہیں، بے شک گمراہی سے ہدایت ظاہر ہو چکی، توجو طاغوت کا کفر کرے اور اللہ پر ایمان لائے تو اس نے بے شک مضبوط حلقہ پکڑ لیا جو ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ سستا جانتا ہے۔”

دنیا کا دستور ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ جن قوموں کے پاس صداقت اور سچائی کی کوئی چیز بھی نہیں ہوئی انہوں نے دوسروں کو اپنے قبضہ میں لانے، اپنے اصول منوانے اور اپنا مطیع و فرماں بردار بنانے کے لئے نیزوں کے پھلوں، تلوار کی دھار اور ہتھیاروں کی جھکار سے فائدہ اٹھایا ہے اور قوت کے زور سے اپنے خیالات و افکار کی نشر و اشاعت کی ہے۔ مگر اسلام ہی وہ سب سے پہلی آواز حق و صدق ہے جس کو تبلیغ و دعوت کے لئے کسی طاقت کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اس نے گمراہی و ضلالت اور ہدایت کو ایک دوسرے سے نمایاں کر دیا۔ سعادت و شقاوت انسانی کی راہیں واضح کر دیں۔ روشنی اور اندھیری صاف نظر آنے لگ گئی، نور و ظلمت میں فرق و امتیاز ہو گیا اور اس لئے انسان الہی نے ہمیشہ کے لئے اعلان کر دیا کہ لا اکراہ فی الدین خلیفہ کا کام یہ ہے کہ ہدایت و ضلالت، نور و ظلمت، اور اسلام و کفر میں ایسا فرق و امتیاز کر دے کہ ہر شخص سمجھ جائے اور لوگوں کی ترغیب و تحریص کے سامان فراہم کر دے اور جو لوگ اسلام قبول کرنے کو تیار ہوں، ان کی راہ سے رکاوٹوں کو دور کر دے۔ پس جس نے طغیان و سرکشی کی ہر چیز سے نفرت کا اظہار کیا خواہ وہ اصنام و طواغیت ہوں یا انسان اور جن ہوں سب سے بغاوت کا اعلان کیا اور زمین و آسمان کے پادشاہ کے آستانہ جلال و کبریائی پر اپنا سر نیاز جھکا دیا اور اس کا ہر حکم ماننے کو تیار ہو گیا تو بیشک اس نے ایسے محکم و مضبوط کڑے میں ہاتھ ڈالا جو کبھی بھی ٹوٹ نہیں سکتا، بلکہ برابر ترقی کرتا رہے گا۔ اللہ کو معلوم ہے کہ تم نے طاغوت سے علیحدگی اختیار کی، اس لئے تمہاری ترقی کے لئے عظیم الشان میدان کھول دے گا۔

اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَوَّلِيَّتُهُمُ الطَّاغُوتُ يُخْرِجُهُم مِّنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ ۗ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢٥﴾

”اللہ ان کا حامی ہے جو ایمان لائے، ان کو اندھیروں سے اجالے کی جانب نکالتا ہے اور جو لوگ کافر ہیں ان کے رفیق شیطان ہیں، جو ان کو اجالے سے اندھیروں کی جانب نکالتے ہیں، یہی لوگ دوزخی ہیں اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔“  
جو لوگ صرف خدائے واحد کی غلامی کریں گے ان کی راہ میں رکاوٹیں پیدا ہوں گی، شیاطین اپنا اثر ڈالنے کی کوشش کریں گے، ظلمت چاروں طرف سے گھیر لے گی، قوانین الہی میں شبہات رونما ہوں گے، لیکن اللہ نور السموات والارض کی ایک ہی جلوہ نمائی ان تمام طواغیت کو فنا کر دے گی، شکوک رفع ہو جائیں گے، ہدایت ورہ نمائی حاصل ہوگی۔ تمام رکاوٹیں حرف غلط کی طرح مٹ جائیں گی، جب کبھی کوئی قوت حق کو دبانے کی کوشش کرے گی اس کو فوراً ابر باد کر دیا جائے گا اور مسلم قانت اپنے آگے نور ہی نور دیکھے گا۔ دوسری جگہ فرمایا۔ قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ ﴿١٦٠﴾ يَهْدِي بِيهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ نِصْرَتَهُ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ وَيَهْدِيهِمْ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (المائدہ ۱۵، ۱۶) لیکن انکار کرنے والے ظلمت و تاریکی میں مبتلا ہو جائیں گے، ان کو حق و صدق میں اس قدر شبہات پیدا ہوں گے کہ اس کو باطل سمجھنے لگ جائیں گے۔

وجود باری تعالیٰ

انسان کبھی فسق و فجور سے باز نہیں رہ سکتا جب تک اس کو دو باتوں کا یقین نہ ہو۔

(الف) اللہ موجود ہے اور وہ ہمارے ہر عمل حیات کا نگران کار و محافظ ہے۔

(ب) جو کچھ ہم کرتے ہیں ان کے متعلق ایک روز سوال کیا جائے گا اور احتساب اعمال سے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ ان دو باتوں کو تسلیم کرنے کے بعد خود بخود اس امر کی ضرورت محسوس ہوگی کہ ان اعمال و اخلاق کا پتہ لگا یا جائے جو نجات کا باعث ہیں اور ان سے پرہیز کیا جائے جو تباہی لانے والے ہوں۔ اس لئے اب اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ رہے گا کہ،

(ج) نبی کی جانب توجہ کی جائے جو ان تمام باتوں پر روشنی ڈال سکے۔ اگلے رکوع میں چند واقعات بیان کئے گئے ہیں، مگر ان میں وجود باری تعالیٰ اور اثبات قیامت پر بحث کی گئی ہے۔ ان کو تسلیم کرنے کے بعد تیسرا مقدمہ نبوت خود بخود ثابت ہو جائے گا۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ حَاجَّكَ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ ۖ إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُعْبَدُ وَيُؤْتِي ۖ قَالَ أَنَا أُحِىُّ وَأُمِيتُ ۖ قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالسَّيِّئِينَ مِنَ الْبَشَرِ قَاتٍ بِهَا مِنَ النَّارِ ۖ فَهَبْهُمُ اللَّهُ الَّذِي كَفَرُوا ۖ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿٢٦﴾

”کیا تو نے اس کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے ان کے رب کے بارے میں بحث کی، اس وجہ سے کہ اللہ نے اس کو سلطنت دیدی تھی، جب ابراہیم نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے، وہ بولا کہ میں بھی جلاتا اور مارتا ہوں، ابراہیم نے کہا کہ اللہ تو سورج کو پورب سے لاتا ہے پس تو اس کو سمجھ سے لا، پس وہ کافر متحیر رہ گیا اور اللہ ناانصاف لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔“

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ نبوت میں نمرود کو اپنی ظاہری شان و شوکت اور جاہ و جلال کی وجہ سے دھوکا ہو گیا تھا کہ وہ خدا ہے، اسی لئے لوگوں سے سجدہ کراتا تھا، ابراہیم نے اس کو اللہ کی طرف توجہ دلائی تو وہ حیران ہو کر پوچھنے لگا کہ میرے سوا کوئی اور بھی خالق ارض و سما ہو سکتا ہے اور اس کی کیا خصوصیات ہوں گی؟ انہوں نے جواب دیا کہ دنیا میں کروڑوں جان دار ہیں جن کی زندگی اور موت کا رشتہ ایک بالاتر قوت کے ہاتھ میں ہے، مگر وہ اس حقیقت کو سمجھ نہ سکا اور کہنے لگا کہ یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں جس کو چاہوں قتل کر دوں یا معافی دے دوں، حالانکہ اگر وہ ذرا غور کرتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ زندہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ بے جان چیزوں میں جان ڈالنا اور مارنے سے مراد یہ ہے کہ اپنے اختیار و قدرت سے جان نکالنا۔

ابراہیم نے قرآن سے معلوم کر لیا کہ زندگی اور موت کی حقیقت سے وہ نا آشنا محض ہے، اس لئے ایسے بلید الذہن کو سمجھانے کے لئے دوسرے جواب کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ میرا رب وہ ہے جو آفتاب کو روز کے روز مشرق سے نکالتا ہے تو ایک ہی دن مغرب سے نکال کر دکھا۔ یہ سنتے ہی اس کی عقل ماری گئی اور بھونچکا سا رہ گیا۔ اب اس صریح شکست کا تقاضا تو یہ تھا کہ فوراً ہدایت قبول کر لیتا، مگر اس کو طاغوت کی ہم نشینی حاصل تھی، اس لئے اپنی ضد پر قائم رہا۔ ہدایت کے تمام اسباب فراہم ہوں پھر بھی ایک شخص ان سے کام نہ لے تو پھر ایسے شخص کی راہ نمائی کے لئے اور کوئی جدید سامان نہیں پیدا کیا جاتا۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ نمرود یہ جواب دے سکتا تھا کہ مشرق سے تو میں سورج نکالتا ہوں، تم مغرب سے نکال کر دکھاؤ۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم کی بات نے اس کو اس درجہ مبہوت کر دیا تھا کہ اس کے ہوش و حواس ہی بجانہ رہے تھے۔ مناظرہ کا بہترین طریق یہ ہے کہ مخالف کو تھوڑی دیر کے لئے حیران کر دیا جائے۔

گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اللہ ولی الذین امنوا یخضع من الظلمت الی النور والذین کفروا اولیہم الطاغوت فیخضعونہم من النور الی الظلمت، اس قصہ نے بتا دیا کہ ابراہیم کی راہ میں ایک طاغوت حائل ہوا، مگر اللہ نے ان کی فوراً راہ نمائی کی ایک نئی حجت سکھادی اور اس طرح کائنات غلت کو ظلمت سے نور کی طرف لے آیا۔ مگر نمرود طاغوت کی غلامی کرتا تھا اس لئے اور زیادہ کفر میں پختہ کار ہو گیا۔

## اثبات قیامت

أَوَكَلَّيْنِي مَرَّةً عَلَى قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا ۚ قَالَ أَنَّى يُغِي هَٰذَا اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ ۖ قَالَ كَمْ لَبِثْتُ ۖ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۖ قَالَ بَلْ لَبِثْتُ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ إِلَى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۖ وَانْظُرْ إِلَى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَ آيَةً لِّلنَّاسِ ۖ وَانْظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنشِئُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ ۚ قَالَ أَعْلَمْتُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٥﴾

”کیا تو نے اس کو نہیں دیکھا جو ایک قصبہ پر گزرا اور وہ اپنی چھتوں پر گر پڑا تھا، کہنے لگا کہ اس کو اللہ اس کے مرے پیچھے کس طرح زندہ کرے گا، تو اس کو اللہ نے سو برس مردہ رکھا پھر اس کو جلایا فرمایا تو کتنی دیر رہا؟ اس نے جواب دیا کہ ایک دن یا ایک دن سے کم ہو گا۔ فرمایا بلکہ تو سو برس رہا پس اپنے کھانے اور پینے کو دیکھ کہ سڑا تک نہیں اور اپنے گدھے کو دیکھ اور تاکہ ہم تجھ کو لوگوں کے لئے نمونہ بنائیں اور ہڈیوں کی جانب دیکھ کہ ہم کیونکر ان کا ڈھانچہ بناتے ہیں پھر ان کو گوشت پہنانے دیتے ہیں، پس جب اس کو کھل گیا تو بولا کہ میں خوب جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

بخت نصر، والی بابل نے ۶۱۳ قبل مسیح بیت المقدس پر حملہ کیا اور ۵۹۹ میں اس کو بالکل ویران کر دیا۔ اکثر یہودی تلواریں گھاٹ اتار دیئے گئے اور جو بچے ان کو جلاوطن کیا گیا۔ ۵۳۶ میں اہل بابل بھی فنا ہو گئے۔ اس پر فورس، شاہ ایران نے یہودیوں کو واپس آنے اور یروشلم آباد کرنے کی اجازت دی۔ آخر کامل ایک صدی کے بعد بیت المقدس پھر آباد ہوا۔ اس تباہی کے زمانہ میں حضرت حزقیل کا اس بستی پر گزر ہوا، وہ اس المناک منظر کو دیکھ کر براہ حیرت و استعجاب کہنے لگے کہ نہیں معلوم اللہ تعالیٰ اس بستی کے مردوں کو کس طرح زندہ کرے گا؟ اس سوال کے جواب میں خود ان پر موت طاری کی گئی۔

برابر ایک سو سال تک اسی حالت میں پڑے رہے۔ دوبارہ زندہ ہونے پر ان سے دریافت کیا گیا کہ کتنی دیر تک اس حالت میں رہے؟ ان کے لئے سو سال کی مدت برابر تھی، انہیں خیال ہوا کہ ایک دن یا اس کا کچھ حصہ۔ جس وقت اصحاب کہف سالہا سال کے بعد بیدار ہوئے اور ان سے پوچھا گیا کہ اس حالت میں کب تک رہے تو انہوں نے بھی یہی جواب دیا تھا:

قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ قَالُوا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ (الکہف ۱۹) قیامت کے روز جب کفار سے پوچھا جائے گا کہ دنیا میں ان کے رہنے کی مدت کتنی تھی تو وہ بھی یہی جواب دیں گے قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ قَالُوا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ (المؤمنون ۱۱۳، ۱۱۴) پس ان آیات کے ہوتے ہوئے جو لوگ حضرت حزقیل کے واقعہ کو محض خواب اور رویہ پر محمول کرتے ہیں وہ یقیناً غلطی پر ہیں اور صحیح وہی ہے جس کو ہم نے اختیار کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا کہ تم برابر ایک سو سال تک اس حالت میں رہے۔ اب ہمارے کرشمہائے قدرت ملاحظہ کرو۔ تمہارے کھانے پینے کی چیزوں میں بویک نہیں پیدا ہوئی۔ گدھے کو دیکھو گل سڑ گیا ہے، مگر اسے دوبارہ زندہ کئے دیتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت حزقیل کو دو باتیں دکھانا چاہتا تھا۔

(الف) بعض چیزیں ایسی ہیں کہ لاکھوں کروڑوں برس گزرنے پر بھی وہ اپنی حالت پر قائم رہتی ہیں۔ ان کے خواص

واثرات میں کوئی فرق نہیں آتا۔ کیا اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر نہیں کہ اگرچہ انسان پر ہزار ہا برس تک فناطاری رہے مگر پھر بھی اس کے بعض اجزا کو محفوظ رکھے اور وقت پر ان میں زندگی پیدا کر دے۔

(ب) اگر ایک چیز گل سڑ کر فنا ہو جائے اور اس کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے، اللہ تعالیٰ اس کو دوبارہ زندہ کر سکتا ہے۔ اس آیت میں ان دونوں باتوں کو واضح کر دیا گیا، لیکن اس قسم کے واقعات عام لوگوں کے سامنے روزمرہ نہیں ہوا کریں گے۔ یہی ایک نظیر باقی انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے کافی ہوگی۔ جس وقت انہوں نے یہ کیفیت ملاحظہ کی تو بے اختیار ہو کر کہنے لگے کہ میں دل سے یقین کرتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ احیائے یوم البعث میں چند چیزوں کو یاد رکھنا ضروری ہے:

(۱) خود زندہ کرنا: حضرت حزقیل اور ان کے گدھے کو اللہ تعالیٰ نے زندہ کر کے دکھا دیا۔

(۲) زمانہائے دراز کے بعد زندگی بخش: اس کے لئے ان کو سو برس تک عالم ممات میں رکھا۔

(۳) خاص کیفیت سے زندہ کرنا: گدھے کو زندہ کر دیا۔

(۴) اتنی مدت تک روح کا باقی رکھنا: طعام و شراب کا باقی رہنا اور ان کے بدن کا موجود ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان کی روح باقی ہے۔ کیوں کہ بدن، طعام، شراب، مختلف اجزاء و عناصر سے مرکب ہیں، ان میں آسانی سے تغیر اور فساد آسکتا ہے، حالانکہ روح میں یہ بات نہیں۔

(۵) دوبارہ زندہ ہونے کے بعد برزخ کی مدت معلوم نہ ہونا: چنانچہ حزقیل نے جواب دیا کہ میں ایک دن یا اس کا کچھ حصہ رہا ہوں، لیکن حقیقت میں وہ ایک سو سال تک رہے تھے اور یہی جواب قیامت کے روز کفار دینگے، لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ (المؤمنون ۱۱۳)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قوموں اور ملتوں کو زندہ کرتا ہے، اگرچہ ان پر گنہگار اور غلامی کی صدیاں گزر جائیں مگر پھر بھی ان کو فضیلت و برتری مل سکتی ہے بنی اسرائیل ایک صدی تک بر باد رہے، آخر اللہ نے ان کی ساری اور انہیں دوبارہ حکومت نوازش کی، لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ (الزمر ۵۳)

ایک اور مثال

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ ۖ قَالَ أَوْلَمْ تُؤْمِنْ ۖ قَالَ بَلَىٰ وَلَٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي ۖ قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ أَجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا ۖ وَاعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٥٨﴾

“اور جب ابراہیم نے کہا کہ اے میرے رب! مجھ کو دکھا تو کیسے مردوں کو زندہ کرے گا، فرمایا کہ کیا تم کو یقین نہیں، عرض کیا کیوں نہیں۔ لیکن یہ کہ میرے دل کو تسکین ہو جائے، فرمایا اچھا چار پرند لو، پس ان کو اپنے ساتھ بلاؤ، پھر ہر

پہاڑی پر ان کا ایک ٹکڑا رکھ دو، پھر ان کو آواز دو، وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے چلے آئیں گے اور جانو کہ اللہ زبردست حکمت والا ہے۔

چونکہ لوگوں کو احیائے اموات میں سب سے زیادہ شبہات ہوتے ہیں، اس لئے ایک اور مثال بیان کی جاتی ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے قیامت کے روز مردوں کے زندہ کرنے کی کیفیت کا سوال کیا، ممکن تھا بعض لوگوں کو ان کے اس سوال سے یہ شبہ ہوتا کہ باوجود پیغمبر ہونے کے ان کو حشر اجساد پر یقین نہ تھا، اس لئے فوراً بعد ان کا جواب نقل کر کے بتادیا کہ ان کو یقین تو حاصل تھا مگر وہ صرف اتنا چاہتے تھے کہ زندہ کرنے کی مختلف صورتیں ہیں، ان میں سے ایک کیفیت کا مشاہدہ کر لیں۔

اصل بات یہ ہے کہ ہر انسان کی طبیعت میں یہ جذبہ موجود ہے کہ وہ ہر امر کے متعلق کیوں اور کس طرح کا سوال کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس سوال کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں:

(الف) استفسار کے طور پر کہ اطمینان قلب مقصود ہے، چنانچہ ابراہیم کا سوال اسی قسم کا تھا۔ وہ احیائے موتی کی کیفیت دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ امام بخاری نے اس آیت سے ایمان کی کمی اور زیادتی پر استدلال کیا ہے۔

(ب) جس امر کی نسبت سوال کیا جاتا ہے اس کے متعلق کسی کو شکوک و شبہات ہیں، کفار کہتے تھے مَنْ يُحْيِي الْعِظَامَ وَ هِيَ رَمِيمٌ (یس ۷۸) ہڈیوں کو بوسیدہ ہونے پر کون زندہ کرے گا۔

پہلی صورت ایمان میں داخل ہے اور دوسری کا تعلق ضلالت و گمراہی سے ہے۔

ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ چار پرندے لے کر ان کو پالو یہاں تک کہ خوب مانوس ہو جائیں، پھر سب کو ذبح کر کے ان کے اجزائے مختلفہ کو ملا لو اور ہر پہاڑ پر ایک ایک حصہ رکھ دو، اب انہیں آواز دو تو وہ دوڑتے ہوئے تمہارے پاس آجائیں گے۔ لوہاجب مقناطیس کے سامنے آئے گا تو ضرور ہے کہ اس کی طرف کھچے۔ حضرت ابراہیم کی آواز میں اس درجہ قوت مقناطیسی پیدا کر دی گئی تھی کہ جس جانور کا نام لیتے فوراً دوڑتا ہوا ان کے پاس چلا آتا، تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ اللہ غالب ہے اور یہ کام کر سکتا ہے۔ تمام مخلوقات کو اپنے خالق کے ساتھ ایسا فطری ربط و تعلق ہے کہ اس کے ٹوٹنے کی کوئی دوسری صورت نہیں، اگرچہ ان پر ہزاروں سال فطارت ہی رہے، مگر جس وقت خدائے قدوس ایک لفظ کن ارشاد فرمائے گا سب کے سب بھاگتے ہوئے اس کے پاس آجائیں گے۔

اب تک تین واقعات بیان کئے گئے ہیں، ان سے معلوم ہو گیا کہ حق و صدق اور توحید کی نشر و اشاعت میں ظلمتیں پیدا ہوں گی، ان کے رفع و انسداد کے لئے اللہ تعالیٰ ایسے آدمی پیدا کر دے گا جو ان ظلمتوں اور تاریکیوں کے پردوں کو چاک چاک کر کے دنیا کے سامنے اسلام کی اصلی صورت پیش کر دیں گے۔ خلیفہ کا فرض ہو گا کہ ایسے ارباب صلاح و تقویٰ کو ڈھونڈ نکالے، ان کو دعوت و ارشاد کے کام پر لگائے۔ جو لوگ ان سے تعلیم حاصل کرنے کے لئے آئیں، ان کے لئے



آسانیاں پیدا کرے اور جب اس قسم کے واقعات پیش آئیں تو ان کا تمام اطراف مملکت میں اعلان کرے۔ ان آیات نے خلیفہ کے دو فرض معین کر دیئے:

(الف) توحید کی نشر و اشاعت اور اس کی حفظ و صیانت۔

(ب) امت مسلمہ کے بہترین دل و دماغ سے کام لینا۔

انفاق فی سبیل اللہ کی شرطیں

خلیفہ اور اس کے اعوان و انصار کے فرائض بیان کئے گئے، یہی لوگ حقیقی معنی میں خلافت کے دست و بازو ہوں گے، جن کے صدق و اخلاص اور حسن نیت پر ملک و ملت کی بہتری موقوف ہوگی۔ اگر ارباب دولت و ثروت بھی اس آسانی پادشاہت میں شریک ہونے کے آرزو مند ہوں، جس کا داخلہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کے لئے ممنوع قرار دیا تھا تو وہ اپنا مال خلافت کی نذر کریں، مگر یہ روپیہ چند شرطوں کے ماتحت قبول کیا جاسکتا ہے، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَتَتْ نَارًا حَرَّةً سَبُعَ سَنَابِلٍ فِي كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِائَةُ حَبَّةٍ ۗ وَاللَّهُ يُضَعِفُ لِمَنْ يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿۹۱﴾

”جو لوگ اپنے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کی مثال اس دانہ کی سی ہے جس سے سات بالیں اگیں کہ ہر بال میں سودانے ہوں اور جس کے لئے چاہتا ہے اللہ بڑھاتا ہے اور اللہ گنجائش والا وقف کار ہے۔“

خلیفہ اسلام کو سلطنت کے بقا و استحکام، قوم کی تعلیم و تربیت، لشکروں کی تیاری، سامان حرب کی خریداری اور جہاد فی سبیل اللہ کے لئے روپیہ کی ضرورت ہوگی۔ جو شخص ایسی ضرورت کے موقع پر مال صرف کرے گا اس کے خرچ کی مثال اس بچ کی سی ہے جو ایک دانہ سے سات سو بن جاتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اس قسم کے صدقات کی خیر و برکت بیان کرتے ہیں: اور جو اچھی زمین میں بویا گیا یہ وہ ہے جو کلام کو سنتا اور سمجھتا ہے اور پھل بھی لاتا ہے کوئی سو گنا پھلتا ہے کوئی ساٹھ گنا کوئی تیس گنا۔ (متی ۳۱:۳۲) مرقس میں ہے: اور کچھ اچھی زمین پر گر اور وہ اگا اور بڑھ کر پھلا اور کوئی تیس گنا کوئی ساٹھ گنا کوئی سو گنا پھل لایا۔ (مرقس ۴:۸) مگر قرآن حکیم بتاتا ہے کہ ایک مسلم قانت جب جہاد فی سبیل اللہ کے لئے دیتا ہے تو وہ سات سو گنا بڑھتا ہے اور اس سے زیادہ کی حد نہیں۔ صحابہ کرام نے اس وعدہ کو دیکھ لیا کہ سینکڑوں خرچ کر کے کروڑوں کے مالک بن گئے۔ جس مال کے یہ ثمرات و نتائج ہوں اس کی شرطیں ملاحظہ ہوں:

مَنْ وَادَىٰ نَهْهُ

الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُونَ مَا أَنْفَقُوا مَنًّا وَلَا أَذًى ۖ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۹۲﴾ قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ ۖ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يُتْبَعُهَا أَذًى ۗ وَاللَّهُ غَفِيٌّ حَلِيمٌ ﴿۹۳﴾



”جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں پھر خرچ کئے پیچھے احسان نہیں جتاتے اور نہ ستاتے ہیں ان کے لئے ان کا ثواب ان کے رب کے پاس ہے اور نہ ان پر کچھ خوف ہے اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے۔ معقول بات اور درگزر کرنا ایسی خیرات سے بہتر ہے جس کے بعد میں ستانا ہو اور اللہ غنی ہے حلیم ہے۔“

عام دستور ہے کہ کسی محتاج کو روپیہ دے کر لوگ اس پر احسان جتاتے ہیں اور تکلیف دیتے ہیں۔ جنہیں قومی کاموں میں خرچ کرنے کی عادت ہے، وہ ہر موقع پر اپنے چندوں کا ذکر فخر مہابت سے کرتے ہیں اور جن لوگوں نے کم چندہ دیا ہے ان کا ذکر حقارت سے کرتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں بری ہیں کہ صدقات بھی دوا اور احسان بھی رکھو۔ بلکہ خرچ کرنے کی اولین شرط یہ ہے کہ نہ تو ان لوگوں پر احسان جتاؤ اور نہ انہیں یاد دلا کر اذیت دو۔ اللہ کے نزدیک صرف وہ مال قدر و قیمت رکھتا ہے جس کے بعد من اور اذی نہ ہو، ورنہ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ تم اچھی بات کہہ دو اور کہو کہ اس وقت معاف کیجئے۔ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے متعلق تو تم سے مواخذہ نہیں کرتا، مگر حلیم کے غضب سے بھی ہر وقت ڈرنا ضروری ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَبْطُلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ ۚ كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِيقًا وَنَسَاءً ۖ لَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ  
الْآخِرِ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَمَكَّنَهُ صَلْدًا ۖ لَا يَقْدِرُونَ عَلَىٰ شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوا ۗ وَاللَّهُ  
لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ﴿٢٥﴾

”مسلمانو! احسان جتا کر اور ایذا دے کر اپنی خیرات کو اکارت نہ کرو، اس شخص کی طرح جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں لاتا تو اس کی خیرات کی مثال اس چٹان کی سی ہے جس پر مٹی پڑی ہوئی ہو پھر اس پر زور کا مینہ برسے تو اس کو سپاٹ بنا چھوڑے، اس میں سے جو انہوں نے کمایا ان کے کچھ ہاتھ نہ لگے گا اور اللہ کافر قوم کی ہدایت نہیں کرتا۔“

مسلمانوں کو چاہئے کہ اپنے صدقات و خیرات کو من اور اذی سے برباد نہ کریں اور یہ تو ایک مسلم کی شان ہی نہیں کہ لوگوں کو دکھانے کے لئے کچھ خرچ کرے، بلکہ یہ اس شخص کا کام ہے جس کو اسلام سے کوئی تعلق نہیں، جس کو نہ اللہ پر یقین ہے اور نہ یوم آخرت پر۔

جو لوگ ریا و سمعہ اپنی دولت صرف کرتے ہیں ان کو اس مثال سے عبرت اندوز ہونا چاہئے۔ ایک پتھر پر کچھ مٹی پڑی ہوئی ہے ایک ہی زور کی بارش نے اس کو بالکل صاف کر دیا اور اس پر دانہ اگنے کی کوئی صورت نہیں۔ پس جس طرح اللہ تعالیٰ انفاق فی سبیل اللہ کے لئے سات سو اور اس سے بھی زائد اجر و ثواب دیتا ہے، دوسری جانب وہ مال جو دکھانے کی غرض سے دیا گیا ہو اس کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اس کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہنے دیتا، تمام محنت اکارت جاتی ہے۔

رضائے الہی پیش نظر رہے

وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَشْيِئَتِنَا مِمَّنْ أَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَذْءٍ بِرَبْوَةٍ أَصَابَهَا وَابِلٌ  
فَأَثَرُهُ مَضْغَفِينَ ۚ فَإِنَّ لِمَ يَصُبُّهَا وَابِلٌ فُطْلٌ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٢٦﴾

”اور جو لوگ اپنے مال اللہ کی رضا جوئی اور اپنی نیت ثابت رکھ کر خرچ کرتے ہیں ان کی مثال اس باغ کی ہے جو اونچی جگہ پر واقع ہو کہ اس پر زور کا مینہ پڑا ہو اور وہ اپنے پھل دوچند لایا ہو اور اگر اس پر زور کا مینہ نہ پڑا تو پھوار ہی کافی ہے اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ دیکھ رہا ہے۔“

دوسرے وہ لوگ ہیں جو اپنے مال کو محض اس لئے خرچ کرتے ہیں کہ اللہ کی رضامندی حاصل ہو اور نفس میں چنگی پیدا ہو۔ یہ قاعدہ ہے کہ جس کام میں نفس کو تکلیف برداشت کرنی پڑے اس کے بار بار کرنے سے عادت ہو جاتی ہے اور پھر طبیعت میں وہی ملکہ راسخ ہو جاتا ہے، نفس کی مزاحمت جاتی رہتی ہے اور دوسرے اعمال صالحہ میں بھی دقت نہیں پیدا ہوتی۔ اس چنگی کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ چونکہ ہم اپنی عزیز ترین متاع حیات دولت کو اللہ کی راہ میں صرف کرتے ہیں تو جس چیز کے لئے اس کو خرچ کریں گے خود اس سے بھی ایک قسم کا ربط و تعلق قائم ہو جائے گا اور خدا کی راہ میں زیادہ ثابت قدمی اور وفاداری نوازش ہوگی۔ ان صفات کو ملحوظ رکھ کر خرچ کرنے والوں کی مثال اس باغ کی ہے جو بلند مقام پر واقع ہے، جس کی ہوا لطیف اور بار آور ہے، بارش بھی خوب ہوتی ہے، اس لئے وہ باغ دگنا اور چو گنا پھل لاتا ہے اور اگر بارش نہ بھی ہو، تو ہلکی پھوار بھی کافی ہو جاتی ہے، کیونکہ زمین اور اس کا موقع بہت عمدہ ہے۔

اَيُّوْذُ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنُ لَهُ جَنَّةٌ مِّنْ تَّخْيِيلِ ۚ وَاَعْنَابٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ ۚ لَهُ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ ۚ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهُ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَاءُ ۚ فَاَصَابَهَا اَعْصَارٌ فَبَدَّتْ ۚ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ الْاٰيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۴۴﴾

”کیا تم میں کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کا کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو، اس کے نیچے نہریں بہتی ہوں، اس کو وہاں ہر قسم کے پھل میسر ہوں اور اس کو بڑھاپا آ پہنچے اور اس کے بال بچے ناتواں ہوں، پھر اس باغ پر ایک گلولہ آ پڑے جس میں آگ ہو اور وہ جل بھن جائے، اسی طرح اللہ تم سے احکام کھول کر بیان کرتا ہے کہ تم غور کرو۔“

یہ تیسری مثال ہے کہ من، اذی اور ریا سے صدقات و خیرات پر کس طرح تباہی و بربادی نازل ہوتی ہے۔ ایک شخص کا باغ ہے جس میں ہر قسم کے میوہ جات ہیں، پیری و نقاہت کا زمانہ ہے، سب سے زیادہ احتیاج کا یہی وقت ہوتا ہے۔ پھر اہل و عیال میں اتنی طاقت نہیں کہ خبر گیری کر سکیں، اسی باغ پر تمام خاندان کی زندگی کا دار و مدار ہے، ایسی حالت میں ایک ہی آگ گلولہ سے تمام باغ جل کر خاکستر ہو جاتا ہے۔

یہی حال ان لوگوں کا ہے جو من و اذی، شہرت و ناموری اور دنیا کی قدر و منزلت کے لئے روپیہ دیتے ہیں کہ ہر جگہ ان کی فیاضی و سخاوت کا تذکرہ ہو۔ لیکن مرنے کے بعد یہ سخاوت کچھ کام نہ آئے گی اور یاس و حرمان کے سوا کچھ نصیب نہ ہو گا۔

بہترین مال خرچ کرو

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْاَرْضِ ۖ وَلَا تَيَبَسُوْا الْخَبِيْثَ مِنْهُ

تَنْفِقُونَ وَلَسْتُمْ بِأَخِيذِهِ إِلَّا أَنْ تُغْبِضُوا فِيهِ ۖ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفِيرٌ حَنِيدٌ ﴿٢٧﴾

”مسلمانو! جو پاک چیزیں تم نے کمائی ہوں اور اس میں سے جو ہم نے تمہارے واسطے زمین سے اگائی ہیں خرچ کرو اور اس میں سے رڈی چیز کا ارادہ نہ کرنا، خرچ کرنے لگو حالانکہ تم خود نہ لو، مگر یہ کہ چشم پوشی کر جاؤ اور جان لو کہ اللہ بے نیاز تعریف کے لائق ہے۔“

انفاق فی سبیل اللہ کے لئے ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ مال دو جو جائز طریق سے کمایا گیا ہو اور اس میں سے بھی بہترین ہو۔ یہ مال یقیناً حیات قومی کی لئے زندگی بخش ثابت ہوگا، اللہ کو ناکارہ اور ردی اشیاء کی ضرورت نہیں، ان صدقات کے بغیر بھی اس کی ذات حمد کے لائق اور قابل ستائش ہے، اس لئے وہی چیز پیش کرو جو اس کی ذات اور صفات کے لائق ہو۔

اَلشَّيْطٰنُ يُعِدُّ كُمْ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يُعِدُّكُمْ مَّغْفِرًا مِّنْهُ وَفَضْلًا ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٨﴾

”شیطان تم کو تنگدستی سے ڈراتا ہے اور تم کو بے حیائی کا حکم کرتا ہے اور اللہ تم سے اپنی بخشش اور برکت کا وعدہ کرتا ہے اور اللہ گنجائش والا واقف کار ہے۔“

جب ایک شخص اللہ کی راہ میں خرچ کرنے لگتا ہے تو اسے خیال پیدا ہوتا ہے کہ میں غریب و مفلس نہ بن جاؤں، یہ تمام وساوس و خطرات شیطانی ہیں۔ ایک مسلم کا فرض ہے کہ ان کی پروا نہ کرے اور خوب دل کھول کر خلافت کی مدد کرے۔ اس کا ایک تو یہ فائدہ ہوگا کہ اس کی غلط کاریوں کا کفارہ ہو جائے گا، دوسرے اللہ تعالیٰ اس کو مال مال کر دے گا، اللہ کا علم بہت وسیع ہے، ہر ایک کو اس کی نیت کے مطابق اجر دیتا ہے۔

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَن يَّشَاءُ ۚ وَمَن يُؤْتِ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ ﴿٢٩﴾

”جس کو چاہتا ہے سمجھ عطا فرماتا ہے اور جس کو سمجھ عطا کی گئی اس کو بیشک بہت بڑی خوبی عطا کی گئی، مگر صاحبان عقل ہی اس سے نصیحت حاصل کرتے ہیں۔“

انفاق فی سبیل اللہ کے لئے گزشتہ آیات میں مختلف شرطیں بیان کی گئیں، جن کی تلخیص حسب ذیل ہے:

(۱).... دے کر احسان نہ جتاؤ۔

(۲).... دوسروں کو اذیت و تکلیف نہ دو۔

(۳).... دکھاوے کی غرض سے نہ ہو۔

① مگر مسلمان بالکل اس کے برعکس کرتے ہیں، بدترین مال خدا کی راہ میں صرف کرتے ہیں، جب کھانا خراب ہونے لگے تو فقیر کو دیا جاتا ہے۔ جب کاروبار سے تھک گئے اور کام کرنے کی طاقت نہ رہے، تو دو چار اسلامی ہمدردی کی باتیں کر لیں۔ دماغ معطل ہو گیا، تفریح کا وقت نہ رہا، تو دوسرے قرآن میں آگئے۔ اپنے بچوں میں جو سب سے کمابہو، آنکھ کا اور فہم و فراست سے بے بہرہ ہو، تو اسے مذہبی تعلیم کے لئے وقف کر دیا۔ جن کتابوں کے فروخت ہونے کی زیادہ توقع ہو، اس کے لئے کاغذ کتابت اور طباعت کا بہترین انتظام کیا اور قرآن کو معمولی کاغذ پر شائع کیا۔ صحت کا بھی خیال نہ کیا، ان امراض کے ہوتے ہوئے مسلمان زندہ ہوں تو کیسے۔

(۴).... رضائے الہی پیش نظر رہے۔

(۵).... چنگی اور استواری کا خیال ہو۔

(۶).... بہترین مال خرچ کرو۔

(۷).... جائز ذرائع سے کمایا ہو۔

(۸).... فقر و تنگدستی کا خیال دل میں نہ آئے۔

(۹) بخل و امساک سے پرہیز کرو۔

ان تمام شرطوں کا تعلق مال و دولت سے ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ جس شخص میں اللہ تعالیٰ استعداد اور قابلیت دیکھتا ہے، اس کو علم و حکمت اور تفقہ فی الدین نوازش کرتا ہے۔ قرآن حکیم سے معلوم ہوتا ہے کہ مال و دولت کے لئے خیر کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے: وانه لحب الخیر لشدید، وما تنفقوا من خیر، میں خیر سے مراد مال ہی ہے اور خیر کثیر کا اطلاق علم و حکمت پر آتا ہے۔ گزشتہ آیات کے ربط و تعلق سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شرطیں ارباب دولت و ثروت کے لئے بیان کی گئی ہیں وہی قیود اہل علم و فضل کے لئے ہیں، دونوں میں کوئی فرق و امتیاز نہیں۔

وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ نَفَقَةٍ أَوْ نَذَرْتُمْ مِنْ نَذْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُهَا وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ ﴿۷۵﴾ إِنَّ تَبَدُّوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَإِنْ تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهُهَا الْفُتُورَ آفَهُمْ خَيْرٌ لَكُمْ وَيَكْفُرْ عَنْكُمْ مِنْ سَيِّئَاتِكُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿۷۶﴾

”اور جو کچھ کوئی خیرات تم خرچ کرتے ہو یا کوئی منت مانتے ہو تو بیشک اللہ اس سے واقف ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہو گا، اگر تم ظاہر میں خیرات دو تو بھی اچھا ہے اور اگر اس کو چھپاؤ اور حاجتمندوں کو دے دیا کرو تو وہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے اور تمہارے کچھ گناہ دور کر دے گا اور جو اعمال تم کرتے ہو اللہ ان سے باخبر ہے۔“

مال و دولت کے صرف کرنے اور علم و حکمت کی نشر و اشاعت کے لئے تمام شرطوں کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ان کو پیش نظر رکھ کر اب تمہیں اختیار ہے خواہ گاہ و بیگاہ اللہ کے نام پر دو یا ایک رقم نذر کے طور پر معین کر لو، نذر کے بعد اگر تم نے اس کو پورا نہ کیا تو اس کا بہت برا اثر اخلاق پر پڑے گا اور باقی فرائض ملت کے ادا کرنے میں بھی کاہلی سے کام لو گے۔ اس قدر تعلیم کے بعد بھی جو لوگ بر محل صرف نہ کریں اور بہانے بناتے پھریں، اللہ انہیں خوب جانتا ہے، ان کی کبھی مدد نہ ہوگی۔

علی الاعلان دینا اور خاموشی کے ساتھ چھپا کر دینا بھی جائز ہے۔ اگر رفاه عام کے لئے دینا ہے، سیاسی و مذہبی ضرورتوں میں صرف کرنا ہے، تو اعلان ہی مفید ہو گا کہ دوسروں کی ترغیب و تشویق کا باعث ہو اور اگر فقرا و مساکین کو دینا ہو تو چھپا کر دینا مفید ہو گا، اصل چیز حسن نیت اور اخلاص ہے، جب یہ ہے تو چھوٹے سے چھوٹا کام بھی مفید و نافع ہو گا۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هَذَا إِلَهُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ يُهْدِي مَنْ يَشَاءُ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَا نَفْسِكُمْ وَمَا تُنْفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِهِ

اللَّهُ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُؤْتِ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ ﴿۱۷۰﴾

”تمہارے ذمہ ان لوگوں کا راہ پر لانا نہیں، لیکن اللہ جسے چاہتا ہے راہ پر لاتا ہے اور جو کچھ تم مال خرچ کرو گے سواپنے لئے اور اللہ کی رضا جوئی کے سوا خرچ نہ کرو اور جس قدر مال تم خرچ کرو گے اور وہ تم تک پورا پہنچا دیا جائے گا اور تم پر ظلم نہ کیا جائے گا۔“

رسول اللہ ﷺ کا یہی فرض تھا کہ لوگوں کے سامنے قانون صحیح پیش کر دیں، شکوک و شبہات کو دور کر دیں اور دولت و علم کے مصارف بتا دیں کہ جہاد فی سبیل اللہ ہی ان کے صرف کرنے کے بہترین مواقع ہیں۔ لیکن یہ آپ کا فرض نہیں کہ لوگوں میں جذبات صادقہ بھی پیدا کر دیں۔ انما انت مذکر لست علیہم بصیطر، پھر دوسری جگہ فرمایا: انک لا تہدی من اجبت ولكن الله یهدی من یشاء، مسلمانوں کو خود یہ ضرورت محسوس کرنی چاہئے کہ ان کی حیات ملی کا دار و مدار انفاق و جہاد فی سبیل اللہ پر ہے، باقی ہدایت و راہ نمائی تو اللہ کے اختیار میں ہے۔

اگر کسی کو یہ خیال ہو کہ اسلام کی تعلیم کا تمام تر مقصد یہی ہو کہ اپنی ساری دولت اللہ کی راہ میں لٹا دی جائے تو وہ ذرا غور کر کے دیکھیں کہ وہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں، اس کا نفع و سود انہی کی جانب عود کرتا ہے یا نہیں۔ عزیز و قریب کی ہدایت کا باعث بنتے ہیں، اسلام کا بول بالا ہوتا ہے، خلافت اسلامی محکم و استوار ہوتی ہے، مال غنیمت سے مالا مال ہوتے ہیں اور جو قومیں ظلم و جور کا تختہ مشق بنی ہوئی تھیں، ان کی آزادی کا باعث بنتے ہیں، اس سے زیادہ اور کیا چاہتے ہیں۔

### انفاق فی سبیل اللہ کے مصارف

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسِبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَاقًا وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ﴿۱۷۱﴾

”ان مفلسوں کا حق ہے جو اللہ کی راہ میں گھرے ہوئے ہیں، ملک میں چل پھر نہیں سکتے، ان کی بے سوالی کے سبب انجان ان کو مالدار سمجھتا ہے، ان کی صورت سے تم ان کو پہچان لو گے، وہ لوگوں سے لگ لپٹ کر نہیں مانگتے اور جو کچھ تم کام کی چیز خرچ کرو گے اللہ اس سے واقف ہے۔“

اس آیت میں ان لوگوں کو بیان کیا ہے جن پر ہم اپنی دولت صرف کر سکتے ہیں اور وہ حسب ذیل ہیں:

(الف) مجاہدین (ب) جو جہاد میں مجروح ہوں (ج) علمائے ملت جو تعلیم حقہ کی نشر و اشاعت میں مصروف ہوں، کتاب و سنت کا درس دیتے ہوں اور لوگوں کو جہاد کے لئے تیار کرتے ہوں (د) خلافت اسلامی کے اعضاء اور کان جو ملک کے نظم و نسق میں لگے ہوئے ہوں۔

یہ لوگ نالائق و بیکار نہیں، بلکہ شرعی ضرورتوں نے ان کو روزی کمانے، تجارت کرنے اور دوسرے مشاغل دنیوی

میں شریک ہونے سے روک دیا ہے۔ وہ کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کرتے اور نہ لگ لپٹ کر مانگتے ہیں۔ یہ شرط اس لئے لگادی کہ عام طور پر فقر و مساکین اصرار مالی کیا کرتے ہیں۔

حضرت ابو بکر اپنی خلافت کے ابتدائی ایام میں تجارت کرتے تھے۔ ایک روز کپڑوں کی گٹھڑی اٹھا کر بازار جا رہے تھے کہ حضرت عمر مل گئے، انہوں نے کہا اے امیر المؤمنین! کہاں کا قصد ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ اپنے اہل و عیال کے لئے کمانے جاتا ہوں۔ حضرت عمر نے جواب دیا کہ یہ نہیں ہو سکتا، اپنے ضروری مصارف کے لئے بیت المال سے لے لیا کیجئے۔

الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِالْإِثْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٢٧﴾

”جو لوگ اپنے مال رات اور دن چھپے اور کھلے صرف کرتے ہیں ان کے رب کے ہاں ان کے لئے ان کا ثواب ہے اور نہ ان پر کچھ خوف ہے اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے۔“

شرائط کا علم ہو گیا، اب کسی مزید پابندی کی ضرورت نہیں، وقت معین کرنا بھی بے سود ہے، بلکہ ان لوگوں کو جب ضرورت ہو، دن ہو یا رات، سر آہو یا جھر آؤ زامد کرو۔

### سود کی حرمت

خلافت اسلامی اور اس کے اعضاء و ارکان کی غایۃ الغایات توحید کی نشر و اشاعت اور اعلیٰ ترین علم و حکمت کا درس و تعلیم ہے۔ ان مقاصد مہمہ کا حصول ممکن نہیں جب تک کثرت سے روپیہ نہ ملے۔ اس لئے گزشتہ آیات میں انفاق فی سبیل اللہ پر پورا زور دیا گیا ہے اور فرمایا کہ خرچ کرو گے تو بڑے اجر ملیں گے اور کامیابی نصیب ہوگی۔ انفاق کے جذبہ صادقہ کی تکمیل و تربیت کے لئے ضروری ہے کہ جس قدر اخلاق فاسقہ اس کے مخالف ہوں ان کو ترک کر دیا جائے۔ لوگوں کے دلوں میں مال کی محبت جاگیر نہ ہو، کیونکہ اگر مال کی محبت جڑ پکڑ گئی تو اللہ اور اس کے کلمہ حق کی محبت کم ہو جائے گی، جہاد فی سبیل اللہ کا شوق جاتا رہے گا۔ اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ سود خواری کو ہمیشہ کے لئے حرام کر دیا جائے اور ایک لمحہ کے لئے بھی اسے جائز نہ رکھا جائے، اس لئے اب یہاں سے سود کی حرمت پر بحث ہوتی ہے۔

الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقْوَمُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ النَّسِئِ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّا الْبَيْعُ مِثْلَ الرِّبَا وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا فَمَنْ جَاءَكَ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّهِ فَاتَّقْهَا فَلَهُ مَا سَلَفَ وَأَمْرُهُ إِلَى اللَّهِ وَمَنْ عَادَ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢٨﴾

”جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ کھڑے نہ ہو سکیں گے مگر اس طرح وہ شخص کھڑا ہوتا ہے جس کے حواس شیطان نے لپٹ کر کھو دیئے ہوں، یہ اس لئے ہے کہ انہوں نے کہا تھا کہ بیع بھی تو سود ہی جیسی ہے، حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال کیا اور سود کو حرام کیا، تو جس شخص کے پاس اس کے رب کی طرف سے نصیحت پہنچ چکی پھر وہ باز آگیا تو اسی کا ہے جو لے چکا اور

اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے اور جس نے پھر سود لیا تو وہ لوگ دوزخی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔“  
امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں۔

الا مرالذی کان مشہور امتعارفاً فی الجاہلیۃ انہم کانوا یدفعون البال علی ان یاخذوا کل  
شہر قدراً معیناً ویکون راس البال باقیائہم اذا حل الدین طالبوا المدیون براس البال فان تعذر علیہ الا  
داعا زادوا فی الحق والا جل۔

”زمانہ جاہلیت میں رہا ایک مشہور متعارف امر تھا، ان کا قاعدہ یہ تھا کہ وہ اس شرط پر قرض دیتے کہ ہر ماہ ایک معین رقم وصول کر لیا کریں گے اور اصل رقم بدستور باقی رہے گی۔ پھر جب قرض کے ادا کرنے کا وقت آجاتا تو قرضدار سے راس المال طلب کرتے اگر وہ اس اصل رقم کے ادا کرنے سے ہی اپنے آپ کو معذور پاتا تو رقم اور مدت دونوں میں اضافہ کر دیتے۔“

ہندوستان میں بھی اسی طرح کیا جاتا ہے، عرب جس کو رہا کہتے ہیں یہاں اس کو سود اور بیاج کہتے ہیں۔ یہاں بھی ساہوکار اصل رقم پر کچھ معین کر لیتا ہے اور اپنی سہولت کے اعتبار سے ماہوار یا سال کے ختم پر وصول کرتا ہے یا تمام سود کو اس المال میں شامل کر لیتا ہے۔ یہی سود اور سودور سود ہے۔ عرب اور ہندوستان میں اس مسئلہ کے متعلق کوئی اختلاف نہیں اور دونوں جگہ ایک ہی طرح کا سود نظر آتا ہے۔

جو شخص سود کھاتا ہے، قرآن حکیم نے اس کے حالات و واردات کو اس کے ساتھ تشبیہ دی ہے، جس کو شیطان چھو کر مجبوظ الحواس کر دے۔ اس آیت میں سود خوار زندگی، اس کے عادات و خصائل، اس کے اعمال و افعال اور اس کے ثمرات و نتائج کی نہایت ہی جامع و مانع تشبیہ دی گئی ہے، وہ گویا اس مسئلہ کی پوری کتاب ہے۔ اہل عرب کا خیال تھا کہ شیطان اور جن کی ضرب سے انسان مجنون ولا یعقل ہو جاتا ہے اور صرع (مرگی) کی بیماری دراصل ایک طرح کی آسیب ہوتی ہے۔ مس جنون کے معنی میں بولا جاتا ہے اور مسموس پاگل کو کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں سود خوار زندگی کو ایک آسیب زدہ پاگل اور ایک مصروع کے حالات و خصائص سے تشبیہ دی ہے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ ان بد بختوں نے اپنی فطرت صالحہ، اپنے جذبات ملکوتیہ اور اپنے عواطف انسانیت کو بالکل بدل دیا اور کہنے لگ گئے کہ بیع و شرا مثل سود ہی کے ہے۔ ایک سود خوار عام تاجروں کی طرح اپنی ایک تجارت رکھتا ہے، وہ مبادلہ اثبات کی تجارت نہیں کرتا تو کیا ہوا، ایک ہی جنس کو دیتا اور ایک ہی جنس کو لیتا ہے، یہ بھی ایک کاروبار اور بیع و شرا ہی ہے۔ اس کے جواب میں فرمایا کہ یہ نظریہ ہی سرے سے غلط ہے، اس لئے کہ۔

(الف) تجارت کا سبب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ انسان کو محنت و مشقت کی عادت پڑے۔ اسلام تجارت کا سبب سے بڑا حامی اور ان پیشوں کا مخالف ہے جن سے کاہلی اور سستی پیدا ہو اور جو انسان کو اخلاق فاضلہ اور کمالات انسانیت سے محروم کر دیں۔



(ب) سود خوار جب روپیہ دیتا ہے تو صرف نفع کا مالک ہوتا ہے، مگر تجارت میں سود زیاں اور نفع و نقصان کے دونوں پہلو ہوتے ہیں۔

اس لئے بیچ و شر کو تو جائز قرار دیا گیا، اور سود کو حرام کر دیا۔ ترمذی نے عبد اللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے کہ: لعن رسول اللہ ﷺ اکل الربوا و موكله و شاهد یه و كاتبه، ”رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے، سود دینے والے، گواہوں اور اس کے کاتب پر لعنت کی ہے۔“

يَحَقُّ اللَّهُ الزُّبُلَا وَيُزِي الصَّدَقَاتِ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَتَيْمٍ ﴿٢٤﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٢٥﴾

”اللہ سود کو گھٹاتا ہے اور خیرات کو بڑھاتا ہے اور اللہ کسی کافر گنہگار کو پسند نہیں کرتا۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کئے اور نماز قائم کی اور زکوٰۃ دی، ان کے لئے ان کے رب کے پاس ان کا ثواب ہے اور نہ ان پر کچھ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔“

آپ سود خواری کے چند نتائج کو سامنے لائیے۔

(۱) سود خوار اپنے پیشہ کے لئے یہ خواہش کرنے پر مجبور ہے کہ لوگ اپنی ضروریات انجام دینے پر قادر نہ ہوں اور قرض کے لئے درخواست کریں۔ کسی کو قمار بازی کی عادت ہو، کوئی عیاشی میں مبتلا ہو، عیال داری کے مصارف برداشت کرنے کے قابل نہ ہو، لوگ اس کی حالت پر افسوس کریں گے، مگر بد بخت سود خوار دل ہی دل میں خوش ہو گا کہ حسب دلخواہ سود لینے اور اس کی جائیداد پر قبضہ کرنے کا وقت آگیا۔

(۲) یہ آمدنی محنت کو چھوڑنے اور آرام طلب ہونے کی ترغیب دیتی ہے۔

(۳) ایک محدود جماعت ملک کے تمام سرمایہ پر قابض ہو جاتی ہے، اقتصادیات کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ اس سے ملک کو کس قدر نقصان پہنچتا ہے۔

(۴) بعض اوقات غیر اقوام کے لوگ ایک ملک کے سرمایہ پر قبضہ کر لیتے ہیں اور اس ملک کے رہنے والے محروم رہ جاتے ہیں۔

مال کی تقسیم کا مسئلہ دولتمندوں اور فقیروں میں ہمیشہ سے منازعت کا باعث رہا ہے، یورپ اس لئے اور بھی مصیبت میں ہے۔ ارباب دولت و ثروت روز بروز روپیہ کو اپنے قابو میں کر رہے ہیں، غربا و مساکین کی حالت بد سے بدتر ہوتی جاتی ہے۔ اسی کشمکش نے یورپ میں مختلف فرقے پیدا کر دیئے، مگر اس مسئلہ کو حل نہ کر سکے۔

ہنسلٹ: ان کا مقصد یہ ہے کہ جملہ املاک و امتیازات پر افراد قوم کا مساوی حق تصرف و یکساں حق مالکیت ہو۔

سوشیلسٹ: یہ چاہتے ہیں کہ اسباب معیشت پر سے شخصی ملکیت کو اٹھا دیا جائے اور جمہور کی ملک میں کر دیا جائے۔

نیشنلسٹ: ان کی غرض یہ ہے کہ اراضی سکتی اوزرعی کی ملکیت و پیداوار کو شخصی قبضہ سے نکال لیا جائے۔



بولشوسٹ: ان کا خیال یہ ہے کہ حکومت افراد کی تمام ضروریات کی متکفل ہو اور سب کو مساوی حقوق دیئے جائیں اور افراد کی تمام سعی و کوشش سے حکومت و قوم فائدہ اٹھائے۔

مگر یاد رہے حکیم سولون کے عہد سے لے کر آج تک کوئی انسانی دماغ اس عقدہ کی گرہ کشائی نہ کر سکا۔ املاک پر سے مالکوں کا حق ملکیت کا اٹھادینا عملاً اس قدر محال ہے کہ دنیا میں کبھی بھی اس کا رواج نہیں ہو سکتا۔

اسلام نے اس کی یوں گرہ کشائی کی کہ تمام دولت مند سالانہ اپنی دولت کا چالیسواں حصہ نکالیں، بیت المال میں جمع ہو۔ وہاں سے فقرا و مساکین کی مدد ہو اور ساتھ یہ حکم بھی نافذ کر دیا کہ بغیر سود کے قرض دیا کریں۔

سود کے مال میں کبھی برکت نہیں ہوتی، شراب قلیل مقدار میں نقصان نہیں پہنچاتی مگر ترقی کرتی ہوئی آخر کار مہلک ثابت ہوتی ہے، ایسے ہی سود خوار کی معاملہ ہے، جس کا انجام کار ایسی شکل اختیار کر لیتا ہے جس سے سود لینے والے کو سود تو ملے مگر تمام موجودہ دولت اور اس کی مدد سے آئندہ کی بڑی پیداوار معدودے چند کام کرنے والوں کے پاس ضرورت سے زیادہ جمع ہو جائے، باقی تمام ملک جس کی متحدہ کوشش سے وہ رقم جمع ہوئی ہے اور جس میں سود خواروں کے سرمایہ اور مزدوروں کی محنت سے بہت بڑی خدمت لی گئی ہے سب اپنے واجب استحقاق سے محروم رہیں، آرام طلبی کے خوگر ہوں، چیزوں کو گراں قیمت پر خریدیں، غرض ایک سود کی لالچ میں کئی طرح کا مالی نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔

زکوٰۃ، خیرات اور صدقات سے تمام ملک یکساں طور پر فائدہ اٹھاتا ہے۔ فقرا اور مساکین اپنی حالت کو درست کر لیتے ہیں۔ دولت کا ایک حصہ تقسیم ہو جاتا ہے اور اس طرح دولت مندوں اور غریبوں کی باہمی کشمکش کا مسئلہ صاف ہو جاتا ہے۔

## اعلان جنگ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿۲۸﴾ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِن تُبْنُوا فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ﴿۲۹﴾

”مسلمانو! اللہ سے ڈرو اور اگر تم مسلمان ہو تو جس قدر سود رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو اور اگر ایسا نہ کرو تو اللہ اور اس کے رسول سے لڑنے کو تیار ہو جاؤ۔ اور اگر توبہ کرتے ہو تو اصل رقم تمہاری ہے نہ تم کسی کا نقصان کرو گے اور نہ کوئی تمہارا نقصان کرے گا۔“

غور کرو! قرآن حکیم نے انسانی معاصی و جرائم کے متعلق طرح طرح کی وعیدیں فرمائی ہیں، لیکن سود کے متعلق ایک ایسا لفظ کہہ دیا ہے جس سے سخت تر وعید اور کسی سخت سے سخت جرم و معصیت کی بھی نسبت نہیں آئی۔ اصل بات یہ ہے کہ انسان کا کوئی فعل جلب نفع اور خود غرضی سے خالی نہیں، اس دو غرضی کا ایک بدترین ظہور جمع و حصول مال کی بھوک ہے۔ اگر غور سے دیکھئے تو اعمال انسانیت میں اس مرض کا کوئی ظہور اس درجہ انسان کے ملکوئی خصائل کے لئے مہلک، اس کی بہیمیت و معبت کے لئے مقوی، بیت اجتماع انسانیت کی صحبت

مدنی کے لئے سم قاتل اور عالم مخلوقات کے انسان کو خوفناک درندہ بنادینے کے لئے عمل السحر نہیں ہے جیسا کہ سود اور سود خواری کی زندگی کی مختلف شکلیں۔

یقیناً تمام انسانی گناہوں میں صرف یہی معصیت حرب من اللہ ورسولہ ہے، کیونکہ اور کسی معصیت میں انسان خدا کے بندوں کے لئے اس درجہ بے رحم اور خونخوار نہیں ہو جاتا، جس درجہ سود کو اپنا وسیلہ معاش بنالینے کے بعد از سر تا پا مجسمہ شقاوت و قساوت اور غفلت و صلابت بن جاتا ہے اور خدا کے بندوں کے آگے بے رحمی سے مغرور ہوتا، فی الحقیقت خدا کے آگے مغرور ہو کر آمادہ جنگ و پیکار ہوتا ہے۔

اگر ایک شخص چور ہے، ڈاکو ہے، قاتل ہے، تو قانون اس کو سزا دیگا اور انسانی آبادی اس سے پناہ مانگے گی، لیکن ایک سود خوار کہتا ہے کہ انہا البیعم مثل الربوا، اس نے تجارت کی ایک دکان کھول دی ہے اور ضرورت و احتیاج انسان کے ہوش و حواس معطل کر دیتی ہے۔ ڈاکو سے انسان بھاگتا ہے مگر مظلوم قرضدار خود دوڑ کر اس کے پاس جاتا ہے۔ پس فی الحقیقت قتل و غارت کسی قانون اور مذہب کے لئے اس درجہ سختی کی مستحق نہیں جس قدر سود اور سود خواری کی مہیب زندگی۔ پھر کیا صاحب من اللہ ورسولہ سے اس کی تعبیر صحیح نہیں ہے۔

دنیا میں خود غرضی کے جس قدر اعمال کئے جاتے ہیں، ان میں سے کسی میں بھی اس درجہ استمرار اور مداومت نہیں، جیسی کاروباری بے رحمی میں سود خوار کا عمل ظلم و دغی اور انسانی عمروں، خاندانوں اور نسلوں تک جاری رہتا ہے۔ اور وہ جس شکار کو پکڑتا ہے اس کی بے کسی اور مظلومی کا نظارہ برسوں تک دیکھتا رہتا ہے اور جب تک ہمیشہ کے لئے اس کے تڑپنے، لوٹنے اور کراہنے کے نظارہ کا تحمل اپنے اندر نہ پیدا کر لے وہ سود خوار نہیں بن سکتا۔ اس لئے صرف اسی معصیت کو حرب من اللہ ورسولہ سے تعبیر کیا گیا۔ البتہ اگر توبہ و انابت الی اللہ کر کے آئندہ سود کو بالکل ترک کر دینے کا عہد و میثاق کر لے تو اپنا اس المال لینے میں کوئی گناہ نہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے ربانکی ہر شاخ کو حرام قرار دیا اور سود خواروں کو اس کے نتائج الیمہ سے ڈرایا۔ امام احمد نے اپنی مسند میں اور دارقطنی نے عبد اللہ بن حنظلہ سے روایت کیا ہے کہ: درهم دہویا لکھ الرجل وهو یعلم اشد من ستۃ وثلثین زنیۃ، جو شخص معلوم ہونے کے باوجود سود کا ایک درہم کھاتا ہے، اس کو چھتیس زنا سے زیادہ کا گناہ ہوگا۔ ابو ہریرہ نے روایت کیا ہے کہ: الربوا سبعون جزءا ایسا ہا ان ینکح الرجل امہ، سود کے ستر اجزا ہیں، ان میں سے ادنیٰ یہ ہے کہ وہ شخص اپنی ماں سے صحبت کرے۔ ابن ماجہ نے ابن مسعود سے روایت کیا کہ: ان الربوا وان کثر فان عاقبتہ تصیدل قل۔ سود کی بنا پر اگرچہ دولت میں زیادتی ہو جائے مگر انجام کار اس پر فتناری ہوگی۔

وَإِنْ كَانَ دُوعُسْرًا فَنُظِرُوا إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ وَأَنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۲۸﴾ وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَىٰ  
اللَّهِ ۖ ثُمَّ تُوَلَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿۲۹﴾

“اور اگر کوئی تنگ دست ہو تو فراخی تک مہلت دینی چاہئے اور یہ کہ معاف کر دو تو تمہارے حق میں بہت بہتر ہے۔ اگر تم سمجھو اور اس دن سے ڈرو جس روز تم اللہ کے طرف لوٹائے جاؤ گے، پھر جو کچھ کسی نے کمایا اس کو پورا دے دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہ کیا جائے گا۔”

راس المال کے وصول کرنے میں بھی اس امر کا خیال رہے کہ اگر قرضدار غریب و مفلس ہے تو اسے فراخی و فراغت تک مہلت دینا بہتر ہو گا اور اگر نہ لو تو اچھا ہے۔ آخر سود خواری کے زمانہ میں تم اصل رقم سے کئی گنا زائد وصول کر چکے ہو۔ اگر تم قیامت کے روز خدا سے نرمی کی توقع رکھتے ہو تو آج نوع انسانی کے ساتھ ہمدردی و اعانت اور لیت و نرمی کا سلوک کرو، ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء۔

### قرض کا قانون

سود کی ابتدا یوں ہوئی کہ لوگ قرض لے کر ادا نہیں کرتے تھے یا زمانہ دراز تک ادا کرنے کا نام نہ لیتے اور اس طرح قرض دینے والا مصیبت میں مبتلا ہو جاتا۔ اس لئے سود کا رواج ہوا کہ اب ہر شخص جلد ادا کرنے کی کوشش کرے گا، ورنہ انجام کار اس کی تمام جائیداد فنا ہو جائے گی۔ ادھر قرض خواہ کو بھی اپنے سرمایہ کے ضائع ہونے کا اندیشہ نہ رہے گا۔ اسلام نے آتے ہی اس مہیب ترین درندگی اور بربریت کو ہمیشہ کے لئے حرام قرار دے کر اس کے بعد فوراً قرض کا قانون معین کر دیا جس نے ان تمام غلط کاریوں کی اصلاح کر دی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَيْتُمْ بِدِينٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ وَلْيَكْتُبَ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللَّهُ فَلْيَكْتُبْ وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا يَبْخَسَ مِنْهُ شَيْئًا فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَفِيعُ أَنْ يُطْلَلَ هُوَ فْلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ فَإِنْ لَمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَى وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا وَلَا تَسْمَعُوا أَنْ تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَىٰ أَجَلٍ ذَلِكُمْ أَفْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ لِلشُّهَادَةِ وَأَدْنَىٰ أَلَّا تَرْتَابُوا إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيرُونَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُبُوهَا وَأَشْهِدُوا إِذَا تَبَايَعْتُمْ وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ وَإِنْ تَفَعَّلُوا فَإِنَّهُ فَسُوقٌ بِكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللَّهُ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٧﴾

“مسلمانو! جب تم ادھار کا ایک میعاد معین تک لین دین کیا کرو، تو اس کو لکھ لیا کرو اور چاہئے کہ کاتب انصاف سے تمہارے درمیان لکھ دے اور جس طرح اللہ نے کاتب کو سکھایا ہے تو اس کو چاہئے کہ وہ لکھنے سے انکار نہ کرے، بلکہ لکھ دے اور وہ شخص لکھوائے جس پر حق ہے اور اس اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے اور اس میں کچھ کاٹ چھانٹ نہ کرے۔ پس اگر وہ شخص جس پر وہ حق ہے کم عقل یا کمزور ہو یا وہ خود نہ لکھو سکتا، ہو تو اس کا کارکن انصاف سے لکھواتا

جائے اور اپنے مردوں میں سے دو گواہ کر لیا کرو، پس اگر وہ دو گواہ مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں جن کو تم گواہوں میں سے پسند کرو، تاکہ کوئی ایک بھول جائے تو ایک عورت ان میں سے دوسری کو یاد دلا دے گی اور جب گواہ بلائے جائیں تو وہ انکار نہ کریں اور چھوٹا معاملہ ہو یا بڑا تو اس کو میعاد تک لکھ لیا کرو، یہ اللہ کے نزدیک نہایت منصفانہ کاروائی ہے، اور گواہی کے لئے بہت درست ہے، لگتا ہے کہ تم کو شبہ نہ پڑے، مگر یہ کہ جس کا تم لین دین کرتے ہو وہ سودا آپس میں دام نقد ہو تو اگر اس کو نہ لکھو تو تم پر کچھ گناہ نہیں اور جب تم سودا کرو تو گواہ تو کر ہی لیا کرو اور کاتب اور گواہ کو تکلیف نہ دی جائے اور اگر ایسا کرو تو یہ تمہارے لئے گناہ کی بات ہے۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو اور اللہ تم کو سکھاتا ہے اور اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔

کئی رکوع میں برابر اتفاق فی سبیل اللہ پر زور دیا جا رہا ہے، اس سے خواہ مخواہ مال کی محبت کم ہوگی۔ سود کی حرمت نے اس الفت اور محبت کو اور بھی فکا کر دیا۔ اب جبکہ مسلمان اس درجہ پر آگئے تو ان کو بتایا جاتا ہے کہ مال و دولت ایک نہایت ہی اہم اور ضروری چیز ہے۔ قوموں اور ملتوں کا قیام و ثبات اس کے ساتھ وابستہ ہے، اس لئے تم اپنے مال کی خوب حفاظت کرو، روپیہ کو محفوظ رکھو اور وقت آئے تو سارے کا سارا قوم کی راہ میں قربان بھی کر دو۔ اس پہلو کی طرف متوجہ کرنے کے لئے قرضہ کا ایک قانون مرتب کیا۔ لین دین کے متعلق جس قدر انسانی معاملات ہو سکتے ہیں ان کی تقسیم حسب ذیل ہے:-

(الف) لینے دینے کی دونوں چیزیں موجود ہیں۔

(ب) جس چیز کو خریدنا ہے وہ موجود ہے، مگر قیمت بعد میں ادا کی جائے گی۔

(ج) قیمت تو موجود ہے، مگر جس چیز کو خریدنا ہے وہ موجود نہیں ہے۔

ان تینوں صورتوں کو اسلام نے جائز قرار دیا ہے اور انہی کے متعلق گزشتہ آیت میں احکام بیان کئے گئے ہیں۔

(د) لینے اور دینے کی کوئی چیز بھی موجود نہیں، فرضی بیع ہے، نہ روپیہ پاس ہے اور نہ مال، اسلام نے اس کی سختی سے مخالفت کی ہے اور اس کو حرام قرار دیا ہے۔

گزشتہ آیت میں جن مسائل کو بیان کیا گیا ہے ہم سہولت و آسانی کی خاطر ان کو اسی ترتیب کے ساتھ لکھ دیتے ہیں جو ترتیب آیت میں ہے۔

(۱) جب آپس میں کوئی معاملہ کرنے لگو اور دام یا چیز ادھار ہو تو اس کو لکھ لیا کرو۔

(۲) دستاویز اور یادداشت میں ادا کرنے کی مدت ضرور معین کر دو۔

(۳) کاتب اور وثیقہ نویس انصاف کے ساتھ لکھے، کسی کی رعایت کے خیال سے کمی بیشی نہ کر دے۔

(۴) وثیقہ نویس لکھنے سے انکار نہ کرے۔

(۵) جس شخص کے ذمہ حق واجب ہوتا ہے اور جس کو وہ رقم یا چیز ادا کرنی ہوگی، وہ خود اپنی زبان سے لکھوائے اور

لکھواتے وقت خدا کا خوف دل میں رکھے اور اس میں کمی زیادتی نہ کرے۔

(۶) اگر جس شخص کے ذمہ حق واجب ہوتا ہے وہ:

(الف) سفیہ ہے، خفیف العقل ہے، مجنون ہے اور اس کے حواس مختل ہو چکے ہیں۔

(ب) ضعیف البدن ہے، نابالغ ہے، پیر فروت ہے یا بد حواس ہے۔

(ج) کسی اتفاقی امر سے خود بیان کرنے اور لکھوانے کی قدرت نہیں رکھتا، مثلاً گونگا ہے اور کاتب اس کے اشارات

سے واقف نہیں یا اجنبی ملک کارہنے والا ہے اور یہاں کی زبان نہیں جانتا ہے۔ تو ان تینوں صورتوں میں اس کا

کارکن ٹھیک ٹھیک لکھوادے۔ کارکن حسب ذیل لوگ ہو سکتے ہیں:

(۱) ولی جس کا تصرف اسکے مال میں نافذ ہو سکے اور وہ باپ، دادا، باپ کا وصی، دادا کا وصی اور قاضی ہیں۔

(۲) وکیل، مترجم اور مفہم بھی کارکن اور ولی میں آجائیں گے۔

(۷) معاملہ اور دستاویز کی پختگی کے لئے دو مرد گواہ بنالو۔

(۸) اگر دو مرد نہ مل سکیں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں تاکہ اگر ایک عورت بھول جائے تو دوسری اسے

یاد دلادے۔

(۹) عدالت جب گواہوں کو شہادت کے لئے بلائے تو وہ جانے سے انکار نہ کریں۔

(۱۰) گواہی صرف اس شخص کی معتبر ہوگی جس میں اسلام، عقل، بلوغ، آزادی اور عدالت ہو۔ بے دین کی شہادت

قبول نہ کی جائے گی۔

(۱۱) قرض کا معاملہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، لکھ لینا زیادہ مناسب ہے، کیونکہ اس سے یہ ہو گا کہ:

(الف) اللہ کے نزدیک انصاف کی بات یہی ہے۔ جب عدالت میں مقدمہ جائے گا تو قاضی کو فیصلہ کرنے میں

مدد ملے گی اور صحیح واقعات اس کے سامنے آجائیں گے۔

(ب) گواہوں کو شک و شبہ کا موقع نہ رہے گا۔ دستاویز دیکھتے ہی ان کو تمام واقعات یاد آجائیں گے اور سچی

گواہی دے سکیں گے۔

(ج) جب قرض کی مقدار اور مدت ادا لکھی ہوگی تو کسی کو دوسرے کی نسبت بدگمانی کا موقع نہ رہے گا۔

(۱۲) اگر سودا دست بدست ہو تو لکھنے کی ضرورت نہیں۔

(۱۳) باہم لیتے دیتے وقت گواہ کر لینے مفید ہوں گے، ورنہ ممکن ہے دکان دار کہنے لگے کہ مجھے قیمت وصول نہیں

ہوئی یا میں نے اس چیز کو فروخت ہی نہیں کیا۔

(۱۴) وثیقہ نویس اور گواہوں سے مفت کام نہ لیں، بلکہ ان کی اجرت ادا کر دینا، ورنہ تمہیں کاتب اور گواہ نہ مل سکیں

گے۔ عدالت کو تکلیف ہوگی اور لین دین بند ہو جائے گا۔ خدا سے ڈرو اور چند ملکوں کی خاطر عدالت کی راہ میں رکاوٹیں نہ پیدا کرو۔ اللہ کو خود معلوم ہے کہ یہی قانون تمہارے جھگڑوں کو دور کر سکتا ہے۔

رہن کی اجازت ہے

وَإِنْ كُنْتُمْ عَلَىٰ سَفَىٰ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهْلُمْ مَّقْبُوضَةٌ فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُم بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتِنَ أَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ إِيَّمًا قَلْبُهُ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ﴿٢٧﴾

”اور اگر تم سفر میں ہو اور لکھنے والا نہ پاؤ تو گروی قبضہ کر ہوئی، پس اگر تم میں ایک دوسرے پر اعتبار کرے تو جس پر اعتبار کیا گیا ہے اس کو دوسرے کی امانت ادا کر دینا چاہئے اور وہ اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے اور گواہی کو نہ چھپاؤ اور جو اس کو چھپائے گا تو بیشک اس کا دل گنہگار ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ سب جانتا ہے۔“

سفر میں اگر قرض لینے کی ضرورت محسوس ہو اور کاتب نہ مل سکے، تو ایسی حالت میں اطمینان کی یہی صورت ہو سکتی ہے کہ قرضدار اپنی کوئی چیز رہن کے طور پر قرض خواہ کے پاس رکھ دے اور اگر ان کو ایک دوسرے پر اعتماد ہے تو اس کی بھی ضرورت نہیں، البتہ اب مدیون کو چاہئے کہ خدا سے ڈر کر حق نہ مارے۔ آخر میں پھر تبصرہ کر کے فرما دیا کہ شہادت اور گواہی کو چھپانے کی کوشش نہ کرو، ورنہ تمہارے اعمال و اخلاق پر برا اثر پڑے گا۔

عرب کے لوگ لکھے پڑھے نہ تھے، ان کے تمام قومی معاملات، معرکہ کھانے کا رزار اور دواوین و اشعار کا دار و مدار صرف حافظہ پر تھا۔ ان کے سامنے قرآن نے یہ قانون بیان کیا اور نہایت ہی لطیف طریق سے بتا دیا کہ تم عنقریب دنیا کی عظیم الشان قوم بن جاؤ گے۔ کامیابی و کامرانی تمہارے ہم رکاب ہوگی، تمہارے باہمی معاملات اس قدر وسیع ہو جائیں گے کہ ان میں کتابت اور تحریر کی ضرورت محسوس ہوگی۔

یہ آیت ہمیں بتاتی ہے کہ ایک ترقی یافتہ قوم کی تمام ضروریات اجتماعی کے لئے جو چیز اساس و بنیاد کا کام دے سکتی ہے وہ یہی ہے کہ کاتب ہوں، ان کی کتابت کا معاوضہ دیا جائے، گواہی کا قاعدہ یہ ہے کہ گواہ شہادت سے انکار نہ کریں، صاحب معاملہ اگر بچہ، بوڑھا، اور پاگل ہو یا اور کوئی عذر ہو تو اس کا ولی ہونا ضروری ہے۔ اگر ہم غور سے دیکھیں تو آج تمام مہذب دنیا کے قانون کی بنیاد پر ہے، جس کو قرآن نے صرف ایک آیت میں بیان کر دیا ہے۔

ارکان خلافت اور تعلق باللہ

خلافت کبریٰ کے فرائض بیان کر دیئے گئے۔ اولیائے خلافت کا یہ کام ہو گا کہ اپنی ماتحت دول و اقوام کی نگرانی کریں۔ فتنہ و فساد نہ ہونے پائے اور ہر جگہ امن و سلامتی کا دور دورہ ہو، لیکن اگر اعضائے حکومت ہی کی نیتوں میں فرق آجائے اور وہی لوگ ظلم و جور پر کمر باندھ لیں تو ان سے کون باز پرس کرے گا؟ اور کس کے سامنے ان کے اعمال کا احتساب کیا جائے

گا؟ اس رکوع میں اسی موضوع پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تَخْفَوْا يُحَاسِبْكُمْ بِهٖ اللّٰهُ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۷۶﴾

”جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب اللہ ہی کا ہے اور اگر جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اس کو ظاہر کر دیا چھپاؤ بہر حال تم سے اللہ اس کا حساب لے گا پھر جسے چاہے بخشے گا اور جسے چاہے عذاب دے گا اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

ارکان خلافت کو بتایا جاتا ہے کہ زمین و آسمان کی حکومت اللہ کے قبضہ میں ہے، البتہ یہ امانت تمہارے سپرد کر دی گئی ہے، اس لئے اترانہ جانا بلکہ اعلیٰ ترین حکمران جماعت ہونے کی وجہ سے تمہارا احتساب اور بھی زیادہ سخت ہو گا۔ اگر دوسروں کے اعمال پر نظر ہو گی تو تمہارے ارادے بھی ہمارے محاسبہ سے نہ بچ سکیں گے۔

نزدیکاں راہیں بود حیرانی!

صحابہ اس کو سن کر کانپ اٹھے اور حضور رسالت میں عرض کیا کہ وسوس و خطرات سے بچنا مشکل ہے۔ آپ نے فرمایا تم یہودیوں کی طرح سبعنا و عصینا نہ کہنے لگ جاؤ۔ اس پر سب کی گردنیں تسلیم و رضا کے طور پر جھک گئیں اور فوراً بعد دوسری آیت نازل ہوئی جس نے حقیقت سے پردہ اٹھا دیا۔

بعض لوگوں نے اس آیت کو لایکلف اللہ نفساً الا وسعها سے منسوخ مانا ہے، حالانکہ ان آیات میں نوحی بحث ماننا ہے سو ہے۔ سورہ بقرہ کے بعد آل عمران کا نزول ہوا ہے اس میں بھی اس کے ہم معنی آیت موجود ہے: قُلْ اِنْ تُخَفَوْا مَآئِقِ ضُدُوْكُمْ اَوْ تُبْدُوْا يَغْلِبْكُمْ اللّٰهُ (آل عمران ۲۹) اصل بات یہ ہے کہ آیت منسوخ نہیں ہوئی بلکہ جس وقت صحابہ کرام پریشان و مضطرب ہو کر بار رسالت میں حاضر ہوئے تو غایت خشیت اور شدت خوف کی بنا پر آپ کی نظر بھی الفاظ کے ظاہری عموم پر پڑی، مگر اللہ نے فوراً اپنی مراد واضح کر دی اور صحابہ کے اشکال کو دور کر دیا۔

اَمِنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اَنْزَلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهِ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلُّ اَمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِنْ رُّسُلِهٖ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرٰنَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۷۷﴾

”ان کے رب کی طرف سے پیغمبر پر جو کچھ اتارا گیا اس کو انہوں نے اور مسلمانوں نے بھی مان لیا سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لے آئے، ہم اس کے پیغمبروں میں کسی کو جدا نہیں سمجھتے اور بول اٹھے کہ ہم نے سنا اور مان لیا، اے ہمارے پروردگار تیری بخشش چاہتے ہیں اور تیری ہی طرف لوٹنا ہے۔“

یہ وسعت صرف اسلام کو حاصل ہے کہ وہ دنیا کی تمام صداقتوں پر ایمان کا اظہار کرتا ہے، حق و صدق کی آواز دنیا کے کسی گوشہ سے بلند ہو مسلمان اس کو لبیک کہنے کو تیار ہو گا۔ کیا کوئی قوم اس خصوصیت میں مسلمانوں کا مقابلہ کر سکتی ہے۔

## یوں دعا کرو

لَا يَكْفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وَسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِكْرَامًا حَسَنَتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ وَاعْفُ عَنَّا وَاعْفُ لَنَا وَارْحَمْنَا أَنْتَ مَوْلَانَا فَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿٢٨﴾

”اللہ کسی کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی طاقت کے موافق، اسے ملنا ہے جو اس نے کمایا اور اس پر پڑنا ہے جو اس نے کمایا۔ اے رب! اگر ہم بھول چوک جائیں تو ہم کو نہ پکڑ، اے ہمارے رب! جیسا بوجھ تو نے ان پر جو ہم سے پہلے تھے رکھا تھا ویسا ہم پر نہ رکھ۔ اے ہمارے رب جس بوجھ کی ہم میں سکت نہیں وہ ہم سے نہ اٹھوا، اور ہم سے درگزر فرما اور ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما تو ہی ہمارا حامی ہے پس کافروں کے مقابلہ میں ہماری مدد کر۔“

اس سے پہلی آیت میں فرمایا تھا کہ نفوس کی پوشیدہ باتوں پر بھی محاسبہ ہو گا اب اس کو اور زیادہ وضاحت سے بیان کیا کہ اس سے مراد غیر اختیاری امور نہیں ہیں کیونکہ اللہ کبھی ایسے احکام صادر نہیں کرتا جو ایک شخص کی طاقت سے باہر ہوں اور ان کے لئے اسباب فراہم نہ ہو سکیں، بلکہ جتنا کرو گے اسی کے مطابق جزا ملے گی قوت ارادی میں ضعف و کمزوری نہ آنے پائے اور کام کرنے کا عزم مصمم ہو پھر اگر غلطی ہو جائے تو یوں دعا کرو!

اگر ہم سے بھول کر کوئی غلطی ہو جائے یا باوجود یاد ہونے کے پھر بے ارادہ کوئی فعل سرزد ہو تو اس پر مواخذہ نہ کیجیو، قانون کے متعلق دو باتیں یاد رکھنے کے قابل ہیں:

(الف) لوگ اس کو سمجھ لیں: کیونکہ اگر یوں ہی ان کو عمل کرنے کے لئے مجبور کیا گیا تو وہ کبھی اس کے پابند نہ رہ سکیں گے۔

(ب) طاقت اور استطاعت سے زائد نہ ہو۔

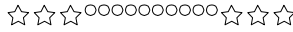
ان دونوں غلط کاریوں سے ہمیں محفوظ رکھنا، کیونکہ پہلی قومیں ان مصائب کی بنا پر فنا ہو گئیں۔ قانون ان کے لئے سخت تر ہوتا چلا گیا، ہم پر اس قسم کی بے سمجھی اور نادانی کا بار عظیم نہ ڈالنا اور جو قانون بھی نوازش ہو تو ہماری طاقت کا لحاظ کر کے دیا جائے، ہم اگرچہ غلط کریں مگر عفو و درگزر سے کام لینا اور سختی سے پیش نہ آنا، غلط کاری کے بعد فوراً مواخذہ نہ کرنا بلکہ چند روز کی مہلت دینا کہ ہم اصلاح کر لیں۔ ابھی ترقی کے بہت سے مواقع ہیں، مقاصد مہمہ پیش نظر ہیں اور ہم ابھی تک ایسے جرائم کے مرتکب نہیں ہوئے کہ ہمیں اس ترقی سے محروم کر دیا جائے، بلکہ تو اپنی رحمت سے آگے بڑھنے کا موقع نوازش کر اور اگر ہمارے مقابلہ میں کوئی دوسری قوم پیدا ہو تو اس کو فنا کر دے اور اس ترقی کے لئے صرف ہمارا ہی انتخاب عمل میں آئے۔ تو ہی ہمارا پروردگار ہے۔ تیرے سوا اور کس کے پاس جاسکتے ہیں اور جب ہم تیرے ہی غلام ہیں تو ہمیں کفار پر غلبہ نوازش کر۔ آمین یا رب العالمین۔



## حسن خاتمہ

اس حسن خاتمہ کے قربان جائیے جس میں اسلام کے انتہائی نصب العین اور غایت الغایات کو نہایت ہی واضح اور روشن الفاظ میں بیان کر دیا کہ فرزند ان توحید دنیا کی تمام اقوام و ملل اور مذاہب و ادیان پر حاکم بنا کر بھیجے گئے ہیں اور شہدائے علی الناس اسی صورت میں بن سکتے ہیں جبکہ اس قانون پر عمل کریں، جو رسول عربی کی معرفت انہیں نوازش کیا گیا ہے۔ صبر و استقامت و عزم و استقلال اور ولولہ دینی و حب مذہبی اپنے اندر پیدا کریں، جہاد فی سبیل اللہ کے لئے ہمیشہ تیار رہیں اور خداوند قدوس سے فتح و کامرانی کی دعا مانگیں۔

سورت کی ابتدا میں فرمایا تھا اولئک ہم المفلحون اور آخر میں بھی فانصرنا علی القوم الکفرین سے اسی طرف اشارہ کیا کہ ابتدا و انتہا ہی ایک سورت کے موضوع و مقصد معلوم کرنے کی کنجی ہے۔ اس مقصد کے کسب و حصول کے لئے دعا بہترین ذریعہ ہے، اس لئے اس کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے اور وہ یہی ہے کہ فانصرنا علی القوم الکفرین۔ واللہ اعلم بالصواب۔





بسم الله الرحمن الرحيم  
الحمد لله وسلام على عباده الذين اصطفى

## سورۃ آل عمران (رکوع ۲۰- آیات ۲۰۰)

### سورۃ کا نام

ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ قرآن حکیم میں جس قدر سورتیں ہیں ان کے نام ان کی بعض نمایاں اور ممتاز خصوصیات کی بنا پر رکھے گئے ہیں اور ان کو خود رسول اللہ ﷺ ہی نے معین فرما دیا تھا۔ اس سورۃ مبارکہ میں بتایا گیا ہے کہ نبوت کا تاج بنی اسرائیل سے چھین کر بنی اسماعیل کے سر پر رکھا جائے گا۔ اس میں موسوی سلسلہ کے آخری نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات و واقعات کو پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ان کے اتباع و مقلدین کی غلط کاریوں کو بھی واضح کیا ہے۔ بنی اسرائیل کا سلسلہ نبوت دراصل حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام سے شروع ہوتا ہے جن کے والد کا نام عمران تھا، اس لئے اس سورۃ کا نام بھی آل عمران ہی تجویز ہوا کہ اس خاندان کے بعض اکابر رجال کی سوانح زندگی کا اس میں تذکرہ ہے اور یہ نام خود لسان نبوت کا تجویز کردہ ہے، جیسا کہ مسند امام احمد میں نواس بن سمعان الکلابی سے مروی ہے: سمعت رسول اللہ ﷺ یقول، یبق بالقرآن یوم القیمة و اھلہ الذین کانوا یعملون بہ تقدّمہم سورۃ البقرۃ و آل عمران و ضرب لھما رسول اللہ ﷺ ثلاثۃ امثال ما نسیتھن بعد، قال کانہما غبا متان او ظلتان سوداوان بینہما شرق او فرقان من طیر صوف یحاجان عن صاحبہما، آپ نے فرمایا کہ قیامت کے روز قرآن اور ان لوگوں کو لایا جائے گا جو اس کتاب عزیز پر عمل کرتے تھے، ان کے آگے آگے سورۃ بقرہ اور آل عمران ہوں گی جو ابریا سائے کی مانند چلیں گی اور ان ارباب ایمان کی جانب سے گفتگو کریں گی۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ خود دربار رسالت سے اس سورت کا یہی نام تجویز ہوا ہے۔ اس روایت کو مسلم اور ترمذی نے بھی بیان کیا ہے۔

### ترتیب نزول

اس امر کو تمام مفسرین کرام تسلیم کرتے ہیں کہ یہ سورۃ تمام و کمال مدینہ منورہ ہی میں نازل ہوئی ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس کا بیشتر حصہ سورۃ بقرہ کے بعد نازل ہوا ہے۔ تیرہویں رکوع سے اٹھارویں رکوع تک غزوہ احد کا تذکرہ ہے۔ اور

اسی کے مختلف نتائج و ثمرات اور بصائر و حکم کو نہایت ہی دل آویز انداز سے بیان کیا ہے۔ یہ جنگ ۳ ہجری میں ہوئی ہے، اس لئے یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ یہ تمام حصہ ۳ ہجری ہی میں نازل ہوا ہے۔

سورۃ کے ابتدائی رکوعوں میں عیسائیوں کے عقائد باطلہ کا رد کیا گیا ہے، وہاں ہمیں آیت مباہلہ بھی ملتی ہے جو فد نجران کے سامنے پیش کی گئی تھی۔ یہ وفد ۹ ہجری میں مدینہ حاضر ہوا تھا اس سے بظاہر یہ خیال ہو سکتا ہے کہ غالباً تمام ابتدائی رکوع ہجرت کے نویں سال نازل ہوئے ہوں گے، مگر آیات کی اندرونی شہادت اس فیصلہ کی تائید نہیں کرتی، اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے قیصر اور دوسرے امراء کو جو خطوط لکھے ہیں ان میں تعالوا الی کلمۃ سواعییننا و بینکم درج ہے۔ ارباب تاریخ کو معلوم ہے کہ قیصر وغیرہ کو ۶ ہجری میں خطوط روانہ کئے گئے۔ اس لئے ان تمام آیات کے متعلق یقینی طور پر بات کہی جاسکتی ہے کہ ان کا نزول بھی ۶ ہجری سے قبل ہو چکا تھا۔

اب صرف آیت مباہلہ کا سوال باقی رہ جاتا ہے۔ ہمارے پاس کوئی ایسی شہادت موجود نہیں جس کی بناء پر اس کے نزول کی کوئی تاریخ معین کر سکیں۔ بالکل ممکن ہے کہ یہ آیت اسی وقت نازل ہوئی ہو جب وفد نجران دربار رسالت میں حاضر ہوا تھا اور یہ بھی قرین قیاس ہے کہ یہ آیت بھی باقی تمام آیات کے ساتھ ہی اتری ہو اور جس وقت وفد نجران آیا ہو تو آپ نے اس کو انکے سامنے تلاوت کر دیا ہو، والعلم عند اللہ۔

ما قبل سے تعلق

سورہ بقرہ اور آل عمران کا آپس میں نہایت ہی گہرا تعلق ہے۔ دونوں کو رسول اللہ ﷺ نے الزہرہ اور ان کے لقب سے یاد فرمایا ہے۔ اس میں حضرت آدم کا تذکرہ تھا اور اس میں ان مثل عیسوی عند اللہ کمثل آدم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعات زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں یہودیوں کی خرابیوں کو بیان کیا گیا تھا اور اس میں عیسائیوں کے نقائص و ذنائب کی قلعی کھولی گئی ہے کہ دونوں کے دونوں بنی اسرائیل ہی کے دو مختلف گروہ ہیں۔ اس میں یہودیوں کو اسلام کی جانب دعوت دی گئی تھی اور اس میں عیسائیوں کو اسی راہ حق کی طرف بلایا گیا ہے اور قدرتی ترتیب بھی اسی بات کی مقتضی تھی کہ دعوت اسلام میں عیسائیوں کا درجہ بعد کو آئے۔ سورہ بقرہ کے آخر میں ان الفاظ میں دعا کی گئی تھی: فانصرنا علی القوم الکفرین۔ اس سورت کے ابتدا ہی میں اللہ لا الہ الا هو الہی القیوم ذکر کر کے بتادیا کہ مسلمانوں کی دعا کو شرف اجابت بخشا گیا، وہ کبھی ہلاک نہ ہوں گے بلکہ ان کو ایک قوی و طاقتور اور زندہ قوم بنا دیا جائے گا۔

روئے سخن

اس میں شک نہیں کہ شریعت اور طریقت ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں اور ان میں باہمی کوئی فرق و امتیاز نہیں، لیکن پھر بھی بعض امتیازات و خصوصیات کی بنا پر کسی پر علم غالب آ جاتا ہے اور اس کی تمام زندگی اسی کی نشر و اشاعت میں صرف

ہو جاتی ہے اور کسی پر عشق و شیفگی کے دروازے مفتوح ہو جاتے ہیں اور اس کی تمام کائنات حیات اسی جذب و وارفتگی کے لئے وقف ہو جاتی ہے۔ اگر موسیٰ و داؤد پر پہلی چیز غالب تھی تو زکریا اور عیسیٰ دوسری حقیقت کے نمونہ تھے، لیکن غرض ان سب کی حقائق و معارف الہیہ کی نشر و اشاعت تھی اور بس۔

قرآن حکیم کا مقصد دعوت و تبلیغ اسلام ہے۔ سورۃ بقرہ میں اس نے یہودیوں کو مخاطب کیا کہ وہی سب سے زیادہ مذہبی ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ موسیٰ سے لے کر عیسیٰ تک ان میں انبیاء کرام مبعوث ہوتے رہے، مگر اپنے علم کے گھمنڈ میں انہوں نے ان بزرگان ملت کی پروا نہ کی۔ ان میں حیلہ سازی، قانون الہی سے نفرت، باریک بینی، آرام پسندی، ریاکاری اور عجب و غرور کے امراض خبیثہ پیدا ہو گئے۔ ان کے واقعات و حالات بیان کئے کہ مسلمانوں کے ارباب علم و فضل ان سے عبرت اندوز ہوں اور ان جرائم کے ارتکاب سے پرہیز کریں جن کی بنا پر بنی اسرائیل مغضوبیت کے مورد قرار پائے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش عام قاعدہ کے خلاف ہوئی تھی اور یہودیوں کا غرور و تکبر حد سے تجاوز کر گیا تھا، اس لئے بجائے اس کے کہ وہ اس عظیم الشان و بزرگ ترین ہستی سے فائدہ حاصل کرتے خود اسی کی ذات اقدس کو مورد طعن و تشنیع بنانے لگے، البتہ سنت اللہ کے مطابق چند نہایت ہی عاجز و درماندہ لوگوں نے ان کی طرف توجہ کی اور ان کے علوم سے استفادہ حاصل کیا اور یہی قانون قدرت ہے کہ انبیائے کرام کے اولین اتباع ہمیشہ ضعیف و کمزور لوگ ہی ہوا کرتے ہیں، بدآلا سلام غریبا و سيعود غریبا فطین للغرباء۔ بعد میں انھیں لوگوں کو نصاریٰ کہا جانے لگا اور اس سورت میں یہی مخاطب ہیں۔ اس میں نہایت تفصیل سے ان کی خرابیاں اور غلط کاریاں ذکر کی گئی ہیں اور آخر میں بتایا گیا ہے کہ اگر وہ ان بد کاریوں سے بچنا چاہتے ہیں اور دنیا میں ایک زندہ قوم کی طرح رہنے کے آرزو مند ہیں، تو دائرہ اسلام میں داخل ہوں اور فرزندان اسلام کے دوش بدوش اصلاح و تجدید عالم کے فرائض حقہ انجام دیں۔

بعض مخصوص اسباب و وجوہ کی بنا پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تمام عمر نکاح نہیں کیا۔ عیسائیوں نے اس نمونہ کی تقلید کی اور ان میں سے اکثر لوگوں نے تجرید و رہبانیت کی زندگی اختیار کر لی۔ انہوں نے دنیا کے لذائذ و مرغوبات کو اپنے اوپر حرام کر لیا اور نہایت ہی شدید ریاضتوں اور مجاہدوں کے پابند بن گئے، مگر ایسا کرنا بالکل خلاف فطرت تھا، اس لئے راہبانہ زندگی میں ان سے بے انتہا فرگزاشتیں ہوئیں اور وہ سخت ترین جرائم کے مرتکب ہوئے، انجام کار ان میں سے بیشتر مجسمہ ملعونیت و شیطنت اور پیکر خست و بد باطنی بن گئے۔

اس سورت میں ان کی خرابیوں کے بیان کرنے کا مقصد یہ تھا کہ امت مسلمہ کے ارباب تصوف و تجرید ان کو آویزہ گوش بنائیں اور جو غلط کاریاں عیسائیوں کے صوفیوں اور پیروں سے ظاہر ہوئی ہیں، ان سے ہمارے مشائخ کرام اور صوفیائے عظام پرہیز کریں۔

## موضوع سورۃ

گزشتہ سطروں سے یہ بات صاف ہو گئی ہوگی کہ اگرچہ سورۃ بقرہ میں یہودی مخاطب تھے، مگر ضمناً عیسائیوں کا تذکرہ بھی آجاتا تھا، اسی طرح آل عمران میں اصلی روئے سخن تو نصاریٰ کی جانب ہے، مگر بعض اوقات یہودیوں کا نام بھی آجاتا ہے، اس لئے کہ دونوں جماعتیں ایک ہی سلسلہ موسوی کی دو متصل کڑیاں ہیں۔ بنی اسرائیل نے سبعنا وعصینا کہہ کر قبول اسلام سے انکار کر دیا، اس لئے سورۃ بقرہ میں ضربت علیہم الذلۃ والمسکنۃ کی بنا پر ان کے ہاتھ سے ہمیشہ کے لئے تلوار چھین لی گئی اور ان کو حکومت سے محروم کر دیا گیا۔ عیسائیوں سے بھی کچھ زیادہ توقع نہیں کہ وہ اسلام قبول کریں گے، اس لئے آل عمران کے ابتدا ہی میں مسلمانوں کو یہ دعا سکھائی گئی:

اللھم مالک المملکات توئی المملک من تشاء وتنزع المملک من تشاء وتذل من تشاء بییدک الخیر انک علی کل شیء قدید

”خداوند! تمام کائنات ارضی و سماوی تیرے ہی قبضہ و اختیار میں ہے پس تو اپنی قدرت سے کام لے کر نصاریٰ سے سلطنت چھین اور عاجز و درماندہ مسلمانوں کو نوازش کر۔“ آمین

یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ رسول اللہ نے ان دونوں سورتوں کو الزہرا و ان کے نام سے یاد فرمایا ہے جس کی معنی روشن، درخشندہ اور سفید کے ہیں۔ گویا سورۃ بقرہ میں مسلمانوں کو جس خلافت کبریٰ اور فضیلت علیٰ العلمین کا وعدہ دیا گیا ہے وہ ضرور پورا ہو کر رہے گا۔ اس سورۃ کے ابتدا ہی میں فرمایا تھا:

اولئک علی ہدی من ربہم واولئک ہم المفلحون

اور آل عمران کے اخیر میں فرمایا:

اصبروا وصابروا ورابطوا واتقوا اللہ لعلکم تفلحون۔

مگر اس خلافت کبریٰ کے حفظ و بقا کے لئے چند قوانین اور خصوصیات کی پابندی لازمی اور ضروری ہے۔ اس سورۃ میں ان تمام امور پر روشنی ڈالی گئی ہے جو خلافت اسلامی کو قائم و دائم رکھ سکتے ہیں۔ گویا دوسرے الفاظ میں اس سورۃ کا موضوع اصلی خلافت اسلامیہ کی حفظ و صیانت ہے اور بس۔

## تلخیص مضامین

آل عمران کے تمام مضامین اول سے آخر تک اسی طرح مربوط اور مسلسل ہیں جس طرح آپ سورۃ بقرہ اور انفال و توبہ میں دیکھ چکے ہیں۔ اس سورۃ کا روئے سخن نصاریٰ کی طرف ہے، اس لئے سب سے پہلے ان کے عقیدہ مسیحیت کو باطل ٹھہرایا گیا اور توحید کو اصل و اساس تعلیمات الہیہ قرار دیا گیا۔ یہی تعلیم توراۃ اور انجیل کے اوراق میں محفوظ ہے اور اسی کا حامل قرآن حکیم ہے، مگر کتب الہیہ سے مستفید ہونے کا بہترین طریق یہ ہے کہ انسان اپنے ضمیر اور کائنات کا نشنہ کو بر باد نہ کرے

اور محکمات سے متشابہات، بدیہیات سے نظریات اور اصول سے مخصوصات کا استخراج و استنباط کرے۔ ورنہ ہمیشہ ناکامی رہے گی۔ آیت نمبر ۹ سے اس پر تاریخی شہادت پیش کی کہ جن لوگوں نے اپنے ضمیر کو خراب کر لیا اور محکمات کو چھوڑ کر متشابہات کے پیچھے پڑ گئے وہ کبھی کامیاب نہ ہو سکے۔ اس سلسلہ میں فرعون اور اس کی قوم کے نظائر بیان کئے، اس غلطی میں عیسائی بھی مبتلا ہوئے اور عقیدۃ الوہیت مسیح میں انہوں نے فرعونوں کے نقش قدم کی پیروی کی، پس ان کا بھی وہی حال ہو گا جو ان سے پہلے لوگوں کا ہوا۔ اور ان کے مقابلہ میں صرف ارباب توحید ہی کو کامیابی ہوگی کہ وہ محکمات سے متشابہات کی جانب رجوع کرتے ہیں۔ اگر نصاریٰ کو یہ خیال ہو کہ مسلمان قلت تعداد اور ضعف ظاہری کی وجہ سے ان پر غالب نہ آسکیں گے تو انہیں غزوہ بدر کا دیدہ عبرت سے مطلع کرنا چاہئے، دونوں جماعتوں کے مقاصد حیات میں زمین و آسمان کا فرق ہے، مسلمان اپنی ہر چیز خدا کے نام پر قربان کرنے کو تیار ہیں، اس لئے ان پر کفار کبھی غالب نہیں آسکتے، پس جبکہ عیسائیوں کی تباہی کا فیصلہ ہو چکا ہے تو مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ خدائے قدوس سے حکومت کی دعا مانگیں۔ اس میں جہاں ایک طرف اس حقیقت کو واضح کیا کہ انجام کار حق غالب رہے گا اور دنیا کے گوشہ گوشہ اور کونہ کونہ میں توحید کی حکمرانی ہوگی، وہاں یہ بھی بتادیا کہ آج کی تاریخ سے بنی اسرائیل کو نبوت کے تخت سیادت سے نیچے گرا دیا جاتا ہے اور ان کی جگہ مسلمانوں کو دی جاتی ہے۔ یہ مضمون آیت نمبر ۱۱ سے نمبر ۲۶ میں بیان کیا گیا ہے۔

خلافت اسلامی کے بقا و استحکام کے لئے ضرورت ہے کہ مسلمان تمام کفار و مشرکین اور اہل کتاب سے ہر قسم کے تعلقات منقطع کر لیں اور صرف اللہ کے قانون کی پابندی اختیار کریں۔ چنانچہ پہلے لوگوں کی کامیابی محض قانون الہی کے اتباع کی بدولت ہوئی، اسی ذیل میں حضرت زکریا، یحییٰ، مریم اور عیسیٰ علیہم السلام کے واقعات بیان کئے اور ساتھ ہی ساتھ افترا پر دازیوں کی اصلاح کردی، جو حضرت مسیح کی جانب منسوب کی جاتی ہیں، تا آنکہ یہ واضح ہو گیا کہ عیسیٰ بھی ایک انسان ہی تھے۔ جب باوجود ان حقائق ثابتہ کے نصاریٰ پھر بھی اپنے عقائد باطلہ پر قائم رہے اور ان کی گردنیں حق کے آگے نہ جھکیں تو انہیں مباہلہ کی دعوت دی گئی، مگر وہ اس کے لئے بھی تیار نہ ہوئے، اس لئے انہیں توحید کی طرف بلایا گیا جو تمام مذاہب و ادیان میں ایک مشترک امر ہے اور جس کی نشر و اشاعت ہر مذہب کا اولین فرض۔ اس مضمون کو آیت نمبر ۶۴ پر ختم کیا۔

اہل کتاب توحید کو تو کیا مانیں گے وہ الثانیہ دعویٰ کرتے ہیں کہ جو تعلیم ہمارے پاس ہے وہ راز سربستہ کی طرح ابراہیم سے ہم تک پہنچی ہے، اس لئے پہلے تو یہ بات بتائی کہ تم اتنی بات بھی نہیں جانتے کہ توراۃ و انجیل کا نزول ان کے بعد ہوا ہے جن سے یہودیت و نصرانیت کی اشاعت ہوئی ہے۔ ابراہیم تو حنیف مسلم تھے اور اس وقت اگر اس کے نقش قدم پر چلنے والا کوئی نفس قدسی مل سکتا ہے تو وہ صرف نبی اُمّی ہی کی ذات ہے۔ جب باوجود ایک امر مشترک کی طرف بلائے جانے کے وہ لوگ اپنی ہٹ پر قائم ہیں تو آیت نمبر ۶۸ سے ان کی خرابیاں شروع کی گئیں کہ مسلمان ان سے پرہیز کریں اور اس سلسلہ میں یہ بات واضح کر دی کہ بے ایمانی اور دھوکا دہی اہل کتاب کی ممتاز خصوصیات ہیں۔ اس خبث باطنی کا ظہور ان کے علم میں بھی ہو رہا ہے۔ مثل موسیٰ کی پیشین گوئی ان کی کتابوں میں موجود ہے۔ تمام انبیائے سابقین نے رسول اللہ ﷺ کے

ظہور کی پیشین گوئی کی ہے، مگر ان کی شرح و تفصیل میں یہی وہ خدع و فریب سے کام لے رہے ہیں اور اپنے انبیائے کرام پر اتہامات لگاتے ہیں۔ آیت نمبر ۹۴ تک یہی مضمون چلا گیا ہے۔ یہ لوگ ابراہیمی ملت اور اس کی خصوصیات پر بہت زور دے رہے ہیں اور ان کے اتباع و تقلید کے سب سے زیادہ مدعی ہیں، لیکن وہ یاد رکھیں کہ اگر انہیں ابراہیمی امتیازات و خصائص کی تلاش و جستجو ہے تو ان کا فرض ہے کہ وہ حج بیت اللہ کا ارادہ کریں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اہل کتاب کو حق کی جستجو نہیں، بلکہ مسلمانوں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں اور اپنے اعمال حیات سے اپنی تکذیب آپ کر رہے ہیں۔ آیت نمبر ۹۸ تک اسی پر بحث کی گئی ہے۔

گزشتہ آیات میں یہودیوں اور عیسائیوں کی خرابیاں تفصیل کے ساتھ بیان کی گئیں، اب مسلمانوں کو آیت نمبر ۹۹ سے حکم دیا جاتا ہے کہ ان تمام لوگوں سے فوراً اپنے تعلقات توڑ لو، مگر ساتھ ہی ساتھ اپنے تعمیری پروگرام کو بھی ہاتھ سے جانے نہ دو۔ داخلی اصلاح پر تمہاری توجہ مبذول ہو، تمام اختلافات کو یک قلم دور کر دو، کسی فرقہ بندی میں مبتلا نہ ہو، ورنہ یاد رکھو دنیا و آخرت میں اس تفریق کی وجہ سے برباد ہو جاؤ گے تمہیں جو خیر الامم کا لقب نوازش کیا گیا ہے، تو اس لئے کہ اختلاف کو دور کرو، تعلیم حقہ کی نشر و اشاعت میں سر بکف کوشش کرو اور اسلام کی آواز کو دنیا کے گوشہ گوشہ اور کونہ کونہ میں پہنچا دو۔ اگر تم نے اتحاد و یگانگت اپنے اندر پیدا کر لی اور تمہارا ہر افسر مجسمہ تبلیغ اسلام ہو گیا تو پھر تمہیں ایک لمحہ کے لئے بھی دشمنوں سے خوف نہ کرنا چاہئے، اس لئے کہ یہودیوں اور عیسائیوں میں ایسی خرابیاں موجود ہیں جن کی وجہ سے وہ لازمی طور پر تمہارے سامنے آنے کی ہمت نہ کریں گے۔ یہ مضمون آیت نمبر ۱۱۹ پر ختم ہوتا ہے۔

آیت نمبر ۱۲۰ سے نمبر ۷۸ تک غزوہ احد کا تذکرہ ہے، اس کے مختلف نتائج و ثمرات پر بحث کی ہے، صحابہ کے شبہات کا جواب دیا ہے، اس کے حقائق مستورہ کو بے نقاب کیا ہے اور بصائر و حکم کو منصفہ شہود پر جلوہ افروز کیا ہے۔ جنگ کے اصول و ضوابط بیان کئے ہیں، قوموں کی تنظیم و تشکیل کے قوانین پر روشنی ڈالی ہے، ان کے عروج و زوال کے مسائل پر گفتگو کی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ کفار و منافقین کے تعلقات مسلمانوں کو اپنی فتح و کامرانی کے نتائج صالح سے کس طرح محروم کر دیتے ہیں۔

ہم یہ پہلے بتا چکے ہیں کہ سورۃ آل عمران کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں میں ان فضائل و کمالات کو پیدا کیا جائے جن کی بنا پر وہ تمام عیسائی ممالک پر قابض ہو جائیں اور ہر جگہ صلیب کے بجائے ہلال لہراتا ہوا نظر آئے۔ اس لئے آیت نمبر ۱۷۹ سے یہودیوں کی خرابیاں بتادی جاتی ہیں کہ مسلمانوں کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ ان تمام بد اخلاقیوں سے پرہیز کریں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان کی تمام باتیں خراب نہیں ہیں۔ اس لئے آیت نمبر ۸۷ تک اچھی اور بری باتوں کو کھول کھول کر کے دکھا دیا کہ ان اعمال سے فرزند ان اسلام الگ رہیں اور ان باتوں پر عمل کریں۔ آیت نمبر ۱۸۹ سے ان خصائص و امتیازات کو بیان کیا جن کا کسب و حصول ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے اور جن سے تمسک و اعتصام فوز و کامرانی کا ذمہ دار و کفیل، ان میں سے آخری چیز یہ بتائی: اَصِدُّوْا صَابِرُوْا وَاٰبٰطُوْا اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ اور اسی پر سورۃ کو ختم کر دیا۔



## باب نمبر ۱ الوہیت مسیح

### نصاری کی غلط کاری

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ اَلَمْ ۙ اِنَّ اللّٰهَ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۝

”اللہ وہ ذات ہے جسکے سوا کوئی معبود نہیں وہ ہمیشہ زندہ رہے گا، تھامنے والا ہے۔“

حروف مقطعات اور دوسری آیت کی تفسیر پر ہم نے اپنی کتاب الخلافۃ الکبریٰ میں مفصل بحث کر دی ہے اس کی جانب رجوع کیجئے، البتہ یہ سمجھ لیجئے کہ دونوں سورتوں کی ابتداء میں ایک ہی قسم کے حروف مقطعات تحریر کئے گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہودی اور عیسائی ایک ہی سلسلہ کی دو متصل کڑیاں ہیں۔ دونوں کے سامنے ایک ہی چیز پیش کی گئی ہے اور دونوں کو ایک ہی رنگ پر لانا منظور ہے۔

عیسائی اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دائرہ نبوت صرف بنی اسرائیل تک محدود تھا۔ چنانچہ جس وقت انہوں نے اپنے بارہ شاگردوں کو بیرون نجات میں منادی کے لئے بھیجا تو انہیں حسب ذیل ہدایت کی: ”غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا، بلکہ بنی اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا“ (متی ۱۰: ۶، ۵) مگر ان لوگوں نے سب سے پہلی غلطی یہی کی کہ یہودیوں کے علاوہ یونانیوں کو بھی عیسائیت کے دائرہ میں داخل ہونے کی دعوت دینا شروع کر دی، مگر یونانیوں نے ان کی شدت سے مخالفت کی۔ ان پر کامیابی حاصل کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی، اب مبشرین ودعاۃ عیسویت کو اس امر کی فکر دامن گیر ہوئی کہ عیسوی قانون کی ایسی خصوصیات بیان کی جائیں جن کی بنا پر وہ ایک ممتاز حیثیت اختیار کر لے اور یونانی عقائد و یقینیات کے مطابق واقع ہو، تاکہ وہ بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تسلیم کر لیں۔

حضرت موسیٰ کی شریعت میں ابن اللہ یا خدا کی اصطلاح پہلے سے موجود تھی جس کے معنی ہماری زبان میں محبوب الہی کے ہیں، زبور میں ہے: میں نے تو کہا کہ تم الہ ہو اور تم سب حق تعالیٰ کے فرزند ہو (زبور ۶: ۲۸) جس وقت حضرت مسیح کو یہودیوں نے سنگسار کرنے کی دھمکی دی تو انہوں نے ان سے دریافت کیا کہ میری زندگی تو تمام تر اعمال صالحہ میں گزری ہے تو پھر کس نیک کام کے عوض میں مجھے یہ سزا دے رہے ہو۔ بنی اسرائیل نے جواب دیا کہ اچھے کاموں کی وجہ سے نہیں بلکہ

اس لئے کہ تم اپنے آپ کو خدا کہتے ہو، اس پر حضرت عیسیٰ نے فرمایا: کیا تمہاری شریعت میں یہ نہیں لکھا ہے کہ میں نے کہا کہ تم خدا ہو، جبکہ اس نے انہیں خدا کہا جن کے پاس خدا کا کلام آیا، آیا تم اس شخص سے جسے باپ نے مقدس کر کے دنیا میں بھیجا ہے کہتے ہو کہ تو کفر بکتا ہے، اس لئے کہ میں نے کہا میں خدا کا بیٹا ہوں (یوحنا ۱۰: ۳۴ تا ۳۶)

نصاری نے اس اصطلاح سے فائدہ اٹھا کر یہ دعویٰ کر دیا کہ موسوی شریعت کے احیاء و تجدید کے لئے جس قدر انبیاء و رسل بھیجے گئے ہیں ان کو مجازی معنی میں ابن اللہ کہا جاتا تھا اور عیسیٰ علیہ السلام جیسی پاکباز ہستی پر یہ افترا پر دازی کی کہ وہ حقیقی معنی میں اپنے آپ کو ابن اللہ کہتے تھے: سبحانک ہذہ بتان عظیم۔

اور انہوں نے دیکھا کہ الواحد لا یصدر عنہ الا الواحد کو یونانی بطور اصول موضوعہ تسلیم کرتے ہیں اور اس لئے ان کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عقل اول کو پیدا کیا، اس نے عقل ثانی کو اور یہ سلسلہ بڑھتا گیا تا آنکہ عقل عاشر پیدا ہوئی، زمین و آسمان اور تمام کائنات اسی کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ عیسائیوں نے اس قاعدہ کو تسلیم کر کے اس پر اتنا اور اضافہ کیا کہ صادر اول کی روح حضرت عیسیٰ میں حلول کر گئی ہے، اس لئے وہ حقیقت میں ابن اللہ ہیں۔

یہ تو ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اس سورت میں عیسائی مخاطب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں سب سے پہلے الوہیت مسیح کے عقیدہ کو غلط ٹھہرایا۔ اللہ لا الہ الا ہو کا مفہوم یہی ہے کہ ہر جگہ اللہ ہی کار ساز ہے، تثلیث کا عقیدہ غلط ہے اور حی و قیوم سے اس طرف اشارہ کیا کہ کائنات عالم کی حیات محض ان اسمائے الہیہ کے فیض عمومی کا نتیجہ ہے۔

## نزول قرآن

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَأَنزَلَ التَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ ۚ ﴿١٠﴾ مِّن قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَأَنزَلَ الْفُرْقَانَ ۚ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۚ وَاللَّهُ عَزِيزٌ ذُو انتِقَامٍ ﴿١١﴾

”تم پر ضرورت کے مطابق ایسی کتاب اتاری جو ان کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے جو اس سے قبل تھیں اور پہلے لوگوں کی ہدایت کے لئے تورات اور انجیل کو اتارا اور فرقان نازل کیا، بیشک جنہوں نے اللہ کی آیتوں کا انکار کیا ان کے لئے سخت عذاب ہے اور اللہ زبردست بدلہ لینے والا ہے۔“

عیسیٰ علیہ السلام کے بعد صدیوں تک کوئی نبی نہ آیا۔ اس زمانہ میں لوگوں نے مذاہب کو بالکل بدل ڈالا اور ہر طرف جہالت کی تاریکی چھا گئی۔ عین یاس و قنوط اور بد عملی و بطالت کے وقت اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کو نازل کیا کہ توحید کی نشر و اشاعت ہو، تہذیب اخلاق کا فرض سرانجام پائے اور دنیا میں جس قدر غلط عقائد و مہینیات رواں چا گئے ہیں، ان کا ایک قلم استیصال ہو۔

لیکن اس کے سوا نزول قرآن کا ایک اور بھی مقصد تھا۔ کتب سابقہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے متعلق پیشین گوئیاں موجود تھیں، جن کا مصداق اب تک اس زمین کی پشت پر ظاہر نہ ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت

عمومی کی بنا پر اس بزرگ ترین انسان کو کامل چھ سو سال کے بعد بھیجا، جو دعائے خلیل اور نوید مسیحا کو اپنی شخصیت کبریٰ میں لئے ہوئے تھا اور اس طرح آپ کے ظہور اقدس نے ان الہامی کتابوں اور ان کے لانے والوں کی تصدیق و توثیق کر دی۔ قرآن حکیم نہ صرف ان صد اقتوں کو تسلیم کرتا ہے جو اسفار آسمانی میں موجود ہیں، بلکہ ان پر ایمان لانا بھی ضروری قرار دیتا ہے اور پھر ان سب حقائق و معارف الہیہ کو اپنے اندر جمع کر کے ان کی تکمیل کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نبی سے حسب ذیل وعدہ لیا گیا:

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الْبَنِي إِسْرَءِيلَ أَنِّي مَعَكُمْ بِمَا كَتَبْتُ عَلَيْكُمْ فِي تُورٍ وَأَنِّي كُنْتُ بِكُمْ رَسُولًا مُبْتَلًى ۖ فَلَمَّا تَوَسَّوْا بَيْنَكُمْ وَأَخَذْتُم مِّنْ دُونِهَا أَن تَعْلَمُوا أَنَّهُ هُوَ ۖ قَالُوا أَشْهَدُكَ ۖ قَالَ فَأَمَّا إِنَّا مِنَ الْبَشَرِ الْأَشْقَىٰ ۖ (آل عمران ۸۰)

“اور جب اللہ نے بنیوں سے عہد لیا کہ جو کچھ میں تم کو کتاب اور علم دوں پھر تمہارے پاس کوئی رسول آئے جو اس کتاب کی تصدیق کرتا ہو جو تمہارے پاس ہو تو ضرور اس کو مانو گے اور ضرور اس کی مدد کرو گے۔ کہا کیا تم نے اقرار کر لیا اور اس پر میرا ذمہ لے لیا، وہ بولے کہ ہم نے اقرار کیا، کہا کہ تم گواہ ہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔”

کتب الہیہ کا سلسلہ تو بہت لمبا ہے، مگر اس کی قریب ترین کڑیاں توراۃ اور انجیل ہیں۔ تورات دراصل عبرانی لفظ ہے جس کے معنی آگ نکالنے اور کسی چیز کے چھپا دینے کے آتے ہیں۔ اس کتاب کو تورات اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ پتھر سے آگ نکالنے کی مثال ہے۔ روشنی پیدا تو ہوتی ہے مگر تکلیف و مصیبت بھی برداشت کرنی پڑتی ہے۔ قرآن حکیم نے تورات کی نسبت یہ فرمایا ہے: **إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِيهَا هُدًى وَتُورًا** (المائدہ ۴۴) اور یہی الفاظ انجیل کی نسبت بھی بیان کئے گئے ہیں **وَأَنبِئْنَاهُ بِالنَّبِيِّينَ فِيهِ هُدًى وَتُورًا** (المائدہ ۴۶) تورات اور انجیل دونوں کی دونوں بنی اسرائیل کی ہدایت ورہ نمائی اور ان کے روحانی و جسمانی کمالات کے کسب و حصول کے لئے کافی تھیں اور یہ ہر کتاب الہی کی خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ جس قوم کی طرف بھیجی جائے اس کی تمام ضرورتوں کو پورا کر دے، مگر امتداد و وقت کی بنا پر اول تو ان میں تحریف لفظی و معنوی ہو گئی، دوسرے زمانہ نے اتنی ترقی کر لی کہ اب یہ دونوں کتابیں دنیا کی ہدایت کا فرض انجام نہیں دے سکتیں اور اب پھر ٹھیک وہ معنی صادق آجاتے ہیں جو ہم نے اوپر بیان کئے ہیں۔ اس وقت صرف قرآن ہی تمام اقوام عالم کی رہبری کر سکتا ہے کہ وہ ہر قسم کی تحریفات سے پاک ہے اور جس کی بابت لسان الہی یوں ارشاد فرماتی ہے۔ **يَكَادُ زَيِّتُهَا يُبْقِىٰ وَهِيَ تَكْذِبُ ۚ وَأَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلٍ مُّبَارَكَةٍ ۚ وَأَنزَلْنَاهُ فِي الْقُرْآنِ عَرَبِيًّا مُبَرَّكًا** (النور ۳۵) قریب ہے کہ اس کا تیل جل اٹھے اگرچہ اس کو آگ نہ بھی چھوئے، روشنی پر روشنی ہے۔

مگر ہر کتاب الہی کے ساتھ فرقان بھی نازل کیا جاتا ہے کہ لوگوں کی ناقدانہ قوت میں اور زیادہ نور و بصیرت پیدا ہو، جس سے وہ حق و باطل، نور و ظلمت اور کفر و اسلام میں تمیز کر سکیں۔ انہیں اپنی اصلاح کا خیال دامن گیر ہو اور اپنے اندر الہی علوم کے لئے تشنگی محسوس کریں۔ فرقان کا نزول اس لئے ہوتا ہے کہ لوگ اپنے آپ کو کتاب الہی کا محتاج

ودست نگر پائیں اور اس کی تلاوت کے لئے تیار ہوں، ورنہ اگر یہ ضرورت نہ پیدا کی جاتی تو اس کتاب سے فائدہ اٹھانے کے لئے کوئی تیار نہ ہوتا۔

اب جن لوگوں نے اپنے کائنات کو تباہ کر دیا اور فرقان سے صحیح طور پر کام نہ لیا، وہ اللہ کی آیات بینات کے منکر ہوئے اور انہوں نے اندرونی کفر کا ارتکاب کیا۔ کتاب الہی سے فائدہ اٹھانے کے لئے فرقان اور ضمیر کی حفاظت الزم اللہ ازم ہے کہ خارجی اثرات ضلالت اس آئینہ کو گرد آلود نہ کر دیں۔ جو لوگ فرقان کو برباد کر دیتے ہیں ان کی عقل ماری جاتی ہے اور وہ اس درجہ احمق بن جاتے ہیں کہ غلط اور صحیح میں تمیز نہیں کر سکتے۔ یہ وہ سزا ہے جو ان کو اس جرم کی پاداش میں اسی دنیا میں مل جاتی ہے اور ان کی مثال اس شخص کی سی ہو جاتی ہے جو آنکھوں پر پٹی باندھ کر پھر رہا ہو۔ اس کو سورج کی روشنی کچھ کام نہ دے سکے گی۔ اسی طرح فرقان برباد کرنے کی وجہ سے کتاب الہی ان کے حق میں بیکار رہتی ہے۔

قائدہ اور ربیع بن انس کے نزدیک فرقان سے مراد قرآن حکیم ہے اور اسی کو ابن جریر نے اختیار کیا ہے۔ اس اعتبار سے آیت مذکورۃ الصدر کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم نے توراۃ اور انجیل کو اہل کتاب کے لئے ہدیٰ و نور بنا کر بھیجا تھا، مگر انہوں نے ان کتابوں میں اس قدر تحریفات سے کام لیا کہ غلط اور صحیح کی تمیز ہی اٹھ گئی۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کو نازل کیا کہ حق و باطل میں فرق کر دے: **إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ يَتْلُو عَلَىٰ بَنِي إِسْرَآئِيلَ أَكْثَرَ الَّذِي هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۝ (النمل ۷۶)** بیشک یہ قرآن بنی اسرائیل پر اکثر ان باتوں کو ظاہر کرتا ہے جن میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔ دوسری جگہ آتا ہے: **وَ أَفْرَأَيْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيِّئًا عَلَيْهِ (المائدہ ۴۸)** اور ہم نے تم پر برحق کتاب اتاری ہے جو سب اگلی کتابوں کو سچا بتاتی ہے اور ان کی محافظ ہے۔

### قطعی فیصلہ

**إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْفَىٰ عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ۝ هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ ۚ لَآ إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝**

”بیشک زمین و آسمان میں سے کوئی چیز اللہ سے چھپی ہوئی نہیں، وہی ہے جو ماں باپ کے پیٹ میں جیسی چاہتا ہے صورت بناتا ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی زبردست حکمت والا ہے۔“

زمین و آسمان کی کوئی چیز بھی اللہ سے مخفی نہیں۔ وہی خوب جانتا ہے کہ کون شخص روح تعلیم اور حقیقت اعمال کا پابند ہے اور کس نے اپنے فرقان کو برباد کر دیا ہے۔ اس کی قدرت تو اتنی وسیع ہے کہ رحم مادر میں بھی انسانوں کی صورت بناتا ہے۔ پس جب حالت یہ ہے کہ ہر جگہ اسی کی ذات کار فرما ہے اور وہ عزیز ہے تو وہ یقیناً ان لوگوں کو سزا دے گا جو اس کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور فرقان کو برباد کر دیتے ہیں۔ البتہ ان کی سزائیں جو اس وقت تاخیر ہو رہی ہے، تو یہ کسی نہ کسی حکمت اور مصلحت پر مبنی ہے۔

ان آیات سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا نہیں بن سکتے، کیونکہ ان پر بہت سی باتیں چھپی کی چھپی ہی رہ گئیں۔ مرقس میں ہے: ”دوسرے دن جب وہ بیت عنیاہ سے نکلے اس کو بھوک لگی اور دور سے انجیر کا ایک درخت جس میں پتے تھے دیکھ کر گیا کہ شاید اس میں کچھ پائے مگر جب اس کے پاس پہنچا تو پتوں کے سوا کچھ نہ پایا کیونکہ انجیر کا موسم نہ تھا۔“ (مرقس ۱۱: ۱۳-۱۴) انجیل متی میں ایک جگہ خود ان کا اعتراف موجود ہے: ”لیکن اس دن اور اس گھڑی کی بابت کوئی نہیں جانتا، نہ آسمان کے فرشتے نہ بیٹا، مگر باپ۔“ (متی ۲۳: ۳۴)

ابن جریر نے ان تمام آیات کے شان نزول میں ایک طویل روایت بیان کی ہے جس کا مفاد یہ ہے کہ ایک مرتبہ چند نصاریٰ دربار رسالت میں حاضر ہو کر اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخانہ الفاظ استعمال کرنے لگے۔ آپ نے ان لوگوں کے سامنے حسب ذیل حقائق پیش کئے:

(۱) اولاد ہمیشہ اپنے والد کے مشابہ ہوا کرتی ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ زندہ ہے اس پر موت طاری نہ ہوگی، حالانکہ عیسیٰ بن مریم ضرور کسی نہ کسی روز وفات پائیں گے۔

(۳) خداوند قدوس ہر چیز کا محافظ اور رازق ہے، عیسیٰ ایسا نہیں کر سکتے۔

(۴) اللہ پر کوئی چیز مخفی نہیں اور ابن مریم کو صرف وہی باتیں معلوم ہیں جو ان کو بتادی گئی ہیں اور بس۔

(۵) عیسیٰ کی صورت رحم مادر میں بنائی گئی اور اللہ ان تمام امور سے پاک ہے۔ ان تمام حقائق کو ان لوگوں نے تسلیم کیا مگر الوہیت مسیح کے عقیدہ کو خیر باد نہ کہہ سکے پھر جو لوگ ان بدیہی مقدمات کے بعد بھی اپنی غلط بات پر قائم رہیں وہ کیسے عذاب الہی سے بے خوف ہو سکتے ہیں۔

## تقسیم کتاب

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ ۖ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ ۗ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ ۚ كُلٌّ مِّنْ عِندِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ ①

”وہی ہے جس نے تم پر یہ کتاب اتاری جس میں سے بعض آیتیں محکم ہیں کہ وہی اصل کتاب ہیں اور دوسری متشابہ تو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ تو قرآن کی متشابہ آیتوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں کہ فساد پیدا کریں اور ان کے اصل مطلب کی ٹوہ لگائیں، حالانکہ اللہ کے سوا ان کا مطلب کسی کو معلوم نہیں اور جو لوگ علم میں بڑی پایا گاہ رکھتے ہیں وہ تو اتنا ہی کہ کر رہ جاتے ہیں کہ ان پر ہمارا ایمان ہے۔ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے اور وہی سمجھتے ہیں جن کو عقل ہے۔“

اس میں شک نہیں کہ محکم و متشابہ کی شرح و تفصیل میں اہل علم باہم مختلف ہیں متشابہ کے متعلق جابر بن عبد اللہ شعبی اور سفیان ثوری کی یہ رائے ہے کہ: ”مالم یکن لاحد الی علمہ سبیل“، ”کسی شخص کو اس کا علم نہیں۔ عبد اللہ بن مسعود، قتادہ، ربیع اور ضحاک محکم کو نسخ اور متشابہ کو منسوخ قرار دیتے ہیں۔ لیکن محقق علماء کی راہ ان سب سے جداگانہ ہے۔ بہتر ہے کہ پہلے ان الفاظ کے معانی سامنے آجائیں تاکہ اصل حقیقت پر دے میں نہ رہے۔ محکم کا مطلب ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: متضام المعنی واضح الدلالة قائم بنفسه لایحتاج ان یرجع فیہ لی غیرہ“، ”اس کے معنی اس قدر واضح اور کھلے ہوں کہ کسی دوسری جانب رجوع کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو“۔ ”روح المعانی میں ہے: واضحه المعنی ظاهرة الدلالة محكمة العبارة۔ نحاس اور ابن عطیہ کی رائے ہے: المحکم ما کان قائماً بنفسه لایحتاج الی ان یرجع فیہ لی غیرہ۔

ایک اور جگہ یہ بیان کیا گیا ہے: واضح المراد کہ سامع راہتاویل حاجت نمی افتد۔ ان تمام الفاظ سے معلوم ہو گیا کہ محکم ان تمام آیات کو کہتے ہیں جو اپنی مراد آپ واضح کرتی ہوں، ان میں کسی قسم کی تاویل کی گنجائش نہ ہو۔ ان کا فہم و ادراک آسان و سہل تر ہو، ان کے لئے کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہ پڑے۔ اس قسم کی تمام آیات ام لکتاب ہیں، یہی اصل و اساس ہیں اور انہی پر تعلیمات الہیہ کا دار و مدار ہے۔ سعید بن جبیر کہتے ہیں: هن ام الكتاب لانهن مکتوبات فی جیبہم الكتب، ان کو ام الكتاب اس لئے کہتے ہیں کہ جملہ صحائف و اسفار آسمانی میں ان کو بطور اصول موضوعہ کے تسلیم کیا گیا ہے۔

اس قدر تفصیل سے خود متشابہ کے معنی بھی واضح ہو گئے، یعنی ان کے معانی و مطالب معلوم کرنے کے لئے دوسری آیات کی جانب رجوع کرنا پڑتا ہے اور ان میں تاویلات مختلف کی گنجائش ہوتی ہے: یصدق بعضاً لا یدرک من نفس تلك الایة الا بالمراجعة الی آیات اخر۔ نحاس کہتے ہیں: المتشابہ ما یرجع فیہ لی غیرہ۔

## فطری طریق

دنیا میں جس قدر علوم و معارف موجود ہیں، اگر ان تمام کی تحلیل و تفرید کی جائے تو ان میں دو چیزیں ممتاز نظر آئیں گی جن پر تمام مباحث علمیہ کا دار و مدار ہے اور جو ہر علم اور کتاب کی حقیقی اور فطری تقسیم ہوگی اور وہ یہ ہیں: (الف) بدیہی: جس کا فہم و ادراک ہر ایک شخص کے لئے آسان و سہل ہو اور جس کے لئے دلیل و حجت کی ضرورت نہ پڑے۔

(ب) نظری: بدیہی مقدمات کو ترتیب دینے کے بعد اس کی حقیقت مستورہ بے نقاب ہو۔ تعلیم دینے کا صحیح اور فطری طریق یہی ہے کہ ابتداء میں طالب علم کے سامنے بدیہیات کو پیش کیا جائے، جب یہ مقدمات اس کے ذہن میں راسخ ہو جائیں اور اس کی قابلیت و استعداد ترقی کر جائے تو نظریات کی طرف اس کی عنان توجہ پھیر دی جائے۔ اس قانون کی پابندی سے طالب علم کی نشو و نما اور تربیت بہترین طریق سے ہوگی۔ اور اگر کوتاہ بینی اور کج فہمی

کی وجہ سے پہلے نظریات کو اس کے سامنے پیش کیا گیا تو اس کی تمام تعلیم اکارت جائے گی اور اس پر کوئی ثمرہ مرتب نہ ہو گا۔ یہی دو اصول ہر جگہ جاری و ساری نظر آئیں گے۔ کوئی علم ایسا نہیں جس میں ان اصول کی پابندی نہ کی گئی ہو اور یہی وہ چیزیں ہیں جن کی جانب آیت مذکورۃ الصدر نے ہماری راہ نمائی کی ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ قرآن کی تمام آیات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(۱) محکمات۔ جن کو آپ بدیہیات سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہی اصل و اساس ہیں اور انھی پر تمام تعلیمات کا دار و مدار ہے۔

(۲) متشابہات۔ جن کے لئے دوسرا لفظ نظریات کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔

### فیصلہ کن راہ

قرآن میں بحث و نظر کا صحیح طریق یہی ہے کہ ابتدا میں محکمات کو لیا جائے، جب ان میں درخور وافی حاصل ہو جائے، پھر متشابہات کی طرف توجہ ہو، مگر جن لوگوں کے دلوں میں ضلالت و گمراہی اور بغی وعدوان کے جذبات خبیثہ مخفی ہوتے ہیں وہ اس راہ حق و صراط مستقیم سے گریز کر کے سب سے پہلے متشابہات میں گفتگو شروع کر دیتے ہیں۔ اس غلط راستہ کو اختیار کرنے سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ:

(الف) لوگوں کے قلوب و اذہان کو پریشان کر کے تشویش و اضطراب میں ڈال دیں۔ جن عقائد و اخلاق کو وہ اب تک درست تسلیم کرتے تھے، انہیں غلط معلوم ہونے لگیں۔ ایک آیت کا مفہوم دوسری کے خلاف کر کے یہ بتا دیں کہ قرآنی آیات میں اختلاف و نقیض ہے۔ اصول و کلیات سے الگ ہو کر اپنی رائے سے قرآن کی آیات کا جدا گانہ مطلب قرار دیں۔ شک و اشتباہ پیدا کر کے لوگوں کے قوائے عملیہ کو بیکار کر دیں اور اس طرح بتدریج ان میں دین حق سے انحراف کا جذبہ فاسقہ پختہ ہو۔

(ب) تاویل کہتے ہیں: رد الشی الی الغایۃ المرادۃ منہ علما کان اوفعلا۔ اپنے ارادے کے مطابق کسی چیز کو لوٹا دینا۔ متشابہات میں غور کرنے والوں کی عملی قوت تو بالکل برباد ہو چکی ہوتی ہے، اس لئے اب ان کی دماغی کاوشیں صرف اس بات تک محدود رہتی ہیں کہ احکام و اوامر الہیہ پر عمل کیے بغیر انہیں ان کے نتائج و ثمرات سے آگاہی ہو۔ اپنی خواہشات نفسانیہ اور عقائد باطلہ کی تائید قرآنی آیات سے تلاش کرتے ہیں۔ محکمات کو چھوڑ کر صرف متشابہات ہی پر حصر کرتے ہیں اور روشن اور واضح باتوں کو ترک کر کے محض الفاظ کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔



## ایک مثال

ہم اس تمام بحث کو ایک مثال سے واضح کرتے ہیں کہ کسی قسم کا حجاب باقی نہ رہے۔ گزشتہ آیت میں جس اصول کی طرف ہماری راہ نمائی کی گئی ہے، اس سے حق و باطل میں بآسانی تمیز ہو سکتی ہے۔ عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں اور اس دعویٰ کی تائید میں وہ قرآن کی ان آیات سے استدلال کرتے ہیں جن میں ان کو کلمۃ اللہ اور روح اللہ کہا گیا ہے:

إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَكَلِمَتُهُ ۖ أَلْقَاهَا إِلَىٰ مَرْيَمَ وَزُوْجُ مِنْهُ (النساء ۱۷۱) ”عیسیٰ اللہ کے رسول اور اس کا کلمہ ہیں جن کا مریم کی جانب القا ہوا اور اس کی روح اللہ اور کلمہ اللہ کے الفاظ قرآن نے کسی اور نبی کے لئے استعمال نہیں کئے، اس لئے وہ ابن اللہ ہیں۔

ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ اللہ ہونے کے لئے کن امتیازات و خصوصیات کا ہونا ضروری ہے؟ اس کے لئے صرف ماقبل کی آیت کی جانب رجوع کر لینا کافی ہے جس میں یہ دو باتیں بیان کی گئی ہیں:

(الف) ان اللہ لایخفی علیہ شیء عن الارض ولا فی السماء۔ زمین و آسمان کی کوئی چیز اس پر مخفی نہیں۔

(ب) هو الذی یصور کم فی الارحام کیف یشاء۔ وہ رحم مادر میں اپنی مرضی کے مطابق بچہ کو صورت بخشتا ہے۔

اب ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں ان صفات کو تلاش کرتے ہیں تو انہیں ان سے یکسر خالی پاتے ہیں۔ تم پہلے پڑھ آئے ہو کہ انجیل لینے کے لئے وہ ایک درخت کی طرف بھاگے گئے تو انہیں وہاں پتوں کے سوا کچھ نہ ملا، کیونکہ انجیل کا موسم نہ تھا۔ وفد نجران نے یہ خود تسلیم کیا کہ وہ مریم کے پیٹ میں ایک مدت تک رہے، اس لئے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ حضرت عیسیٰ عام انسانوں کی طرح ایک انسان ہیں اور بس۔

یہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن حکیم نے کلمۃ اللہ اور روح اللہ کے الفاظ ان کے لئے استعمال کئے ہیں، مگر گزشتہ آیات کو پیش نظر رکھنے کے بعد یہ ماننا پڑے گا کہ یہ الفاظ متشابہات میں داخل ہیں، اس لئے ان کے وہی معنی لئے جائیں گے جو حکمت کو سامنے رکھ کر واضح ہوں گے۔ اب ہم قرآن حکیم کو دیکھتے ہیں تو وہ بآنگ دہل اس عقیدہ کی ناقابل تاویل الفاظ میں تردید کرتا ہے۔ ایک جگہ آتا ہے: لَنْ يَسْتَنْكِفَ الْمَسِيحُ أَنْ يَكُونَ عَبْدًا لِلَّهِ وَلَا الْمَلَائِكَةُ الْمُقَرَّبُونَ (النساء ۱۷۲) ”مسیح کو ہرگز اس امر میں عار نہیں ہے کہ وہ اللہ کا بندہ ہو، اور نہ ملائکہ مقربین کو“، دوسری جگہ آتا ہے: إِنَّهُ هُوَ إِلَّا عَبْدٌ أَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنَاهُ مَثَلًا لِّبَنِي إِسْرَءِيلَ (الزخرف ۵۹) ”بس عیسیٰ تو ایک بندہ ہے جس پر ہم نے فضل فرمایا اور ان کو ہم نے بنی اسرائیل کے لئے نمونہ بنایا۔“ سورہ مائدہ میں ہے: لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ وَمَا مِنْ إِلَهٍ إِلَّا إِلَهُ وَاحِدٌ (المائدہ ۷۳) بیشک وہ لوگ کافر ہوئے جنہوں نے کہا کہ اللہ تینوں میں کا ایک ہے، حالانکہ سوائے خدائے واحد کے اور کوئی معبود نہیں۔ ایک جگہ فرمایا: لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۖ وَقَالَ الْمَسِيحُ يَبْنِي إِسْرَءِيلَ اَعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ (المائدہ ۷۲) بیشک وہ لوگ کافر ہوئے جنہوں نے کہا کہ اللہ تو یہی مسیح بن مریم ہے، حالانکہ مسیح نے



بنی اسرائیل سے کہا تھا کہ میرے اور اپنے پروردگار اللہ کی غلامی کرو، آگے چل کر آتا ہے: مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ ۖ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۖ وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ ۖ كَانَا يَأْكُلَنِ الطَّعَامَ (المائدہ ۷۵) مسیح بن مریم سوائے رسول کے اور کچھ نہیں۔ بیشک ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں اور ان کی ماں صدیقہ تھیں، وہ دونوں کھانا بھی کھاتے تھے۔

قیامت کی گفتگو کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: عَآزَنْتُ فَكُنْتُ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِ وَأَمَّا إِلَهُيِنَّ مِنْ دُونِ اللَّهِ ۖ قَالَ سُبْحَانَكَ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي ۖ بِحَقِّ (المائدہ ۱۱۶) اے عیسیٰ! کیا تم نے لوگوں سے یہ بات کہی تھی کہ اللہ کے سوا مجھے اور میری ماں کو خدا بنا لو، وہ فوراً عرض کریں گے۔ خداوند! تیری ذات ان چیزوں سے پاک ہے، میری طاقت نہیں کہ وہ بات اپنی زبان سے نکالوں جس کا مجھے حق نہیں۔ ”سورہ مریم میں کس قدر صاف الفاظ میں الوہیت مسیح کا انکار کیا۔ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَنُ وَلَدًا ۚ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا ۖ تَكَادُ السَّمُوتُ يَنْفَطَرْنَ مِنْهُ وَتَتَنَشَّقُّ الْأَرْضُ وَتُخَرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۚ أَنْ دَعَا لِلرَّحْمَنِ وَلَدًا ۚ وَمَا يَنْبَغِي لِلرَّحْمَنِ أَنْ يَتَّخِذَ وَلَدًا ۚ إِنَّ كُلَّ مَنْ فِي السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا لَاقِيَ الرَّحْمَنَ عَبْدًا ۚ (مریم ۳۸ تا ۹۳) اور کہتے ہیں کہ رحمن اولاد رکھتا ہے، تم ایسی سخت بات لائے کہ کچھ عجب نہیں اسکی وجہ سے آسمان پھٹ پڑیں، اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر پڑیں کہ انہوں نے رحمن کے لئے فرزند ثابت کیا، حالانکہ رحمن کی یہ شان نہیں کہ بیٹا بنائے۔ آسمان اور زمین میں کوئی چیز نہیں جو رحمن کے حضور میں غلام بن کر نہ آئے۔ ”اسی ذیل میں اس آیت کو بھی فراموش نہ کرنا چاہئے: لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ أَنْ يُنْزِلَ إِلَيْكُمُ الْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۖ وَآمَنَ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَبِينًا ۖ وَ لِلَّهِ مُلْكُ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۖ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ۖ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (المائدہ ۷۱) وہ یقیناً کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ ہی مسیح بن مریم ہے۔ کہو کس کو اللہ کے مقابلہ میں کچھ بھی اختیار ہوا۔ جب اللہ نے مسیح ابن مریم اور اس کی ماں اور ان سب کو جو زمین میں ہیں، ہلاک کرنے کا ارادہ کیا اور آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اور جو ان کے درمیان ہے اللہ ہے کے لئے ہے، وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

نتیجہ

قرآن حکیم کی یہ تصریحات تمہارے سامنے ہیں، ان کو پڑھو، ان آیات کا ایک ایک لفظ الوہیت مسیح کی صاف صاف تردید کرتا ہے، یہ الفاظ کسی دور از کار تاویل کے بھی متحمل نہیں ہو سکتے۔ قرآن نے بتا دیا کہ مسئلہ الوہیت میں بدیہیات و محکمات یہی آیات بینات ہیں، اس لئے کلمۃ اللہ اور روح اللہ کو ان محکمات ہی پر عرض کر کے ان کے ایسے معنی لینے پڑیں گے جو کسی طریق سے بھی ان اصول سے مختلف نہ ہوں۔ ان آیات کی بنا پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو خدا ابن سکتے ہیں اور نہ خدا کے بیٹے، اس لئے وہ انسان ہیں اور دائرۃ انسانیت میں داخل اور ان کو خدا بنانا ضلالت و گمراہی، بغی و عدوان اور متشابہات کی پیروی ہے۔ فہل من مدکر۔

## رجوع الی المقصود

یہ بحث ضمنتیج میں آگئی تھی۔ اب ہم پھر اصل کلام کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اوپر کی تقریر کو پھر ایک مرتبہ دیکھ جائیے، ہم نے محکم و متشابہ کی جو معنی بیان کئے ہیں، اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ متشابہات کے مطالب و معانی نہ صرف اللہ تعالیٰ کو معلوم ہیں بلکہ راسخین فی العلم کو بھی خدائے قدوس ان کا علم نوازش فرما دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ان ارباب فضل و کمال کو بھی ان کا علم نہ ہو تو ان متشابہات سے نوع انسانی کی ہدایت ورہ نمائی کا مقصد نہیں حاصل ہو سکتا۔ قرطبی کہتا ہے کہ ابن عباس الراسخون کو اللہ پر معطوف مانتے تھے یعنی یہ لوگ بھی متشابہ کی تاویل سے واقف ہیں۔ ابن عباس کی نسبت تمہیں خود معلوم ہے کہ لسان نبوت نے ان کے لئے یوں دعا کی تھی، جس کو بخاری نے نقل کیا ہے: اللهم فقهه فی الدین وعلیہ التاویل، خداوند! اس کو دین کی سمجھ اور تاویل کا علم نوازش فرما۔ مجاہد کہتے ہیں: عرضت البصیف علی ابن عباس من اولہ الی اخرہ، اقفہ عند کل ایۃ واسالہ عنہا وکان یقول انامن الراسخین فی العلم الذین یعلمون تاویلہ۔ ”میں نے ابن عباس کو تمام قرآن اول سے آخر تک سنایا۔ ہر ایک آیت کے متعلق میں ان سے سوال کرتا تھا اور وہ اپنے آپ کو راسخین فی العلم میں شمار کرتے تھے جو آیات قرآنی کی تاویلات سے واقف ہیں۔“ عبد اللہ بن مسعود کہتے ہیں: مافی کتاب اللہ الا وانا اعلم فیما ذلزلت۔ ”قرآن میں ایسی کوئی آیت نہیں، جس کے نزول کا سبب مجھے معلوم نہ ہو۔“ ابو عبد الرحمن السلمی کہتے ہیں: حدثنا الذین کانوا یقرؤنا القرآن عثمان بن عفان وعبد اللہ بن مسعود وغیرہما انہم کانوا اذا تعلبوا من النبی ﷺ عشا، آیات لم یجاوزوا حق یعلموا ما فیہا من العلم والعمل۔ ”عثمان، عبد اللہ بن مسعود اور دوسرے صحابہ کا یہ دستور تھا کہ جب وہ رسول اللہ سے دس آیات پڑھ لیتے تو جب تک وہ ان کے علم و عمل، حرام و حلال اور معانی و مطالب سے واقف نہ ہو لیتے آگے نہ بڑھتے۔“

مجاہد، ربیع بن انس، محمد بن جعفر ابن الزبیر اور ابن فورک کا یہی مذہب ہے کہ راسخین فی العلم بھی متشابہات کے مطالب سے واقف ہوتے ہیں اور اسی کو امام احمد بن حنبل، ابن قتیبہ، ابوسلیمان الدمشقی اور ابن تیمیہ نے ترجیح دی ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے سورۃ اخلاص کی تفسیر میں اس موضوع پر نہایت ہی معنی خیر و دل ویز گفتگو کی ہے۔ آخر میں فرماتے ہیں: واعلم ان من قال ان من القرآن کلاما لا یفہم احد معنایہ ولا یعرف معنایہ الا اللہ فانہ مخالف لاجماع الامۃ مع مخالفة الكتاب والسنة۔ ”جو شخص یہ کہتا ہے کہ قرآن میں کوئی ایسی ایک آیت بھی ہے جس کے مفہوم اور معنی کو اللہ کے سوا کوئی انسان نہیں جانتا تو وہ نہ صرف اجماع امت کی مخالفت کر رہا ہے بلکہ وہ کتاب و سنت سے بھی بہت دور جا پڑا ہے۔“

## خلاصۃ المرام

اس قدر تفصیل کے بعد آپ ایک اور حقیقت بھی سامنے لائیے۔ اسلام کی نسبت لیلہا کنہا رہا کہا گیا ہے، لم یجعل

لہ عوجا بھی اسی قرآن کے متعلق نازل ہوا ہے، پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قدر مذاہب و مشارب مختلفہ کیوں مسلمانوں میں پیدا ہو گئے؟ اس کا جواب مختصر الفاظ میں یہی دیا جاسکتا ہے کہ جس قدر گمراہ کن فرقے ہمیں دکھائی دے رہے ہیں ان کی گمراہی و ضلالت کے مجملہ اور اسباب و علل کے ایک سبب یہ بھی ہے کہ انہوں نے حکمت سے الگ ہو کر صرف تشابہات پر غور کرنا شروع کر دیا اور آہستہ آہستہ راہ حق سے منحرف ہوتے چلے گئے۔

اس تمام بحث کا خلاصہ یہ نکلا کہ ان ادا و امر و نواہی کے نتائج و عواقب نہ صرف اللہ ہے جانتا ہے بلکہ راسخین فی العلم بھی ان سے محروم نہیں رہے اور یہ درجہ علیا انہیں اس لئے ملتا ہے کہ وہ پہلے بدیہیات کو لیتے ہیں۔ جب ان میں انہیں رسوخ و کمال پیدا ہو جاتا ہے تو پھر تشابہات و نظریات کی جانب رجوع کرتے ہیں اور یہ راہ حق صرف وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جو رباب بصیرت ہوں اور عقل و ایمان سے بہرہ وافر رکھتے ہوں۔

### دعائے ہدایت

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً ۚ إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ ۝ رَبَّنَا آتِنَاكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيُؤْمِرَ لَا رَيْبَ فِيهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْوَعْدَ ۚ ۝

”اے ہمارے رب! اس کے بعد کہ تو ہم کو ہدایت دے چکا ہمارے دلوں میں کجی نہ پیدا کر اور اپنی سرکار سے ہم کو رحمت عطا فرما بیشک تو بڑا دینے والا ہے، اے ہمارے پروردگار! بیشک تو ایک دن جس میں کچھ شک نہیں ہے تمام لوگوں کو اکٹھا کرے گا۔ اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔“

ظاہر بات ہے کہ تشابہات میں گفتگو کرنا ہر ایک شخص کا کام نہیں، کیونکہ بسا اوقات ان میں بحث و نظر گمراہی و ضلالت کا سبب بن جاتی ہے اور بڑے بڑوں کے پاؤں یہاں آکر پھسل گئے ہیں۔ راسخین فی العلم بھی باوجود اپنے انتہائی فضل و کمال کے ضعف بشری اور نسیان و ذہول سے خالی نہیں۔ اس لئے ان کو خدائے قدوس کی جانب سے یہ تعلیم دی گئی کہ بار بار ان کی زبانوں سے یہ دعا نکلے: خداوند! ہم نے ابتدائی مدارج صحیح طریق سے طے کر لیے ہیں، حکمت ہمارے سامنے آچکی ہیں، اب آئندہ چل کر بھٹک نہ جائیں، علم و حکمت کے اعلیٰ ترین مسائل میں اس وقت تک غور کرنے کا ارادہ نہ کریں جب تک ہم ان کے سمجھنے کے قابل نہ ہوں اور ان کو بے سوچے سمجھے ماننے کے لئے تیار نہ ہوں۔ جس حد تک ہم خود بخود ترقی کر کے پہنچ سکتے ہیں وہاں تک تو کسی قسم کی مجروری نہ آئے اور جن حقائق عالیہ پر ہم اپنے قصور فہم کی وجہ سے قابو نہ پاسکیں، تو اپنی رحمت خاصہ سے ان کی سمجھ نوازش فرما، تو اندھوں کو آنکھیں دیتا ہے اور پیاسوں کو پانی پلاتا ہے اور تو ہی ہر چیز بخشنے والا ہے۔

ابوداؤد اور نسائی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ شب کے وقت بیدار ہوتے تو یوں دعا مانگتے: لا الہ الا انت سبحانک استغفرک لذنبی واسئلك رحمة، اللهم زنی علما، ولا تزغ قلبي بعد اذ هديتني وهب لي من لدنك رحمة انت الوهاب، ام سلمہ کہتی ہیں کہ اکثر رسول اکرم ان الفاظ میں دعا مانگا کرتے

تھے یا مقلب القلوب ثبت قلبی علی دینک۔

راستخیز فی العلم صرف اتنی ہی دعا پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ وہ اور زیادہ توجہ و انابت الی اللہ میں یوں عرض کرتے ہیں: خدا وند! اگر ہم سے پہلے کسی قوم کو تو نے کوئی علم نوازش کیا ہے تو اس سے بھی ہمیں سرفراز کی جیو، تاکہ اس روز ہمیں شرمسار نہ ہونا پڑے، جب تمام قومیں ایک میدان میں جمع ہوں گی اور ہم سے وہ آگے نکل جائیں گی، اس دن کے ہونے میں تو یقیناً کوئی شک و اشتباہ نہیں، اس لئے اس عزت سے ہمیں محروم نہ رکھ۔

تبائی کی وعید

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمْ وَقُودُ النَّارِ ۖ كَذَّابِ ۖ  
فِرْعَوْنَ ۖ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۖ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ۖ فَآخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ ۖ وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۖ

”بیشک جن لوگوں نے کفر کیا، اللہ کے مقابلہ میں ان کے مال اور ان کی اولاد ان کے ہر گز کام نہیں آسکتی اور یہی لوگ دوزخ کا ایندھن ہیں۔ ان کا حال فرعون والوں اور ان سے پہلے لوگوں کا سا ہو گا جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تو اللہ نے ان کے گناہوں پر ان کو پکڑا اور اللہ سخت عذاب والا ہے۔“

کتاب الہی سے فائدہ اٹھانے کا زرین اصول بتا دیا گیا، اب جو لوگ اس قاعدہ کو نظر انداز کر دیتے ہیں ان کے مال و اولاد میں سے کوئی چیز ان کے لئے کفارہ نہ بن سکے گی۔ ایک جگہ آتا ہے: وَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا وَتَزْهِقَ أَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُونَ ﴿۸۵﴾ (البقرہ ۸۵) پس ان کے مال اور ان کی اولاد تم کو تعجب میں نہ ڈالیں، بس اللہ چاہتا ہے کہ ان کی وجہ سے ان کو دنیا کی زندگی میں مبتلائے عذاب رکھے اور ان کی جان نکلے اور وہ کافر ہوں۔ اسی طرح دوسری جگہ فرمایا: لَا يَغْنُتُكَ تَغْلِبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ ﴿۸۶﴾ مَتَاعٌ قَلِيلٌ ۖ ثُمَّ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۸۷﴾ (آل عمران ۸۶ تا ۸۷) جو کافر ہیں ان کا ملکوں میں تصرف تجھے دھوکے میں نہ ڈالے، تھوڑا سا سامان ہے پھر ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ اور وہ بہت ہی بُری جگہ ہے۔ سورہ مریم میں آتا ہے: أَفَرَأَيْتَ الَّذِي كَفَرَ بِالْإِيمَانِ وَقَالَ لَاؤْتِيَنِي مَالًا وَلَدًا ۖ وَلَدًا ۖ أَطَلَعَ الْغَيْبَ أَمْ اِتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمَنِ عَهْدًا ۖ ﴿۸۸﴾ (مریم ۷۷ تا ۸۸) بھلا تم نے اسے بھی دیکھا جس نے ہماری آیات کا انکار کیا اور کہا کہ میں ضرور مال و اولاد دیا جاؤں گا۔ کیا وہ غیب پر مطلع ہو گیا ہے یا رحمن کے ہاں اس نے عہد لے رکھا ہے۔

جب کبھی یہ لوگ حق کے مقابلہ میں سر اٹھائیں گے وہیں کچل دیئے جائیں گے اور کبھی اسلام کے مقابلہ میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ چنانچہ ایسی قوموں کی تبائی کی تاریخ محفوظ ہے۔ فرعون والوں نے اپنے ضمیر کو برباد کر دیا۔ کتاب الہی کی پروانہ کی اور حق کو مٹانے کے لئے تیار ہو گئے، مگر نتیجہ یہ ہوا کہ خود ہی اپنا نام و نشان کھو بیٹھے۔ ایسے ہی جو بد بخت اسلام کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کریں گے اور فرعون کے نقش قدم پر چلیں گے، وہ بھی یقیناً تباہ ہو کر رہیں گے اور بحر ذخار کی موجیں ان کو ہضم کر جائیں گی۔

## غلبہ اسلام

قُلْ لِلَّذِينَ كَفَرُوا سِتْغَلِبُونَ وَتُخْشَوْنَ إِلَىٰ جَهَنَّمَ ۖ وَبِئْسَ الْبِهَادُ ۝

”جو لوگ کافر ہو گئے ان سے کہہ دو کہ عنقریب تم مغلوب ہو گے اور دوزخ کی جانب لوٹائے جاؤ گے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔“

یہود و نصاریٰ اور تمام مخالفین اسلام سے یہ کہہ دینا چاہئے کہ تم تعلیمات حقہ کو ترک کر چکے ہو، اس لئے تمہاری حکومت باقی نہیں رہ سکتی، تم عنقریب مغلوب ہو جاؤ گے اور مسلمانوں کی ماتحتی میں تمہیں زندگی بسر کرنی پڑے گی اور پھر مرنے کے بعد جہنم میں داخل ہونا پڑیگا۔ اس دنیا میں تمہاری مغلوبیت اس امر کی دلیل ہوگی کہ تم ضرور دوزخ کا ایندھن بنو گے اور اگر تمہیں یہ خیال ہو کہ مسلمان مفلس و نادار ہیں، قلت تعداد اور فقدان اسباب کی بنا پر تم سے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتے، تو اس واقعہ کا دیدہٴ عبرت سے مطالعہ کرو۔

## جنگ بدر

قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي مِثْلِ هَذِهِ الْأَيَّةِ ۖ فَمَتَّيْنِ الْغَنَّتَا ۖ فَمِثْلُ قَاتِلٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَأَخْرَىٰ كَافِرًا ۖ يَرَوْنَهُمْ مِثْلَيْهِمْ رَأَىٰ الْعَيْنِ ۖ وَاللَّهُ يُؤَيِّدُ بِنَصَرِهِ ۖ مَن يَشَاءُ ۖ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي الْأَبْصَارِ ۝

”ابھی تمہارے لئے دو فوجوں میں نمونہ ہو چکا ہے جو آپس میں گتھ گئیں، ایک فوج تو اللہ کی راہ میں لڑتی تھی اور دوسری کا فر تھی کہ مسلمانوں کو آنکھیں دیکھتے اپنے سے دو چند دیکھتے تھے اور اللہ اپنی مدد کا زور جس کو چاہے دیتا ہے، بیشک آنکھ والوں کے لئے اس میں بڑی عبرت ہے۔“

اس آیت میں جنگ بدر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ:

(الف) .... کی سورتوں میں ایک ایسی جنگ کی خبر دی گئی تھی جس میں مسلمان مظفر و منصور اور کفار ناکام و خاسر رہیں

گے: اَمْرِيَقُولُونَ نَحْنُ جَبِيْنُ مُنْتَصِرٌ ۝ سِيَهْزَمُ الْجَنْعُ وَيُولُوْنَ الدُّبُرَ ۝ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمْرٌ

۝ (القر ۴۴، ۴۶) اس جگہ ساعۃ سے مراد وہی شکست و ہزیمت کی گھڑی بھی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ

جب میدان بدر میں مسلمانوں کی فتح و نصرت کی دعا مانگ رہے تھے اور اللہ نے اس دعا کو شرف اجابت بخشا تو

آپ یہی آیت تلاوت کرتے ہوئے اپنے خیمہ سے باہر نکلے تھے: سِيَهْزَمُ الْجَنْعُ وَيُولُوْنَ الدُّبُرَ، بَلِ السَّاعَةُ

مَوْعِدُهُمُ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمْرٌ۔

(ب) .... جس وقت جنگ بدر ہوئی ہے مسلمان نہایت ہی کمزور و ناتواں، بے یار و مددگار اور بغیر کسی سامان و اسباب

حرب کے تھے اور کفار پوری شان و شوکت، بے انتہا سامان حرب اور عظیم الشان تعداد کے ساتھ مسلمانوں پر

حملہ آور ہوئے تھے۔ مگر باوجود ان تمام مخالف حالات کے فرزند ان اسلام ہی غالب رہے، پھر اس سے بڑھ کر

اور کونسا نشان صداقت ہو سکتا ہے۔

(ج).... اس جنگ کی پیشین گوئی خود اہل کتاب کے پاس موجود ہے: ”عرب کی بابت الہامی کلام، عرب کے صحرا میں تم رات کاٹو گے اے دوانیوں کے قافلو! پانی لے کے پیاسے کا استقبال کرنے آؤ، اے حیا کی سر زمین کے باشندو! روٹی لے کے بھاگنے والے کے ملنے کو نکلو کیونکہ وہ تلواروں کے سامنے سے، ننگی تلوار سے اور کھچی ہوئی کمان سے اور جنگ کی شدت سے بھاگے ہیں کیونکہ خداوند نے مجھ کو یوں فرمایا ہنوز ایک برس ہاں مزدور کے سے ایک ٹھیک برس میں قیدار کی ساری حشمت جاتی رہے گی اور تیر اندازوں کے جو باقی رہے قیدار کے بہادر گھٹ جائیں گے کہ خداوند اسرائیل کے خدا نے یوں فرمایا (یسعیاہ، ۳۱: ۱۲-۱۳) اس پیشین گوئی میں چند باتیں بیان کی گئی ہیں: بھاگنے والے سے مراد رسول اللہ ﷺ اور اس میں آپ کی ہجرت کی طرف اشارہ ہے۔

ہجرت کے دوسرے سال جنگ بدر ہوئی اور قیدار کی ساری حشمت جاتی رہی۔ قیدار کا لفظ کتاب مقدس میں صرف بنی اسمعیل پر بولا جاتا ہے۔

عرب کی بابت الہامی کلام سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس پیشین گوئی کے ایک ایک لفظ کا تعلق سرزمین عرب سے ہے۔ ان تمام دلائل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اس آیت میں جنگ بدر کا ذکر ہے۔ پس جو ارباب بصیرت قوموں کی ترقی و تنزل، عروج و زوال اور علو و تسفل کے اسباب و علل میں غور کیا کرتے ہیں ان کے لئے یہی غزوہ بدر عبرتوں اور بصیرتوں کی صد ہار اہیں کھول دیتا ہے کہ وہ ان بصائر و حکم کو آویزہ گوش بنائیں۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت مسلمانوں اور کافروں کا لشکر میدان جنگ میں صف آرا ہوا ہے تو مسلمان کافروں کو اور کافر مسلمانوں کو اپنے سے دو چند دیکھتے تھے۔ سورہ انفال کی تفسیر میں ہم نے اس پر بہت تفصیل سے بحث کی ہے ومن شاء التفصیل فلیدرج ثبہ۔ دنیانے یہ دیکھ لیا کہ اس پیشین گوئی کے الفاظ کس قدر جلد پورے ہو گئے اور مہاجرین و انصار کی جماعت کتنے ہی قلیل زمانہ میں قیصر و کسریٰ کے ممالک پر قابض ہو گئی۔ مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ یہ وعدہ ان کو اب بھی دیا جاتا ہے، اگر وہ سچے دل سے اب بھی اسلام کے پابند ہوں تو ضرور وہی غالب و قاهر رہیں گے: لا تھنوا ولا تحزنوا و اتمم الاعلون ان کنتم مؤمنین۔

اختلاف مقاصد

زَيْنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِصَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ  
وَالْأَنْعَامِ وَالْخَرْثِ ۚ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۗ وَاللَّهُ عِنْدَ أَحْسَنِ الْمَالِ ۝

”لوگوں کے لئے خواہشات کی محبت مثلاً بیویاں، بیٹے اور سونے اور چاندی کے ڈھیر اور نشان کئے ہوئے عمدہ گھوڑے اور مویشی اور کھیتی آراستہ کر دی گئی ہے یہ دنیا کی زندگی کی استعمالی چیزیں ہیں اور اللہ کے ہاں اچھا ٹھکانا ہے۔“

عیسائیوں اور دوسرے کفار و مشرکین کو دیکھئے تو یہی چیزیں ان کی زندگی کا نصب العین ہوں گی۔ پھر جن لوگوں کے یہ مقاصد ہوں وہ ان مسلمانوں کا کیا مقابلہ کر سکیں گے جو اپنی ہر چیز خدائے قدوس کے نام پر قربان کرنے کو تیار ہیں اور جب کبھی ان دونوں جماعتوں کا مقابلہ ہو گا تو مخالفین اسلام ان محبوبات و مالوفات کی وجہ سے کبھی بھی مسلمانوں پر غالب نہ آسکیں گے، کیونکہ انہیں ہر وقت ان چیزوں کے ضائع ہونے کا اندیشہ دامن گیر رہے گا۔ حالانکہ وہ ذرا غور سے کام لیں تو ان پر یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے گی کہ دنیا کی تمام چیزیں انسانی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے کافی نہیں۔

### فرزندان اسلام

قُلْ أُو۟سِبۡتُمۡ بِخَبِيرٍ مِّنۢ ذٰلِكُمْ ۖ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا۟ عِنۡدَ رَبِّهِمْ جَنَّٰتٌ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا۟ الْاَنْۡهَارُ ۚ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ۚ وَآَزَٰوُا۟ مِنْۢ مَّطۡہَرٍ ۚ وَرِضۡوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ ۚ وَاللّٰہُ یَصِیۡرُ بِالْعِبَادِ ۚ ۝۱۰۱ اَلَّذِیۡنَ یَقُولُوۡنَ رَبَّنَاۤ اِنَّاۤ اٰمَنَّا فَاغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوبَنَا وَنَنَا عَذَابَ النَّارِ ۝۱۰۲ اَلطَّٰغِیۡنَ وَالتَّٰغِیۡتِیۡنَ وَالتَّٰمَنِّعِیۡنَ وَالتَّٰسْتَفْغِیۡرِیۡنَ بِالْاَسۡحَادِ ۝۱۰۳

”کہہ دو کیا میں ان چیزوں سے بہتر بتاؤں، جو پرہیز گار ہیں، اللہ کے ہاں ان کے لئے ایسے باغ ہیں جنکے نیچے نہریں بہتی ہیں، اس میں ہمیشہ رہیں گے اور بیویاں صاف ستھری ہیں اور اللہ کی خوشنودی ہے، اور اللہ اپنے بندوں کو دیکھ رہا ہے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہم بے شک ایمان لائے پس تو ہمارے گناہ بخش دے اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچالے، صبر کرنے والے اور سچ بولنے والے اور حکم بردار اور خرچ کرنے والے اور پچھلی رات میں گناہ بخشوانے والے ہیں۔“

جو لوگ اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر تمام دنیاوی لذتوں کو قربان کرنے کو تیار ہیں، انہیں بدرجہا اشرف و اعلیٰ نعمتیں نوازش ہوں گی اور وہ ہر جگہ کامیاب و بامراد ہوں گے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ دونوں جماعتوں کے حالات و واقعات کو دیکھ رہا ہے، اس لئے ناممکن ہے کہ مخالف غالب ہو جائے۔ ارباب ایمان ہمیشہ اس طرح والہانہ و مضطربانہ دعا کرتے ہیں: خداوند ہماری زندگی کا جو نصب العین تو نے مقرر کر دیا ہے ہم بھی اسی کو اپنا مقصد حیات قرار دیتے ہیں، اگر اس کے پورا کرنے میں ہم سے غلطیاں ہوں تو معاف کی جیو۔ اور دنیا میں وہ ان امتیازات و خصائص کی بنا پر اپنے ابنائے جنس سے نمایاں ہوتے ہیں:

(۱) الطہرین: مقصد زندگی پر مر مٹنے والے اور تکالیف و مصائب برداشت کر کے اپنے اندر قوت و طاقت پیدا پیدا کرنے والے۔

(۲) الصّٰدقین: اخلاق صالحہ کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دینے والے، جو زبان سے کہیں اس کے پورا کرنے والے اور اس قدر ثبات قدم و استقلال والے کہ ہمیشہ ان کا قدم آگے ہی رہتا ہے پیچھے ہٹنے کا نام تک نہیں لیتے: وَالَّذِیۡنَ



جَاءَ بِالصَّدِيقِ وَصَدَّقَ بِهِ أُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ۝ لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۝ ذَلِكَ جَزَاءُ الْمُحْسِنِينَ ۝ يُكْفِرُ اللَّهُ عَنْهُمْ أَسْوَأَ الَّذِي عَمِلُوا وَيَجْزِيَهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ (الزمر ۳۴-۳۵) اور جو سچی بات لے کر آئے اور اس کو سچ جانا وہی لوگ پرہیز گار ہیں، ان کے پروردگار کے پاس ان کے لئے ہے جو وہ چاہیں، یہ نیکو کاروں کی جزا ہے، تاکہ اللہ ان سے برے اعمال دور کر دے جو انہوں نے کئے تھے اور ان نیک اعمال پر ان کو اجر عطا فرمائے جو وہ کرتے تھے۔ سورہ احزاب میں ہے: رَجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ (الاحزاب ۳۳) کچھ مرد ایسے ہیں کہ اس عہد میں سچے رہے جو انہوں نے اللہ سے کیا تھا۔

(۳) الْمُتَّقِينَ: اللہ تعالیٰ کا ہر حکم ماننے اور اس کی کامل فرماں برداری کے ساتھ ترقی کرنے والے۔

(۴) الْمُتَّقِينَ: اپنی دولت، اپنے تمام قوائے عملیہ اور اپنی ہر عزیز ترین متاع حیات اس کی راہ میں خرچ کرنے والے۔

(۵) السَّاعَتِينَ: بالاسرار: پھر وہ ان صفات جلیلہ پر فخر نہیں کرتے بلکہ اپنی اخلاقی و روحانی ترقی کے لئے تخلیہ میں عبادت کرنے والے اور خلوت میں اپنے اعمال و اخلاق کا احتساب کرنے والے۔ اپنی غلط کاریوں کو معین کرنے کے لئے بہترین وقت رات کا پچھلا حصہ ہوتا ہے اور ایک انسان کو یہ موقع حاصل ہوتا ہے کہ آئندہ ان کے مرتکب نہ ہونے کا خدا سے عہد غلیظ باندھ لے۔ جس طرح بارش سے کھیتی دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرتی ہے، اسی طرح رات کے آخری حصہ میں عبادت کرنا انسان کے فضائل و کمالات کو چار چاند لگا دیتا ہے۔

اسلام میں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج ابتدائی تعلیم کے قائم مقام ہیں، جب ایک مسلمان اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا آرزو مند ہو تو اس پر اولین فرض یہ عائد ہوتا ہے کہ وہ تہجد کا پابند بن جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے کبھی اس نماز کو ترک نہیں کیا۔ گویا اس طرح اشارہ کرنا مقصود تھا کہ جو لوگ دعوت و ارشاد کے فرض جلیل کو اپنے ذمہ لیتے ہیں، وہ فرائض عمومی کے علاوہ جن کو سب کے سب ادا کرتے ہیں ایک اور چیز بھی اپنے اوپر لازم کر لیں اور اس ذیل میں سب سے پہلے تہجد کی نماز آتی ہے۔ حدیث میں آتا ہے: یُنْزِلُ اللَّهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى فِي كُلِّ لَيْلَةٍ إِلَى سَبْعِ الدُّنْيَا حِينَ يَتَقَرَّبُ إِلَيْهِ ثَلَاثُ الدُّلَى الْخَيْرِ فَيَقُولُ هَلْ مِنْ سَائِلٍ فَاعْطِيهِ، هَلْ مِنْ دَاعٍ فَاسْتَجِبْ لَهُ، هَلْ مِنْ مُسْتَغْفِرٍ فَارْغِفْ لَهُ، ”ہر رات کے آخری ٹکٹ میں اللہ تعالیٰ آسمان دنیا پر نزول اجلال فرما کر اعلان کرتا ہے: کوئی سائل ہے کہ اس کو دوں، دعا کرنے والا کہ اس کی دعا کو مشرف اجابت بخشوں اور مغفرت کا طالب کہ اس کو بخش دوں۔“ اسی لئے حضرت عبد اللہ بن عمر کی عادت تھی کہ جب سحر ہوتی تو صبح تک دعا و استغفار میں مصروف رہتے۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: کُنَّا نَرَاهُ أَصْلَيْنَا مِنَ اللَّيْلِ أَنْ نَسْتَغْفِرَ فِي آخِرِ السَّحَرِ سَبْعِينَ مَرَّةً۔ جب ہم تہجد کی نماز پڑھ چکے تو ہمیں حکم دیا جاتا کہ طلوع صبح تک ستر مرتبہ استغفار کریں۔



## باب نمبر ۲

## دعوت اسلام

## فصل اوّل: نصاب تعلیم

## اساس عالم

نصاری کی سلطنت قائم ہے، حکومت کے بیچارے و متکبر کی وجہ سے وہ کسی نئی دعوت کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہ ہوں گے، اس لئے ان پر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ جب تک وہ اسلام کو قبول نہیں کریں گے کبھی عزت کی زندگی نہیں بسر کر سکتے اور ان کی حکومت جاتی رہے گی، مگر اس دھمکی دینے سے پہلے ان کے سامنے پھر ایک مرتبہ اس حقیقت کو پیش کیا جاتا ہے کہ کائنات ارضی و سماوی کی اساس و بنیاد ہی توحید و ربوبیت خداوندی ہے۔ اگر وہ الوہیت مسیح کے غلط عقیدہ کو ترک کر کے صرف ایک خدا کو تسلیم کر لیں تو ان کی دائمی سربلندی کا وعدہ دیا جاتا ہے اور یہی وہ نصاب تعلیم ہے جس کی جانب ان کو دعوت دی جاتی ہے:

شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ قَائِمًا بِالنَّقِصِطِ ۖ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿١٨﴾

اللہ گواہ ہے کہ اس کے سوا کوئی قابل عبادت نہیں اور فرشتے اور علم والے اگر وہ انصاف پر قائم ہوں تو وہ بھی گواہ ہیں کہ بجز اس کے کوئی معبود نہیں وہ زبردست حکمت والا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید پر تین دلائل پیش کئے ہیں:

(الف) اس کی تمام تعلیمات دیکھ جاؤ، ہر ایک کتاب الہی کی ورق گردانی کرو اور جملہ صحائف و اسفار آسمانی کا مطالعہ کرو، کہیں بھی توحید کے خلاف تعلیم نہ ہوگی بلکہ ہر جگہ یہی حکم دکھائی دے گا کہ خدائے واحد کی غلامی کرو۔

(ب) جس قدر انبیاء و رسل دنیا میں معبود ہوئے، ارباب کشف و الہام پیدا ہوئے اور جن لوگوں کو بھی ملائکہ الرحمن کے دیکھنے اور ان سے گفتگو کرنے کا موقع ملا ان سے دریافت کرو گے تو وہ بھی توحید کے حامی نظر آئیں گے۔

(ج) جتنے اہل علم و فضل اس کرہ ارضی پر موجود ہیں اگر وہ انصاف و حق پرستی کو ہاتھ سے نہ جانے دیں تو وہ بھی فقط توحید ہی کی جانب دنیا کو دعوت دیں گے۔

ان تمام کا قاطبہ یہی فیصلہ ہے کہ اللہ ہی عبادت کے لائق ہے۔ اب جو لوگ اس توحید کے خلاف کریں گے ان کو اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے کام لے کر ذلیل و رسوا کر دے گا، لیکن اس تباہی و بربادی میں وہ حکمت و داناتی اور نظام صالح کا ضرور خیال کرے گا۔

## صرف اسلام مطلوب ہے

إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ ۚ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوْتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَعِيًّا بَيْنَهُمْ ۖ  
وَمَنْ يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿۸۵﴾

”بیشک دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے اور ان لوگوں نے جن کو کتاب دی گئی تھی مخالفت نہ کی، مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس علم آچکا آپس کی ضد سے، اور جو کوئی اللہ کی آیتوں کا انکار کرے گا تو اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔“

تمام تعلیمات الہیہ، جملہ انبیاء و رسل، سب کے سب ارباب علم و فضل اور خود فطرت انسانی اس امر کی شاہد ہے کہ خدائے واحد ہی غلامی اور پرستش کے لائق ہے اور اس کو فقط توحید ہی مطلوب ہے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ اللہ کے نزدیک دین حق و صدق صرف اسلام ہے، قرآن حکیم میں ایک جگہ آتا ہے: وَرَضِيتُ لَكُمْ الْإِسْلَامَ دِينًا (المائدہ ۳) میں نے تمہارے لئے اسلام کو از روئے دین کے پسند کیا۔ ایک جگہ ہے: وَمَنْ يَتَّبِعْ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ (آل عمران ۸۵) جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کی تلاش کرے گا وہ اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔ سورہ نساء میں آتا ہے: وَمَنْ أَحْسَنُ دِينًا مِمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَاتَّبَعَ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا (النساء ۱۲۵) اور دین کے اعتبار سے بہترین شخص وہ ہے جس نے اللہ کے آگے نیک نیکی کے ساتھ اپنی گردن کو خم کر دیا اور ملت ابراہیم کی پابندی اختیار کی۔

تمام مذاہب و ادیان عالم کا مرکزی نقطہ یہی تھا کہ اب تم ہر جگہ کچھ نہ کچھ شائبہ شرک ضرور دیکھو گے، اس لئے اب اگر توحید خالص مل سکتی ہے تو صرف رسول اللہ ﷺ کے اتباع ہی سے مل سکتی ہے۔ قرآن حکیم نے نہایت ہی شرح و بسط کے ساتھ شرک اور توحید پر بحث کی ہے، پھر تمام کتب آسمانی میں سے صرف قرآن ہی کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ وہ ہر قسم کی تحریف سے پاک ہے۔ پس اس وقت اس آیت کے معنی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتے کہ اگر دنیا توحید محض کی آرزو مند ہے تو وہ دائرۃ اسلام میں داخل ہو جائے۔

یہی توحید تھی جس کی تعلیم اہل کتاب کو بھی دی گئی، مگر انہوں نے آپس کی ضد اور ہٹ دھرمی، حرص و آرزو اور مال و زر کے کسب و حصول کی خاطر اس کو بدل دیا۔ جب ایک مذہبی آدمی عوام الناس پر اپنی حکومت قائم رکھنے کی خاطر مذہبی اصول و کلیات میں تغیر کرنا شروع کر دیتا ہے تو پھر ناممکن ہے کہ وہ معزز و محترم رہ سکے، بلکہ اللہ تعالیٰ اسے بہت جلد عذاب میں مبتلا کر دے گا۔ ارباب مذاہب اسی وقت تک خلافت ارضی کے مستحق ہو سکتے ہیں جب تک وہ حق و صدق کی نشر و اشاعت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائے رکھیں۔ دوسرے الفاظ میں اس آیت کا یہ مطلب ہو گا کہ اگر ہمارے علمائے کرام ہمیں کتاب و سنت کی طرف بلائیں تو ان کی ہر بات ماننے کو تیار ہو جاؤ، مگر جس وقت وہ اپنی خواہشات کی پیروی پر مجبور کریں تو ان سے مخالفت کا اعلان کر دو اور ہر گز ان کے آگے سر تسلیم خم نہ کرو۔

## ترقی ناممکن ہے

فَإِنْ حَاجَّكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلَّهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ۖ وَقُلْ لِلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُمِّيِّينَ ءَأَسْلَمْتُمْ فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۖ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَدُ ۖ وَاللَّهُ بِصَيْرُوتِ الْعِبَادِ ۖ

”اس پر بھی اگر وہ تم سے حجت کریں تو کہہ دو کہ میں اور جو لوگ میرے پیرو ہیں اپنے آپ کو اللہ کا تابع اور بننا چکے، اور جن کو کتاب دی گئی ہے ان سے اور نیز ان پڑھوں سے کہ دو کہ کیا تم بھی اسلام لاتے ہو؟ پس اگر وہ مسلمان ہو جائیں تو بیشک ہدایت پر آگئے اور اگر منہ موڑیں تو بس تم پر پہنچا دینا ہے اور اللہ اپنے بندوں کو دیکھ رہا ہے۔“

اگر نصاریٰ اس بات کو تسلیم نہ کریں اور تم سے مناظرہ کرنے لگ جائیں تو ان نالائقوں سے اب زیادہ گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان سے صرف اتنا کہ دیجئے کہ میرا اور میرے متبعین کا صراط مستقیم اور طریق عمل تو یہی ہے، اسی پر قائم رہ کر ہماری ہر قسم کی ترقی ہو سکتی ہے اور اسی کے ذریعہ سے ہم سلامتی کے دروازہ میں داخل ہو سکتے ہیں، آپ اسی توحید کو تمام اقوام عالم کے سامنے پیش کر دیجئے، جن میں اہل کتاب اور عرب کے ان پڑھ لوگ بھی داخل ہیں۔ اگر سب کے سب توحید خالص کے آگے اپنی گردنیں جھکا دیں تو بہتر، ورنہ انحراف کی صورت میں ان کی تمام ترقی رک جائے گی اور اس کی جگہ پر تنزل و انحطاط کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ رسول اللہ کی بعثت عمومی ہے۔ سورہ فرقان میں ہے: تَبٰرَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا ۝ (الفرقان) بابرکت خدا نے اپنے بندے محمد پر قرآن نازل کیا، تاکہ وہ تمام جہان کو ڈرائے۔ مسلم میں ہے: والذی نفسی بیدہ لا یسمعہی احد من هذه الامۃ یهودی ولا نصرانی ولم یومن بالذی ارسلت به الا کان من اهل النار۔ مجھے خدا کی قسم کوئی ایسا یہودی یا نصرانی نہیں جس کے پاس میرا پیغام پہنچے اور وہ اس پر ایمان نہ لائے مگر یہ کہ وہ ضرور دوزخ میں جائے گا۔ ایک حدیث میں یہ الفاظ موجود ہیں: بعثت الی الاحمر والاسود میں سرخ و سیاہ تمام اقوام عالم کی طرف مبعوث کیا گیا ہوں۔ ایک مرتبہ فرمایا: کان النبی وبعث فی قومہ خاصۃ وبعثت الی الناس عامۃ، ہر ایک نبی صرف اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا مگر میں سب کی طرف بھیجا گیا ہوں۔ الغرض ان تمام تصریحات نے بتا دیا کہ دنیا کے گوشہ گوشہ اور کونہ کونہ میں اسلام کی آواز پہنچانا ہر مسلمان کا فرض ہے، تاکہ وہ بھی رسول کا اتباع حاصل کر سکے۔

## دوزخ کی بشارت

بد اخلاقی، فسق و فجور اور جمود و استبداد اہل کتاب کے رگ و پے میں اس درجہ اثر کر چکا ہے کہ وہ کسی حقانیت کو سننے کے لئے تیار نہ ہوں گے، اس لئے ان سے کہا جاتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِالْآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيَّ بِغَيْرِ حَقٍّ ۖ وَيَقْتُلُونَ الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۖ

فَبِمَا نُهُم بِعَذَابِ الْيَمِّ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَّاصِرِينَ ۝

”پیشک جو لوگ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں اور نبیوں کو ناحق قتل کر ڈالتے ہیں اور ان لوگوں کو قتل کر ڈالتے ہیں جو لوگوں کو انصاف کرنے کو کہتے ہیں، تو ان کو دردناک عذاب کی خوش خبری دیدو، یہی ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں اکارت گئے اور ان کا کوئی مددگار نہیں۔“

جن لوگوں کی عادت ہی کفر بآیات اللہ، قتل انبیاء اور عدل و انصاف کی تعلیم دینے والوں کا قتل کرنا ہو، ان کو جہنم کی خوش خبری دیدو۔ ان جرائم کی پاداش میں ان کے تمام اعمال حبط ہو جائیں گے۔ قرآن حکیم نے حبط اعمال کو کئی معنوں میں استعمال کیا ہے:

(۱) ایک شخص اپنی تمام عمر دنیاوی کاموں میں لگا دیتا ہے، اخلاق فاضلہ اور اعمال صالحہ کے کسب و حصول سے بالکلہ چشم پوشی کر لیتا ہے، اسے آخرت کا مطلق خیال نہیں آتا اور اس کے ان دنیاوی اعمال کا اس کی اخروی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑتا، ایسے شخص کی تمام سعی و کوشش اکارت جائے گی اور آخرت میں اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔

قُلْ هَلْ تُنْتِظُونَ إِلَّا خُسْرًا ۚ أُولَٰئِكَ سَمِعُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۚ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَزْنًا ۝ (الکہف ۱۰۳ تا ۱۰۵) سورہ فرقان میں ہے: وَقَدْ مَنَّ آلِي مَاعِصِلًا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنَاهُ هَبَاءً مَّنْثُورًا ۝ (فرقان ۲۳) اور ہم ان کے اعمال کی طرف متوجہ ہوئے جو انہوں نے کئے تھے تو ہم نے ان کو غبار پر اگندہ بنا دیا۔

(۲) ایک شخص مسلمان تھا اور عمل صالح کیا کرتا تھا، اس کے بعد مرتد ہو گیا اور اس نے کفر و الجاد کی راہ اختیار کر لی۔ اب چونکہ اس کا زاویہ نگاہ ہی بالکل بدل گیا ہے، اس لئے اس کی تمام پہلی نیکیاں اکارت جائیں گی وَمَنْ يُّتَدَبَّرْ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَيُتَبَّعْ فَأُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ (البقرہ ۲۱۷)

(۳) انبیاء و رسل کے مخالفین پوری کوشش کرتے ہیں کہ ان کی تحریک کو فنا کر دیں، مگر وہ خود ہی ناکام و خاسر رہتے ہیں اور کسی جگہ ان کو کامیابی نصیب نہیں ہوتی، بلکہ انبیاء علیہم السلام ہی غالب رہتے ہیں۔ ان منصوبہ بازیوں اور ریشہ دوانیوں میں مصروف رہنے کی وجہ سے ان کی توجہ نیکی کی جانب نہیں ہوتی، اس لئے مرنے کے بعد جہنم میں داخل ہوں گے۔ آیت زیر بحث اسی قانون کو بیان کرتی ہے: إِنَّ الَّذِينَ يُحَادِّثُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ فِي الْأَذَلِّينَ ۝ كَتَبَ اللَّهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِي (المجادلہ ۲۰ تا ۲۱)

(۴) حدیث میں ایک اور صورت بھی حبط عمل کی بیان کی گئی ہے: ایک شخص نیک کام کرتا ہے مگر اس کی نیت اچھی نہیں، اس کام کا کوئی نتیجہ نہ نکلے گا۔ چنانچہ حدیث میں دولت مند عالم اور مجاہد کی مثال دی گئی ہے۔ ان کا مقصد

صرف شہرت و ناموری تھی جو انہیں دنیا میں حاصل ہو گئی، اس لئے قیامت کے روز ان کا دامن اجر و ثواب سے خالی رہے گا۔

(۵) ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ایک شخص کی نیکیاں معدودے چند اور گناہوں کے انبار کے انبار ہوں۔

### قانون سے اعراض

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أَوْتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُدْعَوْنَ إِلَى كِتَابِ اللَّهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلَّى فَرِيقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُونَ ﴿۳۷﴾

”کیا تم نے ان کو نہیں دیکھا جن کو کتاب کا ایک حصہ دیا گیا تھا، ان کو اللہ کی کتاب کی طرف بلایا جاتا ہے کہ وہ ان میں فیصلہ کرے، پھر ان میں کا ایک گروہ بے رخی کرتے ہوئے انحراف کر جاتا ہے۔“

اس آیت کے شان نزول میں دو مختلف روایات بیان کی گئی ہیں مگر نتیجہ دونوں سے ایک ہی نکلتا ہے۔ ابن ابی حاتم اور ابن المنذر نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ یہودیوں کے بیت المدراس میں تشریف لے گئے اور ان لوگوں کو توحید کی طرف بلایا۔ نعیم بن عمر اور حارث بن زید نے آپ سے پوچھا: علی ای دین انت یا محمد، آپ کس دین پر ہیں؟ آپ نے فرمایا: ملت ابراہیمی میرا طریق عمل ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ وہ تو یہودی تھے۔ آپ نے کہا کہ توراۃ لاؤ وہی اس بات کا فیصلہ کر دے گی، اس پر سب کے سب خاموش ہو گئے۔ ایک دوسری روایت میں کہ یہودی ایک مرد و عورت کو دربار رسالت میں لائے جو زنا کے مرتکب ہوئے تھے اور آپ سے فیصلہ کے خواستگار ہوئے، انہیں خیال تھا کہ آپ کوئی ہلکی سی سزا تجویز کر دیں گے اور اس طرح یہ لوگ رجم سے بچ جائیں گے۔ مگر آپ نے فرمایا کہ میں بھی توراۃ کے مطابق ان کو رجم کرنے کا حکم دیتا ہوں۔ انہوں نے اس فیصلہ کو تسلیم کرنے سے انکار کیا تو آپ نے فرمایا کہ مجھ میں اور تم میں توراۃ حکم ہے اور اس کا فیصلہ ناطق۔ آخر وہ توراۃ لے تو آئے مگر آیت رجم کو پڑھے بغیر آگے نکل گئے۔ عبد اللہ بن سلام نے روکا اور اس طرح ان کی خیانت ظاہر ہو گئی۔

یہ ہے ان کا حق سے انحراف اور قانون الہی سے نفرت، اسی سلسلہ میں ان پیشین گوئیوں کو بھی سمجھ لینا چاہئے جو کتب سابقہ میں ظہور رسالت کبریٰ کے متعلق ہیں اور جن کو یہ لوگ اپنے خبث باطنی کی وجہ سے چھپاتے ہیں، پھر ایسے نالائقوں کی ہدایت کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔

### یہ کیوں

ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَنْ تَسْنَأَ النَّارُ إِلَّا آيَاتًا مَّعْدُودَاتٍ ۖ وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِمْ مَا كَانُوا يَفْتَكِرُونَ ﴿۳۸﴾ فَكَيفَ إِذَا جَعَلْنَاهُمْ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيهِ ۖ وَوَفَّيْتُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿۳۹﴾

”یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ سوائے گنتی کے چند روز کے ہم کو دوزخ کی آگ ہرگز نہ چھوئے گی اور ان باتوں

نے ان کو دین کے بارے میں دھوکا دے رکھا ہے جو یہ اپنی طرف سے بناتے ہیں۔ سو کیا حال ہو گا جب ہم ان کو اس دن اکٹھا کریں گے جس کے ہونے میں کچھ شبہ نہیں اور ہر شخص کو پورا دیدیا جائے گا جیسا کہ اس نے کیا ہے اور وہ بالکل ظلم نہ کئے جائیں گے۔

دائرۃ اسلام میں داخل نہ ہونے اور رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کرنے کا اصلی سبب یہ ہے کہ ان کا خیال یہ ہے کہ انہیں صرف چند روز تک جہنم میں رہنا پڑے گا۔ یہودیوں نے تو نحن ابناء اللہ و احباءہ کی پناہ لے رکھی ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کا مصلوب ہونا عیسائیوں کی نجات کا باعث بن گیا اور یہی مرض اب آہستہ آہستہ مسلمانوں میں سرایت کرنا جاتا ہے۔ یاد رہے جو قوم اعمال سے قطع نظر کر لیتی ہے وہ ترقی نہیں کر سکتی۔ قرآن حکیم نے تو نہایت ہی کھلے الفاظ میں نجات کا قانون بیان کیا ہے: وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ اُولَٰئِكَ اَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۸۲﴾ (البقرہ ۸۲) جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے وہی جنتی ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اس قسم کے عقائد فاسدہ ہمیشہ اس وقت کسی قوم میں پیدا ہوتے ہیں جب وہ دین سے بعد و ہجر اختیار کر لیتی ہے اور محرمات الہیہ کا احترام ترک کر دیتی ہے۔

جن لوگوں کی عادت ہی یہی رہی ہو کہ انہوں نے انبیاء اللہ کو قتل کیا، وہ ابھی بھی ان ناشائستہ حرکات سے باز نہ آئیں گے اور رسول اللہ کے بھی درپے آزار ہوں گے۔ اس طرح بتدریج اس پیشین گوئی کے پورا ہونے کے اسباب پیدا ہونے شروع ہو جائیں گے جو مستغلبون و تحشرون الی جہنم و بیئس البہاد میں کی گئی ہے، رہا ان کا کفارہ تو اس کا ابطال و دو فیت کل نفس ما کسبت سے ہو جاتا ہے اور اس کی پوری کیفیت تو مرنے کے بعد نظر آئے گی، جب اللہ تعالیٰ ہر ایک شخص کو اس کے اعمال کے مطابق بدلہ دے گا۔ اس وقت انہیں اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ کفارہ کا عقیدہ بالکل ہی غلط تھا۔

## فصل ثانی شرائط خلافت

### حکومت کی دعا

قُلِ اللّٰهُمَّ مَلِكُ الْمُلْكِ تَوْفِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُدْلِلُ مَنْ تَشَاءُ بِیَدِكَ الْخَیْرُ اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱﴾

”کہو اے اللہ! ملک کے مالک! تو جس کو چاہتا ہے سلطنت دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے حکومت چھین لیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے تو ہی عزت دیتا ہے اور جسکو چاہتا ہے تو ہی ذلیل کرتا ہے، ہر بھلائی تیرے ہی ہاتھ ہے، بیشک تو ہی ہر چیز پر قادر ہے۔“

عیسائی اس تعلیم صحیح کے آگے سر جھکاتے نظر نہیں آتے، بلکہ قرآن حکیم کی نشر و اشاعت میں رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں وہ قائم نہیں رہ سکتے بلکہ بہت جلد برباد کر دیئے جائیں گے۔ مگر ان کی تباہی سے قبل رسول اللہ ﷺ اور تمام مسلمانوں کو یہ دعا تعلیم دی جاتی ہے کہ سب کے سب نہایت ہی الحاح و تضرع کے ساتھ بارگاہ خداوندی میں یوں التجا کریں: خداوند! حکومتوں کا دینا اور چھین لینا، عزت و کرامت کی بخشش اور ذلت و رسوائی کی پھینکار، سب تیرے ہی قبضہ قدرت میں ہے، پس تو نصاریٰ سے حکومت چھین، ان کو ذلیل و رسوا کر، ان میں اختلاف و تفریق پیدا کر اور ان کی تمام حکومتیں اور مملکتیں چھین کر مسلمانوں کو دے اور فرزند ان اسلام میں اتحاد و اشتراک عمل پیدا کر، تو صرف ارباب استعداد و قابلیت ہی کو حکومت نوازش کیا کرتا ہے اور تیرے لئے یہ انقلاب نہایت ہی آسان اور سہل ہے۔

یہ مبارک دعا ان ایام میں مسلمانوں کو تعلیم دی جاتی ہے جبکہ کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ مسلمانوں کو فاکر کرنے پر متفق ہو چکے تھے۔ پھر دیکھو اس کے الفاظ کس قدر جلد پورے ہو گئے، لیکن اے عزیزانِ من! اس غلط فہمی میں نہ پڑ جانا کہ یہ وعدہ لسانِ الہی کا صرف صحابہ کرام ہی کے لئے مخصوص تھا، بلکہ آج بھی تم سے یہی عہد کیا جاتا ہے، مگر شرط اول قدم آنست کہ مجنون باشی!

دنیا ایک مرتبہ اس کا تجربہ کر چکی ہے، پھر کر کے دیکھ لو، وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

تُولِیْهِمُ الْاَيْلٰ فِي الْاَنْهَارِ وَتُؤْتِيْهِمُ النِّهَارَ فِي الْاَيْلِ ۚ وَتُخْرِجُ الْحَيٰ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ۚ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۱۷﴾

”تو ہی رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کر لیتا ہے، اور تو ہی جاندار کو بے جان سے اور بے جان کو جاندار سے نکالتا ہے اور جسکو چاہتا ہے بے شمار روزی دیتا ہے۔“

خداوند! رات کو دن، دن کو رات، سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کرنا تیرا معمولی کام ہے۔ نصاریٰ کے پاس ہر قسم کا سامان جہاگیر و جہانداری موجود ہے، ادھر مسلمانوں کی ناداری، و تہی دستی اور غربت و افلاس ضرب المثل ہے۔ پس اے ہمارے رب! تو نصاریٰ کے دن کو رات سے بدل دے اور ان کو نیست و نابود کر، مسلمانوں کی شب تاریک کو روشن و درخشندہ کر، انہیں علم و تدبیر عنایت فرما اور ان میں انتظام مملکت کی استعداد پیدا کر۔

تو بیجان سے جاندار، کافر سے مومن، جاہل سے عالم اور فاسق سے صالح پیدا کرتا ہے۔ پس تو اپنے فضل مخصوص سے مسلمانوں کو ملک گیری و ملک داری کا علم عطا فرما۔ ان کی موت کو زندگی سے بدل اور نصاریٰ پر موت و ہلاکت طاری کر کہ ان کی سرکشی اور متمادی طرز عمل نے زمین کو فساد کا گھر بنا دیا ہے۔ ویرحہ اللہ عبد اقال امینا۔

جن قوموں نے اپنی حکومت قائم کرنے میں صدیاں گزاری ہیں اور اسی کے محکم و استوار کرنے میں انہوں نے ہزار ہا سال صرف کر دیئے ہیں، خداوند! ان کی تمام حکومتیں اور سلطنتیں جلد تر مسلمانوں کو نوازش کر کہ تو ہی جس میں قابلیت دیکھتا ہے، اس کو بے حساب رزق دیتا ہے۔



خداوند قدوس نے قیام و استحکام سلطنت کے لئے چند نوامیس و سنن مقرر کی ہوئی ہیں۔ کسی قوم کی خاطر ان اصول و کلیات میں تغیر نہیں ہو سکتا، بلکہ جب کبھی کوئی قوم عمداً یا سہواً ان قوانین کی پابندی کرے گی تو وہ ضرور سرفرازی و سر بلندی سے بہرہ اندوز ہوگی۔ مسلمانوں نے ان اصول صحیحہ کو براہ راست مشکوٰۃ نبوت سے اخذ کیا اور وہ یکسر عمل بن گئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قلیل ترین زمانہ میں انہوں نے وہ حیرت انگیز ترقی کی جو سلطنت روما کو تین سو سال میں بھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ جنگوں اور بیابانوں کے رہنے والے قیصر و کسریٰ کے محلات پر قابض ہو گئے اور جب تک وہ ان قوانین الہیہ کے پابند رہے دن دوئی اور رات چوگنی ترقی کرتے گئے۔ اسی نشو و نما کو یزق من یشاء بغیر حساب سے تعبیر کیا گیا ہے۔

قرآن حکیم نے صحیح علم و عمل پر ترقی کرنے والی قوم کی مثال ان الفاظ میں بیان کی ہے: اَلَمْ تَرَ كَيْفَ خَرَّبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ۚ تُنتُجُ أَكْثَرُهَا كَلٌّ لِّجَنِّ بِأَذْنٍ رَّبِّهَا (ابراہیم ۲۴ تا ۲۵) کیا تم نے دیکھا نہیں اللہ نے کیسی مثال بیان کی کہ پاکیزہ بات گویا ایک پاکیزہ درخت ہے، جس کی جڑ مضبوط اور ٹہنیاں آسمان میں ہوں، وہ اپنے پروردگار کے حکم سے ہر وقت پھل لاتا رہتا ہے۔ اب بھی مسلمان اگر قرآن کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنا لیں تو وہ یقیناً بے حساب حکومت اپنے سامنے پائیں گے۔

### انقطاع تعلقات

گزشتہ آیات میں مسلمانوں کو حکومت و سرفرازی کی دعا تعلیم دی گئی، اب انھیں اپنی داخلی و خارجی قوت کے محفوظ کرنے، جماعتوں کو مضبوط و مستحکم بنانے اور دشمن سے مقابلہ کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہنے کے لئے فرمایا جاتا ہے:

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ ۚ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ فِي شَيْءٍ إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاتُ ۚ وَيَحْذَرُكُمْ اللَّهُ نَفْسَهُ ۖ وَإِلَى اللَّهِ الْمَصِيرُ ۝

”مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بنائیں اور جو ایسا کرے گا تو وہ اللہ کا کوئی نہیں مگر ایسی صورت میں کہ تم لوگ ان کے شر سے بچاؤ چاہو، اور اللہ اپنے آپ سے تم کو ڈراتا ہے اور اللہ ہی کی جانب لوٹ کر جاتا ہے۔“

اس ذیل میں اولین حکم ان کو یہ دیا گیا کہ وہ اپنوں کو چھوڑ کر غیروں سے دوستی نہ پیدا کریں۔ اور اگر کسی نے ایسا کیا تو اللہ کی برکتیں اس سے دور ہو جائیں گی۔ کامیابی کے لئے اپنے رموز و اسرار کا محفوظ رکھنا ضروری ہے۔ اور جو شخص مسلمانوں کے دشمنوں سے یارانہ کا گھنٹتا ہے وہ بعض اوقات اپنی قوم کی تباہی کا باعث بن جائے گا۔ قرآن حکیم نے اس موضوع پر نہایت ہی تفصیل سے بحث کی ہے۔ ایک جگہ آیا ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْكَافِرِيْنَ اَوْلِيَاءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِنَّ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلٰيكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۝ (النساء ۱۳۴) اے ایمان والو! مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست مت بناؤ، کیا تم اپنے اوپر اللہ کا صریح الزام لینا چاہتے ہو۔ دوسری جگہ فرمایا: اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصٰرَى اَوْلِيَاءَ ۚ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ وَمَنْ



يَتَوَكَّلْهُمْ مِّنْكُمْ فَإِنَّهُمْ (المائدہ ۵۱) اے مسلمانو! یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بنائیو، وہ ایک دوسرے کے رفیق ہیں اور جو کوئی تم میں سے ان کو دوست بنائے گا تو وہ ان ہی کا ہو گا۔ سورہ مجادلہ میں ہے: لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللّٰهَ وَرُسُلَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ (مجادلہ ۲۲) جو اللہ اور روز آخرت پر یقین رکھتے ہیں تم ان کو نہیں پاؤ گے کہ وہ ایسے لوگوں سے دوستی کریں جو اللہ اور اس کے رسول کے مخالف ہیں، اگرچہ وہ ان کے باپ ہی کیوں نہ ہوں۔ سورہ ممتحنہ نے تو بہت ہی صاف صاف اور رکھ رکھے کھلے الفاظ میں اس کو بیان کیا ہے۔ ارباب ایمان کے لئے حضرت ابراہیم کا اسوہ حسنہ پیش کیا ہے: اِنَّا بَرَّأُوْا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ اَبَدًا حَتّٰى تُوْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحَدّٰكُمَا (الممتحنہ ۴) اس آیت میں ترک موالات کے حسب ذیل مراتب سہ گانہ بیان کئے گئے ہیں۔

(الف) انا براءؤامنکم ومما تعبدون من دون اللہ: وہ اللہ کے دشمن ہیں اس لئے ان سے ہر قسم کے تعلقات و روابط کا انقطاع حقیقی۔

(ب) کفرنا بکم ان کا قانون غلط اور جبر و تشدد پر مبنی ہے، اس لئے ان کے ہر قانون کی شدید ترین مخالفت اور نافرمانی۔  
(ج) بد ائیننا و بینکم العداۃ والبغضاء ابدًا: وہ ظلم و جور کے بانی اور فسق و فجور کے حامی ہیں، اس لئے ان سے کمال درجہ کا بغض اور عداوت۔

پس آج مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ دشمنان اسلام سے ہر قسم کے تعلقات توڑ کر ان کے غلط قوانین کی نافرمانی کریں اور ان کے لئے عذاب الہی بن جائیں۔

لیکن اس ممانعت سے یہ نہ خیال کر لیا جائے کہ تمام کفار سے بلا اختلاف و تفریق ہر قسم کے تعلقات ممنوع و حرام ہیں۔ قرآن نے دشمنوں کی دو بڑی تقسیمیں کر دی ہیں۔ سورہ ممتحنہ کی ابتدائی آیات نے ان خصائص و امتیازات کو بیان کیا ہے جن کی بنا پر ہم ایک دشمن سے اپنے روابط کو توڑ سکتے ہیں، فرمایا:

(الف) کفرنا و ابا جاء کم من الحق لتعلیم صحیح کے دشمن ہیں۔

(ب) یخارجون الرسول و ایاکم: رسول اللہ ﷺ اور ان کے جانشینوں کو ان کے مرکزی مقامات سے نکالنے کی سعی و کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔

(ج) ان یتفقو کم یکونوا لکم اعداء ویسقطوا الیکم اید یهم والسننہم بالسوء و دوا لوتکفرون: وہ تمہیں عالمگیر اتحاد اسلامی سے روکتے ہیں، تم میں اور تمہاری حکومتوں میں اختلاف کا بیج بوتے ہیں اور اس طرح جب تم الگ الگ ہو جاتے ہو تو ایک ایک کے ساتھ دشمنی کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ اپنی تمام قوت و طاقت تمہاری بربادی میں صرف کر دیتے ہیں۔ ان کی تقریریں اور تحریریں تمہارے لئے گالیوں سے بھری ہوتی ہیں اور وہ ہمیشہ اسی فکر میں رہتے ہیں کہ تمہیں دین حق سے منحرف کر دیں۔

سورہ توبہ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

(۱) نكثُوا اِيْمَانَهُمْ : انہوں نے اپنے عہد و موافق کو پس پشت ڈال دیا ہے۔

(۲) وھو باخراہ الرسول : رسول اور اس کے جانشینوں کو دار الخلافت سے محروم کرنے کی کوشش کی ہے۔

(۳) وھم بدؤکم اول مرہ : ابتدا بھی انہیں کی جانب سے ہوئی ہے : والہادی اظلم اور سورہ بقرہ میں تو کئی جگہ فرمایا :

ولن ترضوا عنک الیھود ولا النصریٰ حق تتبع ملتھم، جب تک تم ان کے دین کا اتباع نہ کرو یہود و نصاریٰ تم سے ہر گز خوش نہ ہوں گے۔ پھر فرمایا : لایزالون یقاتلونکم حتی یردوکم عن دینکم ان استطاعوا، وہ تم سے برابر جنگ کرتے رہیں گے یہاں تک کہ اگر ان کی طاقت ہو تو وہ تمہیں راہ حق سے منحرف کر دیں۔ الغرض ان آیات نے اس فلسفہ کو بیان کر دیا جس کی وجہ سے ہم ان دشمنان دین و ملت کے ساتھ تعلقات نہیں رکھ سکتے۔

البتہ اس نے ان کفار کے ساتھ مروت و احسان کی اجازت دی ہے جنہوں نے نہ تو ہم سے جنگ کی ہو اور نہ ہمارے بے گھر ہونے میں ان کا کوئی ہاتھ ہو۔ چنانچہ اسی سورہ ممتحنہ میں آتا ہے : لَا یُنْهَکُمُ اللّٰهُ عَنِ الدِّینِ لَیْمَ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَ لَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ اَنْ تَبْکُوْهُمْ وَ تَقْسِطُوْا اِلَیْھِمْ (الممتحنہ ۸) اور بعض اوقات دفع شر کے لئے بھی ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کر سکتے ہیں۔

### انتباہ

قُلْ اِنْ تَخْضَعُوْا مَآئِیْ صُدُوْرُکُمْ اَوْ تُتْبَدُوْا یَعْلَمْنٰہُ اللّٰهُ ۚ وَ یَعْلَمُ مَآئِی السَّلٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ۚ وَ اللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۰﴾ یَوْمَ تَجِدُ کُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَیْرٍ مُّحْضَرًا ۙ وَ مَا عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ ۙ تَوَدُّ اَنْ یَّبَیْنَهَا وَ بَیْنَهَا اَمَدًا ۙ بَعِیْدًا ۙ وَ یُحَدِّثُکُمْ اللّٰهُ نَفْسَہُ ۚ وَ اللّٰهُ رَعُوْفٌ بِالْعِبَادِ ﴿۱۱﴾

”کہدو کہ اگر تم اس کو چھپاؤ جو تمہارے دلوں میں ہے یا اسے ظاہر کرو بہر حال اللہ تو اس کو جانتا ہے اور جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اس کو جانتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے، جس دن کہ ہر شخص بھلائی کو اور برائی کو جو اس نے کی ہے پائے گا، آرزو کرے گا کہ کاش اس میں اور ان میں مسافت دراز ہوتی اور اللہ اپنے آپ سے تم کو ڈراتا ہے اور اللہ بندوں پر بڑا شفیق ہے۔“

تمہیں ظاہر اور باطن کسی صورت میں بھی ظالموں سے دوستی رکھنا جائز نہیں۔ اگر تم لوگوں سے یہ عذر کرو کہ مسلمانوں کی حکومت میں بد امنی ہے، جان و مال کا خطرہ ہے، اس لئے ہم کافروں کے ماتحت زندگی بسر کرتے ہیں اور ان سے پیمان مودت باندھتے ہیں۔ تو یہ عذر لنگ اللہ تعالیٰ کی دربار میں کام نہ دے گا، کیونکہ اگر کہیں سے مسلمانوں کی حکومت چھین جائے تو یہ ان کا فرض ہے کہ فوراً اپنے مرکز خلافت میں جمع ہو کر اس ملک پر دوبارہ قبضہ کرنے کی کوشش کریں اور یہ تو کسی صورت میں بھی جائز نہیں کہ دار الحرب ہی کو اپنا وطن بنالو۔ قیامت کے روز یہی اعمال فاسقہ تمہاری ذلت و رسوائی کا

باعث بن جائیں گے۔ پس خدا سے ڈرو اور یہود و نصاریٰ سے دوستی نہ کرو۔ خدا کا حکم کسی ظلم و جور پر مبنی نہیں بلکہ اس کی رافت و رحمت کا یہی تقاضا ہے کہ وہ تمہیں یہ حکم دے اور اسی میں تمہاری زندگی ہے۔

### بہترین طریق عمل

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۶۱﴾ قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ  
وَالرَّسُولَ ۚ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ ﴿۶۲﴾

”کہہ دو اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے، کہہ دو کہ اللہ اور رسول کا حکم مانو پس اگر وہ انحراف کریں تو بیشک اللہ کافروں سے محبت نہیں کرتا۔“

جو لوگ نحن ابناء الله واحباءہ کا نعرہ مستانہ لگاتے پھرتے ہیں اور جن کا دعویٰ یہ ہے کہ لن تمسنا النار الا ایاما معدودات وہ دوسرے الفاظ میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اللہ ان کی ہر وقت دستگیری اور اعانت کرے گا اور ان کے ساتھ اس کا وہی طرزِ عمل ہو گا جو وہ دوستوں کے ساتھ رکھتا ہے۔ لیکن اس توقع کے پورا ہونے کی صرف ایک ہی صورت ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ تم سب کے سب میرے نقش قدم پر چلو۔ میں قرآن حکیم کی خاطر تمام دنیا قربان کر دینے کو تیار ہوں، تم بھی اسی کتاب عزیز کی نشر و اشاعت کو اپنی زندگی کا انتہائی نصب العین بنالو، پھر یقیناً تمہاری مدد ہوگی اور تمہاری گزشتہ غلط کاریوں کو نظر انداز کر دیا جائے گا۔

عیسائیوں کے لئے تو اس کے سوا اور کوئی چارہ کار ہی نہیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے نقش قدم پر چلیں، کیونکہ حضرت عیسیٰ انہیں نہایت ہی صاف اور ناقابل تاویل الفاظ میں کہہ گئے ہیں: ”اگر تم مجھ سے پیار کرتے ہو تو میرے حکموں پر عمل کرو اور میں اپنے باپ سے درخواست کروں گا اور وہ تمہیں دو سراسر تسلی دینے والا بخشے گا۔“ (یوحنا ۱۴: ۲۱) ایک جگہ انہوں نے فرمایا: ”مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی ہیں، مگر اب تم ان کو برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ یعنی سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا۔“ (یوحنا ۱۴: ۲۱)

ان آیات نے عیسائیوں کے تمام عذر و رفع کر دیے، اب بھی اگر وہ دائرۃ اسلام میں داخل ہونے سے گریز کرتے ہیں تو یہ ان کی اپنی ضد اور ہٹ دھرمی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی اطاعت یہ ہے کہ ہر ایک مسلم اپنی زندگی کا مقصد اصلی قرآن حکیم کی نشر و اشاعت، اعلائے کلمۃ اللہ اور اس پر عمل کرنا بنالے اور اس میں رسول اللہ ﷺ کی حیات مقدس کو اپنے لئے نمونہ تصور کرے۔ صرف یہی ایک صورت کامیابی کی ہے اور انحراف کی شکل میں تمام تر قیام رک جائیں گی۔

ان تمام آیات میں خلافت کے حاصل کرنے کی شرطوں کو بیان کیا گیا ہے جن کی تلخیص حسب ذیل ہے:

(الف) ہماری تمام قوت دعائیں صرف ہو اور صرف اللہ تعالیٰ سے حکومت و سرفرازی اور فضیلت علیٰ العلمین کی دعا مانگیں۔

(ب) یہود و نصاریٰ، کفار و مشرکین اور تمام مخالفین اسلام سے انقطاع تعلقات کر لیں اور ان کی دوستی پر ہرگز اعتماد نہ کریں۔

(ج) اللہ کے قانون کی پابندی کریں اور رسول اللہ ﷺ کے اسوہ حسنہ کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

## فصل ثالث تاریخی نظائر

آئندہ آیات میں چند تاریخی واقعات بیان کئے جاتے ہیں جن سے دو باتیں ثابت کرنی ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ہمیشہ ان لوگوں کی مدد کی ہے جو اس کے قانون کی پابندی کرتے ہیں۔

(۲) اب تک نبوت اور حکومت ابراہیم کے خاندان کی ایک شاخ میں رہی ہے، مگر آج کی تاریخ سے بنی اسرائیل سے نبوت چھین کر بنی اسماعیل میں چلی جائے گی۔

برگزیدہ خاندان

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِصْمَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿۱۳۷﴾ ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِن بَعْضٍ ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۱۳۸﴾

”اللہ نے آدم نوح خاندان ابراہیم اور خاندان عمران کو تمام جہان میں سے چن لیا، یہ ایک دوسرے کی نسل سے تھے اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔“

عمران حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد کا نام ہے، مورث اعلیٰ کے ذکر کرنے کا منشا یہ ہے کہ تمام سلسلہ موسویہ کا تذکرہ آگیا۔ یہ لوگ آل ابراہیم میں شامل تھے، مگر ان کو الگ ذکر کیا تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ اگرچہ آج تک صرف بنی اسرائیل ہی اس عزت و سرفرازی حکومت و سر بلندی اور مکالمہ و مخاطبہ الہی کے وارث رہے ہیں، مگر اب حضرت اسماعیل کی اولاد اس عروج و ارتقا کے لئے مخصوص کر لی جائے گی۔ گویا آل ابراہیم کے علیحدہ ذکر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کی جانب اشارہ ہو۔

یہ تمام جلیل القدر انبیاء و رسل صرف اس لئے ان مراتب عالیہ پر فائز ہوئے اور ان کے خاندانوں کو ارض مقدس کی

حکومت ملی کہ انہوں نے اپنی زندگی کی غایت الغایات قانون الہی کا اتباع قرار دیا تھا۔ پس اگر مسلمان بھی اس ترقی کے آرزو مند ہیں تو قرآن حکیم سے تمسک و اعتصام کریں۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک شخص کے حالات سے واقف ہے، جس قدر ایک شخص اس کا قانون ترک کرے گا، وہ اتنی ہی اس کی امداد و اعانت بند کر دے گا۔ چنانچہ ان خاندانوں میں سے جن لوگوں نے قانون الہی کا اتباع ترک کر دیا انہیں ہمیشہ کے لئے ذلیل و رسوا کر دیا گیا اور جتنا ایک شخص اتباع کرے گا اس کی اتنی ہی امداد ہوگی۔

### عمران کی بیوی کی دعا

إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي ۖ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۱۹﴾

”جب عمران کی بیوی نے کہا، اے میرے رب! جو کچھ میرے پیٹ میں ہے میں نے اسے آزاد کر کے تیری نذر کیا ہے، پس میری طرف سے قبول فرما کیونکہ تو سننے والا جاننے والا ہے۔“

اس آیت میں امراۃ عمران کے الفاظ نے بعض لوگوں کو اس شبہ میں ڈال دیا ہے کہ اس سے کیا مراد ہے۔ حالانکہ سورہ تحریم کی یہ آیت وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا (التحریم ۱۲) صاف بتا رہی ہے کہ عمران دراصل حضرت مریم کے والد کا نام ہے اور یہ عام دستور ہے کہ لوگ اپنے خاندان کے بزرگوں کے ناموں پر اپنی اولاد کے نام رکھا کرتے ہیں۔ چنانچہ مریم کے بھائی کا نام ہارون تھا جس کی بنا پر انہیں سورہ مریم میں یا اخت طرون کہہ کر پکارا گیا۔ آج کل بھی لوگ ایسا ہی کرتے ہیں، مگر عیسائیوں نے اس حقیقت کو فراموش کر دیا اور اعتراض کیا اور یہ کوئی نیا اعتراض نہیں بلکہ چودہ صدی قبل یہی سوال خود رسول اکرم سے بھی کیا گیا تھا تو آپ نے بھی اس کا یہی جواب دیا تھا۔ اس بنا پر ہمارے نزدیک امراۃ عمران سے مراد مریم کی والدہ ہیں۔

بنی اسرائیل قوانین الہیہ کو ترک کر چکے ہیں۔ تنزل و انحطاط کا زمانہ ہے اور بدترین زندگی بسر کر رہے ہیں، اس دور لازمہیت میں بھی بنی اسرائیل کے عام دستور کے مطابق عمران کی بیوی یہ منت مانتی ہے کہ جو لڑکا اس کے ہاں پیدا ہو گا وہ اس کو صرف بیت المقدس کی خدمت کے لئے وقف کر دے گی۔ اب اس نذر کو شرف قبول بخشا اور اس سے وہی خدمت لینا خدا نے قدوس کی مرضی پر ہے۔

فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنْثَىٰ ۖ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعْتَ ۖ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَىٰ ۖ وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ ۖ وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذَرَيْتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ﴿۲۰﴾

”پھر جب اس کو جنا تو کہا میرے رب! میں نے تو لڑکی جنی ہے اور اللہ خوب جانتا ہے جو اس نے جنا اور لڑکا اس لڑکی کی طرح نہیں ہوتا اور میں نے اس کا نام مریم رکھا اور میں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔“

عمران کی بیوی کو یقین تھا کہ لڑکا پیدا ہو گا۔ لڑکی پیدا ہونے پر اسے کچھ حسرت سی ہوئی اور کہنے لگی کہ مذہبی خدمت تو بہترین طریق سے صرف لڑکا ہی ادا کر سکتا ہے۔ مگر اسے کیا خبر تھی کہ یہی لڑکی آئندہ چل کر دنیا میں نام آور ہو گی۔ بہر حال اس نے اپنی نذر کے مطابق اس کو ہیکل کے سپرد کر دیا، اللہ تعالیٰ نے اس نذر کو یوں شرف اجابت بخشا: یَسِّرْهُم اِنَّ اللّٰهَ اَصْلَفُکَ وَطَهَّرَکَ وَاصْطَفٰکَ عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۳۱﴾ (آل عمران ۳۱) اے مریم! اللہ نے تم کو برگزیدہ کیا اور تمہیں پاک و طاہر بنایا اور دنیا کی تمام عورتوں پر برگزیدگی نوازش کی۔ ایسی بیٹی پر ہزاروں بیٹے قربان جس سے خود ملائکہ الرحمن ہم کلام ہوں، جس کی طہارت و پاکیزگی کا قرآن حکیم میں بار بار اعلان ہو، جس کی نسبت لسان الہی کا یہ فیصلہ ہو کہ نہ صرف مریم، بلکہ اس کا بیٹا، دونوں کے دونوں کائنات ارضی و سماوی کے لئے عظیم و جلیل نشان بننے والے ہیں۔

### قبولیت دعا

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ ۖ وَاَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۖ وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۖ وَلَمَّا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰرَبِّیْمُ اَنْیَ لَکَ هٰذَا ۙ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴿۳۲﴾

”سو مریم کو اس کے رب نے اچھی طرح قبول فرمایا، اور اس کو عمدہ پرورش سے پڑھایا اور اس کو زکریا کے سپرد کر دیا، جب کبھی زکریا اس کے پاس حجرے میں آتے تو اس کے پاس رزق پاتے۔ زکریا نے کہا اے مریم! یہ تمہیں کہاں سے ملا۔ اس نے کہا اللہ کی طرف سے ہے، بے شک اللہ جس کو چاہتا ہے بے حساب روزی دیتا ہے۔“

بنی اسرائیل جس جگہ بیٹھ کر اور ادو وظائف اور نماز پڑھا کرتے تھے اس کو محراب کہتے تھے۔ حضرت زکریا علیہ السلام بیت المقدس کے مجاور تھے۔ جب حضرت مریم کی کفالت و سرپرستی کا مسئلہ پیش ہوا تو ہر ایک مجاور اس سعادتمند لڑکی کو اپنے پاس رکھنے کا آرزو مند تھا۔ مگر جب دلائل پیش کئے گئے تو زکریا کا پہلو غالب رہا اور مریم کو ان کے حوالہ کر دیا گیا۔ اول تو قرعہ اندازی نے ان کو ترجیح دے دی، دوسرے زکریا کی بیوی مریم کی خالہ ہوتی تھیں۔ یہ بھی قبول حسن کی ایک شان تھی جو اللہ کی جانب سے ہوئی کہ بہترین انسان کی نگرانی میں اس لڑکی کو رکھ دیا گیا۔

حضرت زکریا علیہ السلام درجہ کے زہد و تقویٰ، ورع و پاکیزگی اور قناعت و توکل علی اللہ کی زندگی بسر کرتے تھے، خود ان کے گھر میں کئی کئی روز تک فاقہ رہتا تھا، اس لئے مریم کے لئے قدرت خداوندی نے یہ قاعدہ بنادیا کہ جس وقت انہیں کسی چیز کی ضرورت ہوتی فوراً تو اے مثالہ کی وجہ سے انہیں مل جاتی۔ اس طرح ان کی نشوونما پر کوئی مضر صحت اثر نہ پڑا، اسی کو نبات حسن سے تعبیر کیا گیا ہے۔

جب کبھی مریم کو دیکھنے کے لئے زکریا آتے تو وہ ضرور کوئی نہ کوئی چیز اس کے پاس پاتے۔ ان نعمت ہائے گونا گوں کو دیکھ کر ایک روز انہوں نے لڑکی سے پوچھا کہ یہ چیزیں کہاں سے آتی ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ قدوس حق نوازی کرشمہ سازیاں ہیں، وہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے: وَمَنْ يَشَقِّ اللّٰهُ يَجْعَلْ لَّدٰىهُ مَخْرَجًا ﴿۳۳﴾ ۚ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۚ وَمَنْ يَتَّكِلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهُ (طلاق ۳۲-۳۳)

## بشارتِ یحییٰ

هٰذَاكَ دَعَاكَ كَرِيْمًا رَبُّهُ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاۗءِ ﴿۸۵﴾

”وہیں زکریا نے اپنے رب سے دعا کی کہ اے میرے رب! اپنی جناب سے مجھے اولاد صالح عطا فرما بے شک تو ہی دعا کا سننے والا ہے۔“

جب زکریا نے دیکھا کہ یہ مریم کی نیک بختی اور پارسائی کا نتیجہ ہے کہ جب وہ دعا کرتی ہیں تو ہر چیز اپنے پاس موجود پاتی ہیں اور بنی اسرائیل کی اس گئی گذری حالت میں بھی ایسی پاکباز عورتیں پیدا ہو کر دوسروں کی سعادت و راہ نمائی کا ذریعہ بن سکتی ہیں تو ان کے دل میں بھی جوش و ولولہ دعا پیدا ہوا اور انہوں نے بھی ایک نیک بخت اور سعید فرزند کی حق تعالیٰ سے والہانہ و مضطربانہ دعا کی۔

انہیں اب تک اپنی عورت کے بانجھ ہونے کی وجہ سے دعا کی طرف رغبت نہیں ہوئی تھی، مگر جب انہوں نے دیکھا کہ بغیر کسی ظاہری سبب کے محض اللہ تعالیٰ کے لطف و اکرام سے مریم کو ہر چیز مل جاتی ہے تو ان کا جو تھوڑا بہت اعتماد اب تک سلسلہ اسباب و علل پر تھا وہ اور بھی کمزور ہو گیا اور انہیں امید ہوئی کہ باوجود میری عورت کے بانجھ ہونے کے، اللہ تعالیٰ کی قدرت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ مجھے ایک فرزند صالح عطا کرے۔ چنانچہ وہ نہایت ہی الحاح و تضرع کے ساتھ درگاہ خداوندی میں یوں عرض کرنے لگے: رَبِّ اِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ وَاسْتَعَلَ الرَّاسُ شَیْبًا وَاَکْمُ اُکُنُّ بِدُعَاۡتِکَ رَبِّ شَقِیًّا ۝ وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ وَكَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقرًا فَهَبْ لِّیْ مِنْ لَدُنْکَ وَلِیًّا ۝ یٰرَبِّیْ تُعْطِیْ وَیَرْثِیْ مِنْ اِلٰی یَعْقُوْبُ ۚ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِیًّا ۝ (مریم ۶۳) میرے رب! میری ہڈیاں کمزور پڑ گئیں اور سر بڑھاپے سے بھڑک اٹھا اور اے پروردگار! میں تجھ سے مانگنے میں کبھی محروم نہیں رہا اور میری عورت بانجھ ہے، تو مجھ کو اپنی طرف سے ایک وارث عطا فرما، جو میرا اور آل یعقوب کا وارث بنے اور اس کو اے پروردگار پسندیدہ بنا۔

یہ جو زکریا نے ایک وارث کی دعا کی ہے تو اس کا یہ منشا ہرگز نہیں کہ وہ اپنی جائداد اور دولت کا وارث طلب کرتے ہیں، اس لئے کہ انبیائے کرام کے پاس ہوتا ہی کیا ہے، جو وارث کی تلاش کریں، بلکہ ان کی غرض یہ تھی کہ میرے بعد وہ بنی اسرائیل کو راہ راست پر لانے والا یعقوب کی نبوت کا وارث اور ان کے علوم و معارف کا حامل ہو، تاکہ ایسا نہ ہو کہ میری وفات کے بعد علوم نبوت کا سنبھالنے والا کوئی بھی باقی نہ رہے۔

فَنَادٰتْهُ الْمَلَٰٓئِکَةُ وَهُوَ قَائِمٌ یُّصَلِّیْ فِی الْبَحْرٰٓءِ ۚ اَنَّ اللّٰهَ یُبَشِّرُکَ بِیَحْیٰی مُصَدِّقًا بِکَلِمَةٍ مِّنْ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَنَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۸۶﴾

”جب وہ عبادت گاہ میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا تو فرشتوں نے اس کو آواز دی کہ اللہ تم کو یحییٰ کی خوش خبری دیتا ہے، جو اللہ کے حکم کی تصدیق کرنے والا اور سردار اور بدیوں سے رکے والا اور نبی نیکو کاروں میں سے ہو گا۔“

رحمت الہیہ نے دستگیری کی اور ان کو ایک فرزند صالح کی بشارت دی، جس کے حسب ذیل امتیازات ہوں گے:

(۱) مصدقا بحکمۃ من اللہ: قرآن حکیم نے مصدق کے معنی پیشین گوئیوں کے پورا کرنے والے کے بیان کئے ہیں: نَزَّلَ عَلَیْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ (ال عمران ۳) خود رسول اللہ ﷺ کو بھی اسی معنی میں کتب سابقہ کا مصدق کہا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مریم کو بغیر کسی خاوند کے فرزند رشید کی خوش خبری دی تھی: اذ قالت الملائکۃ یریم ان اللہ یشاء بحکمۃ منه، حضرت یحییٰ کو ان کی تصدیق کے لئے بھیجا گیا تاکہ یہودیوں کا منہ بند ہو جائے اور وہ آپ کی پیدائش پر کوئی اعتراض نہ کر سکیں، یہی وہ کلمۃ اللہ ہیں جن کی تصدیق کے لئے یحییٰ تشریف لائے۔

(۲) سید: انسانوں کو طبعی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(الف) سید بالطبع: جو ابتدا ہی سے سرداری کے لئے پیدا کیا گیا ہو، اپنے فرائض کو بحسن و خوبی انجام دے سکے اور مشکلات و موانع کے ہجوم سے نہ گھبرائے۔ ایسے لوگ ہر قوم میں خال خال ہوتے ہیں انھی کی تعلیم دتر بیت اور صحبت و ہم نشینی سے بعض ایسے بندگان خدا نکل آتے ہیں جو دنیا کی تاریخ بنانے والے اور امتوں میں انقلاب عظیم پیدا کرنے والے ہوتے ہیں، انھی میں شاہان اولوالعزم دکھائی دیتے ہیں اور انھی کی صف فاتحان ممالک و قائدین عسا کر پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہی صفت کامل طور پر حضرت یحییٰ علیہ السلام میں ودیعت کی گئی تھی۔

(ب) عبد بالطبع: لیکن عموماً دنیا کی آبادی جن نفوس پر مشتمل ہے وہ ان اوصاف سے بالکل معرہ ہوتی ہے۔ ان کی خود کوئی ذاتی رائے نہیں ہوتی، وہ تعلیم و تربیت کے بعد بھی عموماً ایک ایسے شخص کے متلاشی رہتے ہیں جو ان کی تکمیل پکڑ کر جہاں جی چاہے لے جائے، انھی کو حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کی اصطلاح میں عبد بالطبع کہا جاتا ہے اور یہ اصطلاح آجکل کے جی حضوریوں پر پورے طور سے صادق آتی ہے۔

(۳) حضور: سرداری کے ساتھ عقیف و پاکدامن ہونا، ان انعامات الہیہ میں سے ہے جو لوگوں کو بہت کم نصیب ہوتے ہیں۔ کیونکہ سردار جن آزادیوں سے مستیع ہوتا ہے ان کی وجہ سے اس کا فسق و فجور میں مبتلا ہو جانا بہت زیادہ قرین قیاس ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ کو سرداری کے ساتھ عفت و طہارت دے کر ان کے والد کی دعا کو بدرجہ اتم قبول فرمایا اور دوسری طرف بنی اسرائیل کے لئے ایک ایسا راہ نما مہیا کر دیا جس کی ان کو شدید ترین ضرورت تھی۔

(۴) ایک نیک بخت نبی ہوں گے۔

طلب آیت

قَالَ رَبِّ اَنْیَیْکُونُ لِیْ عِلْمٌ وَقَدْ بَلَغَنِی الْکِبَرُ وَامْرَاٌیَ عَاقِرٌ ؕ قَالَ کَذٰلِکَ اللّٰهُ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ ۝ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّیْ



آيَةٌ قَالِ اٰتٰنَكَ الْاُنْكَلَمَ النَّاسُ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ اَلَا رَمَوْا ۚ وَاذْكُرْ رَبَّكَ كَثِيْرًا وَّاَسْبِغْ بِالْعِشِيْ وَالْاَبْكَارِ ۝

”اس نے کہا اے میرے رب! میرے یہاں لڑکا کیسے ہو گا حالانکہ مجھ پر بڑھاپا آچکا اور میری بیوی بانجھ ہے۔ فرمایا اسی طرح ہو گا اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ عرض کیا میرے رب! میرے لئے کوئی نشانی مقرر کر۔ فرمایا تیرے لئے نشانی یہ ہے کہ تم تین دن تک اشارہ کے سوا لوگوں سے بات نہ کر سکو گے اور اپنے رب کا بکثرت ذکر کرو اور شام اور صبح تسبیح کرو۔“

ذکر کیا کو ان تمام وعدوں پر یقین ہے، مریم میں انہوں نے اس کا نمونہ بھی دیکھ لیا ہے، مگر پھر بھی بشارت کی قدرت کا ایک عظیم الشان نشان اور ان کے نزدیک حیرت انگیز کام ہے، اس لئے وہ ازراہ تعجب پوچھتے ہیں کہ اس کی کیا صورت ہوگی۔ حضرت ابراہیم نے بھی اس موقع پر یہی عرض کیا تھا: اَبَشِّرْ نَبِيْنِيْ عَلٰی اَنْ مَّسِّنِيَ الْكِبَرَ فَيَمِ نُبَشِّرُكَ نُبُوْنًا ۝ (الحجر ۵۴) اس کبر سنی میں تم مجھے اسحق کی خوش خبری دیتے ہو، درگاہ خداوندی سے جواب ملتا ہے کہ دنیا میں جس قدر مخلوقات روزانہ پیدا ہوتی ہے وہ محض والدین ہی کی کوشش کا نتیجہ نہیں ہوتی، بلکہ اس میں یکسر ہمارا تصرف ہوتا ہے اور یہی تمہارے ساتھ ہو گا۔ وہ ان تمام باتوں کو تسلیم کرتے ہیں مگر پھر بھی مزید اطمینان کے لئے نشانی طلب کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم اپنی عادت کے مطابق شب و روز ذکر الہی میں مصروف رہو گے، ایک وقت آئے گا کہ اللہ کے ذکر میں تو تمہاری زبان زمر مرہ سنج ہوگی مگر اس میں لوگوں سے بات کرنے کی طاقت نہ رہے گی اور تمہیں رمز و کنایہ سے کام لینا پڑے گا۔ جب یہ حالت ہو تو سمجھ لینا کہ یہی ضرور پیدا ہوں گے۔

تمہاری تمام قوتیں کام کرنے کے قابل ہوں گی، مگر ہم صرف ایک روحانی طاقت کو اتنا تیز کر دیں گے کہ تسبیح و تقدیس خدا تو کر سکو گے مگر دوسری باتوں سے اپنے آپ کو عاجز پاؤ گے، اسی سے تم سمجھ لو کہ عالم شباب میں تمہاری ہر قسم کی قوت بدرجہ کمال موجود تھی مگر پھر بھی اولاد سے تم محروم رہے، بڑھاپے میں یہ ہماری نیرنگ سازی ہے کہ اولاد ہو جائے۔ درمیان میں جو رکاوٹ حائل تھی اس کو دعائے دور کر دیا۔

اصل بات یہ ہے کہ ہر کام کے لئے ایک خاص معیار قوت ضروری ہے جو عموماً نوجوانوں اور تندرست و توانا آدمیوں کو حاصل ہوتا ہے، لیکن اگر ایک ضعیف و ناتوان شخص بھی عزم مصمم کر لے اور اپنے اندر ارادہ کی پختگی، استقلال اور ثبات قدم پیدا کر لے تو جسمانی قوتوں کی تلافی ہو جائے گی۔

مریم کی برگزیدگی

وَ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰرَحْمٰتُہٗ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ يٰرَحْمٰتُہٗ اَقْنَعِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرَّاكِعِيْنَ ۝

”اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم! اللہ نے تم کو منتخب کیا اور تجھے پاک بنایا ہے اور قوموں کی عورتوں میں سے تمہیں چن لیا ہے، اے مریم! اپنے رب کی فرماں برداری کر اور سجدہ کر اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ جھک جا۔“

اگرچہ عام قانون کے مطابق بیت المقدس کی خدمت اور جارب کشی کے لئے صرف مردوں ہی کا انتخاب عمل میں آتا تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے عمران کی بیوی کی نذر کو قبول کیا اور مریم کو ہیکل کے لئے چن لیا، پھر زکریا جیسے بزرگ ترین انسان کی تربیت میں اس کو رکھا، اس کی ہر قسم کے گناہ کی آلائش سے حفاظت کی اور اس کو تمام زمانہ کی عورتوں پر فضیلت و برتری نوازش کی۔ بغیر خاوند کے اس کو ایک جلیل القدر پیغمبر کی ولادت کا فخر حاصل ہوا اور اسے فرشتوں سے ہم کلامی کا شرف نصیب ہوا۔ بخاری میں ان کی نسبت آتا ہے: خیر نسائھا مریم بنت عمران، وخیر نسائھا خدیجۃ بنت خویلد۔ ترمذی میں ہے: نسائکم من نساء العالیین مریم بنت عمران وخدیجۃ بنت خویلد وفاطمة بنت محمد واسیۃ امراۃ فرعون، ”تمہارے لئے یہ کافی ہے کہ تمام زمانہ کی عورتوں پر مریم، خدیجہ، فاطمہ اور آسیہ کو فضیلت و بزرگی حاصل ہے“، ایک حدیث میں یہ الفاظ وارد ہیں: کمل من الرجال ولم یکمل من النساء الا ثلاث مریم بنت عمران واسیۃ امراۃ فرعون وخدیجۃ بنت خویلد، وفضل عائشة علی النساء کفضل الثرید علی الطعام۔ ”مردوں میں تو بڑے بڑے لوگ کامل ہوئے مگر عورتوں میں سے صرف مریم، آسیہ اور خدیجہ کو یہ عزت نصیب ہوئی اور جملہ کھانوں میں جو فضل و شرف ثرید کو حاصل ہے وہی مزیت و کرامت عائشہ کو باقی تمام عورتوں کے مقابلہ میں ہے۔“

پس جب مریم کی بزرگی اور برتری کی یہ کیفیت ہے تو اس کے شکریہ کے طور پر لسان الہی نے انہیں حکم دیا کہ وہ ہر وقت خدائے قدوس کی فرماں بردار رہیں اور عبادت گاہ میں دوسروں کے ساتھ نماز میں شریک ہوں۔ قنوت دل کا فعل ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ جو حکم کسی شخص کو ملے وہ اس کے پورا کرنے کے لئے فوراً تیار رہے۔ اس قنوت کا ظہور رکوع و سجود سے ہوتا ہے۔ بار بار مشق کرنے سے اس جذبہ صادقہ میں ترقی ہوتی رہتی ہے، اسی لئے ہر مسلمان پر رکوع اور سجود فرض کیا گیا ہے اور نماز کو معراج المؤمنین فرمایا گیا۔ خود رسول اللہ ﷺ نے اس کو اپنے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک بتایا: قنۃ عینی فی الصلوۃ۔

نبی امی کے لئے پیشین گوئی

ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُونَ اَقْلَامَهُمْ اَتَيْتُكُمْ بِرَبِّكُمْ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُونَ ﴿۷۷﴾

”یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں اور تم ان کے پاس نہ تھے جب وہ اپنے قلم ڈال رہے تھے کہ ان میں سے کون مریم کا کفیل ہو اور تم ان کے پاس نہ تھے جب وہ آپس میں جھگڑ رہے تھے۔“

حضرت مریم کی کفالت و سرپرستی کے لئے بیت المقدس کے خادموں میں جھگڑا ہوا تھا، جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، اگرچہ حضرت زکریا نے وجہ ترجیح بیان کئے، مگر کسی نے ان کو قابل غور خیال نہ کیا۔ آخر فیصلہ اس پر آٹھرا کہ توراۃ لکھنے کے قلم ندی میں ڈالے جائیں جس کا قلم خلاف عادت اوپر کو آئے وہی کفیل مقرر ہو، حسن اتفاق سے یہ سعادت زکریا کے

نصیب میں تھی اور وہ بازی لے گئے۔

ان تمام واقعات کی اطلاع رسول اللہ ﷺ کو نہ تھی اور نہ یہ باتیں آپ کے سامنے ہوئی تھیں، بلکہ صرف وحی والہام کی بنا پر آپ کو سب کچھ معلوم ہو گیا۔ ان حالات کے بیان کرنے کی غرض یہ تھی کہ جو سلوک ہم نے ان جلیل القدر بزرگوں کے ساتھ روا رکھا ہے، جس طرح ہم نے ان کی ہر تکلیف میں نصرت و دستگیری کی ہے، زکریا کو وارث کی ضرورت تھی، اس کو یحییٰ دیا، مریم کے نشو و نما کے لئے روحانی اسباب فراہم کر دیئے اور اس کو تمام دنیا پر فضیلت دی، اسی طرح آپ کے ساتھ ہو گا، ہر وقت تمہاری مدد ہوگی، بہترین جانشین نوازش ہوں گے اور تمام کائنات ارضی و سماوی پر تمہیں برگزیدہ کیا جائے گا۔

مریم سے وعدہ ہائے خداوندی

إِذْ قَالَتِ الْمَلَكَةُ يٰرَبِّیْمُ اِنَّ اللّٰهَ یُبَشِّرُکَ بِکَلِمَۃٍ مِّنْهُ ۖ اَسْمٰهُ النَّسِیْمُ عِیْسٰی ابْنُ مَرْیَمَ وَجِیْہَا الدُّنْیَا وَالْآخِرَۃُ  
وَمِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ ۝ وَیُکَلِّمُ النَّاسَ فِی الْمَهْدِ وَکَهْلًا ۚ وَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝

”جب فرشتوں نے کہا اے مریم! اللہ تم کو اپنے ایک حکم کی خوش خبری دیتا ہے، جس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہو گا، جو دنیا اور آخرت میں معزز اور مقرب بندوں میں سے ہو گا اور وہ لوگوں سے جھولے میں اور بڑا ہو کر باتیں کرے گا اور نیک بندوں میں ہو گا۔“

عمران کی بیوی نے جو دعا کی تھی اس کے لئے دراصل بیٹے کی ضرورت تھی، مگر اب وہی خدمت مریم کے صاحبزادے انجام دیں گے۔ یہ اس دعا کا اثر تھا جو انکی والدہ نے کی تھی کہ اسکو خداوند تعالیٰ نے بغیر شوہر کے ایک فرزند صالح عطا فرمایا۔ حضرت یحییٰ کے پیدا ہونے کا ذکر پہلے آچکا ہے، اس کے تذکرہ سے مقصد یہ تھا کہ وہ واقعہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے تمہید کا کام دے۔ زکریا کو اولاد ہونے کی بظاہر کوئی توقع نہیں، بڑھاپے نے سر کو سفید کر دیا ہے اور عورت بھی بانجھ ہے۔ جب ان حالات کے ہوتے یحییٰ پیدا ہو سکتے ہیں تو یہ کونسی مشکل بات ہے کہ عیسیٰ بغیر باپ کے ہو جائیں۔ سورہ مریم میں یہی ترتیب موجود ہے اور وہاں بھی اسی مقصد کی طرف اشارہ کرنا منظور ہے۔

آگے چل کر آئے گا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کو حضرت آدم کے پیدا ہونے کے مشابہ قرار دیا گیا ہے: ان مثل عیسیٰ عند اللہ کمثل ادم، جب نصاریٰ حضرت آدم کو ماں اور باپ کے بغیر پیدا شدہ مان لینے کے باوجود ان کو خدا نہیں بناتے تو کوئی وجہ نہیں کہ صرف باپ نہ ہونے کی وجہ سے عیسیٰ علیہ السلام تو خدائی کے درجہ پر پہنچ جائیں اور آدم وہی انسان کے انسان ہی رہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے مسیح کا لقب بھی قرآن حکیم میں استعمال ہوتا ہے، اس لئے کہ وہ مریضوں کو صرف چھو کر اچھا کر دیتے تھے۔

بہر حال فرشتوں نے مریم کو ایک صابزادے کی بشارت دی جس کا نام عیسیٰ ہو گا اور جس کے خصائص کبریٰ حسب ذیل ہوں گے:

(الف) وجیہانی الدنیا والاخرۃ: یہودیوں نے حضرت عیسیٰ کی ذات پر نہایت ہی ناپاک الزامات لگائے ہیں، یہاں تک کہ ان کی موت کو بھی وہ لعنتی موت سے تعبیر کرتے ہیں۔ عیسائیوں نے اپنی حماقت و نادانی سے ان بے بنیاد باتوں کو تسلیم کر لیا جو یقیناً از سر تا پا غلط اور بعید از حقیقت ہیں۔ ممکن ہے کہ ایک ظاہر بین مورخ حضرت عیسیٰ کو ناکام نبی قرار دے، کیونکہ اس کی نظر مادیات کی حدود سے آگے تجاوز نہیں کرتی، لیکن جو شخص نور بصیرت سے حیات مسیح کا درس و مطالعہ کرے گا وہ یقیناً تسلیم کر لے گا کہ بیشک وہ کامیاب و باہر اد نبی تھے، انہوں نے اپنی زندگی میں ایسے قریباً ستر آدمی خدا پر ایمان لانے والے پیدا کر دیئے، جنہوں نے خدا کی پادشاہت کے آنے کی مسرت اندوز بشارت مختلف بلاد و امصار میں پہنچادی۔ چنانچہ جس وقت رسول اللہ ﷺ کا ظہور مقدس سر زمین حجاز میں ہوا تو عیسوی قانون کے اصول صحیحہ پر چلنے والے جس قدر نفوس قدسیہ اس وقت سطح ارضی پر موجود تھے فوراً دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے، جن کا تذکرہ قرآن نے ان الفاظ میں کیا ہے: اَفَرَبُّهُمْ مَّوَدَّةَ لِّلَّذِينَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّا نَصْرِيْكَ ۚ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قَسِيْصِيْنَ وَرَهْبَانًا وَاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝۱۰ **وَ اِذَا سَبَّحُوْا مَا اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرَآیْ اَعْيُنُهُمْ تَفِيْضٌ مِّنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اَمَّا فَاكُنْ بِنَا مَعَ الشَّاهِدِيْنَ ۝۱۱ وَمَا لَنَا لَا نُوْفِّیْ بِاِلٰهِهِ وَمَا جَاۤءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۚ وَنَطْلُبُ اَنْ یُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ (المائدہ ۸۲-۸۳)** اور مسلمانوں کی محبت میں سب لوگوں سے زیادہ قریب ان کو پاؤ گے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں، اس لئے کہ ان میں عالم اور درویش ہیں اور اس سبب سے کہ یہ لوگ تکبر نہیں کرتے اور جب اس کو سنتے ہیں جو رسول کی طرف اتارا گیا ہے تو تم ان کی آنکھوں کو دیکھتے ہو کہ آنسوؤں سے امنڈ آتی ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے حق کو پہچان لیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے تو ہم کو ماننے والوں کے ساتھ لکھ لے اور ہم کو کیا ہوا کہ ہم اللہ اور حق بات پر ایمان نہ لائیں جو ہمارے پاس آئی اور توقع یہ رکھیں کہ ہمارا پروردگار ہم کو نیک بختوں کی جماعت کے ساتھ داخل کرے گا۔

وجیہانی الدنیا والاخرۃ کے متعلق دو باتوں کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔ اول تو یہ کہ یہودیوں اور ان تمام لوگوں پر رد ہے جو حضرت عیسیٰ کو ایک ناکام نبی بتاتے ہیں۔ دوسرے اس میں دراصل ایک عظیم الشان پیشین گوئی ہے کہ جس وقت مسلمانوں کی داخلی و خارجی زندگی نہایت ہی بری ہو جائے گی اور وہ ایک مصلح عظیم کے محتاج ہوں گے، جبکہ حضرت مہدی علیہ السلام کی تجدید و اصلاح میں مصروف ہوں گے، اس وقت کی امداد و اعانت کے لئے اس نفس قدسی کو دور باہ بھیجا جائے گا، تاکہ اگر وہ ایک طرف فرزند ان اسلام کے نشو و ارتقا میں امام مہدی کے ناصر و مددگار ہوں تو دوسری جانب قرآن حکیم کا اتباع کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کے امام الانبیاء ہونے کا ثبوت دیں۔

(ب) ویکلم الناس فی البہد وکھلا: سورہ مریم میں آتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جھولے میں بولنا ثابت ہے، اس کی تفصیل خود قرآن نے اس طرح بیان کی ہے: یُرِیْمُ لَقَدْ جِئْتَ شَیْئًا فَرِیًّا ۝ یَا لَحْتَ هَؤُلَاءِ مَا کَانَ اَبَیْکَ اَمْرًا سُوًّا وَمَا کَانَ اَمْرًا لِّکَ بَغِیًّا ۝ فَاسْأَلْ اِلَیْهِ ۚ قَالُوا کَیْفَ نُنْکِحُ مَنْ کَانَ فِی الْبَہْدِ صَبِیًّا ۝ قَالَ اِنِّیْ عِنْدَ اللّٰهِ ۙ اِنِّیْ اِلَیْهِ اَلْتُکَلِّمُ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا ۝ وَجَعَلَنِیْ مُبْرَکًا اَیْنَ مَا کُنْتُ ۚ وَ اَوْصَنِیْ بِالصَّلٰوَةِ وَ الزَّکٰوَةِ مَا دُمْتُ حَیًّا ۝ وَ بَرًّا بِوَالِدِیْ ۚ وَلَمْ یَجْعَلَنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا ۝ وَالسَّلَامُ عَلٰی یَوْمِ وُلِدْتُ وَ یَوْمِ اَمُوْتُ وَ یَوْمِ اُنْبِئْتُ حَیًّا ۝ (مریم ۳۳-۳۷) اے مریم! تم نے بڑا غضب کیا، اے ہارون کی بہن! تمہارا باپ برا آدمی نہ تھا اور نہ تمہاری ماں بدکار تھی، پس مریم نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ لوگ کہنے لگے، ہم اس سے کیونکر بات کریں جو گود میں بچہ ہی ہے۔ بچہ بول اٹھا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھ کو کتاب دی اور مجھ کو نبی بنایا اور جہاں کہیں بھی رہوں مجھ کو مبارک بنایا اور جب تک زندہ ہوں مجھ کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا اور مجھ کو اپنی ماں کا تابع اور بنایا اور مجھے سرکش بد بخت نہیں بنایا اور مجھ پر سلام ہے جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن میں انتقال کروں گا اور جس روز زندہ کر کے اٹھایا جاؤں گا۔

مریم شادی شدہ نہ تھیں، اس لئے ان کی قوم بچے کو دیکھ کر پریشان ہوئی۔ وہ خود تو صوم سکوت سے تھیں اس لئے انہوں نے بچے کی طرف اشارہ کر دیا: فَاِمَّا تَرِیْنَ مِنَ الْاَنْبِیَآءِ اَحَدًا ۙ فَقُلُوْا لَیْ ۤیَنْدَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اَکَلِمَ الْیَوْمَ اَنْسِیًّا ۝ (مریم ۲۶) ”پھر اگر کسی آدمی کو دیکھو تو اشارہ سے کہہ دی جیو کہ میں نے رحمٰن کے لئے روزہ کی منت مان رکھی ہے۔ پس میں آج کسی آدمی سے بات نہ کروں گی“، مگر مریم سے لوگوں نے کہا کہ ایسے بچے سے ہم کیسے بات کریں جو ابھی جھولے ہی میں ہے۔

تدبر فی القرآن کے لئے سب سے زیادہ اہم اور ضروری بات یہ ہے کہ انسان ان معانی کو معلوم کرنے کی سعی و کوشش کرے جو رسول اکرم کے صحابہ کی اکثر جماعت نے سمجھا ہوا، کیونکہ اتباع السواد الاعظم کے مطابق ہمیں قرآنی آیات کا وہی مفہوم معین کرنا پڑے گا جس کی طرف اکثر صحابہ گئے ہوں۔ ظاہر ہے کہ اگر ایک استاد کے اکثر شاگرد کسی مسئلہ میں خاص رائے رکھتے ہیں، لیکن صرف معدودے چند دوسری رائے ظاہر کرتے ہیں تو ارباب خرد کا یہی فیصلہ ہو گا کہ جو اکثر شاگردوں کی رائے ہے وہی ان کے استاد کا مذہب ہو گا۔ چنانچہ تکلم فی البہد کے متعلق جمہور صحابہ کا وہی مذہب ہے جو زباں زد خاص و عام ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اُس وقت کلام کیا ہے جبکہ عام طور پر بچے نہیں بولتے۔ کیونکہ اگر ہر بچہ اس وقت بولا کہ تاتھا تو مریم کے اس کی طرف اشارہ کرنے پر قوم برا فروختہ ہو کر یہ نہ کہتی: کیف نکلم من کان فی البہد صبیبا۔ قرآن حکیم کے الفاظ سے تو صاف صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی ولادت کے بعد ہی یہ گفتگو ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ حضرت مریم اس بچے کی پیدائش کو ہیکل کے کاهنوں سے مخفی نہیں رکھ سکتی تھیں، کیونکہ وہ بھی اسی جگہ رہتے تھے۔ سالہا سال تک ولادت مسیح کا قصہ پردہ خفا میں رہے، ناقابل تسلیم ہے، ادھر حدیث کے الفاظ بباگ دہل بتا رہے

ہیں کہ خود حاصل شریعت کا اس بارے میں کیا مذہب ہے: ماتکم احدی صغرة الا عیسویٰ وصاحب جریج“ عیسیٰ اور صاحب جریج کے سوا کسی نے بھی صغریٰ میں کلام نہیں کیا۔“ ان دلائل کی بنا پر ہم یقیناً اس بات کا دعویٰ کر سکتے ہیں کہ تکلم فی البہد کے متعلق مرزا غلام احمد صاحب قادیانی اور ان کی دونوں جماعتوں کا جو مذہب ہے وہ حق اور صداقت سے دور ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جھوٹے میں جو کچھ کلام کیا اس کا مقصد صرف اتنا تھا کہ حضرت مریم کی بریت و پاکدامنی کا اظہار ہو۔ اگر یہ واقعہ نہ ہوتا تو یہودیوں کی تاریخ پر اعتماد کر کے دنیا آج تک مریم کو معاذ اللہ ایک فاحشہ عورت تصور کرتی۔ اس میں حضرت عیسیٰ کے لئے کوئی شرف و عزیت نہیں ہے، بلکہ ان کی والدہ کی بزرگی اور طہارت کا اعلان ہے۔ اسی ذیل میں انہوں نے اپنی نبوت کے اصول اساسی بھی بیان کر دیئے۔ یہ مطلب نہ تھا کہ وہ اس وقت ان پر عمل بھی کرتے تھے، جس طرح کہ ہر ایک نابالغ مسلمان لڑکے کو معلوم ہے کہ نماز فرض ہے، مگر جب اس کا وقت آئے گا تو وہ اس کو ادا کرے گا۔ اس لئے حضرت عیسیٰ کے کلمات طیبات صداقت پر مبنی ہیں، رہی یہ بات کہ نبوت چالیس سال کے بعد ملتی ہے تو اس کے لئے بھی ہمارے پاس کوئی شرعی حجت نہیں۔ ان ہم الاخصصون اور جب تک کہ کوئی کھلی اور ناقابل تاویل دلیل ہمارے پاس نہ ہو اس کو ہم اپنے آئندہ دعاوی کے لئے بنیاد قرار نہیں دے سکتے۔

آیت مذکورۃ الصدر سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے ہوں گے، کیونکہ وہ برابر ابوالدتی فرماتے ہیں۔ حالانکہ ان سے پہلے یحییٰ اپنے لئے برابر ابوالدیہ کے الفاظ استعمال کرتے ہیں، کیونکہ ان کے والد بھی تھے اگر حضرت عیسیٰ کے والد ہوتے تو اپنی والدہ کے ساتھ ساتھ ان کا تذکرہ بھی ضرور کرتے۔

آیت زیر بحث میں عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق مریم سے دو وعدے کئے گئے ہیں جن میں سے ایک کے پورا ہونے کا ذکر تفصیل کے ساتھ سورہ مریم میں موجود ہے اور باوجودیکہ پورے چھ سو سال کے بعد رسول اللہ پر قرآن کا نزول ہوتا ہے، مگر اس میں دوسرے وعدہ کے ایفا کا کوئی تذکرہ نہیں آتا، اس لئے ہمیں یہی ماننا پڑے گا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ نازل ہوں گے اور جس کے آنے کی خوش خبری انہوں نے اپنی امت کو دی تھی، اس کی امامت و پیشوائی کی تصدیق میں تمام دنیا کے سامنے گویا ہوں گے اور اس طرح دوسرا وعدہ پورا ہو کر رہے گا اور یہی جمہور اہل اسلام کا مذہب ہے اس پر مفصل بحث آگے آئے گی، انشاء اللہ۔

(ج) ومن الصالحین: کسی شخص کو حق نہیں کہ ان کی تمام تر حیات میں سے ایک واقعہ بھی قابل اعتراض بتا سکے، بلکہ ان کا شمار اعلیٰ درجہ کے نیک لوگوں میں سے ہو گا۔ اس آیت نے بتا دیا کہ یہودیوں نے بغض وعداوت کی وجہ سے حضرت عیسیٰ کی جو تاریخ مرتب کی ہے، وہ سر تا پا غلط اور اس لئے ہرگز قابل اعتماد نہیں ہے۔

عیسائی اس آیت سے ایک غلط استدلال کرتے ہیں۔ ہم تفصیل کے ساتھ گزشتہ اوراق میں بحث کر آئے ہیں، اس جگہ صرف ایک نکتہ بیان کرنا مقصود ہے۔ ان اللہ یشہک بکلمۃ منہ کے لفظ منہ سے وہ لوگ یہ دلیل پکڑتے ہیں کہ اس میں

ضمیر کا راجع اللہ کی طرف ہوتا ہے، اس لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ایک جز ہیں۔ اگر یہ کج فہم ذرا دقت نظر سے کام لیتے تو ان پر ان کی غلطی منکشف ہو جاتی۔ سورہ ۵۵ جاہلیہ میں تمام کائنات ارضی و سماوی کے لئے بھی یہی منہ آیا ہے: وَ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ (الجماعہ ۱۳) اس سے بھی زیادہ اس آیت کو سامنے لائے: وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ (الحجر ۲۹) میں نے آدم میں اپنی روح پھونک دی، پس اگر منہ کی بنا پر ان کے نزدیک حضرت عیسیٰ خدا کا جز بن سکتے ہیں تو زمین و آسمان کی ہر چیز اور آدم بھی اس کے مستحق ہیں جو حق ابن مریم کو دیا گیا ہے۔

## مریم کا تعجب

قَالَتْ رَبِّ اَتَىٰ بِكَ ذٰلِكَ اِلٰهًا مِّنْ دُونِ الَّذِي خَلَقَ مَا يَشَاءُ ۚ اِذَا قُضِيَ اَمْرًا فَاِنَّا يٰقُوْلُوْا لَهُ كُنْ فَيَكُوْنُ ۚ وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰتِ وَالْاِنْجِيْلَ ۚ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْ اِسْرٰءِيْلَ

“مریم نے کہا اے میرے رب! میرے یہاں لڑکا کیسے ہو گا حالانکہ کسی مرد نے مجھے چھوا تک نہیں۔ فرمایا اسی طرح اللہ جو چاہتا ہے پیدا کر دیتا ہے، وہ جب کسی کام کو پورا کرنا چاہتا ہے تو بس اس کو کہہ دیتا ہے ہو جاتا ہو جاتا ہے اور اللہ عیسیٰ کو کتاب اور حکمت اور توراۃ اور انجیل سکھائے گا اور وہ بنی اسرائیل کی جانب رسول ہو گا۔“

دنیا کے عام دستور کے مطابق مرد و عورت کے اختلاط سے اولاد پیدا ہوتی ہے، اسی بنا پر مریم نے تعجب ظاہر کیا کہ خاوند ہونے کے بغیر میرے یہاں کس طرح اولاد ہو سکتی ہے، خدا نے کہا کہ دنیا میں قانون تو وہی ہے، مگر ہم اس کے بغیر بھی کر سکتے ہیں۔ دراصل ہر چیز کی علت تامہ محض ارادۃ الہیہ ہے، تمہارے حق میں صرف اتنا ہو گا کہ تمام ان قوتوں کو تمہارے اندر جمع کر دیا جائے گا جو سلسلہ توالد و تناسل کے لئے ضروری ہیں اور اس طرح مریم کو اطمینان دلادیا گیا۔

جس وقت حضرت زکریا کو یحییٰ کی خوش خبری دی گئی تو انہوں نے بھی ازراہ تعجب یہی سوال کیا تھا: اِنِّیْ یٰکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ۔ ایسے ہی جب حضرت ابراہیم کو ایک غلام علیم اور فرزند صالح کی مسرت اندوز بشارت دی گئی تو ان کی بیوی نے کہا: عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ: جواب ملا: كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ ۚ اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ۝ (الذریٰ۲۹ تا ۳۰) بات یہ ہے کہ یہ لوگ سب کے سب کبر سنی کو پہنچ چکے تھے اور اس عمر میں عموماً اولاد نہیں ہوتی۔ اس زمانہ میں ولد صالح کی پیدائش یقیناً ماں باپ کے لئے ایک آیت مبینہ ہے۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام کا بغیر باپ کے پیدا ہونا تو اور بھی عظیم الشان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مریم اور اس کے صاحبزادے کو دنیا کے لئے زبردست نشانی بتایا گیا ہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ بغیر باپ کے اولاد کا پیدا ہونا، قانون قدرت کے خلاف ہے، ان کے لئے صرف اتنا ہی جواب کافی ہے کہ پہلے آپ تمام قوانین ولادت کا احاطہ کر لیجئے، پھر اس سوال کی طرف توجہ ہو گی، ورنہ خطر القتاد۔ مریم کو جو لڑکا دیا جائے گا اس پر حسب ذیل نعمتیں نازل ہوں گی:



(۱) اللہ تعالیٰ اس کو کتاب حکمت توراۃ اور انجیل کا علم نوازش کرے گا۔

(۲) اسے بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجا جائے گا۔

اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صرف بنی اسرائیل کے لئے مبعوث کئے گئے ہیں۔ انجیل میں بھی اس کی شہادت ملتی ہے: ”اس نے جواب میں کہا کہ میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا۔“ (متی، ۲۲: ۵۱) متی میں ہے کہ جس وقت انہوں نے اپنے حواریوں کو تبلیغ کے لئے بھیجا تو انہیں خصوصیت کے ساتھ یہ وصیت کی: ”غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ بنی اسرائیل کے گھر انے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا۔“ (متی ۱۰: ۶) گویا آج جو کچھ دنیائے عیسائیت میں ہو رہا ہے وہ یکسر تعلیم عیسیٰ کے مخالف ہے۔

### عیسوی معجزات

اِنَّ قَدْ جِئْتَكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ ۚ اَنْتُمْ اَخْلَقْتُمْ لَكُمْ مِنَ الطَّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَانْفُخْ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُتِرَى الْاَكْمَةُ وَالْاَكْبَرُصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدْخِرُوْنَ ۚ فِىْ يَوْمٍ تَكُوْنُ لَكُمْ لَآئِيَةٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

”میں تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے ایک نشانی لے کر آیا ہوں، میں تمہارے لئے کچھڑے پرند کی سی شکل بناتا ہوں، پھر اس کے اندر پھونک مارتا ہوں تو اللہ کے حکم سے وہ اڑنے والا جانور ہو جاتا ہے اور اللہ کے حکم سے مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کرتا ہوں اور مردوں کو زندہ کرتا ہوں اور جو کچھ تم کھاتے ہو اور جو اپنے گھروں میں ذخیرہ رکھتے ہو اس کی خبر دیتا ہوں اگر تم مومن ہو تو یقیناً اس میں تمہارے لئے نشان ہے۔“

اس آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے چند معجزات کا تذکرہ کیا گیا ہے، ان کے بیان سے مقصد یہ ہے کہ جب ایک کامل بزرگ کسی کام کا پختہ ارادہ کر لے اور اتفاق سے وہاں اسباب موجود نہ ہوں تو اللہ تعالیٰ اس کی آرزو پورا کرنے کے لئے تمام اسباب جمع کر دیتا ہے۔ ان معجزات میں حضرت عیسیٰ کی قوت ارادی اور فراست ایمانی کے نتائج و ثمرات بیان کئے گئے ہیں۔ عام طور پر انسان یہ خیال نہیں کر سکتا کہ مردہ چیز بھی زندہ ہو سکتی ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام خداوند قدوس پر اعتماد و توکل کر کے کہتے ہیں کہ میں تمہارے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آیا ہوں اور وہ یہ ہیں:

(۱) مٹی سے پرند بناتا ہوں، اللہ تعالیٰ اس میں تمام اسباب حیات جمع کر دیتا ہے، اور وہ اڑنے لگتا ہے۔

(۲) مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو اپنی توجہ سے اچھا کر دیتا ہوں۔

(۳) مردوں کو اللہ کے حکم سے زندہ کرتا ہوں، یہ خوارق عادت امور میری طاقت میں نہیں ہیں، میں فقط ارادہ الہیہ کا مظہر ہوں۔ یہ معجزات دراصل تمثیلی رنگ میں پیشین گوئیاں تھیں، اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے کہ





مال ناحق کھاتے تھے۔ دوسری جگہ آتا ہے: وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُلْفٍ ۖ وَ مِنَ الْبَقَرِ وَ الْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُومَهُمَا إِلَّا مَا حَبَلَتْ ظُهُورُهُمَا أَوْ الْحَوَايَا أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۚ ذَلِكَ جَزَيْنَهُمْ بِبَغْيِهِمْ (الانعام ۱۴۶) ”اور یہودیوں پر ہم نے تمام ناخن والے جانور حرام کر دیئے تھے اور گائے اور بکری میں سے ان دونوں کی چربی ہم نے ان پر حرام کر دی تھی، جو ان کی پشت یا انتڑیوں میں لگی ہوئی یا ہڈیوں سے ملی ہوئی ہو، یہ ان کی شرارت پر ہم نے سزا دی تھی۔“

بہر حال ابن مریم کی نبوت یہودیوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے تھی، اس لئے انہوں نے فرمایا کہ تم آنکھیں بند کر کے میرے پیچھے چلے آؤ اور میری تعلیم تو بہت ہی مختصر ہے، جس کی تلخیص صرف دو لفظوں میں بیان کی جاسکتی ہے کہ صرف ایک خدا کی غلامی کرو، یہ اسی خدائے قدوس کی ذات پر اعتماد و توکل کا نتیجہ ہے کہ میرے تمام ارادے پورے ہو جاتے ہیں۔ پس اگر تم بھی اس امر کے آرزو مند ہو کہ اس قسم کے واقعات تم سے بھی ظاہر ہوں تو اس خدائے واحد کی ذات سے تمسک و اعتصام کرو اور یہی صراطِ مستقیم ہے۔

جب ہم انجیل کی طرف رجوع کرتے ہیں تو اس کے اوراق بھی اس حقیقت کا انکشاف کرتے ہیں کہ انہوں نے صرف تو حید کی تعلیم دنیا کے سامنے پیش کی تھی۔ چنانچہ متی میں ہے ”پھر ایلئس اسے ایک بہت اونچے پہاڑ پر لے گیا اور دنیا کی ساری پادشاہتیں اور ان کی شان و شوکت اسے دکھائی اور اس سے کہا کہ اگر تو جھک کر مجھے سجدہ کرے تو یہ سب کچھ تجھے دے دوں گا۔ یسوع نے اس سے کہا اے شیطان! دور ہو کیونکہ لکھا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر۔“ (متی ۱۴: ۸، ۹، ۱۰) مگر عیسائیوں نے اس سے انحراف و اجتناب کیا اور آج وہ دنیا کو تثلیث کی دعوت دے رہے ہیں۔

### من انصاری الی اللہ

فَلَمَّا أَحَسَّ عِيسَى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ ۚ قَالَ الْخَوَارِثُونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ ۖ إِمَّا بِاللَّهِ ۖ وَ أَشْهَدُ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ۝ رَبَّنَا إِمَّا بِنَا أَنْزَلْتَ وَ أَتَّبَعْنَا الرَّسُولَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ۝

”پھر جب عیسیٰ نے ان کی طرف سے کفر محسوس کیا تو کہا کہ کون ہیں جو اللہ کی طرف ہو کر میری مدد کریں۔ حواریوں نے کہا ہم اللہ کے مددگار ہیں، ہم اللہ پر ایمان لائے اور گواہ ہو کہ ہم مسلمان ہیں۔ ہمارے رب! جو کچھ تو نے اتارا ہم اس پر ایمان لے آئے اور رسول کی پیروی کی پس تو ہمیں گواہی دینے والوں کے ساتھ لکھ۔“

جب حضرت مسیح نے دیکھا کہ یہودی میری بات کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ انکار کئے جارہے ہیں اور میرے قتل کے درپے ہیں، تو انہوں نے اپنے اتباع و مقلدین سے دریافت کیا کہ اس تعلیم صحیح کو قائم رکھنے کے لئے کون شخص میرا معاون و مددگار بننے کو تیار ہے؟ حواریوں نے فوراً اپنی خدمات پیش کیں اور عرض کیا کہ ہم ان تعلیمات صالحہ کو باقی رکھنے کے لئے اپنی زندگی وقف کرتے ہیں، خداوند قدوس کا ہر حکم ماننے کو تیار ہیں اور اس رسول کے اسوۂ حسنہ کو ہمیشہ اپنا نصب العین رکھیں گے۔

ہمیں اس امر کا پورا یقین ہے کہ اس تعلیم پر عمل کرنے والے ہر جگہ کامیاب و باہر اور ہیں گے، پس تو بھی ہمارے ساتھ وہی معاملہ کر جو تو انبیاء و رسل کے اعوان و انصار کے ساتھ کیا کرتا ہے۔

## مکر کی تشریح

وَمَكْرُهُمْ وَكَرَهُوا مَكْرَ اللَّهِ ۖ وَاللَّهُ خَيْرٌ مِنَ الْمَكْرِينَ ﴿٦٠﴾

”اور انہوں نے تدبیر کی اور اللہ نے تدبیر کی، اور اللہ سب تدبیر کرنے والوں سے بہتر ہے۔“

افسوس ہے کہ بعض کوتاہ اندیش لوگوں نے اس قسم کی آیات پر بیجا اعتراض کئے ہیں اور پھر ان کے جواب میں لوگوں کو عجیب عجیب حیرانیاں پیش آئی ہیں، ہمیں دفاع کی خاطر دور از کار تاویل کی ضرورت نہیں، بلکہ ذرا غور کرنے سے خود ہی مطلب صاف نظر آنے لگتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ مکر کرنے والا یا تو ان قوانین الہیہ سے یک قلم ناواقف محض اور بے خبر ہوتا ہے، جن کے مطابق انسانی اعمال کے نتائج و ثمرات ظہور پذیر ہوتے ہیں یا وہ کسی جوش غضب اور طیش میں آکر ان اصول و کلیات کو عمداً نظر انداز کر دیتا ہے اور ان جرائم کا ارتکاب شروع کر دیتا ہے جن کا نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ کون شخص ہے جو چاہے کن راجاہ در پیش کی شہرہ آفاق حقیقت سے ناشنا ہے اور جس نے اس کو ہکمت و مہمت سنا اور سمجھا نہ ہو، مگر پھر بھی ہم روزمرہ اس امر کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ بعض مکار لوگ ایک بے گناہ شخص کو اپنے دام فریب میں مبتلا کر کے ہلاک و برباد کرنا چاہتے ہیں، لیکن ان کا یہ دجل و فریب دراصل خود ان کی تباہی کا سامان فراہم کرتا جاتا ہے، یہاں تک کہ پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے اور قبل اس کے کہ وہ بیگناہ ان کے دام فریب میں گرفتار ہو وہ خود ہی عذاب الہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

اس آیت میں دراصل اس جزائے اعمال کے قانون کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات صالحہ کو فغا کرنے اور ان کا نام و نشان مٹا دینے کی خفیہ تدبیریں کی ہیں، لیکن خدائے حق نواز کا فیصلہ اس کے خلاف ہے، اس لئے وہ تو ناکام و خاسر رہتے ہیں اور حضرت عیسیٰ ان کے ضرر و نقصان سے بچائے جاتے ہیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ اس کی مزید تشریح و توضیح کے لئے کچھ اور آیات بھی پیش کر دیں کہ حقیقت اصل یہ سامنے آجائے۔  
(۱) سورۃ انفال میں آتا ہے: **وَإِذْ يَبْغُوكَ الَّذِينَ كَفَرُوا الْيَهُودَ أَوْ يَحْتَفِلُونَ فِي الْكُفْرِ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَيْرٌ مِنْهُمْ** (انفال ۳۰) کفار مکہ رسول اللہ کو گرفتار، قتل یا جلاوطن کرنے کی خفیہ تدابیر میں مصروف ہیں، مگر وہ آپ کے غبار راہ کو بھی نہیں پاسکتے، ناکام و خاسر غار ثور سے گھروں کو واپس لوٹتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پورے اطمینان کے ساتھ مدینہ میں رونق افروز نظر آتے ہیں۔

(۲) سورۃ یوسف میں ہے: **وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ أَجْمَعُوا أَمْرَهُمْ وَهُمْ يَنْهَوْنَ (یوسف ۱۰۲)** برادران یوسف عزم مصمم کر کے آتے ہیں کہ یوسف کو مار ڈالیں گے، مگر باوجود اس کے وہ کامیاب نہیں ہوتے اور یوسف زندہ سلامت

رہتے ہیں۔

(۳) سورۃ نمل میں ہے: وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ﴿٥﴾ قَالُوا تَغَاسَمُوا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهُ وَأَهْلَهُ ثُمَّ لَنَقُولَنَّ لِوَلِيِّهِ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ أَهْلِهِ وَإِنَّا لَصٰدِقُونَ ﴿٦﴾ وَمَكَرُوا مَكْرًا وَمَكَرْنَا مَكْرًا وَهُمْ لَا يُشْعُرُونَ ﴿٧﴾ نمل ۵۰ تا ۵۸) اور اس شہر میں نو آدمی تھے جو ملک میں فساد کرتے تھے اور اصلاح نہ کرتے تھے، وہ کہنے لگے کہ باہم اللہ کی قسم کھاؤ کہ ہم ضرور رات کو صالح اور اس کے گھر والوں کو جاہلیں گے پھر ہم ان کے وارث سے کہہ دیں گے کہ ان کے متعلقین کے ہلاک ہونے کے وقت ہم تو موجود ہی نہ تھے اور ہم بیشک سچے ہیں اور انہوں نے ایک خفیہ تدبیر کی اور ہم نے بھی ایک خفیہ تدبیر کی اور ان کو خبر بھی نہ ہوئی۔ یہ لوگ حضرت صالح علیہ السلام کو قتل کرنے کی فکر میں ہیں، مگر نتیجہ بالکل ان کے خلاف نکلتا ہے: فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۚ اِنَّآ دَٰمِرُوْنَهُمْ وَقَوْمَهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٥﴾ فَبَلَكَ يَوْمَهُمْ تَخٰوِيَةً مُّبَآءٍ عَلِمُوْا ۚ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَعْلَمُوْنَ ﴿٦﴾ وَآدَمُ الْبَيْنُ الْاَيْمَنُ اَمَنُوْا وَكَانُوا يَتَّقُوْنَ ﴿٧﴾ (نمل ۵۱ تا ۵۳) پس دیکھو ان کی خفیہ تدبیر کا کیا انجام ہوا کہ ہم نے ان کو اور ان کی ساری قوم کو ہلاک کر دیا۔ سو ان کے ظلم کے سبب یہ ان کے گھر ڈھسے ہوئے پڑے ہیں بیشک اس میں جانے والوں کے لئے بڑی نشانی ہے، اور جو ایمان لائے تھے اور ڈرتے تھے ان کو ہم نے بچا لیا۔

(۴) وَالَّذِينَ يَبْكُورُونَ السَّيِّئَاتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۚ وَ مَكْرٌ اُولٰٓئِكَ هُوَ يُنَوِّرُ (فاطر ۱۰) اور جو لوگ بڑی تدبیریں سوچتے رہتے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہے، اور ان کا مکر ہی نابود ہو گا۔

(۵) اسی سورت میں آگے چل کر آتا ہے: وَلَا يَحِثُّ الْبُكَرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِأَهْلِهِ (فاطر ۴۳) اور بری تدبیر کا وبال بری تدبیر والوں ہی پر پڑتا ہے۔

(۶) قَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَئِنْ لَّمْ يُنْصِرْهُمُ اللّٰهُ لَيَكُونُنَّ مِنَ الْخٰوِعِيْنَ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ قَوْنِهِمْ وَاَسْلَمَ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ (النحل ۲۶) ان کے اگلے لوگ مکر کر چکے ہیں پس ان کی عمارت پر بنیادوں کی جانب سے اللہ کا حکم آیا پھر ان کے اوپر سے ان پر چھت گر پڑی اور ان پر ایسی جانب سے عذاب آیا کہ ان کو خبر بھی نہ تھی۔

یہ تمام آیات تمہارے سامنے ہیں ان کو پڑھو اور بار بار پڑھو، ان کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ جو لوگ انبیاء و رسل کی مخالفت کرتے ہیں، ان کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں اور ارباب حق و صدق کی تباہی و بربادی کے منصوبے سوچتے ہیں وہ خود ہی بمصدق چاہ کن راجا در پیش ور طہ ہلاکت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہودیوں نے خدا کے ایک برگزیدہ انسان کو قتل کرنے کی کوشش کی، مگر خدا نے ان کو ہمیشہ کے لئے دوسروں کا غلام و محکوم بنادیا اور ان پر غیروں کی بندگی کی لعنت نازل کر دی۔ اسی طرح جس قوم اور فرد نے راہ حق سے انحراف کیا ہے، دوسروں کو منحرف ہونے کی ترغیب دی ہے اور دعاۃ حق و صدق کی کوششوں کو کچلنے کی ٹھان لی ہے، تو انجام کار وہی ناکام و خاسر رہے ہیں۔ الا ان حزب الشیطن ہم الخصامون۔

## وعدہ ہائے خداوندی

إِذْ قَالَ اللَّهُ لِيُحْيِيَ إِبْرَاهِيمَ مَتَوَفِّيكَ وَرَافِعَكَ إِلَىٰ مَوْطِئِكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ثُمَّ إِنَّهُ مَرْجِعُكُمْ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿٥٥﴾

”جس وقت اللہ نے کہا اے عیسیٰ! میں تجھے وفات دینے والا ہوں اور تم کو اپنی جانب اٹھانے والا ہوں اور جو کافر ہیں ان سے تجھ کو پاک کرنے والا ہوں اور جن لوگوں نے تیری پیروی کی ہے ان کو ان پر جنہوں نے تیرا انکار کیا قیامت کے دن تک فوقیت دینے والا ہوں، پھر میری ہی جانب تم کو لوٹنا ہے پھر میں ان باتوں میں تمہارے درمیان فیصلہ کروں گا جن میں تم اختلاف کرتے تھے۔“

اس تدبیر کا ظہور اس وقت ہوا جبکہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے گرفتار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ حضرت عیسیٰ کو یہ خیال ہوا کہ ان بد بختوں کی سعی و کوشش کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ میری تعلیم کا نام و نشان مٹ جائے گا اور اللہ کا نام لینے والا کوئی بھی باقی نہ رہے گا۔ غزوہ بدر کے موقع پر اسی قسم کا خیال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہوا تھا۔

لیکن ہم نے عیسیٰ کو اطمینان دلایا کہ غم کرنے کی کوئی بات نہیں، اس وقت یہ لوگ نہ تمہیں گرفتار کر سکتے ہیں اور نہ تم پر کسی قسم کا غلبہ حاصل کر سکتے ہیں، بلکہ ہم تمہیں وقت موعود پر طبعی موت سے ماریں گے۔ اسی حفاظت کو دوسری جگہ اظہار نعمت کے طور پر ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَ إِذْ كَفَفْتُ بَنِي إِسْرَءِيلَ عَنْكَ (المائدہ ۱۱۰) ”جب بنی اسرائیل کو میں نے تم سے روک دیا“ اور روایات یہود کے مطابق ہم حضرت عیسیٰ کا گرفتار ہونا تسلیم کر لیں تو یہ آیت غلط ٹھہرتی ہے اور باز رکھنے کا وہ مفہوم باقی نہیں رہتا جو اس کا اصلی مطلب ہے۔ اسی قسم کی آیت ایک اور جگہ بھی آتی ہے: وَ اذْ كُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّتَّسُطُوا اِلَيْكُمْ اَيَّدِيْهِمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ (المائدہ ۱۱) ”اللہ کا وہ انعام یاد کرو جو تم پر ہوا جب بعض لوگوں نے ارادہ کیا کہ تمہاری طرف ہاتھ بڑھائیں تو اس نے ان کے ہاتھوں کو تم سے روک دیا۔“

رسول اللہ اور چند صحابہ دیت وصول کرنے کی غرض سے بنو نضیر کے پاس جاتے ہیں، وہ لوگ آپ کو وہاں بٹھا کر اس لئے وہاں سے ہٹ جاتے ہیں کہ چکی کا پات اوپر سے گر کر آپ کو شہید کر دیں، مگر آپ کو ان کے خدع و فریب کی اطلاع مل جاتی ہے۔ اٹھ کر وہاں سے چلے جاتے ہیں اور ان کی تمام تدبیریں اکارت جاتی ہیں۔ پس اس آیت کو پیش نظر رکھ کر ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مخالفین اپنی حیلہ سازیوں میں بالکل ناکام و خاسر رہے ہیں۔

رجوع الی المقصود

آیت زیر بحث میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ سے چار وعدے کئے ہیں، اسی ترتیب سے ہم ان کی ضروری تشریح کرتے ہیں:

(الف) انی متوفیک: ہم پہلے بتا آئے ہیں کہ یہودی حضرت عیسیٰ کے سخت ترین دشمن بن گئے تھے۔ سب کے سب اسی فکر میں تھے کہ انہیں مار ڈالیں۔ چنانچہ عید الفطر کے روز وہ انہیں پلاطوس، والی شام کے پاس لے گئے اور اس کی عدالت میں ان پر حسب ذیل الزامات لگائے:

(۱) یہ اپنے آپ کو مسیح پادشاہ کہتا ہے، لوگوں کو قیصر کا محصول ادا کرنے سے روکتا ہے اور حکومت کے خلاف بغاوت کے جراثیم پھیلاتا ہے۔

(۲) یہ کافر ہے اس لئے کہ یہ ملت اسرائیل کی سخت توہین و تذلیل کرتا ہے اور اپنے آپ کو خدا اور خدا کا بیٹا کہتا ہے۔

پہلے الزام کے متعلق حضرت عیسیٰ کا جواب یہ تھا کہ دنیا میں انبیاء و رسل اصلاح انسانیت کے لئے آتے ہیں نہ کہ افساد فی الارض کے لئے، میں بغاوت نہیں پھیلاتا بلکہ اصلاح کا بیج بوری ہوں۔ دوسرے جرم کی بابت وہ یہ کہتے تھے کہ دراصل تم خود شریعت اسرائیل کو ترک کر چکے ہو۔ اب تمہارے اکاذیب و باطل ہیں جنہوں نے مذہب کا نام اختیار کر لیا ہے۔ پس میں آیا ہوں کہ تم کو اصل تورات کی طرف لے آؤں، مگر یہودیوں نے ان کی کسی بات کو بھی تسلیم نہ کیا اور حاکم شہر کو مجبور کیا کہ وہ ان کی موت کا فتویٰ صادر کرے۔

## توفی کی تحقیق

لغت میں توفی کے معنی اخذ الشی وافیاً تاماً کے آتے ہیں یعنی کسی چیز کا پورا پورا لیتا۔ مردہ اپنی زندگی کا پورا حصہ پالیتا ہے، اس لئے اس کو بھی متوفی کہتے ہیں: **اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِينَ مَوْتِهَا (الزمر ۴۲)** ”اللہ جانوں کو ان کے مرتے وقت قبض فرمالتا ہے“، دوسری جگہ آتا ہے: **قُلْ يَتَوَفَّكُم مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي ذُكِّرَ بِكُمْ (السجده ۱۱)** ”کہہ دو کہ ملک الموت جو تم پر مقرر ہے تمہاری جان قبض کرے گا“۔ بعض لوگ قرآن نہ جاننے کی وجہ سے بیان کیا کرتے ہیں کہ قرآن میں جس جگہ توفی کا لفظ ذی روح کے لئے استعمال ہوا ہے اور اللہ اس کا فاعل ہے تو اس کے معنی قبض روح کے سوا اور کچھ نہیں ہوتے، اس قاعدہ کی غلطی واضح کرنے کے لئے صرف ایک آیت پیش کر دینا کافی ہے: **وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّكُم بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُم بِالنَّهَارِ (الانعام ۶۰)** ”اور وہی ہے جو رات کو تمہیں سلا دیتا ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم دن میں کر چکے ہو“۔

قرآن نے تمام اختلافات کو دور کرنے کے لئے آل عمران کی ابتدا میں ایک قاعدہ معین کر دیا ہے اور وہ یہی ہے کہ مشابہات کو محکمات پر عرض کیا جائے۔ اسی قاعدہ کے مطابق اب ہم حضرت عیسیٰ کی وفات و حیات کے متعلق قرآن کی آیات میں درس و فکر کرتے ہیں، تو سب سے پہلے سورہ نساء ہمارے سامنے آتی ہے، جس میں دو باتوں کا فیصلہ کیا گیا ہے: **وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ (النساء ۱۵)** یہودیوں نے نہ تو حضرت عیسیٰ کو قتل ہی کیا اور نہ ہی صلیب دیا۔ ان محکمات کو تسلیم کرنے کے بعد ان وعدوں کو یاد کیجئے جو گزشتہ آیات میں مریم سے کئے گئے ہیں: **يُكَلِّمُ النَّاسَ فِي النَّهْدِ وَكَهَلًا (مریم ۴۶)** ان دو میں

سے صرف ایک کے ایفاء کا تذکرہ سورہ مریم میں آتا ہے: اِنِّیْ عِبْدُ اللّٰهِ ﷻ الْکِتٰبِ (مریم ۳۰) مگر دوسرے وعدہ کے متعلق قرآن بالکل خاموشی اختیار کرتا ہے، جس سے صاف طور پر یہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ نزول قرآن تک یہ وعدہ پورا نہیں ہوا تھا۔ تمام قرآن کو دیکھ جاؤ کسی نبی کے ساتھ یہ دو وعدے نہیں کئے گئے اور نہ خصوصیت کے ساتھ ان کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ گویا یہ عیسوی خصوصیات ہیں جو اور پیغمبروں میں موجود نہ تھیں۔

ان امور کی بنا پر متوفیک کے معنی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتے کہ میں تمہاری دنیا میں رہنے کی مدت پوری کرنے والا ہوں۔ صاحب کشف فرماتے ہیں: متوفی اجلک ومعناه انی عاصمک من ان یقتلک الکفار وموخر اجلک الی اجل کتبتہ لک ومیتک حتف انک لا قتلا بایدیم، تمہیں کفار سے محفوظ کر کے اس وقت تک زندہ رکھوں گا جب تک تمہاری طبعی موت کا وقت نہ آجائے اور میں تم پر طبعی موت طاری کروں گا اور کفار کے ہاتھوں تم قتل نہ ہو گے۔ آیات کی نظم و ترتیب بتاتی ہے کہ ان وعدوں کی غرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عظمت و کرامت کا اظہار ہے۔ اگر متوفیک کے معنی وہ نہ لئے جائیں جو ہم نے اوپر بیان کئے ہیں تو ان کی کوئی خصوصیت باقی نہیں رہتی۔ اس لئے ماننا پڑے گا کہ علامہ زنجشیری ہی کا مطلب درست اور اقرب الی الصواب ہے اور بخاری نے جو ابن عباس سے اس کے معنی مہیتک نقل کئے ہیں تو وہ بھی اس کے منافی نہیں بلکہ بصریغہ اسم فاعل ہونے کی وجہ سے عین مطابق ہیں۔

### رافعک الی

(ب) رافعک الی: اور تمہیں اپنے پاس بلانے والا ہوں۔ بعض لوگوں کا یہ دعویٰ ہے کہ واؤ ہمیشہ ترتیب کے لئے ہوا کرتی ہے، مگر قرآن حکیم کی حسب ذیل آیات اس قاعدہ کلیہ کو توڑتی ہیں: وَاسْتَبِقُوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ (البقرہ ۱۹۶) حالانکہ حج اور عمرہ دونوں کا احرام باندھ کر سب سے پہلے عمرہ کے ارکان ادا کرنے پڑتے ہیں۔ وَخُذُوهُمْ وَاحْضَرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصِدٍ (التوبہ ۵) ظاہر ہے کہ پہلے پکڑنا اور پھر قتل کرنا ہو گا۔ ایک اور آیت بھی سامنے رکھ لیجئے: وَادْعِنَا اِلٰی الْاِبْرٰهٖمَ وَاسْمٰعِیْلَ وَاسْحٰقَ وَیَعْقُوبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِیْسٰی وَالْیُوْسُفَ وَهٰرُونَ وَسُلَیْمٰنَ ؕ وَادْعُنَا اِلٰی دِیْنِکُمْ ؕ (النساء ۱۶۳) پس ان تمام تصریحات سے واضح ہو گیا کہ واؤ کا ترتیب کے لئے ہونا ضروری نہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ حکومت نے حضرت عیسیٰ کے قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے، ان کی حالت یہ ہے کہ وہ صرف بنی اسرائیل کی طرف نبی بنا کر بھیجے گئے ہیں، اس لئے وہ کسی دوسری قوم کی طرف ہجرت نہیں کر سکتے اور یہ لوگ سب کے سب دشمن بن گئے ہیں۔ اب اگر وہ مصلوب ہو جائیں تو، یکلم الناس فی البہد وکھلا کا دوسرا وعدہ پورا نہیں ہو سکتا۔ پس اس کے پورا کرنے کی یہی صورت ہو سکتی ہے کہ فی الحال ان کو مخالفین کے خدع و فریب سے بچالیا جائے۔ یہ تم جانتے ہو کہ ان کی پیدائش عام قاعدہ کے خلاف ہوئی ہے: فَارْسَلْنَا اِلَیْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (مریم ۱۹) ”تو ہم نے ان کی جانب اپنی روح کو بھیجا تو وہ ان کے آگے پورا آدمی بن آیا“، اس روحانیت کا اثر ان کی جسمانی قوتوں پر پہلے ہی سے غالب تھا۔



اب جبکہ مخالفین ان کے قتل پر تلے ہوئے ہیں، تو وہ یکسر روحانیت بن جاتے ہیں اور عالم مثال کی قوتیں ان کو اوپر اٹھا لیتی ہیں اور یوں ہجرت الی اللہ و ترک وطن کی مقدس منزل بھی طے ہو جاتی ہے۔

باقی رہیں وہ احادیث جن سے بعض لوگوں نے تمسک کر کے یہ فیصلہ کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی وفات ہو گئی ہے تو وہ کسی طرح بھی قابل قبول نہیں، اس لئے کہ محدثین نے قاطبہ ان کے غلط اور موضوع ہونے کا فیصلہ کر دیا ہے۔

تیسرا وعدہ

(ج) ومطهرک من الذین کفروا: یہودیوں کی کوشش یہ ہے کہ تجھے سولی پر لٹکا کر لعنتی موت ماریں، مگر میں تجھے ان سے بچا لوں گا اور اس لعنتی موت سے محفوظ رکھوں گا۔ ربی وہ تاریخ جو انہوں نے تمہاری پیدائش اور تمہارے مشن کے متعلق مرتب کی ہے اور جس کو غلطی سے عیسائیوں نے بھی تسلیم کر لیا ہے، اس سے بھی میں تمہیں پاک کروں گا۔ تمہارے بعد ایک اور نبی آئے گا جو تمہاری تطہیر اور پاکیزگی بیان کرے گا، یعنی رسول اللہ ﷺ جنہوں نے قرآن حکیم کے ذریعہ تمام حقائق مستورہ کو بے نقاب کر دیا ہے۔ یوحنا کی انجیل میں ہے: ”لیکن جب وہ یعنی سچائی کا روح آئے گا، تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا وہ میرا جلال ظاہر کرے گا۔“ (یوحنا ۱۴: ۱۶-۱۷)

فضیلت و برتری

(د) وجاعل الذین اتبعوک فوق الذین کفروا الی یوم القیمة: یہودیوں نے حضرت عیسیٰ کا صاف صاف انکار کر دیا، اس لئے وہ کافر ہیں اور اس آیت میں یہی لوگ مراد ہیں۔ ابن مریم کو قبول کرنے والے مسلمان اور عیسائی ہیں۔ اگرچہ مسلمان تو حقیقتاً عیسیٰ کو نبی اللہ مانتے ہیں اور عیسائی صرف ظواہر کے پجاری ہیں، مگر اتباع کا اطلاق دونوں پر ہو گا، اس لئے قیامت تک یہ دونوں گروہ بنی اسرائیل پر غالب رہیں گے۔

دو قسمیں

اگرچہ قرآن حکیم نے نبوت کے اشتراک عام کی وجہ سے سب انبیائے کرام کو نبی کہا ہے، مگر پھر بھی ان کی بعض خصوصیات کی بنا پر ان کو دو سلسلوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(الف) ایک سلسلہ تو انبیائے موسسین کا ہے جو اپنی دعوت سے جدید قومیتوں کی بنیاد ڈالتے ہیں۔

(ب) دوسرے انبیائے مجددین ہیں جو مذہب سابق کی اصلاح و تجدید کے لئے آتے ہیں۔

انبیائے موسسین میں ان رسل عظام کی جلیل القدر ہستیاں ممتاز نظر آتی ہیں:

(۱) حضرت نوح علیہ السلام: ان کو دشمنوں نے ہلاک کرنے کی کوشش کی مگر وہ خود ہی برباد ہو گئے: فَأَنْجَيْنَاهُ وَمَنْ مَعَهُ



- فِي الْفُلِّ الْمَشْهُونِ (اشعر آء ۱۱۹) پس ہم نے نوح اور اس کے ساتھیوں کو بھری ہوئی کشتی میں نجات دی۔
- (۲) حضرت ابراہیم: ان کو آگ میں ڈالا گیا مگر اللہ نے ان کو بچالیا: قُلْنَا إِنَّا لُكُنْهِ بِرَدَاً وَسَلْمًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ (الانبیاء ۶۹) ہم نے حکم دیا کہ اے آگ! ابراہیم کے لئے ٹھنڈک اور سلامتی ہو جا۔
- (۳) حضرت موسیٰ: فرعون باوجود اپنی پوری کوشش کے ان کو قتل نہ کر سکا۔
- (۴) حضرت عیسیٰ: ان کی دو حیثیتیں ہیں۔ وہ بنی اسرائیل کی تجدید کرتے ہیں اور اگر یہ ان کی عدم قابلیت کی وجہ سے ممکن نہیں تو پھر ان کو ہمیشہ کے لئے نبوت سے محروم کرنے کو تیار ہیں۔ وہ آئندہ آسمانی بادشاہت کا اعلان کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اب بنی اسمعیل میں سے رسول اللہ ﷺ کا ظہور ہو گا: مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَةِ وَ مُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِيهِ مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ (الصافات ۶) تورات کی تصدیق کرتا ہوں اور اپنے بعد ایک رسول کے آنے کی خوش خبری دیتا ہوں جس کا نام احمد ہو گا۔
- (۵) رسول اللہ ﷺ کو کفار کہہ اور یہود مدینہ نے شہید کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔

ان تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قتل نہیں ہوئے اور نہ ہی مصلوب ہوئے، بلکہ اپنی طبعی موت مر گئے۔ اس موقع پر ایک غلطی کا ازالہ ضروری ہے جس میں اکثر احمدی حضرات مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ دماقتلوہ و ما صلبوہ والی آیت کو آیت زیر بحث کی تفسیر بنا کر غلط بحث کر دیتے ہیں، حالانکہ وہاں نفی موت کے بعد رفع کا ذکر ہے جو ظاہر ہے کہ رفع جسمانی ہونا چاہئے اور آیت انی متوفیک و ادفعک الی میں رفع بصیغہ اسم فاعل یعنی زمانہ استقبال میں بیان کیا گیا ہے۔ پس دونوں کو علیحدہ علیحدہ رکھنا ضروری ہے اور یہ دونوں آیتیں مل کر تفسیر ہوں گی اس آیت مبارکہ کی جس میں حضرت عیسیٰ کے متعلق وجیہانی الدینا والاخرۃ آیا ہے فافہم۔

### کامیابی کا عہد

فَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَأَعْدِبْهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۖ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ ۝ وَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَيُوَفِّيهِمْ أُجُورَهُمْ ۖ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ۝ ذَٰلِكَ تَشْلُوكُمْ عَلَيْكَ مِنَ الْآيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيمِ ۝

”سو جن لوگوں نے انکار کیا ان کو میں دنیا اور آخرت میں سخت عذاب دوں گا اور ان کا کوئی بھی مددگار نہ ہو گا اور جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے تو ان کے اجر ان کو پورے دے گا اور اللہ عالموں سے محبت نہیں کرتا، یہ آیتوں اور حکمت والے ذکر سے تجھ پر پڑھتے ہیں۔“

یہودیوں کی موجودہ حالت اللہ تعالیٰ کے کلام کی پوری پوری تصدیق ہے، اگرچہ بعض ان میں سے کروڑوں کے مالک ہیں، مگر عموماً یورپ و امریکہ میں در بدر پھرتے ہیں، ذلت و رسوائی اور خصوصاً بد اخلاقی ان کے سر پر سوار ہے۔ یہی دنیا کا عذاب ہے۔ البتہ جو لوگ حضرت عیسیٰ کو تسلیم کرتے ہیں ان کی دو قسمیں ہیں:

(الف) مسلمان: کہ وہی الذین امنوا وعملوا الصلحت کے مصداق حقیقی ہیں۔ علم صحیح کے حامل، ایمان باللہ رکھنے والے اور اعمال صالحہ کرنے والے، ان کو بہترین جزا ملے گی اور وہ ضرور کامیاب ہوں گے۔

(ب) نصاریٰ: یہ ظالم ہیں، کیونکہ انہوں نے الوہیت مسیح اور کفارہ کے غلط عقائد بنا کر اللہ کے ساتھ عبد اللہ کو شریک کر دیا اور نہ صرف ایمان باللہ کو خراب کیا بلکہ عمل صالح بھی ترک کر بیٹھے، یہ گودنیا میں کامیاب ہوں، مگر انجام کار ناکام و خاسر رہیں گے۔

یہ گزشتہ شریعتوں کے واقعات و حوادث ہیں، ان کے بیان کرنے کی ضرورت اس لئے تھی کہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ حقیقی کامیابی فقط قانون الہی کے اتباع ہی سے ہوا کرتی ہے اور یہ کہ ان دلائل و براہین اور بصائر و حکم کے درس و مطالعہ سے تم پر یہ واضح ہو جائے کہ عبد اللہ کبھی بھی ابن اللہ نہیں بن سکتا۔ کفارہ کا عقیدہ اگر صحیح ہو جائے تو احساس ذمہ داری جو تمام دینی و دنیاوی ترقی کا باعث اصلی ہے، فنا ہو جائے۔

### ابن اللہ کا ابطال

إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِنْدَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ ۖ خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿۵۷﴾ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُنَ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ﴿۵۸﴾

“یشک عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی سی ہے۔ اسے مٹی سے بنایا پھر اسے کہا ہو بس وہ ہو جاتا ہے، حق تمہارے رب کی طرف سے ہے، تم شک کرنے والوں میں سے نہ ہو۔“  
آدم علیہ السلام کی حیثیت قرآن حکیم میں دو طریق پر بیان کی گئی ہے:

(الف) وہ ابو البشر ہیں: اس لئے بشریت کے تمام لوازمات و خصوصیات ان میں موجود ہیں، ان کی پیدائش، طفولیت، بھوک اور پیاس وغیرہ، یہ وہ چیزیں ہیں جو ان کو الوہیت سے بالکل ممتاز کر دیتی ہیں خلقہ من تراب ثم قال لہکن فیکون اور اس کی اولاد پر تو اس سے بھی زیادہ تغیرات آتے ہیں: وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ طِينٍ ﴿۵۷﴾ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نَفْثَةً فِي فَمِّ رَاقٍ مَكِينٍ ﴿۵۸﴾ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّفُثَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظًا فَكَسَوْنَا الْعِظَ لَحْمًا ﴿۵۹﴾ ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ ۖ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ ﴿۶۰﴾ (المؤمنون ۱۲ تا ۱۴) اور مٹی کے خلاصہ سے ہم نے انسان کو پیدا کیا، پھر اس کو محفوظ جگہ ہم نے نطفہ بنا کر رکھا پھر ہم نے نطفہ کو لو تھڑا بنایا، پھر ہم نے لو تھڑے کو بوٹی بنایا، پھر بوٹی کو ہڈیاں بنایا پھر ہڈیوں کو گوشت پہنا دیا پھر اس کو دوسری مخلوق بنا دیا۔ پس سب سے بہتر بنانے والا اللہ بڑا برکت ہے۔

(ب) وہ اللہ کے برگزیدہ پیغمبروں میں سے ہیں۔ ان اللہ اصطفیٰ آدم و نوح و آل ابراہیم و آل عمران علی العلین۔ اب آپ ابن مریم کو لیجئے ان میں بھی جملہ لوازمات بشری پائے جاتے ہیں، پھر وہ خدا کیسے بن سکتے ہیں۔ عیسائی حضرت آدم کو ماں اور باپ کے بغیر پیدا شدہ مان کر بھی ان کو خدا نہیں کہتے پھر مسیح علیہ السلام کس طرح الوہیت کے مستحق

ہو گئے۔ کرخی کہتا ہے: ہومن تشبیہ الغریب بالاغرب لیكون اقطع للخصم و اوقع فی النفس ”یہ غریب کی اغرب کے ساتھ تشبہ و تمثیل ہے جس سے مخالف کی حجت بالکل ناکام ہو جاتی ہے اور نفس انسانی اس کو فوراً قبول کر لیتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعات زندگی، ان کا مقصد حیات، ان کی کامیابی کی ابتدا و انتہاء، ان کی تعلیم اور اس کے ثمرات و نتائج یہی ہیں جن کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے اور ان میں ذرہ برابر بھی شک و اشتباہ کی گنجائش نہیں۔

## مباہلہ کی دعوت

فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ آبْنَاءَنَا وَابْنَاتَنَا وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ  
وَأَنفُسَنَا وَأَنفُسَكُمْ ۖ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ ﴿٦١﴾

”پھر اگر اس کے بعد کہ تمہارے پاس علم آچکا اس کے بارے میں تجھ سے حجت کرے تو کہہ دو آؤ ہم اپنے بیٹوں اور تمہارے بیٹوں کو اور اپنی عورتوں اور تمہاری عورتوں کو اور خود اپنے آپ کو اور تم لوگوں کو بلائیں پھر سب گڑ گڑا کر دعا مانگیں پس جھوٹوں پر اللہ کی لعنت کریں۔“

دانشمند شخص کے لئے دلائل کافی ہوتے ہیں، مگر جب عیسائیوں نے ان کے آگے بھی سر تسلیم خم نہ کیا اور صحیح تعلیم کی برابر مخالفت کرتے رہے، تو اب ان پر اتمام حجت کرنے کی غرض سے انہیں مباہلہ کی دعوت دی گئی کہ دعا کے ذریعہ اس کا فیصلہ کیا جائے جس کی قبولیت کے خود عیسائی بھی قائل ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جو شخص اپنی تعلیم کو صحیح خیال کرتا ہے، اس میں اتنی ہمت تو ہونی چاہئے کہ وہ قدوس حق نواز سے جھوٹے کی ہلاکت کا سوال کرے۔ رسول اللہ نے وفد نجران کے سامنے مباہلہ کی دعوت کو پیش کیا مگر انہوں نے میدان میں آنے سے گریز کیا۔ بخاری میں آتا ہے۔

جاء العاقب والسيد صاحبانجران الى رسول الله ﷺ يريدان ان يلاعنا، قال فقال احد هما لصاحبه  
لا تفعل فوالله لئن كان نبيا فلا عنة لا تصلم نحن ولا عقبنا من بعدنا، قالانا نعطيك ما سألتنا وابعث  
معنا رجلا امينا ولا تبعث معنا الا امينا۔

”نجران کے سردار عاقب اور سید صاحبانجران رسول اللہ کی خدمت میں ایک دوسرے پر لعنت کرنے کی غرض سے حاضر ہوئے، مگر ان میں سے ایک نے کہا ایسا نہ کرو، اس لئے کہ اگر وہ نبی ہو تو نہ صرف ہم برباد ہوں گے بلکہ ہماری نسلیں بھی تباہ ہو جائیں گی۔ اس پر ان لوگوں نے عرض کیا کہ جو کچھ آپ ہم سے طلب فرمائیں ہم اسے ادا کرنے کو تیار ہیں۔ آپ ہمارے ساتھ کسی امانت دار آدمی کو روانہ کر دیجئے۔“

گویا یہ لوگ نہ دلائل کے آگے خمیدہ گردن ہوئے اور نہ ہی دعا کے واسطے تیار ہوئے۔

إِنَّ هَذَا لَهُوَ النِّقْصُ الْحَقُّ ۖ وَمَا مِنْ إِلَهٍ إِلَّا اللَّهُ ۖ وَإِنَّ اللَّهَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٦٢﴾ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ عَلَيْهِمُ  
بِالْمُفْسِدِينَ ﴿٦٣﴾

”بیشک یہی سچا بیان ہے اور اللہ کے سوا کوئی بھی معبود نہیں اور بیشک اللہ زبردست حکمت والا ہے، پس اگر وہ بھاگ

کھڑے ہوں تو اللہ فساد کرنے والوں کو خوب جانتا ہے۔“

صحیح تعلیم یہی ہے جس کو آپ پیش کر رہے ہیں کہ زمین و آسمان میں کام کرنے والا فقط اللہ ہی ہے، اگر عیسائی اپنے فاسد عقیدہ سے باز نہ آئیں تو وہ ذلیل ہو کر رہیں گے۔

## توحید خالص

قرآن حکیم نے اب مناظرے کا وہ روشن ترین اصول بیان کیا ہے جس سے کوئی سلیم الفطرت آدمی ایک لمحہ کے لئے بھی انکار نہیں کر سکتا۔

قُلْ يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ تَعَالَوْا۟ إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا ٱللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّنْ دُونِ ٱللَّهِ ۚ فَإِن تَوَلَّوْا۟ فَقُولُوا۟ ٱشْهَدُوا۟ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ﴿۶﴾

”کہہ دو اہل کتاب! ایسی بات کی طرف آ جاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے، ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں اور نہ ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو رب بنائے، پس اگر وہ منہ موڑ لیں تو کہہ دو کہ تم گواہ رہو کہ ہم مسلمان ہیں۔“

دنیا کے تمام مذاہب و ادیان کی اگر چھان بین کی جائے تو معلوم ہو گا کہ سب کے سب توحید پر متفق ہیں۔ سورہ ہود کو دیکھئے ہر ایک نبی کی تعلیم کی اساس و بنیاد یہی توحید بیان کی گئی ہے۔ نوح علیہ السلام فرماتے ہیں: لَا تَعْبُدُوا۟ إِلَّا ٱللَّهَ ۚ إِنِّيْٓ أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلَيْسَ بِهٖ دَعْوَتِىْ ۚ يَقَوْمِ اعْبُدُوا۟ ٱللَّهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهُ ۚ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُونَ (ہود ۵۰) صالح علیہ السلام کو دیکھئے: يَقَوْمِ اعْبُدُوا۟ ٱللَّهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهُ (ہود ۶۴) شعیب علیہ السلام کی یہی پکار تھی: يَقَوْمِ اعْبُدُوا۟ ٱللَّهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهُ (ہود ۸۴) اے قوم! اللہ کی پرستش کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ پھر اسی سورت کے آخر میں فرمایا: وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَٱلْاَرْضِ وَ اِلَيْهِ يَرْجِعُ ٱلْاَمْرُ كُلُّهُ فَاعْبُدُوْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ۚ اور اللہ ہی زمین و آسمان کے غیب سے واقف ہے۔ ہر کام کا رجوع اسی کی طرف ہو گا۔ پس اسی کی پرستش کرو اور اسی پر اعتماد کرو۔ قرآن حکیم میں ایک جگہ ارشاد ہے: وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا يُؤْتِىْهِ اَنۡهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (الانبیاء ۲۵) جتنے رسول بھی ہم نے تم سے قبل روانہ کئے ان میں سے ہر ایک کو یہی وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس میری ہی عبادت کرو۔ دوسرے مقام پر یوں ارشاد ہوتا ہے: وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنۡ اَعْبُدُوا۟ ٱللَّهَ وَاجْتَنِبُوا۟ الطَّاغُوْتِ (النحل ۳۸) ہم نے ہر امت میں اسی تعلیم کے ساتھ رسول بھیجے کہ اللہ کی پرستش کرو اور طاغوت سے بچو۔

یہ قرآن کی تصریحات ہیں جو اپنے مقصد کو باعلیٰ نداء ظاہر کر رہی ہیں، لیکن اگر تم دنیا کے مذاہب مختلفہ کی تحقیقات کرو تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ توحید کے متعلق تمام دنیا کے مدعیان مذاہب بالکل متحد ہیں، اس لئے قرآن کی محبت نہایت ہی قوی ہے۔

اب تک ان لوگوں کا تذکرہ تھا جن کے پاس رسول آئے اور ان کے پاس اپنے پیغمبروں کی کچھ نہ کچھ تعلیم موجود ہے، لیکن اگر تم مشرکین اور بت پرستوں کو دیکھو گے تو وہ بھی اصل توحید سے انکار نہیں کر سکتے۔ وہ اگر اصنام و طواغیت کو پوجتے ہیں تو یہ بھی ساتھ ہی کہہ دیتے ہیں مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ (الزمر ۳) اور هُوَ لَا شَافِعَ عِنْدَ اللَّهِ، اللہ کے پاس یہ ہماری شفاعت کریں گے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی تمام قومیں باوجود اختلاف عقائد و اعمال اور مذاہب و مشارب، اس امر کو ضرور تسلیم کرتی ہیں کہ اللہ ایک ہے اور وہی عبادت کے لائق ہے۔ یقین کیجئے کہ اگر تمام اہل کتاب اور دوسرے ادیان اس بنیادی اصول کو مرکزی نقطہ تسلیم کر لیں تو سب جھگڑے مٹ جاتے ہیں۔ اسی کی طرف قرآن ان سب کو بلاتا ہے اور یہی ایک چیز ہے جو تمام مذاہب کو ایک مرکز پر لا سکتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ہر قل اور مقوقس کو جو خطوط لکھے ہیں ان میں بھی اسی توحید خالص کی جانب ان کو دعوت دی ہے۔ بخاری میں ہے:

من محمد عبد الله ورسوله الى هرقل عظيم الروم سلام على من اتبع الهدى اما بعد فاني ادعوك بدعاية  
 الاسلام اسلم تسلم، يوتك الله اجرک مرتين فان توليت فان عليك اثم الا رسيين ويا اهل الكتب تعالوا  
 الى كلمة سواء بيننا وبينكم الا نعبد الا الله-

“اے والی روم: اس شخص پر سلامتی ہو جو ہدایت کا اتباع کرے۔ میں تمہیں اسلام کی طرف بلاتا ہوں۔ اسلام قبول کرو کہ اسی میں تمہاری سلامتی ہے۔ اور اللہ اس کا تم کو دو گنا ثواب دے گا، لیکن انکار کرنے پر تمام قوم کا عذاب بھی تمہیں پر نازل ہو گا۔ اے اہل کتاب توحید خالص کو مان لو جو ہم میں تم میں ایک امر مشترک ہے۔”

یہ کتاب وسنت کی تصریحات ہیں جن سے واضح ہو گیا کہ اگر مجوسی خیر و شر کے دو جدا گانہ خدا تسلیم کرتے ہیں، عیسائی اب، ابن اور روح القدس کو درجہ ربوبیت دیتے ہیں، یہودی عزیر علیہ السلام کو عبد اللہ سے ابن اللہ بناتے ہیں اور آریہ روح، مادہ اور دوسری چیزوں کو قدیم مانتے ہیں، تو یہ ان کی اپنی اختراعات ہیں، ورنہ کسی مذہب کی اصل کتاب میں توحید کے سوا کوئی دوسری تعلیم نہیں دی گئی۔

اس آیت میں شرک کی ہر صورت کو حرام و ناجائز قرار دیا گیا ہے:

شرك في العبادت۔ اللہ کے سوا اور کسی چیز کے آگے اپنا سر نیاز نہ جھکائیں اور نہ اس سے دعا کے طالب ہوں، خواہ وہ عظیم و جلیل مظاہر قدرت ہوں اور خواہ وہ فرشتے اور پیغمبر ہوں، الا نعبد الا اللہ سے یہی مراد ہے۔

شَرَاكٌ فِي الصِّفَاتِ۔ اللہ کی صفات میں دوسروں کو شریک نہ کریں، کفار و مشرکین عرب اپنے بزرگوں اور بتوں میں بعض صفات الہیہ تسلیم کرتے تھے۔ انہیں کے نقش قدم پر چل کر آج کل بعض صوفی اپنے پیروں کی نسبت اسی قسم کا باطل عقیدہ رکھتے ہیں۔ لَاشَرَاكُ بِهٖ شَيْءٌ کا یہی مطلب ہے۔

شرک فی الاطاعت۔ جس وقت رسول اللہ ﷺ نے سورہ توبہ کی آیت اتخذوا احبارہم ودرہبانہم اربابا من دون اللہ، تلاوت فرمائی تو عدی بن حاتم نے عرض کیا: لم یکنوا یعبدونہم، وہ ان کو نہیں پوجتے تھے۔ آپ نے فرمایا: ایس یحرمون ما احل اللہ فیہ، مونہ ویحلون ما حرم اللہ فیستملونہ، ان لوگوں نے اپنے عالموں اور پیروں کو یہ درجہ دے رکھا تھا کہ جس چیز کو وہ حرام کہہ دیتے اس کو عوام الناس بھی حقیقتاً حرام سمجھنے لگتے، حالانکہ یہ درجہ کتاب الہی کے سوا اور کسی کو حاصل نہیں۔ افسوس ہے کہ بعض مسلمانوں میں بھی اسی قسم کی خرابی آگئی ہے کہ وہ بعض اوقات ائمہ کرام کے استنباط و استخراج کو کتاب و سنت کے مقابلہ میں ترجیح دیتے ہیں، حالانکہ امام الائمہ حضرت ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اذا قلت قولا و کتاب اللہ یخالفہ اترکو اقول بکتاب اللہ فقیل اذا کان خبر رسول اللہ ﷺ یتخالفہ قال اترکو اقول بخبر رسول اللہ ﷺ۔ ”اگر میں کوئی مسئلہ کتاب اللہ کے مخالف بیان کروں تو میرے قول کو ترک کر کے کتاب اللہ پر عمل کرو، بعض لوگوں نے پوچھا کہ اگر وہ سنت رسول کے مخالف ہو تو، جواب دیا کہ سنت کی خاطر میرا قول ترک کر دو۔“

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں:

لا تقلدنی ولا تقلدن مالک ولا الاوزاعی ولا النخعی ولا غیرہم۔ ”نہ تو تم میری تقلید کرو اور نہ مالک، اوزاعی وغیرہ کی تقلید میں مبتلا ہو۔“ امام شافعی کا ارشاد ہے: اذا صح الحدیث فهو مذہبی، ”جب حدیث صحیح مل جائے تو وہی میرا مذہب ہے۔“ مگر باوجود ان ناقابل تاویل الفاظ کے پھر بھی اندھی تقلید کی زنجیروں نے ان کے پاؤں کو بو جھل کر رکھا ہے: اعاذنا اللہ من الحور بعد الکوز، واتباع الهوی، واعجاب کل ذی رأی برأیہ۔

سینہ بسینہ تعلیم

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَحَاجُّونَ فِي الْإِبْرَاهِيمَ وَمَا أُنْزِلَتْ التَّوْرَةُ وَالْإِنْجِيلُ إِلَّا مِنْ بَعْدِهِ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۱۳۰﴾

”اے اہل کتاب! تم ابراہیم کے بارہ میں کیوں جھگڑتے ہو حالانکہ توراۃ اور انجیل اس کے بعد نازل کی گئی ہیں، کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔“

پہلے ایک اصولی بات کی طرف اہل کتاب کو دعوت دی گئی اب ایک اور امر مشترک کو ان کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ اہل کتاب اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ تمام مذہبوں کا سنگ بنیاد یہی مسئلہ توحید ہے اور سب کا دعویٰ بھی ہے کہ کائنات خلقت حضرت ابراہیم ہمارے ہی مذہب پر تھی۔ لباب النقول میں ہے کہ نصارائے خنجران اور احبار یہود ایک مرتبہ دربار رسالت میں حاضر ہو کر کہنے لگے کہ ابراہیم ہماری ملت پر تھے۔ اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی۔ ظاہر ہے کہ تورات و انجیل کا نزول تو حضرت ابراہیم کے مدت ہائے دراز کے بعد ہوا ہے۔ اور اس لئے یہ سوال بھی مہمل اور بے معنی ہے کہ وہ یہودی تھے یا نصرانی۔

پس تم ان چیزوں کو چھوڑ کر خود ان امور کو اصل و اساس بناؤ جن پر ابراہیم کا بند تھے کیونکہ ان کا وجود مقدس یہودیوں،

عیسائیوں، مسلمانوں اور مشرکوں سب کے نزدیک قابل احترام و تقلید ہے اور ان کا مذہب صرف اتنا ہے حنیفاً مسلماً۔

### کائنات خلعت

هَآأَنْتُمْ هَآؤَلَاءِ حَآجَجْتُمْ فِیْمَا لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّونَ فِیْمَا لَیْسَ لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ ۚ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿۳۷﴾  
مَا كَانَ اِبْرَہِیْمُ یَہُودِیًّا وَلَا نَصْرَآئِیًّا وَلَکِنْ کَانَ حَنِیْفًا مُّسْلِمًا ۚ وَمَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ﴿۳۸﴾

”سنئے ہی ہو تم وہ ہو جو اس میں جھگڑ چکے جس کا تم کو علم تھا، پھر اب ایسی باتوں میں کیوں جھگڑتے ہو جن کا تم کو کچھ بھی علم نہیں اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ ابراہیم نہ یہودی تھا اور نہ نصرانی بلکہ وہ راست رو فرماں بردار تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔“

ایک شخص ان باتوں میں جھگڑا کرے جن سے وہ واقف ہے تو ایک بات بھی ہے، مگر عدم علم کے باوجود اپنے دعوے پر زور دینا سراسر جہل و سفاہت ہے۔ مثلاً یہود و نصاریٰ حضرت موسیٰ و عیسیٰ کے متعلق تو یہ کہنے کا حق رکھتے ہیں کہ وہ یہودی یا نصرانی تھے، لیکن ابراہیم پر اس قسم کے الفاظ منطبق کرنا بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے بعض جاہل حنفی کہہ دیا کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیم بھی تو حنفی ہی تھے کیونکہ قرآن میں ان کے لئے حنیف آیا ہے۔

رہے مشرکین عرب جو اپنے آپ کو حنیف کہتے ہیں اور ابراہیم کو اپنا بزرگ تسلیم کرتے ہیں تو وہ بھی اس بات کا یقین کر لیں کہ ابراہیم مشرک نہ تھے، بلکہ وہ سب سے کٹ کر صرف ایک ہی کی طرف ہو گئے تھے اور توحید خالص ان کا مذہب تھا جس کو صرف اسلام پیش کرتا ہے۔ گویا ان آیات میں یہود و نصاریٰ اور مشرکین کو ایسے اصول کی دعوت دی ہے جس پر سب کا اتفاق ہے اور جس سے کسی کو ذرہ برابر انحراف کی گنجائش نہیں۔

إِنَّ أَوَّلَ الْإِنْسَانِ بِإِبْرَہِیْمَ لَلَّذِیْنِ اتَّبَعُوْهُ وَهَآؤَ الذِّیْنَ آمَنُوْا ۚ وَاللّٰهُ وَٰلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۳۹﴾

”ابراہیم کی خصوصیت کے لوگوں میں سے زیادہ حقدار بیشک وہ ہیں جنہوں نے اس کی پیروی کی اور یہ نبی اور وہ جو ایمان لائے اور اللہ مسلمانوں کا حامی ہے۔“

ابراہیمی طریق پر چلنے کا اگر کوئی جماعت صحیح معنی میں دعویٰ کر سکتی ہے تو صرف وہ لوگ جو ان کی زندگی میں اس کائنات خلعت پر ایمان لائے اور اس کے نقش قدم پر چلے اور اس وقت اس کرہ ارضی میں جتنے لوگ بستے ہیں ان میں سے صرف رسول اللہ اور اس کے اتباع، مہاجرین و انصار ان تمام اصول و کلیات پر عامل ہیں جو حضرت ابراہیم کے تھے، باقی سب کا دعوائے اتباع غلط ہے اور اللہ تعالیٰ صرف ان لوگوں کی مدد کرتا ہے جو نفع و ضرر کے لئے صرف خدائے واحد کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں، جو انسانوں کی ولایت اور شفاعت پر ادھار کھا کر نہیں بیٹھ جاتے بلکہ اپنے اعمال و اخلاق کی تہذیب کرتے ہیں: یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَا لَآ لَا یَبْنُوْنَ ﴿۴۰﴾ إِلَّا مَنْ لَّیَّ اللّٰهُ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ ﴿۴۱﴾ (الشعر ۸۸، ۸۹) جس روز مال و اولاد میں سے کوئی چیز بھی کام نہ آئے گی۔ بلکہ نجات اس کو ملے گی جو قلب سلیم اور فطرت صالحہ لے کر دربا خداوندی میں حاضر ہو گا۔



## باب نمبر ۳

## فصل اوّل

## اہل کتاب کی خرابیاں

## انتہائی سفاہت

باوجود قدر مشترک کی طرف دعوت دینے کے، یہ لوگ اپنی ہٹ پر قائم ہیں، اس لئے اب ان کی خرابیاں ذکر کی جاتی ہیں تاکہ مسلمان ان سے آگاہ ہوں، بعد ازاں ان سے تعلقات و روابط کو منقطع کرنے کا حکم دیا جائے گا:

وَدَّثَ طَائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يُضِلُّوكُمْ ۖ وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ﴿٥٠﴾

“اہل کتاب کا ایک گروہ چاہتا ہے کہ تم کو گمراہ کر دیں مگر وہ اپنے آپ کو گمراہ کرتے ہیں اور نہیں محسوس کرتے۔”

یہ لوگ خود تو اپنی کتاب پر عمل نہیں کرتے مگر اس امر کو بھی گوارا نہیں کر سکتے کہ کوئی دوسری جماعت اس کام کے لئے تیار ہو، اس لئے ان کی کوشش یہی ہے کہ جو خرابیاں ان میں ہیں وہی مسلمانوں میں بھی پیدا ہوں اور اس طرح بتدریج وہ دین حق سے منحرف ہو جائیں، مگر ظاہر ہے کہ جس شخص کو رسول اللہ ﷺ کی صحبت و ہم نشینی کا فخر حاصل ہو چکا ہو اور اس نے آپ کے نمونہ اور اسوہ حسنہ کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنالیا ہو، وہ بھلا ان کے فریب و خدع میں کیا آئے گا، بلکہ الٹا انہیں لوگوں کو نقصان پہنچے گا، کیونکہ جب ان کی تمام تر سعی و کوشش مسلمانوں کے گمراہ کرنے میں صرف ہوگی تو ان کے قلوب و اذہان کی لطافت و نظافت سب جاتی رہے گی اور ان کو اپنی اصلاح و تہذیب کی طرف توجہ ہی نہ ہوگی۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ ﴿٥١﴾ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَلْبِسُونَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٥٢﴾

“اے اہل کتاب! اللہ کی آیتوں کا کیوں انکار کرتے ہو حالانکہ تم مشاہدہ کرتے ہو، اے اہل کتاب! کیوں حق کو باطل سے ملائے ہو اور حق کو چھپاتے ہو حالانکہ تم جانتے ہو۔”

ان آیات میں اہل کتاب کی حسب ذیل خرابیاں ذکر کی گئی ہیں:

(الف) کفر، بدایات اللہ۔ ان لوگوں کو معلوم ہے کہ بنی اسمعیل میں ایک نبی آنے والا ہے، وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کی طرف قرآن حکیم الہام کرے گا، مگر باوجود ان تمام باتوں کے جاننے کے وہ ان حقائق ثابتہ کا انکار کرتے ہیں۔



(ب) کتبیس الحق بالباطل۔ ان پر یہ حقیقت واضح ہے کہ تمام کتب سماوی کی تعلیم توحید ہے۔ سب کے اصول برواٹھم ایک ہی ہیں اور یہ کہ رسول اللہ ﷺ تمام دنیا کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیں گے۔ لیکن وہ ان باتوں کی تو پرواہ نہیں کرتے الٹا اپنے رہبان و احبار کے خیالات فاسدہ اور آرائے کاسدہ کو اصل دین و عہد ملت خیال کرتے ہیں۔ ویقولون ہو من عند اللہ وما ہو من عند اللہ اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہوتا۔

(ج) کتبمان حق۔ تورات کے احکام کو چھپاتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی پیشین گوئیوں پر پردہ ڈالتے ہیں۔ مَنْ أَنْزَلَ الْكِتَابَ الَّذِي جَاءَ بِهِ مُوسَى نُورًا وَهُدًى لِلنَّاسِ تَجْعَلُونَهُ قَرَاطِيسَ تُبْدُونَهَا وَتُخْفُونَ كَثِيرًا (الانعام ۹۱) کس نے وہ کتاب اتاری جو موسیٰ لائے تھے لوگوں کے لئے روشنی اور ہدایت تھی۔ تم نے ورق ورق کر رکھا ہے اس کو ظاہر کرتے ہو اور بہت کچھ چھپاتے ہو۔

### خدع و فریب

وَقَالَتْ طَائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ اٰمَنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلٰی الدِّیْنِ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاَكْفُرُوْا اٰخِرًا لَّعَلَّہُمْ یَرْجَعُوْنَ ﴿۷﴾

”اور اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے کہا کہ مسلمانوں پر جو اتارا گیا ہے اس پر دن چڑھے ایمان لے آؤ اور اس کے آخر میں انکار کر جاؤ، شاید وہ پھر جائیں۔“

اس آیت کے شان نزول میں مفسرین کرام نے مختلف روایات بیان کی ہیں۔ ایک روایت میں آتا ہے: قال عبد اللہ بن الصیف وعدی بن زید والحارث بن عوف بعضهم لبعض تعالوا نؤمن بها انزل علی محمد واصطبه غدوة ونكف به عشية حتى نلبس عليهم دينهم لعلهم يصنعون كما نصنع فيرجعون عن دينهم۔ ”ان یہودیوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ آؤ صبح کے وقت ہم قرآن پر ایمان لے آئیں اور شام کو انکار کر دیں تو اس سے خود مسلمان بھی شبہہ میں پڑ جائیں گے اور شاید انجام کار اپنے دین ہی کو ترک کر دیں۔“

ابن عباس فرماتے ہیں: قالت طائفة من اهل الكتب اذ القيتهم اصحاب محمد اول النهار فامنوا واذا كان اخره فصلوا صلوتكم لعلهم يقولون هولاء اهل كتاب وهم اعلم منا۔ صبح کے وقت مسلمانوں کے سامنے اظہار اسلام کرو اور شام کے وقت اپنی نماز ادا کرو، اس سے ان لوگوں کو ضروریہ خیال پیدا ہو گا کہ یہ اہل کتاب ہم سے زیادہ عالم اور سمجھدار ہیں کسی برائی کی وجہ سے تو اسلام ترک کر رہے ہیں۔ غرض یہ کہ ان بد بختوں کی ہر ممکن کوشش یہی تھی کہ اسلام کی ترقی روک دیں۔

دنیا میں انسانی طبیعت کا یہ خاصہ ہے کہ جب وہ ایک بات کو حق اور یقین خیال کر لیتی ہے، تو اس کو ترک کرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہوتی۔ رسول اللہ نے جس وقت ہر قل کے پاس خط بھیجا اور اس نے ابوسفیان کو بلا کر مختلف سوال کئے تو

ان میں ایک سوال یہ بھی تھا: هل یرتد احد منهم سخطۃ لدینہ بعد ان یدخل فیہ۔ اسلام قبول کرنے کے بعد کیا کوئی شخص اس سے منحرف بھی ہو جاتا ہے۔ اگرچہ ابوسفیان اس وقت اسلام کے سخت ترین دشمن تھے مگر انہیں اس کا جواب نفی ہی میں دینا پڑا۔

ان لوگوں کا منشا یہ تھا کہ فرزند ان اسلام یوں تو دائرۃ توحید سے قدم باہر نہ رکھیں گے، ان کے ساتھ خدع و فریب سے کام لینا چاہئے۔ اور اس کی صورت یہ ہو کہ صبح کے وقت ہم اپنے آپ کو کامل اور پختہ کار مسلمان ظاہر کریں، تمام فرائض اسلام میں شریک ہوں تاکہ سب لوگوں کو یقین ہو جائے کہ ہم حسن و اخلاص نیت کے ساتھ مسلمان ہوئے ہیں، مگر شام کے وقت پھر وہی الحاد و زندقہ کی راہ اختیار کر لیں۔ اس ناشائستہ حرکت کا اثر مسلمانوں پر بہت برا پڑے گا اور عجب نہیں وہ بھی اسلام کو ترک کر دیں۔ کیونکہ جب وہ دیکھیں گے کہ ہم عالم ہیں، ہمارے فضل و کمال کو سب تسلیم کرتے ہیں، ہمارا اسلام میں داخل ہونا تو یہ واضح کر دے گا کہ ہم بالکل انصاف پسند ہیں، جہاں بھی حق مل جائے اس کو قبول کرنے کو ہمہ تن تیار ہیں اور ہمارا اسلام کا ترک کر دینا یہ ثابت کرے گا کہ ضرور اسلام میں ایسی خرابیاں ہوں گی جو ان پر واضح ہو گئیں اور جن کی وجہ سے انہوں نے اس مذہب کو ترک کر دیا، ورنہ حق بات کون عقلمند چھوڑ سکتا ہے۔

اس قسم کی ناشائستہ حرکات سے ارباب یقین و اذعان کو تو ذرہ برابر بھی نقصان نہیں پہنچ سکتا، البتہ ادنیٰ درجہ کے لوگوں پر اس کا کچھ نہ کچھ برا اثر ضرور پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت نے مرتدین کے قتل کا حکم دیا ہے، کیونکہ ایسا نہ ہو کہ ان کا مکر و فریب بعض ضعیف الاعتقاد مسلمانوں کو خراب کر دے۔

## فضل عظیم

وَلَا تُؤْمِنُوا إِلَّا بِمَا نُنَافِقُكُمْ قُلْ إِنَّ الْهُدَىٰ هُدَىٰ اللَّهِ ۖ أَنْ يُؤْتَىٰ أَحَدٌ مِّثْلَ مَا أُوتِيتُمْ أَوْ يُحَاجُّوكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ قُلْ إِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللَّهِ ۖ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ ۖ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ ۖ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ۝

اور ایمان نہ لاؤ مگر اسی پر جو تمہارے دین پر چلے۔ کہہ دو کہ ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے کہ کسی شخص کو اس کی مثل دیا جائے، یا وہ تم سے تمہارے رب کے نزدیک جھگڑا کریں گے۔ کہہ دو کہ فضل تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بہت دینے والا جاننے والا ہے۔

جو لوگ صبح کو اسلام قبول کر کے شام کے وقت اس سے بیزاری کا اظہار کرنے کے لئے تیار ہوتے ہیں، ان کو وصیت کی جاتی ہے کہ ان کا اصلی ایمان صرف اس نبی کے لئے مخصوص ہے جو اسرائیلی شریعت اور قانون کا پابند ہو۔ اس بے ہودہ حرکت کا جواب انہیں یہ دیا گیا کہ کامل ہدایت صرف اللہ ہی کی طرف سے ہو سکتی ہے اور وہی اپنی حکمت سے کسی فرد یا قوم کو حامل شریعت بناتا ہے۔ چنانچہ اس نے بنی اسمعیل کو ہدایت دینے کا وعدہ کیا: ”خداوند تیرا خدا تیرے لئے تیرے ہی

در میان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا، تم اس کی طرف کان دھریو.... میں ان کے لئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ جیسا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا۔“ (استثناء ۹۱، ۸۱، ۵۰)

ان الفاظ سے ظاہر ہوا کہ بنی اسماعیل میں سے جو نبی اسرائیل کے بھائی ہیں ایک نبی آئے گا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کسی نبی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ مثل موسیٰ ہیں، اس لئے اس پیشین گوئی کے مطابق یہ ضروری بات ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے خاندان سے ایک نبی ہو اور اس کو موسیٰ کی طرح ایک شریعت نوازش ہو۔ اِنَّا اَرْسَلْنَا اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَٰهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا اَرْسَلْنَا اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا (الزل ۱۵) ہم نے تمہاری جانب ایک پیغمبر بھیجا جو تم پر گواہی دینے والا ہے جس طرح ہم نے فرعون کی جانب ایک رسول بھیجا تھا۔

اہل کتاب کا اصرار یہ ہے کہ وہ صرف ان انبیاء و رسل کا اتباع کریں گے جو ان کی شریعت کے پابند ہوں، حالانکہ سابقہ پیشین گوئی کے مطابق یہ ضروری ہے کہ جس قسم کا قانون اہل کتاب کو دیا گیا ہے ویسا ہی قانون کسی اور کو بھی دیا جائے۔ پس جب حقیقت نفس الامری یہ ہے، تو یہ لوگ اپنے ہی رسولوں کے اتباع پر اصرار کرنے میں یقیناً غلطی پر ہیں، اگر یہ نہ تو رسول اللہ کو نبی مانیں اور نہ یہ تسلیم کریں کہ شریعت اسلامی کے اصول و کلیات وہی ہیں جیسے شریعت موسوی کے ہیں تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو گا کہ وہ خود حضرت موسیٰ کی صداقت کو مشتبہ بنا رہے ہیں۔

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ نبوت کسی خاص قوم اور ملک میں محدود نہیں، بلکہ یہ اللہ کا فضل مخصوص ہے جس کو چاہتا ہے اس فرض جلیل کے لئے چن لیتا ہے، اس لئے تم بنی اسرائیل ہی میں اس کو منحصر مت مانو۔

خائن و بد عہد

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنُوْهُ بِغَطَارٍ ذُوْءٍ اِلَيْكَ ؕ وَمِنْهُمْ مَنْ اِنْ تَاْمَنُوْهُ بِدِيْنَارٍ لَاْ يُؤَدُّ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتُ عَلَيْهِ قَائِمًا ۚ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا اَلَيْسَ عَلَيْنَا فِيْ الْاُمَمِ نَّ سَبِيْلٌ ؕ وَيَقُوْلُوْنَ عَلٰى اللّٰهِ الْكُذِبُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝

“اور اہل کتاب میں سے وہ ہے کہ اگر تم ہال کا ڈھیر اس کے پاس امانت رکھو تو وہ تم کو ادا کر دے اور ان میں سے وہ ہے کہ اگر اس کے پاس ایک دینار امانت رکھو تو وہ تجھے واپس نہ دے، سوائے اس کے کہ تم اس کے سر پر کھڑے رہو۔ اس لئے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم پر ان امیوں کے بارے میں کوئی گناہ نہیں اور اللہ پر وہ جھوٹ بولتے ہیں، حالانکہ وہ جانتے ہیں۔“

ہر جماعت میں دو قسم کے لوگ ہوا کرتے ہیں: اچھے اور برے۔ اہل کتاب بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ اہل کتاب کی مذہبی خباثتیں معلوم ہو چکی ہیں، اب ان کے دنیاوی معاملات کی کیفیت ملاحظہ ہو۔ وہ اسکو اپنا حق شرعی خیال کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے ساتھ خدع و فریب سے کام لیں، ان کی امانتوں میں خیانت کریں، ان کے ممالک میں تجارت کی غرض سے جائیں، یا ایک مدت کے لئے ان کے شہروں کو اجارہ پر لے لیں، پھر آہستہ آہستہ ان پر قبضہ

جمالیں اور مسلمانوں کو وہاں سے بے دخل کر دیں، اور کبھی کبھی تہذیب و شائستگی اور تمدن و حضارت کی نشر و اشاعت کا بہانہ کر کے ان کے بلاد و امصار پر صلیبی جھنڈا گاڑ دیں۔ اس کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ ہم اہل کتاب ہیں، ہمیں اجازت ہے کہ غیر اہل کتاب کو دھوکا دے دیں اور اس پر ہم سے کوئی مواخذہ نہ ہو گا۔ کیونکہ نحن ابناء اللہ و احباؤہ کا طغرائے امتیاز ہمارے ہی لئے ہے۔

جب دنیاوی معاملات میں ان کی یہ حالت ہے کہ ایک دینار کے ادا کرنے میں وہ پس و پیش کرتے ہیں تو بڑی امانتوں میں ان پر کیسے اعتماد ہو سکتا ہے اور پھر اسی سے اندازہ کر لیجئے کہ انہوں نے اپنی مذہبی کتابوں میں کس قدر خیانت سے کام لیا ہو گا۔ جو شخص دنیا کے کاموں میں حق ادا کرنے کو تیار نہیں، وہ دین کی باتوں میں بھی یقیناً خائن و بد عہد ہو گا۔ قرآن حکیم کا انصاف دیکھئے کہ اگر وہ ایک جانب اہل کتاب کو خیانت کا مرتکب بتاتا ہے، تو دوسری طرف اگر ان میں چند ارباب ورع و تقویٰ ہیں تو ان کو کبھی فراموش نہیں کرتا، بلکہ سب سے پہلے انھی کا ذکر کرتا ہے اور یہ واضح کرنا چاہتا ہے کہ اگر ایک قوم میں کچھ آدمی خراب ہیں تو تمام کی تمام جماعت کو برا مت کہو۔ جو اچھے ہیں ان کی اچھائی کو تسلیم کرو اور ان کی نیکی کا اعتراف کرو۔

آج اگر تم آنکھیں کھول کر دیکھو تو یورپ اسی مرض شدید میں مبتلا ہے۔ اس کے نزدیک دنیا میں اگر کسی کی عزت و آبرو ہے تو صرف سفید رنگ عیسائی اقوام کی۔ دول یورپ نے خصوصاً جو کچھ اسلامی ممالک کے ساتھ اس سلسلہ میں دجل و شیطنت سے کام لیا ہے اور جس ابلیسانہ خدع و فریب سے انہوں نے دول اسلامی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں، وہ محتاج تشریح نہیں، نہ تو ان کے نزدیک کسی عہد و پیمان کی وقعت ہے اور نہ کسی کی عزت و آبرو کی، فہل من مدکر۔

اہل کتاب اس حقیقت سے خوب واقف ہیں کہ ان کی کتابوں میں یہ حکم موجود نہیں اور کوئی شریعت اس قسم کے احکام نافذ نہیں کر سکتی۔ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عباس سے پوچھا: انانصیب فی الغزو من اموال اہل الذمۃ الدجاجة والشاء۔ دوران جنگ میں ہمیں ذمیوں کی بعض چیزیں مل جاتی ہیں۔ مثلاً مرغی یا بکری وغیرہ، تو کیا ہم بغیر قیمت ادا کئے ہوئے ان کو اپنے کام میں لاسکتے ہیں، کیونکہ وہ مسلمان تو ہیں نہیں، پھر ان کے مال پر قبضہ کرنے میں کیا قباحت ہے۔ ابن عباس نے ناراض ہو کر کہا: ہذا کما قال اہل الکتاب لیس علینا فی الامین سبیل، انہم اذا ادوا الجزیۃ لم تحل لکم اموالہم الا بطیب انفسہم۔ اہل کتاب بھی تو یہی کہا کرتے تھے: لیس علینا فی الامین سبیل۔ یاد رکھو جب وہ جزیہ ادا کر دیں تو ان کی ہر چیز تم پر حرام ہے، سوائے اس کے جو وہ خود اپنی مرضی سے تم کو دیں۔

سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ جب اہل کتاب نے لیس علینا فی الامین سبیل کا دعویٰ کیا تو رسول اللہ ﷺ

نے فرمایا: کذب اعداء اللہ ما من شئ کان فی الجاہلیۃ الا وھو تحت قدمی ہاتین الا الامانۃ انھا موداۃ امی البر والفاجر، خدا کے دشمن جھوٹ کہتے ہیں، میں نے جاہلیت کی ہر رسم کو محو و باطل کر دیا۔ یاد رہے امانت میں تم خیانت نہیں کر سکتے۔ ایک شخص اچھا ہو یا برا، اس کی امانت بہر صورت واپس کرنی پڑے گی۔ ایک حدیث میں آپ نے اس طرح فرمایا: لایمان لمن

لامانۃ له ولا دین لمن لاعہدہ، جو شخص امین نہیں اس کا دل بھی ایمان سے خالی ہے اور جو اپنے عہد کا پابند نہیں، وہ کبھی دینداری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

ایک مرتبہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے صلح نامہ کے زمانہ میں فوجوں کو سرحد پر جمع کرنا شروع کر دیا کہ مدت عہد ختم ہوتی ہی دشمن پر حملہ کر سکیں۔ حضرت ابوہریرہ اسلمیؓ نے ان کو اس سے روکا کہ یہ بد عہدی اور خیانت ہے۔ چنانچہ امیر معاویہؓ کو اپنی تمام فوجیں واپس بلانی پڑیں۔ ان فی ذلک لعبدۃ لاولی الابصار۔

## اصلی قانون

بَلَىٰ مَنْ أَقْبَىٰ بِعَهْدِهِ وَاتَّقَىٰ فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ﴿۵۸﴾

”ہاں جو شخص اپنے اقرار کو پورا کرتا ہے، تو بے شک اللہ پر ہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے۔“

اہل کتاب کی یہ باتیں بالکل غلط اور بے بنیاد ہیں، اصلی قانون یہ ہے کہ ایفائے عہد سخت ضروری ہے، امانت کے بغیر کبھی کوئی جماعت بااخلاق نہیں بن سکتی۔ تعلیمات الہیہ کی تمام تربیاد اخلاق فاضلہ پر ہے، وہ کبھی بددیانتی کی تعلیم نہیں دے سکتی۔ جو لوگ حاکم بن کر اپنی رعایا کے حقوق ادا نہیں کرتے، ظلم پر کمر باندھتے ہیں اور دن رات بے انصافی کے مرتکب ہوتے ہیں، وہ عموماً جلد تباہ ہو جاتے ہیں۔ قرآن حکیم میں ایک جگہ آتا ہے: إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا ۚ وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ (النساء: ۵۸) اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ ہر امانت اس کے اہل کے سپرد کرو اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے کے لئے بیٹھو تو عدل و انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ دوسری جگہ آیا ہے: فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتِنَ اَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ (البقرہ: ۲۸۳) مسلمانوں کے خصائص و امتیازات بیان کرتے ہوئے فرمایا: وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ (المومنون: ۸) جو اپنی امانتوں اور عہدوں کی نگرانی کرتے ہیں۔ سورہ معارج میں ہے: وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ ﴿۳۱﴾ وَالَّذِينَ هُمْ بِشَهَادَاتِهِمْ قَائِمُونَ ﴿۳۲﴾ (المعارج: ۳۱-۳۲) سورہ انفال میں مسلمانوں کو خیانت سے روکا: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ (الانفال: ۲۷) اے مسلمانو! اللہ اور رسول کی خیانت نہ کرو، اور اپنی امانتوں میں خیانت سے کام نہ لو۔ رسول اللہ ﷺ نے ارباب نفاق کی ایک علامت یہ بھی بتائی ہے: واذا اتمن خان، جب اس کے پاس کوئی امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت سے کام لیتا ہے۔

## عاقبت کار

إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۵۹﴾

”جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے عوض حقیر معاوضہ لیتے ہیں ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور ان سے اللہ بات بھی نہ کرے گا اور نہ قیامت کے دن ان کی طرف دیکھے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا اور ان کے لئے

دردناک عذاب ہے۔“

قرآن کی اس آیت میں مناظر قیامت میں سے ایک منظر کا سماں کھینچا گیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ارباب ورع و تقویٰ جب خدائے قدوس کی نوازش ہائے گوناگوں سے بہرہ اندوز سعادت ہوں گے تو کفار و مشرکین ان الطاف و اکرام الہیہ سے یکسر محروم رہیں گے۔ پس اس قسم کی آیات میں دراصل جزئیات پر بحث مقصود نہیں ہوتی، بلکہ ایک اجمالی حکم کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرنی ہوتی ہے۔ قرآن میں ایک جگہ آتا ہے: **مَثَلِ حَبَّةٍ أَتَتْكَ سَبْعَ سَنَابِلٍ فِي كُلِّ سَنَابِلَةٍ مِائَةٌ حَبَّةٌ** (البقرہ ۲۶۱) ہر ایک دانہ کے سات خوشے، اور ہر ایک خوشہ میں سو سودانہ ہو گا۔ اب اس تفصیل سے درحقیقت یہ نہیں ثابت ہوتا کہ کوئی قسم انانج کی ایسی بھی ہونا ضروری ہے جس کے ایک دانہ سے واقعی سات سودانے پیدا بھی ہوں، بلکہ صرف کثرت مراد ہے۔

### تحریف کتاب

وَإِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيقًا يَلُؤْنَ أَلْسِنَتَهُمُ بِالْكِتَابِ لِتَحْسَبُوهُ مِنَ الْكِتَابِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتَابِ ۚ وَيَقُولُونَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ۚ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿۵۸﴾

“اور ان میں ایک گروہ ہے جو اپنی زبان کو کتاب پڑھتے وقت مروڑتے ہیں، تاکہ تم خیال کرو کہ وہ کتاب ہی کا حصہ ہے، حالانکہ وہ کتاب سے نہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے ہے، حالانکہ وہ اللہ کے پاس سے نہیں اور اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں اور وہ جانتے ہیں۔“

اہل علم کی حالت یہ ہے کہ کتاب الہی کی تحریف کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس کی آیات کو لے کر ان سے اپنا مطلب نکالتے ہیں اور غلط تفسیر کر کے دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ یہی اللہ کا حکم ہے، حالانکہ انہیں خوب معلوم ہے کہ یہ حقیقت اصلیہ کے بالکل برخلاف ہے اور رسول کبھی ایسی تعلیم نہیں دے سکتا۔ سورہ بقرہ میں آتا ہے: **يَكْتُمُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ**، یعنی تحریف لفظی کا ارتکاب کرتے ہیں، اس سورہ میں فرمایا کہ وہ تحریف معنوی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ امام بخاری نے یہی معنی ابن عباس سے نقل کئے ہیں: **يَتَاوَلُونَهُ عَلَى غَيْرِ تَأْوِيلِهِ**، صحیح معنی کو ترک کر کے غلط تاویل کرتے تھے، لیکن مجاہد، شعبی، قتادہ اور ربیع بن انس کی رائے ہے کہ وہ تحریف لفظی کے بھی مرتکب ہوتے تھے اور یہی ہماری رائے ہے۔

انسان خدا نہیں بن سکتا

سورہ آل عمران میں تمام تر خطاب عیسائیوں سے ہے، اگرچہ کہیں کہیں یہودیوں کا تذکرہ بھی آجاتا ہے، مگر اصل میں روئے سخن نصاریٰ ہی کی جانب ہے، پس وہ لوگ جو اپنی حماقت و نادانی کی وجہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف الوہیت اور

خدا کی منسوب کرتے ہیں، ان سے کہا جاتا ہے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ كُنُوا رَبِّكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ ﴿٥٠﴾ وَلَا يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلَائِكَةَ وَالنَّبِيِّينَ أَرْبَابًا ۚ أَيَأْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴿٥١﴾

”کسی بشر کو شایاں نہیں کہ اللہ تو اس کو کتاب اور عقل اور نبوت دے، پھر وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کو چھوڑ کر تم میرے بندے بن جاؤ، لیکن وہ کہے گا کہ تم ربانی بن جاؤ، اس لئے کہ تم کتاب پڑھاتے تھے اور اس لئے کہ تم درس دیتے تھے، اور تمہیں کبھی یہ حکم نہ دے گا کہ فرشتوں اور نبیوں کو خدا بناؤ، کیا اس کے بعد کہ تم مسلم ہو چکے ہو تم کو کفر کا حکم دے گا۔“

انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعض کلمات ایسے نقل کئے گئے ہیں، جن سے ایک معمولی آدمی کو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو خدا کہتے ہیں، مگر انہوں نے خود ہی اس غلط فہمی کو دوسری کئی جگہ صاف کر دیا ہے کہ میں اس لفظ کو اسی طرح مجازی معنی میں استعمال کرتا ہوں جس طرح بنی اسرائیل کے باقی انبیاء اور مشائخ استعمال کرتے تھے۔ اس لئے یہاں بتایا گیا کہ وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ فہم و فراست، نبوت اور کتاب سے سرفراز فرماتا ہے وہ کبھی ایسی تعلیم نہیں دے سکتا کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ، اس لئے کہ یہ علاوہ کذب و افتراء کے سخت نادانی اور حماقت ہے، بلکہ خدا کا رسول تو لوگوں کو عالم ربانی بنادیتا ہے، جو اپنے شاگردوں کو تدریجی تعلیم یعنی اول ابتدائی علوم اور پھر انتہائی اصول و کلیات سکھاتا ہے۔

بخاری نے ربانی کے یہ معنی کئے ہیں: الذی یبہی الناس بصغر العلوم قبل کبارہا۔ جس وقت ابن عباسؓ کی وفات ہوئی تو محمد بن الحنفیہ نے کہا: مات ربانی هذه الامة۔ پس انبیاء علیہم السلام لوگوں کو صحیح علوم کی جانب متوجہ کرنے آتے ہیں اور وہ یہی کہتے ہیں کہ تم خدائے واحد کی پرستش کرو، کیونکہ تم کتاب الہی خود پڑھتے ہو اور دوسروں کو پڑھاتے ہو، اور اس کتاب میں فقط توحید ہی کی تعلیم ہو سکتی ہے۔

بعض جاہل لوگ اپنی نادانی اور سفاهت کی بناء پر اپنے بزرگوں کو خدا اور مختار کل بنادیا کرتے ہیں، لیکن نبی سے یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ وہ تمہیں فرشتوں اور نبیوں کو رب بنانے کے لئے کہے اور تمہیں اپنے بزرگوں کو ان مراتب تک لے جانے کی اجازت دے۔ بھلا یہ ممکن ہے کہ تم تو مسلمان بننے اور احکام خداوندی کے آگے اپنی گردنیں خم کرنے کی کوشش کرو اور خود نبی جو مرکز دانشمندی ہے، وہ اتنا بے وقوف بن جائے کہ تم کو اصل حقیقت سے ہٹ جانے کا حکم دے؟ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔

جس وقت نصارائے نجران کے سامنے رسول اللہ ﷺ نے ربوبیت مسیح پر نہایت ہی دندان شکن اعتراضات کئے تو اس سے ارکان وفد کو یہ خیال پیدا ہوا کہ آپ شاید اپنے آپ کو خدا بنانے کی خاطر الوہیت مسیح پر حملہ کر رہے ہیں، اس لئے



ان میں سے بعض نے دریافت کیا: اتزیدیا محمدان نعبدک کہا تعبد النصارى عیسوی بن مریم، اے محمد! کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کو اسی طریق پر پوجا کریں، جس طرح نصاریٰ عیسیٰ کی کرتے ہیں۔ آپ نے نہایت ہی غصہ کے لہجہ میں فرمایا: معاذ اللہ ان نعبد غیر اللہ، اونا امر بعبادۃ غیر اللہ، ما بذلک بعثنی ولا بذلک امین، خدا کی پناہ کہ ہم غیر اللہ کی پرستش کریں، یا ایسا کرنے کا حکم دیں، نہ تو اس غرض کے لئے خدا نے مجھے مبعوث کیا ہے اور نہ اس کا مجھے حکم دیا ہے۔

انبیائے کرام کا تو طغرائے امتیاز یہی ہے کہ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی غیر اللہ کی طرف نہیں بلا سکتے، قرآن حکیم میں آتا ہے: وما ارسلنک من رسول الا نوحی الیه انه لا اله الا انا فاعبدون۔ دوسری جگہ آتا ہے: ولقد بعثنا فی کل قریۃ رسولا ان اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت۔ ایک مقام پر یوں ارشاد ہوتا ہے: وَسُئِلَ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مَنْ دُسِلْنَا اَجَعَلْنَا مِنْ دُونِ الرَّحْمٰنِ اِلٰهَةً یُّعْبَدُونَ (الزخرف ۲۵) تم سے پہلے جن رسولوں کو ہم نے بھیجا ہے، ان سے ذرا پوچھو تو سہی کیا ہم نے رحمن کے سوا کسی اور کو بھی خدا بنایا کہ یہ لوگ اس کی پوجا کریں۔ اور ملاحظہ ہو: وَمَنْ یَقُلْ مِنْهُمْ اِنِّیْ اِلٰهٌ مِنْ دُوْنِہٖ فَذٰلِکَ نَجْزِیْہُمْ ۚ کَذٰلِکَ نَجْزِی الظّٰلِمِیْنَ (الانبیاء ۲۹) اور ان میں سے جو یہ کہے کہ میں اللہ کے سوا تمہارا خدا ہوں، تو اس کو ہم اس کا بدلہ جہنم دیں گے، ظالموں کو ہم اسی طرح سزا دیا کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے توحید کو اس درجہ صاف کر دیا ہے کہ اب ذرہ بھر شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہ سکتی۔ ایک دفعہ بعض لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! نسلم علیک کہا یسلم بعضنا علی بعض افلا نسجد لک، جس طرح ہم آپس میں ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں، ویسے ہی آپ کی خدمت میں بھی سلام عرض کرتے ہیں، کیا ہم آپ کو سجدہ نہ کریں؟ آپ نے اسی وقت جواب دیا: لاولکن اکرموا نبیکم واعرفوا الحق لاهله فانہ لا ینبغی ان یسجد لاحد من دون اللہ، ہر گز نہیں، ہاں اپنے نبی کا اکرام ہمیشہ ملحوظ خاطر رہے اور ہر ایک کا حق پہچانو، یاد رکھو اللہ کے سوا کسی کو سجدہ کرنے کی اجازت نہیں۔

جس قدر مذاہب برباد ہوتے ہیں ان کی ابتداء اسی جگہ سے ہوتی ہے کہ وہ اپنے بزرگوں میں ایک شان الوہیت تسلیم کرنے لگتے ہیں اور پھر تعظیم سے عبادت کی طرف چل پڑتے ہیں۔ ہندوؤں کا مذہب اسی لئے تباہ ہوا کہ انہوں نے اپنے بزرگوں کے احکام کی خاطر خداوندی ارشادات کی کوئی پرواہ نہ کی اور اہل کتاب بھی اسی مرض میں مبتلا ہیں۔ پس ایک مسلمان کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ ایسے شخص کا اتباع کرے جو شریعت کا مخالف ہو، اگرچہ وہ کرامت کے زور سے آسمان ہی پر کیوں نہ اڑنے لگے۔

### اخذ میثاق

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیِّیْنَ لَمَّا اٰتٰیْتُمْکُمْ مِنْ کِتٰبٍ وَحِکْمَةٍ ثُمَّ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمْ لَتَتَّوْمِنُنَّ بِہٖ وَلَتَنْصُرُنَّہٗ ۚ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِکُمْ اٰمِرٰی ۚ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا ۚ قَالَ فَاشْہَدُوْۤا وَاَنَا مَعَکُمْ مِّنَ الشّٰہِدِیْنَ ⑥



”اور جب اللہ نے نبیوں سے عہد لیا اس لئے کہ ضرور میں نے تم کو کتاب اور حکمت سے دیا ہے پھر تمہارے پاس وہ رسول آئے جو اس کی تصدیق کرنے والا ہو جو تمہارے پاس ہے تو تم ضرور اس کو مانو گے اور ضرور اس کی مدد کرو گے فرمایا کیا تم اقرار کرتے ہو اور اس پر میرا عہد لیتے ہو انہوں نے کہا ہم اقرار کرتے ہیں، کہا پس گواہ ہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔“

اہل کتاب باوجود ان آیات بینات کے رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کو تیار نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ صرف عرب کے لئے مخصوص ہیں، حالانکہ ان کا یہ دعویٰ سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔

یہ سچ ہے کہ انبیاء علیہم السلام لوگوں میں صحیح تعلیم پھیلانے، ان کو مہذب و شائستہ بنانے اور ان کے اخلاق و اعمال کی اصلاح کی غرض سے آتے ہیں، مگر ان اغراض و مقاصد کے علاوہ ان تمام انبیاء و رسل سے ایک اور بھی عہد و میثاق لیا جاتا تھا جس کی حفظ و صیانت اور اپنی اپنی امت میں نشر و اشاعت ان کے ذمہ تھی اور وہ عہد یہ تھا کہ ایک مدت کے بعد نبی آخر الزماں پیدا ہونے والا ہے، اس کی نصرت و اعانت اور اس پر ایمان لانا تمہارا فرض ہو گا۔ لو کان موسیٰ حیاً ما وسعہ الا اتباعی، اگر آج موسیٰ زندہ ہوتے تو انہیں بھی میرے اتباع کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ ہوتا۔

اجلہ صحابہ کرام اور جمہور مفسرین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ یہاں رسول اللہ ﷺ کی بعثت کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت علی، ابن عباس اور قتادہ وغیرہ کی یہی رائے ہے۔ قرآن حکیم نے بار بار اس حقیقت کو واضح کیا کہ رسول اللہ سے قبل ہر ایک نبی اپنی اپنی قوم کی طرف بھیجا گیا تھا: وما من امة الا خلا فیہا نذیر۔ اس زمانہ میں ہر ایک قوم اپنے اپنے ملک میں رہتی تھی، بین الاقوامی تعلقات مضبوط نہ تھے، اسی لئے ہر ایک قوم اپنے اپنے امتیازات و خصوصیات کو قائم کئے ہوئے تھی۔ مگر ایک وقت ایسا آنے والا تھا جبکہ قومیت اور وطنیت کی بندشیں ٹوٹنے والی تھیں۔ اس لئے ضروری تھا کہ جب تمام قوموں کے درمیان تعلقات قائم ہو جائیں اور وہ پابندیاں اٹھ جائیں تو اس وقت تمام دنیا کے لئے ایک ہی پیغمبر بھیجا جائے، جو ان تفریقوں اور اختلافوں کو یک قلم مٹا دے اور تمام نسل انسانی کو ایک بنا دے۔ اس نبی آخر الزماں کا فرض یہ تھا کہ وہ تمام قوموں میں عالمگیر برادری قائم کر دے اس لئے ضروری تھا کہ تمام انبیائے کرام سے اس قسم کا عہد و میثاق لیا جاتا کہ وہ اپنی امت کو ہر وقت اس کے لئے تیار رکھیں کہ جس وقت وہ نبی آئے فوراً اس کے آگے اپنی گردنیں خم کر دیں۔ چنانچہ رسول اللہ نے آتے ہی نسل انسانی کی وحدت کا اعلان عام کر دیا: یَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْثَرَ مَا كُنْتُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْفَكُومُ (الحجرات ۱۳) اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہارے کنبے اور قبیلے ٹھہرائے تاکہ ایک دوسرے کو پہچانو۔ واقعی تم میں زیادہ باعزت اللہ کے نزدیک وہی ہے جو تم میں زیادہ پرہیز گار ہے۔ دوسری جگہ فرمایا: یَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً (النساء) اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک نفس سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا پیدا کر دیا اور ان سے بہتیرے مرد اور عورتیں پھیلادیں۔

اس آخری نبی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تمام کتابوں اور رسولوں کی تصدیق کرے گا۔ لا نفراق بین احد من رسلہ اس کا طرہ افتخار یہ ہوگا: یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک، اس رسول کے متعلق ہم کتاب استثناء کی پیشین گوئیاں تفصیل کے ساتھ گزشتہ اور اوراق میں درج کر چکے ہیں، اب رسولوں کے اعمال سے ایک اور شہادت اسی کی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

”ضرور ہے کہ وہ آسمان میں اس وقت رہے جب تک کہ وہ سب چیزیں بحال نہ کی جائیں جن کا ذکر خدا نے اپنے پاک نبیوں کی زبانی کیا ہے جو دنیا کے شروع سے ہوتے آئے ہیں، چنانچہ موسیٰ نے کہا کہ خداوند خدا تمہارے بھائیوں میں سے تمہارے لئے مجھ سا ایک نبی پیدا کرے گا جو کچھ وہ تم سے کہے اس کی سننا اور یہ ہو گا کہ جو شخص اس نبی کی نہ سنے گا وہ امت میں سے نیست و نابود کر دیا جائے گا۔“ (اعمال ۱۲: ۳۲۳۲)

یہ الفاظ اپنی شرح آپ کر رہے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ایسے نبی کا انتظار تھا اور آج تک رسول اللہ کے سوا اور کسی شخص نے مثل موسیٰ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ تمام انبیاء نے آپ کے ظہور اقدس کی اپنی امت کو خبر دی اور ہر ایک نبی سے اللہ نے یہ عہد لیا کہ وہ اس نبی موعود کی امداد و اعانت کے لئے اپنی امت سے ضرور وعدہ لے گا اور یہ میثاق لیا گیا کہ وہ اس عہد کو لوگوں میں برابر مشہور کرتے رہیں گے اور جو کتاب نازل ہوگی اس میں اس عہد و میثاق کی یاد تازہ کرادی جائیگا۔

فَمَنْ تَوَلَّىٰ بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿۳۲﴾

”پھر اس کے بعد جو شخص منہ موڑے تو وہی لوگ نافرمان ہیں۔“

اس قدر روشن دلائل کے بعد بھی اگر یہ لوگ دائرۃ اسلام میں داخل نہ ہوں، رسول اللہ کی نبوت کا اقرار نہ کریں اور دین کو ذریعہ تفریق و عدوان بنائیں تو ان بد اخلاقوں کی کوئی عزت نہ ہوگی اور ان کو برباد کر دیا جائے گا۔

انتباہ

أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْتَغُونَ وَلَوْ أَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿۳۳﴾

”کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے سوا اور کچھ چاہتے ہیں حالانکہ جو آسمانوں میں اور زمین میں ہیں بخوشی اور بجز اسی کے تابعدار ہیں اور اسی کی جانب لوٹائے جائیں گے۔“

کیا اس کے بعد بھی یہ لوگ خداوند قدوس کی توحید خالص اور اس دینِ قوم کو ترک کر کے کسی دوسری طاقت کے آگے اپنی گردنیں خم کرینگے۔ حالانکہ زمین و آسمان کی ہر چیز اسی کے تابع فرمان ہے۔ وان من شيء الا يسبح بحمده۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کی دو قسمیں ہیں:

(الف) تکوینی۔ یہ انسان کے اختیار میں نہیں کہ اس پر آثار و ثمرات خود مرتب کر سکے۔ مرنا، جینا بیمار، پڑنا وغیرہ سب اسی میں داخل ہیں: فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعَتَيْنِ (حم السجده ۱۱) پس اس نے

آسمان اور زمین کو حکم دیا کہ تمہیں طوعاً یا کرہاً ہمارے احکام کو تسلیم کرنا پڑے گا، انہوں نے عرض کیا کہ ہم طوعاً حاضر ہوتے ہیں۔

(ب) تشریحی۔ یہ انسان کے اختیار اور قدرت میں ہے، نماز پڑھنا وغیرہ۔ تمام انسان، ملائکہ اور زمین و آسمان تکوینی احکام کے مجبور و اکراہ پابند ہیں۔ ان کا خلاف ہی ناممکن ہے۔ فرشتوں کے متعلق آتا ہے: لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ وہ اللہ کے اوامر کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم دیا جاتا ہے وہی کرتے ہیں۔ ایک جگہ اس طرح ہے: وَلِلَّهِ يَسْجُدُ مِنَ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ كُلُّ شَيْءٍ حَاشٍ، زمین و آسمان میں ہر ایک طوعاً و کرہاً اسی کا تابع فرمان ہے۔ ایک اور مقام پر یوں ارشاد ہے: أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى مَا خَلَقَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ يُتَفَكَّرُونَ ظِلُّهُ لَئِنْ يَشَاءْ يَنْفَخِ النَّفْثَ فِيهِ وَالنَّجَّاتِ كُلِّ سَاجِدٍ لِلَّهِ وَهُمْ لَا يَسْجُدُونَ ۝ وَلِلَّهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مِنْ دَابَّةٍ وَالْهَبْلِ كُلِّ وَهُمْ لَا يَسْجُدُونَ ۝ يَخَافُونَ رَبَّهُمْ مِنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ۝ (النحل ۴۸ تا ۵۰) کیا انہوں نے اللہ کی پیدا کی ہوئی چیز کی جانب نہیں دیکھا کہ اللہ کو سجدہ کرتے ہوئے اس کے سائے دائیں سے اور بائیں سے ڈھلتے ہیں اور وہ عاجزی میں ہیں اور اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں جاندار اور فرشتے بھی اور وہ تکبر نہیں کرتے۔ اپنے رب سے ڈرتے ہیں جو ان کے اوپر ہے اور کرتے ہیں جو کچھ سب ان کو حکم دیا جاتا ہے۔ ایک جگہ پر یوں بھی ہے: وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَهَا ۚ ذَلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ۝ وَالْقَمَرَ قَدَرْنَاهُ مَنَازِلَ حَتَّىٰ عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ ۝ لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۚ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ۝ (یس ۳۸ تا ۴۰) اور سورج اپنی ٹھہری ہوئی راہ پر چلا جا رہا ہے، یہ زبردست علیم کا اندازہ ہے اور چاند کے لئے ہم نے منزلیں مقرر کر دیں یہاں تک کہ پھر کھجوروں کی پرانی ٹہنی کی طرح ہو گیا۔ نہ سورج سے ہو سکتا ہے کہ چاند کو آپکڑے اور نہ رات ہی دن سے آگے بڑھ سکتی ہے اور سب گھیرے میں تیر رہے ہیں۔

اس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ رب الارباب کس قدر باجبروت اور باعظمت ہے۔ اب جو لوگ تشریحی احکام کی مخالفت کرتے ہیں وہ اس کی گرفت سے کیسے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ ایسے خدائے قدوس کی چوکھٹ پر سر رکھنا بیشک عزت کی نشانی اور اس کو چھوڑ کر انسانوں کے آگے سر بسجود ہونا ذلت و رسوائی کی دلیل ہے۔ حالانکہ اگر تم ذرا غور سے کام لو تو تمہیں معلوم ہو گا کہ انسان بسا اوقات مجبور ہو کر اسی ذات واحد کے آگے اپنی گردن خم کر دیتا ہے: وَإِذَا غَشِيَهُمْ مَوُجُّ كَالظَّلِيلِ دَعَا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الدِّبْرِ فَبَنَّهُمْ مُّقْتَصِدًا ۚ وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُورٍ (القصص ۲۲) اور جب سائبانوں کی طرح موج ان کو چھپا لیتی ہے تو اللہ ہی کے لئے عبادت کو خالص کر کے اسی کو پکارتے ہیں، پھر جب وہ ان کو خشکی کی جانب بچا لاتا ہے تو بعض ان میں اعتدال پر رہتے ہیں اور ہماری آیتوں کا انکار وہی کرتے ہیں جو بد عہد اور ناشکرے ہیں۔ انسان کی عجز و درماندگی ملاحظہ ہو: وَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلِكِ دَعَا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الدِّبْرِ فَبَنَّهُمْ مُّقْتَصِدًا ۚ وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُورٍ (النجم ۱۰) اور جب کشتی پر سوار ہوتے ہیں تو اللہ ہی کو پکارتے ہیں اور ہر قسم کی عبادت کو اسی کے لئے

مخصوص کر دیتے ہیں، پھر جب وہ ان کو خشکی پر لے آتا ہے اور سمندر کی موجوں سے نجات بخشتا ہے تو پھر شرک شروع کر دیتے ہیں۔ ایک جگہ آتا ہے: وَلَیْنِ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَیَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (لقمان ۲۵) اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو یقیناً اللہ ہی کا نام لیں گے۔ الغرض ان تمام تصریحات سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ زمین و آسمان کا قیام، نوع انسانی کا وجود اور کائنات عالم کا ایک ایک ذرہ اسی مذہب اسلام اور فرمان الہی کا پابند ہے۔

## طغرائے امتیاز

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَا اُنْزِلَ عَلٰى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَا اَوْفَىٰ مُوسٰى وَعِيسٰى وَالنَّبِيِّنَّ مِنْ رَبِّهِمْ ۚ لَا نُنْفِقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِنْهُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ﴿٨٧﴾

”کہہ دو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہم پر اتارا گیا اور جو ابراہیم، اسمعیل، اسحق، یعقوب اور اس کی اولاد پر اتارا گیا اور جو موسیٰ، عیسیٰ اور نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا۔ ہم ان میں سے کسی ایک میں بھی فرق نہیں کرتے اور ہم تو اسی کے حکم بردار ہیں۔“

فرزند ان اسلام و حلقہ گجستان توحید کا یہی طغرائے امتیاز ہے کہ وہ تمام انبیاء و رسل کی تعلیمات صالحہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ حق و صدق کی آواز دنیا کے کسی گوشہ سے بلند ہو، سب سے پہلے ایک مسلمان ہی اس کو لبیک کہنے کے لئے آمادہ ہوگا۔ یہ خصوصیت دنیا کے اور کسی مذہب کو حاصل نہیں۔ ہر ایک جماعت کسی نہ کسی نبی کی تکذیب ضرور کرتی ہے۔ یہ صرف اسلام ہی میں بات پائی جاتی ہے کہ وہ تمام رسولوں کی تصدیق کرتا ہے اور اس لئے دنیا کا اعلیٰ مذہب بھی یہی ہو سکتا ہے۔

وَمَنْ يَتَّبِعْ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ ۖ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَسِرِينَ ﴿٨٥﴾

”اور جو کوئی اسلام کے سوا دوسرا دین طلب کرے گا تو اس سے قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔“

گزشتہ آیات نے یہ ثابت کر دیا کہ کائنات عالم کا ایک ایک ذرہ پابند اسلام ہے۔ تمام انبیائے کرام نے اسی مذہب کی اپنی اپنی کتابوں میں پیشین گوئی کی ہے اور یہ خود تمام رسل کرام کی تصدیق کرتا ہے، اب اس کے بعد بھی اگر ایک شخص اس صراطِ مستقیم کو ترک کر کے دوسرا کوئی مذہب اختیار کرتا ہے تو وہ انجام کار ناکام رہے گا۔ اس لئے کہ دنیا کے تمام مذاہب وادیان کی تعلیمات اور کتابوں میں شدید ترین تحریف کی گئی ہے اور اس طرح راہِ حق گم ہو گئی ہے۔ اسلام ان تمام عیوب و نقائص سے پاک ہے۔ اس کو ترک کرنے کے یہ معنی ہیں کہ عمداً صراطِ مستقیم سے انحراف کیا جا رہا ہے۔

ادھر خود فطرت انسانی کو دیکھئے تو وہ اسی اسلام پر پیدا کی گئی ہے۔ جب تمام ارواح انسانی سے سوال کیا گیا: الست بریکم

تو سب نے بلی ہی میں جواب دیا تھا۔ گویا انسان کی فطرت ہی اسلام پر پیدا کی گئی ہے۔ حدیث میں آتا ہے: کل مولود یولد علی فطرۃ الاسلام، ہر ایک انسان فطرت اسلام پر پیدا کیا جاتا ہے۔ اب جو شخص اسلام سے احتراز کرتا ہے وہ گویا اپنی فطرت صحیحہ کو برباد کرتا ہے جس کے بعد کامیابی کی کوئی توقع نہیں ہو سکتی۔

کوئی عذر نہیں رہا

كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ وَشَهِدُوا أَنَّ الرُّسُولَ حَقٌّ وَجَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۖ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿٨٠﴾

”اللہ ان لوگوں کی کیسے ہدایت کرے گا جو اپنے ایمان کے بعد کافر ہوئے اور وہ اقرار کر چکے کہ رسول سچا ہے اور ان کے پاس کھلی دلیلیں آچکیں اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔“

اہل کتاب کی عجب حالت ہے، تمام انبیائے سابقین پر وہ ایمان رکھتے ہیں۔ رسول اللہ کی صداقت کو برآی العین مشاہدہ کر چکے ہیں: یعرفونہ کہا یعرفونہ ابنائہم، پھر یہ آیات بینات ہیں جو اسلام کی صداقت کو ظاہر کرتی ہیں۔ باوجود ان تمام باتوں کے وہ اسلام قبول نہیں کرتے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ اسلام کی تعلیم کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ خدا کے حکم کے لئے اپنی چھوٹی سے چھوٹی مصلحت کو بھی قربان کرنے کو تیار نہیں، اس لئے وہ یاد رکھیں کہ کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔ ان کی ہدایت کے لئے ہر گز کوئی دوسرا نبی نہ بھیجا جائے گا اور ان کی عقلوں پر ایسے پردے پڑ جائیں گے کہ صاف صاف باتیں بھی ان کی سمجھ میں نہ آئیں گی۔

أُولَٰئِكَ جَزَّوْهُمْ أَلَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿٨١﴾ خُلِدِينَ فِيهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْقَرُونَ ﴿٨٢﴾ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ وَأَصْلَحُوا ۚ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٨٣﴾

”ان کی سزا یہی ہے کہ ان پر اللہ فرشتوں اور لوگوں سب کی لعنت ہے، اس میں رہیں گے، نہ ان سے عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی، مگر ہاں جنہوں نے اس کے بعد توبہ کی اور اصلاح کی تو بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔“ جب یہ لوگ رسول اللہ کی تعلیم کو نہ مانیں گے تو ان پر لعنت طاری ہوگی۔ یعنی:

اللہ تعالیٰ سے دور ہوں گے جو طہارت اور قد و سیت کا سرچشمہ ہے۔

ملائکہ سے دور ہوں گے جن کی وساطت سے نیکی کی تحریک ہوتی ہے۔

اور انجام کار لوگ بھی ان کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیں گے۔

ان لعنتوں کی تفصیل کتاب استثناء میں اس طرح آتی ہے:

”لیکن اگر تو خداوند اپنے خدا کی آواز کا شنوائہ ہو گا کہ اس کے سارے شرعوں اور حکموں پر جو آج کے دن میں تجھے

بتاتا ہوں، دھیان رکھ کے عمل کرے تو ایسا ہو گا کہ یہ ساری لعنتیں تجھ پر اتریں گی اور تجھ تک پہنچے گی، تو شہر میں لعنتی ہو گا، اور تو کھیت میں بھی لعنتی ہو گا۔ تیرا ٹوکرا اور تیرا کٹھرا لعنتی ہو گا۔ تیرے بدن کا پھل اور تیری زمین کا پھل تیری گائے بیل کی بڑھتی اور تیرے بھیڑ بکری کے گلے لعنتی ہو جائیں گے، تو بھیڑ آنے کے وقت لعنتی ہو گا اور تو باہر جانے کے وقت لعنتی ہو گا۔ خداوند ان سارے کاموں میں جن میں تو کرنے کے لئے ہاتھ لگا دے تجھ پر لعنت اور حیرت اور ملامت نازل کرے گا۔ یہاں تک کہ تو ہلاک ہو گا اور جلد نابود ہو جائے گا۔ تیرے عملوں کی برائی کے باعث جن کے سبب سے تو نے مجھے ترک کیا۔ (استثنا ۵۱: ۸۲ تا ۸۳)

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ أَذَّادُوا كُفْرًا أَلَنْ نَقْبَلَ تَوْبَتَهُمْ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الصَّالُونَ ۝ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْ أَحَدِهِمْ مِلْءُ الْأَرْضِ ذَهَبًا وَلَوِ افْتَدَىٰ بِهِ ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَّاصِرِينَ ۝

“بیشک جو لوگ ایمان کے بعد کافر ہوئے پھر کفر میں بڑھتے گئے ان کی توبہ قبول نہ کی جائے گی اور وہی گمراہ ہیں۔ جو لوگ کافر ہو گئے اور کافر ہی مر گئے تو ان میں سے کسی سے زمین بھر سونا بھی قبول نہ کیا جائے گا اگرچہ وہ اسے معاوضہ میں دے۔ یہی لوگ ہیں جن کے لئے دردناک عذاب ہے اور ان کے لئے کوئی بھی مددگار نہ ہو گا۔”

جو لوگ ایمان کے بعد کفر کرتے ہیں اور پھر اس میں برابر ترقی کرتے جاتے ہیں ان کی توبہ ہر گز قبول نہ ہو گی۔ ایمان کا مطلب تو یہ تھا کہ آئندہ تمام اعمال فاسقہ سے پرہیز کیا جائے گا، مگر جب انہوں نے قبول اسلام سے انکار کر دیا اور وہ بھی اس قدر شدید کہ فسق و فجور میں برابر ترقی کر رہے ہیں، تو پھر ان کی توبہ بھلا کیسے قبول ہو سکتی ہے۔ اس کے قبول ہونے کی اولین شرط یہ ہے کہ انسان راہ حق اختیار کرے اور بدیوں سے بچے۔

اسلام سے انکار کرنے کے بعد اگر ایک شخص اپنی تمام دولت بھی خدا کی نذر کر دے تو اس کو قبول نہیں کیا جائے گا اور نہ یہ چیزیں اس کو عذاب آخرت سے بچا سکیں گی۔ ایک جگہ آتا ہے: وَلَا يَقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةُ دُوسری جگہ ہے: يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا نَهْنُونَ، الْإِمْنُ اتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ۔ ایک مقام پر یوں ارشاد ہوتا ہے: لَا يَمِيعُ فِيهِ وَلَا خِلَالٌ۔ یہ بھی فرمایا: إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَالْوَأَالُ لَهُمْ مَتَانِي الْأَرْضِ جَبِينًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لِيَفْتَدُوا بِهِ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَا تُقْبَلُ مِنْهُمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (المائدہ ۳۶) جو لوگ کافر ہیں اگر ان کے پاس جو کچھ زمین میں ہے سب اور اس کے ساتھ اتنا ہی اور بھی، قیامت کے دن کے عذاب سے اپنی نجات کے لئے دیدیں تو وہ بھی ان سے قبول نہ کیا جائے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ۝

“تم نیکی کو ہر گز نہ پاسکو گے جب تک وہ چیزیں خرچ نہ کرو جن کو تم عزیز رکھتے ہو اور جو کچھ بھی خرچ کرو گے اللہ اس کو جانتا ہے۔”

حقیقی نیکی حاصل کرنے کا قاعدہ یہ ہے کہ انسان اپنی محبوب و عزیز ترین متاع اللہ کے نام پر قربان کرنا سیکھے۔ موقع و محل کے اعتبار سے اسلام کو جس قربانی کی ضرورت ہو اس کو خود ذوق سے پیش کرے۔ آج اگر ملت اسلام یہ چاہتی ہے کہ دنیا کے تمام مسلمان اپنے گھر بار چھوڑ کر فقط اس کو بچانے کے لئے اپنی جانیں قربان کر دیں تو اس وقت نیکی صرف یہی ہو گی کہ ہم فوراً اپنی ہتھیلیوں پر سروں کو رکھ کر میدان جنگ میں حاضر ہوں اور اگر اس وقت تبلیغ و دعوت اسلام کی اکناف و اطراف عالم میں ضرورت ہو تو ہر مسلمان مرد و عورت کا فرض ہے کہ وہ پیکر تبلیغ و مجسم دعوت بن کر گھر سے نکل جائے کہ آج صرف یہی نیکی ہے۔

### ایک اعتراض

براہر اہل کتاب ہی سے گفتگو چلی آرہی ہے۔ اسلام ان کو اصول و کلیات کی طرف بلاتا ہے اور وہ کج بحث جزئیات و فرعیات میں جھگڑتے ہیں۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں وہ ایک اور اعتراض کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی شریعت میں اونٹ کا دودھ اور گوشت حلال ہے، مگر بنی اسرائیل کے نزدیک دونوں چیزیں حرام تھیں، اہل کتاب نے اعتراض کیا کہ آپ تو ملت ابراہیمی کے اتباع کا دعویٰ کر رہے ہیں حالانکہ اس میں ان چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے، اس کے جواب میں فرمایا:

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حَلَالًا لِّبَنِي إِسْرَءِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَءِيلُ عَلَى نَفْسِهِ مِنْ قَبْلِ أَنْ تُنَزَّلَ الشَّوْرَةُ قُلْ فَاتُوا بِالشَّوْرَةِ فَآتَوْهَا إِنَّ كُنتُمْ صَادِقِينَ ٥ فَمَنْ افْتَرَى عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ٦

“بنی اسرائیل کے کھانے کی سب چیزیں حلال تھیں قبل اس کے تو رات اتاری جائے سوائے اس چیز کے جس کو اسرائیل نے اپنے اوپر حرام کر لیا، کہہ دو کہ اگر تم سچے ہو تو تو رات لاؤ اور اسے پڑھو، پھر جو کوئی اس کے بعد اللہ پر جھوٹ باندھے تو وہی ظالم ہیں۔”

بیشک اونٹ کا گوشت بنی اسرائیل کے لئے ایک خاص وجہ سے حرام ہوا تھا، اس کے علاوہ بعض اور چیزیں بھی مخصوص طور پر ان کے لئے حرام کر دی گئی تھیں، جس کے حسب ذیل اسباب تھے:

(الف) ہم نے ناخن والے جانور ان پر حرام کر دیئے اور یہ ان کے لغوی وعدہ ان کی سزا تھی: وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفْرٍ ۖ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُومَهُمَا إِلَّا مَا حَبَلَتْ ظُهُورُهُمَا أَوِ الْحَوَايَا أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۚ ذَٰلِكَ جَزَاءُ بَغْيِهِمْ ۖ وَإِنَّا لَصَدِيقُونَ (الانعام ۱۴۶) اور یہودیوں پر ہم نے تمام ناخن والے جانور حرام کر دیئے تھے اور گائے اور بکری میں سے ہم نے ان پر ان دونوں کی چربی حرام کر دی تھی، سوائے اس کے جو ان کی پشت پر لگی ہوئی ہو یا انتڑیوں میں ہو یا ہڈیوں سے ملی ہوئی ہو۔ یہ ہم نے ان کو ان کی شرارت پر سزا دی تھی اور ہم یقیناً سچے ہیں۔



(ب) آئندہ چل کر انہیں چالیس سال تک بیابانوں میں مارے مارے پھرنا تھا، جہاں سوائے اونٹ کے اور کوئی جانور ان کے کام نہ آسکتا تھا، اس لئے اس کو حرام کر دیا گیا کہ سزا کی بھی تکمیل ہو جائے۔

(ج) ترمذی میں ابن عباس سے روایت ہے: ان اليهود قالوا للنبی ﷺ اخبرنا ما حرم اسرائیل علی نفسه قال کان یسکن البدو فاشتی عرق النساء فلم یجد شیاً یلائه الا تحريم الابل والبانها فلذلك حرمها قالوا صدقت۔ بعض یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ حضرت یعقوب نے اپنے اوپر کیا چیز حرام کی تھی؟ آپ نے فرمایا کہ وہ جنگل میں اقامت گزریں تھے، ایک مرتبہ انہیں عرق النساء کی شکایت ہوئی تو اونٹ کا گوشت اور دودھ چھوڑنا ان کے لئے نہایت ہی مفید و نافع ثابت ہوا۔ اسی بنا پر انہوں نے ان دونوں چیزوں کو اپنے اوپر حرام کر لیا، ان لوگوں نے اس کی تصدیق کی۔

جس وقت حضرت اسرائیل علیہ السلام نے اس کا گوشت کھانا ترک کر دیا تو ان کی تقلید میں گھروالوں نے بھی اسے چھوڑ دیا۔ رفتہ رفتہ ان کی اولاد اس سے نفرت کرنے لگی اور اس نفرت نے یہاں تک ترقی کی کہ تمام بنی اسرائیل اس کو حرام سمجھنے لگے۔ اب اگر کوئی شخص اس کو کھالیتا تو لوگ اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے اور یہ خیال کرتے کہ اس نے خود حضرت یعقوب کی توہین کی ہے۔ جب تمام قوم کی قوم نے عملاً اس کو حرام کر دیا تو انجام کار تورات میں بھی اس کی حرمت کے احکام نازل ہو گئے۔

پس اس تمام تفصیل سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ یہ چیزیں ابراہیم پر ہرگز حرام نہ تھیں، بلکہ یہ اسرائیلی خصوصیت ہے، اب تم لوگ جو یہ دعویٰ کرتے ہو کہ خود ابراہیم کے نزدیک اونٹ کا گوشت حرام تھا تو ذرا تورات لا کر یہ ثابت کر دو کہ ان چیزوں کو کائنات خلقت نے حرام کیا تھا اور اگر باوجود ثابت نہ کرنے کے پھر بھی اپنی بات پر قائم رہو، تو گویا اللہ پر افترا پرداز کرتے ہو۔

قُلْ صَدَقَ اللَّهُ فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ⑤

”کہہ دو کہ اللہ نے سچ فرمایا پس ابراہیم کے دین کی پیروی کرو جو ایک کے ہو رہے تھے اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے۔“  
تم تمام فرعی مسائل چھوڑ کر اصل و اساس کو اپنے ہاتھ میں لے لو، شرک کو ترک کر کے توحید خالص سے اعتصام و تمسک کرو۔ چنانچہ حضرت ابراہیم کا بھی یہی طرز عمل تھا۔ ایک جگہ آتا ہے: قُلْ إِنِّي هَدَيْتُ دِيْنِي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ④ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ⑤ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (الانعام ۱۶۱) ایک مقام پر یوں ارشاد ہوتا ہے: ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنْ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ⑥ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (النحل ۱۲۳) پھر ہم نے تمہاری طرف الہام کیا کہ ابراہیم حنیف کی ملت کا اتباع کرو، وہ مشرکین میں سے نہ تھے۔

حج بیت اللہ



گزشتہ آیات میں ابراہیمی خصوصیات پر بہت زور دیا گیا ہے، لیکن ان کی نشاۃ و تولید اور تربیت نہیں ہو سکتی جب تک انسان خود اس مقام ابراہیم سے شرف اندوز یا رت نہ ہو کہ اس کے دیکھتے ہی کائنات غلت کے تمام مقامات ذہاب الی اللہ یاد آجائیں گے، وہی جذبات حقہ ہم میں بھی پیدا ہوں گے۔ توحید کی خاطر ہم بھی اپنی ہر چیز قربان کرنے کو تیار ہو جائیں گے اور تکالیف و شدائد میں مقصد حیات سے انحراف نہ کریں گے۔ اس لئے فرمایا:

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِلْعَالَمِينَ ﴿۵﴾

”پہلا گھر جو لوگوں کیلئے مقرر کیا گیا وہی ہے جو مکہ میں ہے برکت دیا گیا اور جہان کے لوگوں کیلئے ہدایت ہے۔“  
لوگوں کے لئے سب سے پہلا گھر جو صرف عبادت کے لئے بنایا گیا وہ بیت اللہ ہے۔ بخاری و مسلم میں ہے: ابوذر عرض کرتے ہیں: نیا رسول اللہ ای مسجد وضع اول، قال المسجد الحرام، قلت ثم ای قال المسجد الاقصی قلت کم بینہما قال اربعون سنۃ۔ سب سے پہلے کوئی مسجد بنائے گئی؟ آپ نے فرمایا مسجد حرام اس کے بعد مسجد اقصیٰ اور ان دونوں کی تعمیر کے درمیان چالیس سال کا فاصلہ تھا۔ قرآن حکیم نے مکہ کا دوسرا نام ام القریٰ یعنی بستیوں کی ماں رکھا ہے کہ یہاں سے تمام دنیا توحید حاصل کرے گی اور ہر ایک قوم اس کے سرچشمہ ہدایت سے سیراب ہوگی۔

پچھلی آیت میں یہ بتایا تھا کہ دنیا کے تمام برگزیدہ رسولوں نے اپنے اپنے زمانہ میں رسول اللہ کی پیشین گوئی کی ہے، اس لئے آپ اول النبیین ہیں اور یہی وجہ ہوئی کہ اول بیت کو آپ کے لئے قبلہ بنا دیا گیا۔ حضرت ابراہیم اپنی اولاد کو ایک وادغید ذی زہر میں آباد کر گئے کہ اللہ کا مقدس نام لوگوں کو اس جگہ پر کشاں کشاں لے آئے گا۔

یہ گھر مبارک ہے۔ حدیث میں آتا ہے: صلوة فی مسجدی هذا افضل من الف صلوة فیما سواہ من المساجد الا المسجد الحرام۔ مسجد حرام کے سوا باقی تمام مساجد ارضی میں سے صرف میری مسجد میں نماز پڑھنے سے ایک ہزار نماز کا ثواب ملتا ہے۔ اس کی خیر و برکت اور رشد و ہدایت ایک وقت اور ایک ملک کے لئے مخصوص نہیں، بلکہ دائمی، غیر منقطع اور تمام انسانوں کے لئے ہوگی۔ پہلی عبادت گاہیں اور قبلے ایک وقت کے لئے ہوتے تھے، اس لئے ان کی برکتیں بھی ختم ہو جاتیں، مگر یہ پاک گھر ہمیشہ کے لئے برکتوں اور رحمتوں کا سرچشمہ رہے گا اور جو ہدایت یہاں سے نکلے گی وہ محض عرب کے لئے مخصوص نہ ہوگی، بلکہ کرۂ ارضی کی تمام قومیں اور امتیں اس سے یکساں طور پر فائدہ حاصل کریں گی اور اس طرح بتدریج تمام نسل انسانی کی ایک عالمگیر برادری قائم ہو جائے گی۔ جس کا قرآن نے آتے ہی اعلان کر دیا تھا۔

## آیات بینات

فِیْہِ اٰیٰتٌ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰہِیْمَ وَمَنْ دَخَلْہٗ كَانَ اٰمِنًا وَّلِلّٰہِ عَلٰی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتِطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا وَمَنْ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰہَ غَفِیْرٌ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۵﴾

”اس میں بہت سی کھلی نشانیاں ہیں مثلاً مقام ابراہیم اور جو وہاں داخل ہو گیا وہ امن والا ہو گیا اور اللہ کے لوگوں پر اس گھر

کاج کرنا ہے اس پر جس کو اس تک پہنچنے کی طاقت ہو، اور جس نے کفر کیا تو بیشک اللہ جہانوں سے بے نیاز ہے۔“ پہلے بیت اللہ الحرام کے امتیازات خصوصی اور برکات کو بیان کیا، اب تین کھلی کھلی اور ناقابل انکار نشانیوں کا ذکر آتا ہے، جن کی وجہ سے اس بیت اللہ کا اکرام و احترام ہمیشہ کے لئے ہوتا رہے گا اور تمام دنیا پر اتمام حجت ہو جائے گی۔ ان نشانات کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(الف) مقام ابراہیم: توراۃ میں بیت ایل یا بیت اللہ کا ذکر کئی جگہ آیا ہے۔ دنیا کی تمام عبادت گاہوں میں سے صرف اسی گھر کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کو اللہ کا گھر کہا گیا۔ یہی ایک مقام ہے جس کے ساتھ اس کرۂ ارضی میں ابراہیم کی شہرت و رفعت کا ذکر وابستہ ہے۔ بیت المقدس اور دوسرے مذہبی مقامات کو یہ امتیازات حاصل نہیں ہیں۔ عرب کے لوگ بت پرستی اور شرک میں مبتلا تھے، مگر باوجود اس کے وہ بھی خانہ کعبہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جانب منسوب کرتے تھے۔

ابراہیم علیہ السلام کی قیام گاہ، ان کے ترک و وطن و ذہاب الی اللہ کے مختلف منازل، ان کا قربانی کرنا اور اللہ قدوس کے لئے ایک گھر تعمیر کرنا، یہ سب چیزیں وہاں ملتی ہیں۔ ان کے نظر آتے ہی خود ہم میں بھی ویسے ہی جذبات حقہ موجزن ہوں گے۔ اسی ایثار و فدویت کی نشیو تولید ہوگی اور اسی حق و حریت کے لئے ہم بھی جان و مال قربان کرنے کیلئے تیار ہو جائیں گے۔ (ب) ومن دخله کان امناً: عرب کے لوگ اسلام سے قبل اپنی جہالت و بربریت کے لئے شہرہ آفاق تھے، مگر باوجود اس کے پھر بھی انہوں نے اس گھر کو امن والا رکھا۔ بڑے سے بڑا مجرم یہاں آکر پناہ لے سکتا تھا اور کسی کو اس کے گرفتار کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی، قنادہ کہتے ہیں: کان هذا فی الجاہلیۃ کان الرجل لو چوکل جریرۃ علی نفسه ثم لجاء الی الحرم لم یتناول ولم یطلب۔ زمانہ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ اگر ایک شخص جرائم کے ارتکاب کے بعد بیت اللہ میں آکر پناہ لیتا تو اسے کوئی گرفتار نہ کر سکتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: لو وجدنا فیہ قاتل الخطاب ما مسته حتی یخرج منه، اگر میں اپنے والد کے قاتل کو بھی بیت اللہ میں دیکھ پاؤں تو جب تک وہ خود باہر نہ آئے گا میں اس کے جسم کو ہاتھ تک نہ لگاؤں گا۔ امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے کہ: جب ایک مجرم بھاگ کر حرم کی پناہ لے لے تو جب تک وہ باہر نہ آجائے اس پر حد نہیں جاری ہو سکتی۔ فتح مکہ کے روز خود لسان نبوت نے اس گھر کے امن والا ہونے کا ان الفاظ میں اعلان کیا۔

قام النبی ﷺ الغد من یوم الفتح فقال ان مکة حرمها الله ولم یحرمها الناس فلا یحل لامری یومن بالله والیوم الآخر ان یسفک بها دما او یعضد بها شجرة فان احد ترخص لقتال رسول الله ﷺ فقولوا ان الله قد اذن لرسوله، ولم یاذن لکم وانما اذن لی ساعة من نهار، ثم عادت حرمتها کحرمتها بالامس۔

”آپ نے فرمایا کہ اس گھر کی حرمت خدا کی طرف سے ہوئی ہے نہ کہ لوگوں کی طرف سے، پس ایک مسلمان کے لئے ہر گزیہ جائز نہیں کہ اس حرم میں خون بہائے یا اس کا کوئی درخت کاٹے اور اگر کوئی شخص رسول اللہ ﷺ کے فعل سے استنبہ کرے تو اس سے کہہ دو کہ رسول کو تو خود اللہ نے اجازت دی تھی اور وہ بھی نہایت ہی قلیل وقت کے لئے اور تمہیں تو کسی نے اجازت نہیں دی۔ رسول اللہ کے اس قتال کے بعد اس گھر کی حرمت پھر سابق کی طرح عود کر آئی۔“

اس کے با امن گھر ہونے کا تو یہاں تک اہتمام کیا گیا کہ رسول اللہ نے اس میں ہتھیاروں کے ساتھ داخل ہونے کو قانوناً روک دیا: لا یحل لاحدان یحمل السلاح بمکة۔ کسی شخص کے لئے جائز نہیں کہ وہ ہتھیار بند مکہ میں داخل ہو۔

مُجملہ اور ضروریات کے، جن کی بنا پر بیت اللہ الحرام کو امن والا گھر بنانا ضروری قرار دیا گیا، اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسی گھر کے ذریعہ سے دنیا کی تمام قوموں میں اتحاد و اشتراک عمل پیدا ہو اور کرہ ارضی فتنہ و فساد کی بجائے امن اور سلامتی کی جگہ بن جائے۔

(ج) ولله على الناس حج البيت: دنیا میں جس قدر مذہبی مقامات اور زیارت گاہیں موجود ہیں ان پر بارہا دشمنوں نے حملے کئے، ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور ان کو تباہ و برباد کر دیا، مگر اس بیت اللہ الجلیل کے لئے تمام دنیا کے مسلمانوں پر لازمی کر دیا گیا کہ وہ اپنے اندر اتنی قوت محفوظ رکھیں کہ بڑے سے بڑا مخالف بھی اس پر قابض نہ ہو سکے، تاکہ یہ امن کا گھر رہے اور ہر زمانہ میں لوگ اس کاج کر سکیں۔ اہل جاہلیت باوجود جدال پسند ہونے کے اس بیت الامن کا احترام و اجالہ ہمیشہ ملحوظ رکھتے تھے۔

دوسری قوموں کے اختلاط سے بسا اوقات انسان اپنے خصائل و امتیازات کو فراموش کر دیتا ہے اور پھر وہ آہستہ آہستہ مٹ جاتے ہیں۔ ان خارجی اثرات سے بچنے کے لئے ہر صاحب استطاعت مسلمان کے لئے یہ ضروری قرار دیا گیا کہ اپنی تمام زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ وہ بیت اللہ جا کر اپنے جذبات ملی کو تازہ کرے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص نے من استطاع الیہ سبیلاً کی تفسیر رسول اللہ سے پوچھی تو آپ نے فرمایا: الزاد والراحلة۔

چونکہ اس گھر کو تمام معتقدین توحید کے لئے مرکز قومی قرار دیا گیا ہے، اس لئے ضروری ہوا کہ مُجملہ اور شرائط اور قیود کے امن پر بہت زیادہ زور دیا جائے، تاکہ ہر سال دنیا کے بہترین دل و دماغ بلاروک ٹوک تبلیغ توحید کی سب سے بڑی مجلس شوریہ قائم کر کے ان ذرائع و وسائل پر غور کریں جن کی وجہ سے تمام دنیائے اسلام میں اتحاد قائم ہو، کرہ ارضی کی تمام اسلامی حکومتیں ایک لڑی میں منسلک ہو سکیں اور دنیا کے باقی حصوں میں تبلیغ اسلام کے لئے کوئی راہ عمل معین کر سکیں۔ مسلمانوں کے سیاسی و مذہبی، عمرانی و اجتماعی اور اخلاقی و ادبی احیاء و تجدید کے لئے حج سے بہتر کوئی اجتماع نہیں ہو سکتا، فہل من مدکر۔

حج کے اسرار و مصالح پر صد ہا دفاتر تیار کئے جاسکتے ہیں جن کی اس مختصر کتاب میں گنجائش نہیں اور عقلمند کے لئے گزشتہ سطور ہی مشعل راہ کا کام دے سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو کافر کہا جو باوجود استطاعت، حج نہ

کریں۔ ان لوگوں میں صحیح طریق پر کام کرنے کی قابلیت حج کے بغیر پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ ترقی کے لئے ضروری ہے کہ مسلمانوں کے اعلیٰ ترین دماغ ایک مرکز پر جمع ہو کر ارتقائے اسلام اور بقائے خلافت کے مسائل پر غور کریں۔ حدیث میں آتا ہے: من ملک زاداد وراحلة ولم یحج بیت اللہ فلا یضراہ مات یہودیا اونصرانیا، جو مسلمان باوجود طاقت رکھنے کے حج نہیں کرتا، اب وہ خواہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر خدا کو اس کی کوئی پروا نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اس قسم کے الفاظ فرمائے ہیں: من اطاق الحج فلم یحج فسواء علیہ مات یہودیا اونصرانیا۔ حسن بصری رضی اللہ عنہ حضرت عمر کا یہ قول نقل کرتے ہیں: لقد هبت ان ابعث رجالا الى هذه الامصار فينظروا لي كل من كان عنده جدقة فلم یحج فیضربوا علیہم الجبۃ مالہم مسلمین مالہم مسلمین، میں چاہتا ہوں کہ تمام بلاد اسلام میں ہر کارے بھیج کر ان لوگوں کو معلوم کروں جو باوجود استطاعت حج نہیں کرتے تاکہ ان پر میرے ہر کارے جزیہ لگا دیں، یاد رکھو اس قسم کے لوگ ہر گز مسلمان نہیں ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ دنیائے اسلام میں سے بہترین حکمران گزرے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے ان کی نسبت جو کچھ فرمایا ہے اس کا ایک ایک لفظ حقیقت سے پُر ہے، وہ فرماتے ہیں: ”سینہ فاروق اعظم را بمنزلہ خانہ تصور کن کہ درہائے مختلف دارد، در ہر درے صاحب کمالے نشستہ و در یک در مثلاً اسکندر و ذوالقرنین باں ہمہ سلیقہ ملک گیری و جہاں ستانی و جمع جیوش و برہم زدن اعدا و در دیگر نوشیر و انے باں ہمہ رفق و ولین و رعیت پروری و داد گستری اگر چہ ذکر نوشیر و ان در محبت فضائل حضرت فاروق سوا ادب است و در دیگر امام ابوحنفیہ و امام مالکی باں ہمہ قیام بہ علم فتویٰ و احکام و در دیگر مرشدے مثل سیدی عبد القادر جیلانی یا خواجہ علاء الدین و در دیگر محدثے بر وزن ابو ہریرہ و ابن عمر و در دیگر حکیمے مانند جلال الدین رومی یا شیخ فرید الدین عطار مردمان گرداگرد ایں خانہ خانہ ایستادہ اند، دہر محتاجے حاجت خود را از صاحب فن درخواست می نماید و کامیاب میگردد، سبحان اللہ! حضر عمر کے سامنے یہی حقائق تھے جن کی بنا پر وہ ہر ایک مستطیع مسلمان کو حج کے لئے مجبور کرتے تھے۔

## اپنی تکذیب آپ

قُلْ يَٰٓأَهْلَ الْكِتَٰبِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ شَهِيدٌ عَلَىٰ مَا تَعْمَلُونَ ﴿۵۰﴾

”کہہ دو اے اہل کتاب! اللہ کی آیتوں کا کیوں انکار کرتے ہو اور اللہ اس پر گواہ ہے جو تم کرتے ہو۔“

اوپر جو کچھ مذکور ہوا، علمائے عہد عتیق و جدید پر روز روشن کی طرح واضح ہے کہ حرفا حرفاً توراۃ اور انجیل کی تصدیق و تائید میں ظہور پذیر ہوا ہے، پس ایسے کھلے کھلے اور ناقابل انکار نشانات کے معلوم ہونے پر بھی اہل کتاب کا سر تسلیم خم نہ کرنا اور برابر منحرف رہنا، کس قدر بد نصیبی اور ہٹ دھرمی ہے۔ ان لوگوں کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی کہ اسلام ہی حق مذہب ہے اور یہ ایسی صاف باتیں ہیں کہ معمولی عقل والا آدمی بھی ان کو سمجھ سکتا ہے، مگر یہ بد بخت پھر بھی تکذیب کئے جا رہے ہیں اور نہیں دیکھتے کہ خود توراۃ کی پیشینگوئی کو غلط ٹھہرا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی یہودہ حرکات کو دیکھ رہا ہے،

وہ ضرور ان کو سزا دے گا اور یہ اپنے کئے کا بدلہ پائیں گے۔

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ مَنَ تَبْغُؤْنَهَا عِوَجًا أَأَنْتُمْ شُهَدَاءُ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝

کہہ دو، اے اہل کتاب! تم ان لوگوں کو اللہ کی راہ سے کیوں روکتے ہو جو ایمان لاپچکے، باوجود خبر دار ہونے کے تم اس میں عیب ڈھونڈتے ہو اور ان کاموں سے اللہ بے خبر نہیں جو تم کر رہے ہو۔

اہل کتاب کی برابر یہی کوشش ہے کہ جس طرح ممکن ہو لوگوں کو اسلام لانے سے روکیں، اپنی حماقت اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے اس میں کج بحثی شروع کر دیں اور مسلمانوں کے دلوں میں خطرات و وساوس پیدا کر دیں اور یہ جو کچھ کرتے ہیں جان بوجھ کر کرتے ہیں۔

## فصل ثانی

### انقطاع تعلقات

مسلمانوں کو خلافت ارضی کا وعدہ دیا گیا، مگر اس کے لئے اولین شرط یہ قرار پائی کہ وہ کفار و معاندین اسلام سے دوستانہ تعلقات توڑ دیں، کیونکہ یہی رشتہ اتحاد ان کی تباہی و بربادی کا سبب بن سکتا ہے۔ ممکن تھا کہ بعض حیلہ جو طبیعتیں اہل کتاب کی ظاہری رواداری، احسان و مروت اور زبانی پاسداری سے متاثر ہو کر ان کی دوستی کو ترجیح دیتیں، انہیں یہ خیال ہوتا کہ جب یہودی اور عیسائی اپنے اپنے مذہب کے پابند ہیں تو ہمیں کاہے کو دھوکا دیں گے۔

اس شک و اشتباہ کو دور کرنے کے لئے گزشتہ آیات میں ان اہل کتاب کی خرابیاں نہایت تفصیل سے بیان کی گئیں کہ ان کا مکرو فریب واضح ہو جائے اور کوئی مسلمان ان کے خدع و فریب میں نہ پھنسے۔ جب ان کی اصلی تصویر سامنے آگئی تو اب فرزند ان اسلام کو ہمیشہ کے لئے یہ حکم سنا دیا جاتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَطِيعُوا فِرْيَقًا مِّنَ الَّذِينَ أَوْثُوا الْكِتَابَ يَرُدُّوكُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كُفْرًا ۝

“اے ایمان والو! اگر ان میں سے کسی گروہ کا تم کہنا ہو کہ جن کو کتاب دی گئی ہے تو تمہارے ایمان لانے کے بعد وہ تم کو پھر کافر بنا دیں گے۔“

اس آیت میں دو چیزوں کو بیان کیا گیا ہے اور دونوں ایک دوسرے کی شرط و جزا واقع ہو رہی ہیں:

(الف) شرط: اگر تم نے اہل کتاب کے کسی فریق کی اطاعت کی، اہل کتاب میں یہودی اور عیسائی دونوں برابر ہیں، اس لئے دونوں میں سے کوئی مراد ہو سکتا ہے۔ اطاعت کا لفظ بھی عام ہے اس میں کسی شق کی تخصیص نہیں کی گئی، بلکہ اس میں مذہبی، اخلاقی، تعلیمی تمدنی معاشرتی اور سیاسی ہر قسم کی اطاعت و فرمانبرداری داخل ہے اور کوئی وجہ

نہیں کہ بغیر کسی دلیل کے ایک معنی کو خاص کر لیا جائے۔

بہر حال شرط یہ ہے کہ اگر مسلمانوں نے یہودیوں یا عیسائیوں کی اطاعت کی تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟

(ب) جزا: سزا یہ ملے گی کہ وہ درپردہ ایسی کوششیں جاری رکھیں گے، ایسے مکر و فریب سے کام لیں گے اور اس قسم کی حیلہ سازیاں کریں گے کہ مسلمانوں کو بے ایمان بنادیں، پھر وہی مدعیان اسلام اپنے ہاتھوں سے مسلمانوں کو قتل کریں گے اور اس قتل و خونریزی پر علی الاعلان فخر کریں گے، اپنی حکومتوں اور سلطنتوں کو ان کے حوالے کرتے جائیں گے۔ چنانچہ اس زمانہ میں بعض سجادہ نشینوں نے سقوط بغداد پر حکومت برطانیہ کو مبارکباد پیش کی اور اس کے جلوس مسرت میں شریک ہوئے۔ اسلام پر حملہ ہوتے دیکھیں گے اور ان کے کان پر جوں تک نہ ریگے گی، اسلام و ایمان، جوش ملی و مذہبی اور ولولہ سرفروشی و فداکاری مٹ جائے گا اور اپنی مجلسوں میں قرآن و اسلام پر اعتراض کر کے اس کی عظمت و احترام کو مٹانے کی ناکام کوشش کریں گے۔

اس شرط و جزا نے واضح کر دیا کہ ان دونوں فریقوں کی اطاعت کرنا کفر کے مرادف اور ہم معنی ہے۔ پس مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس سے پرہیز کریں اور ان کی مخالفت کو اپنا شعار ملی قرار دیں، اگرچہ بعض کم فہم مسلمان اس حکمت کو سمجھنے سے اب تک قاصر رہے۔

وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنْتُمْ تُبْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُ اللَّهِ وَفِيكُمْ رَسُولُهُ وَمَنْ يَعْتَصِمْ بِاللَّهِ فَقَدْ هُدِيَ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ٥

“اور تم کس طرح کفر کرنے لگو گے حالانکہ اللہ کی آیات تم پر پڑھی جاتی ہیں اور تم میں اس کا رسول موجود ہے اور جو شخص اللہ کو مضبوط پکڑ لیتا ہے وہ راہ راست کی ہدایت کیا جاتا ہے۔”

غیروں کی اطاعت دو ضرورتوں کی وجہ سے ہو سکتی ہے، اپنے پاس کوئی مکمل قانون اور دستور العمل موجود نہ ہو یا قانون تو ہو مگر اس کے عملی نمونے سامنے نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی دونوں ضرورتوں کو پورا کر دیا ہے۔ ان میں قرآن موجود ہے جو درس حکمت ہونے کے ساتھ بہترین ضابطہ عمل بھی ہے، اس لئے انہیں یہود و نصاریٰ کی اطاعت ایک لمحہ کے لئے بھی جائز نہیں، تمام مسلمان اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ کامیاب و بامراد وہی شخص یا جماعت ہو سکتی ہے جو اس کتاب کو اپنا امام بنائے اور اس کی شرح و تفصیل کے لئے رسول اللہ ﷺ کے اسوہ حسنہ کی پیروی کرے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ٦

“اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جو اس سے ڈرنے کا حق ہے اور نہ مرنا مگر مسلمان۔”

کامیابی اور حکومت کی بقا کے لئے سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں تقوی اللہ پیدا ہو۔ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ حق تقاتہ کی ناخ آیت فاتقوا اللہ ما استطعتم ہے، مگر حضرت شاہ ولی اللہ نے اس کی نہایت

عمدہ تطبیق بیان کر دی ہے اور وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا تعلق عقائد سے ہے اور ما استطعتم اعمال سے تعلق رکھتی ہے۔ اس تو جیہ کے بعد نسخ و منسوخ ماننے کی ضرورت نہیں رہتی۔

ہم سورہ بقرہ کی تفسیر میں اس حقیقت کو اچھی طرح واضح کر چکے ہیں کہ شریعت اسلام کا نصب العین یہ ہے کہ انفرادی طور پر ہر ایک مسلمان مقاصد اسلام و محاسن شریعت کا پیکر مجسم ہو، اخلاق فاضلہ و اعمال صالحہ کی مثال ہو اور تمام دنیا کے ارباب عقل و خرد اس کی سیرت اور کیریٹر کی تحسین پر مجبور ہوں اور جب تمام قوم میں ایسے افراد کی کثرت ہوگی تو ساری جماعت حقیقتاً خیر امت اخراجت للناس کی مخاطب صحیح بن سکے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اس آیت کریمہ میں ہر ایک مسلمان کو اپنے اندر تقوی اللہ اور خشیت الہی پیدا کرنے کا حکم دیا، یعنی خدا کا جو حکم ہے اس کے پورا کرنے میں کاہلی اور سستی نہ ہو، اس کے مقدس نام پر جان قربان کرنے کو تیار ہوں اور ہر حال میں فرماں بردار رہیں، نہیں معلوم موت کس وقت آجائے۔

فرقہ بندی ممنوع ہے

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُم مِّنْهَا كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۳۱﴾

”اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ نہ کرو اور اپنے اوپر اللہ کی نعمت یاد کرو جبکہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے پھر اس نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کی تو اس کے فضل سے تم بھائی بھائی ہو گئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے، تو اس نے تم کو اس سے بچالیا، اسی طرح اللہ تمہارے لئے اپنی آیتیں کھول کر بیان کرتا ہے، تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔“

فتح و کامرانی کے لئے ایک ضروری عنصر یہ ہے کہ ساری قوم اس حبل اللہ الجلیل، نور و ہدی، شفاء لہما فی الصدور، کتب مبیین اور بصائر للناس یعنی قرآن حکیم کو مضبوطی سے پکڑ لے۔ حبل اللہ کی شرح رسول اللہ ﷺ سے بھی قرآن حکیم ہی مروی ہے: کتاب اللہ ہو حبل اللہ الممدود من السماء الی الارض۔ اللہ کی کتاب ہی اللہ کی رسی ہے جو آسمان سے زمین تک لٹکی ہوئی ہے۔ مسند امام احمد میں ہے: انی تارک فیکم الثقلین، کتب اللہ تعالیٰ حبل ممدود من السماء الی الارض وعتدی اهل بیتی۔ میں تم میں کتاب اللہ اور اہل بیت دو چیزیں چھوڑ جاتا ہوں۔ عبد اللہ بن مسعود فرماتے ہیں: هذا القرآن حبل اللہ۔ حضرت علی کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ نے آنے والے فتنوں کا ذکر کیا تو صحابہ نے پوچھا ان سے بچنے کی کیا صورت ہے؟ آپ نے فرمایا: کتاب اللہ فیہ نباء من قبلکم وخیبر من بعدکم، وحکم ما بینکم وحوبل اللہ المتین۔ قرآن سے تمسک و اعتصام کرو اس لئے کہ عبرت و بصیرت کے لئے اس میں گزشتہ امتوں کے واقعات، آنے والے حوادث، قوانین و ضوابط بیان کئے گئے ہیں اور یہی حبل اللہ المتین ہے۔ مسلم



میں ابو ہریرہ کی روایت نے اس پر اور زیادہ روشنی ڈالی ہے: ان اللہ یرضی لکم ثلاثا ویسخط لکم ثلاثا یرضی لکم ان تعبدوا ولا تشمکوا بہ شئاً وان تعصبوا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا، وان تناصحوامن ولاہ اللہ امرکم، ویسخط لکم ثلاثا، قیل وقال، وکثرة السوال، واضاعة المال، اللہ کو تمہاری یہ تین چیزیں پسند خاطر ہیں: شرک سے اجتناب اور ایک خدا کی عبادت، اعتصام بحبل اللہ اور اختلاف سے پرہیز اور یہ کہ حکام کی خیر خواہی اور فضول کو اس، کثرت سوال اور مال کا ضائع کرنا اسے پسند نہیں آتا۔

دنیا میں انفرادی کامیابی اور ذمہ داری کا احساس کوئی چیز نہیں جب تک اس میں اجتماع وانضمام نہ پیدا ہو۔ اگر ہم تمام قوم کو جسم سے تعبیر کریں تو اس کے تمام افراد مختلف اعضاء و جوارح ہوں گے۔ جسم کی ترقی اور نشوونما یہی ہے کہ اس کے تمام اعضاء تناسب کے ساتھ ترقی پذیر ہوں۔ اگر ایک شخص کی ایک آنکھ بہت بڑی اور قوی ہو اور باقی تمام جسم کمزور ہو تو وہ کبھی صحیح البدن نہیں کہلا سکتا۔ یہی حال قوم کا ہے اگر اس کے چند افراد مناصب عالیہ پر فائز ہوں، حالانکہ غلام ہوتے ہوئے یہ بھی محال ہے اور باقی لوگ اسی جہالت و لاعلمی، غربت و افلاس، غلامی و محکومی اور بے راہ روی و بطالت میں مبتلا ہوں تو یہ کامیابی نہ ہوگی۔

اللہ تعالیٰ کی برکتیں اور نعمتیں جماعت پر نازل ہوا کرتی ہیں۔ ید اللہ فوق یدہم سے اسی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ ید اللہ علی الجماعت کا بھی یہی مطلب ہے۔ من شنذ، شنذ فی النار، جماعت سے علیحدگی تباہی و بربادی کا پیش خیمہ اور ذلت و رسوائی کی ضامن ہے۔ جب کسی قوم میں خانہ جنگی شروع ہو جائے تو وہ خود بخود مٹ جاتی ہے، کیونکہ اس کے افراد آپس میں کٹ کر مر جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ظالم حکومتیں ہمیشہ قومیت متحدہ کو توڑنے کی فکر میں لگی رہتی ہیں۔

عرب جاہلیت کی مثال تمہارے سامنے ہے، جہاں بھائی بھائی کا دشمن تھا اور ذرا سی بات پر خون کی ندیاں بہا نا ان کا دلفریب مشغلہ۔ قرآن مجید نے ان کو چند عقائد حقہ پر جمع کر دیا، جس کے اثر سے پشتینی دشمن پیکر اخلاص و محبت بن گئے کہ دنیا اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے اور تاریخ کے اوراق اس قسم کی مثال سے خالی ہیں۔ اگر مسلمان اس کتاب عزیز کو اب بھی اپنا نام و پیشوا بنالیں تو اس میں اب بھی یہ قوت موجود ہے کہ بچھڑے ہوؤں کو پھر ایک کر دے۔

کاش ہمارے عربی مدارس کے اساتذہ اپنے اثر سے کام لے کر مختلف بلاد و امصار کے طلبہ میں یہ روح اتحاد پھونکنے کی کوشش کریں تو کیا عجب ہے کہ خدائے بزرگ و برتر ان کی مساعی جلیلہ کو مشکور فرمائے۔ انگریزی درس گاہوں میں یہ بات شاید بطریق احسن ہو سکتی اگر وہاں یہ دو مخالف عنصر جمع نہ ہوتے۔

(الف) یورپ ہر چیز کو تاجرانہ نظر سے دیکھتا ہے یہاں تک کہ تعلیم بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، اس لئے شاگرد کے نزدیک استاد کی حیثیت ایک تاجر سے زیادہ نہیں ہوتی۔

(ب) اسکولوں اور کالجوں کے پرنسپل اکثر غیر مسلم ہوتے ہیں جو اپنی تمام تر ذہانت مسلمانوں کی فرقہ بندی اور انتشار کی ترقی میں صرف کرتے ہیں۔



## دعوت و ارشاد

وَلَتَنُكِّنَنَّ مِنْكُمْ أُمَّةً يَذْعُونُ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٥٠﴾

”اور چاہئے کہ تم میں ایک گروہ ہو جو نیک کام کی طرف بلائیں اور اچھے کاموں کا حکم دیں اور برے کاموں سے روکیں اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔“

اہل باطل کی طرف سے افساد فی الارض کی کوششیں برابر جاری رہیں گی، پس اہل حق کا فرض ہے کہ وہ حقانیت کی تبلیغ میں پورے کوشاں رہیں اور اس کے لئے اعلیٰ ترین دل و دماغ مصروف عمل رہیں، تاکہ مخالفین حق کی دجالانہ کوششیں بار آور نہ ہو سکیں۔ اس جماعت کے فرائض کی ضمنی تقسیم یوں ہو سکتی ہے:

(۱) دعوت الی الخیر: اصلاح ارض کے لئے قرآن اللہ تعالیٰ کا مکمل ترین فرمان ہے، ہمارا فرض ہے کہ اس کی آواز کو خدا

کی زمین کے گوشہ گوشہ میں پہنچادیں، چپہ بھر زمین اس سے خالی نہ رہے اور ہر جگہ قرآن ہی کی حکومت ہو۔ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام سب کے سب اس طفرائے امتیاز سے سرفراز تھے، ان کی زندگیاں اس تعمیل ارشاد کی بہترین نمونہ تھیں۔ وہ اس حقیقت سے خوب واقف تھے کہ اطراف عالم میں اسلام کی اشاعت ہمارا فرض ہے۔ بلغوا عفی ولو آیت نے ان کے اس شوق کو اور بھی تیز کر دیا تھا۔ اسی کی خاطر وہ اپنے گھروں کو چھوڑ کر تمام روئے زمین پر پھیل گئے تھے، مگر آہ ثم آہ! آج ہم اس عظیم ترین فرض سے غافل، آرام اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور نہیں سوچتے کہ یہی سہل انگاری ہماری بربادی کا سامان فراہم کر رہی ہے۔

آج دنیا کی کوئی طرف اسلام سے خالی نہیں، مگر اس کو ہماری سعی و کوشش سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ یہ اس ایثار و فدویت کے آثار و علامت ہیں جو صحابہ کرام اور ان کے نقش قدم پر چلنے والوں نے اس راہ میں ظاہر کی۔ اس وقت تو ہر فرد مبلغ اسلام اور داعی قرآن تھا۔ ہماری یہ حالت ہے کہ خود علمائے کرام نے اس فرض جلیل کو ترک کر دیا ہے اور اپنے بدترین نمونے سے اسلام کی وسعت میں رکاوٹ پیدا کر دی ہے۔ پھر قوم کی حالت کس قدر خطرناک ہے جو خرچ تو کر رہی ہے مگر آمدنی کے ذرائع و وسائل نہیں رکھتی، جب اس کے افراد نہیں بڑھیں گے تو عروج و ارتقا کی کیا صورت ہوگی۔

(۲) امر بالمعروف: مسلمان شہداء علی الناس کے درجہ پر فائز کئے گئے ہیں، اس لئے اس زمین کی پشت پر نیک راہ قائم کرنا، لوگوں کو صراط مستقیم کی دعوت دینا اور ان کے اخلاق و اعمال کی اصلاح کرنا ایک مسلمان ہی کا فرض اہم و اعظم ہے۔ دنیا میں جب کبھی حق و حریت کی بنیاد پڑے تو اس کی خشت اول ایک مسلم ہی کے ہاتھ سے رکھی جانی چاہئے اور مسلمانوں کا اولین کام یہی ہے کہ وہ تمام افراد کو اتحاد و اشتراک عمل کی دعوت دیں کہ تمام نیکیوں کی بنیاد اسی پر ہے اور گزشتہ آیات میں اسی پر زور دیا گیا ہے۔

(۳) نہی عن المنکر: دنیا کے کسی گوشہ میں برائی ہو یہ مسلمان ہی کا فرض ہے کہ اس کو روکے۔ اس لئے کہ مسلمانوں کا

طفرائے امتیاز یہی ہے: کنتم خیر امة اخرجت للناس تاملون بالمعروف وتنہون عن المنکر۔ حدیث میں آتا ہے: من رای منکم منکرا، فلیغیرہ ببیدہ، فان لم یستطع فیلسانہ فان لم یستطع فیلقبہ ولیس وراء ذلک حبة خردل من الایمان۔ اس حدیث میں ایمان کے مدارج ثلاثہ بیان کئے گئے ہیں: مسلمانوں کو اجتماعی طور پر اتنی قوت و طاقت کا مالک ہونا چاہئے کہ جب کبھی اور جہاں کہیں انہیں کوئی برائی دکھائی دے تو فوراً اپنی قاہرانہ قوت اور حکومت کے زور سے اس کو نیست و نابود کر دیں کہ اسی سے افساد فی الارض کی ابتدا ہوتی ہے۔

اگر خدا انخواستہ ان کے پاس حکومت نہیں تو ہر فرزند اسلام کو صاعقہ حق بن کر گناہ اور خرابی کو جلا کر خاکستر کر دینا چاہئے اور اس کی زبان کبھی بھی اس کی برائی بیان کرنے سے نہ ٹھکے۔ عادل ترین پادشاہ کا عدل اور ظالم ترین حاکم کا ظلم و جور اس کی راہ میں حائل نہ ہو۔ جب ایک چیز بری ہے تو اسے علی الاعلان کہنا چاہئے کہ یہ بری ہے: الساکت عن الحق شیطان اخرس، اور بہترین جہاد وہی ہے کہ جبار و قاہر بادشاہ کے دربار میں حق کی پکار بلند کی جائے: افضل الجہاد کلمۃ حق عند سلطان جائز، اور اگر زبان بھی گنگ ہے تو دل سے نفرت تو ضرور کرو کہ یہی ایمان کی آخری منزل ہے۔ اگر یہ جذبہ بھی فنا ہو گیا تو پھر ایمان کیسا؟ تم نے تو اپنے سکوت اور رضامندی سے ہزار ہا انسانوں کو گنہگار بنادیا۔

قرآن حکیم نے یہودیوں کی کثرت سے خرابیاں ذکر کی ہیں، لیکن ان میں نمایاں درجہ اسی چیز کو دیا گیا ہے کہ وہ برائی کو دیکھتے تھے اور لوگوں کو اس سے نہ روکتے تھے: کَانُوا لَا یَتَنَبَّاهُوْنَ عَنْ مُنْکَرِ فَعْلُوْهُمْ (المائدہ ۷۹) پھر تمہیں معلوم ہے کہ جس گروہ نے برائی دیکھنے کے باوجود بھی خاموشی اختیار کی تھی اس کا کیا حشر ہوا تھا۔ سورۃ اعراف اس پر یوں روشنی ڈالتی ہے: وَ اِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعْبُدُوْنَ قَوْمًا ۚ اَللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِیْدًا ۚ قَالُوا مَعٰذِرَةٌ اِلٰی رَبِّکُمْ وَلَعَلَّہُمْ یَرْثِقُوْنَ ۝ فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُکِّرُوْا بِہٖ اَنْزَلْنٰ اِلَیْہِمْ السُّوْۤیَ وَاَخَذْنَا اِلَیْہِمْ ذِیْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۭ یَّسِیْرٍ ۝ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَا نُهُوا عَنْہٗ قُلْنَا لَہُمْ کُتُوْبًا فَرِیْدًا ۝ خُسِیْدٍ ۝ (الاعراف ۱۶۳ تا ۱۶۶) اور جب ان میں سے ایک جماعت نے کہا کہ تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جن کو خدا ہلاک کرنے والا یا سخت عذاب دینے والا ہے، تو انہوں نے کہا اس لئے کہ تمہارے پروردگار کے سامنے معذرت کر سکیں اور عجب نہیں کہ وہ پرہیز گاری اختیار کریں، جب انہوں نے ان باتوں کو فراموش کر دیا جن کی ان کو نصیحت کی گئی تھی، تو جو لوگ برائی سے منع کرتے تھے ان کو ہم نے نجات دی، جو ظلم کرتے تھے ان کو بڑے عذاب میں پکڑ لیا کہ نافرمانی کئے جاتے تھے۔ غرض جن اعمال بد سے ان کو منع کیا گیا تھا جب وہ ان پر اصرار اور ہمارے حکم سے گردن کشی کرنے لگے تو ہم نے ان کو حکم دیا کہ ذلیل بند رہو جاؤ۔

اصل بات یہ ہے کہ جب قوم سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی روح نکل جاتی ہے تو اس کے اکثر افراد گناہ پر دلیر ہو جاتے ہیں اور پھر بتدریج سب کے سب گنہگار بن جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں برائی کو روکنے کے لئے قوت و طاقت سے کام لینے کے لئے کہا گیا۔ یہ اعلیٰ ترین درجہ ایمان ہے جس سے آج مسلمانوں کا ہر طبقہ خالی ہے، بلکہ صرف تیسرا درجہ امت مسلمہ کے چند مخصوص افراد میں دکھائی دیتا ہے۔

کامیابی کے یہی تین اصول تھے جن کا نتیجہ اس آیت کے آخر میں بتا دیا گیا کہ جو لوگ ان اصول پر چلیں گے وہ اپنی دنیاوی شوکت کے مالک ہوں گے۔ آج مسلمانوں نے ان فرائض کو ترک کر دیا، اس لئے سب سے زیادہ ذلیل ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسی نتیجہ کی طرف ان الفاظ میں توجہ دلائی تھی: **وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَتَأْمُرَنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ** اولیو شکن اللہ ان یبعث علیکم عقابا من عندہ ثم ینزل علیکم فلیستحب لکم۔ تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں مصروف ہو جاؤ، ورنہ خدا کی قسم اللہ تعالیٰ اپنی جانب سے تم پر عذاب نازل کرے گا، پھر تم والہانہ دعائیں کرو گے اور ان کو شرف اجابت نہ بخشا جائے گا۔ ایک روایت میں آپ نے داعی اسلام کو خلیفۃ اللہ فی الارض کے نام سے یاد فرمایا ہے: **من امر بالمعروف ونہی عن المنکر کان خلیفۃ اللہ فی ارضہ و خلیفۃ رسولہ و خلیفۃ کتابہ**، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ **یا ایہا الناس اتوبوا بالمعروف واتہتوا عن المنکر، تعیشوا بخیر۔** لوگو! امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو تو آرام و اطمینان کی زندگی بسر کرو گے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے: **افضل الجہاد الامر بالمعروف والنہی عن المنکر۔**

### اختلاف سے بچو

**وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۱۰﴾**

”اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو ایک دوسرے سے جدا ہو گئے اور اختلاف کرنے لگے بعد اس کے کہ ان کے پاس صاف احکام آچکے اور انہی کے لئے بھاری عذاب ہے۔“

مسلمانوں کے یہ شایان شان نہیں کہ وہ اپنی مجتمع قوت کو پاش پاش کر دیں اور مختلف فرقوں میں تقسیم ہو کر ایک دوسرے کا گلا گائیں۔ مسلمانوں سے قبل صدہا اقوام و ملل دنیا میں ہو چکی ہیں جن کو دو نعمتیں نوازش کی گئی تھیں، اس زمانہ کے مطابق اعلیٰ ترین علم اور باہمی اتحاد و اشتراک عمل، مگر ایک وقت ان پر ایسا آیا کہ وہ اختلاف کا شکار ہو گئیں، ان میں فرقے فرقے بن گئے، ان کا شیرازہ قومی منتشر ہو گیا اور انجام کار اس جرم عظیم کی پاداش میں ان کو غلامی و محکومی کے عذاب میں مبتلا کیا گیا۔ اگر مسلمان بھی ان کے نقش قدم پر چلنے لگے تو یہ بھی اپنے کیے کی سزا پائیں گے۔

لسان نبوت نے اس کثرت سے مسلمانوں کو اختلاف سے ڈرایا تھا کہ اس کا استقصا مشکل ہے، مگر افسوس کہ فرزند ان اسلام کچھ ایسے پنبہ درگوش ہیں کہ ان الفاظ کی طرف توجہ تک نہیں کرتے۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا: **لا تختلفوا فتختلف قلوبکم، اختلاف مت کرو کہ آخر کار یہی مرض تمہارے دلوں میں جاگیر ہو جائے گا۔** دوسرے موقع پر آپ نے اس سے یوں ڈرایا: **انہا ہلکت بنو اسرائیل بکثرة سوالہم و اختلافہم علی انبیائہم۔** بنی اسرائیل صرف اس لئے ہلاک ہوئے کہ وہ کثرت سے سوالات کرتے اور اپنے انبیائے کرام کے متعلق اختلاف میں مبتلا ہوتے تھے۔ جس وقت آپ نے حضرت معاذ اور ابو موسیٰ اشعری کو یمن کی طرف بھیجا تو منجملہ اور باتوں کے ایک وصیت خاص طور سے یہ فرمائی: **تطاولوا ولا تختلفوا،** ایک دوسرے کی اطاعت کرنا اور آپس میں اختلاف نہ کرنا۔ ایک مرتبہ آپ نے فرزند ان اسلام کو تفریق کے عواقب

المیہ سے یوں ڈرایا: افتقرت الیہود علی احدى وسبعین فرقة وتفرقت النصارى علی ثنتين وسبعین فرقة، وتفترق امتی علی ثلاث وسبعین فرقة، یہودیوں کے ۷۱ فرقے بن گئے عیسائیوں کی تقسیم ۷۲ میں ہو گئی اور میری امت کے لوگ ۷۳ گر وہ بن جائیں گے۔ ابن ماجہ میں اس طرح آتا ہے: فواحدة فی الجنة وثنتان وسبعون فی النار قیل یا رسول اللہ! فمن هم قال الجباعة، ان میں سے ۷۲ تو جہنم کا بندھن بنیں گے اور صرف ایک جنت میں جائے گا۔ اس پر صحابہ نے عرض کیا کہ جنت میں جانے والے کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا وہ جو جماعت کے ساتھ ہیں۔ حاکم کی روایت میں ہے کہ صحابہ کرام نے آپ سے اس جماعت کے خصائص و امتیازات دریافت کئے تو آپ نے جواب دیا: ما انا علیہ واصحابی، صرف وہ لوگ جو میری اسوہ حسنہ اور میرے صحابہ کے طرز عمل کو مضبوطی سے پکڑیں گے۔

رسول اللہ ﷺ کو سب سے زیادہ اسی اختلاف و تفریق کا خوف تھا، اس لئے سب سے زیادہ اسی سے مسلمانوں کو ڈرایا، ابو داؤد میں حضرت ابو ذر غفاری کی روایت ہے: من فارق الجباعة شبرا فقد خلع ريقه الاسلام من عنقه، جو شخص ایک بالشت بھر بھی جماعت کے اعمال و عقائد سے ہٹ گیا تو وہ دائرۃ اسلام سے خارج ہو گیا۔ بغوی کی روایت بتاتی ہے کہ دخول جنت کی اولین شرط یہی قیام اتحاد ہے: من ساء ان یسکن بحبوة الجنة فعليه بالجباعة فان الشيطان مع الغدو هو من الاثنين ابعده، جس مسلمان کی یہ آرزو ہے کہ وہ جنت میں قیام پذیر ہو تو اس کا فرض ہے کہ وہ جماعت کے ساتھ رہے، اس لئے کہ جس نے جماعت سے علیحدگی اختیار کی تو شیطان فوراً اس پر قابو پالے گا اور جب دو مسلمان آپس میں متحد ہو جاتے ہیں تو ان میں جماعتی زندگی آ جاتی ہے اور اسی لئے شیطان ان پر اپنا کوئی اثر نہیں ڈال سکتا۔

سبحان اللہ! رسول اللہ نے اپنی دور بین نگاہوں سے اس حقیقت کو اسی وقت اپنے سامنے دیکھ لیا تھا کہ وہ وقت بہت جلد آنے والا ہے جب خود عرب کے بعض لوگ ہی تمام مسلمانان عالم کے اختلاف و تفریق کا باعث بن جائیں گے، اپنی نفسانی خواہشات کی بنا پر دنیا بھر کے مسلمانوں کو نقصان پہنچائیں گے اور ان کی راہ ترقی میں زبردست رکاوٹ بن جائیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ نے پیش بندی کے طور پر پہلے ہی صاف صاف فرمادیا تھا: ابو عامر عبد اللہ بن یحییٰ کہتے ہیں کہ ہم سب حضرت معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک مرتبہ حج کی خاطر مکہ کو روانہ ہوئے، جب وہاں حج سے فارغ ہو گئے تو نماز ظہر کے بعد حضرت معاویہ نے حسب ذیل خطبہ دیا:

ان رسول اللہ ﷺ قال ان اهل الكتابین افترقوا فی دینہم علی ثنتين وسبعین ملة وان هذه الامة ستفترق علی ثلاث وسبعین ملة یعنی الالهواء، کلہا فی النار الا واحدة وہی الجباعة، وانه سیخرجنی امتی اقوام تتجاری بہم الالهواء کما یتجاری الکلب بصاحبه لا یتقی منه عرق ولا مفصل الا دخلہ واللہ یا معشای العرب لئن لم تقوموا بہا جاء بہ نبیکم ﷺ یرفی کم من الناس احرى ان لا یقوم بہ،

”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اہل کتاب ۷۲ فرقوں میں تقسیم ہو گئے اور یہ ملت اسلام اپنی خواہشات نفسانی کی بنا پر ۷۳ جماعتوں میں منقسم ہو جائے گی۔ جماعت کے ساتھ رہنے والوں کے سوا باقی سب دوزخ کی نذر ہوں گے۔ میری امت میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو یکسر بندہ حرص و آرزو ہوں گے، ان کے بدن کار و ٹکٹا و ٹکٹا اس میں آلودہ ہو گا۔ اے اہل عرب! اگر تم شریعت اسلام کو قائم نہیں رکھ سکتے، تو پروا نہیں اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کے لئے دوسری جماعتوں کو منتخب کر لے گا جو اس فرض کو فخر و مباہات کے ساتھ ادا کریں گے۔“

آج عرب کی سر زمین اسی کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے اور دنیا اسلام کو اسی نے تکلیف و مصیبت میں ڈال رکھا ہے۔ ہم نے اس موضوع پر نہایت ہی شرح و بسط کے ساتھ اپنی کتاب بصائر میں بحث کی ہے، ومن شاء التفصیل فلیدرجہ شہ۔

### اتحاد و اختلاف کے نتائج

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكْفَرْتُمْ بَعْدَ آيَاتِنَا كُفُّوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿٥٥﴾ وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٥٦﴾

”جس دن بعض منہ سفید ہوں گے اور بعض منہ سیاہ ہوں گے، کیا تم اپنے ایمان کے بعد کافر ہو گئے تھے اچھا تم جو کفر کرتے تھے، تو عذاب چکھو اور جن کے منہ سفید ہوئے وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔“

اگر ایک جماعت میں مختلف اغراض و مقاصد کے لوگ مصروف عمل ہیں، ایک گروہ تو اتحاد کی دعوت دیتا ہے اور دوسرے اختلاف کی طرف بلاتا ہے تو لازمی امر ہے کہ دونوں کے نتائج و ثمرات جدا گانہ ہوں۔ اسی دنیا میں ان مختلف جماعتوں کو معلوم ہو جائے گا کہ کامیابی کا ذریعہ وحید اتفاق اور صرف اتفاق ہے اور مرنے کے بعد ان ارباب اتحاد کے چہرے نہایت ہی روشن اور خوبصورت ہوں گے، مسرت و شادمانی، فرح و ابساط اور کامیابی و کامرانی پر خوشی کا اظہار کریں گے اور ان کی فضیلت و برتری ہر جگہ نمایاں ہوگی۔

لیکن جن بد بختوں نے اختلاف و انشقاق کی کوشش کی، اپنی قوم کو الگ الگ کرنے اور فرقے فرقے بنانے میں مصروف رہے ان کے چہرے سیاہ ہوں گے۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ غیروں نے ان کے افتراق سے فائدہ اٹھا کر ان کو اپنا محکوم بنالیا۔ پھر مرنے کے بعد حزن و ملال، رنج و غم اور یاس و حرمان میں مبتلا ہوں گے۔ ان سے کہا جائے گا کہ تمہیں بہترین علم نوازش کیا گیا، مگر تم نے بد بختانہ کوئی قدر نہ کی، اب اس کفر و عصیان کے مزے لو۔

قرآن حکیم نے اگر جماعتی زندگی پر زور دیا ہے تو فرقہ بندیوں کے عواقب المیہ سے بھی ڈرا دیا ہے۔ سورہ انفال میں آتا ہے: وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا (انفال ۴۶) اور آپس میں جھگڑنا نہ کرنا کہ ایسا کرو گے تو تم بزدل ہو جاؤ گے اور تمہارا اقبال جاتا رہے گا۔ آگے چل کر تالیف قلوب اور وحدۃ امتہ کو ایک عظیم الشان نعمت بتایا: وَالْفَّ يَبْنَ قُلُوبِهِمْ لَوْ

أَنْفَقَتْ مَنَافِيَ الْأَرْضِ جَمِيعًا مَّا أَكْثَرَتْ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ أَلْفَ بَيْنَهُمْ (انفال ۶۳) اور اُن کے دلوں میں الفت پیدا کر دی اور اگر تم دنیا بھر کی دولت خرچ کرتے تب بھی ان کے دلوں میں الفت پیدا نہ کر سکتے، مگر خدا ہی نے ان میں الفت ڈال دی۔ سورہ حشر میں بنو نضیر، یہود مدینہ کی ذلت و رسوائی اور جین و نامردی کے اسباب بیان کرتے ہوئے فرمایا: بِأَسْهُمَ بَيْنَهُمْ شَدِيدًا تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتَّى (الحشر ۱۴) ان کا آپس میں بڑا عصب ہے، تم شاید خیال کرتے ہو کہ یہ اکٹھے اور ایک جان ہیں، مگر ان کے دل پھٹے ہوئے ہیں۔ افسوس کہ آج مسلمان اسی مرض اختلاف میں مبتلا ہیں اور ذرا ذرا سی بات پر ایک دوسرے کو کافر بناتے ہیں۔

ففی رحمہ اللہ فرما کر ایک نہایت ہی دقیق اور بلند پایہ نکتہ کی طرف توجہ دلائی، جس تک پہنچنے کے لئے اس علم کی ضرورت ہے جو براہ راست مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہو اور وہ یہ ہے کہ خدا کی رحمتیں مختلف قسم کی ہیں۔ بعض وہ ہیں جو مومن اور کافر، سب پر یکساں طور سے نازل ہوتی ہیں اور کچھ ایسی ہیں جو ارباب ایمان پر بھی اوقات خاصہ ہی میں نازل ہوتی ہیں۔ حدیث میں آتا ہے: ان الله نفحات، الافتعروضوا لها۔ اس تمہید کے بعد اس حدیث کو سامنے لاؤ جس میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: لن يدخل احدكم الجنة عمله، محض اعمال کسی شخص کے دخول جنت کے ضامن نہیں ہو سکتے۔ اس پر صحابہ نے عرض کیا کہ کیا آپ کی ذات مبارک بھی اسی قاعدہ کلیہ میں داخل ہے۔ آپ نے فرمایا: حق انا الا ان يتغمدني الله تعالى برحمته۔ ہاں میرا بھی یہی حال ہے، البتہ صرف ایک صورت استثنائی کی ہے کہ خود خدائے رحیم وودود اپنی رحمت سے مجھے ڈھانپ لے۔

اس سے واضح ہو گیا کہ اعمال صالحہ پر بھی انسان کو نازاں نہ ہونا چاہئے، کیونکہ ممکن ہے یہ ناز ہی کسی وقت خدا سے بعید کر دے۔ فلسفیانہ اصطلاح میں اس کی تعبیر یوں کر سکتے ہیں کہ اعمال صالحہ اللہ کی اس رحمت خاصہ کو جوش میں لائیں گے جو ارباب ایمان و اخلاص کو جنت میں داخل کرنے کا سبب بن جائے گی، پس اعمال فقط دخول جنت کا سبب قریب نہیں ہیں البتہ سبب بعید کہے جاسکتے ہیں۔

تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ تَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظَلَمْنَا لِلْعَالَمِينَ ﴿٣٨﴾ وَلِلَّهِ مَنَافِيَ السَّمٰوٰتِ وَمَنَافِيَ الْأَرْضِ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ﴿٣٩﴾

”یہ اللہ کی آیتیں ہیں جن کو ہم تجھ پر حق کے ساتھ پڑھتے ہیں اور اللہ جہانوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہی کی جانب تمام کام لوٹائے جاتے ہیں۔“

ان اصول و کلیات کے ذکر کرنے کی ضرورت تھی کیونکہ جس طرح پہلی قوموں کو علم صحیح دیا گیا اور اس کی وجہ سے ان میں اتفاق پیدا ہو گیا مگر ایک مدت کے بعد انہوں نے اس علم صحیح کی پروانہ کی اور اس اتحاد کو اختلاف سے بدل دیا، ایسے ہی ہم نے قرآن نازل کیا جس نے مسلمانوں کو ایک کر دیا لیکن وہ وقت بھی آسکتا ہے جب اس طریق مستقیم کے متعلق جس کو مہاجرین و انصار نے قائم کیا تھا مسلمانوں میں دو جماعتیں ہو جائیں۔

(الف) ایک گروہ مہاجرین و انصار کے نقش قدم پر چلنے کو اپنا فخر خیال کرے اور ہمیشہ مسلمانوں کو متحرک رکھنے کی سعی و کوشش میں رہے۔ اس جماعت کا امام و دستور العمل قرآن حکیم ہو گا اور اسی پر ماننا علیہ و اصحابی کے الفاظ صادق آئیں گے۔

(ب) دوسری جماعت اس اتفاق کی پروانہ کرے اور اس طرح کفار کے خدع و فریب کی شکار ہو جائے اور یہ جو کچھ ہو گا ان کی اپنی کر توت کا نتیجہ ہو گا۔ معاذ اللہ خدا کی طرف کسی ظلم کی نسبت نہیں ہو سکتی۔

## خیر الامم

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ مِنْهُمْ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿۸۱﴾

تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے ظاہر کی گئی، تم نیک کام کا حکم دیتے ہو اور برے کام سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اگر اہل کتاب ایمان لے آتے تو یقیناً ان کے لئے اچھا ہوتا، ان میں بعض تو ایمان دار ہیں لیکن اکثر فاسق ہیں۔

دنیا میں آج تک صد ہا انبیاء و رسل مبعوث ہوئے، ان کی امتوں نے اشاعت مذہب کا فرض بھی ادا کیا، مگر ان سب کا دائرہ عمل محدود تھا، ان سب میں اعلیٰ ترین درجہ رسول اللہ ﷺ کو نوازش کیا گیا کہ آپ کا روئے سخن تمام اقوام عالم کی طرف ہے، پھر آپ کو سب سے پہلے وہ قوم دی گئی جو دنیا میں ذلیل ترین خیال کی جاتی تھی، مگر آپ کے نفس قدسی نے اسی بدترین سر زمین میں سے مہاجرین و انصار کا بہترین گروہ تیار کر دیا جو سب قوموں پر سبقت لے گیا اور اقوام عالم، میزان اخلاق و ایمان میں ان کے پائنگ بھی نہ ہو سکے۔ اب جو لوگ بھی ان صحابہ کرام کے نقش قدم پر چل کر وہی فرائض ادا کریں گے وہ بھی خیر امت کے معزز ترین لقب سے سرفراز کئے جائیں گے: وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِلِحْسانِ جَنَّهُونَ لَیْسَ لَهُمْ صُلْحٌ مَعَ النَّاسِ وَیَسْلُبُ اللَّهُ مِنْهُمُ آلَهُمْ وَیُؤْتِیْهِمْ مِمَّا یَشَاءُونَ وَیُؤْتِیْهِمْ مِمَّا یَشَاءُونَ وَیُؤْتِیْهِمْ مِمَّا یَشَاءُونَ

کے ساتھ اتباع کیا، گویا خیر امت میں تمام دنیا کے مسلمان شامل ہو سکتے ہیں بشرطیکہ وہ ان فرائض کو ادا کریں جنہیں صحابہ کرام انجام دیتے تھے۔

اس خیر کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا وجود صرف اس لئے ہے کہ وہ نوع انسانی کی رشد و فلاح، خیر و برکت اور ہدایت و سعادت کے لئے سعی و کوشش کریں۔ ان کی تخلیق کا اس کے سوا اور کوئی مقصد نہیں کہ وہ ہر نیکی کے قائم کرنے والے اور برائی کے کرہ ارضی سے دور کرنے والے ہیں۔ ایک فرزند اسلام ہی وہ ذمہ دار ہستی ہے جو شہداء علی الناس کے درجہ پر فائز کی گئی ہے اور اسی کا یہ کام ہے کہ دنیا میں نیکی کی پادشاہت قائم کرے اور بدی کو جڑ سے اکھاڑ دے: الَّذِیْنَ اِنْ مَنَّ عَلَیْهِمُ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوْا الزَّكٰوةَ وَآمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (الحج ۴۱) یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور برے کاموں سے منع کریں۔ مسند امام احمد میں ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ منبر پر خطبہ دے رہے تھے کہ ایک شخص نے کھڑے ہو کر عرض کیا: ای الناس



خیر بہترین انسان کون ہے؟ آپ نے فرمایا: خیر الناس اقراہم واتتاہم اللہ وامرہم بالمعروف وانہاہم عن المنکر واصلہم للرحم، وہ جو سب سے زیادہ قرآن جاننے وال، اخدا سے ڈر رکھنے والا، امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرنے والا اور سب سے زیادہ صلہ رحمی کرنے والا ہے۔ ترمذی میں ہے: اتم توفون سبعین امۃ اتم خیرہا واکرمہا ستر امتوں میں سے تم ہی بہترین والیٰ ترین ہو۔ مسند امام احمد میں ہے رسول اللہ نے فرمایا: اعطیت مالہم یعط احد من الانبیاء، مجھے وہ چیزیں دی گئی ہیں جو مجھ سے قبل کسی نبی کو نہیں دی گئیں۔ صحابہ نے سوال کیا وہ کونسی ہیں؟ تو آپ نے مجملہ اور خصوصیات کے ایک یہ فرمایا: وجعلت امتی خیر الامم، میری امت کو بہترین کیا گیا۔

اب اگر مسلمانوں کو خیر الامم کہا گیا ہے تو اس کا منشا اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ پیکر تبلیغ حق و مجسمہ دعوت اسلام ہوں گے۔

اللہ نگہبان ہے

لَنْ يَضُرُّكُمْ الْاٰذَىٰ ۚ وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوْلُوْكُمْ الْاٰذِبَارَ ۚ ثُمَّ لَا يَنْصُرُوْنَ ۝۱۰ ضَرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا تُثْقَلُوْا ۚ لَا يَحْبِلُ مِنَ اللّٰهِ وَحَبْلٌ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضَرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۚ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِالْاٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۚ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَاُكُنُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝۱۱

”بجز تھوڑی سی تکلیف دینے کے وہ تمہارا کچھ بھی بگاڑ نہ سکیں گے اور اگر وہ تم سے لڑیں گے تو تمہارے سامنے سے پیٹھ پھیریں گے پھر ان کی مدد نہ کی جائے گی۔ جہاں کہیں بھی پائے جائیں ان پر ذلت کی مار ہے، سوائے اس کے کہ اللہ کی دستاویز اور لوگوں کی دستاویز کے ذریعہ سے پناہ لیں اور وہ اللہ کے غضب میں گرفتار ہو گئے اور ان پر مسکینی کی مار ہے۔ یہ اس لئے کہ وہ اللہ کی آیاتوں کا انکار کرتے تھے اور انبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے، یہ اس لئے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے بڑھ جاتے تھے۔“

اگرچہ اس آیت میں اہل کتاب کا لفظ استعمال کیا گیا ہے مگر جمہور مفسرین اسی طرف گئے ہیں کہ یہاں صرف بنی اسرائیل مراد ہیں۔ اس لئے کہ آئندہ جن عذابوں اور نقائص و زمام کا ذکر آتا ہے وہ سب کے سب صرف یہودیوں ہی پر صادق آتے ہیں۔ یہ لوگ اسلام قبول نہیں کرتے، اس لئے مسلمانوں کے دلوں میں ان کی طرف سے خوف کا پیدا ہونا ایک قدرتی امر ہے کہ ایسا نہ ہو یہ دجل و فریب سے کام لے کر مسلمانوں کو نقصان پہنچادیں۔ اللہ تعالیٰ پیشین گوئی کے طور پر ارشاد فرماتا ہے کہ یہودیوں سے اہل اسلام کو ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں، ان کی خباثت زیادہ تر مسلمانوں کو گالی ہی دینے تک محدود رہے گی: وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِينَ أَكْفَرُوا اَذَىٰ كَثِيْرًا (آل عمران ۱۸۶) اور تم اہل کتاب سے اور ان لوگوں سے جو مشرک ہیں بہت سی ایذا کی باتیں سنو گے۔ اور اگر ان سے دست بدست لڑائی کا موقع ہو تو آخر کار مسلمان ہی کامیاب ہوں گے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ جب کبھی یہودیوں نے مسلمانوں سے جنگ کی ہے کبھی



کامیاب نہیں ہوئے۔

یہ بد بخت یہودی اب آئندہ سے بحیثیت قوم کے کبھی معزز نہ رہ سکیں گے بلکہ ذلت ان کے ساتھ ساتھ ہوگی۔ نہ ان کو امن چین نصیب ہوگا اور نہ انہیں حکومت مل سکے گی، ہمیشہ جس وقید اور قتل و غارت کا شکار رہیں گے۔ صرف دو صورتوں میں ان کو دنیا میں امن میسر آسکتا ہے:

(الف) حبل من اللہ۔ اللہ کے معاہدہ کو تسلیم کر لیں، مسلمانوں کی حکومتوں میں رہیں یا اسلام قبول کر لیں۔  
(ب) حبل من الناس۔ غیر اسلامی حکومتوں سے عہد و پیمان کر کے ان کے ماتحت رہیں۔ لیکن وہ اس حقیقت کو پیش نظر رکھ لیں کہ خواہ وہ اسلامی حکومتوں کے ماتحت رہیں یا کسی اور غیر مسلم طاقت کو تسلیم کر لیں، دونوں صورتوں میں ذلت و مسکنت ان کے ساتھ ساتھ ہوگی اور کبھی انہیں حکومت نہ ملے گی۔ یہودیوں کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لو باوجود ارباب دولت و ثروت ہونے کے نہ ان کے پاس حکومت ہے اور نہ دنیا میں ان کی عزت، اگر اس کے بعض افراد اچھے بھی ہوں تو اس سے قومی ارتقاء پر کوئی اثر نہیں پڑتا، قومی حیثیت سے وہ ذلیل ہی سمجھے جاتے ہیں۔

مزید تفصیل

لَيْسُوا سَوَاءً مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتَّبِعُونَ آيَةَ اللَّهِ إِنَّآ الْبَيْتَ وَهُمْ يَسْجُدُونَ ﴿٢٠﴾ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ  
الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَأُولَٰئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ ﴿٢١﴾ وَمَا يَفْعَلُوا  
مِنْ خَيْرٍ فَلَن يُكْفَرُوا بِهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ ﴿٢٢﴾

”وہ سب برابر نہیں اہل کتاب میں سے ایک گروہ حق پر قائم ہے وہ اللہ کی آیتیں اوقات شب میں پڑھتے ہیں اور وہ سجدے کرتے ہیں وہ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور اچھے کاموں کا حکم دیتے ہیں اور برے کاموں سے روکتے ہیں اور نیکیوں میں جلدی کرتے ہیں اور وہی نیکیوں میں سے ہیں اور وہ کسی طرح کی نیکی کریں ہر گز اس کی ناقدی نہ ہوگی اور اللہ پر ہیز گاروں کو خوب جانتا ہے۔“

گزشتہ آیات میں یہودیوں کے مغضوب ہونے کا ذکر تھا، اس کا یہ مطلب ہر گز نہ تھا کہ اب اس قوم سے ہر قسم کی خیر و برکت اٹھ گئی ہے، بلکہ یہ فیصلہ قومی حیثیت سے تھا، اس کے بعض افراد نزول قرآن کے وقت بھی نہایت ہی پاکیزگی اور طہارت کی زندگی بسر کرتے تھے جن کے اوصاف و کمالات یہ تھے:

(۱) راہ حق و صدق اور اطاعت خداوندی پر قائم و استوار تھے۔

(۲) راتوں کو اٹھ اٹھ کر تلاوت آیات کرتے: تَتَجَلَّىٰ جَنُّهُمْ عَنِ الصُّجَّاجِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا (السجہ ۱۶) ان

کے پہلو پچھونوں سے الگ رہتے ہیں اور وہ اپنے پروردگار کو خوف اور امید سے پکارتے ہیں۔

(۳) اپنی پیشانیوں کو اللہ کے حضور میں خاک آلود کرتے اور اسکے آستانہ گبریا کی جبہ سائی کو اپنی سعادت سمجھتے۔

(۴) وہ خدائے واحد کی ربوبیت اور احتساب اعمال کا دل سے یقین کرتے۔

(۵) دوسروں کی خیر خواہی اور نوع انسانی کی رشد و ہدایت میں اپنی تمام زندگی صرف کرتے۔

(۶) پھر ان کی کیفیت ایمانی اور طہارت قلبی کی یہ حالت تھی کہ ہر نیکی میں دوسروں سے آگے بڑھنے کی فکر میں

رہتے اور ہر وقت واجعلنا للمتقين اماما کے الفاظ ان کی زبان پر ہوتے۔

ایسے افراد کی سعی و کوشش کبھی رائیگاں نہیں جاسکتی۔ چنانچہ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آئے اور ان کا اسلام کے دائرے میں داخل ہونا ان کے سابقہ اعمال صالحہ کا نتیجہ تھا: اسلمت علی ما اسلفت من الخیر کا یہی مطلب ہے۔ ان ارباب حق و صدق کا ایک اور جگہ اس طرح ذکر کیا گیا ہے: وَإِنَّ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَمَنْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ لَحِيعِينَ ۚ لَا يُشْتَوُونَ بِاللَّهِ فَبِأَيِّ آلَاءِ اللَّهِ هُمْ قَلِيلًا ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ (آل عمران ۱۹۹) اور بعض اہل کتاب ایسے بھی ہیں جو خدا پر اور اس کتاب پر جو تم پر نازل ہوئی اور اس پر جو ان پر نازل ہوئی ایمان رکھتے ہیں اور خدا کے آگے عاجزی کرتے ہیں اور خدا کی آیتوں کے بدلے تھوڑی سی قیمت نہیں لیتے۔ یہی لوگ ہیں جن کا حصہ ان کے پروردگار کے یہاں تیار ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٣٨﴾  
مَثَلُ مَا يُنْفِقُونَ فِي هَذِهِ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيحٍ فِيهَا صِرٌّ أَصَابَتْ حَرَثَ قَوْمٍ طَلَعُوا أَنْفُسَهُمْ فَاهْلَكَتُهُ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللَّهُ وَلَٰكِنْ أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿٣٩﴾

”جن لوگوں نے کفر کیا ان کے مال اور ان کی اولاد اللہ کے سامنے ان کے کسی کام نہ آئیں گے وہ دوزخی ہیں ہمیشہ دوزخ میں رہنے والے۔ جو کچھ یہ لوگ اس دنیا کی زندگی میں صرف کرتے ہیں اس کی مثال اس ہوا کی سی ہے جس میں سخت سردی ہو جو ان کی کھیتی کو پہنچے جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اور اسے تباہ کر دے اور اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔“

جو بد بختان نوع انسانی محض نفرت و حقارت کی وجہ سے مذہبی احکام کو ترک کر دیں، ان کے لئے مال و اولاد بیکار ہیں: لن تنفعكم ارحامكم واولادكم يوم القيامة۔ قیامت کے روز مال اور رشتے دار تمہارے کام نہ آئیں گے۔ ایک جگہ فرمایا: يوم لا ينفع مال ولا بنون، جس دن مال اور اولاد، دونوں چیزیں بے سود ثابت ہوں گی۔ ان لوگوں کی مثال یہ ہے کہ ایک قوم نے جبر و تشدد اور ظلم و جور کر کے اپنے ماتحتوں سے خوب کام لیا، جب کھیتی بالکل تیار ہو گئی تو ایک ہی سرد ہوانے اس کا ستیاناس کر دیا۔ یہی حال ان نالائقوں کا ہو گا۔ یہ اسلام کی مخالفت میں پوری ہمت صرف کر لیں انجام کار ناکام و خاسر ہی رہیں گے۔

## منافقین سے پرہیز

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بَطَانَةً مِّن دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ  
وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ إِن كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ ﴿٣٨﴾

”اے ایمان والو! اپنے سوانغیروں کو رازدار نہ بناؤ وہ تمہاری خرابی میں کوئی کمی نہیں کرتے، چاہتے ہیں کہ تم خطرناک مصیبت میں پڑ جاؤ۔ بیشک ان کے منہ سے بغض ظاہر ہو چکا ہے اور جو کچھ ان کے سینے چھپاتے ہیں وہ بڑھ کر ہے، اگر تم عقل رکھتے ہو تو ہم نے یقیناً تمہارے لئے باتیں کھول کر کے بیان کر دی ہیں۔“

رسول اللہ ﷺ نے مدینہ آتے ہی اولین کام یہ کیا کہ یہودیوں کے ساتھ معاہدہ کیا، جس کی پوری عبارت ہم سورہ بقرہ کی تفسیر میں درج کر چکے ہیں، اس کی ایک شرط یہ تھی کہ یہ لوگ ہماری مدد کریں گے اور اگر دشمن مدینہ پر حملہ آور ہو تو ہمارے ساتھ مل کر اس کے مقابلہ کے لئے تیار ہوں گے۔

باوجود ان تمام عہود و موافقات کے ان کی حالت یہ تھی کہ مشرکین و کفار مکہ کو مسلمانوں کے خلاف برابر اکساتے رہتے۔ ان کی درپردہ مدد کرتے اور ان سے ساز باز رکھتے۔ ان کے علاوہ منافقین کا ایک گروہ تھا جو ان سے ملا ہوا تھا۔ ان کا بھی یہی مقصد تھا کہ مسلمانوں کو نیست و نابود کر دیں اور ان میں اتحاد و اشتراک عمل نہ پیدا ہونے دیں۔

ان حالات کے ہوتے ہوئے ضروری تھا کہ مسلمانوں کو ان تمام لوگوں سے علیحدہ رہنے، ان پر اعتماد نہ کرنے اور ان کو قومی نشو و ارتقا کی تجاویز نہ بتانے کا حکم دیا جائے۔ یہ بد بخت مسلمانوں کی قومیت متحدہ فنا کرنے کی فکر میں رہتے ہیں، بد زبانیاں کرتے ہیں اور بسا اوقات ان کی تقریریں بتا دیتی ہیں کہ ان کو فرزند ان اسلام کے ساتھ کس قدر بغض و عداوت ہے اور دلوں میں تو اس سے کہیں زیادہ بدخواہی اور دشمنی رکھتے ہیں۔

بطانہ کا اطلاق ایسے شخص پر ہوتا ہے جس کو تم اپنے راز کی خبر کر دو۔ بخاری میں ہے: مابعث الله من نبی ولا استخلف خلیفۃ الا کانت له بطانتان، بطانۃ تامرہ بالخیر وتحضہ علیہ و بطانۃ تامرہ بالسوء وتحضہ علیہ والمعصوم من عصبہ الله، ہر ایک نبی یا اس کے خلیفہ کے ساتھ دو ہم راز ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک تو اسے ہمیشہ خیر و صلاح کا مشورہ دیتا ہے اور دوسرا فسق و فجور پر ابھارتا ہے اور معصوم وہی ہے جس کو اللہ تعالیٰ بچالے۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ بعض لوگوں نے حضرت عمر کو یہ مشورہ دیا کہ اہل حیرہ میں سے ایک نوجوان غیر مسلم بہترین کاتب اور منشی ہے، آپ اسے کاتب السرو پر ایویٹ سیکر ٹری بنالیں۔ آپ نے فوراً ان کی درخواست کو اس جواب کے ساتھ رد کر دیا: قد اتخذت اذ بطانۃ من دون المؤمنین، اس صورت میں تو میں مسلمانوں کو چھوڑ کر ایک غیر مسلم کو اپنا ہم راز و واقف اسرار بنالوں گا اور یہ ناممکن ہے۔ حضرت انس نے ایک مرتبہ بعض لوگوں کے سامنے یہ حدیث بیان کی: لا تستضيؤا بنار البشر کین جس کا ظاہری مطلب یہ ہے کہ مشرکین کی آگ سے تم روشنی نہ لو۔ مگر ان کے احباب اس کا اصلی منشا نہ سمجھ سکے اور حضرت حسن بصری سے جا کر اس کا مفہوم دریافت کیا۔ انہوں نے کہا اس کے معنی یہ ہیں: لا تستضيؤا البشر کین فی امورکم، اپنے کاموں میں مشرکوں سے مشورہ نہ

کر و اور اسی مذکورۃ الصدر آیت سے استدلال کیا۔

## مزید تشریح

ان آیات میں ان لوگوں کے مکرو فریب کو اور زیادہ واضح کیا جاتا ہے:

هَآأَنْتُمْ أَوْلَاءُ تُحِبُّونَهُمْ وَلَا يُحِبُّونَكُمْ بِالْكِتَابِ كُلِّهِ وَإِذَا لَقُوكُمْ قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا عَصَوْا عَٰلَيْكُمْ  
الْأَكْمَالَ مِنَ الْغَيْظِ قُلْ مُؤْتُوا بِغَيْظِكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ٥٥ إِنْ تَسْأَلُونَهُمْ حَسَنَةً تَسْأَلُونَهُمْ وَإِنْ  
تُسْأَلُونَ عَنْ سَيِّئَةٍ يُفَصِّحُوا بِهَا وَإِنْ تَصِدُّوهُمُ عَنْ النَّفَقَةِ فَلَا يَصُدُّوهُمُ كَيْدُهُمْ شَيْطَانُ إِنَّ اللَّهَ بِبَيِّنَاتٍ لِّمُحِيطٍ ٥٦

”سننے بھی ہو تم تو ان سے محبت کرتے ہو اور وہ تم سے محبت نہیں کرتے اور تم تمام کتاب پر ایمان رکھتے ہو اور جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے اور جب اکیلے ہوتے ہیں تو غصے کے مارے تم پر انگلیاں کاٹ کاٹ کھاتے ہیں، کہہ دو کہ اپنے غصہ میں مر رہو، بیشک اللہ سینوں کے راز کو خوب جانتا ہے۔ اگر تم کو کوئی بھلائی پہنچ جائے تو ان کو برا لگتا ہے اور اگر تم کو کوئی برائی پہنچے تو وہ اس سے خوش ہوتے ہیں اور اگر تم صبر کرو اور پرہیز گار نبوت تو تم کو ان کا فریب کچھ نقصان نہ پہنچا سکے گا، بیشک جو کچھ یہ کر رہے ہیں سب اللہ ہی کے بس میں ہے۔“

جن لوگوں میں مسلمانوں کا راز دار بننے کی اہلیت نہیں ہے اور جن پر فرزند ان اسلام کو ہر گز اعتماد نہ کرنا چاہئے، ان کی علامات حسب ذیل ہیں۔

- (الف) تم مسلمان اگرچہ ان سے دوستی کا اظہار کرتے ہو، مگر وہ ایک لمحہ کے لئے بھی تمہارے دوست نہیں۔
- (ب) ملاقات کے وقت تمہارے قومی جلسوں اور عام مجامع ملی میں وہ اس قسم کی تقریریں کر جاتے ہیں جن سے سادہ لوح مسلمان یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ہمارے خیر خواہ ہیں، مگر وہ یاد رکھیں کہ یہ سب زبانی جمع خرچ ہوتا ہے۔
- (ج) مسلمانوں کے لئے ان کے دلوں میں اس قدر بغض و عداوت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے کہ اگر فرزند ان اسلام کو ذرہ برابر بھی بھلائی نصیب ہو تو وہ بد بخت غصہ کے مارے اپنے ہاتھوں کو کاٹے کھاتے ہیں کہ مسلمان کیوں کامیاب ہو گئے۔

(د) ان کی تکالیف و شدائد پر ان کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔

یہ تمام لوگ مسلمانوں کے دشمن ہیں، ان کے خدع و فریب سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ:-

(۱) ہر شعبہ حیات میں اللہ تعالیٰ کے قانون کی پابندی کریں۔

(۲) تمام مسلمان اپنے مقصد حیات اور قرآن حکیم کی نشر و اشاعت کی خاطر فنا ہونے کو تیار ہو جائیں۔

یہ اخلاق و کمالات خدا کی طرف سے اس رحمت خاصہ کو جذب کر لیں گے جس سے اجانب و اخیر مسلمانوں سے مقابلہ کے وقت اپنی تدابیر میں ناکام و خاسر رہیں گے۔

## باب نمبر ۴

### غزوہ احد

### فصل اوّل

ماقبل سے ربط

قرآن حکیم میں لفظ بینات جس مدعا کو ظاہر کرنے کے لئے لایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ایک حکم دے کر اس کے تمام اسرار و مصالح بتا دیئے جائیں اور اس کے خلاف کرنے میں جس قدر نقصان کے پہلو ہیں ان کو واضح کر دیا جائے تاکہ کسی قسم کا خفا باقی نہ رہے۔

گزشتہ آیات میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ کفار و منافقین اور اہل کتاب سے تعلقات و روابط نہ رکھیں، مگر عام لوگ منافقین کے دھوکے میں آکر اس حکم کی پوری تعمیل نہیں کر سکتے۔ لہذا شرح و تفصیل کے ساتھ منافقین کی خرابیاں ذکر کی گئیں۔ اب اسی نظریہ کو دو مثالوں سے اور زیادہ واضح کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اٹھارویں رکوع تک دو لڑائیوں کا تذکرہ آئے گا۔

(الف) جنگ بدر۔ اس کے لئے فقط چند آیات مخصوص کی گئی ہیں، اس میں مسلمان کامیاب ہوئے اور وہ اپنی فتح و کامرانی کے نتائج و ثمرات بھی حاصل کر سکے، حالانکہ ان کی تعداد بھی کم تھی اور ان کے پاس سامان حرب بھی کچھ نہ تھا۔ اس کامیابی کا اصلی سبب یہ تھا کہ کفار کے ساتھ ان کے کسی قسم کے تعلقات نہ تھے، ہر ایک شخص صدق و اخلاص، جوش و ولولہ، عمل اور عزم و ثبات کا پیکر تھا۔

(ب) جنگ احد۔ زیادہ بحث اسی سے ہے۔ اس میں مسلمان کامیاب تو ہو گئے مگر اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے۔ اس لئے کہ تیر اندازوں نے باوجود صریح احکام کے رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کی اور اہل کتاب و منافقین کے ساتھ ان کے دوستانہ روابط قائم ہو چکے تھے۔ یہ دونوں واقعات صاف طور پر بتا رہے ہیں کہ مسلمانوں کو کس قدر اس امر کی ضرورت ہے کہ قدم قدم پر وہ رسول اللہ کی اطاعت کریں اور اہل کتاب و منافقین سے دوستی نہ رکھیں۔

واقعات احد

ہم یہاں قارئین کرام کی آسانی کے لئے اس جنگ کے مختصر واقعات درج کئے دیتے ہیں کہ آئندہ آیات میں انھی

واقعات کے اسرار و مصالح سے بحث ہوگی اس لئے ان کو غور سے پڑھ لینا ضروری ہے۔

ہجرت کے دوسرے سال جنگ بدر ہوئی تھی جس میں کفار کی قوت پاش پاش ہو گئی تھی، کفار قریش نے اس شکست کا بدلہ لینے کے لئے خوب زور سے تیاریاں شروع کر دیں۔ رؤسائے قریش نے ان کو مسلمانوں کے خلاف اس طرح ابھارنا شروع کیا: ان محمد اقد و ترکم و قتل اخیار کم فاعینونا بهذا المال علی حربہ لعلنا ندرک بہ ثارنا بمن اصاب منا۔ محمد نے تمہیں برباد اور تمہارے بہترین رجال کو قتل کر دیا پس مال سے ہماری اعانت کرو کہ ہم بدلہ لے سکیں۔ شوال ۳ ہجری کو تین ہزار کا لشکر جرار لے کر مدینہ پر چڑھ آئے، ابوسفیان ان کا قائد عسکر تھا اور احد کے درمیان میں خیمہ زن ہوئے جو مدینہ سے چار میل کے فاصلہ پر ہے۔

جس وقت رسول اللہ ﷺ کو اس لشکر کی خبر ملی تو آپ نے تمام صحابہ کو جمع کر کے مشورہ کیا کہ راہ عمل معین کریں۔ آپ کی ذاتی رائے تو یہی تھی کہ شہر میں رہ کر جنگ کرنی بہتر ہے، مگر نوجوان صحابہ نے یہ عرض کیا کہ میدان میں نکل کر لڑنا زیادہ قرین صواب ہے۔ اگرچہ فوراً بعد ان لوگوں کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور انہوں نے مل کر درخواست کی کہ آپ جو چاہیں فیصلہ فرمادیں ہم اس کو بسر و چشم قبول کریں گے، مگر آپ نے فرمایا: لاینبغی لنبی ان یلبس لامۃ فیضعہا حق یتقاتل، سامان جنگ پہن لینے کے بعد نبی سے یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ لڑے بغیر اس کو اتار دے۔ چنانچہ آپ ایک ہزار جوان لے کر شہر سے نکل کھڑے ہوئے۔

عبداللہ بن ابی، سردار منافقین کی رائے اس فیصلہ کے بالکل مخالف تھی، وہ آپ کے ہمراہ چل تو پڑا، مگر عین راستے میں سے اپنے تین سو ہمراہی لے کر واپس لوٹ آیا اور اب ذات رسالت کے ساتھ صرف سات سو فد اکاران اسلام رہ گئے۔ میدان میں جاتے ہی آپ نے تمام صحابہ کو مختلف مقامات میں کھڑا کر دیا، ایک گھاٹی ایسی تھی جہاں سے مسلمانوں پر عقب سے حملہ ہو سکتا تھا، آپ نے وہاں عبداللہ بن جبیر کی زیر قیادت پچاس تیر اندازوں کو معین کر کے صاف الفاظ میں انہیں یہ حکم دیدیا: افضحوا الخیل عنا ولا نوتین من قبلکم والزموا مکانکم وان کانت النوبۃ لنا اوعلینا وان رایتہونا تخطفنا الطیر فلا تبدوحوا مکانکم، اس لشکر کو ہم سے دور رکھو اور وہ تمہاری طرف سے ہم پر حملہ نہ کر سکے، ہماری فتح ہو یا شکست مگر تم اسی جگہ رہو، ہمیں جانور نوچ کھائیں لیکن تم اس مورچے سے ایک انچ ادھر ادھر نہ ہٹو۔

جنگ شروع ہوئی، مسلمان کامیاب ہو گئے اور مال غنیمت کے لوٹنے میں مصروف ہو گئے۔ تیر اندازوں نے دیکھا کہ کفار کا تعاقب ہو رہا ہے اور ہم ہر طرح فتح حاصل کر چکے ہیں، ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا، اب ہمیں بھی دشمن کے تعاقب میں شریک ہونا چاہئے۔ امیر نے ان کو روکا مگر اکثر نے نہ سنا اور نیچے اتر آئے، جب کفار نے اس مورچہ کو تیر اندازوں سے خالی دیکھا اور اپنے آپ کو ان کی زد سے محفوظ پایا تو فوراً سنبھل گئے اور لوٹ کر مسلمانوں پر شدید حملہ کیا۔ تعاقب کی وجہ سے مسلمانوں کا لشکر غیر مترتب اور منتشر ہو چکا تھا، مورچہ خالی تھا، اس لئے مسلمان ان کی زد میں آ گئے، بعض لوگ جن کی تعداد نو سے یقیناً زیادہ نہیں، بے ترتیبی اور پریشانی میں بھاگ کھڑے ہوئے، کیونکہ وہ اصلی لشکر سے پہلے ہی کٹ چکے تھے۔

کفار نے رسول اللہ ﷺ کو اپنا نشانہ بنالیا، آپ سخت زخمی ہوئے اور بہت سے مسلمان بھی شہید ہو گئے۔ آخر جب انہوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی پر اگندہ جمعیت پھر یکجا ہو گئی ہے تو فوراً میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے اور مسلمان اسی میدان میں رہ گئے۔ دوسرے روز مسلمانوں نے کفار کا حمراء الاسد تک تعاقب کیا، مگر وہ بہت دور جا چکے تھے، اس لئے یہ مدینہ کو واپس آ گئے۔

یہ مختصر واقعات ہیں جو آئندہ آیتوں میں بیان کئے جائیں گے۔ ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کامیاب تو یقیناً ہو گئے، البتہ اس فتح و کامرانی سے وہ حسب دلخواہ کوئی فائدہ حاصل نہ کر سکے۔ اس دعویٰ کی تائید میں حسب ذیل دلائل پیش کئے جاسکتے ہیں:

- (۱) مسلمان میدان جنگ ہی میں رہے، حالانکہ کفار بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔
- (۲) اگر کفار کامیاب ہوتے تو وہ ضرور مدینہ پر حملہ آور ہوتے، مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔
- (۳) کامیابی کی صورت میں کفار اسی میدان میں مسلمانوں کو بالکل فنا کر دیتے۔
- (۴) راستے میں واپس جاتے وقت کفار نے ابوسفیان سے شکایت کے طور پر کہا: ما صنعنا شیئاً۔ ہم نے تو مسلمانوں کا کچھ بھی نقصان نہ کیا۔

(۵) زخمیوں کے لے جانے میں کفار کو سخت زحمت اٹھانی پڑی۔

(۶) کوئی مسلمان گرفتار نہیں ہوا۔

(۷) کافروں کو مال غنیمت نہیں ملا۔

(۸) خود مسلمانوں نے دوسرے روزان کا دور تک تعاقب کیا۔

اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ہم جنگ احد کو مسلمانوں کی شکست سے تعبیر کریں۔ یہ سچ ہے کہ تیر اندازوں نے رسول اللہ کے حکم کی نافرمانی کی، یہ ان کی غلطی تھی اور عارضی شکست اسی غلطی کا نتیجہ۔ اس لئے فتح کے فوائد تو کیا حاصل کرتے خود ہی نقصان اٹھایا۔

رجوع الی المقصود

وَإِذْ غَدَوْتَ مِنْ أَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِينَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٦٠﴾ إِذْ هَبْتَ طَائِفَتَيْنِ مِنْكَ أَنْ تَفْشَلَا

وَاللَّهُ وَلِيُّهُمَا وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿٦١﴾

”تو اپنے گھر والوں سے سویرے چلا۔ مسلمانوں کو لڑائی کے لئے مورچوں پر بٹھاتا تھا اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ جب تم میں سے دو گروہوں نے ارادہ کیا کہ ہمت ہار دیں اور اللہ ان دونوں کا ولی تھا اور مومنوں کو صرف اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔“

سبحان اللہ! رسول ﷺ کی ذات اقدس تمام صفات و کمالات انسانی کی جامع تھی، میدان جنگ میں آپ ایک عظیم الشان جرنیل کے فرائض ادا کر رہے ہیں۔

بخاری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جن دو قبیلوں کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے وہ انصار میں سے تھے۔ ایک خزرج کی شاخ بنو سلمہ اور دوسرا اوس کی شاخ بنو حارثہ۔ جابر بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ ہمارے ان دو قبیلوں کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ راستے میں سے عبد اللہ بن ابی منافق اپنے تین سو آدمی لے کر واپس آگیا تھا۔ ایسے وقت میں اس قسم کا خیال آنا ایک قدرتی بات تھی اور حدیث نفس سے زیادہ اس کی حقیقت نہ تھی، یہ لوگ اپنی قلت تعداد، فقدان اسباب اور ضعف ظاہری کو دیکھتے تھے، ادھر دشمن کی کثرت، سامان حرب کی فراوانی اور کفار کی قوت و شوکت پیش نظر تھی، کمزوری کا ایک خفیف سا خیال پیدا ہوا، مگر انہوں نے کسی قسم کی کمزوری کا اظہار نہیں کیا۔ عین وقت پر اللہ نے ان کی دستگیری کی اور انہوں نے میدان جنگ میں خوب ہی بہادری کے جوہر دکھائے۔

ایک مسلمان کی شان یہی ہے کہ وہ تمام ظاہری اسباب سے کام لے کر نتیجہ کو خدا پر چھوڑ دے کہ نتائج کی رسی اسی کے ہاتھ میں ہے۔

غزوہ بدر

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ فَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُشْكُرُونَ ﴿۳﴾

”اور بیشک اللہ بدر کی لڑائی میں تمہاری مدد کر چکا ہے، حالانکہ تم بے سرو سامان تھے، پس تم اللہ سے ڈرو تاکہ تم شکر گزار بنو۔“

ان قبائل کے دل میں تھوڑا سا کمزوری کا احساس ہوا، اس لئے ان کو جنگ بدر کا واقعہ یاد دلایا جاتا ہے کہ دشمن کی تعداد اس میں تم سے تین گنا زیادہ تھی، تمہاری کمزوری اور بے سرو سامانی کی یہ حالت تھی کہ تم غالب نہیں آسکتے تھے، مگر باوجود اس کے تم مظفر و منصور واپس لوٹے اور کفار کی قوت پاش پاش ہو گئی۔ اس وقت تمہاری نصرت اس لئے کی گئی تھی کہ آئندہ تم کبھی اس قسم کے سوالات بیچ میں نہ لاؤ، بلکہ تمہیں نتیجہ کو اللہ پر چھوڑ کر کام کرنا چاہئے۔

امداد ملا نکلے

إِذْ تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ أَلَنْ يَكْفِيَكُمْ أَنْ يُبَدِّدَكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلَاثَةِ أَلْفٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ مُنْزِلِينَ ﴿۳﴾ بَلَىٰ إِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا وَيَأْتُوكُم مِّنْ فُورِهِمْ هَذَا يُبْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ أَلْفٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ مُسَوِّمِينَ ﴿۴﴾ وَمَا جَعَلَ اللَّهُ إِلَّا بَشْرًا لَّكُمْ وَلَيَطْغَيْنَّ قُلُوبُكُمْ بِهِ وَمَا النُّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ﴿۵﴾ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوا خَآئِبِينَ ﴿۶﴾

”جب تم مومنوں سے کہتے تھے کہ کیا تمہارے لئے کافی نہیں کہ تمہارا رب تین ہزار اتارے ہوئے فرشتوں سے



تمہاری مدد کرے۔ ہاں اگر تم صبر کرو اور پرہیزگار بنو اور وہ پورے جوش میں تم پر آپڑیں تو تمہارا رب پانچ ہزار نشان والے فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا اور اللہ نے صرف تمہارے خوش کرنے کے لئے اسے ٹھہرایا مدد و نصرت اللہ ہی کی طرف سے ہے، وہ غالب حکمت والا ہے۔ تاکہ وہ ان لوگوں کے ایک حصہ کو کاٹ دے جو کافر ہوئے ہیں، یا ان کو ایسا ذلیل کرے کہ نامراد واپس لوٹ جائیں۔

فرشتوں کے نزول پر ہم نے اپنی کتاب ”الصراط المستقیم“ میں تفصیلی بحث کی ہے، اعانت ملائکہ کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان ثابت قدم رہیں۔ کفار کے دلوں میں ہیبت طاری ہو، ان کے لشکر کا ایک حصہ نیست و نابود ہو جائے اور جو باقی رہے وہ ذلیل ہو کر ناکام لوٹے۔ چنانچہ جنگ احد میں ایسا ہی ہوا۔ لڑائی کے شروع میں مسلمانوں نے کفار کے لشکر کا ایک حصہ بالکل تباہ کر دیا، بہتوں کو زخمی کیا اور انجام کار یہ دشمنان دین بے نیل مرام واپس لوٹے۔

### بیجا انتقام

جنگ احد میں مسلمان خود اپنی غلط کاری کی وجہ سے اس فتح و کامرانی کے نتائج و ثمرات سے مستفید نہ ہو سکے۔ انسانی طبیعت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ اپنی ناکامی سے متاثر ہو کر انتقام لینے پر اتر آتی ہے اور اس جوش انتقام میں بعض اوقات حد سے گزر جاتی ہے۔ جس عدوان کو قرآن پاک نے سختی سے روکا ہے اس لڑائی میں خود رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو سخت تکلیف اٹھانی پڑی۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو مشکہ کیا گیا، ان حالات سے متاثر ہو کر مسلمان بھی اس غلطی میں مبتلا ہو سکتے تھے۔ لہذا ارشاد ہوا۔

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبُهُمْ فَلَا تَهَمَّنْ عَلَيْهِمْ ۚ وَاللَّهُ مَتَّي السَّلَوتِ وَمَتَّي الْأَرْضِ  
يَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ٣٨

”اس میں تیرا کچھ دخل نہیں خواہ وہ ان پر رحمت سے لوٹے یا ان کو سزا دے بیشک وہ ظالم ہیں اور اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے، جسے چاہے معاف کرے اور جسے چاہے عذاب کرے اور اللہ بخشنے والا رحم والا ہے۔“

بخاری و مسلم میں ہے کہ فجر کی دوسری رکعت میں رکوع کے بعد رسول اللہ ﷺ بعض لوگوں کے نام لے کر ان پر بد دعا کرتے تھے۔ مسند امام احمد میں ہے کہ جنگ احد میں آپ کا چہرہ مبارک زخمی ہو گیا اور خون بہنے لگا، تو آپ نے فرمایا: کیف یفلح قوم فعلوا هذا بنبیہم وھود عوھم الی ربھم عزوجل، جو قوم اپنے نبی کے ساتھ اس قسم کی حرکات کرے، وہ کیسے کامیاب ہو سکتی ہے حالانکہ وہ انہیں خدائے واحد کی طرف بلاتا ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور اس میں بتا دیا کہ بد دعا کرنا، بدلہ لینا اور انتقام کے لئے تیار ہونا آپ کی شان رحمت للعالمین کے خلاف ہے۔

اس قسم کے خطابات کا روئے سخن دراصل امت کی طرف ہوتا ہے، ورنہ رسول اللہ کی طبیعت میں تو اس وقت بھی انتقام اور بد دعا کا جوش نہ پیدا ہوا جبکہ طائف کے لوگوں نے چند اوباشوں کے ذریعہ آپ پر پتھر پھکوائے، جس سے پائے مبارک لہو لہان ہو گئے تھے اور جوتے سے پاؤں نکالنا دشوار ہو گیا تھا۔ پیغمبر علیہ السلام کو کفار کی بد بختی پر افسوس ہوتا تھا اور بعض

اوقات یہ حالت اضطراب کے درجہ کو پہنچ جاتی تھی، جس پر یہ ارشاد ہوتا ہے کہ زمین و آسمان کی حکومت صرف اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے، وہی ہر ایک کی ہدایت و ضلالت کا ذمہ دار ہے، آپ کے اختیار میں ان میں سے کوئی چیز بھی نہیں: لیس علیک ہداهم ولكن الله يهدي من يشاء، تم پر کسی انسان کی ہدایت لازمی نہیں، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی مرضی پر موقوف ہے۔ انک لا تہدی من احببت ولكن الله يهدي من يشاء اور فانما علیک البلاغ وعلینا الحساب کا یہی مطلب ہے۔ چنانچہ اللہ نے ان کفار میں سے اکثر کو اسلام کی توفیق بخشی اور وہ نہایت ہی زبردست فداکار اسلام ثابت ہوئے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿۵﴾ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ۖ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿۶﴾

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو بڑھا بڑھا کر سود مت کھاؤ اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم فلاح پاؤ اور اس آگ سے بچو جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے اور اللہ اور رسول کا کہاںوتا کہ تم پر رحم کیا جائے۔“

اس وقت دنیا میں سود کا کاروبار جاری ہے۔ ایک حکومت سود پر قرض لے کر جنگ شروع کر دیتی ہے، خود بڑے بڑے مہاجن اپنے سود کی خاطر بڑی بڑی سلطنتوں کو لڑا دیتے ہیں کہ اس طرح یہ حکومتیں زیر بار احسان رہیں گی۔ یورپ کی عالمگیر جنگ میں یہ بھی ایک راز تھا۔ یہی حال عرب کا تھا۔ فقال کہتا ہے: ان اکثر اموال المشركين قد اجتمعت من الدنيا وكانوا ينفقون تلك الاموال على العبيد، کہہ مشرکین کی بیشتر دولت اسی سود سے جمع ہو کر فوجوں پر خرچ ہوتی تھی، اس لئے مسلمانوں کو بتایا گیا کہ انہیں جو جنگ کی اجازت دی گئی ہے تو اس لئے نہیں دی گئی کہ وہ دوسری قوموں کو اپنا غلام بنائیں اور اس کو اپنی آمدنی کا ذریعہ قرار دیں، بلکہ اس کا مقصد تو نوع انسانی کی ہمدردی، کلمہ حق کی نشر و اشاعت اور صراط مستقیم کی رہ نمائی ہے۔ اس لئے راہ حریت میں جو کچھ بھی خرچ ہو وہ عمدہ اور پاک مال ہو۔

یاد رکھو کامیابی کی یہ راہ نہیں کہ جنگ کا سلسلہ دراز تر کر کے نسل انسانی کو تباہ کر دو، بلکہ تقوی اللہ تمہارا طغرائے امتیاز ہو اور ہر صورت میں قانون الہی کی پابندی تمہارے پیش نظر رہے۔ صرف اسی حالت میں اللہ کی رحمت خاصہ تم پر نازل ہو سکتی ہے۔

جنت کی طلب

وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمُوتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ ﴿۷﴾ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكُظُمِينَ الْغَيْظِ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿۸﴾

”اور اپنے رب کی بخشش اور جنت کی طرف جلدی کرو جس کی وسعت آسمان اور زمین کے برابر ہے جو پرہیز گاروں کے واسطے تیار کی گئی ہے، جو خوشی اور تکلیف میں خرچ کرتے ہیں، غصہ کو ضبط کرنے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں اور اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔“

تمہارا معیار ترقی اس دنیائے دون کی چہار دیواری منحصر نہ رہنا چاہئے، بلکہ تمہارے پیش نظر وہ جنت رہنی چاہئے جو ترقی کی آخری سرحد ہے۔ حدیث میں آتا ہے: اِذَا سَأَلْتُمْ اللّٰهَ الْجَنَّةَ فَاَسْأَلُوْهُ الْفِرْدَوْسَ، فَاِنَّهٗ اَعْلٰی الْجَنَّةِ وَاَوْسَطُ الْجَنَّةِ وَمِنْهُ تَفْجَرُ اَنْهَارُ الْجَنَّةِ وَسُقْفُهَا عَرْشُ الرَّحْمٰنِ، اگر تم جنت کے طالب ہو تو خدا سے جنت الفردوس طلب کرو کہ وہ بہترین جنت ہے۔ اسی سے جنت کی نہریں نکلتی ہیں اور اسی کی چھت عرش باری تعالیٰ ہے۔ یہ جنت ایسی ہے کہ اس کا عرض آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔ خود قرآن میں دوسری جگہ اس طرح آتا ہے: سَابِقُوْا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاءِ وَ الْاَرْضِ (حدید ۲۱) اپنے خدا کی مغفرت کی طرف لپکو اور اس جنت کی طرف جس کا عرض آسمان و زمین کے عرض کے برابر ہے۔ اس لئے اکثر لوگوں کے نزدیک اس آیت میں جنت کی فراخی اور وسعت کو بیان کرنا ہے۔ مسند امام احمد میں ہے کہ جس وقت رسول اللہ ﷺ نے ہر قل کو اس جنت کی دعوت دی تو اس نے پوچھا پھر دوزخ کہاں گئی؟ آپ نے فرمایا: سبحان اللہ فالین الدلیل اذا جاء النہار ارجب دن ہو تو رات کہاں جاتی ہے۔ اس قسم کی گفتگو ایک مرتبہ حضرت عمر کی یہودیوں سے بھی ہوئی تھی اور یہی جواب ابن عباس اور ابو ہریرہ سے بھی منقول ہے۔

پس ایک مسلم کی شان یہی ہے کہ وہ ایسی جنت کو مطمح نظر بنائے، لیکن یہ صرف ان لوگوں کو ملے گی جن میں حسب ذیل خصوصیات ہوں گی:

- (الف) سہا و علانیہ۔ لیلا و نہار، غربت و افلاس اور فراخی و تنگدستی، ہر وقت میں اللہ کے نام پر خرچ کرتے ہیں۔
- (ب) ایمان کی ادنیٰ حالت یہ ہے کہ اگر دوسرے لوگ غلطی کریں تو یہ اپنے غصہ کو دباتے ہیں۔
- (ج) اس سے اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ عفو و درگزر کرتے ہیں اور باوجود انتقام پر قدرت پانے کے لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں۔

(د) اور انتہائی مرتبہ یہ ہے کہ جس سے قصور سرزد ہو اس کے ساتھ احسان و مروت کا سلوک کیا جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی ایسے لوگوں کے ساتھ اس قسم کا سلوک کرتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کیا۔ آپ نے فرمایا: لیس الشدید بالصرعة ولكن الشدید الذی یملک نفسه عند الغضب، پہلوان وہ نہیں جو دوسروں کو کشتی میں گرا دے، بلکہ قوی و طاقتور اسے کہا جائے گا جو غضب کے وقت اپنے اوپر قابو پالیتا ہے۔ فتح مکہ کے روز آپ نے قریش کے ساتھ جو برتاؤ کیا وہ اس کی بہترین عملی تفسیر ہے۔ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی نسبت معلوم ہے کہ وہ نفیس ترین کپڑا استعمال کرتے تھے۔ ایک مرتبہ دعوت کے موقع پر جلدی میں خادم کے ہاتھ سے شور بے کاپیالہ گر گیا اور آپ کے تمام کپڑے اس سے تر ہو گئے۔ خادم نے دیکھا تو نہایت مضطرب ہوا کہ اب امام کا غصہ اس پر اترے گا، اس نے فوراً یہی آیت پڑھ دی۔ امام صاحب ہنس پڑے اور دوسرا جوڑا منگو لیا۔

وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ ۖ وَمَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ ذُنُوبَهُ ۖ إِلَّا اللَّهُ ۚ  
وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٦٠﴾ أُولَٰئِكَ جَزَاءُهُمْ مَغْفِرَةٌ ۖ مِمَّنْ رَّبِّهِمْ وَجُزْءٌ تَجَرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ  
خَالِدِينَ فِيهَا ۖ وَنِعْمَ أَجْرُ الْعَبِيدِ ﴿٦١﴾

“اور وہ جو کوئی بر اکام کر بیٹھے ہیں یا اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں تو اللہ کو یاد کرتے ہیں پھر اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں اور بجز اللہ کے اور کون گناہ بخشتا ہے اور جو کر بیٹھیں تو دانستہ اس پر اصرار نہیں کرتے۔ یہی لوگ ہیں جن کا بدلہ ان کے رب کی طرف سے مغفرت اور بارغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ان میں ہمیشہ رہیں گے اور کام کرنے والوں کا کیا ہی اچھا اجر ہے۔”

ان آیات میں بعض دیگر شرطیں بھی بیان کی گئی ہیں:

(۱) جب وہ کسی ایسی بے حیائی کا ارتکاب کر بیٹھے ہیں جس سے دوسروں کی حق تلفی ہوئی ہو، یا خود اپنا ہی نقصان کر لیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ سے معافی خواہ ہوتے ہیں۔

(۲) اگر ان سے نادانستہ غلطی ہو جائے تو معلوم ہونے پر فوراً رُک جاتے ہیں اور اس پر اصرار نہیں کرتے۔  
حدیث میں آتا ہے: ما صر من استغفر وان عاذق الیوم سبعین مرة، جو شخص توبہ کرتا ہے وہ اپنے جرم پر اصرار نہیں کرتا، اگرچہ وہ ایک روز میں اس کا ستر مرتبہ ارتکاب کرے۔ قرآن میں ہے: الم یعلموا ان اللہ ھو یقبل التوبۃ عن عبادہ، کیا وہ یہ نہیں جانتے کہ اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ کو شرف قبول بخشتا ہے۔ دوسری جگہ آتا ہے: ومن یعمل سوعا ویظلم نفسه ثم یمستغفر اللہ یجد اللہ غفورا رحیما، جو شخص غلطی کا ارتکاب کرے گا یا اپنے اوپر ظلم کرے گا، پھر وہ اللہ سے مغفرت طلب کرے گا تو وہ خدا نے بندہ نواز کو غفور و رحیم پائے گا۔

تذکیر یا ایام اللہ

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۖ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ﴿٦٢﴾

“تم سے پہلے بہت سے واقعات ہو چکے ہیں تو ملک میں چلو پھرو، پھر دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔”  
تم سے پہلے اس کبڑی زمین کی پشت پر صدہا اقوام بس چکی ہیں، ان کو اخلاقی تعلیم دی گئی مگر انہوں نے اس کی پروا نہ کی۔ پھر تاریخ کو اٹھا کر دیکھ لو ان کا کیا پایا برا انجام ہوا۔ اگر ایک قوم جوش جنون میں اخلاق صالحہ کو ترک کرنے پر آمادہ ہو جائے تو وہ بہت جلد فنا ہو جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کو غزوہ احد میں تکلیف پہنچی ہے، مگر وہ باوجود اس مصیبت کے اخلاق کو چھوڑ دینا اور کافروں پر زیادتی کرنا جائز نہیں کہ خلافت کبریٰ کا حصول محض اخلاق صالحہ پر موقوف ہے۔ ہم ایک شخص کے اسی وقت تک دشمن ہیں جب تک وہ ہمارے اسلام کا مخالف، ہماری کتاب کا دشمن اور مسلمانوں کو فتنہ کرنے کی فکر میں ہے اور جہاں وہ دائرہ اسلام میں داخل ہوا پھر وہ ہمارا بھائی ہے اور بیٹوں سے زیادہ عزیز۔

## بیان للناس

هَذَا بَيِّنَاتٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ ﴿٨٨﴾

”یہ لوگوں کو سمجھانا ہے اور پرہیزگاروں کے واسطے ہدایت اور نصیحت ہے۔“  
فتح و کامرانی کی آرزو مند جماعت کے لئے اس دستور العمل کے مطابق عمل کرنا ضروری ہے ورنہ وہ کبھی اعلیٰ ترقی پر فائز نہیں ہو سکتی۔

## غم کا علاج

ظاہر ہے کہ مسلمان جنگ سے فارغ ہو کر اپنی حالت پر غور کریں گے، رسول اللہ ﷺ کا زخمی ہونا انہیں یاد آئے گا، جلیل القدر صحابہ کا مجروح ہونا، حضرت حمزہ کا مثلہ کیا جانا، تیر اندازوں کی نافرمانی اور فتح و ظفر کے نتائج سے محرومی، یہ تمام واقعات ایک ایک کر کے ان کے سامنے آئیں گے، ممکن ہے کہ ان میں سے بعض رنج و غم میں مبتلا ہو کر اپنا تمام وقت اس میں صرف کر دیں، ان لوگوں کو فلسفہ آلام و مصائب سمجھایا جاتا ہے کہ اگرچہ یہ مصیبتیں تم پر آئیں مگر تمہیں ان سے بچد فوائد بھی تو حاصل ہوئے اور بعض نتائج تو صرف اسی صورت میں مل سکتے تھے کہ یہ تکالیف تم پر نازل ہوئیں۔ پس یہ حوادث تمہارے لئے مشہر برکات ثابت ہوئے، پھر رنج و غم اور حزن و ملال کیسا۔

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿٨٩﴾

”اور سست نہ بنو اور نہ غم کرو اور تم ہے غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔“

ایسے وقت میں جبکہ ان پر چاروں طرف سے مصیبتوں اور تکلیفوں کی بارش ہو رہی ہے، انہیں یہ مسرت اندوز خبر دی جاتی ہے کہ اگر تم خداوند قدوس کا ہر حکم اعتقاداً و عملاً ماننے رہو اور اس کی راہ میں اپنی ہر عزیز ترین متاع قربان کرنے کو مستعد ہو تو آخر کار فتح و ظفر تمہاری ہی ہمرکاب ہوگی۔

تفسیر ابن جریر طبری میں ہے کہ صحابہ جنگ احد میں سخت پریشان تھے، رسول اللہ کی وفات کی خبر مشہور ہو چکی تھی، خالد بن ولید پہاڑ پر اپنی جماعت کے ساتھ تھا کہ اتنے میں مسلمانوں نے ذات رسالت کو زندہ دیکھ لیا تو وہ بے انتہا مسرور ہوئے اور آپ نے دعا کی: اللھم لا تقو لنا الابلک و لیس احد یعبدک بهذا البلد غیہو لا عفلا تھلکمھم، خداوند اتیری ہی تائید تقویت بخش ہے، اس شہر میں ان مسلمانوں کے سوا اور کوئی تیر اعبادت کرنے والا نہیں تو انہیں ہلاک نہ کر۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اس آیت نے یہ بتا دیا کہ ایک مسلمان خواہ کیسی ہی سخت سے سخت مصیبت میں مبتلا ہو، قید خانہ کی کوٹھری ہو، آہنی رنجیریں اس کے پاؤں میں ہوں یا سولی کے تختہ پر لٹک رہا ہو، کوئی حالت ہو مگر اس پر کبھی یاس و قنوط نہ طاری ہونی چاہئے۔ وہ کبھی ہمت نہ ہارے اور غم نہ کرے کہ عاقبت کار وہی کامیاب و سر بلند ہوگا۔

## مقصد کیا تھا

إِنْ يَسْأَلْكُمْ فَرَمٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ فَرَمٌ مِّثْلُهُ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَا وَلَهَا بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ⑥ وَلِيُبَيِّنَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ الْكُفْرَاءَ ⑦

”اگر تمہیں زخم پہنچا ہے تو یقیناً ان لوگوں کو بھی ایسا ہی زخم پہنچا ہے اور ان دنوں کو ہم لوگوں میں ادلتے بدلتے رہتے ہیں اور تاکہ اللہ ان کو معلوم کر لے جو ایمان لائے اور تم میں سے شہید بنائے اور ظالموں سے اللہ محبت نہیں کرتا اور تاکہ اللہ ایمان والوں کو نکھار دے اور کافروں کو مٹا دے۔“

اگر تمہارے آدمی شہید ہوئے ہیں تو تم نے ان کے بھی بہت سے آدمی مار ڈالے ہیں۔ وہ لوگ فتح حاصل کر کے اپنے گھروں کو نہیں لوٹے۔ یہ جنگ احد ہی کی طرف اشارہ ہے، جس میں مسلمانوں نے قلیل التعداد ہونے کے باوجود کفار کے بہت زیادہ آدمی مار ڈالے تھے اور اس قدر زخمی کر دیئے تھے کہ واپس جاتے وقت انہیں سواریاں بھی کفایت نہ کر سکیں اور انہیں مجبوراً اپنی گردنوں پر لادنا پڑا۔

اسی سورت میں آگے چل کر آتا ہے: اُولَئِكَ اَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِثْلَيْهَا (ال عمران ۱۶۵) تمہیں تو ایک ہی مصیبت پہنچی ہے اور تم نے اپنے مخالفین کو دو گنا مصیبت پہنچا دی ہے۔ بظاہر یہ آیت اس کے مخالف معلوم ہوتی ہے، مگر دراصل کوئی اختلاف نہیں، کیونکہ پہلی آیت میں فقط غزوہ احد کے نقصانات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور اس میں بدر اور احد دونوں کو شامل کر لیا ہے۔

لڑنے والوں میں یہ ہمیشہ ہوا کرتا ہے کہ کبھی ایک فریق غالب اور کبھی دوسرا۔ غزوہ بدر میں تم ہر طرح کا میاب رہے، یہاں بھی فتح و کامرانی تمہارے لئے تھی مگر تمہاری ہی ایک جماعت کی تھوڑی سی غلطی اس پریشانی کا موجب ہوئی، لیکن باوجود اس کے حسب ذیل فوائد حاصل ہو گئے:

(۱) اللہ تعالیٰ اچھے اور برے میں تمیز کر دیگا، مصیبت کے وقت ہر ایک شخص کا امتحان ہوتا ہے، اس لئے سب کو مسلمان اور منافق کا علم ہو جائے گا۔

(۲) تم میں سے بعض کو وہ شہادت کے درجہ علیا پر فائز کرنا چاہتا تھا، کھیتی کے لئے آفتاب کی روشنی اور پانی ضروری چیزیں ہیں ورنہ وہ خراب ہو جائے گی۔ ایسے ہی قوموں کی حیات ملی شہیدوں پر موقوف ہے، قومی کھیتوں کو بہترین دل دماغ کے خون ہی سیراب کر سکتے ہیں۔ آزادی اور حریت کی راہ کافر صرف انسانی لاشوں ہی سے تیار ہوتا ہے۔ جب تک قربانیاں کثرت سے نہ ہوں گی قوم کبھی زندگی حاصل نہ کر سکے گی۔ جب اعلیٰ ترین افراد ملت ذبح ہوں گے تو قوم میں زندگی کے آثار نمودار ہوں گے، اس کے جذبات بھڑک اٹھیں گے اور جب تک انتقام نہ لے لے گی اسے چین نہ آئے گا۔

جنگ احد میں سید الشہداء حضرت حمزہ شہید ہوئے، ان کی شہادت رسول اللہ ﷺ کے لئے کسی قدر جوش و ہيجان کا باعث ہو گئی، اس کے بعد وہ بنو ہاشم سے بدلہ لئے بغیر نہ رہیں گے۔

یہ احتمال نہ ہوا کہ اس جنگ میں جو بظاہر کافروں کو غلبہ کی صورت حاصل ہو گئی ہے تو یہ اس لئے ہے کہ وہ اللہ کے محبوب ہیں ہر گز نہیں، کفر و شرک کرنے والوں کو اللہ ہر گز دوست نہیں رکھتا۔

(۳) مومنین قانتین کو نمایاں اور ممتاز کر دے تاکہ وہ دوسروں کے امام و پیشوا بن سکیں۔

(۴) منافقوں کا زور توڑ دے کہ ان بزدلوں کو کہیں بھی عزت نصیب نہ ہو اور کافر فنا ہو جائیں۔

أَمْرٍ حَسِبْتُمْ أَنْ تُدْخِلُوا الْجَنَّةَ وَلَكِنَّا يَعْلَمُ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَيَعْلَمُ الظَّالِمِينَ ﴿۲۷﴾

کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کو نہیں معلوم کیا جو جہاد کرنے والے ہیں اور نہ صبر کرنے والوں کو جاننا۔

اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ مسلمان ایک ایسی قوم بن جائیں جو حق و حریت کی راہ میں ہر تکلیف و مصیبت برداشت کرنے کو تیار ہوں کہ اس کے بغیر دنیا و آخرت کی کامیابی ناممکن اور محال ہے اور یہ مقصد نہیں حاصل ہو سکتا تھا جب تک ان پر یہ مصیبت نہ آتی اور مجاہد و صابر کی صفیں باقی لوگوں سے ممتاز نہ ہو جائیں۔ ایک جگہ آتا ہے: أَمْرٍ حَسِبْتُمْ أَنْ تُدْخِلُوا الْجَنَّةَ وَلَكِنَّا يَعْلَمُ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَمَسْتَهْمُ الْبِائِسَاءِ وَالضَّعَافُ وَذُلُّوا (البقرہ ۲۱۴) کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ یونہی بہشت میں جا داخل ہو گے اور ابھی تم کو پہلے لوگوں کی سی مشکلات تو پیش آئیں ہی نہیں ان کو بڑی بڑی سختیاں اور تکلیفیں پہنچیں اور وہ صعوبتوں میں ہلا ہلا دیئے گئے۔ دوسرے مقام پر یوں ارشاد ہوتا ہے: أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ (العنکبوت ۲) کیا لوگ یہ خیال کئے ہوئے ہیں کہ صرف یہ کہنے سے کہ ہم ایمان لے آئے چھوڑ دیئے جائیں گے اور ان کی آزمائش نہیں کی جائے گی۔

وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَأَيْتُمُوهُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ﴿۲۸﴾

”اور قبل اس کے کہ تم اس سے موت کی آرزو کیا کرتے تھے سو اب تم نے آنکھوں کے سامنے اس کو دیکھ لیا۔“

غزوہ بدر میں جو صحابہ کرام شہید ہو گئے تھے ان کی فضیلت و بزرگی میں آیات نازل ہوئیں تو جنگ بدر میں جو لوگ شریک نہ ہو سکے تھے، انہیں اس امر کا بے انتہا افسوس ہوا، انہوں نے بارہا وہاں نہ مضطرب نہ دعا کی کہ اب پھر کوئی جنگ ہو اور انہیں فداکاری و جوش ملی کے اظہار کا موقع ملے۔ ایک روایت میں آتا ہے: ان رجلا من اصحاب رسول اللہ ﷺ كانوا يقولون ليتنا نقتل كما قتل اصحاب بدر ونشهد، اوليت لنا يوم ماكيوم بدر نقاتل فيه المشركين ونهبل فيه خيرا وتلتبس الشهادة والجنة والحياة والرزق۔ رسول اللہ کے بعض صحابہ یہ کہا کرتے تھے اے کاش ہم بھی اصحاب بدر کی طرح جنگ کرتے اور شہادت حاصل کرتے، جنگ بدر کی طرح پھر کوئی معرکہ کارزار گرم ہو کہ ہم بھی اس میں مشرکوں سے جنگ کر کے شہادت کے درجہ علیا پر فائز ہوں۔ جنت، حقیقی زندگی اور رزق سے بہرہ اندوز ہوں۔ یہی



لوگ چاہتے تھے کہ جنگ احد میں باہر جا کر لڑیں، اسی کو اس آیت میں تمنائے موت سے تعبیر کیا گیا ہے اور اسی کی ممانعت کی گئی ہے، بخاری و مسلم میں ہے: لَا تَتَّبِعُوا الْقَاءَ الْعَدُوِّ وَاسْتَلُوا اللَّهَ الْعَافِيَةَ فَإِذَا لَقِيتُمُوهُمْ فَاصْبِرُوا وَاعْلَمُوا أَنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ ظِلَالِ السَّيْفِ، دشمن سے جنگ کی آرزو نہ کرو بلکہ خدا سے عافیت طلب کرو اور اگر جنگ کی نوبت آجائے تو صبر و استقلال سے کام لو کہ جنت تلواروں کے سائے میں ہے۔ گویا اسی آرزو کے مطابق تم اپنی آنکھوں سے اس جنگ کو دیکھ رہے ہو۔

## امیر کی تخصیص

میدان جنگ میں کامیابی کا دار و مدار سالار فوج کے وجود پر ہوتا ہے، وہ مارا گیا تو تمام فوج یا تو بھاگ پڑتی ہے یا دشمن کے آگے ہتھیار ڈال دیتی ہے۔ اس غلط کاری کی اصلاح یوں کی گئی۔

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ ۖ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۖ أَفَأَمَّا إِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ ۚ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَىٰ عَقْبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللَّهَ شَيْئًا ۚ وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ ﴿۳۷﴾

”اور محمد رسول ﷺ ہی تو ہے کہ اس سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں، پھر اگر وہ مر جائے یا قتل کیا جائے تو کیا تم اٹے پاؤں پھر جاؤ گے اور جو کوئی بھی اٹے پاؤں لوٹے گا تو وہ اللہ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا اور اللہ عنقریب شکر کرنے والوں کو بدلہ دے گا۔“

غزوہ احد میں رسول اللہ ﷺ سخت زخمی ہو گئے، کسی نے یہ خبر اڑادی کہ آپ قتل ہو گئے ہیں۔ اندازہ کیجئے، کفار چار گنا تعداد سے مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے ہیں، خود فرزند ان اسلام مورچہ چھوڑ کر دشمن کی زد میں آ گئے ہیں، اسلامی فوج پر اگندہ اور منتشر ہو چکی ہے، اتنے میں خبر ملتی ہے کہ آپ شہید ہو گئے ہیں جو فوج کے جرنیل بھی ہیں، اس کے بادشاہ بھی ہیں اور جس فوج کی تمام امیدیں، ہر قسم کی کامیابیاں اور دنیا جہان کی برکتیں اسی وجود اقدس کے ساتھ وابستہ ہیں، جس کی خاطر وہ وطن و دیار، مال و دولت، عزیز و قریب اور زندگی تک قربان کر چکی ہے، جو اسے تمام زمین و آسمان سے زیادہ محبوب ہے، ایسی صورت میں مسلمانوں کی کیا حالت ہوگی، اگر کوئی اور فوج ہوتی تو یقیناً گھبراہٹ، مگر شمع محمدی کے پروانوں کے پائے ثبات کو ذرا بھی لغزش نہ ہوئی، بعض مضطرب تو ضرور ہوئے مگر ایسے لوگ بہت ہی کم تھے، کیونکہ اگر مسلمان پریشان و مضطرب ہو جاتے اور اس گھبراہٹ میں یہ میدان جنگ چھوڑ دیتے تو ضرور تھا کہ کفار واپس ہوتے جب تک وہ مسلمانوں کا صفایانہ کر دیتے اور انہیں غلبہ حاصل نہ ہو جاتا۔

آپ غور کیجئے کہ رسول اللہ کی وفات کا اعلان ہوتا ہے اور بعض مسلمان گھبرا جاتے ہیں تو حضرت انس بن النضر فرماتے ہیں: ان كان محمداً قد قتل فان رب محمداً لا يموت وما تصنعون بالحيوة بعد رسول الله قاتلوا على ما قاتل عليه، اگر محمد قتل ہو گئے ہیں تو کیوں گھبراہٹ ہو اس کا خدا تو زندہ ہے اور رسول اللہ کے بعد تم زندہ رہ کر کیا کرو گے، اسی



مقصد پر تم بھی جان دیدو جس پر وہ شہید ہوئے ہیں۔ آیت زیر بحث میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ محمد بھی ایک رسول ہیں، ان سے پہلے خدا کے بہت سے رسول ہو چکے ہیں۔ کسی انسان کو موت سے چارہ نہیں، ایک انسان خواہ وہ کتنا ہی جلیل القدر کیوں نہ ہو اس پر ضرور موت طاری ہوگی۔ اب اگر آپ وفات پا جائیں یا قتل ہوں تو کیا تم یہ خبر سنتے ہی میدان جنگ سے بھاگ جاؤ گے اور اسلام چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کرو گے۔

اس قسم کی حرکتیں تو کسی احمق ہی سے سرزد ہو سکتی ہیں، جو ان معمولی باتوں سے گھبرا کر دین اسلام ہی کو خیر باد کہہ دے اور لڑائی سے بھاگنے کی فکر کرے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو وہ اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارے گا اور جو لوگ اپنی قوتوں کو صحیح مواقع میں صرف کریں گے اللہ تعالیٰ انہیں بہترین جزا دے گا۔

### موت کا وقت

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ كِتَابًا مُّؤَجَّلًا ۚ وَمَنْ يُؤِذِ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا ۖ وَمَنْ يُؤِذِ ثَوَابَ الْآخِرَةِ نُؤْتِهِ مِنْهَا ۖ وَسَخَّرْنَا الشَّيْطَانَ ۝

”اور کسی شخص کے لئے نہیں کہ وہ اسلام کے حکم کے بغیر مر جائے۔ وقت مقرر لکھا ہوا ہے اور جو کوئی دنیا کا بدلہ چاہے گا ہم اس کو اس سے دے دیں گے اور جو آخرت کا بدلہ چاہے گا ہم اس کو اس میں سے دے دیں گے اور ہم شکر گزار بندوں کو عنقریب جزا دیں گے۔“

کسی کے مرنے سے گھبرانا فضول ہے، تمہیں اپنے فرائض سے ہرگز غافل نہ ہونا چاہئے۔ تم میں نظام کی وہ اعلیٰ قابلیت ہونی چاہئے کہ اگر امیر فوج قتل بھی ہو جائے، تو تم اپنے فرائض کی انجام دہی میں غیر متزلزل نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ بھی اپنے مقررہ وقت پر انتقال فرمائیں گے، اگرچہ قتل کے تمام اسباب جمع ہو جائیں مگر پھر بھی اس وقت سے قبل دشمن آپ کو قتل نہیں کر سکے گا کہ واللہ یعصمک من الناس کا وعدہ موجود ہے، کفار کا اس جنگ میں یہی مقصد تھا کہ آپ کو شہید کر دیں، مگر باوجود پوری کوشش کے وہ ناکام و خاسر رہے۔

جو شخص محض شہرت طلبی، جاہ پرستی اور قومیت کے جوش میں آکر لڑتا ہے، ہم دنیا میں اس کو پوری جزا دے دیتے ہیں اور جو صرف اس لئے اپنی جان قربان کرتا ہے کہ قانون الہی بلند و برتر ہو اور بہترین دل و دماغ اس قرآن کے پابند بن جائیں، تو ہم اسے دائمی زندگی نوازش کریں گے اور مرنے کے بعد بہترین اجر دیں گے۔ دراصل حقیقی اجر و ثواب کا وہی شخص مستحق قرار پاتا ہے جو عین ضرورت کے موقع پر اپنی خدمات پیش کرے۔ ایک جگہ آیا ہے: مَنْ كَانَ يُؤِذِ حَرْثَ الْآخِرَةِ نَذَرْنَاهُ فِي حَرْثِهِ ۚ وَمَنْ كَانَ يُؤِذِ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَالَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ نَصِيبٍ (شوری ۲۰) جو شخص آخرت کی کھیتی کا طالب ہو اس کے لئے ہم اس کی کھیتی میں افزائش کریں گے اور جو دنیا کی کھیتی کا خواستگار ہو اس کو ہم اس میں سے دے دیں گے اور اس کا آخرت میں کچھ حصہ نہ ہو گا۔ دوسرے مقام پر یوں ارشاد ہوتا ہے: مَنْ كَانَ يُؤِذِ الْعَاجِلَةَ عَجَلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا مَذْمُومًا مَذْحُورًا ۝ وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ

فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا ﴿١٨﴾ (بنی اسرائیل ۱۸ تا ۱۹) جو شخص دنیا کی آسودگی کا خواہشمند ہو تو ہم اس میں سے جسے چاہتے ہیں اور جتنا چاہتے ہیں جلد دیدیتے ہیں، پھر اس کے لئے جہنم کو ٹھکانا مقرر کر رکھا ہے جس میں وہ نفیس سن کر اور درگاہ خدا سے راندہ ہو کر داخل ہو گا۔ اور جو شخص آخرت کا خواہشگاہ ہو اور اس میں اتنی کوشش کرے جتنی اسے لائق ہے اور وہ مومن بھی ہو تو ایسے ہی لوگوں کی کوشش ٹھکانے لگتی ہے۔

### استقلال شرط ہے

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا ۚ  
وَاللَّهُ يَحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿٢١﴾ وَمَا كَانَ قَوْلُهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا  
وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿٢٢﴾ قَالَتْهُمْ اللَّهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحَسُنَ ثَوَابُ الْآخِرَةِ ۚ وَاللَّهُ يَحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿٢٣﴾

“اور بہت سے نبی ہو گزرے ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے ربانی لوگ لڑے، پھر اس بنا پر وہ سست نہ ہوئے جو ان کو اللہ کی راہ میں تکلیف پہنچی اور نہ خفیف ہوئے اور نہ عاجز ہوئے اور اللہ صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور ان کی بات اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ کہنے لگے اے ہمارے رب! ہمارے گناہ اور ہمارے کاموں میں ہماری زیادتیاں بخش اور ہمارے قدم جمائے رکھ اور ہمیں کافروں پر نصرت دے۔ سو اللہ نے ان کو دنیا کا بدلہ اور آخرت کا اچھا ثواب دیا اور اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔”

تاریخ کو اٹھا کر دیکھو صدہا، انبیاء اور رسل کو معاندین اسلام کے ساتھ جنگ کرنی پڑی ہے، انہیں سخت تکالیف کا سامنا کرنا پڑا ہے، مگر باوجود ان تمام باتوں کے نہ تو ان کے عزم مصمم میں کسی قسم کی کمزوری آئی نہ انہوں نے بودے پن کا اظہار کیا اور نہ اپنی عارضی شکست کی وجہ سے دشمنوں کے سامنے انہوں نے عاجزی اور ذلت اختیار کی، بلکہ برابر ثابت قدم رہے اور یوں دعا کرتے رہے، خداوند! ہماری غلط کاریوں کی وجہ سے ہمیں شکست نصیب ہوئی ہے تو ہمارے گناہ معاف کر، ہماری زیادتیوں سے درگزر کر، ہمیں ثابت قدمی اور استقلال نوازش کر اور فتح و کامرانی سے بہرہ اندوز کر۔ چنانچہ وہ کامیاب ہو کر رہے۔

تم تو تھوڑی سی تکلیف ہی سے گھبرا گئے، تمہیں بھی ویسا ہی استقلال و ثبات قدم اور عزم راسخ رکھنا چاہئے، بڑی سے بڑی مصیبت میں تمہارے پائے استقامت میں لغزش نہ پیدا ہو اور جہاد فی سبیل اللہ کی خاطر ہر چیز قربان کرنے کو تیار رہو۔

### نصرت الہی کا وعدہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ تَطِيعُوا الَّذِينَ كَفَرُوا يُؤْذِكُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ فَتَنقَلِبُوا خَاسِرِينَ ﴿٢٤﴾ بَلِ اللَّهُ مُوَلِّكُمْ ۖ وَهُوَ  
خَيْرُ الْمُنِيرِينَ ﴿٢٥﴾

”اے ایمان والو، اگر تم نے کافروں کا کہا مانتا تو وہ تم کو اٹے پاؤں لوٹا دیں گے پھر تم ہی نقصان اٹھانے والے ہو جاؤ گے، بلکہ اللہ ہی تمہارا حامی ہے اور وہی سب مددگاروں سے بہتر ہے۔“

کمزور طبیعت کے مسلمانوں نے دیکھا کہ کفار عظیم الشان لشکر کے ساتھ حملہ آور ہوئے ہیں اور مسلمانوں میں ان کے مقابلے کی طاقت نہیں، تو انہوں نے یہی مناسب خیال کیا کہ مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ کر ان کے ہمراہ ہو جانا چاہیے۔ ان سب کے جواب میں یہی کہا گیا کہ اس قسم کے خیالات لغو و مہمل ہیں، کفار و معاندین کی اطاعت و فرماں برداری تمہیں پھر کافر بنا دے گی کہ یہی ان کی دلی آرزو ہے۔ و لایزالون یقاتلونکم حتی یردوکم عن دینکم ان استطاعوا اور یہ لوگ تم سے ہمیشہ جنگ کرتے رہیں گے یہاں تک کہ اگر ان کی طاقت میں ہو تو تمہیں کافر بنا دیں۔

تم ان سے کیوں گھبراتے ہو؟ تمہارا ولی و ناصر اللہ تعالیٰ ہے، تم اس کے نام پر جان دینے کو تیار ہو تو بڑی سے بڑی طاقت بھی تمہارا مقابلہ نہ کر سکے گی اور فرض کرو کہ دنیا کی کوئی حکومت بھی تمہاری مدد کے لئے تیار نہ ہو تو وہ خدائے حق نوازاں کے لئے ملائکہ عظام کو نازل فرما کر ان کافروں کو ذلیل و رسوا کر دے گا۔

سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِأَأْشَرِ كُذَّابٍ لَّهِ مَا لَمْ يَنْزِلْ بِهِ سُلْطَانًا وَمَأْوَاهُمُ النَّارُ وَبِئْسَ مَثْوًى لِلظَّالِمِينَ ۝

”عقرب ہم کافروں کے دلوں میں بہت ڈال دیں گے کیونکہ انہوں نے اللہ کا شریک مانا جس کی اس نے کوئی سند نہیں اتاری اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور ظالم کا ٹھکانا برا ہے۔“

ہم تمہاری بہت کافروں کے دلوں میں ڈال دیں گے اور یہ مدد ایسی ہو گی جو اسباب سے نہیں پیدا ہو سکتی بلکہ یہ کام ملائکہ الرحمن کا ہو گا، اس کی وجہ سے کافروں کے اندر جبن و نامردی، ضعف و کمزوری اور اضمحلال و ناتوانی پیدا ہو جائے گی۔ اس کمزوری کا اصلی سبب یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ کے ساتھ شریک کرتے ہیں۔ سرسبز درخت کی ٹہنی، جنگل کا ہر تنکا، پہاڑ کا ہر پتھر اور قدرت کا ہر منظر ان کو بہت زندہ بنا دیتا ہے۔ پھر جن لوگوں کے ضعف کی یہ کیفیت ہو ان میں قوت کہاں سے آسکتی ہے اور وہ ایک مسلم قانت کے آگے کس طرح ٹھہر سکتے ہیں جو صرف ایک ہی خدا کا پرستار ہے۔ وہ ایک کے آگے جھکتا ہے کہ سب کے سامنے سر بلند ہو۔ توحید ہی وہ چیز ہے جو انسان میں ہمت پیدا کرتی ہے اور فرد واحد کو تمام دنیا کے مقابلے میں کھڑا کر دیتی ہے۔ سورہ یوسف میں ہے: ارباب متفرقون خیر ام الله الواحد القهار، کیا بہت سے خدا بہتر ہیں یا ایک قہار خدا۔

بخاری میں ہے: اعطيت خمسالم يعطهن احد من الانبياء من قبل، نصرت بالرعب مسيرة شهر، وجعلت لي الارض مسجد او طهورا واحلت لي الغنائم واعطيت الشفاعة وكان النبي يبعث الى قومه خاصة وبعثت الى الناس عامة۔ مجھے ایسی پانچ چیزیں دی گئی ہیں کہ اور کسی پیغمبر کو یہ نہیں نوازش کی گئیں۔ ایک ماہ کے فاصلہ پر میرے دشمن

مجھ سے مرعوب ہو جاتے ہیں، تمام زمین میرے لئے سجدہ گاہ اور پاک ہے، مال غنیمت میرے واسطے حلال کیا گیا ہے، شفاعت عامہ مجھے دی گئی اور ہر ایک نبی صرف اپنی قوم کی طرف بھیجا گیا اور میں تمام عالم کی طرف مبعوث ہوا ہوں۔ یہ رعب کوئی فرضی بات نہیں، بلکہ واقعہ ہے جس کے نظائر آج بھی ہر جگہ ملتے ہیں۔ آپ پہلے خود اس جنگ احد ہی کو لیجئے۔ سات سو مسلمانوں نے کفار کے تین ہزار آدمیوں کو پریشان کر دیا۔ وہ لوگ خوف زدہ ہو کر مکہ کی طرف بھاگ گئے، راستے میں انہیں خیال آیا کہ افسوس جب مسلمانوں میں دم نہیں رہا تھا تو انہیں کیوں نہ فنا کر دیا، چنانچہ مدینہ واپس آنے کا انہیں خیال بھی آیا مگر کچھ ایسے مرعوب ہو گئے کہ ہمت نہ پڑی، صرف اتنا کیا کہ ایک بدوی کو کچھ دینے کا وعدہ کیا اگر وہ جا کر مسلمانوں کو ڈرادے۔ رسول اللہ کو بذریعہ وحی کفار کے ارادے کی اطلاع مل گئی تو آپ حمراء الاسد تک ان کے تعاقب میں گئے۔

پھر آپ کو معلوم ہے کہ ابوسفیان اگلے سال اسی میدان میں آنے کا وعدہ کر گیا تھا مگر نہ آیا۔ غزوہ خندق میں دس ہزار لشکر کے باوجود وہ راتوں رات مدینہ سے بھاگ نکلا اور اس کے بعد پھر کفار کو مسلمانوں سے جنگ کرنے کی ہمت نہ پڑی۔

رسول اللہ ﷺ کے بعد یہی امداد و اعانت مسلمانوں کو بھی دی گئی۔ صحابہ کرام کی زندگی کے واقعات اس پر شاہد ہیں۔ آج جبکہ مسلمانوں کا شیرازہ بکھر چکا ہے، یورپ کی سفید رنگ اقوام کو سب سے زیادہ مسلمانوں ہی کا خوف لگا ہوا ہے، وہ ہر وقت پین اسلامزم کے خواب دیکھتے ہیں اور یہی انشاء اللہ قیامت تک رہے گا۔

### ایفاءِ وعدہ

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللَّهُ وَعْدَهُ إِذْ تَحُسُّونَهُم بِآذَانِهِ ۚ حَتَّىٰ إِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأُمْرِ وَوَصَيْتُمْ مَنْ بَعْدَ مَا أَرَكُم مَّا تُحِبُّونَ ۚ مِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَّفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۚ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ ﴿٣٧﴾

”اور اللہ نے اپنا وعدہ یقیناً تم کو سچا کر دکھایا جب تم اس کے حکم سے ان کو کاٹ رہے تھے یہاں تک کہ تم نے نامردی کی اور حکم کے متعلق آپس میں جھگڑا کرنے لگے اور تم نے نافرمانی کی، بعد اس کے کہ اللہ تم کو دکھا چکا تھا جو کچھ تم پسند کرتے تھے، تم میں سے بعض تو دنیا چاہتے تھے اور بعض آخرت کے طلبگار تھے، پھر تم سے ان کو پھیر دیا تاکہ تمہاری جانچ کرے اور بیشک اس نے تمہیں معاف کر دیا اور مسلمانوں پر اللہ بڑے فضل والا ہے۔“

ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی نصرت کا وعدہ کیا تھا تو جنگ احد میں ان کو یہ تکلیف کیوں اٹھانی پڑی؟ اس آیت نے یہ شبہ بھی دور کر دیا اور بتایا کہ وہ وعدہ پورا ہو کر رہا۔ ملائکہ الرحمن نے مدد کی، جنگ شروع ہوتے ہی کفار کے بہت سے آدمی مارے گئے، ان کے نو علم بردار یکے بعد دیگرے قتل ہوئے اور علاوہ ازیں کثرت سے سپاہی

زخمی ہوئے۔ اس قدر فاسامانی کے بعد انہیں بھاگنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نظر نہ آیا۔ یہاں تک کہ ان کی عورتیں اپنی پنڈلیوں سے کپڑا اٹھا کر بھاگیں حتیٰ رایت النساء یشتدون فی الجبل دفعن عن سوقھن قد بدت خلاخلھن۔

کفار کے بھاگنے پر مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا، تیر انداز ایسے موقع پر متعین کئے گئے تھے کہ بھاگنے والی فوج ان کی زد میں تھی اور ان کے تیروں کی بوچھاڑ ان کو فنا کر رہی تھی، ان تیر اندازوں کو دربار رسالت سے یہ حکم مل چکا تھا کہ مسلمانوں کو فتح ہو یا شکست وہ اپنی جگہ نہ چھوڑیں، مگر جب انہوں نے کفار کو بھاگتے دیکھا تو ان کا آپس میں اختلاف ہو گیا اور ان کے دو گروہ بن گئے۔ ایک یہ سمجھتا تھا کہ حکم رسالت اسی وقت تک کے لئے تھا جب تک مسلمانوں کو کامل فتح نہ ہو جائے، ان کا خیال تھا کہ فتح ہو چکی ہے اس لئے ہم بھی مال غنیمت میں حصہ لے سکتے ہیں، مگر امیر جماعت عبد اللہ بن جبیر کا اپنے چند ہم خیالیوں کے ساتھ اسی جگہ رہنے پر اصرار تھا۔ آخر ان میں سے چالیس تیر انداز نیچے اتر آئے اور الغنیمة الغنیمة کہہ کر مال جمع کرنے میں لگ گئے۔ انھی کے لئے فرمایا:

دنوی مال دیکھ کر ان کے دلوں نے کمزوری اور بزدلی کا اظہار کیا۔

رسول اللہ ﷺ کے حکم میں جھگڑا کیا۔

اور بالآخر نافرمانی کر کے نیچے اتر آئے۔

اگرچہ الفاظ عام ہیں مگر دراصل مراد وہی لوگ ہیں۔

مگر اس حقیقت کو فراموش نہ کیجئے کہ یہ لوگ مشکلات و موانع سے تنگ آ کر اپنی جگہ نہیں چھوڑتے، بلکہ کامیابی ہو جاتی ہے، خدا کا وعدہ پورا ہو چکتا ہے اور کفار بھاگنا شروع کر دیتے ہیں، تب جا کر تیر اندازوں میں جھگڑا شروع ہوتا ہے۔ اس قدر تفصیل کے بعد اب آپ آیت کو دیکھ لیجئے۔ اس میں بتایا جاتا ہے کہ جب تم نے رسول اللہ کی حکم کی نافرمانی کی تو تم کو ان سے ہٹا دیا کہ اب خدائے قدوس تمہیں امتحان میں مبتلا کرے اور اس کی صورت یہ ہوئی کہ جب کفار نے تیر اندازوں کی جگہ کو خالی پایا اور ان کی زد سے محفوظ ہو گئے تو لوٹ کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے۔ یہی ابتلا تھا، اس کا مقصد یہ تھا کہ تم میں جو بہترین افراد ہیں ان کے فضائل و کمالات کا اظہار ہو اور دنیا دیکھ لے کہ رسول اللہ سے بہتر کسی کو جاں نثار اور فداکار نصیب نہیں ہوئے۔

کفار کا نشانہ رسول اللہ کی ذات اقدس تھی، اس لئے صحابہ کرام کی ایک جماعت فوراً آپ کے گرد و پیش جمع ہو گئی، دشمن تیر پر تیر چلاتے ہیں، مگر کیا مجال ہے کہ ایک مسلمان بھی اپنی جان بچانے کی خاطر وہاں سے ہٹ جائے۔ ایک آہنی دیوار ہے کہ اپنی جگہ پر قائم ہے۔ ایک شخص تلوار کا وار کرتا ہے تو طلحہ اپنا ہاتھ کٹوا لیتے ہیں، مگر اس ذات قدس پر آنچ نہیں آنے دیتے۔ ابن قمر آگے بڑھتا ہے کہ آپ کو شہید کر دے، مصعب بن عمیر علم بردار درمیان میں حائل ہو جاتے ہیں اور خود شہید ہو کر آپ پر جان نثار کر دیتے ہیں۔ ابو دجانہ کفار کی جانب پشت کئے کھڑے ہیں کہ اس وجود

مقدس کے لئے ڈھال بن جائیں جو تیران کو لگتا ہے وہ نکال کر اپنے ہمراہی کو دیتے ہیں کہ اسی سے دشمن کو نشانہ بنایا جائے، اللہ اکبر!

اگر یہ مصیبت نہ آتی اور کفار یوں رسول اللہ پر حملہ نہ کرتے تو صحابہ کرام کی خوبیوں کا دنیا کو کیا پتہ لگتا۔ یہ قصور تو محض تیر اندازوں کا تھا جن کی غلطی سے تمام فوج میں ایک پریشانی سی پیدا ہو گئی۔ بعض لوگ جن کی تعداد نہایت قلیل تھی، دشمن کے حملے کی وجہ سے بھاگ گئے۔ ادھر مسلمانوں نے اس وجود اقدس کے گرد جمع ہو کر بہادری کی جو ہر دکھائے تو یہ غلطی اگرچہ نہایت ہی شدید اور مسلمانوں کے فنا کرنے کو کافی تھی، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو بچا لیا اور ان کے گناہوں کو بخش دیا اور اب کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں کہ ان بزرگان امت پر لب کشائی کرے۔

فساد عظیم کی روک تھام

مسلمان اپنی فتح و کامرانی سے فائدہ نہ اٹھا سکے اور ان میں سے بعض نے بھاگنا شروع کر دیا۔ اب اندیشہ تھا کہ جنگ سے فارغ ہونے کے بعد خود مسلمانوں میں کہیں جھگڑا شروع نہ ہو جائے، کیونکہ وہ ضرور اس امر پر بحث کریں گے کہ اس مصیبت کے باعث کون کون لوگ تھے۔ ہر ایک دوسرے کو ملزم بنانے کی کوشش کرے گا، اسی میں قوت انتقام صرف ہو کر خانہ جنگی تک نوبت پہنچ سکتی ہے، اس فساد عظیم کے روکنے کے لئے ان کی توجہ کو بالکل دوسری جانب پھیر دیا اور وہ اس قصہ ہی کو بھول گئے۔

إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلَوْنَهَا عَلَىٰ أَحَدٍ ۚ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي أَخْرَاجِكُمْ فَأَتَابَكُمْ عُنَافٍ يَغِيبُ لِكَيْ لَا تَحْزَنُوا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَا أَصَابَكُمْ ۗ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿٥٠﴾

”جب تم چڑھے چلے جاتے تھے اور مڑ کر بھی کسی کو نہ دیکھتے تھے اور رسول تم کو تمہارے پیچھے بلاتا تھا تو اللہ نے تم کو اس رنج دینے کے بدلے میں دوسرا غم پہنچایا تاکہ تم غم نہ کرو، اس پر جو تمہارے ہاتھ سے جاتا رہا اور نہ اس مصیبت پر جو تم کو پہنچی اور جو تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔“

کفار نے نہایت شدت سے مسلمانوں پر حملہ کیا، اب یہ لوگ کفار کا تعاقب کرنے کی بجائے خود اپنی مصیبت میں گرفتار ہو گئے۔ بے ترتیب اور منتشر ہونے کی وجہ سے ہر ایک کو اپنی اپنی فکر تھی، بھاگا جاتا تھا اور کسی کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھتا تھا، جب رسول اللہ نے یہ حالت دیکھی تو آپ نے ان کو جمع کرنے کے لئے فرمایا: اٰلِی عِبَادِ اللّٰہِ اِنِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ کے بندو میں اللہ کا رسول ہوں، میری طرف آؤ۔

غور کیجئے دشمن آپ کو فنا کرنا چاہتا ہے، مسلمان پریشان ہو کر منتشر ہو چکے ہیں، مگر رسول اللہ ان تمام مشکلات کی مطلقاً پروا نہیں کرتے اور تمام مسلمانوں کو جمع کرنے کے لئے بلند آواز سے پکارتے ہیں۔ جس پر تمام صحابہ کرام آپ کے گرد جمع ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ غزوہ حنین میں بھی آپ نے ایسی ہی شجاعت کا اظہار کیا ہے۔ مسلمان بھاگے جا رہے ہیں

اور آپ دشمن کی صف کی طرف بڑھ کر یہ ارشاد فرماتے ہیں۔

انا النبی لا کذب،

میں حقیقت میں خدا کا فرستادہ ہوں۔ اور نبی کے لئے ناممکن ہے کہ وہ میدان جنگ سے ایک انچ بھی ہٹ جائے، جھوٹے لوگ ایسے مواقع میں راہ فرار اختیار کرتے ہیں۔

انا ابن عبدالمطلب!

میں عبدالمطلب کی اولاد میں سے ہوں، جس کی شجاعت و بسالت سے عرب کا بچہ بچہ واقف ہے، ایسے اعلیٰ ترین خاندان کا فرزند ان مشکلات و موانع میں کبھی بھاگ نہیں سکتا، بلکہ یہی میدان جنگ اس کے کمالات و فضائل قومی کے اظہار کا بہترین محل ہے۔

اس سے آپ بتانا چاہتے ہیں کہ آپ کا یہ طرز عمل حکام فوج کے لئے ایک اسوہ حسنہ ہے کہ ان کو کس قدر جاں باز ہونا چاہئے۔ وہ اپنے آپ کو سب سے آگے رکھیں تاکہ سپاہیوں میں ہمت اور جوش پیدا ہو۔

جب رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو آوازدی تو کفار نے آپ کو پہچان لیا اور اپنے تیروں کا رخ آپ کی جانب پھیر دیا، ابھی مسلمان آپ کے گرد و پیش جمع بھی نہ ہو سکے تھے کہ آپ سخت زخمی ہو کر خندق میں گر گئے، اتنے میں فرزند ان اسلام بھی آپ کے گرد احاطہ باندھ کر بنیان مروض بن گئے۔

مسلمانوں کو پہلے تو یہ غم تھا کہ دشمن ہمارے تعاقب سے بچ گیا اور مال غنیمت وصول نہ ہو سکا، مگر اب جو رسول اللہ کی یہ حالت دیکھی تو وہ اپنا غم تو بھول گئے، تمام تکلیفیں اور مصیبتیں فراموش ہو گئیں اور آپ کی مصیبت ان سب پر غالب آگئی۔ وہ حیران تھے کہ یہ کیا ہو گیا۔ ایک عورت کو خبر دی گئی کہ اس کا والد، اس کا بیٹا اور اس کا خاوند، تینوں اس جنگ میں شہید ہو گئے ہیں، اس نے ان تمام باتوں کے جواب میں صرف اتنا پوچھا کہ بتاؤ رسول اللہ کا کیا حال ہے؟ لوگوں نے کہا وہ خیریت سے ہیں، اس پر وہ بول اٹھی:

کل مصیبة بعدک جلد!

آپ زندہ ہیں تو کچھ پروا نہیں یہ تمام مصیبتیں بچ ہیں۔

جب مدینہ کی عورتوں کو یہ اطلاع مل گئی کہ آپ زندہ ہیں تو انہوں نے اپنے خاوندوں، بیٹوں اور بھائیوں کی وفات پر ذرہ برابر بھی اظہار رنج نہ کیا۔ سچ ہے: لایومن احدکم حق اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین، جب تک ایک مسلمان مجھے سب سے زیادہ عزیز و محبوب نہ رکھے یہاں تک کہ وہ میرے مقابلہ میں اپنی اولاد تک کی پروا نہ کرے اس کا ایمان کامل نہیں ہو سکتا اور صحابہ نے اپنے طرز عمل سے اس کامل ایمان کو ظاہر کر دیا۔



اس غم کا نازل کرنا ضروری تھا تا کہ تمہیں اس بات کا افسوس نہ رہے کہ مال غنیمت ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ دشمن کا تعاقب نہ کر سکے اور یہ سب کچھ فلاں فلاں لوگوں کی نافرمانی کا نتیجہ تھا۔ اب تم اس تمام قصے کو بھول گئے اور لگے اس غم میں گھٹنے کہ ہماری بے خبری میں رسول اللہ زخمی ہو گئے۔

## نزول اطمینان

ثُمَّ انْزِلْ عَلَيْنَا مِّنْ بَعْدِ النِّعَمِ اَمْنَةً نَّحَاسًا يَّغْشَى طَائِفَةً مِّنْكُمْ \*

”پھر اللہ نے غم کے بعد تم پر امن نازل کیا یعنی اونگھ جو تم سے ایک گروہ کو ڈھانک رہی تھی۔“

رسول اللہ کی آواز سنتے ہی مسلمان آپ کے گرد و پیش جمع ہو گئے۔ کفار نے یہ اجتماع دیکھا تو پریشان ہو کر گھر کی راہ لی اور صحابہ کرام اسی جگہ میدان جنگ ہی میں رہ گئے، بلکہ ان کے اطمینان و سکینت قلب کی یہ کیفیت تھی کہ ان پر اونگھ طاری ہو گئی۔ بخاری میں ابو طلحہ سے روایت ہے: غشینا ونحن فی مصافنا یوم احد فجعل سیفی یسقط من یدی و اخذھو یسقط فاحذہ۔ جنگ احد میں عین لڑائی کے وقت ہم پر اونگھ طاری ہو گئی، میری تلوار بار بار میرے ہاتھ سے گرتی تھی اور بار بار میں اسے اٹھاتا تھا۔ زبیر بن العوام کہتے ہیں: رفعت راسی یوم احد فجعلت انظرو ما منھم من احد الا وھو یبیل تحت حفتھ من النعاس میں نے جنگ احد میں اپنی نظر جو اوپر کی تو کیا دیکھا ہوں کہ ہر ایک مسلمان اونگھ کے مارے جھکا جاتا ہے۔ یہ آیت بتا چرہی ہے کہ مسلمانوں کو تکلیف تو ہوئی، مگر شکست نہیں ہوئی کیونکہ میدان جنگ میں رہنا، دشمن کا بھاگ جانا اور اس قدر اطمینان کا ہونا کہ تلوار بھی زمین پر گر پڑے ظاہر کرتا ہے کہ انہیں دشمن کا کوئی خوف نہ تھا، خوف کے وقت نیند نہیں آسکتی۔

وَ طَائِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ يَقُولُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّہٗ لِلّٰهِ يَخْشَوْنَ فِيْ اَنْفُسِهِمْ مَا لَا يُنْبِئُوْنَ لَكَ يَقُولُوْنَ لَوْ كُنَّا نَعْلَمُ مَا قَاتِلْنَا لَهٰذَا قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَیْھِمْ الْقَتْلُ اِلٰی مَضَاجِعِهِمْ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُبَيِّنَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿٥٠﴾

”اور ایک گروہ کو اپنی جان کی پڑی ہوئی تھی وہ اللہ سے ناحق بد گمانیاں جاہلیت کی سی بد گمانیاں کرتے تھے۔ کہتے تھے کیا ہمارے اختیار میں کوئی بات ہے، کہہ دو کہ سب کام اللہ ہی کے اختیار ہے، وہ اپنے دلوں میں وہ باتیں چھپاتے ہیں جو تجھ پر ظاہر نہیں کرتے کہتے ہیں کہ اگر ہمارا کچھ بھی اختیار ہوتا تو ہم یہاں قتل نہ کئے جاتے، کہہ دو کہ اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو وہ لوگ جن کے لئے مقتول ہونا لکھا جا چکا تھا ضرور اپنے بچھڑنے کی جگہ آ نکلتے اور تا کہ اللہ ظاہر کر ائے جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے اور جو خیالات تمہارے دلوں میں ہیں ان کو نکھار دے اور اللہ سینوں کی بات سے واقف ہے۔“

ایک گروہ مسلمانوں کا تھا جس کے ایمان کا تذکرہ پہلے آچکا ہے۔ یہ دوسری جماعت منافقین کی ہے جو عبد اللہ بن ابی



کے ساتھ راستہ ہی سے واپس لوٹ آئی تھی۔ جب ان بد بختوں کو معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو اس جنگ میں تکلیف اٹھانی پڑی اور خود رسول اللہ بھی سخت زخمی ہو گئے، تو اب یہ لگے کفار و مشرکین کی طرح بکواس کرنے کہ اگر یہ رسول واقعی خدا کی طرف سے ہوتے تو اس قدر مصیبت ان لوگوں پر کیوں آتی۔ ان کے اس قسم کے طعنوں کا ذکر سورہ فتح میں بھی کیا گیا ہے: **بَلْ فَتَنَّاكُمْ أَنْ لَنْ يَنْتَقِلَ الْرَّسُولُ وَالْمُؤْمِنُونَ إِلَىٰ أَهْلِيهِمْ أَبَدًا** (الفتح ۱۲) بات یہ ہے کہ تم لوگ یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ پیغمبر اور مومن اپنے اہل و عیال میں کبھی لوٹ کر آنے ہی کے نہیں۔

پھر اس پر قناعت نہ کی، بلکہ اب انہیں اپنے مشوروں کی اہمیت یاد آگئی اور کہنے لگے کہ اس وقت ہماری رائے کی طرف کسی نے توجہ تک نہ کی تھی، اگر اس پر عمل ہوتا اور شہر کے اندر رہ کر جنگ کی جاتی تو اپنے مسلمان بھی شہید نہ ہوتے اور اس قدر نقصان بھی برداشت نہ کرنا پڑتا۔ نوجوانوں کی رائے پر عمل کرنے کے یہی نتائج ہوا کرتے ہیں۔

ان بکواس کرنے والوں کو یہ جواب دیا گیا کہ تمہیں اپنے مشوروں پر زور دینے کا کوئی حق حاصل نہیں، مسلمانوں کی فداکاری و سرفروشی کی تو یہ کیفیت ہے کہ وہ ہر وقت جاں نثاری کے لئے موجود ہیں، اگر مدینہ میں رہ کر جنگ ہوتی جب بھی وہ ضرور گھروں سے باہر نکل کر میدان قتال میں آتے اور اسلام کی خاطر سربکف کوشش کر کے شہید ہو جاتے، ان کے لئے مدینہ اور احد کے میدان برابر ہیں۔ تم ان کے شہید ہونے پر کس لئے اظہار افسوس کر رہے ہو۔ موت سے بھاگنا اور اس سے بچنے کے لئے تدبیریں پیش کرنا سخت بزدلی اور نامردی ہے۔ ایک مسلم کی شان تو یہ ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ کا نام سنتے ہی فوراً میدان جنگ میں حاضر ہو اور ہر گز پس و پیش نہ کرے۔

ان باتوں نے تمہیں تو کوئی فائدہ نہ پہنچایا، البتہ دو باتیں ظاہر ہو گئیں اور انھی کو اللہ تعالیٰ بھی ظاہر کرنا چاہتا تھا: (الف) جن کے دلوں میں نفاق اور کھوٹ ہے وہ نمایاں ہو جائیں اور ہر شخص ان بد بختوں کو اصلی صورت میں شناخت کر سکے۔

(ب) جن ارباب ایمان و اخلاص کے دلوں میں کچھ کمزوری ہے وہ ان تکالیف و شدائد کی وجہ سے دور ہو جائے۔

## معنی خیر حقیقت

یہاں تک دو جماعتوں کا ذکر ہوا، اب تیسرے گروہ کا تذکرہ آتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَنْجَنُ ۚ إِنَّهُمْ اسْتَرْزَلَهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا ۚ وَلَقَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿١٥٥﴾

”جن لوگوں نے اس روز تم سے پشت پھیری جس دن کہ دو جماعتیں بھڑ گئیں تو ان کو فقط شیطان نے پھسلانا چاہا اس کے کسی حصہ کی وجہ سے جو انہوں نے کمایا اور بیشک اللہ ان کو معاف کر چکا بیشک اللہ بخشنے والا بردبار ہے۔“  
ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ جب تیر اندازوں نے اپنی جگہ چھوڑ دی تو کفار نے اپنی مجتمع قوت سے مسلمانوں پر حملہ کیا۔

یہ چونکہ کافروں کا تعاقب کر رہے تھے اور ادھر ادھر پر اگندہ ہو چکے تھے، اس لئے ان کے مقابلے کی تاب نہ لاسکے۔ رسول اللہ ﷺ نے بلند آواز سے پکارا کہ تمام جمع ہو جائیں، مگر اس پریشانی کے عالم میں سب کا اجتماع غیر ممکن تھا۔ چنانچہ کچھ تو ایسے تھے جو فوج سے الگ ہو گئے اور اب ان کے لئے مرکز کے ساتھ اتحاد رکھنا مشکل ہو گیا اور بعض وہ بھی تھے جو بھاگ کھڑے ہوئے۔

بھاگنے کے اسباب کو قرآن ہی نے خود بیان کر دیا ہے اور وہ تیر اندازوں کا اپنی جگہ کو چھوڑ دینا، رسول اللہ کے ارشاد کی تعمیل نہ کرنا اور مال غنیمت میں مصروف ہو جانا تھا، اسی ذلت کو شیطان کی طرف منسوب کیا گیا ہے، اسی کی وجہ سے یہ تمام مصیبت آئی اور بعض لوگ بھاگ جانے پر مجبور ہوئے۔

یہ تو تسلیم شدہ امر ہے کہ جنگ احد میں مسلمان بھاگے ہیں۔ اب یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں جن کا جواب دینا ہمارا فرض ہے:

(۱) بھاگنے والوں کی تعداد کتنی تھی؟

(۲) کون کون لوگ بھاگے تھے؟

اسی ترتیب سے ان کا جواب ملاحظہ ہو۔

بھاگنے والوں کی تعداد

اس سوال کے جواب میں روایات، بیحد مختلف ہیں۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ فوج کا تیسرا حصہ بھاگ گیا تھا۔ ایک تہائی زخموں سے چور چور تھا اور صرف تیسرا حصہ میدان جنگ میں رسول اللہ کے گرد و پیش کھڑا تھا، مگر اس روایت کا مدعا صرف یہ ہے کہ لشکر اسلام میں تین غیر مساوی گروہ ہو گئے تھے۔ بہت ہی قلیل جماعت وہ تھی جو مدینہ کو بھاگ گئے اور جس کی تعداد مختلف روایات پر غور کرنے سے آٹھ نوے سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی۔ دوسرا وہ گروہ تھا جو زخمی ہو گیا۔ اس کی ٹھیک تعداد تو معین نہیں کی جاسکتی، مگر غالباً سو کے اندر ہی اندر تھی، لہذا ثابت قدم گروہ چھ سو کے قریب قریب تھا، کیونکہ مسلمانوں کا لشکر صرف سات سو نفوس پر مشتمل تھا۔ اگر دو سو آدمی آپ کے ساتھ میدان میں رہ جاتے تو ناممکن تھا کہ کفار یوں میدان چھوڑ کر گھر کی راہ لیتے اور مسلمان ثابت قدم رہ سکتے۔ ایک دوسری روایت ہمیں بتاتی ہے کہ سرور عالم کے ساتھ گیارہ جاں نثار موجود ہیں، جن میں ابو بکر، علی، عبد الرحمن بن عوف، ابو عبیدہ بن الجراح، حباب بن المنذر، سعد بن ابی وقاص، زبیر بن العوام، ابو دجانہ اور طلحہ کے نام خصوصیت سے معلوم ہیں۔ یہ روایت قابل تسلیم ہے مگر اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ فدائے اسلام پہلی ہی صدا پر شمع رسالت کے گرد جمع ہو گئے تھے۔

قتال کی روایت بھی ہماری تائید کرتی ہے: والذین تدل علیہ الاخبار فی الجبلۃ ان نفرا منهم تولوا و ابعد وافہنم من دخل المدینۃ او منهم من ذهب الی سائر الجوانب و اما الاکثرون فانہم نزلوا عند الجبل و اجتمعوا ہناک۔ روایات سے

یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ بھاگے تھے پھر بعض تو مدینہ میں جادا خل ہوئے اور کچھ دوسری طرف چلے گئے، مگر اکثر وہیں دامن کوہ میں جمع ہو گئے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ بھاگنے والوں کی تعداد نو سے کسی طرح بھی زیادہ نہیں، کیونکہ نفر کا اطلاق عربی میں تین سے نو تک پر آتا ہے۔

کون لوگ بھاگے ہیں

راویات میں کثرت سے حضرت عثمان، سعد انصاری اور عقبہ انصاری کے نام لیے جاتے ہیں۔ بعض لوگ حضرت عمر کو بھی بھاگنے والوں میں شمار کرتے ہیں، مگر یہ غلط ہے اور بخاری کی حسب ذیل روایت بیاں دہل اس کی تردید کرتی ہے۔

عن البراء قال القينا المشركين يومئذ واجلس النبي جيشا من الرماة وامر عليهم عبد الله وقال لا تبرحوا ان رأيتمونا ظهرنا عليهم تبركا جواوان رأيتموهم ظهورا علينا فلا تعينونا فلما لقينا هربوا حتى رأيت النساء يشتردن في الجبل رعن عن سوقهن قد بدت خلاخلهن فاخذوا يقولون الغنيمية، الغنيمية فقال عبد الله عهد الى النبي ان لا تبرحوا فابوا فلما ابوا احرف وجوههم فاصيب سبعون قتिला، واشرف ابوسفيان فقال اني القوم محمدا فقال لا تجيبوه فقال اني القوم ابن ابي قحافة قال لا تجيبوه فقال اني القوم ابن الخطاب فقال هو لاعتقلوا فلو كانوا احياء لا جابوا فلم يملك عمر نفسه فقال كذبت يا عدو الله ابقى الله عليك ما يخزيك، قال ابوسفيان اعل هبل، فقال النبي اجيبوه قالوا اما نقول قال قولوا الله مولانا ولا مولى لكم قال ابوسفيان يوم يوم بدر والحرب سحبال وتجدون مثله لم امرت بها ولم تسوني۔

”برابر کہتے ہیں کہ جنگ احد میں رسول اللہ نے عبد اللہ بن جبیر کی سرکردگی میں تیر اندازوں کو ایک مورچہ پر مقرر کر کے فرما دیا کہ ہماری فتح و شکست سے تمہیں کوئی بحث نہیں، تم اپنی جگہ نہ چھوڑنا، لڑائی ہوئی تو کفار بھاگ کھڑے ہوئے ان کی عورتیں پنڈلیوں سے کپڑا اٹھائے ہوئے پہاڑوں میں دوڑ رہی تھیں، اب تیر انداز غنیمت کہہ کر مورچے کو خالی کرنے لگے تو عبد اللہ نے انہیں روکا جب وہ باز نہ آئے تو اب خود مسلمانوں پر مصیبت آگئی اور ہمارے ستر آدمی شہید ہو گئے اور ابوسفيان نے پہاڑ پر چڑھ کر رسول اللہ ﷺ، ابو بکر اور عمر کو آواز دی، مگر رسول اللہ نے ہر سوال کے جواب میں یہی ارشاد فرمایا کہ مت جواب دو، جواب نہ ملنے پر اس نے کہا کہ سب لوگ مر گئے، اگر زندہ ہوتے تو ضرور جواب دیتے اس پر حضرت عمر کو طیش آگیا، انہوں نے کہا او خدا کے دشمن تمہیں ذلیل کرنے کے لئے ہم سب زندہ ہیں۔ ابوسفیان نے اب بت ہبل کی جے پکاری تو آپ نے فرمایا تم اللہ کی جے پکارو، جب اس نے کہا: لانا العزی ولا عزی لكم تو آپ نے صحابہ سے فرمایا تم اس کا یہ جواب دو کہ ہمارا ولی و ناصر اللہ ہے اور تمہارا تو کوئی ولی نہیں۔ ابوسفیان نے کہا یہ جنگ بدر کا جواب ہے اور جنگ میں ایسا ہوا ہی کرتا ہے، کبھی ایک فاتح کبھی دوسرا، تم بعض لوگوں کو مشلہ دیکھو گے میں نے اس کا حکم تو نہیں دیا مگر کچھ برا بھی نہیں معلوم ہوتا۔“

یہ طویل روایت تمہارے سامنے ہے جو اس امر کا اعلان کر رہی ہے کہ حضرت عمرؓ ہر گز میدان جنگ سے نہیں بھاگے، بلکہ برابر اسی جگہ جمع رہے اور ابوسفیان کی ہرزہ سرائیوں کا جواب دیتے رہے۔ بخاری کی اس روایت کے بعد کسی منصف مزاج مسلمان کو جائز نہیں کہ وہ فاروق اعظم کی شان میں گستاخی کرے۔

البتہ ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ حضرت عثمانؓ بھاگے ہیں۔ اسی وجہ سے شیعوں نے ان پر طعن کیا ہے اور ان کو مستحق خلافت تصور نہیں کرتے، مگر جس وقت خود لسان الہی ان کے جرم سے درگزر کرتی ہے پھر کس کو حق ہے کہ ان کی شان میں زبان درازی کرے۔ ادھر جمہور امت کا قاطبہ یہی فیصلہ ہے کہ خلافت کے لئے معصوم ہونا شرط نہیں اور اس الزام کا بہترین جواب تو وہ ہے جو حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے دیا ہے، وہو ہذا:

عن عثمان بن وہب قال جاء رجل حج البيت فرأى قوما جلوسا فقال من هؤلاء القعود قالوا هؤلاء عقرش قال من الشيخ قالوا ابن عرفتاه فقال اني سائلك عن شيء اتحدثني قال انشدك بحممة هذا البيت اتعلم ان عثمان بن عفان فر يوم احد قال نعم قال فتعلمه تغيب عن بدر فلم يشهد ها قال نعم فكبر قال ابن عمر تعال لآخبرك ولا بين لك عما سالتني عنه اما فرار يوم احد فاشهد ان الله عفا عنه واما تغيبه عن بدر فانه كان تحته بنت رسول الله وكانت مريضة فقال له النبي ان لك اجر رجل ممن شهد بدرًا وسهبه واما تغيبه عن بيعة الرضوان فانه لو كان احدا اعز بطن مكة من عثمان بن عفان لبعثه مكانه فبعث عثمان وكان بيعة الرضوان بعد ما ذهب عثمان الى مكة فقال النبي بيده اليبس هذ يد عثمان فضرب بها على يدك فقال هذ لعثمان اذهب بهذا الان معك (بخاری غزوہ احد)

“عثمان بن وہب کہتے ہیں کہ ایک شخص حج کی غرض سے مکہ میں آیا تو اس نے بیت اللہ میں ایک مجمع کو دیکھ کر پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ جواب ملا کہ قریش ہیں۔ پھر اس نے پوچھا کہ ان میں شیخ کون ہے؟ کہا عبد اللہ بن عمر تو وہ ان کے پاس گیا اور بیت اللہ کی حرمت کا واسطہ دے کر ان سے پوچھنے لگا کیا عثمان جنگ احد سے بھاگے تھے؟ انہوں نے کہا ہاں، پھر اس نے پوچھا کہ وہ جنگ بدر اور بیعت رضوان میں بھی شریک نہیں ہوئے حضرت عبد اللہ نے ہر ایک سوال کا جواب اثبات میں دیا تو اس نے زور سے تکبیر کہی۔ حضرت عبد اللہ نے کہا یہاں آؤ میں تمہیں ہر ایک بات کا اطمینان بخش جواب دوں۔ غزوہ احد سے وہ بھاگے تو خدا کی قسم ان کی غلطی معاف کر دی گئی۔ غزوہ بدر میں خود سرور کائنات نے ان سے فرما دیا تھا کہ میری صابری صابری کی خبر گیری کرو جو ان کے نکاح میں تھیں اور بیمار تھیں، تمہیں وہی اجر مال غنیمت کا حصہ ملے گا جو دوسروں کو ملے گا، رہا بیعت رضوان کی عدم شرکت تو اس کا قصہ یہ ہے کہ اگر مکہ والوں کے نزدیک ان سے زیادہ کوئی اور شخص معزز و خاندانی ہو تا تو رسول اللہ ضرور اسی کو بھیجتے، مگر ایسا کوئی نہ تھا اس لئے آپ نے عثمان ہی کو بھیجا اور ان کی غیر حاضری میں یہ بیعت ہوئی آپ نے اپنے ایک ہاتھ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ یہ عثمان کا ہاتھ ہے اور اس کو بائیں ہاتھ پر رکھ کر فرمایا کہ یہ عثمان کی طرف سے بیعت ہو گئی۔ اس قدر تفصیل کے بعد اب حضرت عبد اللہ نے سائل سے کہا کہ اب تم جاسکتے ہو۔“

اس تمام روایت کا حاصل یہ ہے کہ یزید بن بشر سسکی فریضہ حج ادا کرنے کے بعد مکہ میں داخل ہوتا ہے اور حضرت عبداللہ بن عمر سے حسب ذیل سوال کرتا ہے۔

(۱) کیا عثمان جنگ احد سے بھاگ گئے تھے؟

(۲) کیا وہ غزوہ بدر میں شریک نہیں تھے؟

(۳) کیا وہ بیعت الرضوان کے وقت موجود نہ تھے؟

وہ ان تینوں سوالوں کا جواب اثبات میں دیکر ان کی تفصیل یوں فرماتے ہیں:

(۱) وہ بھاگے ضرور مگر خدا نے ان کے جرم کو معاف کر دیا۔

(۲) غزوہ بدر میں شرکت اس لئے نہیں کی کہ خود رسول اللہ ﷺ نے حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کی تیمارداری کا انہیں حکم دیا تھا اور یہ بھی فرما دیا تھا کہ تمہیں اجر و ثواب بدریوں کا سا ملے گا۔

گر طمع خواہد زمن سلطان دیں

خاک بر فرق قناعت بعد ازیں!

(۳) بیعت الرضوان کی عدم شرکت اس لئے تھی کہ آپ کفار قریش کو سمجھانے کے لئے سفیر بنا کر بھیجے گئے تھے اور آپ ہی کی کفار کے ہاتھوں مقتول یا محبوس ہونے کی مشتبہ خبر سن کر رسول اللہ نے صحابہ کرام سے بیعت رضوان لی۔ پس اس بیعت کے اصلی سبب خود حضرت عثمان ہی تھے۔

خداوند تعالیٰ کے معاف فرمادینے کے بعد کوئی طعن و تعریض ان بزرگوں پر ہرگز نہ ہونا چاہئے اور اس کے ساتھ ہی یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ان بزرگوں کا بھانگنا رسول اللہ ﷺ کی خبر وفات سننے کے بعد ہوا تھا، جس کا یہ مطلب بھی قرار دیا جاسکتا ہے کہ ان لوگوں کو اب یہ خطرہ پیدا ہونا امر طبعی تھا کہ کفار کیا عجب ہے جو اب مدینہ کا رخ کریں اور مسلمانوں مسلمانوں کی عورتوں اور بچوں کو بھی تلوار کے گھاٹ اتارنے لگیں۔

گو قوانین جنگ کی رو سے رسول اللہ کی خبر وفات پر یقین کرنا اور یوں اپنے لشکر سے الگ ہو جانا ایک غلطی تھی، مگر ظاہر ہے کہ اس غلطی کے مرتکب کو وہ الزام نہیں دیا جاسکتا جو جہاد سے فرار کرنے والوں کے لئے مخصوص ہے۔

صرف حسرت باقی ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتُكُونُوا كَالَّذِينَ كَفَرُوا وَقَالُوا لَا خَافُوا مِنْهُمْ إِذَا مَرُّوا فِي الْأَرْضِ أَوْ كَانُوا غُزًى لَوْ كَانُوا عِنْدَنَا مَا مَاتُوا وَمَا قُتِلُوا ۚ لِيَجْعَلَ اللَّهُ ذَلِكَ حَسْمَةً فَنِعْ قُلُوبُهُمْ ۖ وَاللَّهُ يُخَيِّ وَيُيَسِّتُ ۖ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٥٧﴾

”اے مسلمانو! ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو کافر ہوئے اور اپنے بھائیوں کی نسبت کہتے ہیں جب وہ زمین میں سفر کو نکلتے ہیں یا جہاد کرتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے، تو نہ مرتے اور نہ قتل ہوتے، تاکہ اللہ اس کو ان کے دلوں میں

حسرت بتائے اور اللہ ہی جلاتا اور مارتا ہے اور جو کچھ بھی تم کر رہے ہو اللہ دیکھ رہا ہے۔

گزشتہ آیت میں منافقین کا یہ قول نقل کیا گیا تھا: لو کان لنا من الامر شیء ما قتلناھنہا، ممکن ہے ان باتوں کے سننے سے کبھی کسی وقت مسلمانوں کے دلوں میں بھی ایسے لغو خیالات آنے لگیں، اس لئے ان سے کہا گیا کہ یہ بالکل بے سرو پا باتیں ہیں۔

منافقین کہتے ہیں کہ اگر ہمارے وہ رشتہ دار جو جنگ میں مارے گئے ہیں ہمارے ہی پاس رہتے، لڑائی میں شریک نہ ہوتے اور ہماری ہی طرح انکار کر دیتے تو ان پر یہ مصیبت نہ آتی۔ ظاہر ہے کہ جو کچھ ہونا تھا وہ ہو گیا، البتہ ایک حسرت ہے جو ان کے دلوں میں باقی رہ گئی ہے۔ اس کا غم انہیں زندگی بھر رہے گا اور اسی میں گھل گھل کر مر جائیں گے۔

اصل بات یہ ہے کہ زندگی اور موت کا رشتہ فقط خداوند قدوس کے ہاتھ میں ہے، اس کے سوا کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی یہ اختیار نہیں رکھتی، اگر تمام مادی اور جسمانی قوتیں بھی کام کرنے سے رک جائیں، پھر بھی اللہ تعالیٰ روحانی قوتوں کی مدد سے ہمیں زندگی نوازش کر سکتا ہے۔ جب حالت یہ ہے تو پھر زندگی اور موت کے جھگڑے میں ایک مسلمان کو پڑنے کی کیا ضرورت ہے، اسے تو ہمیشہ اپنے آپ کو اللہ کے پاک نام پر قربان کرنے کو تیار رکھنا چاہئے۔

وَلَیِّنْ قَتَلْتُمْ فِی سَبِیلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لِمَغْفِرَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٍ خَیْرِ مِمَّا یَجْمَعُونَ ﴿۳۷﴾ وَلَیِّنْ مُّتُّمْ اَوْ قَتَلْتُمْ لَا اِلٰی اللّٰهِ تُحْشَرُونَ ﴿۳۸﴾

“اور اگر تم اللہ کی راہ میں قتل کئے جاؤ یا مر جاؤ تو اللہ کی بخشش اور مہربانی یقیناً اس سے بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں اور اگر تم مر جاؤ یا قتل کئے جاؤ بیشک اللہ ہی کے پاس جمع کئے جاؤ گے۔”

مسلمانوں سے پھر کہا جاتا ہے کہ مال و دولت ساتھ جانے والی چیزیں نہیں، ان سے کہیں زیادہ یہ بہتر ہے کہ تم اللہ کی راہ میں قانون الہی کے بلند کرنے اور اسلامی فضیلت و برتری قائم کرنے میں جانیں لڑاؤ، جہاد کرتے کرتے شہید ہو جاؤ، یا مقصد حیات ادا کرتے اپنی طبعی موت سے مر جاؤ، ہر صورت میں اللہ کی رحمت اور مغفرت تمہیں ڈھانچ لے گی، انسان کو ویسے بھی مر کر اور قتل ہو کر اللہ ہی کی حضور میں حاضر ہونا ہے، تو پھر اسی ایک محبوب کی راہ میں اپنی گردنیں کٹوا کر کیوں نہ حاضر ہو۔ اور خدا کی راہ میں لڑ کر جان دینا ایک مسلمان بلکہ ہر عقلمند انسان کا بلند ترین مقصد ہونا چاہئے۔

تنظیم جماعت کے اصول

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ؕ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ؕ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوْهُمْ فِی الْاَمْرِ ؕ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِیْنَ ﴿۳۹﴾

“سو اللہ کی رحمت سے تم ان کے لئے نرم ہو اور اگر تم بد خو اور سخت دل ہوتے تو وہ تمہارے گرد و پیش سے منتشر ہو جاتے، سو تم ان کو معاف کر دو اور ان کے لئے استغفار کرو اور کام میں ان سے مشورہ کر لیا کرو پھر جب تم ٹھان لو تو اللہ

ہی پر بھروسہ کر دینیک اللہ توکل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

جنگ کا زمانہ ہے جو حیات انسانی کی تشدید و تکلیف کا مرکزی دائرہ ہے، فوج کے ایک حصہ نے نافرمانی کی ہے، جس کی وجہ سے نہ صرف آپ کی ذات اقدس کو بلکہ تمام مسلمانوں کو تکلیف اٹھانی پڑی ہے، قوانین جنگ اس بات کے متقاضی ہیں کہ تیر اندازوں اور بھاگنے والوں کو سخت سے سخت سزا دی جائے۔ ایسے وقت میں قرآن حکیم اعلان کرتا ہے کہ آپ نے صحابہ کرام کے ساتھ نہایت ہی نرمی کا سلوک کیا، ان کی غلط کاریوں کی طرف توجہ تک نہ کی، بلکہ آپ نے ان سے فرمایا: انا انکم مثل الوالد، میں تمہارے ساتھ باپ کی طرح سلوک کرتا ہوں، اگر بیٹے سے کبھی فروگزاشت ہو جاتی ہے تو باپ اس کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ آپ نے والد سے بھی بڑھ کر حسن سلوک اور شفقت و محبت کا اظہار کیا۔ آپ کو معلوم تھا کہ ترقی ہمیشہ تدریجی ہو ا کرتی ہے، اگر اس وقت ان سے غلطی ہو گئی تو پھر اس کی اصلاح کر لیں گے۔ اس موقع پر آپ کے خلق عظیم کا اعلان ہونا بتاتا ہے کہ آپ کے اخلاق کریمانہ کس اعلیٰ ترین بلند مقام پر تھے۔ آپ کے اسی خلق عظیم کا ذکر دوسری جگہ اس طرح آتا ہے: انک لعلی خلق عظیم۔ سورہ توبہ کے آخر میں ہے: لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ (توبہ ۱۲۸) لوگو! تمہارے پاس کبھی میں سے ایک پیغمبر آئے ہیں، تمہاری تکلیف ان کو گراں معلوم ہوتی ہے اور تمہاری بھلائی کے بہت خواہشمند ہیں اور مومنوں پر نہایت شفقت کرنے والے اور مہربان ہیں۔ حدیث میں آتا ہے: لا حلم احب الی اللہ تعالیٰ من حلم امام ورفقہ ولا جہل ابغض الی اللہ من جہل امام وخرقہ، اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ترین حلم و بردباری ایک امام و سردار کی ہے کہ باوجود قدرت کے درگزر کرتا ہے اور اس کی جہالت و خود سری سے بڑھ کر کوئی مغبوض ترین چیز نہیں۔

قانون جنگ کی رو سے نافرمانوں یا فرار کرنے والوں کو جو سزا دی جاتی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ منافقین کو ایک بہانہ ہاتھ نہ لگ جائے، ورنہ امام کو جب معلوم ہو کہ فراریا نافرمانی کے تحت میں نفاق عمل مخفی نہ تھا، بلکہ غلط اجتہاد کی بنا پر ایسا ہوا تو پھر ایک شفیق اور دانشمند امام احتساب اعمال میں بھی اسی نسبت سے کمی کر دیتا ہے۔ چونکہ آپ کی ذات اقدس کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ آپ اعلیٰ ترین معلم ہیں۔ اس لئے تمام قوانین عمل اور موجبات حیات ملیہ ایک ایک کر کے آپ اپنے صحابہ کو تعلیم فرماتے ہیں اور خود اس پر عمل کر کے دکھا دیتے ہیں۔

آپ کو حکم ہوتا ہے کہ ضروری کاموں میں اپنے صحابہ سے مشورہ کر لیا کریں، امرہم شوری بینہم مسلمانوں کا طغرائے امتیاز ہے۔ حدیث میں آتا ہے: ماتشاور و قوم قط الاھد والارشاد امرہم، جب کبھی ایک قوم کسی کام کے متعلق مشورہ کرے گی تو اس کو بہترین راہ عمل کی طرف ہدایت ہوگی۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں: ما رایت رجلا اکثر استشارة للہما لجال من رسول اللہ ﷺ، میں نے رسول اللہ سے بڑھ کر کسی شخص کو لوگوں کے ساتھ مشورہ کرنے والا نہیں دیکھا۔ مسند امام احمد میں ہے کہ آپ نے ایک مرتبہ حضرت ابو بکر و عمر سے فرمایا: لواجتمعنا فی مشورۃ ما خلافتکما، اگر تم



دونوں کسی بات میں متفق ہو گئے تو میں تمہاری مخالفت نہیں کروں گا۔ چنانچہ ساری حیات طیبہ میں آپ کا یہی طرز عمل رہا۔ غزوہ بدر میں مشورہ سے نکلے، جنگ احد میں اگرچہ آپ کی رائے مخالف تھی، مگر کثرت رائے کو تسلیم کر لیا۔ جنگ احزاب میں آپ کفار کو کچھ دینے پر رضامند تھے مگر صحابہ کے مشورے سے رک گئے، خود واقعہ اُفک میں آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا۔

آخر میں فرمایا گیا کہ جس وقت مشورہ مکمل ہو جائے، مسئلہ کے تمام ضروری اور ناگزیر اطراف بحث سامنے آجائیں اور سب کے سب یا کثرت رائے سے ایک امر کا فیصلہ کر لیں، تو پھر اس میں تساؤل کی ضرورت نہیں، بلکہ جس قدر سامان و وسائل ہیں، ذرائع و اسباب ہیں اور قوت و طاقت ہے، اس مقصد کے کسب و حصول میں صرف کر دینی چاہئے اور کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کرنا چاہئے۔ نتیجہ کی طرف سے بے نیاز ہو کر اس کو خدا پر چھوڑ دینا چاہئے، تو یقیناً آپ غالب رہیں گے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کہتے ہیں کہ آپ سے عزم کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: مشاورۃ اهل الرأي ثم اتباعهم۔ ارباب حل و عقد کے ساتھ بحث و مشاورت کرنا اور پھر پوری ہمت سے اس کے مطابق عمل کرنا عزم ہے۔

توکل علی اللہ

إِنْ يَنْصُرْكُمْ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۖ وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ ۗ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿٨٥﴾

”اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو پھر کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا اور اگر وہی تم کو چھوڑ بیٹھے تو پھر کون ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کرے اور مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ فقط اللہ ہی پر بھروسہ کریں۔“

اگر مسلمانوں نے صحیح فیصلہ کر لیا، پھر کام کو اٹھ کھڑے ہوئے اور بالفرض ان کے پاس سامان حرب وغیرہ کچھ نہ ہو تو ضرور اللہ تعالیٰ ہر ایک چیز انہیں کسی نہ کسی صورت مہیا کر دے گا۔ خداوند قدوس نے انسانوں کو پیدا کیا اور ان کی ضروریات زندگی فراہم کر دیں، ایسے ہی دنیا کو صحیح علم کی ضرورت ہے جس کا بقا اللہ تعالیٰ کی نصرت اور دستگیری پر موقوف ہے۔ اس لئے جو لوگ اس کے باقی رکھنے کے لئے سربکف کوشش کریں گے یقیناً ان کی مدد ہوگی۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ میں کسی رکاوٹ کی پروا نہ کریں، ضرور انہیں کو کامیابی ہوگی۔

خیانت ناممکن ہے

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ ۚ وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ ثُمَّ تَبَوَّأُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٨٦﴾

”اور کسی نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ خیانت کرے، اور جو خیانت کرتا ہے وہ قیامت کے روز لایا جائے گا جو کچھ اس نے خیانت کی ہے پھر ہر شخص کو پورا دیا جائے گا جو اس نے کمایا ہے اور ان پر کچھ ظلم نہ ہوگا۔“



غلول خیانت کو کہتے ہیں واصلہ اخذ الشی فی الخفیۃ، دراصل خفیہ طور پر کسی چیز کا لینا غلول ہے۔ میدان جنگ میں لڑنے کے بعد جس قدر سامان دستیاب ہو اس کو مال غنیمت کہتے ہیں جس کی تقسیم کرنے کی دو صورتیں ہیں:

(الف) تمام سپاہیوں میں برابر تقسیم کر دیا جائے کیونکہ ان لوگوں نے سامان حرب کی فراہمی اپنے ذاتی مصارف سے کی ہے۔ اوائل عہد اسلام میں اسی صورت پر عمل کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کی ترقی کے لئے یہ بہترین شکل ہے کہ ہر مسلمان جہاد فی سبیل اللہ کے لئے ذمہ دار بنادیا جائے اور وہ خود ضروریات جہاد فراہم کرے۔

(ب) بیت المال میں سب کچھ جمع کر کے وہاں سے مجاہدین کی تنخواہا ہوا دیا ہوا کرے اور تمام سامان جنگ اور آلات حرب کی فراہمی خود حکومت کے ذمہ ہو۔ موجودہ زمانہ میں یہ صورت زیادہ بہتر اور قابل عمل ہے اور ضابطہ اور نظام اسی امر کا مقتضی ہے۔

مال غنیمت کے پانچ حصے کئے جاتے ہیں۔ چار تو سپاہیوں کے لئے اور ایک امام کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس مال میں سے کچھ چھپالے تو وہ غلول کا مرتکب ہو گا۔ اس سے تمام مسلمانوں کی حق تلفی ہوتی ہے اور جب تک سب کے سب اسے معاف نہ کر دیں وہ مجرم ہی رہے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ اونٹ کے چند بال لے کر فرمایا کہ میں اتنا بھی بلا قاعدہ صرف کرنے کا مجاز نہیں۔ یہ سنتے ہی صحابہ سوئیاں اور دھاگے لے کر آگئے اور عرض کیا کہ ہم ان چیزوں کو معمولی خیال کر کے لے گئے تھے۔

گزشتہ آیت میں نبی کریم کو یہ حکم دیا تھا کہ فاعف عنہم واستغفرلہم۔ اس آیت میں یہ بتایا گیا کہ صحابہ کو اب بالکل مطمئن ہو جانا چاہئے کہ رسول اللہ نے ان کو دل سے معاف کر دیا ہے۔ یہ نبی کی شان کے بالکل نامناسب ہے کہ زبان سے تو وہ عفو و درگزر کا اعلان کرے اور دل میں ان جرائم کی یاد تازہ رکھے۔

مفسرین کرام نے اس خیانت کو صرف جنگ کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے۔ بعض نے امور نبوت سے اس کو متعلق کیا ہے۔ لیکن اس لفظ کا اطلاق عمومیت کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خود حضرت رسالت کی یہی مراد تھی۔ مسند امام احمد میں ہے: اعظم الغلول عند اللہ ذراع من الارض تجدون الرجلین جارین فی الارض اونی الدار، فیقطع احدہما من حظ صاحبہ خداعا، فاذا قطعہ طوقہ من سبعم ارضین یوم القیۃ۔ اللہ کے نزدیک بدترین خیانت یہ ہے کہ ایک پڑوسی اپنے ہمسایہ کی زمین یا گھر میں سے ایک حصہ صلب کرے تو قیامت کے روز سات زمینوں کا طوق اس کی گردن میں ڈالا جائے گا۔ شہروں اور ملکوں کے حکام اور والیوں کے متعلق آپ نے صاف صاف اعلان فرمادیا تھا: من ولی لنا عملا ولیس لہ منزل، فلیتخذ منزلا ولیست لہ زوجۃ فلیتزوج، ولیس لہ خادم فلیتخذ خادما ولیس لہ دابة فلیتخذ دابة ومن اصاب شیئاً سوی ذلک فهو غال۔ جس شخص کو ہم نے کسی جگہ کا والی بنایا اور اس کے پاس گھر، بیوی، خادم یا سواری وغیرہ نہیں تو وہ ان میں سے ہر ایک چیز طلب کر سکتا ہے، ان کے سوا وہ جو کچھ رعایا سے وصول کرے گا تو وہ

خائن ہوگا۔ آج کل کے سرکاری ملازم اس فرمان رسالت سے عبرت اندوز ہوں۔ ایک مرتبہ آپ نے ابن اللبتیتہ المازدی کو صدقات وصول کرنے کے لئے تحصیلدار مقرر فرمایا۔ وہ صدقات لے کر دربار نبوی میں حاضر ہوئے تو عرض کیا: ہذا لکم و ہذا اھدی لی، صدقات تو یہ ہیں اور یہ چیزیں لوگوں نے مجھے ہدیہ کے طور پر دی ہیں۔ یہ سنتے ہی آپ منبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا: مابال عامل بنعشہ علی عمل، فیقول ہذا لکم و ہذا اھدی لی، افلا جلس فی بیت ایبہ وامہ فینظر ایھدی الیہ ام لا والذی نفس محمدیۃ لایاتی احدکم منها بشیء الا جاء بہ یوم القیمة علی اقتبہ (مسند امام احمد) یہ عامل بھی عجیب لوگ ہیں ہم ایک شخص کو صدقات وصول کرنے کے لئے بھیجتے ہیں وہ آکر کہتا ہے کہ یہ صدقات ہیں اور یہ لوگوں نے مجھے ہدیہ دیا ہے۔ وہ گھر ہی میں کیوں نہیں بیٹھا رہا پھر دیکھتے لوگ اس کے پاس ہدایا لاتے ہیں یا نہیں، مجھے خدا کی قسم جو شخص ذرہ برابر بھی چیز اپنے پاس رکھے گا قیامت کو وہ اسے اپنی گردن پر لادے ہوئے لائے گا۔

آپ بار بار فرمایا کرتے تھے: ہدایا الولاۃ غلول، والیوں اور عالموں کو جو تحائف ملتے ہیں وہ سب غلول اور خیانت میں شامل ہیں۔ ایک مرتبہ آپ نے حضرت معاذ بن جبل کو یمن کی جانب روانہ کیا، جب وہ دور نکل گئے تو انہیں ایک شخص بھیج کر پھر واپس بلوایا، جب وہ آگئے تو ان سے پوچھا تمہیں معلوم ہے میں نے تمہیں کس لئے واپس بلایا ہے، دیکھو، لاتصیین شیئاً بغیر اخن فانہ غلول ومن یفعل یات بہا غل یوم القیمة لہذا دعوتک فامض لعبدک۔ جن چیزوں کے وصول کرنے کا میں نے حکم دیا ہے ان کے سوا جو کچھ بھی تم لوگوں سے لوگے وہ غلول ہو گا اور تم اسے قیامت کے روز خود لے کر حاضر ہو گے۔ اس بات کے بتانے کے لئے میں نے تمہیں بلایا تھا اب اپنے کام پر جاؤ۔

رسول اللہ ﷺ کی امانت کو نہ صرف دوست بلکہ دشمن بھی تسلیم کرتے تھے۔ ہر شخص آپ کو الامین کے نام سے پکارتا تھا۔ ایسے نبی سے یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ وہ غلول جیسے جرم کا مرتکب ہو۔ اس لئے کہ خائن کبھی ترقی نہیں کر سکتا: ان اللہ لایھدی کید الخائنین۔

### شتان بینہما

اَفَمِنْ اَتْبَعِ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْ بَاءَ بِسَخِطِ مَنِ اللّٰهِ وَمَا وَدَّہُ جَہَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۷﴾ هُمْ دَرَجَتْ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ بِصِيْرَتِهِمْ بَاطِلٌ يُعْلَمُوْنَ ﴿۱۸﴾

”بھلا وہ شخص جو اللہ کی مرضی کا تابع ہو، اس جیسا ہو سکتا ہے جو اللہ کے غضب میں آگیا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔ اللہ کے پاس لوگوں کے درجات ہیں اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں اللہ دیکھ رہا ہے۔“

دونوں کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ رضوان الہی کا اتباع کرنے والا ہمیشہ کامیاب رہے گا۔ اس لئے کہ وہ قانون الہی کی خاطر اپنے اغراض و مقاصد کی پروا نہیں کرتا اور ہر چیز اس کے لئے قربان کر دیتا ہے۔ اور جو شخص اپنی ضروریات کو مقدم رکھتا ہے وہ پورا کامیاب نہیں ہو سکتا۔ قرآن میں ایک جگہ آتا ہے: اَفَمَنْ يُعْلَمُ اَنَّا اَنْزَلْنَا إِلَيْكَ مِنَ رَبِّكَ الْحَقَّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰی

(الرعد ۱۹) بھلا جو شخص یہ جانتا ہے کہ جو کچھ تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے حق ہے وہ اس شخص کی طرح ہے جو اندھا ہے۔ دوسری جگہ ہے: أَفَمَنْ وَعَدْنَاهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَا يَتَذَكَّرُ لَكُمْ مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (القصص ۶۱) بھلا جس شخص سے ہم نے نیک وعدہ کیا اور اس نے اسے حاصل کر لیا تو کیا وہ اس شخص کا سا ہے جس کو ہم نے دنیا کی زندگی کے فائدے سے بہرہ مند کیا۔

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَإِنْ كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿۳۷﴾

“بیشک اللہ نے ایمان والوں پر بڑا احسان کیا جب کہ انھی میں سے ان میں پیغمبر بھیج دیا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور عقل کی باتیں سکھاتا ہے اور بیشک وہ اس سے پہلے صریح مگر ابھی میں تھے۔“

اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت خاصہ سے کام لے کر محمد ﷺ کو تم میں مبعوث کیا، جو زندگی بھر تلاوت آیات، تزکیہ نفس، تعلیم کتاب اور حکمت کے فرائض ادا کرتے رہے۔ جس پاکباز انسان کی حیات مقدس کا ایک ایک لمحہ ان مقاصد عالیہ میں صرف ہو، اس کی نسبت یہ گمان ہو سکتا ہے کہ وہ غول کا مرتکب ہو گا۔ آپ کی شان اس سے بہت بلند تر واقع ہوئی ہے اور آپ کے متعلق ایسے خطرات و وساوس دل میں لانا ہر گز مناسب نہیں۔ کیونکہ پیغمبر کی نسبت تو یہ وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا۔ اس کی صورت تو بالکل ایسی ہی ہے جیسا کہ توراۃ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا گیا کہ تو شرک اور چوری نہ کر، تو اس کا مطلب دراصل امت کو تعلیم دینا ہے اور بس۔

هٰذَا بَصَائِرُ لِلنَّاسِ

ان تمام آیات میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کس طریق پر مسلمانوں کی منتشر قوت کو پھر یکجا کر دیا اور وہ لوگ جو جنگ احد میں الگ ہو گئے تھے ان کو دوبارہ متحد کر دیا۔ اس تمام تر بحث کا مطلب یہ تھا کہ آئندہ جو لوگ آپ کے جانشین ہوں وہ اسی اسوۂ حسنہ کا پورا اتباع کریں:

(۱) دوستوں کی غلط کاری کے باوجود ان کے ساتھ نرمی سے پیش آئیں۔

(۲) بد خلقی سے پرہیز کریں۔

(۳) تمہارے قلوب اپنے احباب کے لئے ہمدردی، محبت اور شفقت سے لبریز ہوں۔

(۴) ان کی غلطیوں کو دل سے بالکل فراموش کر دو اور پھر کبھی ان کو یاد بھی نہ کرو۔

(۵) ان کے لئے برابر دعا کرتے رہو کہ اللہ تعالیٰ ان کو آئندہ غلطیوں سے محفوظ رکھے۔

(۶) ان سے ہمیشہ مشورہ کرو اور اپنی رائے پر اصرار مت کرو۔

(۷) فیصلہ کے بعد عزم مصمم کر کے اس کام کو پورا کرنے میں لگ جاؤ اور اس میں اپنی پوری کوشش صرف کر دو۔

(۸) تمام مسلمانوں کی طرح امیر کا حق مساوی ہو، کسی چیز کو اپنے لئے خاص نہ کرو۔

(۹) قانون الہی کے بلند و برتر کرنے میں اپنی عزیز ترین متاع حیات تک قربان کر دو۔

(۱۰) تلاوت آیات میں برابر مصروف رہو اور لوگوں کو قرآن پڑھاؤ۔

(۱۱) خود اس قانون پر عمل کرو کہ لوگوں کے لئے نمونہ بن سکو۔

(۱۲) قرآن کی تعلیم دو اور لوگوں کے شکوک و شبہات دور کرو۔

(۱۳) تعلیم حکمت میں مصروف ہو جاؤ اور قرآن کے اصول اساسی دنیا کے سامنے پیش کرو۔ یہ نتائج ہیں جو گزشتہ

آیات سے مستنبط ہوتے ہیں اور جن پر عمل کرنے سے ہمارے لیڈر اور رہنما ہماری پر آگندہ جماعتوں کو ایک مرکز پر لاسکتے ہیں۔

### تکالیف کا لطیف جواب

أَوَلَمْ آَاصَابِكُمْ مُصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُمْ مِثْلَيْهَا قُلْتُمْ أَئِذَا هَذَا قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ وَمَا أَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجُنُودُ فَبِإِذْنِ اللَّهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ نَافَقُوا ۝

”کیا جب تم پر کوئی مصیبت آپڑی جس سے دو چند تم ان کو پہنچا چکے ہو تو کہتے ہو یہ کہاں سے ہے، کہہ دو یہ تمہاری اپنی طرف سے ہے بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور جو کچھ اس روز تم پر مصیبت آپڑی جبکہ دونوں جماعتیں بھڑ گئیں تو اللہ کے حکم سے تھا، تاکہ وہ مومنوں کو جان لے اور ان لوگوں کو جان لے جنہوں نے نفاق کیا۔“

غزوہ احد میں مسلمانوں کو تکلیف پہنچ چکی ہے، ممکن ہے اس کا خیال ان کو آئندہ جنگ میں جانے سے روکے، اس لئے کہا گیا تم اتنی سی مصیبت سے پریشان ہو گئے، حالانکہ اس سے دگنی مصیبت تم ان کفار کو پہنچا چکے ہو۔ غزوہ بدر میں ان کے بہترین افراد قتل و قید کئے گئے، پھر اس جنگ میں بھی انہیں نقصان اٹھانا پڑا۔ اس پر بھی کہتے ہو کہ یہ مصیبت کہاں سے آگئی، اس کا جواب یہی ہے کہ تم نے نافرمانی کی، تیر اندازوں نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور یہ تکلیف آئی۔

من عند انفسکم کی ایک اور لطیف توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ جو کچھ ہوا ہے تمہارے فیصلہ کے مطابق ہوا ہے۔ جنگ بدر کے قیدیوں سے فدیہ لیتے وقت تم نے یہی کہا تھا کہ ہم ان کفار کو فدیہ لے کر رہا کئے دیتے ہیں۔ اس کے عوض میں ہمارے ستر آدمی دوسری جنگ میں جو قتل ہوں گے تو شہادت کے درجہ پر فائز ہوں گے۔ ترمذی میں ہے:

جاء جبرئیل الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم، فقال ان الله کره ما صنع قومک فی اخذهم الفداء من الاسارى وقد امرک ان تخیرهم بین ان یضربوا عنقک الاسارى و بین ان یأخذوا الفداء علی ان یقتل منهم عدتهم فذکر ذلک رسول الله ﷺ للناس فقالوا یا رسول الله عشارنا و اخواننا، بل نأخذ فداءهم فتقوی به علی القتال عدونا و لیست تشهد منا عدتهم، فقتل منهم یوم احد سبعون عددا ساری اهل بدر۔

”جبریل نے رسول اللہ سے عرض کیا کہ قیدیوں سے فدیہ قبول کرنے میں آپ کی قوم نے اچھا کام نہیں کیا، خدا کا حکم یہ تھا کہ ان قیدیوں کو قتل کر دو اور اگر فدیہ قبول کرو تو پھر اس کے عوض میں اتنے ہی مسلمان آئندہ شہید ہوں گے۔ رسول اللہ نے صحابہ کے سامنے اس کو پیش کر دیا تو ان لوگوں نے عرض کیا کہ وہ بھی ہمارے بھائی ہیں، ہم فدیہ لیتے ہیں کہ آئندہ جنگ میں ہم اور زیادہ قوی بن سکیں اور ہمارے اتنے ہی آدمی شہید ہو جائیں، چنانچہ اہل بدر کی تعداد ساری کے مطابق جنگ احد میں مسلمان شہید ہو گئے۔“

نتیجہ دونوں کا ایک ہے۔ خود مسلمانوں نے جو کچھ کیا اور جس فیصلہ پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا، اسی کے مطابق نتائج نکلے۔ اب کسی اعتراض کی گنجائش نہیں۔ البتہ اس واقعہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے دونوں گروہوں کو ایک دوسرے سے ممتاز بھی کر دیا۔

وَقِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوْ ادْفَعُوا قَالُوا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَا تَتَّبِعُنَا هُمْ لِنَكْفِيَ يَوْمَئِذٍ عَنْهُمْ وَلَا يَخَافُ اللَّهُ مَا لِيْهِمْ مَا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ ۚ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُونَ ﴿٦٥﴾ الَّذِينَ قَالُوا لَا خِوَانِيَهُمْ وَقَعَدُوا أَلَا عَاوُنَا مَا قَتَلُوا قُلُودًا زَعَوْا عَنْ أَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٦٦﴾

”اور ان سے کہا گیا آؤ اللہ کی راہ میں لڑو یا مدافعت کرو، انہوں نے کہا کہ اگر ہم لڑائی جانتے تو تمہارے ساتھ ہو لیتے۔ یہ لوگ آج بہ نسبت ایمان کے کفر سے زیادہ قریب ہیں۔ اپنے منہ سے ایسی بات کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں۔ اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں، یہ وہی ہیں اگرچہ خود تو بیٹھے رہے مگر اپنے بھائیوں کے بارے میں کہا کہ اگر وہ ہمارا کہنا مانتے تو نہ مارے جاتے، کہہ دو اچھا اگر تم سچے ہو تو اپنے اوپر سے موت کو ہٹا رکھو۔“

ان لوگوں سے کہا گیا کہ حق و صدق کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہو اور اللہ کی راہ میں جنگ کرو کہ کلمہ حق و حریت بلند و برتر ہو۔ انسان کی زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد تو یہی جہاد فی سبیل اللہ ہی ہونا چاہئے، لیکن اگر اس کا شوق و ولولہ نہیں اور تمہارے دل اسلام کی محبت سے خالی ہیں، تو پھر اپنے آپ ہی کو بچانے کے لئے ہتھیار سنبھال لو کہ دشمن تمہارے فنا کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے، مگر ان منافقین کی حالت یہ ہے کہ کسی طرح بھی جہاد کے لئے تیار نہیں ہوتے، بلکہ الٹا ان مسلمانوں کو مورد طعن و تشنیع بناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ذرا عقل سے کام لو، یہ بھی کوئی لڑائی ہے جس کے لئے تم ہمیں دعوت دے رہے ہو، دشمن کی تعداد ہم سے چار گنا زیادہ، اسباب و وسائل اور مال و دولت میں ہم سے بڑھ کر ہے، ادھر مسلمان غریب و مفلس اور بے دست و پا ہیں، اس حالت میں گھر سے جنگ کے لئے نکلنا کہاں کی دانشمندی ہے۔ یہ تو اپنے آپ کو جان بوجھ کر موت کے منہ میں لے جانا ہے، ان حالات میں ہمیں تو یقین نہیں آتا کہ جنگ ہو گی۔ اگر واقعات و قرآن اس بات کی شہادت دیتے کہ لڑائی ہو کر رہے گی تو خیر ہم بھی تمہارے ساتھ ہو لیتے۔

ان بد بختوں کو اتنا دکھائی نہیں دیتا کہ اسلام کو فنا کرنے کا مخالفین نے عزم کر لیا اور یہ لوگ اب تک اپنی مصالحہ خصوصی ہی میں الجھے ہوئے ہیں۔ یہ منافق ہیں اور کفر کے بالکل قریب آگئے ہیں۔ ان کے دلوں میں تو یہی ہے کہ ہم کبھی

مسلمانوں کا ساتھ نہ دیں، مگر ظاہر داری کے طور پر ان خیالات کو چھپاتے ہیں، لیکن اللہ کو دھوکا نہیں دے سکتے۔

یہ احمق پھر اسی پر قناعت نہیں کرتے، بلکہ اپنے مشوروں کی اہمیت، صابت رائے اور دانشمندی جتانے کے لئے کہتے ہیں کہ اگر وہ مسلمان بھی ہمارا کہنا مان لیتے، جو جنگ میں شریک ہوئے ہیں، تو ہرگز قتل نہ ہوتے اور نہ ان کے ممالک ان کے قبضے سے نکلتے۔ ان سے کہہ دو کہ اگر تمہاری بات ماننے سے انسان نہیں مرتا اور تمہاری صحبت و یکجائی زندگی بخش ہے تو ذرا اپنی موت کو تو ٹال دو، جب ایسا نہیں کر سکتے اور وہ ضرور آکر رہے گی تو اس موت سے یقیناً یہ بہتر ہے کہ ایک مسلم جہاد فی سبیل اللہ میں اپنی جان دیدے۔

### اظہار مسرت

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ ﴿۱۶﴾ فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ ۚ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ ۚ أَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۱۷﴾ يُسْتَبْشِرُونَ بِنِعْمَةِ اللَّهِ وَفَضْلٍ ۚ وَاللَّهُ لَا يُضَيِّعُ أَجْرَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۸﴾

”اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے گئے ان کو مردے خیال نہ کرو بلکہ زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس رزق دیئے جاتے ہیں، اللہ نے ان کو جو اپنے فضل سے دیا ہے اس سے وہ خوش ہیں اور جو ان کو پیچھے سے انہیں نہیں ملے ان کی وجہ سے بھی خوش ہیں کہ انہیں کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے، اللہ کی نعمت اور فضل سے خوش ہوتے ہیں اور بیشک اللہ مومنوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔“

حامیان حق و صدق کی موت، موت نہیں، بلکہ دائمی زندگی ہے، ان شہدائے ملت کو دودھری شادمانی اور مسرت ہوتی ہے: (الف) اس لئے کہ قدوس حق نواز نے ان کی قربانی کو شرف قبول بخشا اور ان کو حیات ابدی نوازش کی۔ (ب) اس لئے کہ جو فرزند ان اسلام دنیا میں رہ گئے وہ قانون الہی کو دنیا میں اچھی طرح رائج کر دیں گے اور سعادت کی بنیاد رکھنے والے وہی شہدائے ملت تھے جو پہلے گزر چکے۔

### جنگ میں مرنا یقینی نہیں

الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِلَّهِ وَالرَّسُولِ مِنْ بَعْدِ مَا أَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۚ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا مِنْهُمْ وَاتَّقُوا أَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿۱۹﴾

”جنہوں نے اللہ اور رسول کا حکم مانا بعد اس کے کہ ان کو زخم پہنچ چکے تھے، ان میں سے ان کے لئے بڑا اجر ہے جنہوں نے نیکی کی اور پرہیز گار بنے۔“

ابو سفیان احد سے بھاگ کر جب مقام زوحاء میں پہنچا تو اسے خیال ہوا کہ کام ناتمام رہ گیا اور ارادہ کیا کہ واپس چل کر مسلمانوں کا نام و نشان مٹالے، رسول اللہ ﷺ کو پہلے ہی سے گمان تھا کہ وہ مسلمانوں کو مغلوب سمجھ کر دوبارہ حملہ کرنے کا خیال کرے گا، اس لئے آپ نے دوسرے ہی روز اعلان کر دیا کہ کون ہے جو ان کفار کے تعاقب میں چلے گا۔ فوراً ستر

آدمیوں کی جماعت اس خدمت کے لئے تیار ہو گئی، جن میں حضرت ابو بکر وزیر بھی تھے، آپ حمراء الاسد تک جو مدینہ سے آٹھ میل ہے تشریف لے گئے، قبیلہ خزاعہ اس وقت تک ایمان نہیں لایا تھا مگر درپردہ اسلام کا طرفدار تھا۔ اس کا رئیس معبد خزاعی مسلمانوں کی تکالیف کا ذکر سن کر آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور واپس جا کر ابوسفیان سے ملا۔ ابوسفیان نے مدینہ کی طرف واپس لوٹنے کا ارادہ ظاہر کیا تو معبد نے کہا: میں دیکھتا آتا ہوں، محمد اس سرور سامان سے آرہے ہیں کہ ان سے مقابلہ کرنا غیر ممکن ہے۔ یہ سن کر ابوسفیان کی ہمت نہ پڑی اور مکہ کو چلا گیا۔ اس آیت میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيمَانًا ۖ وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ ۝ فَانْقَلَبُوا بِنِعْمَةِ رَبِّهِمْ إِلَىٰ مَدِينِهِمْ ۖ فَتَبِعُوا رِضْوَانَ اللَّهِ ۖ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَظِيمٍ ۝ إِنَّمَا ذَلِكُمُ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَآءَهُ ۚ فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُوا مِنِّي إِن كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ ۝

“جن سے لوگوں نے کہا کہ کافروں نے تمہارے مقابلے کے لئے بڑا سامان جمع کیا ہے تو ان سے ڈرو مگر اس بات نے ان کا ایمان بڑھا دیا اور بول اٹھے کہ ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے، غرض وہ اللہ کی نعمت اور فضل کے ساتھ واپس آئے، انہیں کوئی گزند نہیں پہنچا اور وہ اللہ کی رضا پر چلے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ یہ شیطان صرف اپنے دوستوں کو ڈراتا ہے سو تم ان سے نہ ڈرو اور اگر تم مومن ہو تو مجھ ہی سے ڈرو۔“

ان آیات میں بدر صغریٰ کا ذکر کیا گیا ہے۔ احد کے میدان میں چلتے وقت ابوسفیان نے رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ آئندہ سال بدر صغریٰ کے میدان میں ہماری اور آپ کی جنگ ہوگی اور آپ کی طرف سے حضرت عمر نے اس کا اثبات میں جواب دیا تھا۔ دوسرے سال اسی وعدہ کے مطابق ابوسفیان اپنے لشکر کو لے کر مرالظہر ان تک آیا مگر کچھ ایسا مرعوب و ہیبت زدہ ہو گیا کہ اسی جگہ سے واپس لوٹ گیا۔ راستے میں نعیم بن مسعود اشجعی سے یہ کہتا گیا کہ اگر رسول اللہ کو روک دو تو دس اونٹ نذر دوں گا، ہم ضرور ان پر حملہ کرتے مگر خشک سالی کی وجہ سے ہم کچھ تیاری نہیں کر سکے۔

نعیم نے جس کو اس آیت میں شیطان کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے، مدینہ میں آکر مسلمانوں کو ڈرانا شروع کیا اور کہنے لگا کہ کفار نے تمہیں فنا کرنے کے لئے ایک عظیم الشان لشکر تیار کیا ہے، تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ گھر سے باہر قدم نہ نکالو، مگر ان الفاظ نے فرزند ان اسلام پر کچھ ہی اثر نہ کیا، وہ خدا کی مدد پر بھروسہ کر کے نکل کھڑے ہوئے اور ان کی ہمت بڑھتی ہی گئی۔ یہ اپنے عہد کے مطابق بدر صغریٰ تک چلے گئے، مگر وہاں دشمن کا نام و نشان تک نہ تھا اور اس طرح ہر قسم کی تکلیف سے بچ گئے۔ اتفاق سے وہی ایام قبیلہ بنو کنانہ کے میلہ کے تھے، ان کی منڈی میں مسلمانوں نے بھی تجارت کی اور خوب کمایا۔

غرض خلاصہ یہ نکلا کہ اگر ایک شخص جہاد فی سبیل اللہ کے لئے گھر سے نکلتا ہے تو یہ ضروری نہیں کہ وہ جنگ میں بھی مارا جائے گا، بہت ممکن ہے کہ خود دشمن ہی مرعوب ہو کر میدان میں نہ آ سکے، اس لئے مسلمانوں کو موت سے ڈر کر اپنے فرائض میں کوتاہی ہر گز نہ کرنی چاہئے۔



یہاں تک غزوہ احد کی بحث ختم ہو گئی، اس سے پہلے کہا گیا تھا کہ کفار و منافقین کے ساتھ دوستانہ تعلقات نہ رکھو، ورنہ برباد ہو جاؤ گے۔ اس دوستی کا نتیجہ بھی دکھادیا کہ اسلام پر حملے ہو رہے ہیں اور ان لوگوں کے کان پر جوں تک نہیں رہتی۔ جب کفار و منافقین کی دوستی کا اثر رسول اللہ ﷺ کے ہوتے ہوئے ظاہر ہونے سے نہ رہا تو اب تو بدرجہ اولیٰ یہ دوستی اپنا رنگ لائے گی۔ چنانچہ آج کل مسلمانوں کی بالکل یہی حالت ہے، اس لئے ہمارا فرض ہے کہ کفار، اہل کتاب اور منافقین کی دوستی سے پرہیز کریں اور ان پر ایک لمحہ کے لئے بھی اعتماد نہ کریں۔

### آپ غمگین نہ ہوں

وَلَا يَخْزِيكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ ۖ إِنَّهُمْ لَن يَصْطُرُوا اللَّهَ شَيْئًا ۚ يُرِيدُ اللَّهُ أَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حِطًّا فِي الْآخِرَةِ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٣٠﴾ إِنَّ الَّذِينَ اشْتَرَوْا الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ لَن يَصْطُرُوا اللَّهَ شَيْئًا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٣١﴾ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّكُمُ لَآتَيْنَهُمْ خَيْرًا لِّأَنفُسِهِمْ ۚ إِنَّمَا نَأْتِيهِمْ لِيُذَادُوا إِثْمًا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿٣٢﴾

”تمہیں وہ لوگ غم میں نہ ڈالیں جو کفر میں دوڑتے ہیں، یہ لوگ اللہ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ اللہ چاہتا ہے کہ ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہ رکھے اور ان کے لئے برا عذاب ہے، بیشک جنہوں نے ایمان کے بدلے کفر کو مول لیا وہ اللہ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے اور ان کو دردناک عذاب ہو گا اور جو لوگ کفر کر رہے ہیں وہ یہ خیال نہ کریں کہ ہم جو ان کو مہلت دے رہے ہیں تو یہ ان کے حق میں بہتر ہے، ہم تو ان کو صرف اس لئے ڈھیل دے رہے ہیں کہ وہ گناہ میں مرجائیں اور ان کے لئے ذلت کی سزا ہے۔“

اگر خدا انخواسے مسلمانوں میں منافقین کے خصائل پیدا ہو جائیں، ان کی طرح وہ بھی اسلام کے ساتھ دغا بازی کرنے لگیں اور اس کے دشمنوں سے ساز باز رکھیں تو رسول اللہ ﷺ کو کس قدر رنج ہو گا، اس سے اسلام کی ترقی رک جائے گی۔ اس آیت میں آپ کو اطمینان دلایا گیا کہ اگر کچھ نام نہاد مسلمان موج نفاق میں بہ جائیں تو آپ ان کی پروا نہ کیجئے کہ اسلام کی حفاظت و صیانت کے لئے فداکاروں کی ایک اعلیٰ ترین جماعت ہمیشہ تیار رہے گی اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے اور وہ جہاد فی سبیل اللہ میں شریک نہیں ہوئے وہ اس خیال میں نہ رہیں کہ ان کو جس قدر مہلت مل رہی ہے یہ ان کے حق میں مفید ہوگی۔ اس فرصت کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ اور زیادہ گناہوں کا ارتکاب کریں گے، انہیں نیک و بد کی تمیز نہ رہے گی اور پھر آخر کار غیروں کے محکوم بن جائیں گے۔ ایک جگہ آتا ہے: فَذَرْنِي وَمَنْ يُكَذِّبْ بِهَذَا الْحَدِيثِ ۚ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ (القلم ۴۴) تو مجھ کو اس کلام کے جھٹلانے والوں سے سمجھ لینے دو، ہم ان کو آہستہ آہستہ ایسے طریق سے پکڑیں گے کہ ان کو خبر بھی نہ ہوگی۔ ایک مقام پر یوں ارشاد ہوتا ہے: تُعْجِبُكَ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُم بِهَآئِ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ أَنفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُونَ (النساء ۵۵) تم ان کے مال و اولاد سے تعجب نہ کرنا، خدا چاہتا ہے کہ ان چیزوں سے دنیا کی زندگی میں ان کو عذاب دے اور جب ان کی جان نکلے تو اس وقت بھی وہ کافر ہی ہوں۔



## فرق و امتیاز

مَا كَانَ اللَّهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَىٰ مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتَّىٰ يَمِيزَ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۚ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَجْتَبِيٰ مِنْ دُسُلِهِ مَنْ يَشَاءُ ۚ فَأَمُونُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ ۚ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَتَنُوكُمْ فَانكُمُ أَجْرُ عَظِيمٌ ﴿٥٠﴾

”اللہ ایسا نہیں کہ مسلمانوں کو اسی حالت پر چھوڑ دے جس پر تم اب ہو جب تک کہ ناپاک کو پاک سے جدا نہ کر دے اور یہ بھی نہیں کہ اللہ تم کو غیب کی باتیں بتا دے، لیکن اللہ اپنے پیغمبروں میں سے جسے چاہے چھانٹ لیتا ہے، تو تم اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور اگر تم ایمان لاؤ گے اور پرہیز گار بنو گے تو تمہارے لئے بڑا اجر ہے۔“

مسلمانوں پر مصیبتیں اور تکلیفیں نازل ہوتی ہیں، وہ مہالک و شدائد میں مبتلا ہوتے ہیں اور بسا اوقات ان پر یاس و قنوط کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اس کی حکمت کیا ہے اور ایسا کیوں ہوا کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ مومنوں کو منافقوں اور ملت فروشوں سے الگ کر دے اور سر فر و شان اسلام کے جوش و ولولہ عمل، فداکاری ملت اور جذبہ اسلام پرستی پر مہر لگ جائے، کیونکہ مشکلات و موانع میں صرف مومن ہی صبر و استقلال، عزم و ہمت اور ثبات قدم کا اظہار کر سکتا ہے، غدار و ملت فروش تھوڑی سی مصیبت سے گھبرا کر کام چھوڑ دیتے ہیں، مگر سنت اللہ یوں جاری ہے کہ واقعات پیدا کر کے اور تکلیفوں میں پھنسا کر اباب ایمان و نفاق کو جدا کیا جاتا ہے، لوگوں کو ان کے نام نہیں بتائے جاتے اور نہ یہ بتانا کسی کے لئے حجت اور سند ہو سکتا ہے، بلکہ حالات و واقعات خود بخود حقیقت کو بے نقاب کر دیتے ہیں اور پھر مسلمان کبھی ان سے دھوکا نہیں کھاتے۔

اس سے یہ مراد نہیں کہ اب ہر ایک شخص جب تکالیف و شدائد کی وجہ سے ممتاز ہو جاتا ہے تو پھر ہر ایک کو الہام بھی ہو جاتا، اس لئے کہ وحی و الہام کے لئے جو انتخاب ہوتا ہے، اس کا قانون ہی بالکل جدا گانہ ہے اور اس انتخاب میں آنا کسی کی سعی و کوشش پر موقوف نہیں، بلکہ اللہ يعلم حیث یجعل رسالتہ، پس تمہاری ترقی کے لئے اسی قدر کافی ہے کہ قانون الہی کو اپنا دستور العمل بناؤ، ان واقعات و حوادث میں ثابت قدم رہو، اسلام کے ساتھ غداری نہ کرو اور جہاد فی سبیل اللہ سے کبھی جی نہ چڑاؤ۔

## فصل ثانی

ان سے پرہیز کرو

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْغُلُونَٰ بِمَا أَنْتُمْ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْرٌ لَّهُمْ ۚ بَلْ هُمْ شَرٌّ لَّهُمْ ۚ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ ٱلْقِيٰمَةِ ۚ وَلِلّٰهِ مِيرَٰثُ السَّمٰوٰتِ وَٱلْأَرْضِ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿٥١﴾

”اور وہ لوگ یہ نہ سمجھیں جو اس میں بخل کرتے ہیں جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے دیا ہے کہ یہ ان کے حق میں بہتر ہے بلکہ وہ ان کے لئے بُرا ہے عنقریب قیامت کے دن اس چیز کا طوق بنا کر ان کے گلے میں ڈال دیا جائے گا جس میں وہ بخل کرتے ہیں اور اللہ ہی آسمانوں اور زمین کا وارث ہے اور اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔“

اس سورۃ میں اصلی مخاطب تو نصاریٰ ہیں مگر کبھی کبھی ضمناً یہودیوں کا ذکر بھی آجاتا ہے۔ اس سورۃ کا مقصد وحید یہی ہے کہ عیسائیوں کی تمام حکومتیں مسلمانوں کو دلوادی جائیں اور ان کے ممالک پر فرزند ان اسلام کا قبضہ ہو، اس غرض کے حصول کے لئے کچھ شرطیں سورت کے ابتدا میں بیان کی گئی تھیں۔ اب اس بحث کو دور کو ع میں ختم کر دیا جائے گا، یہاں سے یہودیوں کی چند خرابیاں ذکر کی جاتی ہیں، جن کا نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ ان کے بیان کرنے سے مسلمانوں کو یہ بتانا تھا کہ وہ ان امراض میں مبتلا نہ ہوں، ورنہ ان کی قومیت فنا ہو جائے گی اور وہ بھی یہودیوں کی طرح بن جائیں گے۔

یہ سمجھ لینا چاہئے کہ یہودیوں کی تمام رسمیں بُری نہیں ہیں۔ ہمیں ان میں فرق و امتیاز کی ضرورت ہے۔ پھر ان کو چھوڑ دیں جو بُری ہیں۔ چنانچہ ان میں ایک مرض بخل کا ہے۔ یہ لوگ اپنے مال و دولت کو سیٹ سیٹ کر رکھتے ہیں، مگر وہ یقین کر لیں کہ یہی دولت ان کی ذلت کا باعث بن جائے گی، چنانچہ بنی اسرائیل کی حالت ان پر گواہ ہے۔

### ناشائستہ حرکات

لَقَدْ سَبَّحَ اللَّهُ قَوْلَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ فَقِيرٌ وَنَحْنُ أَغْنِيَاءُ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوا وَقَتْلَهُمُ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۖ وَنَقُولُ ذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ ﴿٥٠﴾ ذَلِكَ بِمَا قَدَّمْتُمْ آيَاتِيكُمْ وَأَنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِلْعَبِيدِ ﴿٥١﴾

”اللہ نے ان کا قول سن لیا جنہوں نے کہا کہ اللہ محتاج ہے اور ہم مالدار ہیں، ہم لکھ رکھیں گے جو کچھ انہوں نے کہا، نیز ان کا ناحق نبیوں کو قتل کر ڈالنا اور ہم کہیں گے کہ جلائے والا عذاب چکھو، یہ اس کا بدلہ ہے جو تم نے اپنے ہاتھوں بھیجا اور اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔“

یہودیوں کی حالت یہ ہے کہ وہ حد درجہ کے بخیل واقع ہوئے ہیں، اللہ کی راہ میں انہیں کچھ دینا سخت ناگوار گزرتا ہے۔ مصر میں یہ لوگ فرعون کے صدیوں تک غلام رہے۔ وہ بد بخت تمام اعلیٰ ترین مناصب اور عہدے صرف اپنی قوم کو دیتا اور ذلیل کام ان کے سپرد کرتا کہ تمام دن محنت کرنے کے باوجود انہیں کچھ بھی ہاتھ نہ لگے۔ جب ذرائع آمدنی نہ ہوں تو مال کی محبت ہو جانا ایک قدرتی امر ہے، یہی وجہ تھی کہ ان میں دولت کی الفت حد سے بڑھ گئی تھی، جب کبھی ان سے خدا کے نام پر مانگا جاتا تو تمسخر و استہزاء کے طور پر کہتے کہ خدا فقیر ہو گیا ہے جو ہم سے مانگتا ہے۔

اس بخل کے علاوہ ان میں دوسرا مرض یہ تھا کہ تعلیم صحیح کو ماننے کی خاطر ناحق انبیاء و رسل کو قتل کیا کرتے تھے، پھر بھلا ایسے مجرم کہیں کامیاب ہو سکتے ہیں؟ اس بد بختی کا نتیجہ انہیں یہ ملا کہ خدا نے ان کو ایسا ذلیل کر دیا کہ باوجود کروڑ پتی ہونے کے وہ در بدر مارے مارے پھرتے ہیں۔

## دجل و فریب

الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ عَهْدُ إِلَيْنَا أَلَّا تَكُونُ لَنَا بَلِيَّةً يَأْتِيَنَا بِقُرْآنٍ تَأْكُلُ النَّارُ ۖ قُلْ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ قَبْلِهِ بِالْبَيِّنَاتِ ۖ وَيَا لَذِي قُلُوبٍ فَلِمَ قَتَلْتُمُوهُمْ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿١٧﴾

”جن لوگوں نے کہا کہ اللہ نے ہمیں یہ حکم دے رکھا ہے کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں جب تک ہمارے پاس وہ قربانی نہ لائے جسے آگ کھا جاتی ہو، کہہ دو کہ مجھ سے پہلے بہت پیغمبر تمہارے پاس کھلی نشانیاں اور وہ بھی جو تم کہہ رہے ہو لپکے ہیں پھر اگر تم سچے ہو تو تم نے ان کو کیوں قتل کر ڈالا۔“

اس آیت میں یہودیوں کے ایک اور مرض کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم فقط اس رسول کے پیروں میں رہیں جو بنی اسرائیلی شریعت کا پابند ہو اور اس کے نزدیک قربانی دینے کا وہی قاعدہ ہو جو انبیائے بنی اسرائیل میں رائج تھا۔ وہ قانون یہ تھا کہ اکثر اوقات پوری کی پوری قربانی آگ کی نذر کر دی جاتی تھی، جس کو وہ سوختنی قربانی کہا کرتے تھے، بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ آسمان سے آگ نازل ہو کر اس کو کھا گئی جو قبولیت کی نشانی خیال کی جاتی تھی، جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہے: ”اور جب سلیمان دعامانگ چکا تھا تو آسمان سے آگ اتری اور سوختنی قربانی کو اور ذبحوں کو کھا گئی اور وہ گھر خداوند کے جلال سے بھر گیا۔“ (۲ توریت: ۱۷) اس قسم کی بحث وجدل سے ان کا منشا یہ تھا کہ بنی اسرائیل کے سوا کسی دوسرے خاندان کو علوم نبوت نہیں مل سکتے، اس لئے ہم صرف اپنی ہی شریعت کا اتباع کریں گے۔

سورہ بقرہ میں آپ پڑھ آئے ہیں کہ وہ بار بار اسی پر زور دیتے ہیں کہ ہم بنی اسرائیلی پیغمبروں کے سوا اور کسی پر ایمان نہیں لائیں گے۔ اس آیت میں بھی وہی مطلب بیان کیا گیا ہے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ تمہارے پاس بنی اسرائیلی رسول کثرت سے آئے، ان کے پاس معجزات و دلائل تھے، وہ موسوی شریعت کے پابند تھے اور اسی کی جانب تمہیں دعوت بھی دیتے تھے، باوجود ان باتوں کے تم نے انہیں کیوں قتل کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ تم صرف دھوکا دینے کی خاطر رسول اللہ ﷺ سے ایسی باتیں بنا رہے ہو۔ جس کی شریعت میں سوختنی قربانی بالکلمہ منسوخ کر دی گئی، ورنہ اصل میں تمہارا ارادہ سرے سے مخالفت کرنے کا ہے اور تمہارے نمبر میں پیغمبروں کی دشمنی موجود ہے۔

فَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقَدْ كَذَّبَ رَسُولٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَاءُوا بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ ۚ وَالْكِتَابِ الْمُنِيرِ ﴿١٨﴾ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ۚ وَإِنَّمَا تُوَفَّقُونَ أَجُوزَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۖ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ۚ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَهْوٌ مَّتَّعٌ ۚ الْغُورُ ﴿١٩﴾

”پس اگر یہ تم کو جھٹلا دیں تو تم سے پہلے بھی بہت سے پیغمبروں کو جھٹلا چکے ہیں جو کھلی نشانیاں اور صحیفے اور روشن کتاب لائے تھے، ہر جان کو موت چلھنی ہے اور تم کو صرف قیامت کے دن پورے بدلے دیئے جائیں گے، پس جو آگ سے دور ہٹا دیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا وہ ضرور کامیاب ہو گیا اور دنیوی زندگی تو صرف دھوکے کا سودا ہے۔“

روشن دلائل و براہین کے ہوتے ہوئے بھی اگر یہ لوگ تمہاری بات نہ مانیں تو پر وانیہ کیجئے، ان بد بختوں کی یہ قومی

خصوصیت ہے کہ ہر نبی کا انکار کیا جائے۔ چنانچہ ان کے پاس ایسے پیغمبر آئے جن کے پاس حسب ذیل چیزیں تھیں:

(الف) بینات: دلائل نبوت، معجزات اور ایسے صاف و صریح احکام جن کے نتائج فوراً معلوم ہو جائیں۔

(ب) زبر: چھوٹی کتابیں جو مفصل ہوں اور جن میں حکمت و دانائی کی باتیں درج ہوں۔ قرآن حکیم کی مختلف سورتیں اور صحائف انبیاء اسی میں شامل ہیں: وانه لفي زبر الاولين۔

(ج) کتاب منیر: چھوٹی چھوٹی کتابوں اور سورتوں کا مجموعہ مثلاً خود قرآن مجید قنادہ کہتے ہیں: الذیہر کتب الانبیاء و الکتب النبویہ، هو القرآن الکریم۔ زبر سے مراد انبیائے سابقین کی کتابیں ہیں اور کتاب منیر بھی قرآن کریم ہے۔

لیکن یہ تکذیب کب تک، آخر ایک روز ان تمام جھگڑوں کا فیصلہ ہو کر رہے گا اور جس دنیا کو تم نے اپنا مقصد حیات بنالیا ہے وہ تو اس متاع آخرت کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ حدیث میں آتا ہے: ان موضع سوطی الجنة خیر من الدنيا وما فیہا۔ (ترمذی) جنت میں ایک چابک کے برابر جگہ مل جانا دنیا و ما فیہا سے کہیں بہتر ہے۔

لَتُبْلَوْنَ فِيْ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۖ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اَوْثَرُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرٰكُوْا اَدٰى كَيْدًا ۚ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْر (۳۷)

”تمہارے مالوں اور تمہاری جانوں میں ضرور تمہاری آزمائش کی جائے گی اور ان لوگوں سے جن کو کتاب دی گئی ہے اور مشرکوں سے بہت سی ایذا کی باتیں تم ضرور سنو گے اور اگر تم صبر کرتے رہو اور پرہیزگار بنے رہو تو بے شک یہ بڑی ہمت کے کام ہیں۔“

اس آیت میں ہمیں آئندہ کیلئے ایک خاص امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اہل کتاب اور مشرکین مسلمانوں کے نہایت ہی شدید دشمن ہیں۔ یہ سب کے سب اسلام کے مقابلہ میں متحد ہو جائیں گے کہ الکفر ملۃ واحدة اور ان سب کا مرکز نقطہ یہ ہو گا کہ مسلمانوں کو نیست و نابود کر دیں، ان کے ممالک پر قبضہ کر لیں، قرآن حکیم کو محو باطل کر دیں، دنیا میں ایک مسجد بھی قائم نہ رہے اور اللہ کا نام لینے والا ایک متنفس بھی موجود نہ ہو۔ موجودہ زمانہ کے تمام حالات پر یہ آیت پورے طور سے صادق آرہی ہے۔ اپنے گرد و پیش اگر نظر دوڑاؤ اور یورپ کی تاریخ اپنے سامنے رکھ لو تو اس کی صداقت روز روشن کی طرح واضح ہو جائے گی۔

ان تکالیف و مصائب کے زمانہ میں مسلمانوں کو صبر و استقلال سے کام لینا چاہئے، وہ اپنے مقصد پر مر مٹیں، ایک انج بھی اسلام سے نہ ہٹیں، رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کے طرز عمل کو اپنے سامنے رکھیں، اس کے بعد کامیابی صرف فرزند ان اسلام ہی کی ہے۔

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِنْ اٰیِ الْاٰمِنِیْنَ اٰثَرًا وَاَوْثَرُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ ۚ فَتَنْبِذُوْهُ وَاَرٰءَ ظُهُورِهِمْ وَاَشْتَرَوْا بِهٖ ثَمٰنًا قَلِيْلًا ۚ فَبَشِّرْ مَا يَشْتَرُوْنَ (۳۸)

”اور جب اللہ نے ان سے عہد لیا جنہیں کتاب دی گئی ہے کہ تم ضرور اس کو لوگوں کے سامنے کھول کر بیان کرو گے، پھر انہوں نے اس کو اپنی پیٹھ کے پیچھے پھینک دیا اور اس کے بدلے میں تھوڑا سا مول لیا ہو کیا یہی برا ہے جو وہ خریدتے ہیں۔“

ان لوگوں کو کتاب دی گئی تھی کہ اس کی نشر و اشاعت کریں گے، مگر دنیوی اغراض مقاصد کی خاطر اس کو چھپاتے ہیں، افسوس کہ خود امت مسلمہ کے بیشتر طبقات اسی جرم ستان و عدم تمیز کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ عوت الی القرآن جو ان کی زندگی کا مقصد اصلی ہے اسی سے اغراض و انحراف ہے اور کتاب الہی سے بعد و ہجر ہی ان کے تمام امراض و مفاہک کا حقیقی سبب ہے۔ فہل من مدکر۔

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَفَرُّ حُونَ بِمَا آتَوْا وَيُحِبُّونَ أَنْ يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا فَلَا تَحْسَبْنَهُمْ بِمَقَارَۃٍ مِّنَ الْعَذَابِ ؕ  
وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ وَاللَّهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۖ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

”یہ ہر گز خیال نہ کرو کہ جو لوگ خوش ہوتے ہیں اس سے جو انہوں نے کیا اور چاہتے ہیں کہ اس کے لئے ان کی تعریف کی جائے جو انہوں نے نہیں کیا تو یہ ہر گز خیال نہ کیجیو کہ وہ عذاب سے پناہ میں ہیں اور ان کے واسطے دردناک عذاب ہے اور اللہ ہی کے لئے آسمانوں اور زمین کی سلطنت ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

یہ یہودیوں کی آخری خرابی ہے کہ کام کرتے نہیں، کتاب کی تعلیم نہیں دیتے اور اس پر چاہتے ہیں کہ لوگ ان کی تعریف کریں۔ علماء میں اس قسم کا مرض عموماً پیدا ہو جاتا ہے، وہ باوجود اپنا فرض منصبی ادا نہ کرنے کے لوگوں سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ان کی قصیدہ خوانی کریں، مگر یہ تعریف و توصیف انہیں عذاب الہی سے نجات نہیں دلا سکتی۔

## فصل ثالث

### اوصاف ضروریہ

#### اولوالالباب

یہودیوں کی خرابیوں سے پرہیز کرنے کی تعلیم دینے کے بعد بتایا جاتا ہے کہ اگر مسلمان اس امر کے آرزو مند ہیں کہ وہ تمام عیسائی ممالک پر قابض ہو جائیں تو وہ ان اوصاف و کمالات کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کریں جو ان آیات میں ذکر کئے جائیں گے۔ ان خصائص و امتیازات کے کسب و حصول کے بعد کسی نصرانی حکومت کو فرزند ان اسلام سے مقابلہ کی طاقت نہ ہوگی۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ وَالاخْتِلَافِ الْيَلِّ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِأُولِي الْأَلْبَابِ ﴿٢٠﴾ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا ۖ سُبْحَنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿٢١﴾ رَبَّنَا إِنَّكَ مَن تَدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْرَجْتَهُ ۖ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِن أَنْصَارٍ ﴿٢٢﴾

”بیشک آسمانوں اور زمین کی بناوٹ اور رات اور دن کے اختلاف میں عقل والوں کے لئے بہتیری نشانیاں ہیں، جو اللہ کو کھڑے اور بیٹھے ہوئے یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کے پیدا ہونے میں غور کرتے ہیں۔ ہمارے پروردگار تو نے اس کو بے فائدہ نہیں بنایا، تیری ذات پاک ہے پس ہم کو آگ کے عذاب سے بچا۔ ہمارے رب، جس کو تو آگ میں ڈال دے پس اس کو تو نے رسوا کیا اور ظالموں کا کوئی بھی مددگار نہیں۔“

انسانی عقل ہمیشہ خارج سے متاثر اور سبق اندوز ہوتی ہے۔ ارباب عقل و خرد زمین و آسمان کی پیدائش، اختلاف لیل و نہار اور زمانہ کے گزرنے سے صد ہا عبرتیں اور بصیرتیں حاصل کر لیتے ہیں، قوموں کے عروج و زوال، علو و تسفل اور ترقی و تنزل کے اصول و ضوابط معلوم کرتے ہیں۔ ان آیات کا درس و فکر انہیں بتاتا ہے کہ ہر چیز خاص مقصد کے لئے پیدا کی گئی ہے، اس لئے ان ارباب خرد کی زندگی کا بھی ضرور کوئی نہ کوئی مقصد ہو گا، ورنہ وہ درجہ انسانیت سے گر جائیں گے۔

مگر یہ حقیقت ان لوگوں کو معلوم ہوتی ہے جو ہر حالت میں اپنے فرض منصبی کو یاد رکھتے ہیں، اس کے ادا کرنے کی انہیں ہر وقت فکر دامن گیر رہتی ہے، جب وہ ایک مرتبہ زمین و آسمان کی پیدائش میں غور کر چکے ہیں اور انہیں معلوم ہو گیا ہے کہ ہر چیز ایک خاص مقصد کے لئے بنائی گئی ہے، اگر وہ مقصد پورا نہ کرے تو اپنے درجہ سے گر جائے گی، ایسے ہی اگر مسلمان اپنے نصب العین سے گر جائیں تو وہ اعلیٰ ترقی سے محروم رہیں گے، یعنی جنت میں نہیں جاسکیں گے۔

اس لئے یہ لوگ پکار اٹھتے ہیں کہ خداوند! تیرے تمام قاعدے ٹھیک ہیں، ہمیں ان قوانین پر چلنے کی توفیق دے، تاکہ اس اعلیٰ ترین راحت کو حاصل کر سکیں اور آتش سوزا سے نجات پائیں، کیونکہ جس شخص نے اپنے فرائض حیات میں کوتاہی کی وہ ذلیل ہو گا اور اس کے لئے جہنم سے بچنے کی کوئی صورت نہ ہوگی۔

وہ فرض یہ ہے

رَبَّنَا إِنَّا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُنَادِي لِلْإِيمَانِ أَنْ آمِنُوا بِرَبِّكُمْ فَآمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّئَاتِنَا وَتَوَقَّنَا مِنَ الْأَبْوَارِ ﴿٢٣﴾ رَبَّنَا وَاتِنَا مَا وَعَدْتَنَا عَلَىٰ رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۖ إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْوَعْدَ ﴿٢٤﴾

”ہمارے رب! بیشک ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا ہے جو ایمان کے لئے بلاتا ہے کہ تم اپنے رب پر ایمان لے آؤ پس ہم ایمان لے آئے، ہمارے رب تو ہمارے گناہ بخش دے ہماری برائیاں ہم سے دور کر اور نیک لوگوں کے ساتھ ہمارا خاتمہ کیجو، ہمارے رب! ہمیں وہ دے جس کا تو نے اپنے رسولوں کی معرفت ہمیں وعدہ دیا ہے اور قیامت کے روز ہمیں ذلیل نہ کی جو، بیشک تو وعدہ خلافی نہیں کرتا۔“

وہ فرض جس کے ادا نہ کرنے پر جہنم کی آگ کا خوف دلایا گیا ہے یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں خدائے واحد کی جانب بلارہے تھے، ہم نے اس آواز کو سن لیا، اب اسی کو اپنی زندگی کی غایت الغایات، انتہائی نصب العین اور اعلیٰ ترین مقصد بناتے ہیں۔ اگر اس عظیم ترین فرض کے ادا کرنے میں ہم سے غلطیاں سرزد ہوں تو خداوند معاف کر دیجیو، ان غلط کاریوں کا جبر نقصان کر کے ابرار کے ساتھ ہمارا خاتمہ کیجیو، تو نے اپنے رسولوں کی زبانی وعدہ فرمایا ہے کہ جو شخص میرے کام میں لگ جائے گا میں اس کو تمام دنیا سے بے نیاز کر دوں گا اور اس کو ہمیشہ کفار پر غالب رکھوں گا پس تو وعدہ کو پورا کر اور وہ انعامات نوازش فرما، ہماری تمناؤں کو اپنی رحمت سے پورا کر، ایسا نہ ہو کہ ہم ضروریات زندگی فراہم نہ ہونے کی وجہ سے اس فرض جلیل سے غافل ہو کر قیامت کے روز سب کے روبرو ذلیل ہوں، پس تو ہی ہماری ضروریات کو پورا کیجیو۔

وعدہ الہی

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اِنَّیْ لَا اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی ؕ بَعْضُکُمْ مِّنْ بَعْضٍ ؕ فَاَلَدِیْنِ  
هَاجِرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِّنْ دِیَارِهِمْ وَاُوْدُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَفَتَلُوْا وَفُتِلُوْا اَلَا کَفِرْنَ عَنْهُمْ سَبَیْلَتِهِمْ وَلَا دَخَلَتْهُمْ جَنَّتِ تَجْرِیْ  
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ ؕ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عِنْدَ کَاسِنِ الثَّوَابِ ۝۱۰

”پس ان کے رب نے ان کی دعا قبول فرمائی کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہ کروں گا، مرد ہو یا عورت تم سب ایک دوسرے سے ہو، جن لوگوں نے ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے اور لڑے اور مارے گئے ہیں ضرور ان کے گناہ ان سے دور کر دوں گا اور ضرور ان کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں یہ اللہ کی طرف سے بدلہ ہے اور اللہ ہی کے پاس کیا اچھا بدلہ ہے۔“

سورہ بقرہ کا خاتمہ اس دعا پر ہوا تھا: فَانصُرْنَا عَلٰی الْقَوْمِ الْکَافِرِیْنَ، اس سورت میں اس دعا کو شرف اجابت بخشا گیا اور یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ یہودیوں، عیسائیوں اور مشرکوں کی تمام حکومتیں مسلمانوں کو مل کر رہیں گی۔ لیکن اس فتح و کامرانی کے لئے ایک شرط بھی ہو گی وہ یہ کہ محض دعا پر قناعت نہ کر بیٹھیں، بلکہ دعا بھی کریں اور ہاتھ پاؤں بھی ماریں۔ کام کرو گے اور جان و مال قربان کرو گے تو ان نتائج و ثمرات سے بہرہ اندوز ہو گے۔

کام کی صورت یہ ہے کہ جس طرح پہلے ارباب ایمان نے حق و حریت کی خاطر اپنے وطن کو چھوڑا، تم بھی ہجرت الی اللہ اختیار کرو اور جس جگہ تمہاری ضرورت ہو وہاں جا کر کام کرو، ان لوگوں کی تو یہ کیفیت تھی کہ ان میں سے بعض اپنے گھر میں بہترین طریق سے خدمت حق انجام دے سکتے تھے، مگر وہاں کے رہنے والے ان کے شدید ترین خلاف بن گئے اور ان کو زبردستی اپنے وطن سے نکال دیا اور بعض لوگوں نے خود ہی دوسری طرف ہجرت اختیار کی، مگر باوجود ان تمام باتوں کے وہ اپنا فرض منصبی ادا کرنے سے قاصر نہ رہے، میری راہ میں انہیں ہر قسم کی تکلیف دی گئی، ان کے قتل کے منصوبے

باندھے گئے اور جس وقت مخالفین ان کے قتل کے درپے ہوئے تو مجبوراً انہیں یہی ہتھیار سنبھالنے پڑے اور شہید ہو گئے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی تمام غلطیاں نظر انداز ہوں گی اور وہ ہر طرح با مراد ہوں گے۔

لَا يَغُرُّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ ﴿٣٨﴾ مَتَاعٌ قَلِيلٌ ۚ ثُمَّ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿٣٩﴾

”جو کافر ہیں ان کا ملکوں میں تصرف تجھے دھوکے میں نہ ڈالے یہ تو تھوڑا سا فائدہ ہے پھر ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بہت بری جگہ ہے۔“

کفار کی دنیاوی ترقی سے آپ پریشان خاطر نہ ہوں، یہ خیال نہ آنے پائے کہ ان کے پاس ہر قسم کا ساز و سامان موجود ہے، ہر جگہ ان کی حکومت ہے اور مسلمانوں کے پاس کچھ بھی نہیں، یہ بالکل حقیر چیز ہے اور ان بد بختوں کے لئے ہر گز مفید ثابت نہ ہوگی۔ تم مسلمان اگر کام کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تو سب کچھ مہیا کر دیا جائے گا۔ قرآن حکیم میں ایک جگہ آتا ہے: مَا يُجَادِلُ فِي إِلَهٍ إِلَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَلَا يَغُزُّكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ (المومن ۴) خدا کی آیتوں میں وہی لوگ جھگڑتے ہیں جو کافر ہیں تو ان لوگوں کا شہروں میں چلنا پھرنا تمہیں دھوکے میں نہ ڈال دے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: ان الذين يفتنون على الله الكذب لا يفلحون۔ جو لوگ جھوٹ اللہ پر تہمت لگاتے ہیں وہ کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔ ایک مقام پر اس طرح آتا ہے: نمتعهم قليلاً ثم نضطرهم الى عذاب غليظ۔ انہیں ہم تھوڑا سا مال دیں گے پھر عذاب غلیظ کی طرف مجبور کر دیں گے۔

لَكِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا رِبَاهُمْ هُمْ جُنُودٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خُلِدُوا فِيهَا نَارًا مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ ۖ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ لِّلْآبَرَارِ ﴿٤٠﴾

”لیکن جو اپنے رب سے ڈرتے رہے ان کے واسطے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں انھی میں رہیں گے یہ اللہ کی طرف سے مہمانی ہے اور جو اللہ کے پاس ہے وہ نیکیوں کے لئے بہت اچھا ہے۔“

جو تقویٰ اللہ اختیار کریں گے ان کو دائمی کامیابی اور آخرت میں جنت ملے گی اور اس جنت کی نعمتوں کا تو کوئی شخص وہم و گمان بھی نہیں کر سکتا۔ حدیث میں آتا ہے: ملا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر۔ کسی انسانی آنکھ نے ان کو نہیں دیکھا نہ کانوں نے سنا اور ان کا تو کوئی انسانی دماغ مخیل بھی نہیں کر سکتا۔

فضائل مخصوصہ

وَإِنَّ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَمَنْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ خَشِعِينَ لِلَّهِ ۚ لَا يَشْتَغُونَ بِلَايَةِ اللَّهِ شَيْئًا قَلِيلًا ۖ أُولَٰئِكَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۖ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿٤١﴾

”اور اہل کتاب میں وہ لوگ بھی ہیں جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس پر جو تمہاری طرف اتارا گیا اور اس پر جو ان کی



جانب اتارا گیا، اللہ کے سامنے عاجزی کرتے رہتے ہیں، اللہ کی آیات کے عوض تھوڑا سا مول نہیں لیتے، یہی لوگ ہیں جن کے لئے ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے۔ بیشک اللہ جلدی حساب کرنے والا ہے۔”

اہل کتاب میں بعض لوگ یقیناً اچھے ہیں، جن کی صفات اس آیت میں بیان کی گئی ہیں۔ یہ تمام اوصاف و کمالات جو ان آیات میں ذکر کئے گئے ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں میں موجود تھے۔ پھر وہ لوگ جو باوجود عیسائی یا یہودی ہونے کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے، جیسا کہ قرآن میں دوسری جگہ آتا ہے: الَّذِينَ اتَيْنَهُمُ الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِهِ هُمْ بِهِ يُؤْمِنُونَ ۖ وَإِذْ يُثَلَّىٰ عَلَيْهِمْ قَالَ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّنَا اَنَا كُنَّا مِنْ قَبْلِهِ مُسْلِمِينَ ۖ اُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا وَيَذَرُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ۖ (القصص ۵۲ تا ۵۴) جن لوگوں کو ہم نے اس سے پہلے کتاب دی تھی وہ اس پر ایمان لے آتے ہیں اور جب قرآن کو پڑھ کر سنایا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لے آئے۔ بیشک وہ ہمارے پروردگار کی طرف سے برحق ہے اور ہم تو اس سے پہلے کے حکم بردار ہیں۔ ان لوگوں کو دگنابند لادیا جائے گا، کیونکہ صبر کر رہے ہیں اور بھلائی کے ساتھ برائی کو دور کرتے ہیں اور جو مال ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ ایک مقام پر یوں ارشاد ہے: الَّذِينَ اتَيْنَهُمُ الْكِتَابَ يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ اُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ (البقرہ ۱۲۱) جن لوگوں کو ہم نے کتاب عنایت کی ہے وہ اس کو ایسا پڑھتے ہیں جیسا اس کے پڑھنے کا حق ہے، یہی لوگ اس پر ایمان رکھنے والے ہیں۔ اس طرح بھی آتا ہے: مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اُمَّةٌ قَالَتِ هِيَ تِلْكَ اٰيَةُ اللّٰهِ اِنَّهٗ اَتٰلِ اَيْلٍ وَهُمْ يَسْتَحْجِدُونَ ۖ (ال عمران ۱۱۳) ان اہل کتاب میں کچھ لوگ حکم خدا پر قائم بھی ہیں، جو رات کے وقت خدا کی آیتیں پڑھتے اور اس کے آگے سجدے کرتے ہیں۔ پھر ان صفات کا بہترین مجموعہ صحابہ کرام ہیں، پس مسلمانوں کا فرض ہے کہ ان کا ایک ایک فرد ان فضائل و محاسن سے متصف ہو جائے تاکہ نصاریٰ کے ممالک پر قبضہ کرنے کے قابل ہوں۔

حی علی الغلام

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝

“اے لوگو! جو ایمان لائے ہو صبر کرو اور صبر کرو اور نگہ رانی کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ مراد حاصل کرو۔”

ان اوصاف مذکورہ کے بعد ان خصوصیات کو بھی اپنے اندر پیدا کر لو:

(الف) ہر وقت اپنے مقصد حیات پر مرنے کے لئے تیار رہو۔

(ب) مسلمانوں کو ہمیشہ جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے لئے جوش دلاتے رہو اور ان کو بھی اعلیٰ مقاصد زندگی پر مرنے کے لئے تیار کرو۔

(ج) جس قدر تمہارے مخالفین ہیں ان کی نقل و حرکت کی نگرانی کرو تا کہ اگر وہ کوئی تدبیر اسلام کی بربادی کی سوچیں تو تم فوراً اس کا رد عمل کرو۔ آج کل دول یورپ کے سفر ایہی فرائض انجام دیتے ہیں اور اسی کام کے لئے اجنبی حکومتوں میں ان کے قونصل خانے تیار ہوتے ہیں۔ حدیث میں نہایت کثرت سے اس رابطہ فی سبیل اللہ کے فضائل بیان کئے گئے ہیں۔ بخاری میں ہے: رابطہ فی سبیل اللہ خیر من الدنیا وما علیہا۔

اللہ کے لئے ایک دن کی چوکیداری دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔ ابو داؤد میں ہے: کل میت یختم علی عملہ الا الذی مات مرابطاً فی سبیل اللہ فانہ ینسولہ عملہ الی یوم القیمة ویامن فتنۃ القبر۔ ہر مرنے والے کے اعمال ختم ہو جاتے ہیں۔ مگر مرابطہ فی سبیل اللہ کے اعمال قیامت تک بڑھتے رہتے ہیں اور فتنہ قبر سے محفوظ رہتا ہے کہ اس نے نوع انسانی کے بقا کی خاطر اپنا وقت قربان کر دیا۔ مسند امام احمد میں حضرت ام درداء سے ہے: من رابط فی شئ من سواحل المسلمین ثلاثۃ ایام اجزأت عنہ رباط سنت۔ جس نے تین روز تک مسلمانوں کے سواحل سمندر کی حفاظت کی باقی مقامات کی سال بھر کی نگرانی اس کے برابر ہوگی۔ ایک مرتبہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خطبہ دے رہے تھے، اس کے دوران میں انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے: حرس لیلۃ فی سبیل اللہ افضل من الف لیلۃ یقام لیلہا ویصام نہارہا، اللہ کی راہ میں ایک رات جاگنا ایسے ہزار دن سے بہتر ہے جو روزوں سے بسر ہوں اور ان کی شب میں قیام کیا جائے۔ ترمذی نے ابن عباس سے یہ روایت نقل کی ہے: عینان لا تمسہما النار عین بکت من خشیۃ اللہ وعین بانث تحرس فی سبیل اللہ۔ دو آنکھوں کو دوزخ کی آگ نہیں لگے گی وہ جو اللہ کے خوف سے گریہ کرتی ہو اور وہ جو رات کو مسلمانوں کی پاسبانی کرے۔ مسند امام احمد میں ہے: من حرس من وراء المسلمین متطوعاً لا باجرة السلطان لم یر النار بعینہ جس شخص نے محض بوجہ اللہ بغیر اجر ت لئے ہوئے مسلمانوں کی چوکیداری کی وہ اپنی آنکھ سے دوزخ کو نہیں دیکھے گا۔

(د) اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو۔

ان صفات کے کسب و حصول کے بعد کامیابی یقینی اور قطعی ہے۔ بقرہ اور آل عمران دونوں نے مسلمانوں کے سامنے فلاح و کامرانی اور زندہ قوم بننے کی راہ کھول دی ہے: فمن شاء فليؤمن ومن شاء فليکفر۔

الحمد لله الذي بنعمة تتم الصلحت

